

بحر الفرقان
من تفسیر آیات القرآن

از مشتمات قلم
حضرت علامہ مولانا
عبد الوفاق بھٹوی
ناشر
ضیاء العلوم پبلی کیشنز لاہور
پاکستان

کتاب لاریب کی توضیحات و تشریحات، علوم عقلیہ و نقلیہ کی روشنی میں
علمی و تحقیقی ذوق رکھنے والوں کے لئے قدیم و جدید احکامات و مسائل پر اباحت کا حسین مرقع
تفسیر القرآن بالقرآن، ارشادات نبویہ، اقوال صحابہ، تحقیقات اسلاف اور روایات صحیحہ پر مشتمل تفسیر

نجوم الفرقان^{مسمیٰ بہ}

جلد چہارم

سورۃ البقرہ آیات 142 تا 195

از رشحات قلم

محقق اہلسنت
استاذ العلماء حضرت علامہ مولانا
عبدالرزاق^{بھٹراوی طاروی}
مدظلہ العالی

ناشر ضیاء العلوم پبلی کیشنز
ڈاولپنڈی
پاکستان

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب: نجوم الفرقان من تفسیر آیات القرآن
تصنیف: علامہ مولانا عبد الرزاق چشتی بھڑالوی
کمپوزنگ: ضیاء لوم کمپوزنگ سنٹر راولپنڈی
کمپیوٹر گرافکس: قاضی محمد یعقوب چشتی، اظہر اقبال اعوان
ضخامت: $\frac{20 \times 30}{8}$ 864 صفحات
پروف ریڈنگ: اظہر اقبال ملک
بار طبع: اول دسمبر 2006ء
قیمت: 240/- روپے
ناشر: سید شہاب الدین شاہ
ضیاء لوم پبلی کیشنز راولپنڈی پاکستان

0333- 5166587 - Fax 051-4580404
Email: ziauloom@isb.paknet.com.pk

رابطہ:

54	قَدْ نَرَى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَاءِ فَلَنُؤَلِّينَكَ قِبْلَةً تَرْضَاهَا الْآيَةُ	29	سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلَّهُمْ عَنْ قِبَلِهِمُ الَّذِي كَانُوا عَلَيْهِمُ الْآيَةُ
54	شانِ نزول	29	شانِ نزول
55	تحویل قبلہ کے متعلق احادیث مبارکہ	31	السُّفَهَاءُ سے مراد کون لوگ ہیں؟
57	اعتراض، جواب	32	تمام اقوال کا جامع قول
58	تحویل قبلہ کس ماہ میں ہوا	33	قبلہ کو قبلہ کہنے کی وجہ
59	کس مسجد میں قبلہ کی تبدیلی کا حکم آیا	34	قُلْ لِلَّهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا
59	مکہ مکرمہ میں نبی کریم ﷺ کا قبلہ کیا تھا؟	35	لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ الْآيَةُ
60	آیہ کریمہ کی قدرے وضاحت	35	شانِ نزول
61	جبریل سے کہنے میں حکمت	37	حکمت، شجاعت
62	کعبہ کی تمنا کی وجوہ	39	اسی آیہ کریمہ سے معتزلہ کا رد ہو گیا
64	قَوْلٍ وَجْهِكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ	39	اجماع امت دلیل ہے
65	مسجد کا ذکر کیا کعبہ کا نہیں، کیا وجہ؟	41	نبی کریم ﷺ کی امت کی گواہی پر احادیث مبارکہ
67	نتیجہ واضح ہوا	42	امت مصطفیٰ ﷺ کی گواہی کا ایک اور مطلب
68	وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ وَإِنَّ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ لَيَعْلَمُونَ الْآيَةَ	44	چار گواہیوں کا بیان
69	قبلہ مقرر کرنے میں حکمتیں	47	فائدہ جلیلہ
71	کعبہ کو قبلہ بنانے میں حکمتیں	48	تنبیہ
74	وَلَسِنُ آتَيْنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ بِكُلِّ آيَةٍ مَا تَبِعُوا الْآيَةَ	49	اعتراض، جواب
75	قرآن پاک کی آیہ کو آیہ کہنے کی وجہ	50	تسکین الجنان سے اقتباس
		52	طلباء کرام توجہ فرمائیں

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
96	ظہر کی نماز کا وقت اور غیر مقلدین	76	اس ایک جملہ سے پانچ مسائل بیان کر دیئے
97	غیر مقلدین کی اس دلیل میں بھی ناکامی	77	اعتراض
97	احناف کا مذہب فقہ سے	78	جواب اول، دوم
98	ظہر کا مستحب وقت	79	تسکین الجنان سے اقتباس
98	احناف کے دلائل احادیث سے		الَّذِينَ آمَنُوا هُمُ الْكِتَابُ يَعْرِفُونَهُ
	اصلی سایہ کے سواء ایک مثل ہونے سے	82	كَمَا يَعْرِفُونَ ابْنَاءَهُمُ الْخَالِئَةُ
99	پہلے ظہر ادا کر لیجائے	84	وَأَنَّ فَرِيقًا مِنْهُمْ لَيَكْتُمُونَ الْحَقَّ الْخَالِئُ
100	فجر کی نماز کے متعلق غیر مقلدین کا بیان	85	الْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِينَ
100	فجر کی نماز کے وقت کے متعلق فقہ حنفی سے		وَلِكُلِّ وَجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيَهَا فَاسْتَبِقُوا
100	صبح کی جماعت کا مستحب وقت فقہ حنفی سے	88	الْخَيْرَاتِ الْخَالِئَةُ
102	احناف کا استدلال احادیث سے	91	آیہ کریمہ سے حاصل ہونے والا فائدہ
103	غیر مقلدین کی دلیل کا جواب	91	نماز کس وقت ادا کی جائے
	جلدی نماز پڑھنے پر غیر مقلدین کی	92	نمازوں کے اوقات
104	ایک اور دلیل	92	غیر مقلدین کا مذہب
104	اس دلیل کا جواب	93	غیر مقلدین کے دلائل
	غیر مقلدین کا حدیث پر عمل یا	93	منافق کی نماز
105	حدیث سے انحراف	93	غیر مقلدین اپنا دعویٰ ثابت کرنے میں ناکام
108	فائدہ	94	عصر کا وقت فقہ حنفی سے
	وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ	95	اس فقہی قول کو حدیث پاک سے لیا گیا
110	شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ الْخَالِئَةُ		سورج کے زردی مائل ہونے اور غروب
110	تکرار میں فوائد	96	کے قریب ہونے پر فقہاء کا استدلال

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
129	سے خوف نہ کرے	111	پہلا، دوسرا، تیسرا فائدہ
	دل حاضر نہ ہو تو پھر بھی زبان سے	112	چوتھا، پانچواں فائدہ
129	ذکر نہ چھوڑے	113	تنبیہ
131	علامہ رازی رحمہ اللہ کا خوبصورت بیان	114	اعتراض، جواب
132	فضائل ذکر احادیث مبارکہ سے	116	خشیت اور خوف میں فرق
135	فائدہ جلیلہ	116	نعمت سے مراد کیا ہے
137	تنبیہ		كَمَا أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولًا مِّنْكُمْ
138	ومن جاء بالسینة فجزاء سینة مثلها	118	يَتْلُوا عَلَيْكُمْ آيَاتِنَا الخ الآية
141	وضاحت حدیث	122	نکتہ
144	نکتہ	122	وَيُعَلِّمُكُم مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ
146	اعتراض، جواب	122	فائدہ جلیہ
148	مختصر وضاحت	125	فَاذْكُرُونِي اذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوا لِي الخ
149	سوال عدم علم کی دلیل نہیں	125	ذکر کی تین قسمیں
151	افضل الذکر	126	نماز تینوں ذکروں کا مجموعہ
151	حکایت	127	سب سے اعلیٰ ذکر
152	راقم کا موقف	127	جمع اذکار پر مشتمل ذکر
155	فائدہ جلیلہ	128	اعتراض
162	قساوة قلب کیا ہے؟	128	پہلا جواب، دوسرا جواب عظیم
168	وضاحت حدیث	129	اللہ تعالیٰ کا ذکر زیادہ سے زیادہ کرے
171	وضاحت حدیث		کسی ملامت کرنے والے کی ملامت

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
191	فضیلت شہادت	177	وَاشْكُرُوا لِي وَلَا تَكْفُرُون
195	قیامت سے پہلے عذاب و ثواب	178	شکر کیا ہے
196	اعتراض، جواب	178	شکر کی تین قسمیں ہیں
198	جنت تلواریں کے سایہ میں	178	ہر منعم کا شکر یہ ادا کرے
199	نبی کریم ﷺ کی تمنائے شہادت	179	شکر کا فائدہ شکر کر نیوالے کو حاصل ہوتا ہے
201	شہید کو شہید کہنے کی وجوہ	179	شکر گزار تھوڑے نا شکرے زیادہ ہیں
202	شہید کی زندگی	179	شکر کی فضیلت میں احادیث و آثار
203	اعتراض، جواب		يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ
204	نفی قول سے مراد نفی اعتقاد	184	وَالصَّلَاةِ إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ
205	دنیا میں شہید ہو آخرت میں نہ ہو	184	صبر کیا ہے
209	اخروی شہید	185	صبر کی تین قسمیں ہیں
209	اخروی شہید پر احادیث مبارکہ	185	صبر صرف انسانوں کے ساتھ خاص کیوں؟
212	دنیوی اور اخروی شہید	186	صبر کی تقسیم کا خوبصورت انداز
215	فقہی شہید	186	صبر کی دو قسمیں ہیں بدنی اور نفسانی
215	فقہی شہید کے احکام	186	حقیقت صبر کیا ہے؟
218	شہید کے خون کا مسئلہ	187	فضیلت صبر
218	انبیاء کرام اور اولیاء کرام زندہ ہیں	190	إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ
220	نبی کی زندگی شہید کی زندگی سے اعلیٰ ہے		وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ
221	علامہ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ فرماتے ہیں	191	اللَّهِ أَمْوَاتٌ الْخَالِيَةُ
221	انبیاء کرام اپنی قبروں میں نماز پڑھتے ہیں	191	شان نزول

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
253	استرجاع دل سے پڑھے	221	نبی کریم ﷺ درود پاک سنتے ہیں
254	استرجاع اس امت کا خاصہ ہے		نبی کریم ﷺ کا علم موت کے بعد ایسے ہی
255	آنسو بہانے پر احادیث مبارکہ	222	ہے جیسے زندگی میں تھا
256	حدیث پاک سے واضح ہوا	223	نبی کریم ﷺ کی قبر سے اذان کا آواز آنا
259	دین میں بڑی مصیبتیں نبی کریم ﷺ پر آئیں	224	نبی کریم ﷺ اپنی امت کے اعمال کو جانتے ہیں
260	نماز باجماعت رہ جانے پر استرجاع	228	شہید کی زندگی پر روح البیان کا بیان
261	کلام الامام فی تفسیر الآیت للافتتاح		وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ
	أُولَئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّنْ	229	وَالْجُوعِ الْخَالِیَةِ
264	رَبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ الْخَالِیَةِ		صبر سے امداد طلب کرنے کے بعد
266	گزشتہ سے پیوستہ	230	آزمائش کے ذکر کے فوائد
267	مشکل الفاظ کے معانی	233	خوف سے اور آزمائش
268	فائدہ جلیلہ	234	بھوک سے آزمائش کا اور مطلب
269	إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللَّهِ الْخ	238	بھوک سے آزمانے کی ایک اور وجہ
269	شان نزول	240	فوائد
270	مروہ کو مروہ کہنے کی وجہ	243	وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ
271	صفا اور مروہ کو ”شعائر اللہ“ کہنے کی وجہ	244	جانوں میں کمی
271	شعائر اللہ کہنے کی عظیم وجہ	246	آزمائش کا مقصد
272	اس آیت کریمہ کا ماقبل سے تعلق	248	غیر ممکن صبر کا حکم نہیں
275	امام اعظم رحمہ اللہ کا اعظم مذہب	248	طلباء کرام کی توجہ کے لئے
276	حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا اور اس کا جواب	250	استرجاع پر احادیث مبارکہ

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
301	توحید کیا ہے؟	278	اعتراض، جواب
302	حضرت شیخ شبلی رحمہ اللہ کا تقویٰ	279	جزاء طاعت کو شکر کہنے کی وجوہ
304	طلباء کرام کے لئے	280	نکتہ
305	”انت“ کا استعمال		إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنزَلْنَا مِنَ
306	”هو“ کا استعمال	281	الْبَيِّنَاتِ وَالْهُدَىٰ الْخِ الْآيَةِ
307	لفظ ”هو“ کا اور کمال	281	مختصر مطلب
309	إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ الْخِ	281	قدرے تفصیلی ذکر
309	شان نزول	282	کتمان حق کب برا ہے
311	سماوات جمع اور ارض واحد کیوں؟	283	مقام توجہ
	دن رات کا اختلاف وجود صانع پر	284	یہ مقامات کتمان حق میں نہیں آتے
313	دلالت کرتا ہے	286	کتمان علم پر وعید
315	طلباء کرام کی توجہ کے لئے	288	طلباء کرام توجہ فرمائیں
315	مشہور بحور پانچ ہیں		براء بن عازب اور ابن عباس رضی اللہ عنہم
318	کشتیوں کا دریاؤں میں چلنا نشانیاں کیسے؟	289	کا استدلال
322	زمین کو زندہ کرنے کا کیا مطلب؟	292	معزلہ کا مذہب
323	زمین کا زندہ ہونا نشانی کیسے؟	293	گزشتہ سے پیوستہ
	انسان اپنے آپ کو دیکھ کر رب تعالیٰ کی		إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَمَاتُوا وَهُمْ
325	قدرت کا اندازہ کرے	295	كُفَّارًا الْآيَةِ
	حیوانات قدرت باری تعالیٰ پر دلالت	298	آثار مبارکہ
325	کر رہے ہیں	300	وَالْهَكُمْ إِلَهٌ وَاحِدٌ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْخِ
325	حضرت علی رضی اللہ عنہ کا شاندار قول	300	شان نزول

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
	حضرت ابراہیم علیہ السلام رب تعالیٰ	325	عناصر اربعہ سے تخلیق قدرت کی نشانی
343	کے محبت و محبوب		عناصر اربعہ پر شکل کو مرتب کرنا ایک اور
343	نبی کریم ﷺ کی محبت جنت کا ذریعہ	326	قدرت ہے
344	عیسیٰ علیہ السلام کا ارشاد	327	بچے کا قدرت باری تعالیٰ کی نشانی ہونا
345	رب تعالیٰ سے عوام کی محبت	328	انسانوں کے مختلف مزاج قدرت کی نشانی ہیں
345	عارفین کی رب تعالیٰ سے محبت	329	وَتَصْرِيفِ الرِّيحِ
345	عارفین کی دلیل	329	اسی سے نتیجہ یہ حاصل ہوا
346	لذت سے ذاتی طور پر محبت کیسے؟	330	ہواؤں کی چار قسمیں ہیں
346	کمال محبوب لذتہ کیسے؟	330	ريح کی وجہ تسمیہ
347	مقام توجہ	332	بادلوں کے مسخر ہونے میں قدرت کی نشانیاں
348	اللہ تعالیٰ کی معرفت کا ذریعہ	333	اس آیت کریمہ کے متعلق آثار کا تذکرہ
348	محبت کے مراتب کے اسباب	335	وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَتَّخِذُ مِنْ دُونِ اللَّهِ إِلَهًا
349	محبت کا اعلیٰ معیار	336	آیت کریمہ میں انداد کا مطلب کیا ہے؟
350	غلط فہمی کا ازالہ	337	اعتراف، جواب
350	شوق الی اللہ کا مطلب	238	نتیجہ واضح ہوا
351	محبوب کے اشتیاق کی دو وجہ	241	بندے کی محبت رب تعالیٰ سے
351	بندے کا رب تعالیٰ کا مشتاق ہونا	341	اللہ تعالیٰ کی محبت بندے سے
352	مومنوں کو رب تعالیٰ سے محبت کیسے؟	341	يُحِبُّونَهُمْ كَحُبِّ اللَّهِ کا مطلب کیا ہے؟
352	مومنین کی رب تعالیٰ سے محبت زیادہ کیسے؟		بندہ رب تعالیٰ سے محبت کرتا ہے اس میں
355	کافروں کا اپنے معبودوں سے دلچسپ سلوک	343	اختلاف نہیں

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
	يَا أَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ	355	محبت کی زیادتی ثبات سے حاصل ہوتی ہے
365	خَلَالًا طَيِّبًا الْآيَةُ		إِذْ تَبَرَّأَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا مِنَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا
365	ما قبل سے رابطہ	357	وَرَأَوْا الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْأَسْبَابُ
365	شان نزول	357	مختصر مطلب
369	تنبیہ	357	قدرے تفصیل
370	قبولیت دعاء رزق حلال پر موقوف ہے	357	آیہ کریمہ کا مطلب یہ ہے
371	تین چیزوں میں نجات	357	اسی کی اور مثالیں قرآن پاک سے
371	جب یقین ہو حلال میں پھر کھائے	358	متبوعین کی تابعین سے بے زاری کیوں؟
	حلال مال کا چھ چیزوں سے پاک ہونا	358	متبوعین سے مراد کون؟
371	ضروری ہے		متبوعین اپنے قابعین سے کیسے بے زار
	شیطان سے بچنے کا حکم رب تعالیٰ نے کئی	359	ہوں گے
372	مقامات پر دیا	360	آیہ کریمہ میں اسباب سے مراد
	إِنَّمَا يَأْمُرُكُمْ بِالسُّوءِ وَالْفَحْشَاءِ وَأَنْ		وَقَالَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا لَوْ أَنْ لَنَا كَرَّةٌ
374	تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ	362	فَنَسَبُوا مِنْهُمْ الْخَالِ الْآيَةُ
374	عداوت کے تین امور (چیزوں) کا ذکر	362	مختصر مطلب
375	شیطان کے حکم دینے کا مطلب	362	قدرے تفصیل
376	السوء کا لغوی معنی	363	وہ رجوع کی تمنا کیوں کریں گے؟
377	وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ اتَّبِعُوا مَا أَنْزَلَ اللَّهُ الْخ	363	کون سے اعمال ان کو دکھائے جائیں گے
378	طلباء کرام توجہ فرمائیں	364	وہ اعمال ان پر حسرت ہوں گے
379	تقلید کے متعلق علامہ قرطبی رحمہ اللہ کا ارشاد	364	حسرت کیا ہے؟

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
392	تقلید کن مسائل میں جائز ہے؟	380	تقلید کا معنی
393	اپنے امام کے مذہب کو حق ماننا واجب ہے	380	تقلید فروع میں
394	صحابہ کرام پر کس کی تقلید ضروری تھی؟	380	اصول میں صحیح یہ ہے تقلید نہیں
394	امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب کو فوقیت کیوں؟	380	تقلید کے مخالفین ٹیڑھے ہیں
395	امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کا تابعی ہونا	381	نیک لوگوں کی تابعداری
	حضرت علی رضی اللہ عنہ کی امام اعظم	382	اعتراض، جواب
395	رحمۃ اللہ علیہ کے لئے دعا	383	اجتہاد کے درجہ کا علم فرض کفایہ ہے
	آپ کی فضیلت میں حضور علیہ السلام	384	فقہ کیا ہے؟
397	کے ارشادات	384	فقیہ کون ہے؟
400	امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کا علمی مقام	385	اسلام کے پہلے فقیہ و مجتہد
400	امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ	386	عبداللہ بن مسعودؓ کے بعد کے فقہاء کرام
401	مقامِ تفکر	387	تقلید کیا ہے؟
403	امام محمد رحمۃ اللہ علیہ	387	تقلید صرف مجتہد کی ہوگی
404	امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ آپ کے شاگرد ہیں	388	مذہب اربعہ حق ہیں
406	امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب	388	مذہب اربعہ کے بغیر تقلید منع ہے
406	ایک غلط فہمی کا ازالہ	389	تقلید بہت ضروری ہے
408	امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے اساتذہ و شاگرد	389	تقلید مذہب اربعہ ہی کی کیوں ضروری ہے
409	امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے تقویٰ کی ایک جھلک	390	تمام فقہاء کے کل سات درجے ہیں
410	امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے مقلدین اولیاء کرام		امام اعظم کے شاگردوں کا آپ سے کئی
411	امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ طریقت کے بادشاہ	391	مسائل میں اختلاف کیوں؟

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
425	ہنڈیا میں پرندہ گر کر مر جانے کا حکم	411	امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ اور امام باقر رضی اللہ عنہ
426	روایت ابن عباس		وَمَثَلُ الَّذِينَ كَفَرُوا كَمَثَلِ الَّذِي
427	کون سا خون حرام ہے	412	يَنْعُقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ الْآيَةُ
427	دم مسفوح نجاست غلیظہ ہے	414	يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِنْ طَيِّبَاتِ الْخ
	ذبح کے بعد گوشت میں رہ جانے والے		طیب قرآن پاک میں چار معانی میں
428	خون کا حکم	414	استعمال ہے
429	شرعی ضابطہ	414	دونوں کلاموں کے فرق میں عجیب نکتہ
429	مچھلی کا خون پاک اور حلال ہے	415	مومنین کو خطاب
	جانوروں کے حلال ہونے اور حرام ہونے	415	شکر کا حکم وجوبی ہے
430	پر شاندار ضابطہ	415	احادیث مبارکہ
431	مور کا حکم		إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ
431	خنزیر	418	وَلَحْمَ الْخِنْزِيرِ الْخ
433	مسئلہ، تنبیہ	418	طلباء کرام کی توجہ کے لئے
435	وَمَا أَهْلٌ بِهِ لغيرِ اللَّهِ	420	میتہ سے مراد کیا ہے
436	اس مسئلہ میں تین وجوہ	420	زندہ جانور سے گوشت کاٹنے کا حکم
436	حرام ہونے کی پہلی وجہ	420	مردہ جانور سے نفع حاصل کرنا منع ہے
440	مذکورہ بالا بحث سے حاصل ہوا	422	دباغت کیا ہے؟
440	دوسری قسم جو حرام ہے	422	کیا کوئی جانور ذبح کرنے کے بغیر حلال ہے؟
440	تیسری قسم جو حلال ہے	423	جانوروں کے پیٹ میں بچے کا حکم
441	آخری دونوں قسموں پر دلائل	425	چوہے وغیرہ کا گھی میں مر جانے کا حکم

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
441	ذبح کرنے کی چھ شرائط ہیں	456	شراب سے علاج کا حکم
442	غیر اللہ کے لئے ذبح کرنے کی حلت و حرمت	456	مرکب ادویات
443	کی دار و مدار چھٹی شرط پر ہے	457	خون دینے کا حکم
443	غیر اللہ کیلئے بیت تقرب ذبح کرنا حرام ہے	458	إِنَّ الدِّينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ
443	غیر اللہ کے لئے ذبح بغیر ارادہ تقرب کے حلال ہے	458	مِنَ الْكِتَابِ الْخِ الْآيَةِ
445	شیخ احمد ملا جیون رحمہ اللہ کی وضاحت	459	شان نزول
446	بہت خوب فیصلہ	459	یہود کے مشہور رئیس اور عالم لوگ
447	وجہ فرق	459	یہود کیا چھپاتے تھے؟
447	شامی رحمہ اللہ کی مزید وضاحت	459	وہ آیات کو کیسے چھپاتے تھے؟
448	شامی رحمہ اللہ کا وضاحتی قول	460	ثَمَّنَا قَلِيلًا کہنے کی وجہ کیا ہے؟
448	غیر اللہ کے تقرب کا مطلب	461	آگ کھانے کا مطلب
449	علامہ شامی کی وضاحت	461	کلام نہ کرنے کی تین وجوہ
450	خلاصہ کلام	463	طلباء کرام کی توجہ کے لئے
450	علم معانی کا ضابطہ	463	عجیب نکتہ
451	اہل علم سے انصاف کی توقع	464	شدید عذاب کی عظیم وجہ
451	وَمَا أَهْلٌ بِهِ لغيرِ اللہ میں سب سے پہلا اختلاف	465	أُولَئِكَ الَّذِينَ اشْتَرُوا الضَّلَالَةَ
454	مسئلہ، تنبیہ	465	بِالْهُدَى الْخِ الْآيَةِ
455	حالت اضطرار میں شراب کا حکم	465	قدرے وضاحت
		467	پہلی بحث کہ تعجب کیا ہے؟
		468	دوسری بحث

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
480	الہامی کتابوں پر ایمان لانا	469	ذَٰلِكَ بَآئِنُ اللَّهِ نَزَلَ الْكِتَابُ بِالْحَقِّ الْخ
481	انبیاء کرام پر ایمان لانا	471	تمام معانی کا جامع معنی
483	نتیجہ واضح ہوا	472	لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُولُوا وَجُوهَكُمْ الْخ الْآیۃ
484	وَأَتَى الْمَالَ سَے مراد صدقہ یا زکوٰۃ	473	شان نزول
485	رشتہ دار کو صدقہ دینا زیادہ ثواب ہے	474	طلباء کرام توجہ فرمائیں
487	نظمی اور وجوبی صدقہ کے مصرف میں فرق		یہود و نصاریٰ کے ایمان اور عبادات میں
492	کون سا وعدہ مراد ہے؟	475	خلل واقع ہونا
493	اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول سے وعدہ	475	اہل کتاب کے ایمان میں خلل
493	لوگوں سے وعدہ کرنا	475	آخرت پر ایمان لانے میں خلل
493	ایفاء عہد میں وسعت	476	ملائکہ پر ایمان لانے میں خلل
494	طلباء کرام کی توجہ کے لئے	476	اللہ کی کتابوں پر ایمان لانے میں خلل
495	یہ آیت کریمہ اصل الاحکام ہے	476	انبیاء کرام پر ایمان لانے میں خلل
495	اور اس آیت کے آخر میں	477	مال کے خرچ کرنے میں خلل
	يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ	477	نماز اور زکوٰۃ میں خلل
496	الْقِصَاصُ الْخ الْآیۃ	477	ایفاء عہد میں خلل
496	شان نزول	479	نیکی کا اعتبار چند امور پر
498	اعتراض	479	رب تعالیٰ پر ایمان میں وہم اور اس کا ازالہ
499	کون سے قتل میں قصاص ہے؟	479	رب تعالیٰ پر ایمان کیسے؟
500	قتل عمد پر مرتب ہونے والے احکام	480	یوم آخرت پر ایمان لانا
500	قتل سے گناہ پر احادیث مبارکہ	480	فرشتوں پر ایمان لانا

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
520	شان نزول	503	خودکشی کا جرم
520	حدیث پاک سے اس آیت کی منسوخیت	504	قتل عمد کا اور حکم
523	وہ وصیت جو منسوخ نہیں	507	مسئلہ
523	کثیر مال میں وصیت کرے	509	قصاص صرف تیز دھار آلہ سے لیا جائے
	حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے نزدیک	512	مقرر دیت کیا ہے؟
524	کثرت کی حد	513	مِنْ أَخِيهِ سے ایک لطیف اشارہ
525	وصیت تہائی مال سے زیادہ نہ کرے	513	فَمَنْ عُفِيَ فِي دُورِ اِحْتِمَال
528	طلباء کرام توجہ فرمائیں	514	ضیاء القرآن کی ضیاء پاشیاں
528	فائدہ عظیمہ		وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يَّأُولٰٓئِی
530	وصیت کی اہمیت	515	الْاَلْبَابِ الْخِ الْاٰیَةِ
530	وصیت کے متعلق کچھ مسائل	515	حیات عظیمہ کیسے؟
531	مسئلہ		نظام قصاص سے لڑائے جھگڑے کی
	فَمَنْ بَدَّلَهُ بَعْدَ مَا سَمِعَهُ فَإِنَّمَا	516	روک تھام
533	اِثْمُهُ الْخِ الْاٰیَةِ	516	قصاص میں زندگی کی ایک اور وجہ
535	فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوَصِّ جَنْفًا اَوْ اِثْمًا الْخِ		نبی کریم ﷺ کا اپنے آپ کو قصاص
536	ایک اور روایت ملاحظہ فرمائیں	516	کے لئے پیش کرنا
536	جَنْفًا اور اِثْمًا میں فرق	517	علامہ رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں
538	قابل توجہ مسئلہ	518	قرآن پاک کی فصاحت
538	یہ صلح کرانے والا کون ہوگا؟		كُتِبَ عَلَیْكُمْ اِذَا خَضَرَ اَحَدُكُمْ
540	زندگی و صحت میں صدقہ افضل ہے	520	الْمَوْتُ الْخِ الْاٰیَةِ

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
551	افطار کے بعد خوف ورجاء میں ہو	541	فائدہ عظیمہ
553	روزہ اور رمضان کے فضائل	541	وصیت میں ورثاء کو ضرر پہنچانے پر وعید
556	من قام رمضان		يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ
558	روزہ کا حکم علیحدہ کرنے کی وجہ	543	الصِّيَامُ الْخِ الْآيَةِ
558	روزہ کی فضیلت کی دو وجہ	543	ارکان اسلام
	ولخلوف الصائم اطيب عند الله	544	مختصر مطلب
559	من ربح المسك	544	قدرے تفصیل
561	وضاحت حدیث	545	قرآن پاک کا بیان ذیشان
563	فائدہ جلیلہ	545	پہلے لوگوں کے روزوں سے مشابہت کی وجہ
567	وشهر المواساة	546	صوم کا لغوی معنی
568	بیہودہ سوچ	547	صوم کا اصطلاحی معنی
570	واعطی کل سائل	547	روزہ کے فوائد
574	مریض کب روزہ افطار کر سکتا ہے؟	548	رمضان کے روزے کب فرض ہوئے؟
574	مسافر کب روزہ افطار کر سکتا ہے؟	548	روزہ ایمان کا چوتھا حصہ ہے
575	راقم نے 1994ء میں لکھا:	549	روزے کے تین درجے
577	مقدار سفر کی تحقیق	549	روزے میں کمال چھ چیزوں سے آئے گا
577	مسافر روزہ رکھ سکے تو روزہ رکھنا بہتر ہے	550	زبان کی حفاظت کرنا
577	مرض اور سفر کے حکم میں فرق	551	کانوں کو بچانا
578	قضاء کا حکم	551	باقی اعضاء کو گناہوں سے روکنا
578	مسافر کے روزہ کے متعلق احادیث	551	افطار کے وقت زیادہ طعام نہ کھائے

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
607	رمضان کی چاند کی شہادت	580	وضاحت حدیث
608	عید الفطر کے چاند کی شہادت		سفر میں شدید تکلیف اٹھا کر روزہ
609	رویہ ہلال	585	رکھنا منع ہے
609	وضاحت حدیث	585	ایک حدیث میں کیا خوب بیان
611	غلط فہمی کا ازالہ	587	روزے کی قضاء کے متعلق احادیث مبارکہ
	احادیث کے مختلف الفاظ کا مطلب		حیض کی حالت میں چھوٹ جانے والی
612	ایک ہے	589	نمازوں اور روزوں کا حکم
613	مندرجہ بالا بحث سے ایک اور قول رد ہو گیا	591	مختلف تراجم
	انتیس کا چاند نظر آنے پر ثواب میں کوئی	592	فدیہ کب لازم آئے گا
614	کمی نہیں	592	فدیہ کی مقدار کیا ہے؟
615	شک کے دن روزہ رکھنے کی ممانعت	593	صاع کیا ہے؟
	چاند کے بڑا ہونے یا چھوٹا ہونے کو دیکھ کر	594	فدیہ کی جگہ دوسرا شخص روزہ نہیں رکھ سکتا
616	شک نہ کرے	597	حاصل کلام یہ ہے
617	اختلاف مطالع کا مسئلہ	598	شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ
626	کون سی تکبیر پڑھی جائے؟	599	شہر کی وجہ تسمیہ
627	تکبیر کب کہے	599	رمضان کی وجہ تسمیہ
627	تکبیر کیوں کہے؟	602	مقام توجہ
628	وَلِتُكَبِّرُوا اللَّهَ بِمَعْنَى تَعْظِيمِ بَارِي تَعَالَى	603	قرآن کی وجہ تسمیہ
628	اللہ کی بڑائی میں تین چیزیں پائی جائیں	607	طلباء کرام توجہ فرمائیں
629	قول سے بڑائی بیان کرنا	607	ماہ رمضان کو پالینے کا کیا مطلب ہے؟

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
629	عمل سے بڑائی بیان کرنا	653	روزہ کی حالت میں ٹیکہ کا حکم
630	ہدایت دینے کا مطلب کیا؟	654	الاستفتاء
631	نفل روزہ کے متعلق احادیث مبارکہ		روزہ کی حالت میں آنکھ میں سرمہ لگانا
633	وضاحت حدیث	656	دوا ڈالنے کا حکم
634	یوم عرفہ کے روزہ کا حکم	659	کان اور ناک میں روزہ دار کا دوا ڈالنا
635	پیر کے دن روزہ رکھنا مسنون ہے		گرمی اور پیاس کی وجہ سے روزہ دار کا سر پر
635	شوال کے چھ روزے	659	پانی ڈالنا
636	پیر اور جمعرات کو روزہ رکھنا	660	اعتراض، جواب
637	ایام بیض کے روزے	661	وضاحت حدیث
637	جمعہ کے دن روزہ رکھنا		روزہ دار کا افطار والوں کے پاس صابر رہنا باعث
639	تین روزے بغیر معین تاریخوں کے	662	اجر و ثواب ہے
	داؤد علیہ السلام کے روزوں کو نبی کریم ﷺ	664	وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ
640	نے پسند فرمایا	664	شان نزول
643	جن دونوں میں روزہ رکھنا منع ہے	666	ما قبل سے ربط
	بھول کر کھانے اور پینے اور جماع سے روزہ	667	اللہ تعالیٰ کے قریب ہونے کا کیا مطلب؟
648	نہیں ٹوٹتا	672	دعا کرنے والے کے لئے شرائط
	عمداً (جان بوجھ کر) روزہ توڑنے سے قضاء	673	شروط دعائے سات ہیں
649	اور کفارہ لازم آئے گا	674	فائدہ
650	روزہ کی حالت میں قے کا حکم	676	اوقات دعاء
651	روزہ کی حالت میں خون نکلوانے کا حکم	678	دعا کے متعلق احادیث مبارکہ

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
733	رات سے مراد کیا ہے	680	وضاحت حدیث
734	رات روزہ کے حکم سے خارج ہے	694	اعتراض، جواب
734	روزہ جلدی افطار کرے	697	وضاحت حدیث
736	وضاحت حدیث	706	لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ
737	راقم کا موقف		أَحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَى
739	صوم وصال کی ممانعت	707	نِسَائِكُمُ الْخِ الْآيَةِ
741	اعتراض، جواب	708	شان نزول
745	اعتکاف کے مسائل و فضائل	711	دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں
745	اعتکاف واجب	711	عجیب نکتہ
745	اعتکاف مستحب	716	اعتراض و جواب
745	اعتکاف سنہ	718	عزل، برتھ کنٹرول، خاندانی منصوبہ بندی
747	مسئلہ	718	صحابہ کرام کے عزل کی وجوہ
748	وضاحت حدیث	720	عزل جائز ہے لیکن مکروہ تنزیہی
751	معتکف کو معتکف کہنے کی وجہ	720	استقاط حمل کی وجوہ
757	وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ الْخ	721	بلا عذر استقاط حمل نا جائز
757	شان نزول	725	البتہ ایک احتیاط کی سخت ضرورت ہے
759	باطل سے مراد کیا ہے؟	727	وضاحت حدیث
	باطل طریقے سے مال کھانے پر مختلف	729	علمی بحث کثیر فوائد پر مشتمل
761	ارشادات	730	وضاحت حدیث
761	حلال و حرام کی پہچان میں ایک شاندار ضابطہ	732	دینی طلباء کرام کی توجہ کے لئے

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
782	نظام شمسی اور قمری	762	معدنیات کا حکم
	وَلَيْسَ الْبِرُّ بِأَنْ تَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ	762	نباتات کا حکم
785	ظُهُورِهَا الْخِ الْآيَةِ	763	حیوانات کا حکم
785	شان نزول	763	حرام طریقہ سے حاصل کیا ہوا مال حرام ہے
788	حمس کا مطلب کیا ہے؟	764	فضیلت حلال اور مذمت حرام بیان میں
789	دینی طلباء کرام کی توجہ کے لئے	769	امام اعظم رحمہ اللہ کے تقویٰ کی شاندار مثال
	شریعت کے خلاف کوئی کام نیکی کا	771	حکایت
789	نہیں ہو سکتا	772	آیہ کریمہ میں لطیف اشارہ
790	کیا خوب قانون مقرر فرمایا		يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْاَهْلَةِ قُلْ هِيَ
790	بیان کردہ آیات میں لطیف اشارات	773	مَوَاقِيتُ الْخِ الْآيَةِ
793	ایک انوکھی تفسیر	773	شان نزول
793	راقم نے اس تفسیر کو انوکھا کیوں قرار دیا؟	773	ہلال کو ہلال کہنے کی وجہ
796	حدیث پاک پر محدثین کے اقوال	777	دقت و مدت و زمان میں فرق
797	صحیح قول بطور محاکمہ	778	گزشتہ سے پیوستہ
	وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ	779	رویت ہلال سے متعلق چند مسائل
799	يُقَاتِلُونَكُمْ الْخِ الْآيَةِ	780	چاند کے نام حالتوں کے لحاظ پر
799	ما قبل سے تعلق	780	سال، مہینہ، دن اور ساعت کی بحث
799	شان نزول	780	سال میں چار موسم
801	راقم کا موقف	781	بعض اہل علم کا قول
	وَأَقْتُلُوهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوهُمْ	782	محشی کا محاکمہ
802	وَأَخْرِجُوهُمْ الْخِ الْآيَةِ		

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
820	جہاد میں حکم	802	مختصر وضاحت
820	جہاد فرض عین کب ہے؟	803	وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ
822	جہاد کے لئے چندہ جمع کرنا	805	فَإِنْ أَنْتَهَوْا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ
822	تنبیہ	805	دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں
823	خصوصی مقام توجہ	805	وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ
824	مسلمانوں کا کفار سے صلح کرنا	806	الشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ
824	دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں	806	مختصر وضاحت
824	پھر سے مسئلہ کی طرف توجہ	808	آیات جہاد کے متعلق تفصیلی بحث
	کفار اگر وعدہ کا پاس نہ کریں تو مسلمان	808	وضاحت حدیث
825	بھی وعدہ توڑ دیں	812	وضاحت حدیث
825	اسلامی جہاد اور کفار کی جنگ میں فرق	814	جہاد مذہبی یا فرض ہوا
826	عورتوں کے قتل کا حکم	814	پہلا، دوسرا، تیسرا حکم
826	بچوں کو قتل نہ کیا جائے	815	چوتھا، پانچواں، چھٹا حکم
827	راہبوں کو قتل کیا جائے	816	ساتواں حکم
827	معدور لوگوں کو قتل نہ کیا جائے	816	مقام توجہ
827	بوڑھوں کو قتل نہ کیا جائے	816	جہاد فرض کفایہ
828	معتوہ (نیم پاگل) کو قتل نہ کیا جائے	817	ماں، باپ کی خدمت اور جہاد
828	خادم کو قتل نہ کیا جائے	817	دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں
829	کفار کے اعضاء نہ کاٹے جائیں	819	فائدہ
829	غدر سے منع فرمایا		عورت اور غلام اور معدور لوگوں کا

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
852	گناہوں میں مبتلا ہو کر ہلاکت میں نہ پڑو	829	جنگی چال بازی جائز ہے
	رب تعالیٰ کی رحمت سے ناامید ہو کر اپنے	830	کفار کی جنگ
853	آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو	831	دہشت گرد کون؟
853	مال کم سمجھ کر، خرچ نہ کر کے ہلاکت میں نہ پڑو	832	مسلمان کفار سے انتقام لیں
	اپنی اولاد کی فکر میں مال خرچ نہ کر کے	833	جہاد قیامت تک جاری رہے گا
854	ہلاکت میں نہ پڑو	834	جہاد اصغر اور جہاد اکبر
854	ثواب سے محروم ہو کر ہلاکت میں نہ پڑو	837	کون سے جہاد افضل ہے؟
	حرام مال خرچ کر کے اپنے آپ کو	837	وضاحت حدیث
854	ہلاکت میں نہ ڈالو	839	مجاہدین کی ازواج کی حرمت
	جنگ میں بلا خطر کو د پڑنا اس آیت کا	840	مجاہد کی فضیلت
855	مصدق نہیں	843	مسئلہ
857	حضرت امام محمد رحمہ اللہ کی خوبصورت تفصیل		وَأَنْفِقُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا تُلْقُوا
859	احسان کا دوسرا معنی یہ ہے	844	بِأَيْدِيكُمْ الْخِ الْآيَةِ
860	احسان معاملات پر احادیث مبارکہ	844	ما قبل سے رابطہ
861	مخالفین جہاد کے اعتراضات	845	شان نزول
862	اسلام چند صورتوں میں جہاد کا حکم دیتا ہے	846	فائدہ جلیلہ
	یہود و نصاریٰ اپنے گریبان میں	848	کیا خوب حکمت
863	جھانک کر دیکھیں	849	دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں
		849	”تھلکتہ“ کا بہت وسیع مفہوم ہے
		851	خرچ میں اعتدال سے کام لینا

پیش لفظ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلَى أَشْرَفِ الْأَنْبِيَاءِ وَالْمُرْسَلِينَ
 أما بعد ! خالق کائنات جل جلالہ نے اپنے پیارے حبیب ﷺ کی نسبت جلیلہ کا صدقہ اس
 امت کو جو اب دی پیغام قرآن مجید فرقان حمید کی صورت میں انعام فرمایا وہ بے مثال کلام ہے۔ یہ عظیم معجزہ
 ہونے کے ساتھ ساتھ علم و معرفت کا بحرِ خار ہے۔ اس بحر بے کنار میں جس نے بھی نیک نیتی سے غوطہ
 لگایا نئے موتی نکال کر لایا۔ اس کے دُرہائے یگانہ غیر متناہی ہیں۔ نہ ختم ہونیوالے اس سلسلہ کو امت
 مسلمہ کے کالمین نے ہر دور میں اپنائے رکھا اور آئندہ آئیوالی نسلوں کے لئے حکمت و دانش کے عظیم باب
 رقم فرماتے رہے۔

بِسَابِ مَدِينَةِ الْعِلْمِ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عظمت قرآنی اور اس کے رموز و دقائق کے
 دُرہائے بے بہا اور نہ ختم ہونے والی حقیقتوں کے متعلق مرفوعاً روایت فرمائی ہے۔

” قَالَ اِنِّي سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ اَلَا اِنَّهَا سَتَكُونُ فِتْنَةٌ قُلْتُ
 مَا الْمَخْرَجُ مِنْهَا يَا رَسُولَ اللَّهِ ؟ قَالَ كِتَابُ اللَّهِ ، فِيهِ نَبَأُ مَا قَبْلَكُمْ و
 خَيْرُ مَا بَعْدَكُمْ و حَكَمُ مَا بَيْنَكُمْ ، هُوَ الْفَصْلُ لَيْسَ بِالْهَزْلِ ، مَنْ تَرَكَهُ
 مَنْ جَبَارَ قَصَمَهُ اللَّهُ وَمَنْ اتَّبَعَ الْهُدَى فِي غَيْرِهِ اضَلَّهُ اللَّهُ ، وَهُوَ حَبْلُ
 اللَّهِ الْمَتِينِ ، وَهُوَ الذِّكْرُ الْحَكِيمُ ، وَهُوَ الصِّرَاطُ الْمُسْتَقِيمُ ، هُوَ الَّذِي
 لَا تَزِيغُ بِهِ الْأَهْوَاءُ وَلَا تَلْبِسُ بِهِ الْأَلْسَنَةُ ، وَلَا يَشْبَعُ مِنْهُ الْعُلَمَاءُ ،
 وَلَا يَخْلُقُ عَنْ كَثْرَةِ الرَّدِّ ، وَلَا يَنْقُضِي عَجَائِبُهُ هُوَ الَّذِي لَمْ تَنْتَبِهْ الْجَنُّ
 اِذَا سَمِعَتْهُ حَتَّى قَالُوا اِنَّا سَمِعْنَا قُرْآنًا عَجَبًا يَهْدِي إِلَى الرُّشْدِ فَامَنَّا بِهِ مِنْ
 قَبْلِ بَعْثِكَ بِرَسُولٍ أَعْلَمُ ، وَمَنْ عَمِلَ بِهِ اَجَرَ ، وَمَنْ حَكَمَ بِهِ عَدَلَ ، وَمَنْ عَادَ إِلَيْهِ
 هَدَى إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ .“

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ خبردار میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے آپ
 فرماتے تھے خبردار بے شک یہ قصہ غنقریب فتنہ بنے گا۔ میں نے عرض کی یا رسول اللہ

اس کے نکلنے کی جگہ کوئی ہوگی۔ آپ نے فرمایا کہ اللہ کی کتاب؛ کیونکہ اس میں ہم سے پہلے اور بعد والی امتوں کی خبریں ہیں۔ اور تمہارے درمیان جو حوادث ہیں ان کا بھی فیصلہ ہے۔ یہ قرآن حق و باطل کے درمیان فرق کرنے والا ہے۔ جس نے اس کو کسی جبار کی وجہ سے چھوڑ دیا۔ اللہ تعالیٰ اس کو توڑ دے گا۔ اور جس نے اس کے غیر میں ہدایت کو تلاش کیا اللہ نے اس کو گمراہ کر دیا۔ کیونکہ یہ اللہ کی مضبوطی ہے۔ یہ ذکر، حکم اور صراط مستقیم ہے۔ یہ وہ کلام ہے کہ اہل ہواء اس کی تبدیلی پر قادر نہیں ہیں۔ اس کی وجہ سے زبانوں پر التباس نہیں آتا۔ اس سے علماء سیر نہیں ہوتے۔ اس کی قرأت کی تکرار بار بار لوٹاتے، قرأت کی لذت دوسروں سے سننے کی وجہ سے زائل نہیں ہوتی، کیونکہ اس کے عجائب ختم نہیں ہوتے، یہ وہ چیز ہے کہ جنوں نے جب اس کو سنا تو تو اس پر بلا توقف کہا کہ: ہم نے تعجب میں ڈالنے والے قرآن کو سنا ہے، جو بھلائی کی طرف ہدایت دیتا ہے، ہم اس پر ایمان لائے۔ جس نے اس کے ساتھ کلام کیا وہ سچا ہوا، اور جس نے اس پر عمل کیا اس کو اجر دیا گیا، اور جس نے اس کے ساتھ فیصلہ کیا اس نے عدل کیا، جس نے اس کی طرف بلایا اس کو صراط مستقیم کی طرف ہدایت دی گئی۔

حضرت امام شعرانی اپنی مشہور زمانہ تصنیف ”الیواقیت والجوہر“ میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کا وہ ارشاد گرامی نقل کرتے ہیں جس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر سورہ فاتحہ شریف کی تفسیر لکھوں تو اس ایک چھوٹی سورت کے رموز کی تفسیر کا حجم اونٹوں کا بوجھ بن جائے مگر پھر بھی فاتحہ شریف کے رموز باقی رہیں گے۔

تاہم جس نے بھی اپنی فکر و دانش کو غالب کر کے قرآن مجید کے مفاہیم کو بیان کرنے کی کوشش کی اس کیلئے ”من قال فی القرآن براہ فقد اخطا“ کے مصداق خائب و خاسر ہونا ہی نصیب بنا ہے۔ استاذ العلماء حضرت مولانا عبدالرزاق چشتی بھٹرا الوی کہنہ مشق، نہایت محنتی اور فاضل مدرس ہونے کے ساتھ ساتھ زود نویس اور سہل نگاری کے بھی جامع ہیں۔ آپ ان خوش نصیبوں میں سے ہیں جنہیں قسام ازل نے پیارے حبیب حبیب ﷺ کی نسبت صدقہ خدمت دین کی سعادت رفیق

فرمائی ہے۔

اللہ تعالیٰ جل مجدہ نے علامہ موصوف کو اسلام کی خدمت اور بالخصوص قرآن و سنت کے مفہیم اور مطالب عالیہ کو قلم و قرطاس کے ذریعہ سہل انداز میں پیش کر کے عامۃ الناس کو بہرہ مند کرنے کا بہترین ملکہ ودیعت فرمایا ہے۔

حضرت مولانا فطری اور طبعی طور پر تدریسی شعبے سے متعلق ہیں۔ علمی خانوادے کا چشم و چراغ ہونے کے ناطے معقولات و منقولات میں ید طولی رکھتے ہیں۔ زندگی کا بیشتر حصہ اسی نہج پر راہ نور دی کرتے گزار دی ہے۔ آپ کے تلامذہ میں سے کئی محقق علماء اپنے علم و تحقیق کا لوہا منوا چکے ہیں۔

درس و تدریس سے متعلق آدمی کے لئے آسان پیرائے میں لکھنا کافی مشکل کام ہوتا ہے؛ کیونکہ ایسے شخص کو..... جو ہمہ وقت فنی اصطلاحات اور علمی محاورات بولنے اور کہنے کا عادی ہو..... مشکل تراکیب کو ترک کرنا قدرے دشوار ہوتا ہے۔ مگر مولانا موصوف اپنی تحریر میں پختگی زود نویسی کے ساتھ عامۃ الناس کے فہم و ادراک کا بھی پورا پورا خیال رکھتے ہیں۔

آپ کے قلم سے کئی علمی شہ پارے منصف شہود پر آچکے ہیں، اہل علم اور قدردان عامۃ الناس کے ہاں قبولیت کا شرف پاچکے ہیں۔ میرے خیال میں آپ کی تصنیفات میں بالخصوص نصابی کتب کی شروحات و حواشی آپ کا بہت ہی وقیع کارنامہ ہے۔ اردو خواں طبقہ کے لئے یاد درمیانے درجے کے خطباء کے لئے اردو کتابیں ہی بڑا سرمایہ ہیں۔ ایسی کتابوں کی مقبولیت مصنف کے لئے حوصلہ افزائی کا باعث ضرور بنتی ہے لیکن وہ پائیدار فائدہ جس سے قابل علماء و مدرسین پیدا ہوتے ہیں وہ درسی کتابوں کا فہم و ادراک ہی ہے۔

مولانا موصوف کی تصانیف میں عام قاری اور زیر تعلیم طلباء کے لئے ہی نہیں بلکہ ایک استاد کی سہولت کے لئے کافی علمی مواد موجود ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی عربی تصنیفات کو اہل علم کے ہاں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ چند سال پہلے مجھے ساؤتھ افریقہ جانے کا اتفاق ہوا۔ ایک علمی مجلس میں انڈیا سے تشریف لائے ہوئے ایک عالم دین سے ملاقات ہوئی۔ جب انہیں یہ علم ہوا کہ میرا تعلق

جامعہ رضویہ ضیاء العلوم راولپنڈی پاکستان سے ہے تو بڑی خوشی کا اظہار فرمایا اور بتایا کہ حضرت مولانا عبدالرزاق چشتی بھترالوی کا نور الایضاح پر عربی حاشیہ ہمارے ہاں بڑا مقبول ہے۔ اس حاشیہ و توضیح کو اہل علم نے بڑا پسند کیا ہے۔

حضرت علامہ بھترالوی کا انداز تحریر انتہائی سادہ اور عام فہم ہے۔ آپ قلم برداشتہ لکھنے کے عادی ہیں۔ ادبی مویشگافیوں کی طرف کم ہی توجہ دیتے ہیں۔ تاہم مسائل و مفاہیم کا تذکرہ کرتے وقت اسلاف کرام کا تتبع کرتے ہوئے کوئی پہلو تشنہ چھوڑنے کو عار سمجھتے ہیں۔ آپ کی تحریر کو پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ درس نظامی کے باذوق طلباء کو دور اسلاف کا کوئی عظیم مدرس سبق پڑھا رہا ہے اور کتاب کی عبارت کے مالھا اور ماعلیہا سے کوئی بھی نکتہ چھوڑنا نہیں چاہتا۔

حضرت مولانا ایک طویل مدت تک جامعہ رضویہ ضیاء العلوم کے تدریسی شعبہ میں عظیم الشان خدمات انجام دیتے رہے ہیں۔ اس طویل عرصہ میں ہم نے آپ کو انتہائی محبت اور شفیق پایا۔ آپ کی ہمہ جہت شخصیت میں اور خوبیوں کے علاوہ ایک خوبی یہ بھی ہے کہ آپ وقت کی قدر کو جانتے ہیں۔ اور ضیاع وقت اور اسکے نقصانات کا انہیں بھرپور احساس ہے۔ اس لئے اپنا قیمتی وقت ضائع نہیں کرتے۔ تدریسی خدمت بھی بہت محنت اور محبت سے انجام دیتے ہیں، بلکہ طلباء پر شفقت کرتے ہوئے ادارہ کے مقررہ تعلیمی وقت سے زائد اضافی اسباق پڑھاتے ہیں۔ یہ استاد کی شفقت اور اپنے تلامذہ سے انتہائی محبت کی علامت ہے کہ زانوائے تلمذ طے کرنے والے طلباء کی تعلیم و تربیت شفقت و محبت سے انجام دے۔

زیر نظر تصنیف قرآن مجید فرقان حمید کی تفسیر کا مقدمہ اور سورۃ فاتحہ کی تفسیر جو کہ حضرت مولانا کی تدریسی و علمی تحقیقات کا پرتو اور مظہر ہے۔ اگرچہ میں اس کا پورے طور پر مطالعہ نہیں کر پایا تاہم چند ایک مقامات سے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ دیکھ اور پڑھ کر دل سے دعا نکلتی ہے۔ اللہم زد فزد۔

تفسیر کو دیکھ کر جوتائثر قائم ہوا ہے وہ یہ کہ حضرت علامہ کی زندگی درس و تدریس کرتے گزری ہے۔ طلباء و علماء کو پڑھانے، سمجھانے، ان کے ذوق طبع کے مطابق انداز بیاں اور حسب استعداد طرز تکلم اپنانے کا سلیقہ و مہارت ہے۔ اور دوسری طرف فقہی مسائل و معاملات سے متعلق فتاویٰ کی ذمہ داری

بھی ایک عرصہ سے نباہ رہے ہیں جس کے باعث عامۃ الناس کو درپیش مسائل اور ان کے افہام و تفہیم کا تجربہ بھی رکھتے ہیں۔ بایں ہمہ دارالحکومت اسلام آباد میں امامت و خطابت کی سرکاری ذمہ داری کے باعث دور جدید کی ضروریات، جدت پسند طبقہ کی مذہبی و فکری ترجیحات و رجحانات اور ذہنی ارتقاء و تنزل سے بخوبی واقف ہیں۔ لہذا آپ کی تحریر میں ہر طبقہ کے لوگوں کی علمی تشفی کا ساماں ہے۔ البتہ آپ کی حیات پر تدریسی رنگ غالب ہونے کی وجہ سے آپ کی اس تصنیف میں بھی تشریح و توضیحات کے ضمن میں یہی تدریسی ذوق غالب نظر آتا ہے۔

اسلاف کرام کی محبت و مودت میں راسخ ہیں۔ اختلاف آراء کی بھول بھلیوں میں بھی اسلاف کرام کی تحقیقات انیقہ سے اکتساب فیض کرنے کو اپنے لئے سعادت گردانتے ہیں۔ انتہائی کھلی طبیعت کے مالک ہیں۔ جی میں آئی بات کو کہہ گزرنے میں باک نہیں رکھتے۔

حضرت علامہ کا تعلق جس علمی خانوادے سے ہے وہ اپنی عظیم تاریخ اور روشن ماضی کے اعتبار سے انتہائی اعلیٰ اقدار کا حامل ہے۔ عصر حاضر کی ہمہ ہی میں کئی ایک سلف صالحین کے راہ حق کو خیر باد کہہ چکے ہیں مگر آپ کے پائے ثبات میں کوئی لغزش نہ آئی۔ یہ آپ کی ثابت قدمی کا ہی مظہر ہے کہ تنہا آپ نے تحریری میدان میں وہ کام کر دکھایا جو ایک پوری جماعت کے لئے بھی مشکل نظر آتا ہے۔

حق گوئی و بے باکی کے ساتھ ساتھ مولانا جب بھی اپنے مذہبی و مسلکی مخالفین کو مخاطب کرتے ہیں یا کسی اختلافی مسئلہ پر اظہار خیال کرتے ہیں تو اسلامی و اخلاقی اقدار کا بھرپور خیال رکھتے ہوئے انتہائی شستہ انداز میں مخاطب کرتے ہیں۔ اور اصلاح و تبلیغ کے جذبہ سے سرشار ہو کر مخالفین اور ان کے پیروکاروں کو راہ خطر سے محفوظ کرنے کا تہیہ کئے نظر آتے ہیں۔

دعا: اے ارحم الراحمین! اے اجیب دعوة الداع اذا دعان کی شان والے رب! تیرے جود و سخا کے مظہر، تیری رحمتوں کی بھرن عطا کرنے والے حبیب لبیب ﷺ نے تیری یہ شان ہمیں بتائی ہے کہ تو اپنے منکوں کو خالی دامن نہیں لوٹاتا۔ اپنے سائل کو خالی ہاتھ لوٹاتے ہوئے تجھے حیا آتی ہے۔

الہی! تیری اسی کریمی کا واسطہ دے کر التجا کرتا ہوں کہ میری اس دعا کو شرف قبولیت سے نواز!

”مولائے کریم حضرت مولانا کے علم و عمل میں برکتیں عطا فرما۔ ان کی اس تصنیف کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں اپنی خصوصی نصرت عطا فرما۔ ان کے فیضان علمی کو اور زیادہ وسعتیں دے۔ ان کی ذریت نسبی و حبسی کو ان کا حقیقی متبع بنا۔ ہم سب کو اپنے پیارے حبیب ﷺ کی حقیقی محبت سے آشنا فرما اور اسی میں زندہ رکھ اور اسی محبت میں ہمارا خاتمہ فرما۔“

ایں دعائے من و از جملہ جہاں آمین باد

ان دعوات صالحہ اور ہدیہ تحسین کے ساتھ حضرت مولانا موصوف بلکہ ہر پائیدار، نفع بخش اور محنت طلب کام میں مصروف بزرگ کو مشورہ پیش کرتا ہوں کہ کئی دفعہ معاصرانہ چشمک سے پیدا ہونے والے مرض تحاسد یا نا پختہ اذہان کی کج بحثی فروغی وغیر ضروری ابحاث کے گرداب میں پھنسا کر دانستہ یا نادانستہ طور پر مقاصد عالیہ کی راہ سے برگشتہ کر لیتے ہیں۔ مقصد رفیع کی خاطر ان سے تغافل برتنا ضروری ہے وگرنہ اصلی مقصود پیش نظر رہنے کی بجائے ”شخصیت“ مقصد بن جاتی ہے۔ لہذا خیر خواہی اسی میں ہے کہ ایسے جذبات انگیز موقع پر نہایت صبر و تحمل سے کام لیتے ہوئے ”والکاظمین الغیظ والعافین عن الناس“ اور ”اذا خاطبهم الجاهلون قالوا سلاما“ کو مشعل راہ بنایا جائے۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ محمد و علی آلہ واصحابہ اجمعین

ابوالخیر حسین الدین غفرلہ (مہتمم و شیخ الحدیث)

جامعہ رضویہ ضیاء العلوم راولپنڈی پاکستان

﴿سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلَّهُمْ عَن قِبَلِهِمُ الَّتِي
كَانُوا عَلَيْهَا قُلٌ لِّلَّهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ يَهْدِي مَنْ يَّشَاءُ
إِلَى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ﴾

- (۱) ”اب کہیں گے بیوقوف لوگ کس نے پھیر دیا مسلمانوں کو ان کے اس قبلہ سے جس پر تھے تم
فرما دو کہ پورپ پچھتم سب اللہ ہی کا ہے جسے چاہے سیدھی راہ چلاتا ہے۔“
- (۲) ”عنقریب کہیں گے بیوقوف لوگ کس نے پھیر دیا ان کو ان کے اس قبلہ سے جس پر وہ تھے تم
فرما دو اللہ کے لئے ہی ہے مشرق اور مغرب ہدایت دیتا ہے جسے چاہے سیدھی راہ کی۔“

شان نزول: نبی کریم ﷺ جب مکہ مکرمہ میں تھے تو بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز ادا
فرماتے لیکن کعبہ شریف بھی آپ کے سامنے ہوتا۔ لیکن مدینہ طیبہ میں جب آپ تشریف لائے تو
بیت المقدس ہی کی طرف متوجہ ہونے کا رب تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا۔ مدینہ طیبہ میں چونکہ کعبہ شریف
جنوبی جانب ہے اور بیت المقدس شمالی جانب ہے وہاں ممکن نہ تھا کہ بیت المقدس کی جانب توجہ کرنے
سے کعبہ شریف بھی سامنے ہو۔

سولہ سترہ ماہ تو آپ بیت المقدس کی طرف متوجہ ہو کر نماز ادا فرماتے رہے لیکن آپ کی دلی تمنا
تھی کہ جدا مجد حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قبلہ کعبہ شریف ہی ہمارا قبلہ بھی ہو جائے تو آپ کو کعبہ شریف
کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرنے کا حکم دے دیا گیا۔

لیکن اللہ تعالیٰ نے تحویل قبلہ سے پہلے ہی اس آیت کریمہ کو نازل فرما کر نبی کریم ﷺ کو تسلی دے
دی کہ یہود، منافقین اور مشرکین جو بیوقوف لوگ ہیں وہ آپ کو طعنہ دیں گے کہ قبلہ سے تمہیں کس چیز
نے پھیر دیا ہے لیکن آپ اطمینان قلب سے ان کو جواب دینا کہ رب تعالیٰ نے ہی بیت المقدس کو قبلہ
بنایا تھا اسی نے اب کعبہ کو قبلہ بنا دیا ہے وہی ہر چیز کا مالک ہے، وہی مشرق و مغرب کا مالک ہے، وہ جس
سمت کو چاہے قبلہ بنا دے، ہم تو صرف اس کے حکم کو تسلیم کرنے والے ہیں اس کی ذات پر کوئی اعتراض

کرنے والے نہیں۔

﴿سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ﴾ ”عنقریب کہیں گے بے وقوف لوگ“

ان الفاظ مبارکہ میں دو احتمال ہیں ایک یہ کہ اگرچہ ﴿سَيَقُولُ﴾ مستقبل کا صیغہ ہے لیکن ماضی کے معنی میں استعمال ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے ”الرجل يعمل عملا فيطعن فيه بعض اعدائه“ فلاں شخص کے کام پر اس کے دشمنوں نے اسے طعنہ دیا۔ اس قول کے مطابق قبلہ کے بدل جانے اور بیوقوفوں کے طعنہ کے بعد اس آیت کا نزول ہوا۔ مجازی طور پر معنی یہ ہوگا ”بے وقوف لوگوں نے کہا ان کو قبلہ سے کس چیز نے پھیر دیا“۔

لیکن دوسرا احتمال قوی ہے راقم نے بھی اس کے مطابق شان نزول ذکر کیا ہے دوسرا احتمال یہ ہے ”ان الله تعالى اخبر عنهم قبل ان ذكروا هذا الكلام انهم سيدكرونه“

کہ بیشک اللہ تعالیٰ نے اس آیت کریمہ کو پہلے نازل کر کے یہ خبر دے دی کہ وہ اس قسم کا کلام کریں گے یہی احتمال قوی ہے اس میں کئی فوائد پائے گئے ہیں۔

پہلا فائدہ: جب نبی کریم ﷺ نے واقعہ سے پہلے خبر دے دی کہ بے وقوف یہ کہیں گے انہوں نے وہی کہا ”كان هذا اخبارا عن الغيب فيكون معجزا“ تو یہ نبی کریم ﷺ کی غیبی خبر ہو گئی جو آپ کا معجزہ ہے سبحان اللہ علامہ رازی رحمہ اللہ نے نبی کریم ﷺ کے علم غیب کو آپ کا معجزہ کہا ہے۔

پھر یہ بھی واضح کر دیا کہ رب تعالیٰ نے اس آیت کریمہ کو نازل کر کے آپ کو پہلے علم عطا کر دیا جو آپ کا علم غیب ہے اسی سے ان لوگوں کا رد ہو گیا جو کہتے ہیں کہ جو رب تعالیٰ بتا دے وہ غیب نہیں رہتا کاش کہ رب تعالیٰ ان کو علم عطا فرما دے اور حق سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔

دوسرا فائدہ: رب تعالیٰ نے جب پہلے ہی آپ کو بتا دیا کہ بیوقوف اس قسم کا کلام کریں گے تو نبی کریم ﷺ کو علم حاصل ہو گیا جب آپ نے ان سے وہی سنا جس کی آپ کو خبر دے دی گئی تھی۔ ”فانه يكون تأذيه من هذا الكلام اقل مما اذا سمعه منهم اولا“ تو آپ کو سن کر زیادہ تکلیف نہ ہوئی اگر آپ ان سے اچانک سنتے تو یقیناً آپ کو بہت تکلیف ہوتی۔

تیسرا فائدہ: اللہ تعالیٰ نے ان کے کلام کرنے سے پہلے ہی آپ کو خبر دے دی اور ساتھ ساتھ

جواب بھی ذکر کر دیا تو جب انہوں نے طعن زنی کی تو حضور ﷺ نے ان کو فوراً جواب دے دیا۔ نبی کریم ﷺ چونکہ رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی کے منتظر رہتے تھے اس لئے پہلے بتا دینا بہتر تھا نسبت اس کے کہ آپ جواب کا انتظار فرماتے کہ رب تعالیٰ کیا حکم فرماتا ہے۔ (از کبیر)

﴿السُّفَهَاءُ﴾ کا ذکر پہلے ﴿كَمَا آمَنَ السُّفَهَاءُ﴾ کی وضاحت میں ہو چکا ہے تاہم ”فان من لا يميز بين ماله وعليه“ جو شخص نفع نقصان میں فرق نہ کر سکے وہ بیوقوف ہے ”ويعدل عن طريق منفعه الى ما يضره“ جو شخص نفع مند چیزوں کو چھوڑ کر نقصان دہ چیزوں کے درپے ہو جائے وہ بیوقوف ہے ”يوصف بالخفة والسفه“ کم عقل کو سفیہ (بے وقوف) کہا جاتا ہے۔

اور یہ بھی خیال رکھا جائے کہ جو شخص دنیا کے معاملہ میں نقصان دہ راہ کو اختیار کرے جب اسے سفیہ (بیوقوف) کہا جاتا ہے تو یقیناً دین میں نقصان دہ راہ کو اختیار کرنا بہت بڑی بیوقوفی ہے کیونکہ ”ولا شك ان الخطأ في باب الدين اعظم مضره منه في باب الدنيا“ اس میں کوئی شک نہیں کہ دین میں غلط راہ کو اختیار کرنا بہت زیادہ نقصان دہ ہے نسبت دنیا میں غلط راہ پر چلنے کے۔ (از کبیر)

السُّفَهَاءُ سے مراد کون لوگ ہیں؟

”قال ابن عباس ومجاهد هم اليهود“ حضرت ابن عباس اور مجاہد رضی اللہ عنہم نے کہا اس سے مراد یہود ہیں اس لئے کہ جب نبی کریم ﷺ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرتے تھے تو وہ لوگ یہ امید لگائے بیٹھے تھے کہ ابھی یہ نبی ہمارے قبلہ کی موافقت کر رہے ہیں آہستہ آہستہ مکمل طور پر ہمارے دین کی تابعداری کریں گے جب قبلہ شریف کے تبدیل کرنے کا حکم نافذ ہو گیا تو ان کو غم لاحق ہو گیا نبی کریم ﷺ سے اپنے آپ کو مکمل دور سمجھنے لگ گئے ان بیوقوفوں نے تحویل قبلہ پر ہی اعتراض کرنا شروع کر دیا جس کی خبر رب تعالیٰ نے پہلے ہی دے دی۔

وہ کہنے لگے کہ یہ شخص اپنے آباء کے دین کی طرف لوٹ گیا اور ان کے دین کا مشتاق ہو گیا اگر ہمارے قبلہ پر ثابت رہتا تو ہمیں معلوم ہوتا ”انه الرسول المنتظر المبشر به في التوراة“ کہ بیشک یہ وہی رسول ہے جس کی انتظار کی جا رہی تھی اور جس کی آمد کی بشارت کی خبر تورات میں دی گئی۔

”وقال ابن عباس والبراء بن عازب والحسن والاصم انهم مشركوا العرب“

حضرت ابن عباس اور براء بن عازب اور اصم رضی اللہ عنہم کا ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد مشرکین عرب ہیں۔ اس لئے کہ جب نبی کریم ﷺ مکہ مکرمہ میں رہتے ہوئے بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرتے تو وہ لوگ اسے ناپسند کرتے اور اس سے تکلیف محسوس کرتے اور جب مدینہ طیبہ میں بیت المقدس سے پھر کر کعبہ شریف کی طرف متوجہ ہونے کا حکم ہوا تو وہ کہنے لگے کہ اب محمد ہمارے دین کی طرف لوٹ آئے ہیں۔

”ولو ثبت عليه لكان اولی به“ اگر وہ اس پر ثابت رہے تو یہ ان کے لئے بہتر ہے۔

لیکن وہ بیوقوف بھی یہ کہہ رہے تھے کہ پہلے بیت المقدس کی طرف منہ کیوں کیا تھا اب کعبہ کی طرف منہ کیوں کیا ہے اس طرح کے ان کے لغویات کی خبر رب تعالیٰ نے پہلے ہی دے دی ”وَاللّٰهُمَّ الْمُنَافِقُونَ وَهُوَ قَوْلُ السَّادِي“ اور تیسرا قول اس میں سدی رحمہ اللہ کا ہے کہ اس سے مراد منافقین ہیں وہ استہزاء (مزاح) کے طور پر قبلہ کے تبدیل کرنے پر اعتراض کرتے تھے کیونکہ وہ قبلہ کے بدلنے کی حکمت سے بے خبر تھے وہ کہہ رہے تھے کہ یہ قبلہ کی تبدیلی بے مقصد ہے اور فقط رائے اور خواہشات پر مبنی ہے اس آیت کریمہ میں بھی ﴿السُّفَهَاءُ﴾ سے مراد منافقین ہی ہیں اور ﴿آلَا إِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَاءُ وَلَكِنْ لَا يَعْلَمُونَ﴾ میں بھی منافقین کو ہی بیوقوف کہا گیا ہے۔

تمام اقوال کا جامع قول:

”ورابعها انه يدخل فيه الكل“ چوتھا قول یہ ہے کہ اس آیت کریمہ میں ﴿السُّفَهَاءُ﴾ سے مراد یہود و مشرکین اور منافقین تمام ہی مراد ہیں یہی قول زیادہ بہتر ہے کیونکہ اس میں تمام اقوال سمٹ کر آ جاتے ہیں اور وجہ یہ بھی واضح ہے کہ اس مقام میں سیاق و سباق (پہلے اور بعد کلام) سے بھی کوئی تخصیص نہیں اس لئے ﴿السُّفَهَاءُ﴾ سے مراد عموم ہے اور اس پر الف لام بھی استغراقی ہے جو عموم پر دلالت کر رہا ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ”فلا كافر الا سفيه“ کوئی کافر ایسا نہیں جو بے وقوف نہ ہو ہر کافر ہی بیوقوف ہے اور رب تعالیٰ نے ملت ابراہیمی سے اعراض کرنے والے تمام

لوگوں کو ہی بے وقوف کہا ہے۔

﴿وَمَنْ يَرْغَبُ عَنْ مِلَّةِ إِبْرَاهِيمَ إِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهُ﴾

لہذا اس آیت میں ”فوجب ان يتناول الكل“ ضروری ہے کہ السفهاء سے مراد یہود مشرکین اور منافقین تمام ہی ہوں عقل کا تقاضا بھی یہی ہے کہ تمام ہی مراد لئے جائیں۔
 ”لان الاعداء مجبولون على القدح والطعن فاذا وجدوا مجالا لم يتركوا مقالا البتة“
 کیونکہ دشمنوں کا کام ہی یہ ہے وہ عیب لگائیں اور طعن دیں اس لئے وہ کوئی موقع اپنے ہاتھ سے جانے نہیں دیتے جب موقع ملا طعن زنی شروع کر دی۔
 (زبیر)

﴿مَا وَلَّهُمْ عَنْ قِبَلَتِهِمُ الَّتِي كَانُوا عَلَيْهَا﴾

”کس چیز نے پھیر دیا ہے ان کو ان کے اس قبلہ سے جس پر وہ تھے“

”ما“ استفہام کے لئے ہے جو استہزاء اور تعجب کے لئے وہ استعمال کرتے تھے یعنی کفار نے مسلمانوں پر عیب لگاتے ہوئے مزاح اڑاتے ہوئے کہا تمہیں قبلہ سے کس چیز نے پھیر دیا ہے۔

(از کبیر)

قبلہ کو قبلہ کہنے کی وجہ: قبلہ اس جہت کو کہتے ہیں جس کا انسان استقبال کرے اور یہ

”مقابلہ“ سے لیا ہوا ہے ”وانما سميت القبلة قبلة لان المصلى يقابلها وتقابله“ قبلہ کا نام اسی وجہ سے قبلہ رکھا گیا ہے کہ نمازی اس کے مقابل ہوتا ہے اور وہ نمازی کے مقابل ہوتا ہے۔

اور قطر ب نے یہ کہا ہے کہ عرب حضرات اس معنی میں بھی قبلہ کا استعمال کرتے ہیں۔

”ليس لفلان قبلة اي ليس له جهة يأوى اليها“ فلاں شخص کا قبلہ ہی نہیں یعنی اسے کسی جہت پر قرار نہیں قبلہ کو استقبال سے بھی ماخوذ کرتے ہیں جب دو شخص ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہوں تو کہا جاتا ہے ”فكل واحد منهما قبلة للآخر“ ہر ایک، ایک دوسرے کا استقبال کر رہا ہے اور بعض محدثین نے کہا:

وقبله حيثما لجأت

اور جہاں بھی جائے پناہ کی ضرورت ہو وہی میرا قبلہ ہے

جعلت ماواك لي قرارا

تمہارا ٹھکانا میرے لئے قرار ہے

﴿ قُلْ لِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ﴾ ”فرمادیجئے اللہ کے لئے ہی مشرق اور مغرب ہے“

یعنی سب جہات اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہیں کوئی جہت بھی ذاتی طور پر قبلہ بننے کی مستحق نہیں ”بل انما تصیر قبلۃ لان اللہ تعالیٰ جعلها قبلۃ“ بلکہ قبلہ تو وہی ہوتا ہے جسے رب تعالیٰ قبلہ بنادے لہذا رب تعالیٰ جسے چاہے قبلہ بنادے ہر جہت اس کی مملوک ہے ہر چیز پر وہ قادر ہے اس سے سوال نہیں کیا جاسکتا تو کیا کر رہا ہے اس لئے ایک جہت سے قبلہ کو پھیر کر دوسری جہت کو قبلہ بنادے تو اس پر اعتراض نہیں کیا جاسکتا۔
(از کبیر)

﴿ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ﴾ ”ہدایت دیتا ہے جسے چاہے سیدھی راہ کی“

”وہو ما تر تضيہ الحکمة وتقتضیہ المصلحة من التوجه الى بیت المقدس والکعبۃ اخرى“
رب تعالیٰ کی حکمت کے مطابق ہے اور مصلحت کا تقاضا ہے کہ اس نے جب بیت المقدس کو قبلہ مقرر کرنے میں حکمت سمجھی اسے قبلہ بنا دیا اور جب کعبہ شریف کو قبلہ مقرر کرنے میں حکمت سمجھی اسے قبلہ بنا دیا۔ بھلا کون سا انسان ہے جو رب تعالیٰ کے علم سے مقابلہ کر سکے۔
(ماخوذ از بیضاوی)

☆☆☆☆☆

وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى
النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ
الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَتَّبِعُ الرَّسُولَ مِمَّنْ يَنْقَلِبُ
عَلَى عَقْبَيْهِ وَإِنْ كَانَتْ لَكَبِيرَةً إِلَّا عَلَى الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ
وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُضِلَّ إِيْمَانَكُمْ إِنَّ اللَّهَ بِالنَّاسِ لَرَوْفٌ رَحِيمٌ

(۱) ”اور بات یوں ہی ہے کہ ہم نے تمہیں کیا سب امتوں میں افضل کہ تم لوگوں پر گواہ ہو اور یہ رسول تمہارے نگہبان و گواہ اور اے محبوب تم پہلے جس قبلہ پر تھے ہم نے وہ اس لئے مقرر کیا تھا کہ دیکھیں کون رسول کی پیروی کرتا ہے اور کوئی الٹے پاؤں پھر جاتا ہے اور بیشک یہ بھاری تھی مگر ان پر جنہیں اللہ نے ہدایت کی۔ اور اللہ کی شان نہیں کہ تمہارا ایمان اکارت کرے بیشک اللہ آدمیوں پر بہت مہربان رحم والا ہے۔“

(۲) ”اور اسی طرح بنایا ہم نے تمہیں افضل امت، کہ تم لوگوں پر گواہ بنو۔ اور ہوں یہ رسول تمہارے نگہبان و گواہ اور نہیں بنایا ہم نے قبلہ جس پر تم تھے سوائے اس کے کہ ہم آزمائیں کون تابعداری کرتا ہے رسول کی اور کون پھر جاتا ہے الٹے پاؤں اور بیشک یہ بھاری تھی سوائے ان لوگوں کے جن کو اللہ نے ہدایت دی اور نہیں اللہ تعالیٰ ضائع کرتا تمہاری نمازوں کو بیشک اللہ لوگوں پر بہت مہربان، رحم کرنے والا ہے۔“

شان نزول : یہود وغیرہ جو قبلہ شریف کے تبدیل ہونے پر مسلمانوں کو طعنہ دے رہے تھے کہ کس چیز نے تمہیں قبلہ سے پھیر دیا ہے تو ان کو ایک اور جواب دینے کے لئے آیہ کریمہ کو نازل کیا کہ قبلہ شریف کو بدلنے میں درحقیقت لوگوں کی آزمائش مقصود تھی کہ کون لوگ رسول اللہ ﷺ کی تابعداری کرتے ہیں اور کون الٹے پاؤں پھر جاتے ہیں۔

اور اس آیت کریمہ میں نبی کریم ﷺ کی امت کی افضلیت کو بھی بیان کر دیا گیا۔ اور مسلمانوں کی اس پریشانی کو بھی دور کر دیا گیا کہ جو لوگ قبلہ کے تبدیل ہونے سے پہلے بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نمازیں ادا کرتے رہے کیا ان کی نمازیں ضائع تو نہیں ہوئیں تو ان کو ﴿وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُضِيعَ إِيمَانَكُمْ﴾ سے جواب دے دیا گیا جس کا ذکر انشاء اللہ آگے آ رہا ہے۔

﴿وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا﴾ ”اور اسی طرح ہم نے بنایا تمہیں افضل امت“
 ﴿كَذَلِكَ﴾ کا اشارہ ہے پہلی آیت کے مفہوم کی طرف، یعنی جس طرح ہم نے تمہیں ہدایت دی سیدھی راہ کی۔ اسی طرح ہم نے تمہیں افضل بنایا۔

یا اس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح ہم نے تمہارا قبلہ تمام قبلوں سے افضل بنایا اسی طرح ہم نے تمہیں تمام امتوں سے افضل امت بنایا۔

﴿وَسَطًا﴾ ”ای خیار او عدولا“ یعنی وسط کا معنی بہتر اور افضل ہے اگرچہ لغوی معنی کے لحاظ پر درمیان میں جو چیز واقع ہو اسے ”وسط“ کہا جاتا ہے لیکن یہاں صفت ہے امت کی جس کا معنی ”خیر“ ہے کیونکہ دوسری آیت کریمہ سے اس معنی کو تائید حاصل ہے رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ﴾ ”تم بہتر امت ہو“

اور وسط کا معنی عادل ہونا بھی ہے ترمذی شریف میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے ”عن النبی ﷺ انه فسر وسطا فی هذه الآية بقوله عدلا“ کہ نبی کریم ﷺ نے اس آیت کریمہ میں ”وسطا“ کی تفسیر عادل ہونے سے فرمائی ہے۔ اب مطلب یہ ہوگا کہ ہم نے تمہیں عادل امت بنایا اور معنی یہ ہے ”مزکین بالعلم والعمل“ کہ ہم نے تمہیں پاکیزہ بنایا کہ علم اور اچھے اعمال عطا کئے۔

یعنی گناہوں اور جہالت کی میل کچیل سے پاکیزہ بنایا اور علمی فضیلت عطاء کی اور اچھے اعمال سے مزین کیا ”ولا شک ان من کان مزکی بالعلم والعمل جامعاً بینہما یکون“

خیر او عدلا“ یعنی بات ہے جو شخص علم اور اچھے اعمال کی وجہ سے پاکیزگی حاصل کر لیتا ہے وہ بہتر بھی ہوتا ہے اور عادل بھی ہوتا ہے اور تمام اچھی خصلتیں حاصل ہوتی ہیں جو افراط و تفریط (زیادتی اور کمی) کے درمیان پائی جاتی ہیں جیسا کہ جو دان کو حاصل ہے جو بخل اور اسراف کے درمیان پایا جاتا ہے اور شجاعت ان کو حاصل ہے جو بزدلی اور بلا وجہ کسی پر زیادتی کرنے کے درمیان میں ہے۔

فائدہ: انسان کی ترکیب میں تین قوتیں رکھی گئی ہیں ایک مبدأ اور اک حقائق، دوسری مبدأ و جب منافع اور تیسری عظیم ہولناک کاموں پر مبدأ اقدام اور گناہوں سے بچنے کا شوق۔

پہلی قوت کا نام ہے قوت نطقیہ جب اس میں اعتدال پایا جائے تو اس سے حاصل ہونے والی قوت کا نام ہے حکمت۔

دوسری قوت کا نام ہے قوت شہویہ۔ جب اس میں اعتدال پایا جائے تو اس سے حاصل ہونے والی قوت کو عفت کہا جاتا ہے۔

تیسری قوت غصبیہ ہے جب اس میں اعتدال پایا جائے تو اس سے حاصل ہونے والی قوت کو شجاعت کہا جاتا ہے۔ یہ تین خصلتیں یعنی حکمت اور عفت اور شجاعت تمام اچھے کاموں کے لئے اصل ہیں باقی تمام کیفیات اور اچھی عادات ان کے اوپر مفرع ہیں اور یہ تینوں کیفیات افراط اور تفریط کے درمیان ہیں افراط اور تفریط دونوں رذیل (گھٹیا) ہیں اور درمیانی کیفیت ہی بہتر ہے۔

حکمت: یہ وہ کیفیت اور قوت ہے جو انسان کو طاقت بشریہ کے مطابق حقائق کی معرفت حاصل ہو اور اس میں افراط کو ”جریزہ“ کہا جاتا ہے افراط یہ ہے کہ فکر کو ان چیزوں میں استعمال کیا جائے جن میں استعمال نہیں کرنا چاہئے جیسے آیات مشتبہات۔

اور اس میں تفریط کو ”غباوۃ“ کہا جاتا ہے کیونکہ اس میں قوت فکریہ کو مکمل طور پر معطل رکھا جاتا ہے یعنی اس سے کوئی کام نہیں لیا جاتا۔

شجاعت: انسان کو درندگی والی ایک قوت حاصل ہے اگر اسے حکمت اور علم اور صحیح سمجھداری کے مطابق استعمال کیا جائے تو اسے شجاعت کہا جاتا ہے اور اگر اس میں افراط (زیادتی) پائی جائے تو اسے ”تہور“ کہا جاتا ہے یہ جیسا کہ ”الاقدام علی مالا ینبغی“ یعنی نامناسب چیزوں کی طرف

قدم بڑھانا۔ اور اس میں تفریط کو ”جبانہ“ کہا جاتا ہے یعنی بزدلی سے کام لینا۔

عفت: انسان کو چوپاؤں والی قوت شہویہ حاصل ہے اگر انسان اسے معتدل طور پر اپنے کام میں لائے اور حکمت کے مطابق اس سے کام لے یعنی وہ شریعت کے مطابق ہو تو اسے عفت کہا جاتا ہے اور اگر حد سے بڑھ جائے تو اسے ”خلاعت“ کہا جاتا ہے یعنی ایسی لذات اور خواہشات میں منہمک ہو جانا (کامل ان میں مبتلاء ہو جانا) جو شریعت کے خلاف ہو۔ اور اس میں تفریط کو ”جمود“ کہا جاتا ہے یعنی جن لذات اور خواہشات کے حاصل کرنے کی عقلاً اور نقلاً اجازت ہو یعنی شریعت اجازت دے اور عقل بھی جائز سمجھے پھر ان سے دور رہنا۔

نتیجہ واضح ہوا ”ان الاوساط فضائل والاطراف رذائل“ درمیانی صورت فضیلت والی ہے اور دونوں طرفیں یعنی افراط اور تفریط گھٹیا کیفیتیں ہیں۔ جب یہ تینوں چیزیں انسان کو حاصل ہو جائیں یعنی حکمت اور عفت اور شجاعت تو انسان کو خود بخود عدالت حاصل ہو جاتی ہے اسی لئے ”وسطا“ کی تفسیر ”عدولا“ سے کی گئی ہے۔ (بیضاوی و شیخ زادہ)

تنبیہ: اگرچہ ”وسطا“ کی تفسیر ”خیرا“ سے بھی کی گئی ہے اور ”عدولا“ سے بھی لیکن ”خیرا“ سے تفسیر زیادہ بہتر ہے جس میں چند وجوہ پائی گئی ہیں:

ایک وجہ تو یہ ہے کہ ”وسط“ خیر کے معنی میں جمادات میں بھی استعمال ہے لیکن ”وسط“ عادل کے معنی میں جمادات میں استعمال نہیں۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ ”وسط“ کو خیر کے معنی میں استعمال کیا جائے تو دوسری آیت کریمہ ﴿لَا تَحْسَبُ خَيْرًا لِّأُمَّةٍ﴾ کی مطابقت حاصل ہو جائے گی۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ عام محاورہ میں بھی ”وسط“ خیر کے معنی میں زیادہ استعمال ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے ”فلان اوسطنا نسبا“ اس کا معنی مراد لیا جاتا ہے ”انہ اکثر فضلا“ کہ بیشک وہ زیادہ فضیلت رکھنے والا ہے۔ اسی طرح کہا جاتا ہے ”هذا وسط فيهم كواسطة القلادة“ یہ ان میں ایسے افضل ہے جیسے ہار کو فضیلت حاصل ہوتی ہے ”وسط“ کو اس لئے بھی افضل کہا جاتا ہے کہ رئیس کے

ارد گرد اس کے متبعین گھیرا بنا کر بیٹھتے ہیں اور وہ وسط میں ہوتا ہے اور اسے افضلیت حاصل ہوتی ہے۔

چوتھی وجہ یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کی امت افراط اور تفریط کے درمیان ہے نہ ان میں غلو ہے اور نہ ہی ان میں تقصیر پائی جاتی ہے یعنی نصرانیوں کی طرح ان میں غلو نہیں کہ نبی کو اللہ کا بیٹا مان لیا جائے یا نبی کو خدا مان لیا جائے اور نہ ہی یہودیوں کی طرح ان میں تقصیر پائی جاتی ہے جیسا کہ انہوں نے انبیاء کرام کو شہید کیا اور کتب کو تبدیل کر دیا۔

(از کبیر)

اسی آیت کریمہ سے معتزلہ کا رد ہو گیا:

معتزلہ کا مذہب یہ ہے کہ انسان اپنے اعمال کا خود خالق ہے لیکن رب تعالیٰ نے ہدایت و کد لکھ کر دیا کہ ”جعلناکم امة وسطا“ اور اسی طرح ہم نے بنایا تمہیں افضل امت اس سے واضح ہوا کہ بندے کے تمام افعال کا خالق اللہ تعالیٰ ہے ”لان هذه الآية دالة على ان عدالة هذه الامة وخيريتهم بجعل الله وخلقهم“ کیونکہ اس آیت کریمہ سے واضح ہو رہا ہے کہ اس امت کو عدالت اور افضلیت اللہ تعالیٰ کی تخلیق سے حاصل ہے۔

(از کبیر)

اجماع امت دلیل ہے: اس مسئلہ میں جمہور اہل سنت اور معتزلہ کا اتفاق ہے کہ اجماع امت حجت (دلیل) ہے اس مسئلہ پر دلیل یہ پیش کی گئی ہے:

”اخبِر الله تعالى عن عدالة هذه الامة عن خيريتهم فلوا قدموا على شئ من المحظورات لما اتصفوا بالخيرية واذا ثبت انهم لا يقدمون على شئ من المحظورات وجب ان يكون قولهم حجة“

اللہ تعالیٰ نے جب اس امت کی عدالت اور خیریت و افضلیت کی خبر دی تو اگر یہ لوگ ممنوعات پر متفق ہو جائیں تو ان کی صفت خیریت سے بیان نہیں ہو سکتی جب یہ ثابت ہو گیا کہ تمام ممنوع اشیاء پر اتفاق نہیں کر سکتے تو اسی سے واضح ہو گیا کہ اجماع امت حجت ہے۔

(کبیر)

اعتراض: اس امت کے کتنے لوگ گناہوں کا ارتکاب کرتے ہیں نیکیوں کو چھوڑ دیتے ہیں تو یہ کس طرح افضل امت اور کس طرح ان کا اجماع حجت ہے؟

جواب : اس امت کی افضلیت کا ذکر پہلے ہو چکا ہے کہ نسبت یہود و نصاریٰ کے یہ افضل

ہے کہ نہ تو انہوں نے انبیاء کرام کو رب تعالیٰ کا شریک مانا اور نہ ہی خدا کا بیٹا مانا اور نہ ہی دین میں تحریف کی اور نہ ہی انبیاء کرام کو شہید کیا پھر اگر ان سے گناہ سرزد ہو جائے تو سچے دل سے توبہ کر لیں تو ان کی توبہ قبول ہو جاتی ہے۔

پھر یہ تمام کے تمام گناہ پر متفق نہیں ہو سکتے، پس اجماع امت کے حجت ہونے پر یہی دلیل کافی ہے اور اجماع امت کے حجت ہونے پر معصوم ہونا ضروری نہیں اور مجتہدین کا اجتہادی خطاء سے محفوظ ہونا بھی ضروری نہیں کیونکہ اجتہادی خطا حقیقت میں خطا نہیں۔
(از روح المعانی)

﴿لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا﴾: ”تا کہ تم لوگوں پر گواہ بن جاؤ اور رسول تم پر نگہبان و گواہ“ یعنی تمہیں افضل امت بنایا تا کہ تم لوگوں پر گواہی دو۔

”عن عائشة رضی اللہ عنہا قالت قال رسول اللہ ﷺ یعنی فی اہل الکتاب انہم لا یحسدوننا علی شئی کما یحسدوننا علی یوم الجمعة التی ہدانا اللہ لہا و ضلوا عنہا و علی القبلة التی ہدانا اللہ لہا و ضلوا عنہا و علی قولنا خلف الامام امین“ (مسند احمد)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اہل کتاب ہمارے ساتھ کسی چیز میں حسد نہیں کرتے جیسا کہ وہ (تین چیزوں میں ہمارے ساتھ حسد کرتے ہیں) جمعہ کے دن پر ہمارے ساتھ حسد کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں وہ عطاء کیا اور وہ اس سے محروم رہے اور قبلہ پر وہ ہمارے ساتھ حسد کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ہمیں عطاء کیا اور ان کو اس سے محروم کیا اور وہ ہمارے ساتھ امام کے پیچھے آمین پڑھنے میں حسد کرتے ہیں یعنی وہ اس سے محروم ہیں۔

اور گویا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے تمہارے لئے قبلہ کو تبدیل کر کے تمہیں ابراہیم علیہ السلام والا قبلہ عطاء کر دیا اور وہی تمہارے لئے اختیار فرمایا تا کہ تمہیں تمام امتوں سے افضلیت حاصل ہو اور تم لوگوں پر قیامت کے دن گواہی دو ”لان الجميع معترفون لكم بالفضل“ اس لئے کہ تمام تمہاری فضیلت کے معترف ہیں۔

نبی کریم ﷺ کی امت کی گواہی پر احادیث مبارکہ:

”عن ابی سعید قال قال رسول اللہ ﷺ یدعی نوح یوم القیامة فیقال له هل بلغت فیقول نعم فیدعی قومہ فیقال لهم هل بلغکم فیقولون ما اتانا من نذیر وما اتانا من احد فیقال لنوح من یشہدک فیقول محمد وامتہ“

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ نوح علیہ السلام کو قیامت کے دن بلایا جائے گا ان کو کہا جائے گا کیا تم نے تبلیغ فرمادی تھی آپ عرض کریں گے۔ ہاں (ان کو تیرا پیغام پہنچا دیا تھا) پھر آپ کی قوم کو بلایا جائے گا ان سے پوچھا جائے گا کیا تمہیں انہوں نے تبلیغ کر دی تھی۔ وہ کہیں گے ہمارے پاس تو کوئی ڈرانے والا نہیں آیا اور ہمارے پاس تو کوئی ایک بھی نہیں آیا تھا۔ نوح علیہ السلام کو کہا جائے گا تمہاری گواہی کون دے گا وہ کہیں گے حضرت محمد ﷺ اور ان کی امت۔

(مسند احمد)

”عن ابی سعید الخدری قال قال رسول اللہ ﷺ یجنی النبی یوم القیامة ومعہ الرجلان واکثر من ذلک فیدعی قومہ فیقال لهم هل بلغکم هذا فیقولون لا فیقال له هل بلغت قومک فیقول نعم فیقال من یشہدک فیقول محمد وامتہ فیدعی محمد وامتہ فیقال لهم هل بلغ هذا قومہ فیقولون نعم فیقال وما علمکم فیقولون جاء نبینا فاخبرنا ان الرسل قد بلغوا“

(مسند احمد)

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن نبی آئیں گے ان کے ساتھ دو آدمی یا دو سے زیادہ ہوں گے ان کی قوم کو بلایا جائے گا ان سے پوچھا جائے گا کیا تمہیں نبی نے تبلیغ کر دی تھی وہ کہیں گے نہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ اپنے نبی سے پوچھے گا، کیا تم نے ان کو تبلیغ کر دی تھی وہ کہیں گے ہاں (اے اللہ تبلیغ کر دی تھی) پھر ان کو کہا جائے گا تمہارا گواہ کون ہے وہ کہیں محمد ﷺ اور ان کی امت۔ نبی کریم ﷺ کی امت سے پوچھا جائے گا کیا اس نبی نے اپنی امت کو رب تعالیٰ کا پیغام پہنچا دیا تھا؟ وہ کہیں گے ہاں انہوں نے پیغام پہنچا دیا تھا پھر ان سے پوچھا جائے گا تمہیں کیسے علم حاصل ہے وہ کہیں گے ہمارے نبی کریم ﷺ ہمارے پاس تشریف لائے انہوں نے ہمیں خبر دی کہ بیشک رسولوں نے اپنی اپنی امتوں کو رب تعالیٰ کے احکام پہنچا دیئے تھے۔

اللہ تعالیٰ کے ارشاد فرامی:

لَتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا

کامیابی و شہادت ہے۔

امت مصطفیٰ ﷺ کی گواہی کا ایک اور مرتبہ

نبی کریم ﷺ کی امت کے لوگ جب کسی شخص کے نیک اعمال کی گواہی دے دیں تو وہ گواہی اس کے حق میں قبول ہو جاتی ہے اور جب کسی شخص کے برے اعمال کی گواہی دے دیں تو وہ اسی طرح قبول کر لی جاتی ہے۔

عن جابر بن عبد الله قال شهد رسول الله ﷺ جنازة في بني مسلمة وكنت الى جانب رسول الله ﷺ فقال بعضهم والله يا رسول الله لنعم المرء كان لقد كان عفيفا مسلما وكان واثقا عليه خيرا فقال رسول الله ﷺ انت بما تقول فقال الرجل الله اعلم بالسرائر فاما الذي بدالنا منه فذاك فقال النبي ﷺ وجبت ثم شهد جنازة في بني حارثة وكنت الى جانب رسول الله ﷺ فقال بعضهم يا رسول الله بنس المرء كان ان كان لفظا غليظا فانسوا عليه شرا فقال رسول الله ﷺ لبعضهم انت بالذي تقول فقال الرجل الله اعلم بالسرائر فاما الذي بدالنا منه فذاك فقال رسول الله ﷺ وجبت قال مصعب بن ثابت فقال لنا عند ذلك محمد بن كعب صادق رسول الله ﷺ ثم قرأ: وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لَتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا قَالَ الْحَاكِمُ هَذَا حَدِيثٌ صَحِيحٌ الْإِسْنَادُ وَلَمْ يَخْرُجَاهُ (مسند حاكم)

حضرت جابر بن عبد اللہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ بنی مسلمہ کے جنازہ میں تشریف لے گئے اور میں ان کے ساتھ ہی ایک جانب تھا بعض لوگوں نے کہا قسم ہے اللہ تعالیٰ کی یا رسول اللہ یہ شخص نے اپنا تمام پاداش تمہارا مل مسلمان تھا، عام لوگ اس سے اچھے الفاظ سے یاد کر رہے تھے اس کی نیکی اور نیکیوں سے تعریف کر رہے تھے نبی کریم ﷺ نے ایک شخص کو فرمایا کیا واقعی یہ شخص نیک تھا؟ تو انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ چھپے ہوئے بھیجے تو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے جو ہمیں ظاہر طور پر معلوم ہے وہ بھی جانتا ہے یہ شخص بہت نیک تھا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "وجبت" ثابت ہوئی (یعنی تمہاری گواہی)

اس کے حق میں قبول ہوگئی جنت اس کے لئے ثابت ہوگئی) پھر آپ بنی حارثہ کے جنازہ میں تشریف لے گئے میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ہی ایک جانب تھا بعض حضرات نے کہا یا رسول اللہ یہ بہت برا انسان تھا، بڑا بد مزاج بد خلق تھا ان لوگوں نے اس کی برائیوں کو ہی بیان کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے ان میں سے ایک شخص سے پوچھا کیا واقعی وہ ایسا ہی تھا جو تم کہہ رہے ہو تو اس شخص نے عرض کیا کہ چھپی ہوئی باتوں کو تو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے لیکن ظاہر طور پر ایسا ہی تھا جیسا ہم کہہ رہے ہیں تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”وجبت“ ثابت ہوگئی (یعنی تمہاری گواہی قبول ہوگئی وہ رب تعالیٰ کی گرفت میں آ گیا) مصعب بن ثابت نے کہا کہ حضرت جابر کی اس روایت کو محمد بن کعب نے بیان کرنے کے بعد فرمایا رسول اللہ کا ارشاد گرامی سچا ہے پھر انہوں نے یہی آیت کریمہ تلاوت کی۔ حاکم نے بیان فرمایا کہ یہ حدیث صحیح ہے اگرچہ بخاری و مسلم نے بیان نہیں فرمائی اسی سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ حدیث کے صحیح ہونے کے لئے کسی خاص کتاب میں حدیث کا واقع ہونا ضروری نہیں۔

☆ ”عن ابی الاسود انه قال اتيت المدينة فوافقتها وقد وقع بها مرض فموتون موتا ذريعا فجلست الى عمر بن الخطاب فمرت به جنازة فاثني على صاحبها خير فقال وجبت ثم مربأخرى فاثني عليها شر فقال عمر وجبت فقال ابو الاسود ما وجبت يا امير المؤمنين قال قلت كما قال رسول الله ﷺ ايما مسلم شهد له اربعة بخير ادخله الله الجنة قال فقلنا وثلاثة قال فقال وثلاثة قال فقلنا واثنان قال واثنان ثم لم نسأله عن واحد“

(مسند احمد و كذا رواه البخاري والترمذي والسناني)

ابو الاسود کہتے ہیں کہ میں مدینہ طیبہ میں آیا وہاں اتفاقاً عام بیماری پھیلی ہوئی تھی جس کی وجہ سے لوگ جلدی جلدی فوت ہو رہے تھے میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے پاس بیٹھا ہوا تھا وہاں سے ایک جنازہ گزر لوگوں نے اس کی خیریت کی تعریف کی یعنی اس کی خوبیاں، نیکیاں بیان کیں تو آپ نے فرمایا ”وجبت“ ثابت ہوگئی۔ کچھ دیر کے بعد دوسرے جنازہ کا گزر ہوا تو اس کی برائیوں کو بیان کیا گیا کہ یہ شخص تو بہت برا تھا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا ”وجبت“ ثابت ہوگئی ابو الاسود کہتے ہیں میں نے پوچھا اے امیر المؤمنین ”ما وجبت“ کیا چیز ثابت ہوگئی آپ نے فرمایا میں نے وہی کہا جو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب کسی مسلمان کے لئے چار آدمی گواہی دے دیں کہ وہ نیک

شخص تھا تو اللہ تعالیٰ اسے جنت میں داخل کرے گا ہم نے پوچھا اگر تین شخص گواہی دیں تو آپ نے فرمایا تین کی گواہی بھی اسی طرح قبول ہوگی ہم نے کہا اگر دو گواہی دیں تو آپ نے فرمایا دو کی گواہی بھی اسی طرح قبول ہوگی ابوالاسود کہتے ہیں کہ پھر ہم نے ایک کے متعلق سوال نہیں کیا۔

☆ "عن ابی بکر بن ابی زہیر الثقفی عن ابیہ قال سمعت رسول اللہ ﷺ بالبناوة یقول یوشک ان تعلموا خیارکم من شرارکم قالوا بھم یا رسول اللہ بالشاء الحسن والشاء الحسنی انتم شہداء اللہ فی الارض" (ابن مردویہ)

ابو بکر بن زہیر ثقفی اپنے باپ سے بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے لوگوں کے کلام کے انتقال کے متعلق سنا آپ ارشاد فرما رہے تھے کہ تمہیں خود ہی پتہ چل جائے گا کہ نیک لوگ کون ہیں اور برے کون صحابہ کرام نے پوچھا یا رسول اللہ وہ کیسے آپ نے فرمایا اچھی تعریف سے (نیکیوں کا پتہ چل جائے گا) اور بری تعریف سے (برے لوگوں کا پتہ چل جائے گا) تم لوگ زمین میں اللہ کے گواہ ہو۔

(ماخوذ از ابن کثیر)

چار گواہیوں کا بیان: ایک گواہی ان فرشتوں کی ہوگی جو بندوں کے اعمال پر مقرر ہیں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿وَجَاءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَعَهَا سَائِقٌ وَشَهِيدٌ﴾ (ق ۲۱) اور ہر جان یوں حاضر ہوئی کہ اس کے ساتھ ایک ہانکنے والا اور ایک گواہ۔ یعنی گناہ گار، کفار کو ہانک کر جہنم میں لے جانے والا فرشتہ ان کے ساتھ ہوگا اور لوگوں کے اعمال کی گواہی دینے والا فرشتہ بھی ان کے ساتھ ہوگا۔ اور رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

﴿مَا يَلْفُظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ﴾ (ق ۱۸)

”کوئی بات وہ زبان سے نہیں نکالتا کہ اس کے پاس ایک محافظ تیار نہ بیٹھا ہو“

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

﴿وَإِنْ عَلَيْكُمْ لِحَافِظِينَ كَرَامًا كَاتِبِينَ يَعْلَمُونَ مَا تَفْعَلُونَ﴾ (الانفطار ۱۰ تا ۱۲)

”اور بیشک تم پر کچھ نگہبان ہیں، معزز لکھنے والے، جانتے ہیں جو تم کرتے ہو“

دوسری گواہی انبیاء کرام کی ہے اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی گواہی کا ذکر فرمایا:

﴿وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا مَّا دُمْتُ فِيهِمْ﴾ (المانندہ ۱۱۷) اور میں ان پر گواہ رہا جب تک

میں ان میں موجود رہا اور نبی کریم ﷺ کا اپنی امت کے حق میں گواہی دینے کا ذکر ان الفاظ مبارکہ سے فرمایا:

﴿وَيَكُونُ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا﴾ ”اور ہوں گے رسول تم پر گواہ و نگہبان“

تیسری گواہی امت محمد مصطفیٰ ﷺ کی ہوگی خصوصی طور پر یعنی یہ گواہی کسی اور امت کو حاصل نہیں ہوگی اس آیت کریمہ میں ذکر فرمایا ﴿لَتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ﴾ کہ تم لوگوں پر گواہ بنو اور فرمایا ﴿وَجِئْنَا بِالنَّبِيِّ وَالشُّهَدَاءِ﴾ (الزمر ۴۹) اور لائے جائیں گے انبیاء اور یہ نبی اور اس کے امت کے ان پر گواہ ہوں گے۔

چوتھی گواہی انسان کے اعضاء کی ہوگی یہ گواہی اقرار کے درجہ میں ہوگی بلکہ اس سے بڑھ کر تعجبناک ہوگی رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿يَوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمُ أَلْسِنُهُمْ وَأَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ﴾ (الزور ۲۳)

”اس دن ان پر گواہی دیں گی ان کی زبانیں اور ان کے ہاتھ اور ان کے پاؤں جو کچھ وہ کرتے رہے“

(ماخوذ از کبیر)

﴿وَيَكُونُ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا﴾ ”اور یہ رسول تمہارے نگہبان و گواہ“

یہ مندرجہ بالا ترجمہ اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ کا ہے آپ نے لفظ نگہبان زیادہ کیا ہے اس کی کیا وجہ ہے؟ راقم نے اپنی کتاب تسکین الجنان فی محاسن کنز الایمان میں تراجم کا تقابلی جائزہ پیش کرتے ہوئے یوں بیان کیا۔

- ☆ اور ہووے پیغمبر اور تمہارے گواہ (شاہ رفیع الدین صاحب)
- ☆ اور رسول ہو تم پر بتانے والا (شاہ عبدالقادر صاحب)
- ☆ اور پیغمبر آخر الزمان تم پر گواہ بنیں (فتح محمد صاحب)
- ☆ اور ہو رسول تم پر گواہی دینے والا (محمود الحسن صاحب)
- ☆ اور رسول تم پر گواہ ہو (مہرودی صاحب)
- ☆ اور رسول گواہ ہیں تم پر (عبدالماجد صاحب)
- ☆ اور تمہارے لئے رسول اللہ ﷺ گواہ ہو (اشرف علی صاحب)
- ☆ اور یہ رسول تمہارے نگہبان و گواہ (اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان)

نبی کریم ﷺ کی امت لوگوں پر گواہی دے گی اور آپ اپنی امت کی صداقت کی گواہی دیں گے اور ان کے نگہبان ہوں گے دیگر تراجم نے صرف گواہ ذکر کیا جب کہ اعلیٰ حضرت نے نگہبان و گواہ ذکر کیا ہے۔ اس معنی پر مدارک دال ہے ”لما كان الشهيد كالرقيب جنی بكلمة استعلاء كقوله تعالى كنت انت الرقيب عليهم“ چونکہ گواہ نگہبان کی طرح ہوتا ہے اسی وجہ سے جس طرح ”الرقيب“ (نگہبان) کے بعد کلمہ علی آتا ہے اسی طرح یہاں بھی لایا گیا ہے۔

بیضاوی نے بھی اسی طرح بیان کیا ہے کہ جب پہلی امتیں تبلیغ انبیاء کا انکار کر دیں گی تو رب تعالیٰ باوجود علم کے منکرین پر رحمت قائم کرنے کے لئے تبلیغ پر گواہ طلب کرے گا انبیاء کرام امت محمد ﷺ کو گواہ پیش کریں گے پہلی امتیں کہیں گی تم ہمیں کیسے پہچانتے ہو؟ تو یہ کہیں گے کہ ہمیں اپنے سچے نبی کریم ﷺ نے اللہ کا کلام اس کی کتاب کے ذریعے پہنچایا، جس سے ہمیں علم حاصل ہوا۔ پھر ان کے حق میں گواہی کے لئے نبی کریم ﷺ کو لایا جائے گا آخر مقصودی عبارت ملاحظہ ہو:

”فیؤتی بمحمد ﷺ فیسأل عن حال امته فیشهد بعد التهم وهذه الشهادة وان كانت لهم لكن لما كان الرسول عليه السلام كالرقيب المهيم على امته عدی بعلى“

نبی کریم ﷺ کو لایا جائے گا آپ اپنی امت کی عدالت کی گواہی دیں گے، آگے علامہ بیضاوی نے ایک سوال کا جواب دیا ہے کہ شہادت کے بعد ”علی“ آئے تو یہ شہادت کسی کے خلاف ہوتی ہے جب کسی کے حق میں شہادت دینی ہو تو شہادت کے بعد ”لام“ آتا ہے اس کا جواب علامہ نے دیا کہ اگرچہ نبی کریم ﷺ کی شہادت ان کے حق میں ہوگی لیکن آپ چونکہ ان کے لئے رقیبوں (نگہبانوں) کی طرح ہیں۔ اسی وجہ سے ”علی“ سے متعدی کیا ہے چونکہ آپ نگہبان ہیں نہ کہ یہ مراد ہے کہ ان کے خلاف گواہی دیں گے۔ اسی سوال و جواب کو اعلیٰ حضرت نے ترجمہ میں ”نگہبان“ کا لفظ بڑھا کر مندرجہ کر دیا جس کی حقیقت سے دیگر مترجمین بے خبر رہے۔

تنبیہ: لستكونوا شهداء على الناس ﴿ میں بھی لفظ ”علی“ استعمال ہے۔ لیکن اس کے ترجمہ میں ”نگہبان“ کو نہیں لایا گیا اس لئے کہ نبی کریم ﷺ کی امت کی گواہی جہاں انبیاء کرام کے حق میں ہوگی وہاں ان کی امتوں کے خلاف بھی ہوگی۔ لیکن نبی کریم ﷺ کی گواہی اپنی امت کے حق

میں فقط ہوگی کسی کے خلاف نہیں ہوگی۔

فائدہ جلیلہ :

”ان الشهادة والمشاهدة والشهود هو الرؤية يقال شاهدت كذا اذا رأيته وابصرته ولسا كان بين الابصار بالعين وبين المعرفة بالقلب مناسبة شديدة لا جرم قد تسمى المعرفة التي في القلب مشاهدة وشهودا والعارف بالشئ شاهدا ومشاهدا ثم سميت الدلالة على الشئ شاهدا على الشئ لانها هي التي بها صار الشاهد شاهدا ولما كان المخبر عن الشئ والمبين لحاله جاريا مجرى الدليل على ذلك سمي ذلك المخبر ايضا شاهدا“ شہادت اور مشاہدہ اور شہود کا معنی ہے دیکھنا جب کوئی شخص کسی کو دیکھے تو وہ کہتا ہے ”شہادت کذا“ میں نے اس طرح دیکھا۔ جبکہ آنکھوں سے دیکھنے اور دل کی معرفت کے درمیان مناسبت شدیدہ پائی گئی تو یقیناً دل کی معرفت کو مشاہدہ اور شہود کہا جائے گا اور عارف کو شاہد اور مشاہد کہا جائے گا۔ اسی طرح کسی چیز پر دلالت کرنا ”شاہد“ کہلاتا ہے اسی طرح کسی چیز کی خبر دینے والے اور کسی چیز کے حال کو بیان کرنے والے کو بھی شاہد کہا جاتا ہے۔

(از کبیر)

شہود کے لغوی اور مجازی معانی کو سمجھنے کے بعد تفسیر عزیزی کو دیکھیں کہ نبی کریم ﷺ کیسے شہود سے متصف تھے تو سارے جھگڑے ہی ختم ہو جائیں آئیے دیکھیں شاہ صاحب نے کیا خوب بیان فرمایا: **وَيَكُونُ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا**، یعنی و باشد رسول شما بر شما گواہ زیرا کہ او مطلع ست بہ نور نبوت بہ رتبہ ہر متدین بدین خود کہ در کدام درجہ از دین من رسیدہ و حقیقت ایمان او چیست و حجابی کہ بدان از ترقی محجوب ماندہ است کدام است پس او می شناسد گناہار، شمارا درجات ایمان شمارا و اعمال نیک و بد شمارا و اخلاص و اتفاق شمارا و لهذا شہادت او در دنیا بحکم شرع در حق امت مقبول و واجب العمل است“

نبی کریم ﷺ تمہارے حق میں گواہی دیں گے کیونکہ آپ نور نبوت کی وجہ سے ہر دیندار کے دین کو جانتے ہیں کہ یہ دین کے کس درجہ پر ہے اور اس کے ایمان کی حقیقت کیا ہے اور اس کی ترقی میں اس درجہ کے حجاب پائے گئے ہیں۔ نبی کریم ﷺ تمہارے گناہوں کو پہچانتے ہیں اور تمہارے ایمان کے

درجات کو جانتے ہیں اور تمہارے نیک اور برے اعمال کا آپ کو علم ہے اور تمہارے اعمال میں تمہارے اخلاص اور نفاق کو جانتے ہیں اسی وجہ سے آپ کی شہادت دنیا میں بحکم شرع امت کے حق میں مقبول ہے اور واجب العمل ہے۔ اسی وجہ سے نبی کریم ﷺ نے جو خبریں دی ہیں وہ سب سچی ہیں کچھ واقع ہو چکی ہیں کچھ واقع ہو کر رہیں گی انشاء اللہ۔

اس بیان کے بعد شاہ صاحب فرماتے ہیں:

”در روایات آمدہ کہ ہر نبی رابر اعمال امتیان خود مطلع میسازند کہ فلانی امروز چنین می کند و فلانی چنان تاروز قیامت ادای شہادت تواند کرد“
تمام انبیاء کرام کو ان کی امتوں کے اعمال پر مطلع کیا گیا ہے کہ فلاں آج اس طرح کر رہا ہے اور دوسرا شخص اس طرح کر رہا ہے ان کو مطلع کرنے کی یہ وجہ ہے کہ وہ بھی قیامت کے دن گواہی دے سکیں۔

(از عزیز)

﴿وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَتَّبِعِ الرَّسُولَ مِمَّنْ يَنْقَلِبُ عَلٰى عَقْبِهِ﴾

اور ہمیں بنایا ہم نے قبلہ جس پر تم تھے سوائے اس کے کہ ہم آزمائیں کون تابعداری کرتا ہے رسول کی اور کون پھر جاتا ہے الٹے پاؤں۔

یعنی قبلہ کو تبدیل کرنے کی وجہ دراصل لوگوں کا امتحان لینا مقصود تھا کہ کون رسول اللہ ﷺ کی تابعداری کرتا ہے اور کون الٹے پاؤں پھر جاتا ہے یعنی کون تابعداری نہیں کرتا۔

تنبیہ: راقم نے شیخ زادہ کی اس توجیہ کے مطابق ذکر کیا ہے:

”وتقدیره وما جعلنا قبلتک بیت المقدس الا لنعلم بصرفک عنها الی الکعبۃ من یتبعک فی امر تحویل القبلة بان یتروک التوجه الی بیت المقدس ویتوجه الی الکعبۃ وممن لا یتبعک فی ذلک“

حاصل کلام یہ ہے کہ ہم نے نہیں بنایا آپ کا قبلہ بیت المقدس سوائے اس کے کہ ہم آزمائیں اس سے آپ کو پھیر کر کعبہ کی طرف متوجہ ہونے کا حکم دے کر کہ تحویل قبلہ کے حکم سے کہ کون بیت المقدس کی طرف منہ کرنا چھوڑتا ہے اور کعبہ کی طرف منہ کرنے پر عمل کرتا ہے اور کون آپ کی

اس معاملہ میں یعنی تحویل قبلہ میں تابعداری نہیں کرتا۔

اس میں ایک اور وجہ یہ بھی مذکور ہے:

”يجوز ان يكون قوله ﴿الَّتِي كُنْتُ عَلَيْهَا﴾ لسانا للحكمة في جعل بيت المقدس قبله
يعنى ان اصل امرك ان تستقبل الكعبة وان استقبلالك بيت المقدس كان امرا عارضا
نعرض وانما جعلنا القبلة الجهة التي كنت عليها قبل وقتك هذا وهي بيت المقدس
لنمتحن الناس وننتظر من يتبع الرسول ومن لا يتبع وينفر عنه“ (کبير)

ہو سکتا ہے کہ ﴿الَّتِي كُنْتُ عَلَيْهَا﴾ کا مطلب یہ ہو کہ بیت المقدس کو قبلہ بنانے کی حکمت کا ذکر ہو
کہ اصل میں آپ کو کعبہ شریف کی طرف ہی منہ کرنے کا حکم تھا لیکن بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز
ادا کرنے کا حکم عارضی تھا جس کا مقصد یہ تھا کہ کعبہ شریف سے پہلے بیت المقدس کو قبلہ مقرر کر کے لوگوں کا
امتحان لیا جائے کہ کون سے لوگ آپ کی تابعداری میں بیت المقدس کی طرف منہ کرتے ہیں اور کون سے
تابعداری نہیں کرتے اور نفرت کرتے ہیں اس معنی کے لحاظ پر یہ امتحان تحویل قبلہ سے پہلے ہے۔

اعتراض: رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿إِلَّا لِنَعْلَمَ﴾ اور نہیں بنایا ہم نے قبلہ جس پر آپ تھے مگر یہ
کہ ہم جانیں کہ کون تابعداری کرتا ہے رسول کی اور کون الٹے پاؤں پھر جاتا ہے۔

اس سے تو ان بے دین لوگوں کے مذہب کو تائید مل رہی ہے جو یہ کہتے ہیں ”ان الله تعالى
لم يعلم تلك الاشياء قبل وقوعها“ کہ اللہ تعالیٰ کو چیزوں کے واقع ہونے سے پہلے علم حاصل
نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس آیت میں بھی یہی ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تحویل قبلہ کو اپنے علم کا ذریعہ بنایا کہ اس سے
لوگوں کا علم حاصل ہو جائے۔

جواب: ”الا لنعلم معناه الا لنرى ومجاز هذا ان العرب تضع العلم مكان
الرؤية والرؤية مكان العلم“ یہاں آیت کریمہ میں علم بمعنی رؤیت استعمال ہے معنی یہ ہے ”مگر یہ کہ
ہم دیکھ لیں“ (اعلیٰ حضرت نے یہی ترجمہ کیا ہے) یہ مجازی معنی ہے عرب حضرات عام طور پر علم کا معنی
رؤیت لیتے رہتے ہیں اور رؤیت کو علم کے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔

دوسرا جواب: ﴿إِلَّا لِنَعْلَمَ﴾ نعمالکم معامله المختبر، مگر یہ کہ ہم تمہارے
ساتھ وہ معاملہ کریں جو امتحان لینے والا کرتا ہے یعنی ہم آزمائیں (راقم نے یہی ترجمہ کیا ہے) (از کبیر)

تسکین الجنان سے اقتباس:

﴿ وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ ﴾

☆ اور جس قبلہ پر تم (پہلے) تھے اس کو ہم نے اس لئے مقرر کیا تھا کہ معلوم کریں (فتح محمد صاحب)

☆ اور جس سمت قبلہ پر آپ رہ چکے ہیں وہ تو محض اس کے لئے تھا کہ ہم کو معلوم ہو جاوے۔

(اشرف علی صاحب)

☆ نہیں مقرر کیا تھا ہم نے وہ قبلہ جس پر تو پہلے تھا مگر اس واسطے کہ معلوم کریں۔

(شاہ عبد القادر صاحب)

☆ اور نہیں کیا تھا ہم نے قبلہ جو تھا تو اوپر اس کے مگر تا کہ جانیں ہم۔ (شاہ رفیع الدین صاحب)

☆ اور اے محبوب تم پہلے جس قبلہ پر تھے ہم نے وہ اسی لئے مقرر کیا تھا کہ دیکھیں۔

(اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان)

یہاں تحویل قبلہ کا ذکر ہے نبی کریم ﷺ کا پہلے قبلہ کعبہ تھا (یعنی بیت المقدس کی طرف بھی منہ رہتا اور کعبہ کی طرف بھی) مدینہ طیبہ میں آ کر سولہ سترہ ماہ تک بیت المقدس قبلہ بنایا گیا پھر نبی کریم ﷺ کی مرضی کے مطابق کعبہ کو قبلہ بنادیا گیا۔ اس واقعہ کو رب تعالیٰ نے ذکر فرمایا کہ تحویل قبلہ کا مقصد یہ تھا کہ مسلمان اور کافر میں فرق ہو جائے کہ کون نبی کریم ﷺ کی تابعداری کرتا ہے اور کون شک کرتا اور روگردانی کرتا ہے۔

اب اس تمہید کے بعد واضح ہوا کہ عام تراجم میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قبلہ کو اس لئے تبدیل کیا کہ اسے قبیعین اور منکرین کا علم ہو جائے۔ اس میں ایک وہم ہوتا ہے جو تفاسیر نے ذکر کیا ہے اس کا ازالہ نہیں ہوتا بلکہ اس وہم کو تقویت ملتی ہے وہ وہم جو تفاسیر میں ہے وہ دیکھیں۔

(بیضاوی)

”فان قيل كيف يكون علمه تعالى غاية الجعل وهو لم يزل عالما“
اعتراض کیا جاتا ہے کہ علم کو جعل کی غایت بنانا صحیح نہیں کہ قبلہ اس لئے بنایا کہ ہم جانیں کیونکہ اللہ تعالیٰ تو ازلا عالم ہے۔ جواب اس طرح دیا گیا:

”قلت هذا واشباهه باعتبار التعلق الحالی الذي هو مناط الجزاء والمعنى لیتعلق علمنا به موجودا“

(بیضاوی)

یعنی یہاں جزاء کا تعلق موجود کے علم سے ہے اسی جواب کو مدارک میں زیادہ واضح طور پر بیان کیا گیا ہے:

”قال الشيخ ابو منصور معنى قوله لنعلم كائنا موجودا ما قد علمناه انه يكون ويوجد فالله تعالى عالم في الازل بكل ما اراد وجوده انه يوجد في الوقت الذي شاء وجوده فيه ولا يوصف بانه عالم في الازل بانه موجود كائن لانه ليس بموجود في الازل فكيف يعلمه موجودا فاذا صار موجودا يدخل تحت علمه الازلي فيصير معلوما له موجودا كائنا والتغير على المعلوم لا على العلم“ (مدارك)

اس عبارت کا خلاصہ یہ ہے کہ شیخ ابو منصور فرماتے ہیں کہ اگرچہ اللہ تعالیٰ کو علم ازلی حاصل ہے کہ فلاں چیز نے موجود ہونا ہے لیکن پہلے علم معدوم سے ہوگا جس نے بعد میں موجود ہونا ہے۔ اور جب وہ چیز موجود ہو جائے گی اب موجود سے تعلق ہوگا یہاں علم میں تبدیلی نہیں بلکہ معلوم میں تبدیلی ہے۔ یعنی پہلے علم وہ تھا کہ معلوم مقام ظہور میں نہیں تھا اب علم ہے کہ معلوم مقام ظہور میں ہے۔ اب آپ تراجم میں فرق دیکھیں کہ یہ کہا جائے تاکہ ہم معلوم کریں تو یہ اعتراض مندرج ہوگا یا یہ کہا جائے کہ ”ہم دیکھیں“ تو اعتراض مندرج ہوگا۔ یہ ہے مولنا احمد رضا خان رحمہ اللہ کی علمی بصیرت جس میں صاحب نظر کو اعتراف کرنے میں کوئی کلام نہیں۔ (تسکین الجنان ص ۵۲، ۵۳)

﴿مِمَّنْ يَنْقَلِبُ عَلَىٰ عَقْبَيْهِ﴾: ”استعارة ومعناه من يكفر بالله ورسوله“ اس میں استعارہ پایا گیا ہے معنی اس کا یہ ہے کہ ”کون اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ سے کفر کرتا ہے۔“

وجہ تشبیہ یہ ہے کہ ایڑیوں کے بل پلٹ جانے والا، یعنی الٹے پاؤں پھرنے والا اپنے سامنے والی چیز کو چھوڑ دیتا ہے اور اس سے منہ پھیر لیتا ہے جب انہوں نے بھی ایمان کو چھوڑ دیا اور دلائل کو چھوڑ دیا تو وہ اپنے سامنے والی چیزوں کو چھوڑنے والے ہو گئے۔ اسی وجہ سے رب تعالیٰ نے ان کا ذکر ان الفاظ مبارکہ سے کیا ہے ”ثم ادبر واستكبر“ پھر پیٹھ پھیر لی اور تکبر کیا۔ (کبیر)

﴿وَإِنْ كَانَتْ لَكَبِيرَةً إِلَّا عَلَى الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ﴾

اور بیشک یہ بھاری تھی سوائے ان لوگوں کے جن کو اللہ نے ہدایت دی۔ ”كانت“ میں ضمیر

ما قبل کلام سے حاصل ہونے والے مضمون کی طرف لوٹ رہی ہے اس لئے ضمیر کا مرجع ”الجعلۃ“ یا ”التولیۃ“ یا ”التحویلۃ“ یا ”القبلة“ ہے یہ سب مؤنث ہیں اس لئے ضمیر بھی مؤنث کی ہے مفہوم یہ ہے کہ قبلہ کو بدلنا منافقین پر بھاری تھا لیکن مخلصین مؤمنین جن کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت سے نوازا رکھا تھا ان پر کوئی بھاری نہیں تھا۔

طلباء کرام توجہ فرمائیں: لفظ ”ان“ کا استعمال چار طرح ہوتا ہے۔

(۱) ان شرطیہ جس کے بعد جزاء آتی ہے۔ (۲) ان زائدہ جس کا کوئی معنی نہیں ہوتا۔

(۳) ان نافیہ جو نفی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے (۴) ان مخففہ من المثقلۃ

یعنی یہ حرف مشبہ بالفعل ہوتا ہے جس کی تشدید کو ختم کر کے مخفف بنا لیا جاتا ہے یہ مخفف ہونے کے باوجود معنی تحقیق کا ہی دیتا ہے اس کی خبر پر لام آتا ہے تاکہ ان نافیہ اور مخففہ من المثقلۃ میں فرق ہو جائے اسی وجہ سے ”لَکَبِیرَۃ“ پر لام آیا ہوا ہے۔ بعض نحو یوں نے اس آیت کریمہ میں ”ان نافیہ“ کہا ہے اور ”لام“ جو کہ ”لَکَبِیرَۃ“ میں ہے اسے ”الا“ کے معنی میں لیا ہے لیکن یہ قول درست نہیں۔ (از کبیر و روح المعانی)

﴿وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُضِيعَ إِيمَانَكُمْ﴾ اور نہیں اللہ ضائع کرتا تمہاری نمازوں کو۔

”ایمان کا ایک مجازی معنی لیا گیا ہے یعنی نماز۔ اس معنی کے لحاظ پر مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ تمہاری نمازیں جو منسوخ قبلہ کی طرف منہ کر کے ادا کی گئیں ہیں ان کو ضائع نہیں کرتا۔

”ففی الصحیح انه لما وجه رسول اللہ ﷺ الی القبلة قالوا یا رسول اللہ فکیف بالذین ماتوا و ہم یصلون الی بیت المقدس فنزلت“

حدیث شریف میں ہے کہ جب نبی کریم ﷺ نے کعبہ شریف کی طرف منہ پھیر لیا تو صحابہ کرام نے عرض کیا یا رسول اللہ ان لوگوں کا کیا ہوگا جو بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرتے رہے اور فوت بھی ہو چکے ہیں۔ تو اس وقت اس آیت کریمہ کا نزول ہوا کہ اللہ تعالیٰ تمہاری نمازوں کو ضائع نہیں کرتا۔ اس معنی کے لحاظ پر لازم کا اطلاق ملزوم پر ہے یعنی اطلاق ایمان کا مراد نماز ہے۔ تاہم ”ایمان“ حقیقی معنی میں بھی استعمال ہے یعنی ”ثباتکم علی الایمان“ تمہارے ایمان پر ثابت رہنے کو اللہ تعالیٰ ضائع

نہیں کرتا اسی طرح یہ معنی بھی مراد لیا گیا ہے ”ایمانکم بالقبلة المنسوخة“ بیشک اللہ تعالیٰ منسوخ قبلہ پر تمہارے ایمان کو ضائع نہیں کرتا۔
(از روح المعانی)

خیال رہے کہ علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے مجازی معنی کو رائج قرار دیا ہے کہ ”ایمان“ بمعنی نماز مراد لینا بہتر ہے راقم نے یہی معنی ذکر کیا تا کہ طلباء کو دونوں معانی ذہن نشین ہو جائیں۔

﴿إِنَّ اللَّهَ بِالنَّاسِ لَرُؤُوفٌ رَّحِيمٌ﴾ بیشک اللہ لوگوں پر بہت مہربان رحم کر نیوالا ہے

اللہ تعالیٰ نے اپنی ان دو صفات کا خصوصی طور پر ذکر کر کے ثابت کر دیا کہ ”ان الله لا يضيع اجورهم ولا يدع مافيه صلاحهم“ بیشک اللہ تعالیٰ ان کے اجر و ثواب کو ضائع نہیں کرے گا اور ان کے لئے بہتری کو نہیں چھوڑے گا۔ اس کی وجہ یہ کہ ”لان رافة بالناس واضاعته ما كان منهم من العبادات التي افضلها الايمان متنافيان“ اللہ تعالیٰ کا لوگوں پر مہربان ہونا اور ان کی عبادات کو خصوصاً افضل العبادات ایمان کو ضائع کرنا یہ دو متنافی چیزیں ہیں چونکہ یہ قانون ہے کہ دو متنافی چیزوں میں جب ایک پائی جائے تو دوسری کا نہ پایا جانا ضروری ہے جب رب تعالیٰ اپنے بندوں پر رؤف (مہربان) ہے تو یقیناً ان کی عبادات کو ضائع نہیں فرماتا۔ رؤف کو پہلے ذکر کیا اور رحیم کو بعد میں ”لان الرافة بمعنى الرحمة الا انها اشد وابلغ من الرحمة“ اس لئے کہ رافة بھی اگرچہ رحمت کے معنی میں استعمال ہے لیکن رافة میں بنسبت رحمة کے اشد اور ابلاغ رحمت پائی گئی ہے۔ اس لئے خاص کو ذکر کیا اور عام کو بعد میں۔

رافة میں رفع المکروه و ازالة الضرر (مکروہ چیز کو اٹھانا اور ضرر کو دور کرنا) پایا گیا ہے اور رحمت میں حصول منافع پایا گیا ہے۔ اس لئے افضال (فضیلت دینا) اور دفع ضرر اہم چیزیں ہیں بنسبت حصول منافع کے اسی وجہ سے رؤف کو رحیم سے پہلے ذکر کیا گیا ہے اور وجہ یہ ہے کہ رب تعالیٰ کی صفت رافة کا تعلق اپنے خاص مؤمنین بندوں سے ہے لیکن صفت رحمة عام ہے بنسبت رافة کے لہذا صفات کی ترتیب متعلقین کے شرف و قدر کا اعتبار کرتے ہوئے رکھی گئی ہے۔

(از شیخ زادہ روح المعانی)

﴿ قَدْ نَرَى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَاءِ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضَاهَا فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ وَإِنَّ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ لَيَعْلَمُونَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُونَ ﴾

(۱) ”ہم دیکھ رہے ہیں بار بار تمہارا آسمان کی طرف منہ کرنا تو ضرور ہم تمہیں پھیر دیں گے اس قبلہ کی طرف جس میں تمہاری خوشی ہے ابھی اپنا منہ پھیر دو مسجد حرام کی طرف اور اے مسلمانو تم جہاں کہیں ہو اپنا منہ اسی کی طرف کرو اور وہ جنہیں کتاب ملی ہے ضرور جانتے ہیں کہ یہ ان کے رب کی طرف سے حق ہے اور اللہ ان کے کوتلوں سے بے خبر نہیں۔“

(۲) ”تحقیق ہم دیکھ رہے ہیں پھیرنا تمہارا منہ آسمان کی طرف، تو ضرور ہم پھیر دیں گے تمہیں اس قبلہ کی طرف جس میں تمہاری رضاء ہے تو پھیر لو اپنا منہ مسجد حرام کی طرف اور جہاں بھی (اے مسلمانو) تم ہو پھیر لو اپنے منہ اسی کی طرف اور بیشک وہ لوگ جن کو کتاب دی گئی وہ ضرور جانتے ہیں بیشک یہ حق ہے انکے رب کی طرف سے اور نہیں اللہ غافل اس سے جو وہ عمل کرتے ہیں۔“

شان نزول: نبی کریم ﷺ نے مدینہ طیبہ میں سولہ سترہ ماہ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز ادا کی۔ لیکن دل میں تمنا تھی کہ قبلہ کعبہ شریف ہو جائے تو اسی خواہش پر وحی کے انتظار میں بار بار آپ اپنا منہ آسمانوں کی طرف پلٹ رہے تھے تو رب تعالیٰ نے اس آیت کریمہ کو نازل فرمایا کہ اے محبوب ہم آپ کے بار بار چہرہ کو آسمانوں کی طرف اٹھانے کو دیکھ رہے ہیں ہم آپ کو اسی قبلہ کی طرف پھیر دیں گے جو آپ کو پسند ہے پھر ساتھ ہی حکم دے دیا کہ آپ اپنا منہ مسجد حرام کی طرف کر لیں۔

”ذکر الامام القرطبی ان العلماء قالوا هذه الآية مقدمة فی النزول علی قوله تعالیٰ (سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ) الخ“

علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا ہے کہ علماء نے یہی بیان فرمایا کہ یہ آیت نزول کے لحاظ پر

(سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ) آیت سے پہلے ہے ”وفی الكواشی ان قوله تعالى (قد نرى) مستقبل لفظاً و ماضی معنی و متأخر تلاوة متقدم معنی لان رأس القصة“ تفسیر کواشی میں ہے بیشک اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ”قد نرى“ لفظاً مستقبل ہے اور معنی ماضی ہے اور تلاوت کے لحاظ سے متأخر ہے اور معنی کے لحاظ سے مقدم ہے کیونکہ یہی واقعہ کی بنیاد اور اصل ہے تاہم ”سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ“ آیت کی وضاحت میں معتبر قول یہ ہے کہ وہ تحویل قبلہ سے پہلے نازل ہوئی۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے۔ آیت کریمہ کی وضاحت سے پہلے احادیث کو ذکر کیا جاتا ہے جس سے واقعہ کی تفصیل واضح ہو جائے گی۔

تحویل قبلہ کے متعلق احادیث مبارکہ:

بیہقی نے سنن میں اور ابوداؤد نے ناخ و منسوخ میں اور ابن ابی شیبہ نے حضرت عبداللہ بن عباس سے روایت کیا ہے کہ ”کان رسول اللہ ﷺ یصلیٰ و هو بمكة نحو بیت المقدس و الکعبة بین یدیه و بعد ما تحول الی المدینة ستة عشر شهرا ثم صرف الی الکعبة“ رسول اللہ ﷺ مکہ میں بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے جبکہ کعبہ آپ کے سامنے ہوتا اور پھر مدینہ طیبہ میں قبلہ بیت المقدس مقرر کر دیا گیا پھر سولہ ماہ بعد کعبہ کی طرف منہ کرنے کا حکم دے دیا گیا۔

(حفاظی)

☆ ”عن البراء قال کان رسول اللہ ﷺ یصلیٰ نحو بیت المقدس و یکثر النظر الی السماء ینتظر امر اللہ فانزل اللہ (قد نرى قلب و جھک فی السماء فلنولینک قبلہ تر ضھا فول و جھک شطر المسجد الحرام) فقال رجال من المسلمین و ددنا لو علمنا علم من مات منا قبل ان نصرف الی القبلة و کیف بصلاتنا نحو بیت المقدس فانزل اللہ (وما کان اللہ لیضیع ایمانکم) و قال السفهاء من الناس و هم اهل الکتاب ما ولا هم عن قبلتهم الی کانوا علیها فانزل اللہ (سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ) الخ“

حضرت براء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے سولہ سترہ ماہ نماز ادا فرماتے رہے اور آپ زیادہ نظر آسمانوں کی طرف کرتے کیونکہ آپ اللہ تعالیٰ کے حکم کی انتظار فرماتے تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت ﴿قَدْ نَرَىٰ تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَاءِ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضَاهَا﴾

قَوْلٍ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ﴿۱﴾ کو نازل فرمایا مسلمانوں میں سے کچھ حضرات نے کہا کہ ہم چاہتے ہیں کہ ہمیں یہ معلوم ہو جائے کہ جو لوگ ہم میں سے قبلہ کے تبدیل کرنے کے حکم سے پہلے فوت ہو گئے ان کی نمازوں کا حکم کیا ہے اور جو ہم نے بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نمازیں ادا کی ہیں ان کا حکم کیا ہے؟ تو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا ﴿وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُضِيعَ إِيمَانَكُمْ﴾ اور اللہ تمہاری نمازوں کو ضائع نہیں فرماتا اور بیوقوف لوگ اہل کتاب کہنے لگے کہ ان لوگوں کو اس قبلہ سے کس چیز نے پھیر دیا ہے جس پر یہ تھے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ ﴿سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ﴾ نازل فرمائی۔

(مسلم)

☆ "عن ابن عباس ان رسول الله ﷺ لما هاجر الى المدينة امره الله ان يستقبل بيت المقدس ففرحت اليهود فاستقبلها رسول الله ﷺ بضعة عشر شهرا وكان رسول الله ﷺ يحب قبلة ابراهيم فكان يدعو الله وينظر الى السماء فانزل الله عز وجل ﴿قُولُوا وَجُوهَكُمْ شَطْرَهُ﴾ ای نحوہ، فارتاب من ذلك اليهود وقالوا ما ولا هم عن قبلتهم التي كانوا عليها فانزل الله ﴿قُلْ لِلَّهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ اِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ﴾ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے جب مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت فرمائی تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم فرمایا کہ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز ادا کریں۔ یہود اس پر خوش ہوئے آپ نے سولہ، سترہ ماہ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز ادا کی آپ پسند فرماتے تھے کہ ابراہیم علیہ السلام کا قبلہ (کعبہ) ہمارا بھی قبلہ ہو جائے آپ اللہ تعالیٰ سے دعا فرماتے اور آسمانوں کی طرف دیکھتے تو اللہ تعالیٰ نے ﴿قُولُوا وَجُوهَكُمْ شَطْرَهُ﴾ "تم اپنے منہ مسجد حرام کی طرف پھیر لو" نازل فرمایا۔ یہود کو اس پر شک ہوا وہ بے وقوف کہنے لگے کس نے ان کو اس قبلہ سے پھیر دیا جس پر تھے تو اللہ تعالیٰ نے ﴿قُلْ لِلَّهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ اِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ﴾ "فرما دو اللہ کے لئے ہی مشرق و مغرب ہے ہدایت دیتا ہے جسے چاہے سیدھی راہ کی" کو نازل فرمایا۔

☆ "عن البراء ان النبي ﷺ صلى قبل بيت المقدس ستة عشر شهرا او سبعة عشر شهرا وكان يعجبه قبلته قبل البيت وانه صلى صلوة العصر وصلى معه قوم فخرج رجل ممن كان يصلي معه فمر على اهل المسجد وهم راكعون فقال اشهد بالله لقد صليت مع رسول الله ﷺ قبل مكة فداروا كما هم قبل البيت"

(ابو نعیم)

حضرت براء فرماتے ہیں بیشک نبی کریم ﷺ نے بیت المقدس کی طرف سولہ سترہ ماہ منہ کر کے نماز ادا فرمائی آپ کو پسند یہ تھا کہ آپ کا قبلہ کعبہ شریف ہو جائے۔ بیشک آپ عصر کی نماز ادا فرما رہے تھے اور قوم نے بھی آپ کے ساتھ نماز ادا کی (جس میں قبلہ کے تبدیل کرنے کا حکم آیا) ایک شخص جو آپ کے ساتھ نماز ادا کرنے میں شریک تھے وہ نماز ادا کرنے کے بعد اپنے قبیلہ کی طرف گئے تو دیکھا کہ لوگ نماز ادا کر رہے ہیں جو رکوع میں تھے انہوں نے کہا میں اللہ کی گواہی دیتا ہوں کہ تحقیق میں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نماز ادا کی آپ نے نماز کعبہ کی طرف منہ کر کے ادا کی وہ لوگ نماز میں ہی کعبہ شریف کی طرف پھر گئے۔

اعتراض : جو حدیث تم نے ابھی بیان کی اس سے تو پتہ چلتا ہے کہ تحویل قبلہ کا حکم عصر کی نماز میں آیا اور دوسری حدیث میں ظہر کی نماز کا ذکر ہے دونوں حدیثوں میں تطبیق کیسے ہے؟ وہ حدیث جس میں ظہر کا ذکر ہے وہ یہ ہے:

☆ "عن ابن عمر ان اول صلاة صلاها رسول الله ﷺ الى الكعبة صلاة الظهر وانها الصلاة الوسطى"

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں بیشک پہلی نماز جو رسول اللہ ﷺ نے کعبہ شریف کی طرف منہ کر کے ادا کی وہ ظہر کی تھی بیشک وہ نماز وسطیٰ ہے۔

جواب: "والمشهور ان اول صلاة صلاها الى الكعبة صلاة العصر ولهذا تاخر الخبر عن اهل قباء الى صلاة الفجر" (ماخوذ از کبیر)

مشہور یہی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے سب سے پہلے جو نماز کعبہ شریف کی طرف منہ کر کے ادا کی وہ عصر کی نماز تھی۔ اسی وجہ سے قباء والے حضرات کو دوسرے دن صبح کی نماز میں تحویل قبلہ کے متعلق پتہ چلا۔ راقم کے نزدیک جس حدیث میں ظہر کا ذکر ہے اس سے مراد بھی عصر کی نماز ہے کیونکہ اسے صلوٰۃ وسطیٰ کہا گیا ہے جب کہ مشہور یہی ہے کہ صلوٰۃ وسطیٰ عصر کی نماز ہے۔ پھر ظہر کا اطلاق عصر پر اور عشاء کا اطلاق مغرب پر کئی احادیث میں مذکور ہے۔

☆ "عن ابن عمر قال بينهما الناس في صلاة الصبح بقباء اذ جاءهم رجل فقال ان رسول الله ﷺ قد انزل عليه قرآن وامر ان يستقبل الكعبة الا فاستقبلوها"

فاستداروا کھینتھم الی الکعبۃ وکان وجہ الناس الی الشام“

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ لوگ صبح کی نماز قبا میں ادا کر رہے تھے ان کے پاس ایک شخص آیا اس نے کہا بیشک رسول اللہ ﷺ پر قرآن نازل ہوا آپ کو کعبہ شریف کی طرف منہ کرنے کا حکم دے دیا گیا۔ خبردار تم بھی کعبہ کی طرف منہ کر لو سب لوگ نماز میں ہی پھر گئے، کعبہ کی طرف منہ کر لیا حالانکہ پہلے وہ شام (بیت المقدس) کی طرف منہ کر کے نماز ادا کر رہے تھے۔ (احکام القرآن للجصاص)

تحويل قبلہ کس ماہ میں ہوا:

نبی کریم ﷺ نے پانچ ربیع الاول پیر کے دن مکہ مکرمہ سے ہجرت فرمائی اور بارہ ربیع الاول پیر کے دن مدینہ طیبہ پہنچے اور قبلہ شریف کی تبدیلی کا حکم دوسرے سال بدر کے واقعہ سے دو ماہ پہلے پندرہ رجب زوال کے بعد آیا۔

ایک قول علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے بھی یہی بیان کیا اور اس کے بعد دوسرا قول یہ بیان کیا ابو حاتم بستی رحمہ اللہ نے فرمایا نبی کریم ﷺ مدینہ طیبہ میں بارہ ربیع الاول پیر کو پہنچے اور قبلہ شریف کی تبدیلی کا حکم بدھ نصف شعبان کو ہوا۔ اسی وجہ سے بعض روایات میں سولہ ماہ کا ذکر ہے اور بعض میں سترہ ماہ کا ذکر ہے دراصل عرب حضرات اس وقت کسور کا اعتبار نہیں کرتے تھے۔ سولہ ماہ سے کچھ دن اوپر ہونے پر کچھ حضرات سولہ ماہ ہی کہتے تھے اور کچھ سترہ ماہ کہہ لیتے تھے اسی طرح پندرہ ماہ سے کچھ دن زائد ہونے پر بھی سولہ ماہ کہہ لیا جاتا تھا۔ اس پر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول دلیل ہے۔

”رواہ الحاکم بسند صحیح عن ابن عباس فمن اعتبر الايام شهرا كاملا عد سبعة عشر والا فسته عشر“

حاکم نے سند صحیح سے روایت کی کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا جن حضرات نے چند دنوں کو ایک ماہ مکمل شمار کر لیا انہوں نے سترہ ماہ کہہ لیا۔ اور جنہوں نے زائد دنوں کا اعتبار نہیں کیا انہوں نے سولہ ماہ کہہ لیا۔

(از مظہری)

خیال رہے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول اور ابو حاتم بستی رحمہ اللہ کے قول میں اتفاق

نظر آتا ہے۔

کس مسجد میں قبلہ کی تبدیلی کا حکم آیا:

”وقیل نزل ذلك على النبي ﷺ في مسجد بني سلمة وهو في صلوة الظهر بعد ركعتين منها فتحول في الصلوة فسمى ذلك المسجد مسجد القبلتين“

بیان یہ کیا گیا ہے کہ قبلہ کی تبدیلی کا حکم مسجد بنی سلمہ میں نازل ہوا جب کہ آپ ظہر کی نماز ادا فرما رہے تھے دو رکعت بیت المقدس کی طرف منہ کر کے ادا کی جا چکی تھیں، جب حکم آیا تو آپ نماز میں ہی پھر گئے اسی وجہ سے اس مسجد کو ذو قبلتین کہا جاتا ہے۔ اب بھی اس مسجد کے دو محراب بنائے گئے ہیں ایک بیت المقدس کی جانب اور دوسرا کعبہ شریف کی جانب تاہم بورڈ آویزاں ہیں عربی میں تحریر ہے کہ نماز صرف کعبہ شریف کی طرف منہ کر کے ادا کی جائے بعض جاہل حضرات بیت المقدس کی طرف بھی منہ کر کے نماز ادا کرتے ہیں جو ناجائز ہے۔

راقم جیسے گہنگار کو بھی اس مسجد میں نفل ادا کرنے کی سعادت حاصل ہوئی راقم کے ساتھ برادر محترم مولانا فضل دین نقشبندی مدرس جامعہ رضویہ ضیاء العلوم راولپنڈی بھی تھے۔

”قال عباد بن بشر بن قيطي ان رسول الله ﷺ قد استقبل القلبة او قال البيت الحرام فتحول الرجال مكان النساء وتحول النساء مكان الرجال“

عباد بن بشر نے بیان فرمایا کہ بیشک رسول اللہ ﷺ نے جب قبلہ یعنی مسجد حرام کی طرف منہ پھیرا تو مرد عورتوں کی جگہ آگئے اور عورتیں مردوں کی جگہ آگئیں (اور خود نبی کریم ﷺ کعبہ کی جانب آگے تشریف لے گئے)۔
(فرطی)

مکہ مکرمہ میں نبی کریم ﷺ کا قبلہ کیا تھا؟

اس میں ایک قول پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ مکہ مکرمہ میں بھی آپ کا قبلہ بیت المقدس ہی تھا البتہ آپ اس طرح کھڑے ہوتے کہ کعبہ شریف بھی آپ کے سامنے ہوتا مدینہ طیبہ میں چونکہ کعبہ شریف جنوبی جانب ہے اور بیت المقدس شمالی جانب ہے دونوں مختلف سمتوں میں ہونے کی وجہ سے بیک مرثبہ سامنے نہیں ہو سکتے تھے اس لئے سولہ سترہ ماہ فقط بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرنے کا حکم جاری رہا پھر قبلہ تبدیل کر کے کعبہ شریف بنا دیا گیا۔

دوسرا قول یہ ہے کہ مکہ مکرمہ میں قبلہ کعبہ شریف تھا مدینہ طیبہ میں بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرنے کا حکم دیا گیا اور سولہ سترہ ماہ کے بعد قبلہ کو تبدیل کر کے پھر کعبہ شریف کو قبلہ بنا دیا گیا۔ اس قول کے متعلق علامہ قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ”قال ابو عمر وهذا اصح القولین عندی“ ابو عمر کہتے ہیں دونوں قولوں میں سے میرے نزدیک یہی قول زیادہ صحیح ہے۔ (از قرطبی)

راقم کا بھی پہلے یہی موقف رہا اب تفاسیر کے مطالعہ سے اور فتح الباری، نووی، عمدۃ القاری، مرقاۃ کو دیکھنے سے پہلا قول زیادہ رائج نظر آیا..... واللہ اعلم بالصواب۔

مسئلہ: بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرنے کا صراحۃً ذکر قرآن پاک میں نہیں بلکہ حدیث پاک میں ہے اس سے ایک بات تو یہ سمجھ آئی کہ قرآن پاک کو سمجھنے کے لئے حدیث پاک کا سمجھنا ضروری ہے۔ حدیث پاک کے بغیر قرآن پاک پر عمل ممکن ہی نہیں۔ دوسری بات یہ سمجھ آئی کہ قرآن پاک سے حدیث پاک کو منسوخ کرنا جائز ہے۔ (ماخوذ از قرطبی)

شان صحابہ کرام: تحویل قبلہ کے حکم سے صحابہ کرام کی شان واضح طور پر سمجھ آتی ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کو نماز کی حالت میں پھرتا ہوا دیکھ کر ہی اپنے اپنے رخ پھیر لئے کسی نے اس میں کوئی حجت بازی نہیں کی۔ پھر جہاں جہاں خبر پہنچتی رہی وہاں وہاں بلا چون و چرا لوگ اپنا قبلہ بدلتے رہے۔ سبحان اللہ وہ کتنے ہی شریعت کے پابند تھے اور کتنے ہی زیادہ نبی کریم ﷺ سے محبت کر نیوالے تھے۔

آیت کریمہ کی قدرے وضاحت:

” (قَدْ نَرَى) ربمانری (تَقْلُبَ وَجْهَكَ فِي السَّمَاءِ) تردد وجهک فی جہۃ السماء تطلعا للوحی “ ہم بار بار آپ کا منہ آسمانوں کی طرف پلٹتے ہوئے دیکھ رہے ہیں وحی کی انتظار میں نبی کریم ﷺ اپنا رخ بار بار آسمانوں کی طرف اٹھاتے۔

” قد نری “ کا معنی ” ربمانری “ کیا گیا ہے یہ بتانا مقصود ہے کہ ” قد فی قولہ تعالیٰ قد نری للتکثیر ومعناها کثرة الرؤیة “ لفظ ” قد “ اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی ” قد نری “ میں کثرت کے معنی میں استعمال ہے معنی اس کا کثرت رویت ہے یعنی ہم بار بار دیکھ رہے ہیں۔ اگرچہ

”قد“ مضارع پر داخل ہو تو تقلیل کے معنی میں آتا ہے لیکن کبھی مجازی طور پر تکثیر کے لئے بھی آتا ہے۔ جس طرح ”رب“ تقلیل کے لئے آتا ہے لیکن کبھی تکثیر کے لئے بھی آتا ہے۔ وجہ اس کی یہ ہوتی ہے کہ دو چیزیں جو ایک دوسری کی ضد ہیں ان میں مناسبت برقرار رہے۔ (از بیضاوی و شیخ زادہ)

نبی کریم ﷺ پسند کرتے تھے کہ آپ کا قبلہ کعبہ ہو جائے کیونکہ یہود کہتے تھے ”یخالفنا محمد فی دیننا ویتبعنا قبلتنا“ محمد ہمارے دین کی مخالفت کرتے ہیں اور ہمارے ہی قبلہ کی تابعداری کرتے ہیں۔ تو نبی کریم ﷺ نے ایک دن جبریل کو کہا کہ میں یہ پسند کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہمارا قبلہ کعبہ کر دے کیونکہ وہ قبلہ ہی میرے باپ ابراہیم کا ہے تو حضور کی خدمت میں جبریل نے عرض کیا۔
”انما انا عبد مثلك وانت کریم علی ربك فاسئل انت ربك فانك عند المکان“
میں تو آپ کی طرح اللہ تعالیٰ کا بندہ ہوں البتہ آپ اللہ تعالیٰ کے ہاں مکرم ہیں اور آپ کا اللہ تعالیٰ کے ہاں خاص مقام ہے اس لئے آپ اپنے رب سے سوال کرو۔ تو رسول اللہ ﷺ اللہ تعالیٰ سے کثیر دعاء فرماتے اور بار بار آسمانوں کی طرف نظر اٹھاتے اس انتظار میں کہ اللہ تعالیٰ کا حکم کب آتا ہے تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کریمہ کو نازل فرمایا۔
(از مظہری)

جبریل سے کہنے میں حکمت: نبی کریم ﷺ نے قبلہ کی تبدیلی کا ذکر پہلے جبریل سے کیا کہ آپ چاہتے ہیں کہ قبلہ تبدیل کر دیا جائے ”فاخبرہ جبریل بان الله تعالى قد اذن له فی هذا الدعاء“ تو جبریل نے آپ کو خبر دی کہ بیشک اللہ تعالیٰ آپ کو قبلہ کے تبدیل کرنے کے لئے دعاء کرنے کی اجازت دیتا ہے:

”وذلك لان الانبياء لا يسألون الله تعالى شياً الا باذن منه لنلا يسألوا مالا صلاح فيه فلا يجابوا اليه فيفضي ذلك الى تحقير شأنهم“

اس کی وجہ دراصل یہ تھی کہ انبیاء کرام اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر کوئی سوال نہیں کرتے کہ ایسا نہ ہو کہ وہ ایسا سوال کر دیں جو بہتر نہ ہو اور ان کی دعاء کو قبول نہ کیا جائے کہ ان کی تحقیر شان لازم آئے۔

واضح ہوا کہ انبیاء کرام کوئی ایسا سوال نہیں کرتے جو قبول نہ ہو۔ بلکہ رب تعالیٰ سے اجازت لے کر سوال کرتے ہیں یا پھر رب تعالیٰ کی طرف سے انبیاء کرام کو پہلے ہی منع کر دیا جاتا ہے کہ فلاں چیز کی

دعاء نہ کرنا۔

”فلما اذن الله تعالى له في الاجابة علم انه يستجاب اليه فكان يقلب وجهه في السماء ينتظر مجنى جبريل عليه السلام بالوحي في الاجابة“

جب اللہ تعالیٰ نے آپ کو دعاء کرنے کی اجازت دے دی کہ آپ کی دعاء کو قبول کیا جائے گا آپ دعاء کی قبولیت کے یقین پر آسمانوں کی طرف بار بار چہرہ اٹھا کر دیکھتے کہ کب جبریل قبولیت کی وحی لاتے ہیں۔

(از کبیر)

اعتراض: بیت المقدس جب رب تعالیٰ کے حکم سے قبلہ بنایا گیا تھا تو نبی کریم ﷺ اس کے خلاف خواہش کرنا تو رب تعالیٰ کی منشا کے خلاف ہو گیا۔ گویا کہ رب تعالیٰ کی مرضی پر اپنی مرضی کو ترجیح دینا لازم آ گیا یہ کس طرح صحیح ہے؟

جواب: نبی کریم ﷺ کے دل میں رب تعالیٰ نے ہی ڈالا۔ خواہش کے مطابق کام اس وقت ہوتا جب رب تعالیٰ کے حکم کے بغیر ہوتا۔ جب تمنا یہ تھی کہ رب تعالیٰ اجازت دے دے تو یہ تمنا دراصل رب تعالیٰ کی رضا کے مطابق ہے ”وای بعد فی ان یمل طبع الرسول الی شنی فیتمنی فی قلبه ان یاذن الله له فیہ“ اس میں کون سی خرابی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی طبیعت ایک چیز کی طرف مائل ہو، اور آپ کے دل میں یہ تمنا ہو کہ رب تعالیٰ اسی کا حکم دے دے۔ (از کبیر)

کعبہ کی تمنا کی وجوہ:

(۱) اس میں ایک وجہ تو وہی تھی جس کا ذکر پہلے ہوا کہ یہود کہتے تھے کہ بیشک یہ ہمارے دین کی مخالفت کرتے ہیں اور ہمارے قبلہ کی تابعداری کرتے ہیں ”ولو لا نحن لم یدر این یستقبل“ اور اگر ہم نہ ہوتے انہیں معلوم ہی نہ ہوتا کہ نماز میں کدھر متوجہ ہونا ہے۔ تو نبی کریم ﷺ کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ قبلہ بدل جائے، کعبہ شریف کو قبلہ کا حکم آ جائے۔

(۲) ”ان الکعبۃ کانت قبلۃ ابراہیم“ دوسری وجہ یہ تھی کہ کعبہ چونکہ ابراہیم علیہ السلام کا قبلہ تھا اس لئے آپ چاہتے تھے کہ میرے جدا مجد ابراہیم علیہ السلام کا قبلہ ہی میرا قبلہ بھی ہو جائے۔

(۳) ”انہ علیہ السلام کان یقدر ان یصیر ذلک سیلا لا ستمالة العرب ولدخولہم فی الاسلام“ بیشک نبی کریم ﷺ کعبہ شریف کے قبلہ ہو جانے کی تمنا اس لئے کر رہے تھے کہ عرب لوگ اس کی طرف مائل ہو جائیں اور اسلام قبول کر لیں۔ کیونکہ ان کا پہلے سے ہی میلان کعبہ کی طرف ہی تھا کیونکہ وہ ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے۔

(۴) ”انہ علیہ السلام احب ان یحصل هذا الشرف للمسجد الذی فی بلدتہ ومنشئہ“ چوتھی وجہ یہ تھی کہ آپ یہ چاہتے تھے کہ یہ شرافت اس مسجد کو حاصل ہو جائے جو آپ کے پیدائش والے شہر میں ہے۔ آپ کا اپنے آبائی گاؤں کی طرف اس لئے میلان کہ اسے عظیم منصب ہو جائے فطرتی امر تھا۔ (از کبیر)

فَلَنُؤَلِّیکَ قِبْلَةً تَرْضَاهَا : کا مطلب یہ ہے کہ ہم تمہیں قبلہ کی طرف توجہ کرنے کی قدرت عطاء کر دیں گے جو قبلہ آپ کو پسند ہے ”ترضاها“ میں چند وجوہ ہیں ”احدها ترضاها تحبها وتمیل الیہا لان الکعبۃ کانت احب الیہ من غیرہا بحسب میل الطبع“ ان میں سے ایک یہ ہے کہ ”ترضاها“ کا معنی یہ ہے کہ جس سے آپ محبت کرتے ہیں اور جس کی طرف آپ میلان کرتے ہیں کیونکہ کعبہ شریف کی طرف آپ کا طبعی طور پر میلان زیادہ تھا۔ ”وثانیہا (قبلة ترضاها) ای تحبها بسبب اشتمالہا علی المصالح الدینیۃ“ اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ ہم ضرور بر ضرور پھیر دیں گے اس قبلہ کی طرف جسے تم پسند کرتے ہو کیونکہ اس میں کئی دینی مصلحتیں پائی گئی ہیں ”وثالثہا قال الاصم ای کل جهة وجہک اللہ الیہا فہی لک رضا لا یجوز ان تسخط کما فعل من انقلب علی عقبیہ من العرب الذین کانوا قد اسلموا فلما تحولت القبلة ارتدوا“

اور تیسری وجہ جو اصم رحمہ اللہ نے بیان کی وہ یہ ہے کہ رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی کا مطلب یہ ہے کہ ہم آپ کا قبلہ تبدیل کر رہے ہیں لیکن آپ کو تو جس طرف متوجہ ہونے کا حکم دے دیا گیا آپ تو اسی پر راضی رہیں گے آپ سے ناراض ہونے کا تصور تو ممکن نہیں، جس طرح عرب حضرات میں سے بعض اسلام لانے کے باوجود قبلہ کی تبدیلی کے حکم کے بعد (العیاذ باللہ) مرتد ہو گئے تھے۔

”ورابعہا (ترضاها) ای ترضی عاقبتہا لانک تعرف بہا من یتبعک للاسلام ممن

یتبعک لغير ذلک من دنیا یصیبها او من یکتسبه

اور چوتھی وجہ یہ ہے کہ آپ قبلہ کی تبدیلی کے انجام پر راضی ہیں کیونکہ آپ کو تو معلوم ہے کہ کون آپ کی تابعداری صرف اسلام سے محبت کی وجہ سے کر رہا ہے، اور کون آپ کی تابعداری اس کے بغیر دنیاوی اغراض اور مال حاصل کرنے کے لئے کر رہا ہے۔ یعنی قبلہ کی تبدیلی کے بعد یہ دونوں فریق نمایاں طور پر علیحدہ علیحدہ نظر آئیں گے، جو اسلام کی وجہ سے آپ کی تابعداری کر رہے ہیں وہ تو پھر بھی تابعداری کرتے رہیں گے اور جو دنیاوی اغراض و مقاصد کی وجہ سے تابعداری کر رہے ہیں وہ پھر جائیں گے۔

(از کبیر)

خیال رہے کہ ”ترضاہا“ میں یہ وجوہ ذکر کرنے کی ضرورت اس لئے درپیش آئی کہ درحقیقت ایک سوال کو مندرج کرنا مقصود تھا وہ سوال یہ تھا کہ ”رضا“ بمقابلہ ”سخط“ استعمال ہوتا تھا ”سخط“ کا معنی ناراض ہونا اور ”رضا“ کا معنی ناراض نہ ہونا۔ نبی کریم ﷺ کا بیت المقدس کی طرف منہ کرنے پر ناراض ہونے کا کیا مطلب؟ واضح کر دیا کہ یہاں ”رضا“ کے اور مطالب ہیں۔ ناراض نہ ہونے والا معنی نہیں لیا گیا۔

فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ: ”فا“ تعقیب مع الوصل کو چاہتی ہے جس سے پتہ چلا کہ ”فَلتَوَلِّیْنِکَ“ ارشاد فرما کر ساتھ ہی حکم دے دیا کہ اب آپ کعبہ کی طرف منہ پھیر لیں۔ وجہک سے مراد: ذکر ”وجہ“ ہے لیکن مراد اس سے تمام بدن ہے کیونکہ انسان پر واجب ہے کہ اپنے تمام بدن سے قبلہ کا استقبال کرے، صرف چہرہ کو قبلہ کی طرف کرنا اور باقی بدن کو قبلہ سے پھیر لینا جائز نہیں۔ چونکہ ”وجہ“ (چہرہ) تمام اعضاء سے اشرف ہے اسی سے ایک دوسرے انسان کے درمیان تمیز ہوتی ہے۔ ”فلہذا السبب قد یعبر عن کل الذات بالوجه“ اسی وجہ سے کبھی ”وجہ“ کا ذکر کر کے مراد کل ذات لے لی جاتی ہے۔

شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ: یہاں ”شطر“ کا معنی طرف ہے اگرچہ ”شطر“ کا اصل میں معنی ہے ”جدا ہونا“ کہا جاتا ہے ”شطر“ جب وہ جدا ہو جائے جو گھر دوسرے گھروں سے علیحدہ ہوا سے ”دار شطور“ کہتے ہیں پھر ایک جانب طرف کو شطر کہہ لیا جاتا ہے خواہ جدا ہو یا نہ ہو۔

”والحرام المحرم ای محرم فیہ القتال او ممنوع عن الظلمة ان یتعرضوہ“

مسجد حرام کو حرام کہنے کی وجہ یہ ہے کہ وہاں قتل کرنا حرام ہے اور ظالمین کو وہاں ظلم کرنے کی اجازت نہیں۔ (تفصیل پہلے گزر چکی ہے)

مسجد کا ذکر کیا کعبہ کا نہیں، کیا وجہ؟ جب قبلہ کی تبدیلی کا حکم ہوا اس وقت نبی کریم ﷺ مدینہ طیبہ میں تھے جو مکہ مکرمہ سے دور ہے ”والبعد یکفیه مراعاة الجهة لان استقبال عینھا حرج علیہ بخلاف القریب“ اور دور والے کے لئے کعبہ کی جہت کی طرف منہ کرنا کافی ہے قریب والے کے لئے یعنی جسے کعبہ شریف نظر آ رہا ہو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ عین کعبہ کی طرف متوجہ ہو دور والے کے لئے عین کعبہ کی طرف توجہ کرنے کی قید لگانا حرج عظیم ہے۔

تنبیہ: پہلے پارہ میں ”قُلْ لِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ“ کی وضاحت کرتے ہوئے کافی حد تک مسئلہ واضح کر دیا گیا، یہاں اتنا سمجھا جائے کہ یہ ضروری نہیں کہ قبلہ کی سمت معین کرنے میں عمر ریاضی اور علم ہیئت اور موجودہ سائنسی آلات سے جو سمت معین ہوگی اسی کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی جائے تو نماز صحیح ہوگی ورنہ صحیح نہیں ہوگی، یہ کہنا سراسر غلط ہے۔

”ویدل علیہ ان الناس من عهد رسول اللہ ﷺ بنوا المساجد فی جمیع بلاد الاسلام ولم یحضر و اقط مهندساً عند تعیین جهة القبلة“

اس پر واضح دلیل یہ موجود ہے کہ نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں مختلف شہروں میں مسلمانوں نے مساجد تعمیر کیں انہوں نے قبلہ کی سمت مقرر کرنے کے لئے کسی ریاضی دان اور سائنس دان کو نہیں بلایا۔

”وحيث اجتمعت الامة من الصحابة والتابعين ومن بعدهم على صحة ما وقع فيها من الصلوة علمنا ان محاذاة عين الكعبة ليست بشرط“

اور اس میں صحابہ کرام اور تابعین اور بعد میں آنے والے علماء اور صلحاء کا اجماع کہ ان مساجد میں نماز صحیح ہے جو علم ہندسہ وغیرہ والے لوگوں کے بغیر ہی سمت مقرر کر کے بنائی گئی پتہ چلا کہ دور والوں کے لئے کعبہ کی جہت کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرنا ضروری ہے عین کعبہ کا تعین ضروری نہیں۔

”لو كان استقبال عين الكعبة واجب لكان تعلم الدلائل الهندسية واجبا على كل احد لان استقبال العين لا سبيل اليه الا بتلك الدلائل ولما كان غير واجب علمنا ان استقبال العين غير واجب“

اگر میں کعبہ کا استقبال واجب ہوتا تو ہر شخص پر علم ہندسہ کا پڑھنا واجب ہوتا کیونکہ اس کے بغیر میں کعبہ کا تعین ممکن نہیں جب علم ہندسہ، علم ہیئت، علم سائنس کا پڑھنا ہر شخص پر واجب نہیں تو پتہ چلا دور والوں کے لئے صرف جہت کی طرف توجہ کرنا کافی ہے۔

(از شیخ زادہ)

نبی کریم ﷺ کی حدیث پاک بھی ”شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ“ کی وضاحت کر رہی ہے۔
☆ ”عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ ﷺ ما بین المشرق والمغرب قبلۃ“

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مشرق و مغرب کے درمیان قبلہ ہے۔ (ترمذی)
آپ کا یہ ارشاد مدینہ طیبہ والے لوگوں کے لئے تھا جن کا قبلہ مشرق اور مغرب کے درمیان جنوبی طرف واقع ہے اس حدیث پاک سے بھی سمت کا تعین کافی سمجھ آتا ہے۔ اس لئے وہ لوگ ضال اور مضل ہیں جن کو نماز تو آتی نہیں، مسائل سے ناواقف ہوتے ہیں لیکن قطب نما اٹھائے پھرتے ہیں۔ اور مساجد کے قبلہ پر معترض ہوتے رہتے ہیں اور صدیوں سے ان مساجد میں نماز پڑھنے والے حضرات کی نمازوں کو باطل قرار دیتے ہیں وہ خود باطل راہ پر ہیں۔

48 ڈگری تک سمت کے معین کرنے کے لئے وسعت ہے اس لئے بنی ہوئی مساجد میں پانچ، سات ڈگری کے فرق سے اعتراض کی ضرورت نہیں۔ البتہ نئی مساجد کے لئے قبلہ کی سمت کو معین کرنے کے لئے آلات سے کام لے لیا جائے تو بہتر ہے۔

اسی وجہ سے علامہ غزالی رحمہ اللہ نے علم ہندسہ، علم ہیئت وغیرہ کو ضرورت کے مطابق سیکھنے کو محمود کہا اور حد سے زیادہ ان علوم میں عمر گنوا دینے کو مذموم کہا لیکن قرآن و حدیث کا زیادہ سے زیادہ علم حاصل کرنا محمود ہے۔

افسوس آج کل یہود و نصاریٰ کو فکر لاحق ہے کہ قرآن و حدیث کا علم مسلمانوں سے کیسے چھڑایا جائے انہوں نے اپنے یار بنا رکھے ہیں، جو بے دینوں کو دیندار بنانے کی فکر تو نہیں کر رہے البتہ دینداروں کو بے دین بنانے کی فکر میں لگے ہوئے ہیں آٹھویں صدی ہجری کے مشہور معروف عالم ابن رجب حنبلی اسی بناء پر سمت قبلہ میں آلات رصدیہ اور تدقیقات ریاضیہ میں پڑنے کو منع فرماتے ہیں۔
”واما علم التیسیر فاذا تعلم منه ما یحتاج الیہ للاستہداء ومعرفة القبلة والطرق کان

جائزاً عند الجمهور وما زاد عليه فلا حاجة اليه وهو يشغل عما هو اهم منه وربما ادى التدقيق فيه الى اساءة الظن بمحارب المسلمين في امصارهم كما وقع في ذلك كثير من اهل هذا العلم قديما وحديثا وذلك يفضي الى اعتقاد خطأ الصحابة والتابعين في صلواتهم في كثير من الامصار وهو باطل وقد انكر الامام احمد الاستدلال بالجدى وقال انما ورد ما بين المشرق والمغرب قبلة

لیکن علم تیسیر کا اتنی قدر جمہور کے نزدیک حاصل کرنا جائز ہے جس سے راہ حاصل کر سکے اور قبلہ کی سمت متعین کر سکے اور راستوں کا پتہ چلا سکے۔ اس سے زیادہ کی ضرورت نہیں کیونکہ اس قسم کے علوم میں زیادہ مشغول رہنا ضروری علوم سے اسے غافل کر دے گا بلکہ بسا اوقات تدقیقات فلسفہ میں پڑنے سے مسلمانوں کے شہروں میں واقع مساجد کے محرابوں کو دیکھ کر بدگمانی پیدا ہوتی ہے جیسا کہ قدیم فلاسفہ یا نئے فلاسفہ اس قسم کی بدگمانی کا شکار ہوتے رہے۔ یہ بدگمانیاں انسان کو یہاں تک پہنچا دیتی ہیں کہ وہ صحابہ کرام اور تابعین مکرمین کی نمازوں کو غلط سمت کی طرف سمجھنے لگ جاتا ہے یہی باطل راہ ہے (یہی مسلمانوں کے زوال کا سبب بنا) حضرت امام احمد رحمہ اللہ نے ستارہ جدی (قطبی ستارہ) سے کعبہ کی تعیین میں دلیل پکڑنے کو منع کیا اور فرمایا کہ قبلہ مشرق اور مغرب کے درمیان ہے۔

نتیجہ واضح ہوا: کعبہ شریف سے مشرق کی طرف رہنے والوں کے لئے موسم گرما اور موسم سرما کے نروب ہونے کے درمیان قبلہ ہے ریاضی کے قواعد کے مطابق ان کے درمیان 48 ڈگری کا فاصلہ ہے 48 ڈگری ہی شرح چھمینی باب رابع ص ۶۶ میں بھی مذکور ہے۔ لہذا 24 ڈگری تک دائیں بائیں ہونے سے نماز درست ہوگی (از معارف) اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے بہت طویل بحث کی ہے آپ کا مختار یہ ہے کہ زواہیہ قائمہ 90 ڈگری ہے 45 ڈگری سے کم فرق پر نماز صحیح ہوگی۔ (از فتاویٰ رضویہ)

ابھی جو 24 ڈگری کا ذکر کیا ہے اس قول کو علامہ رازی رحمہ اللہ علیہ کے اس بیان سے تائید ملتی ہے ”شطر“ کا ایک معنی نصف ہے کہا جاتا ہے ”شطر الشئی ای جعلته نصفین“ میں نے فلاں چیز کے دو حصے بنائے۔

”ان المصلی خارج المسجد لو وقف بحيث يكون متوجها الى المسجد ولكن لا يكون متوجها الى منتصف المسجد الذي هو موضع الكعبة لا تصح صلواته“

نمازی جب مسجد حرام سے باہر ہو اور مسجد کی طرف متوجہ ہو لیکن کعبہ کے مقام کے نصف مسجد کی طرف توجہ نہ کرے تو اس کی نماز نہیں ہوگی۔ (از کبیر)

خیال رہے کہ "شطر" کا معنی جانب کرنا زیادہ بہتر قرار دیا گیا تاہم جب "شطر" میں نصف والے معنی کا بھی احتمال ہے تو احتیاط اسی میں ہے کہ 24 ڈگری سے زائد انحراف کی صورت میں نماز کے نہ ہونے کا قول کیا جائے اگرچہ بعض مفسرین نے 45 ڈگری تک بھی جواز کا قول کیا ہے۔
وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ :
"اور جہاں بھی تم ہو تو پھیر لو اپنے مونہوں کو اسی طرف"

پہلا خطاب فقط رسول اللہ ﷺ کو کیا گیا: ﴿فَوَلَّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾ اس لئے کہ آپ کو علیحدہ خطاب میں آپ کی عظمت شان کو ذکر کیا گیا۔ اور ساتھ ساتھ آپ کی رغبت کے مطابق قبلہ کو تبدیل کرنے کی دعاء کی قبولیت کو بیان کیا گیا۔ اب تمام لوگوں کو خطاب سے خواہ وہ اس وقت نبی کریم ﷺ کے ساتھ موجود تھے، یا موجود نہیں تھے یعنی پہلے خطاب سے ضمناً سمجھ آیا تھا کہ جو حکم نبی کریم ﷺ کو دیا گیا وہی آپ کی امت کے لئے ہے لیکن اس میں امت کو صراحتاً حکم دیا گیا کہ وہ بھی مسجد حرام کی طرف ہی اپنے اپنے منہ کر لیں۔ (از بیضاوی و شیخ زادہ)

وَإِنَّ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ لَيَعْلَمُونَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ :

اور بیشک وہ لوگ جو کتاب دیئے گئے وہ جانتے ہیں کہ بیشک یہ حق ہے ان کے رب کی طرف سے

یعنی یہود کو تورات کے ذریعے یہ علم تھا کہ آخری نبی کے یہ اوصاف ہوں گے "وانہ یصلی الی القبلتین" اور وہ دو قبلہ کی طرف استقبال کر کے نماز ادا کریں گے ان کا پہلا قبلہ بیت المقدس ہوگا، اور دوسرا قبلہ کعبہ شریف ہوگا۔ اور ان کے علم کی یہ وجہ بھی تھی: "انہم کانوا یعلمون ان الکعبۃ ہی البیت العتیق الذی جعلہ اللہ تعالیٰ قبلۃ لابراہیم واسمعیل علیہما السلام" کہ بیشک وہ جانتے تھے کہ بیشک کعبہ شریف ہی دنیا میں پہلا گھر ہے اور اسی کو قدر و منزلت حاصل ہے اسی کو اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم اور حضرت اسمعیل علیہما السلام کا قبلہ بنایا تھا۔ اور وجہ ان کے علم کی یہ تھی کہ وہ نبی کریم ﷺ کی نبوت کو جانتے تھے آپ کے معجزات کو وہ دیکھ چکے تھے:

”ومتی علموا نبوتہ فقد علموا لا محالة ان کل ما اتی بہ فهو حق فکان هذا التحویل حقا“
اور جب ان کو آپ کی نبوت کا علم یقینی طور پر حاصل ہو چکا تھا تو یقیناً ان کو یہ بھی پتہ چل گیا تھا کہ یہ قبلہ کی تبدیلی حق ہے۔

وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُونَ: اور نہیں ہے اللہ تعالیٰ غافل اس سے جو وہ عمل کرتے ہیں۔

ان الفاظ مبارکہ میں مسلمانوں کے لئے وعدہ بھی ہے، اور یہود کے لئے وعید بھی اگر خطاب مسلمانوں کو ہو تو ان کے لئے وعدہ اور بشارت ہے ”لا ینقص علی جدکم واجتہادکم فی قبول الدین فلا اخل بشواہکم“ یعنی تمہارا اپنے نیک اعمال میں کوشش کرنا اور اس میں محنت کرنا رب تعالیٰ سے پوشیدہ نہیں اس لئے تمہارے اعمال کو وہ دین میں قبول فرمائے گا اور تمہارے ثواب میں کوئی کمی نہیں کرے گا۔

قبلہ مقرر کرنے میں حکمتیں:

(۱) اللہ تعالیٰ نے انسان میں قوت عقلیہ کو پیدا کیا جس سے وہ مجردات اور معقولات کا ادراک کرتا ہے اور قوت خیالیہ کو پیدا فرمایا جو عالم اجسام میں تصرف کرتی ہے قوت عقلیہ اور قوت خیالیہ ایک دوسری کے ساتھ ہی رہتی ہیں کم ہی ایک دوسری سے جدا ہوتی ہیں۔ انسان جب امر عقلی مجرد کو ذہن میں حاضر کرنا چاہتا ہو تو ضروری ہے کہ اس کی ایک صورت خیالیہ کو ذہن میں منتقل کرے پھر قوت عقلیہ سے اس کا ادراک کرے۔

اسی سے واضح ہو گیا کہ قوت خیالیہ اور قوت عقلیہ ساتھ ساتھ پائی جاتی ہیں ایک دوسری سے جدا نہیں ہوتیں علم ہیئت والا شخص جب ارادہ کرتا ہے مقادیر کے احکام میں سی کسی حکم کو ادراک کرنے کا تو اس کے لئے شکل و صورت کو معین کر کے ذہن میں لاتا ہے۔ تو اس کو عقل میں لانے کے لئے جس اور خیال کو بھی معین کیا جاتا ہے پھر اس کا ادراک کیا جاتا ہے یعنی کسی چیز کے ادراک کے لئے اس کی طرف کامل توجہ کی ضرورت ہوتی ہے۔

اس تمہید کے بعد بلا تشبیہ و تمثیل مسئلہ کو یوں سمجھا جائے کہ جب انسان جو کہ عبد ضعیف ہے اللہ تعالیٰ کے دربار میں حاضری دیتا ہے تو اس کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ اس ذات کا استقبال

کرے اس سے اغراض نہ کرے اور اپنی زبان سے اس کی تعریف زیادہ سے زیادہ کرے، اور اس کی خدمت اور بجز کے اظہار میں زیادہ سے زیادہ کوشش کرے۔ چونکہ رب تعالیٰ مکان اور جہت سے پاک ہے اس لئے قبلہ کی طرف توجہ کرنے کا حکم دے کر گویا کہ ذات کی طرف متوجہ ہونے کا حکم دے دیا گیا، اسی حکم سے یہ ثابت ہو جائے گا کہ بندہ رب تعالیٰ سے اعراض نہیں کر رہا۔ پھر قراءت اور تسبیحات اللہ تعالیٰ کی تعریف ہیں اور رکوع و سجود رب تعالیٰ کی خدمت کے قائم مقام ہیں۔

(۲) مقصود نماز میں دل کا حاضر رکھنا ہے اور دل کا حضور اس وقت تک نہیں حاصل ہو سکتا جب تک سکون حاصل نہ ہو اور حرکت اور ادھر ادھر توجہ کو چھوڑ نہ دے ”وہذا لا یسانی الا اذا بقی فی جمیع صلوٰتہ مستقبلاً لجهة واحدة علی التعین“ اور یہ کیفیت اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جب ایک جہت کی طرف توجہ کی جائے پھر کعبہ شریف کی خصوصی فضیلت کی وجہ سے رب تعالیٰ نے اسی کو نماز میں توجہ کرنے کے لئے منتخب فرما دیا۔

(۳) قبلہ مقرر کرنے کی اور وجہ یہ ہے کہ رب تعالیٰ یہ پسند فرماتا ہے کہ مومن آپس میں ایک دوسرے سے محبت کریں اور ایک دوسرے سے اتفاق و اتحاد رکھیں اللہ تعالیٰ نے مؤمنین کے درمیان اتفاق و اتحاد کو مقام احسان میں ذکر فرمایا ارشاد باری تعالیٰ ہوتا ہے:

﴿وَإِذْ كُنَّا نَبْعَثُ إِلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً فَأَلْفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَاصْبِرْتُمْ بِنِعْمَةِ إِخْوَانَا﴾
(آل عمران: ۱۰۳)

”اور اللہ کا احسان اپنے اوپر یاد کرو جب تم میں دشمنی تھی اس نے تمہارے دلوں میں الفت ڈال دی تو اس کے فضل سے تم آپس میں ایک دوسرے کے بھائی بھائی بن گئے۔“ اگر ہر شخص نماز میں اپنی مرضی سے جدھر چاہتا منہ کر لیتا تو مومنین کا آپس میں اختلاف ظاہر ہوتا ”فعین اللہ تعالیٰ لہم جہۃ معلومة وامرہم جمیعاً بالتوجہ نحوہا لیحصل لہم الموافقة بسبب ذلک“ تو اللہ تعالیٰ نے سب کے لئے ایک ہی قبلہ معین فرما دیا اور سب کو اسی کی طرف متوجہ ہونے کا حکم دے دیا تا کہ ان کے درمیان اتفاق و اتحاد رہے۔

”وفیہ اشارۃ الی ان اللہ یحب الموافقة بین عبادہ فی اعمال الخیر“
اسی سے ایک اور مسئلہ سمجھ آ گیا کہ کسی نیکی کے کام میں بندوں کا متفق ہونا اللہ تعالیٰ کو پسند ہے۔

کعبہ کو قبلہ بنانے میں حکمتیں:

(۱) اللہ تعالیٰ نے کعبہ کو اپنی طرف منسوب کر کے اسے خصوصیت و فضیلت عطاء کی رب تعالیٰ نے ”بیت“ ذکر فرمایا کہ یہ میری طرف منسوب ہونے کی وجہ سے میرا گھر ہے۔ اور مؤمنین کو اللہ تعالیٰ نے صفت عبودیت سے خاص فرمایا اور اپنی طرف منسوب کیا گویا کہ یوں فرمایا:

”یا مؤمنین انت عبدی والکعبۃ بیتی والصلوة خدمتی فاقبل

بوجھک فی خدمتی الی بیت و بقلبک الی“

اے مومن تو میرا بندہ ہے، اور کعبہ میرا گھر ہے، اور نماز میری خدمت ہے لہذا میری خدمت میں تو میرے گھر کی طرف توجہ کر اور اپنے دل کو کامل طور پر میری طرف متوجہ کر۔

(۲) یہود کا استقبال قبلہ کی غربی جانب تھا یعنی (بیت المقدس کی غربی جانب) کیونکہ موسیٰ علیہ السلام کے پاس نداء غربی جانب سے آئی اور نصاریٰ کا مشرقی جانب تھا کہ جبریل حضرت مریم کے پاس مشرقی جانب سے آئے۔ اور مؤمنین کا قبلہ کعبہ شریف مقرر کیا گیا ”لانہا قبلۃ خلیل اللہ و مولد حبیب اللہ و ہی موضع حرم اللہ“ کیونکہ یہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ کا قبلہ ہے اور اللہ کے حبیب حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کا پیدائشی شہر ہے اور یہ مقام اللہ تعالیٰ کا حرم ہے۔

(۳) ”استقبلت النصاری مطلع الانوار وقد استقبلنا مطلع سید الانوار و هو محمد ﷺ فمن نوره خلقت الانوار جمیعا“

نصاری کا قبلہ انوار کے طلوع ہونے کا مقام (سورج کا مطلع) اور ہمارا قبلہ سب نوروں کے سردار حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے طلوع ہونے کا مقام ہے آپ کے نور سے تمام نور پیدا کئے گئے۔

(۴) کعبہ چونکہ زمین کے وسط اور مرکز میں ہے اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے زمین کے وسط کو قبلہ مقرر فرمایا:

”وہو اشارة الی انہ یجب العدل فی کل شئی ولاجلہ جعل وسط

الارض قبلۃ للخلق“

اس سے یہ مسئلہ واضح کیا کہ ہر چیز میں عدل واجب ہے اسی وجہ سے زمین کے وسط کو مخلوق کا قبلہ بنایا گیا۔

(۵) ”انہ تعالیٰ اظہر حبه لمحمد علیہ الصلوۃ والسلام بواسطۃ امرہ باستقبال الکعبۃ“

بیشک اللہ تعالیٰ نے کعبہ شریف کی طرف توجہ کرنے کا حکم دے کر واضح کر دیا کہ مجھے

محمد مصطفیٰ ﷺ سے محبت ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ یہود کی مخالفت کی وجہ سے چاہتے تھے کہ قبلہ بدل جائے تو رب تعالیٰ نے آپ کی تمنا کے مطابق جب قبلہ تبدیل فرمادیا تو نبی کریم ﷺ کا رب تعالیٰ کا محبوب ہونا واضح ہو گیا:

”فَاللّٰهُ تَعَالٰی قَدْ حَوَّلَ لِاَجْلِ حَبِیْبِهِ مُحَمَّدٍ عَلَیْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی جِهَةِ التَّحْقِیْقِ“

یہ بات تحقیق سے ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب محمد مصطفیٰ ﷺ کی تمنا اور خواہش پر قبلہ کو تبدیل فرمایا اس پر دلیل یہ ہے کہ رب تعالیٰ نے یہ فرمایا ﴿فَلَنَوَلِّیْكَ قِبْلَةً تَرْضَاهَا﴾ ہم ضرور بر ضرور آپ کو پھیر دیں گے اس قبلہ کی طرف جسے آپ پسند کرتے ہیں۔ یہ نہیں فرمایا ”قبلة ارضاها“ کہ آپ کو اس قبلہ کی طرف پھیر دوں گا جو مجھے پسند ہے اس میں اشارہ ہے اس طرف گویا کہ رب تعالیٰ یہ فرماتا ہے ”یا محمد کل احد یطلب رضای وانا اطلب رضاک فی الدارين“ اے محمد ہر ایک میری رضا طلب کرتا ہے اور میں دونوں جہانوں میں تمہاری رضا طلب کرتا ہوں۔ دنیا میں آپ کی رضا کی طلب تو اسی آیت کریمہ سے سمجھ آگئی اور آخرت میں رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ﴿وَلَسَوْفَ یُعْطِیْكَ رَبُّکَ فَتَرْضٰی﴾ (آپ کو آپ کا رب اتنا دے گا کہ آپ راضی ہو جائیں گے) اسی پر دلالت کر رہا ہے۔

(۶) کعبہ شریف کو قبلہ مقرر فرما کر فقراء کی شان کو بیان فرمادیا کیونکہ رب تعالیٰ نے فقراء کے متعلق فرمایا ”فَتَطْرُدْهُمْ فَتَكُوْنُ مِنَ الظَّالِمِیْنَ“ اے مخاطب کے باشند اگر تم نے ان فقراء کو اپنی مجالس سے نکال دیا تو تم ظالم ہو جاؤ گے۔ اور کعبہ شریف کے متعلق فرمایا:

”وَلَنْ اَتَّبِعْتَ اَهْوَاۤئِهِمْ مِنْۢ بَعْدِ جَآءَکَ مِنَ الْعِلْمِ اِنَّکَ اِذَا لَمِنَ الظَّالِمِیْنَ“

اور اگر تم نے ان کی خواہشات کی تابعداری کی اس کے بعد جب تمہارے پاس علم آ گیا تو بیشک تم ظالموں سے ہو جاؤ گے گویا کہ رب تعالیٰ نے مومنین کو یہ فرمایا:

”الکعبة قبلۃ وجھک والفقراء قبلۃ رحمۃ فاعراضک عن قبلۃ وجھک یوجب کونک ظالما فالاعراض عن قبلۃ رحمۃ کیف یكون“

کہ کعبہ تمہارے چہروں کو اس کی طرف متوجہ کرنے کا قبلہ بنایا۔ لیکن فقیر لوگ میری رحمت کا قبلہ ہیں۔ تمہارا اپنے چہرہ کو متوجہ کرنے کے قبلہ سے اعراض جب تمہیں ظالم بنا دیتا ہے تو تمہارا کیا خیال ہے کہ تم میری رحمت کے قبلہ سے اعراض کر کے کتنے ہی مجھ سے دور ہو گے، کتنے ہی بڑے ظالم ہو گے۔

(۷) ”العرش قبلۃ الحملۃ والکرسی قبلۃ البرۃ، والبیۃ المعمور قبلۃ السفرة والکعبۃ قبلۃ المؤمنین والحق قبلۃ المتحیرین من المؤمنین قال اللہ تعالیٰ (فاینما تولوا فثم وجہ اللہ)“

حالیٰ عرش فرشتوں کا قبلہ عرش ہے، برہ فرشتوں کا قبلہ کرسی ہے سفرہ فرشتوں کا قبلہ البیت المعمور ہے مؤمنین کا قبلہ کعبہ ہے اور مؤمنین جو متحیر ہوں ان کا قبلہ حق تعالیٰ ہے اسی لئے رب تعالیٰ نے فرمایا ”فاینما تولوا فثم وجہ اللہ“ جدھر تم منہ کرو اسی طرف اللہ کی ذات ہے۔

اور ثابت ہوا کہ عرش نور سے پیدا کیا گیا اور کرسی موتی سے، اور البیت المعمور یا قوت سے، اور کعبہ شریف پانچ پہاڑوں سے طور سینا، طور زیتا، جودی، لبنان اور حراء سے بنایا گیا گویا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

”ان کانت علیک ذنوب بمثقال هذه الجبال فاتیت الکعبۃ حاجا او

توجہت نحوہا مصلیا کفرتہا عنک وغفرتہا لک“

اگر تجھ پر ان پہاڑوں کے برابر بھی گناہ ہوئے تو حج کرنے کی غرض سے کعبہ کے پاس آ گیا یا نماز پڑھنے کے لئے کعبہ کی طرف متوجہ ہو گیا (یعنی سچے دل سے تائب ہو کر میرے حضور آ گیا) تو میں تیرے گناہ منادوں گا اور تیری مغفرت کر دوں گا۔

تنبیہ: تفاسیر کے حوالے نقد یا مواتا خیر ذکر کئے گئے ہیں اس لئے ”سیقول السفہاء“

سے لے کر اس زیر بحث آیات کریمہ تک کی تفاسیر سے حوالے تلاش کئے جائیں۔

مسئلہ: استقبال قبلہ کے لئے نیت کرنے کی ضرورت نہیں، کیونکہ آیت کریمہ میں قبلہ کی طرف استقبال کرنے کا حکم دیا گیا جب قبلہ کا استقبال کر لیا تو عمل ہو گیا مزید نیت کی ضرورت نہیں جس طرح ستر عورت، طہارت مکان اور کپڑوں کی طہارت میں نیت کی ضرورت نہیں۔

(کبیر)

☆☆☆☆☆

﴿ وَلَئِنْ آتَيْتَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ بِكُلِّ آيَةٍ مَا تَبِعُوا قِبْلَتَكَ وَمَا أَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ وَلَئِنْ اتَّبَعْتَ أَهْوَاءَ هُمْ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ إِنَّكَ إِذَا لَمِنَ الظَّالِمِينَ ﴾

(۱) ”اور اگر تم ان کتابیوں کیلئے ہر نشانی لے کر آؤ وہ تمہارے قبلہ کی پیروی نہ کریں گے اور نہ تم ان کے قبلہ کی پیروی کرو اور وہ آپس میں بھی ایک دوسرے کے قبلہ کے تابع نہیں اور (اے سننے والے کے باشد) اگر تو اس کی خواہشوں پر چلا بعد اس کے کہ تجھے علم مل چکا تو اس وقت تو ضرور ستمگار ہوگا۔“

(۲) ”اور اگر لاؤ تم“ ان لوگوں کے پاس جو کتاب دیئے گئے“ ہر قسم کی نشانی۔ نہیں تابعداری کریں گے وہ تمہارے قبلہ کی اور نہ تم تابعداری کرو ان کے قبلہ کی اور وہ آپس میں بھی ایک دوسرے کے قبلہ کی تابعداری کرنے والے نہیں اور (اے سننے والے کے باشد) اگر تم تابعداری کرو ان کی خواہشات کی اس کے بعد جو تمہیں علم حاصل ہو چکا تو بیشک تم ظالموں سے ہو گے۔“

اللہ تعالیٰ نے پہلی آیت کریمہ میں بیان فرمایا ﴿وَإِنَّ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ لَيَعْلَمُونَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ﴾ اور بیشک اہل کتاب البتہ جانتے ہیں بیشک یہ (تحویل قبلہ) حق ہے ان کے رب کی طرف سے۔

اس آیت کریمہ میں بیان فرمایا کہ آپ ان کے پاس ہر قسم کے دلائل لے آؤ وہ پھر بھی تمہارے قبلہ کی تابعداری نہیں کریں گے ”لان صفتهم لا تتغير فی الاستمرار علی المعاندة“ کیونکہ ان کی صفت نہیں بدلے گی، ان کی فطرت میں ہی یہ داخل ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ اور مؤمنین سے عناد رکھنا، اور ہمیشہ اسی پر قائم رہنا ہے۔ پھر ان سے کیا توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ آپ کے قبلہ کی تابعداری کریں گے یعنی ان کے اسلام لانے کی آپ امید نہ رکھیں وہ عناد کی وجہ سے اس نعمت سے محروم

(از کبیر)

رہیں گے۔

﴿ وَلَئِنْ آتَيْتَ الذِّكْرَ أَوْ تَوَالِ الْكِتَابِ بِكُلِّ آيَةٍ مَا تَبِعُوا قِبْلَتَكَ ﴾

”اور اگر لاؤ تم ہر قسم کی نشانی اہل کتاب کے پاس تو وہ تمہارے قبلہ کی تابعداری نہیں کریں گے۔“

”اسی“ کے بعد ”با“ تعدیہ کے لئے آئی ہوئی ہے اس لئے اس کا معنی لانا۔ ”آیہ“ فعلیہ کے وزن پر ہے اصل میں یاء مشدود ہے ”آیہ“ لیکن تشدید میں ثقل تھا اس لئے پہلے یا ساکن ماقبل فتح، سے الف سے بدل دیا گیا۔ آیہ کا معنی حجت اور علامت، اور کہا جاتا ہے ”آیہ الرجل“ جس کا معنی انسان کی ذات اور شخص اسی طرح کہا جاتا ہے ”خرج القوم بآیتهم“ قوم اپنی جماعت سے نکل گئے۔

قرآن پاک کی آیہ کو آیہ کہنے کی وجہ:

ایک وجہ یہ ہے کہ قرآن پاک کی آیہ میں کئی حروف جمع ہوتے ہیں حروف کی جماعت کو آیہ کہہ دیا گیا۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ آیہ کا معنی علامت ہے یہ بھی بعد والے کلام کے منقطع ہونے کی علامت بنتی ہے اور اس پر بھی دلیل اور علامت ہے کہ یہ اللہ کا کلام ہے مخلوق سے منقطع ہے یعنی مخلوق نہیں (از کبیر) ”ولئن“ میں لام موطئہ للقسیم ہے ”بکل آیہ“ کا مطلب ہے ”حجة قطعية دالة على حقيقة التحویل“ کہ آپ ان کے پاس قبلہ کی تبدیلی کے حق ہونے پر ہر قسم کے قطعی دلائل لے آئیں وہ اسے تسلیم نہیں کریں گے اس کی وجہ یہ ہے ”انهم ما ترکوا قبلتک لشبهة تزلیها الحجة وانما خالفوک مکابرة وعنادا“ کہ انہوں نے آپ کے قبلہ کو اس لئے نہیں چھوڑا کہ ان کو اس میں کوئی شبہات حاصل تھے کہ وہ دلائل سے زائل ہو جائیں تو یہ ایمان لے آئیں اور آپ کے قبلہ کو تسلیم کر لیں۔ ان کی مخالفت تو صرف حسد، عناد اور تکبر کی وجہ سے ہے لہذا نہ ان سے عناد نے زائل ہونا ہے اور نہ ہی انہوں نے آپ کے قبلہ کی تابعداری کرنی ہے۔ (ابو السعد)

وَمَا أَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتِهِمْ : اور نہ تم ان کے قبلہ کی پیروی کرو۔

یہ ترجمہ اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ہے راقم نے بھی اسی کے مطابق ترجمہ کیا ہے۔ علامہ قرطبی رحمہ اللہ

کے اس قول سے اسے تائید حاصل ہے ”لفظ خبر ویتضمن الامر ای فلا ترک الی شئی من ذلک“ کہ اگرچہ الفاظ کے لحاظ پر تو یہ جملہ خبریہ ہے لیکن معنی کے لحاظ سے جملہ انشائیہ ہے معنی یہ ہے کہ آپ ان کے قبلہ کی تابعداری نہ کرو۔ تاہم اگر معنی ہی خبر والا کر دیا جائے کہ ”آپ تابعداری کرنے والے نہیں ان کے قبلہ کی“ تو یہ معنی بھی درست ہے۔

اس ایک جملہ سے پانچ مسائل بیان کر دیئے:

”الاول ، انه دفع لتجويز النسخ وبيان ان هذه القبلة لا تصير منسوخة“

ایک یہ کہ قبلہ کی پھر منسوخی کے احتمال کو ختم کر دیا یہ ثابت کر دیا کہ اب آپ کا یہی قبلہ تا قیامت رہے گا اب یہ حکم پھر منسوخ نہیں ہوگا آپ ان کے قبلہ کی کبھی بھی تابعداری کرنے والے نہیں۔

”والثانی حسماً لا طماع اهل الكتاب فانهم قالوا ، لو ثبت علی قبلتنا

لکننا نرجو ان تكون صاحبنا الذی ننظره وطمعوا فی رجوعه الی قبلتهم“

اور دوسرا یہ ثابت ہوا کہ اہل کتاب یہ کہتے تھے کہ اگر یہ نبی ہمارے قبلہ پر قائم رہیں تو ہم امید رکھیں گے کہ یہ وہی نبی ہوں گے جن کی انتظار کی جا رہی ہے اور وہ یہ طمع کر رہے تھے کہ یہ ہمارے قبلہ کی طرف رجوع کر لیں گے۔ ان کے اس طمع کو ختم کر دیا گیا کہ اے محبوب آپ تو ان کے قبلہ کی تابعداری کرنے والے نہیں ان کا طمع کرنا بے مقصد ہے اور ان کا یہ کہنا بھی لغو ہے کہ اگر یہ ہمارے قبلہ پر قائم رہیں تو ہم ان کے آخری نبی ہونے کی امید کریں گے۔ اگر یہ سچے ہوتے تو سولہ سترہ ماہ آپ ان کے قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرتے رہے وہ آپ کو نبی تسلیم کر لیتے جب انہوں نے ایمان نہیں لایا تو یہ جھوٹے ہیں۔

”الثالث ، المقابلة یعنی ما ہم بتار کی باطلہم وما انت بتارک حقک“

تیسرا مسئلہ یہ بیان کیا گیا کہ جب وہ اپنے باطل راستہ کو چھوڑنے والے نہیں تو یقیناً آپ بھی اپنی حق راہ کو چھوڑنے والے نہیں۔ اسی مسئلہ کو ابن کثیر رحمہ اللہ نے واضح الفاظ سے بیان فرمایا:

وقوله تعالى ”وما انت بتابع قبلتهم“ اخبار عن شدة متابعة الرسول

ﷺ لما امره الله تعالى به وانه كما هم مستمسكون بأرائهم

واھوانھم فھو ایضا مستمسک بأمر اللہ وطاعته واتباع مرضاتہ وانہ لا یتبع اھوانھم فی جمیع احوالہ ولا کونہ متوجھا الی بیت المقدس

اللہ تعالیٰ نے اپنے اس ارشاد گرامی ”وما انت بتابع قبلتھم“ سے خبر دی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے حکم کی بہت زیادہ تابعداری کرنے والے ہیں۔ جب کہ اہل کتاب اپنی آراء اور اپنی خواہشات کے مطابق عمل کرتے ہیں اور اپنے نظریات کو نہیں چھوڑتے تو رسول اللہ ﷺ جو کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کو تسلیم کرنے والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرنے والے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی رضا مندی کے متبع ہیں تو وہ یقیناً یہود و نصاریٰ کی خواہشات کی تابعداری کسی چیز میں نہیں کریں گے اور تحویل قبلہ کے بعد بیت المقدس کی طرف کبھی بھی منہ نہیں کریں گے:

”الرابع اراد انہ لا یجب علیک استصلاحھم باتباع قبلتھم لان ذلک معصیۃ“

چوتھا مسئلہ یہ سمجھ آیا کہ رب تعالیٰ نے اس کی خبر دی کہ میرے محبوب ان کی خواہش کے مطابق کبھی ان کے قبلہ کی تابعداری نہیں کریں گے کہ وہ کہیں کہ تم ہمارے قبلہ کی تابعداری کرو تو ہم تمہیں نبی مان لیں گے۔ ایسا ہرگز نہیں ہوگا کہ نبی کریم ﷺ ان کی اصلاح کے لئے خود اللہ تعالیٰ کے حکم پر عمل چھوڑ دیں۔ ایسا کرنا تو معصیت ہے جب تمام انبیاء کرام معصیت سے پاک ہیں تو سید الانبیاء ﷺ سے معصیت کے ارتکاب کا تصور کیسے ممکن ہے۔

”الخامس وما انت بتابع قبلۃ جمیع اھل الکتاب من الیھود والنصارى لان قبلۃ الیھود مخالفۃ لقبلۃ النصارى فالیھود بیت المقدس وللنصارى المشرق فالزم قبلتک ودع اقوالھم“

اور پانچواں مسئلہ یہ بیان کیا گیا کہ اے محبوب آپ تمام اہل کتاب کے قبلہ کی تابعداری کر ہی نہ سکتے، یہود چاہتے ہیں آپ ان کے قبلہ کی تابعداری کریں حالانکہ ان کا قبلہ بیت المقدس کی غربی جانب ہے اور نصاریٰ چاہتے ہیں کہ آپ ان کے قبلہ کی تابعداری کریں حالانکہ ان کا قبلہ بیت المقدس کی شرقی جانب ہے۔ اس لئے اے محبوب آپ اپنے قبلہ پر ہی قائم رہیں ان کے اقوال کو چھوڑ دیں۔ (ازہ)

اعتراض: آیۃ کریمہ سے یہ ثابت ہو رہا ہے کہ یہود و نصاریٰ کبھی کعبہ کی طرف متوجہ نہیں ہوں گے حالانکہ یہود میں سے حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھی ایمان لے آئے اور کعبہ

کو ہی انہوں نے قبلہ مانا۔ اس طرح حضرت نجاشی اور ان کے کچھ ساتھی نصاریٰ میں سے ایمان لے آئے اور کعبہ کی طرف منہ کر کے انہوں نے نمازیں ادا کیں تو آیہ کریمہ میں نفی کا کیا مطلب ہے؟
جواب اول: ”الذین اتوا الكتاب“ سے مراد تمام اہل کتاب ہیں یعنی تمام کے تمام اہل کتاب نہ ایمان لائیں گے اور نہ ہی آپ کے قبلہ کے تابعداری کریں گے۔ بعض کے ایمان لانے اور قبلہ کی تابعداری ثابت ہو جائے تو آیہ کریمہ کے منافی نہیں۔

جواب دوم: آیہ کریمہ میں مراد یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ اپنے مذہب پر قائم رہتے ہوئے آپ کے قبلہ کی تابعداری نہیں کریں گے، ہاں جن کی قسمت میں ایمان کی نعمت کا حصول ہوگا وہ ایمان لانے پر یقیناً آپ کے قبلہ کی تابعداری کریں گے۔

اور وہ آپس میں بھی ایک دوسرے کے قبلہ کی تابعداری کرنے والے نہیں۔ یعنی یہود نصاریٰ کے قبلہ کی تابعداری کرنے والے نہیں اور نصاریٰ یہود کے قبلہ کی تابعداری کرنے والے نہیں۔ وہ آپس میں ایک دوسرے کے مخالف ہیں وہ ایک دوسرے سے پیٹھ پھیرنے والے ہیں۔ اور ایک دوسرے کو گمراہ کہتے ہیں۔

یہود کا قبلہ بیت المقدس میں صحرہ (چٹان) جو غربی جانب ہے اور نصاریٰ کا قبلہ بیت المقدس کی ”مطلع الشمس“ (سورج کے طلوع ہونے کی) مشرقی جانب ہے وہ آپس میں بھی اتفاق نہیں کر سکتے اور نہ ہی وہ آپ کے ساتھ متفق ہو کر آپ کے قبلہ کی تابعداری کریں گے۔

ولن اتبعن أهواءهم من بعد ما جاءك من العلم إنك إذا لمن الظالمين :
اور (اے سننے والے کسے باشد) اگر تم تابعداری کرو ان کی خواہشات کی اس کے بعد جو تمہیں علم حاصل ہو چکا تو بیشک تم ظالموں سے ہو گے۔

مسلمانوں کو خطاب ہے کہ قبلہ کی تبدیلی کا جب تمہیں علم حاصل ہو چکا ہے اب اگر تم نے یہود و نصاریٰ کی خواہش کے مطابق ان کے قبلہ کی طرف رخ کیا تو تم ظالم ہو گے۔

واضح ہوا کہ ہر معاملہ میں یہود و نصاریٰ کی خواہشات کے مطابق عمل کرنے والا، ان کے ہر حکم پر سر جھکانے والا بزدل بلی کی طرح کا شیر، بدترین ظالم ہے، خونخوار درندہ ہے لیکن مسلمانوں کے لئے،

دینداروں کے لئے، علماء کے لئے، کافروں کے سامنے ملی ہی ہے وہ وقت کا یزید ہے کاش کہ میں اپنی زندگی میں اس یزید کو ذلیل ہوتے ہوئے دیکھ لوں۔

تسکین الجنان سے اقتباس:

﴿ وَلَئِنْ اتَّبَعْتَ أَهْوَاءَ هُمْ مِّنْ بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ إِنَّكَ إِذَا لَمِنَ الظَّالِمِينَ ۝ ﴾

☆ اور اگر تم باوجود اس کے کہ تمہارے پاس دانش (یعنی وحی خدا) آچکی ہے ان کی خواہشوں کے پیچھے چلو گے تو ظالموں میں داخل ہو جاؤ گے۔ (فتح محمد صاحب)

☆ اور کبھی تو چلا ان کی پسند پر بعد علم کے جو تجھ کو پہنچا تو بیشک تو بھی ہے بے انصافوں میں (شاہ عبدالقادر صاحب)

☆ اور اگر آپ ان کے نفسانی خیالات کو اختیار کر لیں اور (اور وہ بھی) آپ کے پاس علم (وحی) آئے پیچھے یقیناً آپ ظالموں میں شمار ہونے لگیں۔ (اشرف علی صاحب)

☆ اگر تو چلا ان کی خواہشوں پر بعد اس علم کے جو تجھ کو پہنچا تو بے شک تو بھی ہو ابے انصافی میں

(محمود الحسن صاحب)

☆ اور اگر تم نے اس علم کے بعد جو تمہارے پاس آچکا ہے ان کی خواہشات کی پیروی کی تو یقیناً تمہارا شمار ظالموں میں ہوگا۔ (مورودی صاحب)

☆ اور اگر (کہیں) آپ ان کی خواہشوں کی پیروی کرنے لگیں بعد اس کے کہ آپ کے پاس علم آچکا ہے تو یقیناً آپ (بھی) ظالموں میں (شمار) ہوں گے۔ (عبد الماجد صاحب)

☆ اگر تو پیروی کرے گا خواہشوں ان کی کہ پیچھے اس چیز کے کہ آئی تیرے پاس علم سے تحقیق تو اس وقت ظالموں سے ہے۔ (شاہ رفیع الدین صاحب)

☆ اور (اے سننے والے کسے باشد) اگر تو ان کی خواہشوں پر چلا بعد اس کے کہ تجھے علم مل چکا تو اس وقت تو ضرور ستم گار ہوگا۔ (اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان)

یہاں دیگر تراجم میں ”انک من الظالمین“ کی نسبت نبی کریم ﷺ کی طرف کی گئی جس

میں ”ولئن اتیت“ کے ساتھ کوئی بالفرض کی قید کا اضافہ نہیں ہوا۔ بظاہر عام تراجم سے یہ سمجھ آتا ہے

کہ نبی کریم ﷺ سے یہود و نصاریٰ کی خواہشات کی تابعداری ممکن ہے۔ اور اگر آپ نے تابعداری

کر لی تو معاذ اللہ آپ بے انصافوں، ظالموں سے ہوں گے حالانکہ یہ تصور بھی ممکن نہیں۔

اسی وجہ سے جلالین میں ذکر کیا گیا ”انک اذا ان اتبعتم فرضا لمن الظالمین“ یعنی کلام بالفرض محال پر مبنی ہے (مطلب یہ ہے کہ اگر آپ نے بالفرض ان کی خواہشات کی تابعداری کی تو ظالموں سے ہو جاؤ گے) صاحب مدارک فرماتے ہیں:

”وفی ذلک لطف للسامعین وتہیج للثبات علی الحق وتحذیر لمن یترک الدلیل بعد انارتہ یتبع الهوی وقیل الخطاب فی الظاہر للنبی ﷺ والمراد امتہ“

اس میں سامعین پر مہربانی ہے اور حق پر ثابت رہنے کے لئے براہیختہ کیا گیا ہے اور جو شخص دلیل کے روشن ہونے کے بعد اللہ کے حکم کو چھوڑتا ہے اور خواہشات کے درپے ہوتا ہے اس کو ڈرایا گیا ہے۔ اور یہ کہا گیا ہے کہ یہ خطاب بظاہر نبی کریم ﷺ کو ہے لیکن مراد امت ہے۔

اسی وجہ سے اعلیٰ حضرت نے اپنے ترجمہ میں (اور اے سننے والے کسے باشد) کا اضافہ کیا ہے تاکہ تفاسیر کا مفہوم ترجمہ سے ہی واضح ہو جائے۔ بیضاوی نے بھی علی سبیل الفرض والتقدیر ذکر کیا ہے محشی نے کہا کہ یہ سوال کا جواب ہے۔

”اتباع اہواء المخالفین لیس بمحتمل فی حقہ علیہ السلام للقطع بعصمة من المعاصی“ نبی کریم ﷺ سے مخالفین کی خواہشات کی اتباع کا احتمال قطعی طور پر منتفی ہے کیونکہ آپ تو معاصی سے معصوم ہیں۔ بیضاوی نے ”علی سبیل الفرض والتقدیر“ کے الفاظ ذکر کر کے جواب دیا ہے کہ یہ کلام بالفرض ہے نہ کہ حقیقت۔ محشی نے اس کا جواب بھی نقل کیا ہے:

”وفی عادة الناس ان یوجهوا امرہم ونہیہم الی من ہو اعظم منزلة عندهم ارشادا للغير وتأكيدا“

کہ عام لوگوں کی عادت ہے اور امر و نہی کو بڑے شخص کی طرف متوجہ کر دیتے ہیں اگرچہ مقصود اس سے غیروں کو ہدایت دینی ہوتی ہے اس مقام پر یہی صورت ہے جس کو اعلیٰ حضرت نے اختیار کیا ہے۔

(تسکین الجنان ص ۵۳ تا ص ۵۵)

علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے بہت واضح بہت خوب بیان فرمایا:

”الخطاب للنبي ﷺ والمراد امته ممن يجوز ان يتبع هواد فيصير
باتباعه ظالما، وليس يجوز ان يفعل النبي ﷺ ما يكون به ظالما،
فهو محمول على ارادة امته لعصمة النبي ﷺ وقطعنا ان ذلك لا
يكون منه وخطب النبي ﷺ تعظيما للامر ولانه المنزل عليه“

یہ خطاب (ولئن اتبعت میں خطاب) نبی کریم ﷺ کو ہے اور مراد آپ کی امت ہے کیونکہ
کسی امتی سے تو یہ ہو سکتا ہے کہ وہ یہود و نصاریٰ کی خواہشات پر چل کر اور ان کی اتباع کر کے ظالم ہو
جائے۔ لیکن نبی کریم ﷺ یہود و نصاریٰ کی خواہشات کی تابعداری کر کے (معاذ اللہ) ظالم ہو جائیں
یہ تصور کرنا ممکن ہی نہیں لہذا ہم قطعی طور پر یہ کہتے ہیں کہ اس خطاب سے مراد آپ کی امت ہے آپ خود
تو معصوم ہیں لہذا اس خطاب سے مراد آپ خود نہیں۔

البتہ خطاب بظاہر آپ کو کیوں ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ بتانا مقصود ہے کہ یہ امر بہت عظیم ہے
اور دوسری وجہ یہ ہے کہ قرآن پاک نازل چونکہ حضور ﷺ پر ہوا اس لئے بظاہر خطاب آپ کو ہی ہونا ہے۔
قرطبی

☆☆☆☆☆

﴿الَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ يَعْرِفُونَهُ كَمَا يَعْرِفُونَ أَبْنَاءَهُمْ
وَإِنَّ فَرِيقًا مِنْهُمْ لَيَكْتُمُونَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ﴾

(۱) ”جنہیں ہم نے کتاب عطا فرمائی وہ اس نبی کو ایسا پہچانتے ہیں جیسے آدمی اپنے بیٹوں کو پہچانتا ہے اور بے شک ان میں سے ایک گروہ جان بوجھ کر حق چھپاتے ہیں“

(۲) ”وہ لوگ جن کو عطا کی ہم نے کتاب، وہ پہچانتے ہیں آپ کو جیسا پہچانتے ہیں اپنے بیٹوں کو اور بیشک ایک فریق (کے لوگ) ان میں سے البتہ چھپاتے ہیں حق کو حالانکہ وہ جانتے ہیں“

پہلی آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کی امت کو یہود و نصاریٰ کی خواہشات کی پیروی سے ڈرایا اور اس آیت کریمہ میں مومنین کو نبی کریم ﷺ کے حالات کی خبر دی گویا کہ یوں فرمایا:

”اعلموا یا معاشر المؤمنین ان علماء اهل الكتاب يعرفون محمدا وما جاء

به وصدقہ ودعوته وقلته لا يشكون فيه كما لا يشكون في ابائهم“

اے مومنو جان لو کہ بیشک اہل کتاب کے علماء محمد ﷺ کو پہچانتے ہیں آپ نے جو اللہ کا کلام پیش فرمایا اور دین اسلام پیش کیا اسے وہ لوگ جانتے ہیں آپ کی صداقت کو جانتے ہیں آپ کی دعوت کے برحق ہونے کو وہ جانتے ہیں آپ کے قبلہ کو وہ جانتے ہیں اس میں انہیں کوئی شک نہیں، جس طرح اپنے بیٹوں کو پہچاننے میں انہیں کوئی شک نہیں۔ (ازکیر)

واضح ہوا کہ یہود و نصاریٰ کے علماء کا نبی کریم ﷺ پر ایمان نہ لانا اس وجہ سے نہیں تھا کہ وہ آپ کو جانتے نہیں تھے بلکہ ضد اور حسد و عناد کی وجہ سے انہوں نے ایمان قبول نہ کیا۔

الَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ : سے مراد یہود کے علماء ہیں، یعنی ذکر عام مراد خاص ہے جب کوئی قرینہ موجود ہو تو ذکر عام مراد خاص لینا جائز ہے۔

يَعْرِفُونَهُ : ضمیر منصوب رسول اللہ ﷺ کی طرف لوٹ رہی ہے، اگرچہ پہلے صراحتہً آپ کا ذکر نہیں، لیکن کلام کی دلالت اس پر موجود ہے یعنی وہ رسول اللہ ﷺ کو پہچانتے ہیں جس طرح اپنے

بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔ بعض حضرات نے کہا کہ ضمیر علم کی طرف لوٹ رہی ہے کہ وہ علم کو پہچانتے ہیں۔ اور بعض حضرات نے کہا کہ ضمیر قرآن کی طرف لوٹ رہی ہے کہ وہ قرآن کو پہچانتے ہیں اور بعض نے کہا کہ ضمیر تحویل قبلہ کی طرف لوٹ رہی ہے کہ وہ تحویل قبلہ کو پہچانتے ہیں۔ لیکن ضمیر نبی کریم ﷺ کی طرف لوٹنا بہتر ہے کیونکہ اگر ضمیر ”من بعد ما جاءک من العلم“ میں علم کی طرف لوٹے تو علم سے مراد بھی نبوت ہی ہے۔ اب مطلب یہ ہوگا ”انہم یعرفون ذلک العلم (ای علم النبوة) کما یعرفون ابناءہم“ بیشک وہ اس علم نبوت کو ایسے پہچانتے ہیں جیسا کہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔ نبوت سے مراد نبی کریم ﷺ کا علم ہی ہوا کہ وہ نبی کریم ﷺ کا علم ایسے رکھتے ہیں جیسا کہ اپنے بیٹوں کا علم رکھتے ہیں۔

تحویل قبلہ کی طرف ضمیر لوٹے تو مطلب یہ ہوگا کہ قرآن پاک میں جو تحویل قبلہ کا ذکر ہے وہ توراۃ وانجیل میں بھی مذکور ہے اور یہ خبر بھی دی گئی کہ نبی کریم ﷺ کی نبوت بھی توراۃ وانجیل میں مذکور ہے ”فکان صرف هذه المعرفة الى امر النبوة اولى“ لہذا امر نبوت کی معرفت اولی (بہتر) ہے۔ اور وجہ یہ ہے کہ معجزات پہلے نبی کریم ﷺ کی صداقت پر دلالت کرتے ہیں۔ لیکن قبلہ کی معرفت تو موقوف ہے اس پر کہ پہلے حضور کی نبوت کو تسلیم کرے پھر یہ تسلیم کرے کہ قبلہ کی تحویل کا حکم بھی آپ نے لایا ہے لہذا یہ بھی برحق ہے یعنی دل سے تو وہ حقانیت کو بھی تسلیم کرتے تھے اگرچہ بظاہر نہیں مانتے تھے واضح ہوا کہ ضمیر ہر حال میں نبی کریم ﷺ کی طرف ہی لوٹنا بہتر ہے۔ (ازکیہ)

”یعرفونہ باوصافہ“ وہ نبی کریم ﷺ کو آپ کے اوصاف کے ذریعے پہچانتے تھے کہ یہ نبی برحق ہیں یہی وہ نبی ہیں جن کے آنے کا وعدہ کیا گیا کیونکہ نبی کریم ﷺ کے اوصاف ان کی کتب میں موجود تھے خصوصاً جب انہوں نے نبی کریم ﷺ کے معجزات کا مشاہدہ کر لیا تو ان کو اس طرح پہچان حاصل ہوگئی جس طرح اپنے بیٹوں کو انسان دوسرے لڑکوں سے واضح طور پر پہچانتا ہے۔

تنبیہ : ابھی تک بیٹوں کی پہچان سے مراد ان کی ذاتوں اور ان کے تشخص، شکل و صورت کو پہچاننا لیا گیا اور اگر ہر ایک کی پہچان صفات کے ذریعے مراد ہو، کہ وہ نبی کریم ﷺ کو صفات کے ذریعے ایسے پہچانتے ہیں جیسے بیٹوں کو صفات کے ذریعے پہچانتے ہیں تو اس صورت میں علامہ نسفی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مطلب یہ ہوگا ”یعرفونہ بالرسالة والنبوة کما یعرفون ابناءہم بالنسب

والنسوة " وہ رسول اللہ ﷺ کو رسالت و نبوت سے ایسے پہچانتے ہیں جیسا کہ اپنے بیٹوں کو نسب اور بیٹا ہونے سے پہچانتے ہیں۔

اس پر حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کا قول واضح طور پر دلالت کرتا ہے آپ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بتاتے ہیں:

"یا عمر لقد عرفته حين رأيته كما عرفت ابني ومعرفتي بمحمد ﷺ اشد من معرفتي بابني فقال عمر كيف ذلك فقال اني لست اشك في محمد ﷺ انه هو النبي الموعود من حيث ان نعوته مبينة في كتابنا واما ولدي فلا ادري ما صنعت والدته فلعلها خانت فقبل عمر رأسه فقال رفعك الله يا ابن سلام فقد صدقت"

اے عمر میں نے جب نبی کریم ﷺ کو دیکھا اسی وقت آپ کو پہچان لیا جیسا کہ میں اپنے بیٹے کو پہچانتا ہوں بلکہ حضرت محمد ﷺ کو اپنے بیٹے سے بھی زیادہ پہچان لیا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا وہ کیسے تو آپ نے کہا بیشک مجھے حضرت محمد ﷺ کے نبی موعود ہونے میں کسی قسم کا کوئی شک نہیں ہوا کیونکہ آپ کے اوصاف ہماری کتب میں مذکور ہیں۔ لیکن اولاد کے متعلق مجھے معلوم نہیں کہ ان کی ماں نے کیا کیا ہے ہو سکتا ہے کہیں خیانت نہ کر دی ہو تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کے سر کو چوما اور کہا اے ابن سلام تم نے سچ کہا ہے اللہ تعالیٰ تمہارے درجات بلند فرمائے۔ (ماخوذ از بیضاوی و شیخ زادہ)

وَإِنْ فَرِيقًا مِنْهُمْ لَيَكْتُمُونَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ:

"اور بے شک ایک فریق (کے لوگ) ان میں سے حق کو چھپاتے ہیں حالانکہ وہ جانتے ہیں۔ پہلے یہود و نصاریٰ کے تمام علماء کا ذکر کیا کہ وہ نبی کریم ﷺ کو پہچانتے ہیں اس میں معاندین (عناد رکھنے والے) اور مؤمنین تمام کا ذکر تھا لیکن یہاں صرف معاندین کا ذکر ہے جو علم رکھنے کے باوجود جاننے کے باوجود حق کو چھپاتے تھے۔ (از شیخ زادہ)

یہاں سے ان کی زیادہ مذمت بیان کی گئی کیونکہ علم کے بعد عمل نہ کرنا زیادہ قبیح ہے گویا کہ اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا: "لیکتمون ای الناس ما فی کتبہم من صفة النبی ﷺ وهم یعلمون" یعنی یہود و نصاریٰ نے نبی کریم ﷺ کے اوصاف کو چھپایا حالانکہ وہ جانتے تھے کیونکہ ان کی کتب میں وہ اوصاف مذکور تھے۔ (ابن کثیر)

﴿ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِينَ ﴾

(۱) ”(اے سننے والے) یہ حق ہے تیرے رب کی طرف سے (یا حق وہی ہے جو تیرے رب کی طرف سے ہو) تو خبردار تو شک نہ کرنا“

(۲) ”(اے سننے والے) یہ حق ہے تمہارے رب کی طرف سے تو ہرگز نہ ہو شک کرنے والوں میں سے“

اعلیٰ حضرت نے دو ترجمے کئے ہیں ان کو علامہ رازی رحمہ اللہ کی اس بحث میں دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے ترجمہ کرتے وقت کتنی محنت کی اور تفسیر کا نچوڑ پیش کیا۔

”الالف واللام فی قوله (الحق) فیہ وجہان، الاول ان یکون للعہد والاشارة الی الحق الذی علیہ رسول اللہ ﷺ او الی الحق الذی فی قوله (لیکتُمونَ الحق) ای هذا الذی یکتُمونہ هو الحق من ربک“

اس مقام میں ”الْحَقُّ“ پر الف لام عہد خارجی ہو تو اس لحاظ سے معنی ہوگا ”یہ حق ہے تیرے رب کی طرف سے“ یا تو اشارہ ہوگا اس حق کی طرف جس پر رسول اللہ ﷺ قائم ہیں۔ اب تفصیلی مطلب یہ ہوگا یہ حق ہے جس پر رسول ﷺ قائم ہیں تیرے رب کی طرف سے اور یا اشارہ ہوگا اس حق کی طرف جو ”لِیْکْتُمُوْنَ الْحَقَّ“ میں مذکور ہے اب تفصیلی ترجمہ یہ ہوگا یہ حق جس کو یہود و نصاریٰ چھپاتے ہیں یہ حق ہے تمہارے رب کی طرف سے ”وان یکون للجنس علی معنی الحق من اللہ تعالیٰ لامن غیرہ“ اور یا الف لام جنس کے لئے ہو تو اب معنی یہ ہوگا حق وہی ہے جو تیرے رب کی طرف سے ہے جو اس کے غیروں کی طرف سے ہے وہ حق نہیں۔ یعنی حق ہے وہ جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ثابت ہے اور جس پر آپ قائم ہیں۔ اور وہ جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں بلکہ یہود و نصاریٰ کے اپنے من گھڑت نظریات ہیں جن پر وہ قائم ہیں وہ باطل راہ ہے۔ (ازکبیر)

وَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِينَ : ای من الشاکین والخطاب للنبی ﷺ والمراد امتہ“

”ممترین“ کا معنی شک کرنے والے ”ولا تكونن“ میں خطاب بظاہر نبی کریم ﷺ کو ہے مراد آپ کی امت ہے ”امتری فلان“ اس وقت بولتے ہیں جب کسی کو کبھی یقین ہو اور کبھی شک ہو

ایک چیز کو دوسرے سے زائل کرے۔ یعنی شک اس کے یقین کو زائل کر دے یا یقین اس کے شک کو زائل کر دے "المراء" جب کوئی شخص دوسرے کے قول میں شک کرے۔ الامراء کا معنی بھی شک کرنا ہے۔

(از فرطی)

راقم کی ابتدائی تصنیفی کاوش کو دیکھئے:

﴿ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِينَ ﴾

(محمود الحسن صاحب)

☆ تو وہی ہے جو تیرا رب کہے پھر تو نہ ہو شک لانے والا۔

☆ حق ہے پروردگار تیرے کی طرف سے پس مت ہو شک لانے والوں سے۔

(شاہ رفیع الدین صاحب)

☆ (اے پیغمبر یہ نیا قبلہ) تمہارے پروردگار کی طرف سے حق ہے تو تم ہرگز شک کرنے والوں

(فتح محمد صاحب)

☆ میں نہ ہونا۔

(شاہ عبد القادر صاحب)

☆ حق وہی جو تیرا رب کہے پھر تو نہ ہو شک لانے والا۔

☆ یہ قطعی ایک امر حق ہے تمہارے رب کی طرف سے لہذا اس کے متعلق تم ہرگز کسی شک میں نہ پڑو۔

(مودودی صاحب)

☆ یہ امر حق ہے تمہارے پروردگار کی طرف سے تو کہیں شک کرنے والوں میں ہرگز نہ ہو جانا۔

(عبد الماجد صاحب)

(اشرف علی صاحب)

☆ سو ہرگز شک و شبہ کرنے والوں میں شمار نہ ہونا۔

☆ (اے سننے والے) یہ حق تیرے رب کی طرف سے (یا حق وہی ہے جو تیرے رب کی طرف

(اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان)

سے ہو)۔

☆ اس مقام پر مترجمین نے شک کی نسبت نبی کریم ﷺ کی طرف کی اور یہ ترجمہ کیا کہ تو نہ ہو شک

لانے والا۔ لیکن اعلیٰ حضرت نے اس نازک مقام کو تفاسیر پر نظر رکھتے ہوئے اپنے ترجمہ سے حل فرمایا

(اے سننے والے) لفظ کا اضافہ کیا تا کہ نبی میں مخاطب نبی کریم نہ ہوں بلکہ عام امتی ہو۔ اعلیٰ حضرت

کے ترجمہ پر بیضاوی کی عبارت بطور تائید دیکھئے:

"ولیس المراد نهی الرسول ﷺ عن الشك فيه لانه غير متوقع

ولیس بقصد واختيار بل اما تحقيق الامر وانه بحيث لا يشك فيه ناظر

او امر الامة باكتساب المعارف المزينة للشك على وجه الا بلغ

اس پر محشی کی عبارت یہ ہے:

” فان الانسان كما لا ينهى عما لا يتوقع منه ولا ينهى ايضا عما لا
مدخل فيه للمقصد والاختيار كالشك والجهل والجوع والعطش
فاذا اوردت صورة النهي في مثل هذه المواضع لا يراد بها حقيقة
النهي بل يقصد بها شئ آخر فقله تعالى فلا تكونن من الممترين من
قبيل الخطاب العام الوارد على صورة النهي والمقصود منه اخبار
كافة الناس بان المقام ليس بمظنة لان يرتاب فيه عن الانام “

دونوں عبارتوں کا خلاصہ کلام یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کو شک سے نہیں روکا گیا کیونکہ آپ سے تو
شک کی توقع بھی نہیں کی جاسکتی کیونکہ جس مقام پر نبی کی توقع نہ کی جاسکے وہاں نبی نہیں پائی جاسکتی اس
طرح جہاں قصد و اختیار نہ پایا جاسکے وہاں بھی نبی نہیں پائی جاسکتی۔ لہذا یہاں حقیقت نبی نہیں پائی گئی،
بلکہ یہاں عام خطاب ہے جو صورتہ نبی ہے مقصد یہاں عام لوگوں کو خبر دینا ہے کہ یہ مقام ایسا ہے کہ اس
میں کسی ایک کو شک نہیں کرنا چاہئے، حقیقت یہ ہے کہ جس طرح اعلیٰ حضرت کا ترجمہ ایمان افروز ہے
اس کا کوئی ثانی نہیں جس میں علمی بصیرت سے تفاسیر و لغات پر نظر ہوتی ہے محبت رسول اللہ ﷺ کا ایک
درس ہے۔

(نسکب الحسان ص ۵۵، ۵۶)



﴿وَلِكُلِّ وِجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيُّهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ أَيْنَ مَا تَكُونُوا يَأْتِ بِكُمُ اللَّهُ جَمِيعًا إِنَّ اللَّهَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ﴾

- 1: ”اور ہر ایک کے لئے توجہ کی ایک سمت ہے وہ اسی کی طرف منہ کرتا ہے تو یہ چاہو کہ نیکیوں میں اوروں سے آگے نکل جائیں تم کہیں ہو اللہ تم سب کو اکٹھا لے آئے گا بیشک اللہ جو چاہے کرے۔“
- 2: ”اور ہر ایک کے لئے ایک جہت ہے وہ منہ پھیرتا ہے اسی کی طرف، تم جلدی کرو نیکیوں میں، جہاں بھی تم ہو گے لے آئے گا تم تمام کو اللہ جمع کر کے، بیشک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔“

وَلِكُلِّ وِجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيُّهَا : اور ہر ایک کیلئے ایک جہت ہے وہ منہ پھیرتا ہے اسکی طرف۔

”ولکل“ تنوین عوض مضاف الیہ ہے یعنی اس کا معنی یہ ہے ”ولکل امة قبلہ“ برگروہ کے لئے ایک قبلہ ہے اس سے مراد یہ نہیں کہ برگروہ کا قبلہ رب تعالیٰ نے مقرر کر رکھا بلکہ مطلب یہ ہے کہ برگروہ کا کوئی نہ کوئی قبلہ ہے خواہ وہ اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمایا ہے یا انہوں نے خود مقرر کر رکھا ہے۔ کیونکہ مؤمنین کا قبلہ تو اللہ تعالیٰ نے کعبہ مقرر فرمایا۔ لیکن مشرکین اور یہود نصاریٰ نے اپنی اپنی مرضی سے قبلہ مقرر کئے ہوئے ہیں۔ مشرکین کے معبود بھی بت تھے اور ان کی توجہ کا مرکز بھی بت تھے:

”لَا فِي الْمَشْرِكِينَ مِنْ كَانَ يَعْبُدُ الْأَصْنَامَ وَيَتَقَرَّبُ بِذَلِكَ إِلَى اللَّهِ

تَعَالَى كَمَا حَكَى اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمْ فِي قَوْلِهِ هَؤُلَاءِ شَفَعَاؤُنَا عِنْدَ اللَّهِ“

کیونکہ مشرکین بتوں کی عبادت کرتے تھے اور انکے ذریعے ہی اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرتے تھے جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا کہ وہ کہتے ہیں کہ یہ بت اللہ تعالیٰ کے ہاں ہمارے شفیع ہوں گے۔

ہاں یہ بھی خیال رہے کہ مشرکین بتوں کو معبود سمجھ کر شفاعت کرنے والے مانتے تھے جو باعث شرک تھا لیکن مؤمنین اللہ تعالیٰ کے انبیاء کرام اور اولیاء کرام کو اللہ کی مخلوق مانتے ہیں ہاں اللہ تعالیٰ کا مقرب سمجھ کر ان کو شفیع مانتے ہیں جو عین ایمان ہے۔

یہود نے اپنا قبلہ مقرر کر رکھا ہے اور نصاریٰ نے اپنا قبلہ مقرر کر رکھا ہے۔ البتہ مؤمنین کے لئے

اللہ تعالیٰ نے ان کا قبلہ مقرر فرمایا ہے۔

”وَلِكُلِّ وَجْهَةٌ“ کا اور مطلب یہ ہے:

”لکل قوم من المسلمین وجہۃ ای جہۃ من الکعبۃ یصلی الیہا، جنوبیۃ او شمالیۃ او شرقیۃ او غربیۃ“

مسلمانوں کی ہر قوم کے لئے کعبہ میں سے ہی ایک جہت ہے جس کی طرف وہ منہ کر کے نماز ادا کرتے ہیں۔ شمال میں رہنے والے کعبہ کی اس جانب منہ کرتے ہیں جنوب والے کعبہ کی اس جانب، اسی طرح کوئی مشرقی جانب منہ کر رہے اور کوئی غربی جانب منہ کر رہے ہیں۔ (از کبیر و بیضاوی)

هُوَ مُوَلِّیْہَا: ”ہو عائد علی لفظ کل لا علی معنایہ لانہ لو کان علی المعنی لقال ہم مولوہا وجوہم“

”ہو“ ضمیر کا مرجع لفظ ”کل“ ہے نہ کہ ”کل“ کا معنی اگر ”کل“ کا معنی معتبر ہوتا تو جمع کے صیغے اور ضمائر ہونی چاہئیں تھیں پھر ”ہم مولوہا وجوہم“ ہوتا۔ اب اس صورت میں معنی یہ ہو گیا ”ولکل صاحب ملة قبلۃ، صاحب القبلة مولیہا وجہہ“ کہ ہر ملت کے ہر صاحب کا قبلہ ہے وہ صاحب قبلہ اپنے قبلہ کی طرف ہی منہ کرتا ہے۔

لیکن زجاج نے کہا کہ اس میں ایک احتمال یہ بھی ہے کہ ”ہو“ ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹے، اب معنی یہ ہوگا ”لکل صاحب ملة قبلۃ اللہ مولیہا ایہ“ ہر صاحب ملت کا اپنا قبلہ ہے اللہ تعالیٰ اسے اس قبلہ کی طرف ہی پھیر دیتا ہے۔

لیکن یہاں یہ خیال رکھنا اشد ضروری ہوگا کہ جب مراد یہ ہو کہ مشرکین، یہود، نصاریٰ اور مؤمنین کا اپنا اپنا قبلہ ہے تو اللہ تعالیٰ کے اس طرف پھیرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کو قدرت و اختیار دے رکھا ہے وہ ادھر ہی منہ پھیر لیتا ہے۔ ہاں اگر ”ولکل“ سے مسلمان ہی فقط مراد ہوں کہ کعبہ کی مختلف سمتوں میں رہنے والے مسلمان اپنی اپنی سمت میں منہ کرتے ہیں وہی سمت ان کا قبلہ ہوتا ہے۔ اب اللہ تعالیٰ کے پھیرنے کا مطلب بھی واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر طرف رہنے والوں مسلمانوں کو اجازت دے رکھی ہے کہ وہ کعبہ کی جس طرف بھی ہوں، کعبہ کی طرف ہی منہ کریں کیونکہ اللہ تعالیٰ ان

(قرطبی باوضاحت)

کو اسی طرف پھیر دیتا ہے۔

فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ : "یعنی بادروا بامثال کلمات امرکم اللہ وان کان قد امرکم فی بعض الاحیان بالاستقبال الی بیت المقدس وفی بعضها الی الکعبۃ فانہ تعالیٰ یحکم ما یشاء فلا تنازعوا فی امر القبۃ"

یعنی اللہ تعالیٰ تمہیں جو حکم دے اسے تسلیم کرنے کے لئے جلدی کرو، جب رب تعالیٰ نے بعض اوقات میں بیت المقدس کی طرف منہ کرنے کا حکم دیا تو اسی کو جلدی ماننا ضروری تھا اور اب جب کعبہ کا حکم دے دیا تو اسی حکم کو جلدی سے ماننا ضروری ہے اللہ تعالیٰ جو چاہے حکم فرماتا ہے، تم قبلہ کے معاملہ میں کسی قسم کا تنازع نہ کرو۔

(مظہری)

اِنَّ مَا تَكُونُوا يَاتِ بِكُمْ اللّٰهُ جَمِيعًا: جہاں بھی تم ہو لے آئے گا تمہیں اللہ جمع کر کے۔ اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ تم جہاں بھی ہو کہ تمہارا منہ اس قبلہ کی طرف ہو جو رب تعالیٰ کو پسند ہے یا اس قبلہ کی طرف منہ ہو جو رب تعالیٰ کو ناپسند ہو۔ "یات بکم اللہ جمیعاً" کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہاری روحوں کو قبض کر لے گا پھر تمہیں جزاء کے لئے جمع کرے گا اور تمہارے اعمال کے مطابق تمہیں جزاء دے گا۔ اور اگر تمہاری موت تمہاری نماز کے دوران ہی آ جائے، یا واجب کو اپنے ذمہ سے ادا کرنے کے بعد آ جائے تو بہت بڑی سعادت ہوگی۔

آیہ کریمہ کا ایک مطلب یہ بھی ہے، کہ تمام مسلمانوں کا قبلہ کعبہ کی جانب ہے اگر قبلہ معلوم ہو تو اسی جانب وہ منہ کرے اور قبلہ معلوم نہ ہو تو تحری (کوشش) کرے اور اگر نفل پڑھنے والا ہو اور شہر سے باہر سواری پر ہو تو جس جہت کی طرف اس کی سواری متوجہ ہو وہی اس کا قبلہ ہے یعنی اللہ تعالیٰ اسے اس کی طرف ہی پھیر دیتا ہے۔ نیکیوں کی طرف جلدی کرو یعنی قبلہ کے مشتبہ ہونے کی صورت میں نماز میں تاخیر نہ کرو بلکہ تحری کر کے نماز اپنے وقت مستحب میں جلدی ادا کر دو۔ جس طرف بھی تمہارا رخ ہو اللہ تعالیٰ تم تمام کو قبلہ کی طرف متوجہ ہونے کا حکم ہی عطا فرمائے گا۔

(از مظہری)

"اِنَّ مَا تَكُونُوا" کا مطلب علامہ آلوسی رحمہ اللہ بیان فرماتے ہیں کہ تم جس جگہ بھی ہو خواہ وہ طہیبت کے موافق ہو جیسے زمین یا تمہاری طبیعت کے موافق نہ ہو جیسے تم آسمان پر ہو۔ پھر تمہارے

اجزاء چٹان کی طرح جمع ہوں یا ریت کے ذرات کی طرح مختلف جگہ پر بکھرے ہوئے ہوں اللہ تعالیٰ تم تمام کو ایک جگہ جمع کر دے گا پھر تمہیں جزاء دے گا اگر بہتر عمل ہوئے تو بہتر جزاء دے گا اور اگر برے عمل ہوئے تو ان کے مطابق ہی جزاء بھی دے گا۔
(از روح المعانی)

إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ : ”بیشک اللہ ہر چیز پر قادر ہے“

”ای علی الاعادة بعد الموت والاثابة لاهل الطاعة والعقاب
لمستحق العقوبة“

یعنی اللہ تعالیٰ موت کے بعد زندہ کرنے پر قادر ہے اور نیک لوگوں کو ثواب عطا کرنے اور جو لوگ عذاب کے مستحق ہوں گے ان کو عذاب دینے پر قادر ہے۔
(خازن)

پہلے پارہ کے دوسرے رکوع میں اس جملہ کی وضاحت کافی تفصیل سے بیان کر دی گئی۔

آیت کریمہ سے حاصل ہونے والا فائدہ:

اگرچہ آیت کریمہ کا تعلق استقبال قبلہ سے ہے لیکن اس میں مطلقاً یہ ثابت ہوتا ہے:

” (فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ) ای بادروا بالطاعة وقبول الاوامر وفيه حث
على المبادرة الى الاولوية والافضلية“

”بھلائی کی طرف جلدی کرو“ یعنی نیکی کی طرف جلدی کرو، اور اوامر کو قبول کرنے میں
جلدی کرو اس میں اس چیز کی طرف براہیختہ کیا گیا ہے کہ ہر وہ کام کیا جائے جو بہتر اور
افضل ہو۔
(خازن)

نماز کس وقت ادا کی جائے:

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں جب بھی نماز کا وقت شروع ہو اسی وقت جتنا جلدی ہو سکے نماز
ادا کرنا افضل ہے۔

امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جماعت کے لئے جو وقت مستحب ہو اس مستحب وقت
میں جلدی نماز ادا کرنا افضل ہے آپ کے اس موقف کے خلاف کوئی حدیث نہیں۔ آپ کا مسلک
حدیث پاک کے مطابق ہے۔

اس مسئلہ کو تفصیل سے دیکھیں: راقم نے غیر مقلدین کی جانب سے وقفہ فوق جاری ہونے والے اشتہارات کو دیکھ کر ایک کتاب ترتیب دی جس میں نماز کے مختلف مسائل احادیث مبارکہ سے ثابت کئے اس کتاب کا نام ”نماز حبیب کبریاء“ ہے وجہ تصنیف صرف یہ ہے کہ اپنے مسلک کے لوگ اگر اپنے مسلک پر قائم رہ سکیں تو یہ بھی غیبت ہے کسی سے نہ مخالفت نہ مقابلہ۔

راقم بہت معتدل طبیعت کا ہے جسے اپنے کام سے کام ہے۔ نماز حبیب کبریاء میں راقم نے نماز کے اوقات پر تفصیلی بحث کی ہے پہلے وہ دیکھیں۔

نمازوں کے اوقات:

نماز کے وقت میں غیر مقلدین اور احناف میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ غیر مقلدین کہتے ہیں جب نماز کا وقت شروع ہو جائے اسی وقت نماز ادا کی جائے دیر نہ کی جائے۔

احناف کے نزدیک اس مسئلہ میں تفصیل ہے۔ یعنی وقت میں تین حال پائے جاتے ہیں۔ ایک ہے: کل وقت، یعنی نماز کا وقت کب ختم ہوتا ہے۔ وقت کے شروع ہونے سے لیکر وقت کے ختم ہونے تک تمام وقت کہلائے گا۔

دوسرا ہے: مکروہ وقت۔ نماز کے بعض اوقات وہ ہیں جن میں نماز مکروہ ہوگی اگرچہ وہ نماز کا وقت کہلائے گا۔

تیسرا ہے: مستحب وقت جن وقتوں میں نماز ادا کرنا یا جماعت کرنا افضل ہوتا ہے اسے مستحب وقت کہا جاتا ہے۔ دونوں مذہبوں کے دلائل اور مسئلہ پر وضاحت سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ حق مذہب کونسا ہے۔

غیر مقلدین کا مذہب:

آئمہ مساجد کی خدمت میں ہماری درخواست ہے کہ نبی کریم ﷺ کے ارشاد پاک کے مطابق وہ نمازیں اول وقت پر پڑھایا کریں، اس سے خدا خوش ہوگا اور سنت کی پیروی کے سبب رحمۃ اللعالمین

حشر میں شفاعت فرما میں گے۔

(صلوة الرسول ص ۱۳۸)

سبحان اللہ کبھی نبی کریم ﷺ کی شفاعت کا انکار اور کبھی دھوکہ دینے کیلئے اقرار کبھی آپ کی رحمت کو تسلیم نہ کرنا اور کبھی تمام جہانوں کیلئے رحمت مان لینا یہی ان کے باطل مذہب کا بیان کافی ہے، بہر حال ان کے مذہب کے دلائل بیان کرنے کے بعد احناف کے مذہب کی وضاحت ہوگی۔
غیر مقلدین کے دلائل:

نماز عصر کا وقت: حضرت بریدہ روایت کرتے ہیں

”فأقام العصر والشمس مرتفعة بيضا نقية“ (رواہ مسلم)

یعنی رسول اللہ ﷺ نے قائم کی نماز عصر در حالیکہ آفتاب تھا بلند سفید صاف (یعنی زرد نہ تھا)

”وعن انس قال كان رسول الله ﷺ يصلي العصر والشمس مرتفعة حية“ (متفق علیہ)

روایت ہے حضرت انس سے وہ کہتے ہیں کہ رسول خدا نماز عصر پڑھتے اور آفتاب ہوتا تھا بلند،

زندہ، (یعنی روشن بغیر زردی کے)

منافق کی نماز: حضرت انس روایت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ رسول خدا نے فرمایا

”تلك صلاة المنافق يجلس يرقب الشمس حتى اذا اصفرت وكانت بين قرني

الشیطن قام فنقر اربعاً لا يذكر الله فيها الا قليلاً“ (رواہ مسلم)

یہ منافق کی نماز عصر ہے (جو اخیر وقت پڑھی جائے) کہ بیٹھ رہتا ہے، انتظار کرتا ہے آفتاب کا

یہاں تک کہ جب ہو جاتا ہے زرد، اور ہوتا ہے درمیان دو سینگوں شیطان کے (یعنی غروب کے وقت)

کھڑا ہوتا (نماز کیلئے) پھر ٹھونگیں مارتا ہے چار، نہیں یاد کرتا اس میں اللہ کو مگر تھوڑا۔ (صلوة الرسول ص ۱۳۴)

غیر مقلدین اپنا دعویٰ ثابت کرنے میں ناکام ہو گئے:

دعویٰ یہ کہ نماز عصر اول وقت میں پڑھی جائے، گرمیوں میں بھی ساڑھے تین بجے۔ اور جو

احادیث بیان کی ہیں، ان سے یہ دعویٰ کیسے ثابت ہے۔ احادیث سے جو ثابت ہو رہا ہے وہ تو احناف کا

مذہب ہے۔

پہلی جو دو حدیثیں پیش کی ہیں ان سے یہ ثابت ہو رہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے عصر کی نماز ادا

کی جب کہ سورج روشن، چمکدار تھا۔

تیسری حدیث جو پیش کی اس سے یہ ثابت ہو رہا ہے کہ عصر کی نماز میں اتنی تاخیر کر دینا کہ سورج زردی مائل ہو جائے۔ بلکہ غروب کے قریب ہو جائے (کیونکہ غروب کے وقت ہی شیطان سورج کے آگے اپنے بازو پھیلا کر کھڑا ہو جاتا ہے تاکہ سورج کی عبادت کرنے والے دراصل مجھے سجدہ کریں) اور نماز پڑھنے والے کو سورج کے غروب ہونے کا خطرہ ہو وہ بے اطمینانی سے نماز ادا کرے تو یہ علامت نفاق ہے۔

یہ بھی خیال رہے کہ ”منافق کی نماز“ کا عنوان بھی غلط ہے اور ظلم عظیم ہے کسی مومن کو منافق کہنا دراصل اپنے آپ کو کافر بنانا ہے۔ احادیث میں جہاں بھی اس قسم کے الفاظ ہیں وہاں منافقت کی علامت مراد ہوتا ہے، بعینہ منافق نہیں کہا گیا اور نہ ہی یہ کہنا درست ہے۔

اب ذرا ٹھنڈے دل سے غور کیجئے کہ مثال کے طور پر راولپنڈی، اسلام آباد میں گرمیوں کا آخری وقت غروب شمس (سورج کے غروب ہونے کا وقت) کا سات بج کر تیس منٹ ہے۔ سورج کے غروب ہونے سے بیس یا پچیس منٹ پہلے سورج زردی مائل ہوتا ہے اگر کوئی شخص سات بجے یا اس کے بعد نماز ادا کرے تو وہ مکروہ وقت ہوگا۔ اور اگر کوئی غروب کے وقت نماز ادا کرے یعنی جب سورج غروب ہو رہا ہو تو یہ علامت نفاق ہوگی۔

یہی مذہب اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے احناف کا ہے کہ وہ ساڑھے پانچ بجے یا زیادہ سے زیادہ پونے چھ بجے نماز ادا کر لیتے ہیں، جب سورج خوب چمک رہا ہوتا ہے، آب و تاب میں ہوتا ہے۔ ذرا انصاف کیجئے کہ احناف کیا اس وقت نماز نہیں ادا کر رہے ہوتے جو حضور ﷺ کی نماز کا وقت ہوتا ہے۔ یقیناً وہی وقت احناف کی نماز کا ہے جو وقت رسول اللہ ﷺ کی نماز کا ہے۔

عصر کا وقت فقہ حنفی سے:

”واول وقت العصر اذا خرج وقت الظهر على القولين و آخر وقتها مالم تغرب الشمس“

(ہدایہ)

عصر کا وقت اس وقت شروع ہوگا جب ظہر کا وقت امام اعظم رحمہ اللہ اور صاحبین کے قول کے

مطابق ختم ہو جائے گا۔ یعنی سایہ چیز کا دو مثل ہو جائے اور عصر کا وقت ختم اس وقت ہوگا جب سورج غروب ہوگا۔

خیال رہے کہ عصر کا جو وقت بیان کیا گیا ہے یہ کل وقت ہے۔ جس میں مکروہ اور غیر مکروہ دونوں شامل ہیں۔

”ثلاثة اوقات لا يصح فيها شئ من الفرائض والواجبات التي لزمت في الذمة قبل دخولها عند طلوع الشمس الى ان ترتفع وعند استوائها الى ان تزول وعند اصفرارها الى ان تغرب ويصح اداء ما وجب فيها مع الكراهة“ (نور الابضاح)

تین وقتوں میں کوئی فرائض و نوافل ادا نہیں ہوں گے، جو اس کے ذمہ اس سے پہلے ہیں، ایک طلوع شمس (سورج کے نکلنے) کے وقت یہاں تک کہ سورج (ایک دو نیزے کے برابر) اوپر آجائے۔ اور جب سورج درمیان میں ہو یہاں تک کہ ڈھل جائے۔ اور جب سورج زردی مائل ہو جائے البتہ اسی دن کی عصر جو اس وقت اس پر لازم ہوئی بوجہ تاخیر کے وہ ادا ہوگی لیکن مکروہ ہوگی۔

اس فقہی قول کو حدیث پاک سے لیا گیا:

”ولذا استدلل بحديث عقبة بن عامر الثابت في مسلم وغيره ثلاث ساعات كان رسول الله ﷺ نهانا ان نصلی فيهن او نقبر فيهن موتانا حين تطلع الشمس بازغة حتى ترتفع وحين يقوم قائم الظهيرة حين تميل الشمس وحين تضيف للغروب حتى تغرب“ (فتح القدیر)

ان تین اوقات میں نماز کی ممانعت پر اس حدیث پاک سے دلیل پکڑی گئی ہے جو مسلم وغیرہ میں مذکور ہے۔

حضرت عقبہ بن عامر کہتے ہیں۔ تین وقتوں میں رسول اللہ ﷺ ہمیں نماز پڑھنے سے منع کرتے تھے اور فوت ہونے والے لوگوں پر نماز جنازہ پڑھنے سے منع فرماتے تھے، جب سورج طلوع ہو رہا ہو یہاں تک کہ بلند ہو جائے اور جب دوپہر کے وقت سورج درمیان میں ہو یہاں تک کہ سورج ڈھل جائے اور غروب ہونے کی طرف مائل ہو یہاں تک کہ غروب ہو جائے۔

سورج کے زردی مائل ہونے اور غروب کے قریب ہونے پر فقہاء کا استدلال:

”قوله بتجدد ان الشمس تطلع بين قرني شيطان فاذا ارتفعت فارقتها ثم اذا استوت فارقتها فاذا زالت فارقتها فاذا دنت للغروب فارقتها واذا غربت فارقتها ونهى عن الصلوة في تلك الساعات رواه مالك في الموطأ والنسائي فانه افاد كون المنع لما اتصل بالوقت مما يستلزم فعل الاركان فيه التشبيه بعبادة الكفار وهذا المعنى بنقصان الوقت والافالوقت لانقص فيه نفسه بل هو وقت كسائر الاوقات“

(فتح القدیر)

نبی کریم ﷺ کا ارشاد کہ بے شک سورج شیطان کے دو سینگوں (یعنی بازوؤں) کے درمیان طلوع ہوتا ہے، پھر جب سورج بلند ہو جاتا ہے وہ ہٹ جاتا ہے، پھر جب سورج درمیان میں آتا ہے پھر اس کے سامنے آ جاتا ہے۔ پھر جب سورج ڈھل جاتا ہے وہ بھی ہٹ جاتا ہے۔ پھر جب سورج غروب ہونے کے قریب ہوتا ہے وہ پھر اس کے سامنے آ جاتا ہے۔ اور جب غروب ہو جاتا ہے جدا ہو جاتا ہے۔ اور تین اوقات میں نبی کریم ﷺ نے نماز ادا کرنے سے منع فرمایا۔

(موطا امام مالک نسائی)

اس حدیث سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ نبی کریم ﷺ نے ان اوقات میں نماز پڑھنے سے اسلئے منع فرمایا کہ کافروں کی عبادت کی مشابہت حاصل ہوتی ہے ورنہ وقت میں ذاتی طور پر کوئی نقص نہیں۔ بلکہ یہ بھی دوسری وقتوں کی طرح ہی وقت ہیں۔ نقصان عبادات میں ہوگا تو ضمناً اوقات میں بھی نقص آ گیا۔ فقہاء کرام کی عبارات اور دلائل کو دیکھ کر انصاف سے فیصلہ کریں، کیا یہ سچ نہیں، یہ حق نہیں کہ فقہ قرآن و حدیث کے مسائل کی وضاحت کر نیوالے علم کا نام ہے؟ ہاں ہاں یہ حقیقت ہے اسکا انکار ممکن نہیں۔ عوام کو دھوکہ دینا یہ مسئلہ توفیق کا ہے ہم تو حدیث بیان کر رہے ہیں فقہ کوئی حدیث کے مطابق علم کا نام نہیں۔ فقہ تو اماموں کا من گھڑت علم ہے، یہ سب جھوٹ اور فریب ہے، دھوکہ دہی کے بغیر کچھ نہیں۔

ظہر کی نماز کا وقت اور غیر مقلدین:

ترمذی میں ظہر ٹھنڈے وقت: حضرت ابو ہریرہ روایت کرتے ہیں کہتے ہیں۔ کہ رسول خدا نے فرمایا

(منفق علیہ)

”اذا اشتد الحر فابردوا بالصلوة“

جب گرمی سخت ہو تو نماز ٹھنڈے وقت میں پڑھو۔

ملاحظہ: ٹھنڈے وقت کا یہ مطلب نہیں چار بجادو بلکہ یہ مراد ہے کہ شدت کی گرمی میں سورج ڈھلتے ہی فوراً نہ پڑھو۔ تھوڑی دیر کرو۔

اور نسائی میں حضرت انس سے روایت ہے۔ ”واذا كان البرد عجل“ یعنی جب سردی ہوتی تو حضور ظہر پڑھنے میں جلدی کرتے۔
(صلوة الرسول ص ۱۴۴)

غیر مقلدین کی اس دلیل میں بھی ناکامی:

چار بجے نماز پڑھنے کا بہتان ہے، گرمیوں میں نماز ہمارے علاقہ میں ڈیڑھ بجے سے لے کر اڑھائی بجے تک ہوتی ہے۔ سردیوں میں نماز ایک بجے سے لے کر دو بجے تک ہوتی ہے۔

حدیث شریف کی یہ توجیہ بیان کرنا ”کہ شدت گرمی میں سورج ڈھلتے ہی فوراً نہ پڑھو، تھوڑی دیر کرو“ غلط ہے۔ اس پر کوئی دلیل نہیں قائم کی گئی۔ صرف زبانی دعویٰ قابل قبول نہیں۔

اگر اپنی مرضی سے ہی وجہ گھڑنی ہو تو یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ شدت گرمی میں زوال کے وقت نماز نہ پڑھو بلکہ سورج ڈھلتے ہی جلدی پڑھ لو۔

احناف کا مذہب فقہ سے:

”ووقت الظهر من زوال الشمس الى ان يصير ظل كل شئ مثليه او مثله سوى

ظل الاستواء“

(نور الايضاح)

ظہر کا وقت سورج کے ڈھل جانے سے شروع ہوا ہے اور ہر چیز کا سایہ اصلی سایہ کے بغیر دو مثل ہو جائے یا ایک مثل ہو جائے۔

ظہر کا یہ کل وقت ہے۔ یعنی ظہر کے وقت کی ابتداء کو بیان کیا گیا ہے، اور ظہر کے وقت کی انتہاء کو بیان کیا گیا ہے۔

ظہر کا مستحب وقت:

”والابراد بالظہر فی الصيف وتعجلہ فی الشتاء الا فی یوم غیم فیؤخر فیہ“ (نور الابضاح)
 گرمیوں میں ظہر کو ٹھنڈا کر کے پڑھا جائے، سردیوں میں جلدی، ہاں اگر بادل ہو تو تاخیر کرے
 یہ ضرورت اس وقت تھی جب گھڑیوں کا نظام نہیں تھا، دیر کا حکم اس لئے تھا کہ ایسا نہ ہو کہ وقت
 سے پہلے ہی نماز پڑھ لی جائے۔

احناف کے دلائل احادیث سے:

”عن ابی ہریرۃ عن النبی ﷺ انه قال اذا اشتد الحر فابرءوا بالصلوة فان شدة
 الحر من فیح جہنم“

(بخاری ج ۱ ص ۶۷ باب الابراد بالظہر، مسلم ج ۱ ص ۲۲۴ باب استحباب الابراد بالظہر، ابوداؤد ج ۱ ص ۵۸ باب وقت صلوة الظہر
 ترمذی ج ۱ ص ۴۰ باب ماجاء فی تاخیر الظہر، نسائی ج ۱ ص ۸۷ باب الابراد بالظہر، ابن ماجہ ج ۱ ص ۴۹ باب الابراد بالظہر)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ بیشک آپ نے فرمایا
 جب گرمی سخت ہو تو نماز کو ٹھنڈا کر کے پڑھو، بے شک سخت گرمی جہنم کے سانس لینے سے ہے۔
 ”عن انس قال کان رسول اللہ ﷺ اذا کان الحر ابرد بالصلوة واذا کان البرد
 عجل“ (بخاری، نسائی حوالہ مذکور)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ فرماتے تھے جب گرمی ہو تو نماز کو ٹھنڈا
 کر کے پڑھو۔ اور جب سردی ہو تو جلدی پڑھو۔

”عن ابی ذر الغفاری قال کنا مع رسول اللہ ﷺ فی سفر فاراد المؤذن ان یؤذن
 للظہر فقال النبی ﷺ ابرد ثم اراد ان یؤذن فقال له ابرد حتی رأینا فنی التلول
 فقال النبی ﷺ ان شدة الحر من فیح جہنم فاذا اشتد الحر فابرءوا بالصلوة“

(بخاری باب الابراد بالظہر فی السفر، مسلم باب استحباب الابراد بالظہر)

حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سفر میں تھے۔ مؤذن
 نے اذان دینے کا ارادہ کیا تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا ٹھنڈا کرو، کچھ دیر کے بعد مؤذن نے پھر
 اذان دینے کا ارادہ کیا تو آپ نے فرمایا ٹھنڈا کرو یہاں تک کہ ٹیلوں کے سائے (پھیلے ہوئے)
 ہم دیکھ رہے تھے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا بے شک سخت گرمی جہنم کے سانس لینے کی وجہ سے

ہوتی ہے۔ پس جب سخت گرمی ہو تو نماز کو ٹھنڈا کرو۔

اس حدیث پاک میں لفظ ”ثم“ سے بھی پتہ چل رہا ہے کہ ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ کے روکنے کے بعد کچھ وقت گزر گیا تو مؤذن نے دوبارہ اذان دینے کا ارادہ فرمایا تو آپ نے پھر روک دیا۔

”فسی التلول“ سے بھی پتہ چلا کہ ٹیلوں کے سائے کافی مقدار میں پھیل چکے تھے جو دور سے دکھائی دے رہے تھے اگر مطلقاً ”سایہ“ ہی معنی لیا جائے تو وہ کسی طرح بھی درست نہیں، کیونکہ جب تک سایہ ڈھلے نہیں اس وقت تک تو ظہر کا وقت شروع ہی نہیں ہوتا۔

اصلی سایہ کے سواء ایک مثل ہونے سے پہلے ظہر ادا کر لیجائے:

اگر چہ ظہر کے وقت میں مکروہ وقت نہیں، لیکن امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ اور صاحبین کے درمیان اختلاف ہے کہ ظہر کا وقت کب ختم ہوتا ہے ہر چیز کے اصلی سایہ کے بغیر ایک مثل سایہ ختم ہونے تک وقت ختم ہو جاتا ہے یا کہ دو مثل تک پہنچنے تک۔

یہی اختلاف عصر کے وقت کی ابتداء میں ہے کہ ایک مثل کے بعد شروع ہوتا ہے یا دو مثل کے بعد، زیادہ صحیح اور معتبر اور مفتی بہ قول امام اعظم رحمہ اللہ کا دو مثل والا ہے۔

اس لئے بہتر یہ ہے کہ ظہر ایک مثل تک سایہ پہنچنے سے پہلے ادا ہو جائے اور دو مثل تک سایہ پہنچنے کے بعد ہی عصر کی نماز پڑھی جائے۔

اس فقہی ضابطہ کو بھی بفضلہ تعالیٰ حدیث پاک سے ہی لیا گیا ہے۔ آئیے حدیث پاک کو دیکھیں۔

”عن عبد اللہ بن رافع مولیٰ ام سلمۃ زوج النبی ﷺ انه سأل ابا ہریرۃ عن وقت الصلوۃ فقال ابو ہریرۃ انا اخبرک صل الظهر اذا کان ظلمک مثلک والعصر اذا کان ظلمک مثلک“
(موطا امام مالک کتاب وقوت الصلوۃ)

حضرت عبد اللہ بن رافع جو نبی کریم ﷺ کی زوجہ مطہرہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے غلام ہیں وہ روایت کرتے ہیں۔ کہ بے شک انہوں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے نماز کے وقت کے متعلق سوال کیا تو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں تمہیں خبر دیتا ہوں کہ

ظہر کی نماز ادا کر لو جب تمہارا سایہ ایک مثل ہو جائے اور عصر کی نماز ادا کرو جب تمہارا سایہ دو مثل ہو جائے۔

بہت واضح ہوا کہ ظہر کے وقت کی انتہاء شے کے ایک مثل سایہ پر نہیں ہوتی ورنہ وہاں سے ہی عصر کا وقت شروع ہو جاتا ہے البتہ شے کے ایک مثل سایہ کے ختم ہونے تک ظہر کو ادا کر لینا بہتر ہے۔
راقم عام طور دو بجے ہی ظہر کی نماز ادا کرتا ہے۔ میرے خیال میں یہ وقت تقریباً تمام سال راولپنڈی، اسلام کے علاقوں میں بہتر ہے۔ تعجیل و تاخیر دونوں پر بیک وقت عمل ہو جاتا ہے۔

فجر کی نماز کے متعلق غیر مقلدین کا بیان:

”عن عائشة قالت كان رسول الله ﷺ ليصلي الصبح فتصرف النساء متلفعات بمروطهن ما يعرفن من الغلس“
(متفق عليه)

حضرت عائشہ روایت کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ رسول خدا (جب) نماز صبح پڑھتے تھے۔ پس پھر تیس عورتیں (مسجد سے آپ کے ساتھ نماز پڑھ کر) اپنی چادروں میں لپٹی ہوئی نہ پہچانی جاتی تھیں، بسبب اندھیرے کے۔
(بخاری و مسلم)

ملاحظہ: معلوم ہوا کہ حضور اندھیرے میں اول وقت نماز پڑھا کرتے تھے

(صلوة الرسول ص ۱۴۵)

فجر کی نماز کے وقت کے متعلق فقہ حنفی سے:

”وقت الصبح من طلوع الفجر الصادق الى قبيل طلوع الشمس“ (نور الايضاح)

صبح کا وقت صبح صادق سے لیکر سورج کے نکلنے سے تھوڑا پہلے تک۔

صبح کا یہ وقت ہے، یعنی اس کی ابتداء صبح صادق (پو پھٹنے) سے ہی ہے اور انتہاء سورج کے نکلنے کے وقت کے قریب تک ہے۔

صبح کی جماعت کا مستحب وقت فقہ حنفی سے

میں نے نور الايضاح کے عربی حاشیہ ”ذريعة النجاح“ میں درمختار، شامی، مراقی الفلاح سے

ترتیب دیا اور اس میں اپنی طرف سے وضاحت بھی کی۔ اسے دیکھیں۔

متن کی عبارت یہ ہے:

”وَيَسْتَحِبُّ الْإِسْفَارَ بِالْفَجْرِ لِلرِّجَالِ“ مردوں کیلئے فجر کی نماز روشنی میں پڑھنا مستحب ہے۔
اس پر راقم کا ترتیب دیا ہوا حاشیہ یہ ہے۔

”الاسفار بالفجر للرجال الى التاخير للاضائة والابتداء باسفار والختم به وهو المختار بحيث يرتل اربعين اية ثم يعيده بطهارة ولو فسد لقوله عليه السلام اسفروا بالفجر فانه اعظم للاجر، والاسفار بالفجر مستحب سفرا وحضرا للرجال الا في مزدلفه للحاج فان التغليس لهم افضل لوجوب الوقوف بعده بها كما هو في حق النساء دائما لانه اقرب للستر. والفائدة في الاسفار تكثير الجماعة وفي التغليس تقليلها وما يؤدي الى التكثير افضل اقول باعث الافضلية بالاسفار تكثير الجماعة وان كان تكثير الجماعة في التغليس فالافضل التغليس وان الذين يعملون في المعامل والمصانع والمكاتب يرضون التعجيل والتاخير باعث لحرجهن وتقليل الجماعة والله اعلم بالصواب“

(دریغہ الحاج)

مردوں کیلئے فجر کی نماز میں اسفار کا یہ مطلب ہے کہ وقت کے روشن ہونے کیلئے تاخیر کرے، ابتداء بھی روشنی میں ہو اور ختم بھی روشنی میں ہو۔ مختار یہ ہے کہ امام ترتیل سے چالیس آیتیں پڑھے، پھر اگر نماز میں کوئی فساد لازم آجائے تو دوبارہ وضوء کر کے اسی مقدار میں قراءت سے نماز وقت میں ادا ہو سکے۔ اس لئے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا فجر کو روشنی میں ادا کرو کہ اس میں زیادہ اجر ہے۔ فجر کی نماز کو مردوں کے لئے روشنی میں ادا کرنا مستحب ہے خواہ سفر میں ہو یا حضر میں۔ سوائے مزدلفہ کے، کیونکہ وہاں اندھیرے میں نماز افضل ہے حاجیوں کے لئے، اس لئے کہ بعد میں وہاں دعاء کے لئے ٹھہرنا ہے تاکہ زیادہ وقت مل سکے، جیسا کہ عورتوں کو ہمیشہ ہی اندھیرے میں نماز پڑھنا افضل ہے، کیونکہ اس میں ان کا پردہ ہے۔ روشنی میں نماز ادا کرنے کا فائدہ یہ ہے کہ جماعت میں لوگ زیادہ مل سکیں گے اور اندھیرے میں نمازی کم ہوں گے۔ تکثیر جماعت افضل ہے۔

اس پر راقم کی وضاحت یہ ہے کہ جب مقصد روشنی میں پڑھنے کا تکثیر جماعت ہے تو یقیناً اگر

اندھیرے میں نماز پڑھنا نمازیوں کے زیادہ ہونے کا سبب ہو تو اندھیرے میں نماز پڑھنا زیادہ ثواب ہوگا۔ جیسا کہ کارخانوں، فیکریوں اور دفاتر میں ملازمت کرنے والے صبح کی نماز جلدی پڑھنا بہتر سمجھتے ہیں ایسی صورت میں صبح کی نماز اندھیرے میں پڑھنا بہتر ہے، کیونکہ اگر دیر سے نماز ادا کی جائے تو یا ان لوگوں کے کاموں میں حرج واقع ہوگی۔ یا وہ نماز جماعت سے پہلے ادا کر کے چلے جائیں گے اس لئے نمازیوں کا اعتبار کرنا ضروری ہے۔

احناف کا استدلال احادیث سے:

”عن رافع بن خدیج ان رسول الله ﷺ قال اسفروا الصلوة الفجر فان ذلك اعظم للاجر او قال لا جور کم“

مسند حندی ج ۱ ص ۱۹۹ ابو داؤد ج ۱ ص ۶۱ باب وقت الصبح، ترمذی ج ۱ ص ۹۳ باب الاسفار، نصب الرتبة ج ۱ ص ۲۳۸

رافع ابن خدیج رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بے شک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ فجر کو روشنی میں ادا کرو، بے شک اس میں عظیم اجر ہے

اعتراض: نبی کریم ﷺ نے سفیدی میں نماز پڑھنے کا جو حکم دیا ہے، اس کا مطلب تو یہ ہو سکتا ہے کہ صبح صادق کے وقت نماز ادا کرو، کیونکہ صبح کاذب کے بعد اندھیرا ہو جاتا ہے۔

جواب: صبح صادق مراد نہیں ہو سکتی، کیونکہ صبح صادق سے پہلے تو نماز ہو ہی نہیں سکتی، پھر روشنی میں نماز پڑھنے کا حکم اور عظیم اجر کے پائے جانے کا کیا مقصد ہو سکتا ہے؟

ایک اور حدیث پاک کو دیکھیں تو اور واضح ہو جائے گا کہ اس سفیدی سے مراد روشنی ہی ہے، صبح صادق نہیں،

”عن هرير بن عبد الرحمن بن رافع بن خديج قال سمعت جدي رافع بن خديج يقول قال رسول الله ﷺ لبلال نور بصلوة الصبح حتى يبصر القوم مواقع نبلهم من الاسفار“

(المعجم الكبير للطبرانی ص ۲۷۸ رقم الحديث ۴۴۱۲)

هرير بن عبد الرحمن بن رافع بن خديج کہتے ہیں کہ میں نے اپنے دادا رافع بن خديج کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو فرمایا کہ صبح کی نماز کو روشن کر کے

پڑھو، یہاں تک کہ اس روشنی میں قوم اپنے تیروں کے گرنے کے مقامات کو دیکھ لے۔

اس حدیث پاک سے واضح طور پر معلوم ہو گیا کہ ”اسفار“ سے مراد صبح صادق نہیں بلکہ روشنی مراد ہے۔

”عن علی بن ربیعہ قال سمعت علیا یقول لمؤذنه اسفر اسفر“

(مصنف عبدالرزاق ج ۱ ص ۵۶۹ باب وقت الصبح) مصنف ابن ابی شیبہ ج ۱ ص ۳۲۱ باب من کان یورینہا، طحاوی ج ۱ ص ۱۲۳ باب وقت الفجر

حضرت علی بن ربیعہ کہتے ہیں میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے سنا کہ وہ اپنے مؤذن (ابن نباح) کو کہہ رہے تھے اور روشنی ہونے دو، اور روشنی ہونے دو

”عن عبدالرحمن بن یزید قال کنا نصلی مع ابن مسعود فکان یسفر بصلوة الصبح“

(طحاوی ج ۱ ص ۱۲۵ باب وقت الفجر، مصنف عبدالرزاق ج ۱ ص ۵۶۹، مصنف ابن ابی شیبہ ج ۱ ص ۳۲۱ باب من کان یورینہا،

عبدالرحمن بن یزید کہتے ہیں کہ ہم حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے ساتھ نماز پڑھتے تھے وہ صبح کی نماز روشنی میں پڑھتے تھے۔

جن احادیث کو ذکر کیا گیا ہے ان سے یہ بات واضح ہو گئی کہ جب تکثیر جماعت روشنی میں ہو تو روشنی میں نماز ادا کرنا مستحب ہے۔ اس پر عمل رسول اللہ ﷺ کا بھی بیان کیا جا چکا ہے۔ اور صحابہ کرام کا بھی غیر مقلدین کی دلیل کا جواب:

”والحدیث القولی مقدم ای اسفروا بالفجر فانه اعظم للاجر واما ثبوت الغلس فلا ننکره ایضا فانه ایضا جائز فان الخلاف فی الافضلیة فصار الترجیح لمذهب الاحناف“

(حاشیہ ترمذی)

صبح کی نماز کو روشنی میں پڑھنے والی حدیث قوی ہے۔ اور اندھیرے میں نماز پڑھنے والی حدیث فعلی ہے۔ قانون یہ ہے کہ جب قوی اور فعلی حدیث میں تعارض ہو تو قوی حدیث کو ترجیح دی جاتی ہے۔

اور اصل میں یہ نزاع ہی نہیں کہ اندھیرے میں صبح کی نماز نہیں ہوتی، بلکہ نزاع تو صرف فضیلت میں ہے کہ افضل کیا ہے۔ روشنی والی نماز میں عظیم اجر کا ذکر ہے لہذا یہ افضل ہوگی۔ اندھیرے والی نماز میں صرف پڑھنے کا ذکر ہے لہذا وہ جائز رہے گی۔

اندھیرے میں نماز فجر ادا کرے یا روشنی میں جائز ہے۔ لیکن جب روشنی میں نمازی زیادہ ہوں تو روشنی میں افضل ہے۔ اور جب اندھیرے میں نماز پڑھنے سے نمازی زیادہ ہوں تو اندھیرے میں افضل ہے۔

راقم جہاں امام ہے وہاں کے لوگ دفتری ملازم ہیں۔ دفتر میں جانے سے پہلے سیر کرنا، ناشتہ کرنا غسل کرنا، کپڑے بدلنا ان کے کئی معمولات ہیں سردیوں میں وقت کم ہونیکی وجہ سے راقم صبح کی نماز اندھیرے میں پڑھاتا ہے اور گرمیوں میں وقت زیادہ ہونے کی وجہ سے اور رات کے چھوٹا ہونے اور دیر سے جاگ آنے کی وجہ سے صبح کی نماز اجالے میں پڑھاتا ہے۔ یہ دونوں صورتیں نمازیوں کی سہولت کے مد نظر ہیں۔ ورنہ راقم خود گرمیوں اور سردیوں میں جلدی جاگنے کا عادی ہے، ہمیشہ اندھیرے میں نماز پڑھنے یا اجالے میں نماز پڑھنے سے راقم کو کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن فقہی نقطہ کو مد نظر رکھ کر بفضلہ تعالیٰ راقم کا عمل ہے۔ ضد یا عناد کسی کو نہ ہو تو بفضلہ تعالیٰ راقم کے طریقہ پر کوئی اعتراض نہیں کر سکے گا۔

جلدی نماز پڑھنے پر غیر مقلدین کی ایک اور دلیل:

ترمذی شریف میں حضرت علی روایت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”یا علی ثلاث لا تؤخرها الصلوة اذا اتت والجنابة اذا حضرت والايم اذا وجدت لها كفوا“

اے علی تین چیزیں (ایسی) ہیں کہ نہ دیر کرنا ان کو (پہلی) نماز جب کہ آئے وقت اس کا (دوسری) جنازہ جب کہ تیار ہو (تیسری) عورت بن خاوند کے جبکہ پائے تو اس کیلئے کفو۔

(صلوة الرسول ص ۱۴)

اس حدیث کو غیر مقلدین نے دلیل بنایا ہے کہ نماز کا جب وقت آجائے اسی وقت نماز ادا کی جائے دیر نہ کی جائے۔

اس دلیل کا جواب:

حدیث شریف میں تین چیزوں کا ذکر ہے، جنازہ جب حاضر ہو تو اس میں دیر نہ کرو۔ کیا کوئی غیر مقلد اس کے ظاہر پر عمل کرتا ہے۔ کہ ایک شخص فوت ہوا، ادھر قبر تیار ہوئی اور بغیر دیر کے اسے دفن کر دیا؟ نہیں اس پر کوئی عمل نہیں کر رہا، ابھی چند دن ہوئے علامہ عبدالقادر روپڑی فوت ہوئے، ان کی وفات

کے بعد تقریباً سولہ یا اٹھارہ گھنٹے بعد جنازہ ہوا۔

اسی طرح حدیث شریف میں ہے کہ لڑکی غیر شادی شدہ کو جب کفو مل جائے تو اس کی شادی میں دیر نہ کی جائے۔

کیا ایسا کوئی غیر مقلد ہے کہ اپنی بیٹی کی شادی بالغ ہوتے ہوئے کفو ملنے پر کر دیتا ہے کفو تو تقریباً ہر خاندان کو مل ہی جاتی ہے جب ان دونوں پر عمل نہیں تو نماز کے وقت شروع پر نماز ادا کرنے پر زور کیوں؟

بات واضح ہے کہ حدیث پاک کا مطلب یہ ہے کہ نماز کا مستحب وقت ہو جائے تو نماز پڑھنے میں اتنی دیر نہ کر دو کہ مکروہ وقت آجائے۔ جب کوئی شخص فوت ہو جائے جنازہ پڑھنے والے چالیس آدمی آجائیں تو جنازہ ادا کرنے میں بہت دیر نہ کرو کہ جسم سے بدبو آنے لگ جائے یا میت کو برف خانہ میں رکھنا پڑھے لڑکی جوان ہو جائے، کفو مل جائے تو بہت دیر نہ کرو جہاں فتنہ کا خوف ہو۔

یہ مطلب جو راقم نے بیان کیا ہے، یہی تقریباً منصف مزاج علماء کرام کرتے ہیں۔ اور اسی پر عمل بھی ہو رہا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے تین چیزوں کا ذکر کیا ہے ان میں دو پر غیر مقلدین بھی اسی طرح عمل کرتے ہیں جس طرح میں نے بیان کیا ایک پر وہ جلدی جلدی عمل کر کے بظاہر اہل حدیث بننے کی ناکام کوشش کرتے ہیں لیکن درحقیقت وہ وقت مستحب اور مطلق وقت فرق کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے یا سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔

غیر مقلدین کا حدیث پر عمل یا حدیث سے انحراف:

غیر مقلدین نے اوقات کے متعلق جو احادیث بیان کی ہیں (ان کا جواب دیا چکا ہے) ان سے انہوں نے نتیجہ نکالتے ہوئے بظاہر نصیحت ان الفاظ سے کی ہے (جو درحقیقت فضیلت ہے) **بہائیو اور بہنو!** غور کرو رسول اللہ ﷺ نے اپنی ساری زندگی میں پانچوں نمازیں اول وقت پڑھیں۔ (صلوۃ الرسول ص ۱۴۶)

یہ سراسر غلط ہے، گرمیوں میں دیر سے ظہر کی نماز پڑھنے کا ذکر احادیث مبارکہ سے ثابت کیا

جا چکا ہے۔ اور فجر کی نماز نمازیوں کے زیادہ ہونے کی غرض سے روشنی میں ادا کرنے کی فضیلت کو بھی ذکر کیا چکا ہے۔

آئیے اب عشاء کی نماز کی تاخیر کا مستحب ہونا احادیث مبارکہ سے دیکھیں۔ پھر اندازہ کریں کہ غیر مقلدین کی یہ نصیحت واقعی نصیحت ہے یا فضیحت ہے۔ کیا حدیث پر عمل ہے یا حدیث سے انحراف ہے۔

”عن ابی سعید قال انتظرنا رسول الله ﷺ لیلۃ لصلوة العشاء حتی ذهب نحو من شطر اللیل قال فجاء فصلی بنا ثم قال خذوا مقاعدکم فان الناس قد اخذوا مصاجعهم وانکم لم تزالوا فی صلوة منذ انتظرتموها ولو لا ضعف الضعیف وسقم السقیم وحاجة ذی الحاجة لأخرت هذه الصلوة الی شطر اللیل“

مسلم ج ۱ ص ۵۰ باب وقت صلوة العشاء، ابوداؤد ج ۱ ص ۶۱ باب وقت صلوة العشاء الاخرة، مسند احمد ج ۳ ص ۵

حضرت ابوسعید (خدری) رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ہم ایک رات عشاء کی نماز کیلئے رسول اللہ ﷺ کی انتظار کرتے رہے۔ یہاں تک کہ رات کا تقریباً نصف حصہ گزر گیا تو آپ تشریف لائے، پھر ہمیں نماز پڑھائی۔ پھر آپ نے فرمایا اپنی اپنی جگہ پر قائم رہو (اس کے بعد آپ نے ہمیں خطاب کرتے ہوئے فرمایا) بے شک لوگ اپنی اپنی آرامگاہ میں سو گئے ہیں بیشک تم جتنی دیر نماز کی انتظار میں رہے ہو نماز میں ہی تھے۔ اگر بوڑھوں کے بڑھاپے، بیماروں کی بیماری، صاحب حاجت کی حاجت کا خیال نہ ہوتا تو میں اس نماز کو نصف رات تک مؤخر کر دیتا۔

اس حدیث پاک سے واضح ہوا کہ نماز کی انتظار میں بیٹھنا، دیر کرنا، نہ سونا، نماز پڑھنا ہے۔ یعنی نماز کے پڑھنے کا ثواب حاصل ہوتا رہے گا۔

نبی کریم ﷺ نے عشاء کی نماز کو دیر سے ادا کرنے کو پسند فرمایا صرف بوڑھے، بیماروں، نہ رتھندوں کا لحاظ کرتے ہوئے آدھی رات تک دیر نہیں کی۔ لیکن رات کے تہائی حصہ تک دیر کرنا مستحب ہے۔

”عن ابی ہریرۃ قال قال رسول الله ﷺ لو لا ان اشق علی امتی لأمرتهم ان

یؤخروا العشاء الی ثلث اللیل او نصفه“

مسند احمد ج ۲ ص ۲۵۰، ترمذی ج ۱ ص ۳۳ باب ما جاء فی تأخیر العشاء الاخرة، ابن ماجہ ج ۱ ص ۵۰ باب وقت العشاء

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر میں اپنی امت کے لئے مشکل نہ سمجھتا تو حکم دیتا کہ عشاء کی نماز کورات کے تہائی حصہ تک مؤخر کر دو۔

اس حدیث پاک میں شارحین کا اتفاق ہے کہ نبی کریم ﷺ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ اگر میں امت کی مشکل کو خیال میں نہ لاتا تو عشاء کی نماز کورات کے تہائی حصہ تک مؤخر کرنے کو واجب کر دیتا۔ یعنی وجوبی حکم دیتا نبی کریم ﷺ نے اگرچہ عشاء کی نماز کو دیر سے پڑھنا واجب تو نہیں قرار دیا، لیکن رات کے تہائی حصہ تک دیر کرنا پسند فرمایا۔ مستحب یہی ہے کہ عشاء کی نماز دیر سے پڑھی جائے۔

جب عشاء کی نماز کو دیر سے پڑھنا رسول اللہ ﷺ نے پسند فرمایا تو جلدی نماز پڑھنے پر زور دینا یقیناً حدیث پاک سے انحراف ہے خدا غور کریں حدیث پر عمل کرنے سے انحراف کرنے پر کوئی شخص اہل حدیث ہوتا ہے یا کہ عمل کرنے سے؟ حقیقت یہی ہے کہ ہمارا نام تو حنفی ہے لیکن ہم حقیقی معنی میں اہل حدیث ہیں۔ غیر مقلدوں نے اپنا نام ہی صرف اہل حدیث رکھا ہوا ہے، ورنہ وہ اہل حدیث کہلانے کے حقدار نہیں۔

ابھی تک نمازوں کے اوقات کی جو تفصیل بیان کی ہے اسی سے واضح ہو گیا کہ امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا مذہب احادیث کے مطابق ہے جس میں تمام احادیث میں تطابق پایا جاتا ہے۔ امام اعظم رحمہ اللہ بھی نماز کو اول وقت میں ادا کرنے کے قائل ہیں لیکن اول وقت سے وقت مستحب کی اولیت مراد ہے، نہ کہ کل وقت کی اولیت۔

اب امام اعظم کے مذہب اعظم کو دیکھئے اور آپ کے اعظم دلائل کو دیکھنے کے بعد تفسیر قرطبی اور تفسیر کبیر میں اول وقت کی افضلیت کی اسحاث کو دیکھیں تو انشاء اللہ امام رحمہ اللہ کا مذہب ان دلائل کے مطابق آپ کو نظر آئے گا کیونکہ آپ بھی وقت مستحب کی اولیت کے قائل ہیں۔

☆ "عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ ان رسول اللہ ﷺ قال انما مثل المہجر الی الصلوۃ کمثل الذی یہدی البدنۃ ثم الذی علی اثرہ کالذی یہدی البقرۃ ثم الذی علی اثرہ کالذی یہدی الکبش ثم الذی علی اثرہ کالذی یہدی الدجاجة ثم الذی علی اثرہ کالذی یہدی البیضة"

(نسائی)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص نماز (جمعہ) میں جلدی جائے وہ ایسے ہے جیسے اللہ تعالیٰ کی راہ میں اونٹ قربان کر دے اور اس کے بعد جانے والا ایسا ہے جیسے وہ اللہ کی راہ میں گائے قربان کر دے اور اس کے بعد جانے والا ایسے ہے جیسا کہ اللہ کی راہ میں بکری قربان کر دے اور اس کے بعد جانے والا ایسا ہے جیسے اللہ کی راہ میں کوئی مرغی ذبح کر دے (یعنی کسی فقیر کو مرغی ذبح کر کے دے دے)۔ اور اس کے بعد جانے والا ایسا ہے جیسے اللہ کی راہ میں (کسی غریب کو) انڈا دے دے۔

☆ "عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ ﷺ ان احدکم لیصلی الصلوۃ لوقتہا وقد ترک من الوقت الاول ما ہو خیر له من اہلہ وما لہ" (دار قطنی)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک تم میں سے کوئی شخص نماز وقت میں ادا کرتا ہے لیکن اول وقت جو اس کے مال و عیال سے بہتر ہے اسے چھوڑ دیتا ہے۔

☆ "عن ابن عمر قال قال رسول اللہ ﷺ خیر الاعمال الصلوۃ فی اول وقتہا" (دار قطنی)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اعمال میں بہتر عمل نماز اول وقت میں ادا کرنا ہے۔

☆ "قوله علیہ السلام فی خطبۃ لہ" وبادروا بالاعمال الصالحۃ قبل ان تشتغلوا

نبی کریم ﷺ نے دوران خطبہ ارشاد فرمایا نیک اعمال کی طرف جلدی کرو (دنیاوی کاموں میں) مشغول ہونے سے پہلے۔

(ماخوذ از قرطبی و کبیر)

بفضلہ تعالیٰ امام اعظم رحمہ اللہ ان تمام احادیث پر عمل ہے آخری حدیث سے جلدی کی وضاحت بھی سمجھ آ رہی ہے کہ اور کاموں میں مشغول ہو کر کہیں نیک کاموں کو فوت نہ کر دو۔

فائدہ: "وَلِكُلِّ وَجْهَةٌ" سے ایک فائدہ یہ بھی حاصل ہوا کہ:

"ولکل واحد من الرسل واصحاب الشرائع جهة قبلۃ فقبلۃ المقربين العرش، وقبلۃ الروحانيين الكرسي وقبلۃ الكروبيين البيت المعمور وقبلۃ الانبياء الذين قبلک بیت المقدس وقبلتک الکعبۃ"

تمام رسولوں اور اصحاب شرايع کا قبلہ ہے۔ مقررین کا قبلہ عرش، روحانیین کا قبلہ کرسی، کروہیین کا قبلہ البیت المعمور، آپ سے پہلے انبیاء کرام کا قبلہ بیت المقدس اور آپ کا قبلہ کعبہ ہے۔ (کبیر)

”فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ“ ای فالزموا معاشر المسلمین قبلتکم فانکم علی خیرات من ذلک فی الدنیا والآخرة اما فی الدنیا فلشرفکم بقبلة ابراهیم واما فی الآخرة فللثواب العظیم الذی تاخذونه علی انقیادکم لا و امره“

یعنی ”فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ“ کا ایک مفہوم یہ ہے کہ اے مسلمانوں کی جماعت اپنے قبلہ کو لازم پکڑو کیونکہ یہ تمہارے لئے دنیا میں بہتر اور آخرت میں بھی۔ دنیا میں تمہارے لئے خیر اس لئے ہے کہ یہ ابراہیم علیہ السلام کا قبلہ ہے جب تم بھی اس کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرو گے تو تمہیں ابراہیم علیہ السلام کے قبلہ سے شرف حاصل ہوگا۔ آخرت میں تمہارے لئے خیر اس لئے ہے کہ تمہیں اللہ تعالیٰ کا حکم ماننے کی وجہ سے عظیم ثواب حاصل ہوگا۔

(کبیر)



وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ
الْحَرَامِ وَإِنَّهُ لَلْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ
☆ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ
الْحَرَامِ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ لِنَلَّا يَكُونَ
لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ إِلَّا الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ
وَاحْشَوْنِي وَلَا تَمْنَعُكُمْ نِعْمَتِي عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ﴿١﴾

(۱) ”اور جہاں سے آؤ اپنا منہ مسجد حرام کی طرف کرو اور وہ ضرور تمہارے رب کی طرف سے حق ہے اور اللہ تمہارے کاموں سے غافل نہیں۔ اور محبوب تم جہاں سے آؤ اپنا منہ مسجد حرام کی طرف کرو اور اے مسلمانو تم جہاں کہیں ہو اپنا منہ اسی کی طرف کرو کہ لوگوں کو تم پر کوئی حجت نہ رہے مگر جو ان میں نا انصافی کریں تو ان سے نہ ڈرو اور مجھ سے ڈرو اور یہ اس لئے ہے کہ میں اپنی نعمت تم پر پوری کروں اور کسی طرح تم ہدایت پاؤ۔“

(۲) ”اور جہاں سے نکلو تو پھیر لو اپنا منہ مسجد حرام کی طرف اور بیشک یہ حق ہے تمہارے رب کی طرف سے اور نہیں اللہ غافل اس سے جو تم عمل کرتے ہو۔ اور جہاں سے تم نکلو تو پھیر لو اپنا منہ مسجد حرام کی طرف اور جہاں تم ہو پھیر لو اپنے مونہوں کو اسی کی طرف، تاکہ نہ ہو لوگوں کو تم پر حجت سوائے ان لوگوں کے جو ظالم ہیں ان میں سے تو تم نہ ڈرو ان سے اور ڈرو مجھ سے اور تاکہ میں پوری کروں اپنی نعمتیں تم پر اور تاکہ تم ہدایت پر قائم رہو۔“

تکرار میں فوائد: بظاہر آیات میں تکرار نظر آتا ہے کہ تین مرتبہ منہ کو پھیرنے کا حکم دینے کا کیا مقصد ہے؟ لیکن جب غور کیا جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ حقیقت میں تکرار ہے ہی نہیں بلکہ علیحدہ علیحدہ مطالب ہیں۔

پہلا فائدہ : نماز ادا کرنے والا کبھی مسجد حرام میں ہوتا ہے اور کبھی مسجد حرام سے باہر لیکن مکہ مکرمہ میں ہوتا ہے اور کبھی مکہ مکرمہ سے باہر دور و دراز علاقہ میں ہوتا ہے۔ مسجد حرام میں نماز ادا کرنے والے کو کعبہ کی طرف منہ کرنے کا حکم پہلی آیت میں ﴿وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّواْ وُجُوْهُكُمْ شَرْقًا﴾ سے دیا۔ اور دوسری آیت میں مسجد حرام سے باہر لیکن مکہ مکرمہ میں ساکن حضرات کو حکم دیا۔ دوسری آیت سے مراد زیر بحث دو آیتوں سے پہلی آیت ہے۔ اور تیسری آیت میں مکہ مکرمہ سے باہر والوں کو مسجد حرام کی طرف منہ کرنے کا حکم دیا۔ درحقیقت یہ وہم ہو سکتا تھا کہ شاید قریب والوں کے لئے یہ حکم ہو بعید والوں کے لئے نہ ہو تو تمام قریب و بعید والوں کے لئے حکم بیان کر دیا گیا۔ البتہ وضاحت پہلے کر دی گئی کہ کعبہ شریف سامنے ہو تو کیا حکم ہے سامنے نہ ہو تو کیا حکم ہے۔

دوسرا فائدہ : تین مرتبہ ذکر کر کے علیحدہ علیحدہ مقاصد بیان کئے گئے۔ پہلی مرتبہ بیان کرنے کے بعد فرمایا:

﴿وَإِنَّ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ لَيَعْلَمُونَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ﴾

”بیشک اہل کتاب جانتے ہیں کہ یہ حق ہے ان کے رب کی طرف سے“

یعنی اہل کتاب توراۃ و انجیل میں مشاہدہ کرنے کی وجہ سے جانتے ہیں کہ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی نبوت برحق ہے اور تحویل قبلہ برحق ہے

دوسری مرتبہ حکم دینے کے بعد فرمایا ﴿وَإِنَّهُ لَلْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ﴾ ”بیشک یہ حق ہے تمہارے رب کی طرف سے“ یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنی شہادت کا ذکر فرمایا کہ میں اس پر شہادت دیتا ہوں کہ میرے محبوب کی نبوت اور تحویل قبلہ حق امور ہیں۔

تیسری مرتبہ حکم دینے کے بعد فرمایا ﴿لِّنَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ﴾ ”تا کہ لوگوں کی تم پر حجت نہ ہو“ فلما اختلفت هذه الفوائد حسنت اعادتها ”جب تینوں مقاموں میں مختلف فوائد پائے گئے ہیں تو ان کا اعادہ اچھا ہے اسی وجہ سے علیحدہ علیحدہ ذکر کیا۔

تیسرا فائدہ : جب پہلی آیت میں ذکر فرمایا ﴿فَلَنُؤَلِّسَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضَاهَا﴾ ”ہم ضرور بر ضرور پھیر دیں گے آپ کو اس قبلہ کی طرف جس کو آپ پسند کرتے ہیں“ تو اس سے وہم ہو سکتا

تھا کہ شاید یہ حکم صرف نبی کریم ﷺ کو ہو اور لوگوں کو نہ ہو تو ﴿فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ﴾ ارشاد فرما کر ہر جگہ رہنے والوں کو کعبہ کی طرف متوجہ ہونے کا حکم دیا تو دوسری آیت میں ﴿وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَإِنَّهُ لَلْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ﴾ کہہ کر حکم کو عام فرما دیا اور ساتھ ہی بتا دیا کہ یہ تمہارے رب کی طرف سے حق ہے۔ اور تیسری آیت میں بیان فرما دیا کہ تم کعبہ کو قبلہ بناؤ۔ بیت المقدس کا قبلہ ہونا منسوخ ہو چکا ہے اب یہ ہمیشہ کیلئے تمہارا قبلہ رہے گا، منسوخ نہیں ہوگا۔

”والحاصل ان الآیة السالفة امر بالدوام فی جمیع الامکنة والثانیة امر بالدوام فی جمیع الازمنة والامکنة والثالثة امر بالدوام فی جمیع الازمنة واشعار بان هذا لا یصیر منسوخا البتة“

حاصل کلام یہ ہے کہ پہلی آیت میں حکم دیا گیا کہ تم جہاں کہیں بھی ہو تمہارا قبلہ کعبہ ہے اور دوسری آیت میں حکم دیا گیا کہ تم جس وقت نماز ادا کرو کہیں بھی ہو نماز میں منہ کعبہ کی طرف ہی کرنا۔ تیسری آیت میں یہ حکم دیا گیا کہ یہ حکم تمہارے لئے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہے یہ کبھی منسوخ نہیں ہوگا۔

چوتھا فائدہ : پہلی آیت میں نبی کریم ﷺ کے اکرام کا ذکر فرمایا کہ کعبہ کو قبلہ نبی کریم ﷺ کی تمنا کے مطابق بنایا جا رہا ہے اور ساتھ ہی آپ کی امت کو بھی حکم دے دیا کہ یہ وہ قبلہ ہے جو براہیم علیہ السلام کا بھی تھا اور تمہارے نبی کریم ﷺ کا مطلوب بھی ہے۔

دوسری آیت کریمہ میں ذکر فرمایا ”وَلِكُلِّ وَجْهَةٌ“ یعنی ہر صاحب دعوت اور ہر صاحب ملت کا قبلہ ہے جس کی طرف وہ متوجہ ہوتے ہیں ”فتوجهوا انتم الی اشرف الجهات الی علیہم السلام“ تعالیٰ انہا حق ”تو تم تمام جہات میں سے اشرف جہت کی طرف متوجہ ہو اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ وہی حق ہے۔ اور تیسری آیت میں قبلہ کے معاملہ میں یہودی کی طرف سے مخالفت کا رد کرتے ہوئے فرمایا کہ تم مسجد حرام کی طرف منہ کر لو تا کہ ان کی حجت بازیاں ختم ہو جائیں۔

پانچواں فائدہ : اسلام میں منسوخ ہونے والا سب سے پہلا حکم قبلہ کا ہی تھا اس لئے تکرار میں تاکید پائی گئی اور بات کو پختہ کیا گیا۔ اور شبہات کو زائل کیا گیا اور دلائل واضح طور پر بیان کئے گئے۔

(ماخوذ از کبیر)

وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ : اور اللہ تعالیٰ نہیں ہے غافل اس سے جو تم عمل

کرتے ہو۔ یعنی وہ لوگ جو عناد کی وجہ سے آپ کو پہچاننے کے باوجود حق کو چھپاتے ہیں اور لوگوں کے دلوں میں شبہات ڈالتے ہیں اور کہتے ہیں ”مَا وَلَهُمْ عَنْ قِبَلَتِهِمُ الَّذِي كَانُوا عَلَيْهَا“ کس چیز نے ان کو قبلہ سے پھیر دیا جس پر وہ تھے اور یہ کہتے ہیں کہ یہ نبی اپنے آبائی شہر اور آبائی دین کا مشتاق ہو گیا (معاذ اللہ) ان کو خطاب کرتے ہوئے رب تعالیٰ نے فرمایا کہ اللہ تمہارے اعمال سے غافل نہیں۔ (ازکیر)

تنبیہ: علامہ آلوسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ایک قراءت میں ”یعلمون“ (بالیاء) ہے اس میں کفار کو وعید ہے۔ اور ایک قراءت میں ”تعلمون“ ہے اس میں مؤمنین کے لئے وعدہ ہے اس صورت میں معنی یہ ہوگا ”فيجازيكم بذلك احسن الجزاء“ وہ تمہیں اچھی جزاء دے گا کیونکہ وہ تمہارے اچھے اعمال سے بے خبر نہیں۔ (روح المعانی)

خیال رہے کہ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ روح المعانی کے اسی قول کے مطابق ہے کیونکہ آپ نے ترجمہ کیا۔ ”اللہ تمہارے کاموں سے غافل نہیں“ اگر کفار کے لئے وعید ہوتی تو آپ کا ترجمہ ہوتا ”اللہ تمہارے کوتلوں سے غافل نہیں“۔

لئلا يَكُونُ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ . ”تا کہ نہ ہو لوگوں کو تم پر حجت“ پہلے یہ دیکھنا ہے کہ ان کی جتیں کیا تھیں جو تحویل قبلہ کے بعد ختم ہو گئیں، آہستہ آہستہ خود ہی ان کے منہ بند ہوتے چلے گئے۔ ان کی جتیں مختلف قسم کی تھیں:

(۱) ”احدها ان اليهود قالوا تخالفنا في ديننا وتبغ قبلتنا“ ان میں سے ایک یہ تھی کہ یہود نے کہا یہ شخص ہمارے دین کی مخالفت کرتا ہے اور ہمارے قبلہ کی تابعداری کرتا ہے۔

(۲) ”وثانيها قالوا الم يدر محمد اين يتوجه في صلاته حتى هديناه“ دوسری حجت یہود کی یہ تھی کہ وہ کہتے تھے کیا ایسا نہیں کہ محمد کو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ نماز میں کس طرف منہ کرے یہاں تک کہ ہم نے اسے یہ سکھایا ہے۔

(۳) ”ان العرب قالوا انه كان يقول انا على دين ابراهيم والآن ترك التوجه الى الكعبة ومن ترك التوجه الى الكعبة فقد ترك دين ابراهيم عليه السلام“

تیسری حجت ان کی (یعنی مشرکین عرب کی) یہ تھی کہ وہ یہ کہتے تھے کہ یہ شخص کہتا تھا کہ میں

ابراہیم علیہ السلام کے دین پر ہوں لیکن اب مدینہ میں جا کر اس نے کعبہ کی طرف نماز میں منہ کرنا چھوڑ دیا ہے بلکہ بیت المقدس کو قبلہ بنا لیا ہے جو شخص کعبہ کی طرف متوجہ ہونے کو ترک کر دے اس نے ابراہیم علیہ السلام کے دین کو بھی ترک کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے قبلہ کو تبدیل فرما کر ان کی تمام جنتوں کو ختم کر دیا ان کے منہ بند کر دیئے۔

إِلَّا الَّذِينَ ظَلَمُوا : ہاں تحویل قبلہ کے بعد بھی ظالموں کی جنتیں قائم رہیں گی۔ یہی وجہ تھی کہ تحویل قبلہ کے بعد مشرکین کہنے لگے ”ان محمدا (علیہ الصلوٰۃ والسلام) عاد الی دیننا فی الکعبۃ وسیعود الی دیننا بالکلیۃ“ بیشک محمد ﷺ کعبہ کو قبلہ بنانے کے مسئلہ میں تو ہمارے دین کی طرف لوٹ آئے ہیں عنقریب مکمل طور پر ہمارے دین کی طرف لوٹ آئیں گے۔ ان کا یہ کہنا ان کی جہالت اور ان کے کفر پر دلالت کر رہا ہے اور ان کا یہ کہنا اپنے آپ پر ظلم کرنا تھا رب تعالیٰ نے فرمایا: **إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ** ﴿بیشک شرک ظلم عظیم ہے۔ اسی طرح یہودیوں میں سے بے وقوف تحویل قبلہ کے بعد بھی کہتے رہے﴾ **مَا وَلَهُمْ عَنْ قِبَلَتِهِمُ الَّتِي كَانُوا عَلَيْهَا** ﴿ان کو کس نے پھیر دیا ہے اس قبلہ سے جس پر تھے۔

اعتراض : ظالموں کے شبہات کو حجت نہیں کہا جاتا حجت تو دلیل کو کہا جاتا ہے تو ظالموں کے شبہات کو ﴿لَنَلَا يَكُونُ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ﴾ سے استثناء کرنا کیسے صحیح ہے؟
پہلا جواب : حجت کبھی صحیح ہوتی ہے اور کبھی باطل، جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا:
﴿حُجَّتُهُمْ دَاحِضَةٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ﴾ (الشوری ۱۶)

”ان کی دلیل محض بے ثبات (باطل) ہے ان کے رب کے ہاں“

ان کی پہلی جنتیں بھی باطل تھیں اور تحویل قبلہ کے بعد بھی باطل ہی رہیں اس لئے استثناء صحیح ہے۔

دوسرا جواب : جب یہود اور مشرکین نے اپنے شبہات کا نام حجت (دلیل) رکھا تو رب تعالیٰ نے بھی ان کی بیوقوفی کو ظاہر کرنے کے لئے حجت ہی ذکر کر دیا کہ علم و عقل والے لوگ ذرا ان کے دلائل کو دیکھیں تو خود ہی سمجھ جائیں گے کہ وہ کتنے ہی بے وقوف اور جاہل لوگ تھے۔

تیسرا جواب : ”اراد بالحجة المحاجة والمجادلة“ اس مقام پر حجت کا معنی

جھگڑا کرنا، کج روی، یعنی مطلب یہ ہوا کہ تم جہاں بھی ہو مسجد حرام کی طرف منہ کر لو تا کہ لوگوں کی حجت بازیاں اور ان کے مجادلے اور مباحثے ختم ہو جائیں ہاں البتہ ضد اور عناد رکھنے والے پھر حجت بازیاں کرتے ہی رہیں گے۔ (ازکیہ)

سبحان اللہ کیا خوب مسئلہ ثابت ہو گیا کہ بلا وجہ حجت بازی، بلا وجہ مجادلہ، بلا وجہ مباحثہ، کج روی کبھی شان صحابہ کی تنقیص، کبھی انبیاء کرام کی شان میں گھٹیا الفاظ کبھی اولیاء کرام پر مشرکین کے حق میں نازل ہونے والی آیات کو چسپاں کرنا، بتوں والی آیات انبیاء کرام اور اولیاء کرام پر چسپاں کرنا، بیوقوفی نادانی ہے اپنے منہ سے اپنے احمق ہونے کا اعلان ہے۔ طلباء کرام اس قسم کے احمقوں سے ہوشیار رہیں کہیں وہ گمراہ تمہیں بھی گمراہ نہ کر دیں۔

فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِي : تو ان سے نہ ڈرو اور مجھ سے ہی ڈرو۔

یعنی یہود و نصاریٰ اور مشرکین کی طعنہ بازی، حجت بازی اور مجادلہ سے اے مومنو نہ ڈرو، وہ تمہیں قبلہ کے معاملہ میں طعنہ دیں یا تمہارے دین میں کسی قسم کا اعتراض کریں تو ان سے نہ ڈرو کیونکہ وہ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ ﴿وَاخْشَوْنِي﴾ اور مجھ سے ڈرو، یعنی جن احکام کو میں نے تم پر لازم کیا ہے اور جو امور تم پر فرض ہیں اگر تم نے ان پر عمل نہ کیا، حکم عدولی کی تو میں تمہیں عذاب دوں گا لہذا تم میرے عذاب سے ڈرو۔

اس آیت سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ انسان پر واجب ہے کہ وہ اپنے افعال یا ترک افعال میں صرف رب تعالیٰ کی رضا کو دیکھے اور رب تعالیٰ کے عذاب سے ڈرتا رہے۔

”وَان يَعْلَمُ اَنَّهُ لَيْسَ فِي يَدِ الْخَلْقِ شَيْءٌ اِلَّا بِاِذْنِهِ وَانْ لَا يَكُنْ مَشْغُولًا

الْقَلْبُ بِهِمْ وَلَا مَلَفَتْ الْخَاطِرُ إِلَيْهِمْ“

”اور انسان کو یہ علم حاصل ہونا چاہئے کہ مخلوق کے ہاتھ میں کچھ نہیں رب کو چھوڑ کر مخلوق

کی طرف توجہ کرنا اور رب تعالیٰ سے دور ہو کر مخلوق سے دل لگانا منع ہے۔ (ازکیہ)

ہاں البتہ اللہ تعالیٰ کے مقبول بندوں سے محبت کہ یہ رب تعالیٰ کی مخلوق اور رب تعالیٰ کے عبادت گزار ہیں لیکن اسکے مقبول بندے ہیں ان سے محبت درحقیقت رب تعالیٰ سے محبت ہے یہ عقیدہ اور یہ عمل عین ایمان ہے۔

خشیت اور خوف میں فرق:

”الخشية اصلها طمانينة في القلب تبعث على التوقي“

خشیت کا اصل معنی دل میں اطمینان ہونا جس کی وجہ سے انسان برائیوں سے بچ سکے
”والخوف فزع القلب تخف له الاعضاء ولخفة الاعضاء سمي خوفا“
دل میں گھبراہٹ کا طاری ہونا جس کی وجہ سے اعضا پر خفت طاری ہونا خوف ہے۔

(از قرطبی)

مجازی طور پر خشیت کبھی خوف کے معنی میں اور خوف خشیت کے معنی میں استعمال ہوتے رہتے ہیں۔

وَلَا تَمْنَعْنِيْ عَلَيْكُمْ : ”تا کہ میں پوری کروں اپنی نعمتیں تم پر“۔

لام کے تعلق میں ایک احتمال یہ ہے کہ اس کا تعلق ﴿لِّنَّالَا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ﴾ سے ہو۔
اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ تم جہاں کہیں ہو نماز میں منہ قبلہ کی طرف کرو تا کہ لوگوں کی تم پر کوئی
حجت نہ رہے اور میں اپنی نعمتیں تم پر مکمل کروں۔ یعنی کعبہ شریف کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرنے کی دو
حکمتیں بیان فرمادیں ایک یہ کہ لوگوں کی حجت بازیاں ختم ہو جائیں اور دوسری یہ کہ ان پر نعمتوں کی تکمیل
ہو جائے۔

لام کے تعلق میں دوسرا احتمال یہ ہے کہ اس کا تعلق محذوف سے ہو معنوی طور پر اسے یوں بیان کیا جائے گا
”ولا تمام النعمة عليكم وارادنى اهتداء كم امر تكلم بذلك“ میں نے تم پر اپنی نعمتیں
مکمل کرنے کے لئے اور تمہیں ہدایت دینے کے لئے کعبہ شریف کی طرف منہ کرنے کا حکم دیا۔

تیسرا احتمال اس میں یہ ہے کہ اس کا عطف علتہ مقدرہ پر ہو تقدیر عبارت کی یہ ہو ﴿واخشونى﴾
لا وفقكم ولا تم نعمتى عليكم اور مجھ سے ڈرو کہ میں تمہیں توفیق دوں اور اپنی نعمتیں تم پر مکمل کروں۔

نعمت سے مراد کیا ہے؟

”عن معاذ قال قال رسول الله ﷺ تمام النعمة دخول الجنة والفوز

من النار رواه البخارى فى الادب المفرد والترمذى“

”حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے فرمایا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تمام نعمت جنت میں

داخل ہونا اور جہنم سے نجات حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کرنا ہے۔

☆ ”و عن علی رضی اللہ عنہ اتمام النعمة الموت علی الاسلام“

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں تمام نعمت اسلام پر موت کا آنا ہے۔ (از مظہری)

☆ ”قال سعید بن جبیر ولم تتم نعمة الله على عبد حتى يدخله الجنة“

حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی نعمت اس وقت تک بندے پر مکمل نہیں ہوگی جب تک اسے جنت میں داخل نہیں فرمائے گا۔

☆ ”واتمام النعمة الهداية الى القبلة“ اتمام نعمت کا ایک معنی قبلہ کی ہدایت بھی ہے۔ (از قرطبی)

☆ تمام ہی نعمتیں مراد ہیں خواہ وہ وہی ہوں یا کسی۔ وہی نعمتیں جیسے صحت بدن اور سلامتی اعضاء وغیرہ اور کسی نعمتیں جیسے ایمان اور اعمال صالحہ اور امر کو تسلیم کرنا اور نواہی سے اجتناب کرنا یہ تمام نعمتیں انسان کے لئے سعادت دارین کا ذریعہ ہے۔ (شیخ زادہ) راقم نے اسی وجہ سے ترجمہ ”نعمتیں“ کیا ہے۔

اعتراض : اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کے وصال سے چند دن پہلے اس آیت کریمہ کو نازل فرمایا

﴿الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَاتَّمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي﴾

”آج میں نے تم کو مکمل کر دیا ہے تمہارے لئے تمہارے دین کو اور مکمل کر دیا ہے تم پر اپنی نعمتوں کو“

جواب : ”اجیب بان اتمام النعمة فی کل وقت بما یلیق به فتدبر“

ہر وقت ہر زمانہ میں جن نعمتوں کی بندوں کو ضرورت رہی اللہ تعالیٰ اپنی مہربانی سے ان کی تکمیل فرماتا رہا قرب وصال دین کی تکمیل فرما کر عظیم نعمت کی تکمیل فرمادی۔ (از روح المعانی)

وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ : ”تا کہ تم ہدایت پر قائم رہو“ جب اس سے آگے الفاظ ﴿لِلصِّرَاطِ

المستقیم﴾ ہوں تو مطلب ہوگا ”تا کہ تم سیدھی راہ پر قائم رہو“ کیونکہ صحابہ کرام پہلے ہی ہدایت پر

تھے اس لئے راقم نے ترجمہ کیا ”تا کہ تم ہدایت پر قائم رہو“ تاہم اعلیٰ حضرت نے ترجمہ کیا ہے ”اور کسی

طرح تم ہدایت پاؤ“۔ اس پر مدارک کی یہ عبارت شاہد ہے ﴿وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ﴾ ولکی تہتدوا

الی قبلۃ ابراہیم ”تا کہ ابراہیم علیہ السلام کے قبلہ کی ہدایت پا جاؤ۔

﴿ كَمَا أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولًا مِّنْكُمْ يَتْلُوا عَلَيْكُمْ آيَاتِنَا
وَيُزَكِّيكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُم مَّا لَمْ
تَكُونُوا تَعْلَمُونَ ﴾

(۱) ”جیسا ہم نے تم میں بھیجا ایک رسول تم میں سے کہ تم پر ہماری آیتیں تلاوت فرماتا ہے اور تمہیں پاک کرتا اور کتاب اور پختہ علم سکھاتا ہے اور تمہیں وہ تعلیم فرماتا ہے جس کا تمہیں علم نہ تھا۔“
(۲) ”جیسا ہم نے بھیجا تم میں رسول تم میں سے، تلاوت فرماتا ہے تم پر ہماری آیتیں اور تمہیں پاک کرتا ہے اور سکھاتا ہے تمہیں کتاب اور حکمت اور سکھاتا ہے تمہیں وہ جو تم نہیں جانتے تھے۔“

﴿ كَمَا أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولًا مِّنْكُمْ ﴾ : جیسا ہم نے بھیجا تم میں رسول تم میں سے
”کاف“ کا تعلق ماقبل سے ہے یا مابعد سے، جتنے احتمال ”کاف“ کے تعلق میں ہوں گے وہ تمام ہی
اس کے مطالب ہوں گے۔

(۱) ایک مطلب یہ ہے کہ اس کا تعلق ﴿ وَلَا تَمَّ نِعْمَتِي ﴾ سے ہو۔ مطلب یہ ہو کہ میں اپنی نعمتیں
دنیا میں تم پر پوری کروں کہ تمہیں شرافت حاصل ہو۔ اور آخرت میں تمہیں بہت بڑا ثواب عطاء کر کے
کامیابی سے سرفراز کروں ”کما اتممتها علیکم فی الدنیا بارسال الرسول“ جیسا کہ میں
نے تم پر دنیا میں رسول بھیج کر اپنی نعمتوں کی تکمیل کی۔

(۲) ابراہیم علیہ السلام نے دعاء کی ﴿ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ
آيَاتِكَ وَيُزَكِّيهِمْ ﴾ ”اے ہمارے رب مبعوث فرما ان میں رسول ان میں سے جو ان پر تلاوت
کرے تیری آیات اور ان کا تزکیہ کرے اور ساتھ یہ دعاء بھی کی ﴿ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةٌ مُّسْلِمَةٌ لَّكَ
وَإِنَّا مَنَاسِكُنَا ﴾ اور ہماری اولاد سے ایک گروہ کو اپنا مطیع بنا اور ہمیں دکھا عبادت کے طریقے۔

اب مطلب یہ ہوگا کہ ”میں تم پر شریعت کے احکام کے بیان سے اور دین کی تمہیں ہدایت دے
کر اپنی نعمتوں کی تکمیل کروں کہ ابراہیم علیہ السلام کی دعاء میں کامل طور پر قبولیت ہو جائے جیسا کہ میں
”تم میں اپنے رسول کو بھیج کر ان کی دعاء کو قبول کر چکا ہوں۔ گویا کہ اس آیت کریمہ میں ابراہیم علیہ السلام

کی دعاء کی قبولیت کو واضح طور پر بیان کر دیا گیا۔

(۳) اس کا تعلق ﴿وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا﴾ سے ہو جائے۔ اب مطلب یہ ہو گا کہ جس طرح ہم نے تم میں باکمال رسول کو مبعوث فرمایا اسی طرح تمہیں باکمال امت بنایا۔ جس طرح ہم نے تم میں بہت بڑی شان والے رسول کو بھیجا اسی طرح ہم نے تمہیں بہت شان والی امت بنایا اور جس طرح تم میں ہم نے بہت صفات والے، عظیم منصب والے رسول کو مبعوث فرمایا اسی طرح ہم نے تمہیں کامل صفات والی امت بنایا۔

(۴) یا اس کا تعلق مابعد سے ہو یعنی ﴿فَاذْكُرُونِي اَذْكُرْكُمْ﴾ سے اب اس صورت میں مطلب یہ ہو گا کہ تم کتاب کو نہیں جانتے تھے اور نہ ہی تم رسول کو جانتے تھے اور محمد ﷺ تم میں سے ہی ہیں جن کے پاس کوئی کتاب نہیں تھی۔ پھر انہوں نے تم پر وہ کتاب پیش کی جو ”اعجب الآیات“ (عجیب آیات والی) ہے وہ تم پر تمہاری زبان میں ہی تلاوت کرتے ہیں اور اس میں ان چیزوں کا ذکر ہے جن کا پہلی آسمانی کتابوں میں ذکر ہے اور اس کتاب میں پہلے انبیاء کرام کا ذکر موجود ہے اور رب تعالیٰ کی وحدانیت پر دلائل موجود ہیں اور قیامت کا ذکر اس میں ہے اور اخلاق شریفہ پر اس میں متنبہ کیا گیا ہے اور بے وقوفوں کے اخلاق سے اس میں منع کیا گیا ہے یہ تمام نبی کریم ﷺ کی صداقت پر دلائل ہیں۔ تو گویا کہ رب تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ جس طرح میں نے تمہیں یہ نعمتیں عطاء کی ہیں اور تمہارے لئے یہ دلائل قائم کئے ہیں تو تم مجھے شکر سے یاد کرو میں تمہیں اپنی رحمت اور ثواب سے یاد کروں گا۔ (ازکیر) **فِيكُمْ** : سے مراد عرب ہیں یعنی خطاب عرب حضرات کو ہے ”جس طرح ہم نے بھیجا تم میں رسول تم میں سے“

مِنْكُمْ : یعنی وہ رسول محمد ﷺ تم میں سے ہیں اس مقام میں ”رسولا“ مفعول صریحی کو ظرف سے پہلے ذکر کیا تا کہ جلدی فرح و سرور پر دلالت کرے اور ”رسول“ کی صفات کا ذکر تھا گویا کہ ان میں سے ہونا بھی ایک صفت تھی اس لحاظ پر بھی صفات کو اکٹھا ذکر کیا۔

يَتْلُو عَلَيْكُمْ آيَاتِنَا : ”تلاوت فرماتا ہے تم پر ہماری آیات“ یہ رسول اللہ ﷺ کی صفت بیان کی گئی ہے اس میں نبی کریم ﷺ کی نبوت کے ثبوت کی طرف اشارہ ہے:

”لَا تَلَاوَةُ الْأُمِّيِّ الْخَارِجَةِ عَنْ طَوْقِ الْبَشَرِ بِاعْتِبَارِ بِلَاغَتِهَا وَاشْتِمَالِهَا عَلَى الْأَخْبَارِ

بالمغیبات والمصالح التي ينتظم بها امر المعاد والمعاش اقوى دليل على نبوته

کیونکہ وہ نبی جو امی ہیں (جنہوں نے کسی انسان کو اپنا استاذ نہیں بنایا) ان کا ایسی آیات تلاوت کرنا جو بلاغت کے لحاظ سے انسانی طاقت سے خارج ہوں اور غیبی خبروں پر مشتمل ہوں، اور دنیا و آخرت کی مصلحتوں پر مشتمل ہوں یہ آپ کی نبوت پر قوی دلیل ہے۔ (روح المعانی)

قرآن پاک کی تلاوت کرنا نبی کریم ﷺ کا عظیم معجزہ ہے ”لانه معجزة باقية“ اس وجہ سے کہ آپ کا یہ معجزہ باقی رہنے والا معجزہ ہے۔ ”ولانه يتلى فيتأدى به العبادات“ کیونکہ قرآن پاک کی تلاوت سے عبادات ادا ہوتی ہیں۔ یعنی قرآن پاک کی تلاوت سے ہی نماز، زکوٰۃ، حج اور روزہ کی فرضیت کا پتہ چلتا ہے بلکہ ایمان بھی قرآن سے ہی حاصل ہوتا ہے ”ولانه يتلى فيستفاد منه جميع العلوم“ اور قرآن پاک کی تلاوت سے ہی تمام علوم حاصل ہوتے ہیں۔ کیونکہ علم صرف ہو یا نحو خواہ علم معانی ہو یا بیان ہو یا بدیع، خواہ علم کلام ہو یا تصوف، خواہ فقہ ہو یا اصول فقہ، خواہ علم لغت ہو یا ادب تمام علوم ہی قرآن پاک سے حاصل ہوئے ہیں۔ ان کو پڑھنے کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ قرآن پاک سمجھ میں آجائے۔ ”ولانه يتلى فيستفاد منه مجامع الاخلاق الحميدة“ قرآن پاک کی تلاوت سے ہی تمام کے تمام اخلاق حمیدہ حاصل ہوتے ہیں یعنی قرآن پاک نیک اعمال، اچھے اخلاق، بھائی چارہ، اخوت، مروت، عدل و احسان کا سبق دیتا ہے۔

”فكانه يحصل من تلاوته كل خيرات الدنيا والآخرة“

گویا کہ قرآن پاک کی تلاوت سے دنیا اور آخرت کی ہر قسم کی بھلائیاں حاصل ہوتی ہیں۔ (ازکیہ) **وَيُزَكِّكُمْ** : ”اور تمہارا تزکیہ فرماتے ہیں“ ای بطہرکم من الشرک“ یعنی وہ تمہیں شرک سے پاک کرتے ہیں تلاوت کے بعد تزکیہ کا ذکر کیا کیونکہ یہ بھی آپ کا معجزہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جسے توفیق دینے کا ارادہ فرماتا ہے کہ اسے ایمان کی توفیق حاصل ہو جائے اسے آپ کے ذریعے توفیق عطاء کرتا ہے گویا کہ ایک معجزہ کے بعد دوسرے معجزہ کا ذکر ہے۔ (ازروح المعانی)

اور مطلب یہ ہے ”انه عليه الصلوة والسلام يعلمهم ما اذا تمسكوا به صاروا ازكيا“ بیشک نبی کریم ﷺ تمہیں وہ تعلیم دیتے ہیں جس پر عمل کر کے تم پاکیزہ ہو جاتے ہو۔ یعنی آپ کی تعلیم کے ذریعے وہ لوگ شرک کی نجاست، گناہوں کی نحوست، بد اخلاقی کی آلودگی سے پاک ہو گئے۔ اور

مطلب یہ ہے:

”ويزكيكم بالثناء والمدح اى يعلم ما انتم عليه من محاسن الاخلاق فيصفاكم به“

کہ وہ مدح اور ثناء کے ذریعے تمہارا تزکیہ فرماتے ہیں یعنی تمہیں محاسن اخلاق سکھائے، جن پر عمل کرنے کی وجہ سے تم قابل تعریف ہوئے خود نبی کریم ﷺ نے بھی اپنے صحابہ کرام کی تعریف کی اور جہاں میں بھی وہ قابل تعریف ہوئے سبحان اللہ تعلیمات مصطفویہ کے اثرات تا قیامت جگمگاتے رہیں گے۔ اور مطلب یہ ہے ”ان التزكية عبارة عن التسمية“ یعنی تزکیہ کا معنی بڑھانا بھی آتا ہے اب مطلب یہ ہوگا کہ وہ تمہیں بڑھاتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿ اِذْ كُنْتُمْ قَلِيلًا فَكَثَّرَكُمْ ﴾ ”جب تم قلیل تھے تو اللہ تعالیٰ نے تمہیں کثیر کیا“۔ یعنی وہ رسول تمہیں حق پر جمع کرتے ہیں تمہیں ایک دوسرے کے ساتھ مل کر رہنے اور بھائی بھائی بن کر رہنے کی تعلیم دیتے ہیں جو تمہارے روز بروز بڑھنے کا ذریعہ ہے۔

”وهذه الوجوه غير متنافية فلعله تعالى يفعل بالمطيع كل ذلك“

اور یہ تمام وجوہ متنافی نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے مطیع لوگوں کو ان تمام نعمتوں سے نوازتا ہے۔

(از کبیر)

وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ : ”اور سکھاتا ہے تمہیں کتاب اور حکمت“

پہلے ﴿يَتْلُوا عَلَيْكُمْ آيَاتِنَا﴾ ذکر کیا ہے لیکن تکرار نہیں اس لئے اس میں آیات کی تلاوت کا ذکر ہے یعنی صرف آیات کا سنانا اور ﴿وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ﴾ میں اللہ کی کتاب کی تعلیم کا ذکر ہے ”والحكمة“ سے مراد ”العلم بسائر الشريعة التي يشتمل القرآن على تفصيلها“ تمام شرعی مسائل کا علم جن کی تفصیل پر قرآن پاک مشتمل ہے۔

اسی لئے امام شافعی رحمہ اللہ نے فرمایا

”الحكمة هي سنة الرسول ﷺ“ حکمت رسول اللہ ﷺ کی سنت کو کہا جاتا ہے۔ (از کبیر)

تعلیم کتاب اللہ اور اس میں پائے جانے والے اسرار ربانیہ اور کتاب اللہ میں حکمت الہیہ کو مؤخر ذکر کیا اور تزکیہ کا ذکر پہلے کیا اس لئے کہ شرک کی میل سے پاک ہونا، اور شک کی نجاست سے پاک ہونا پہلے ضروری ہے اس کے بعد ہی انسان کتاب اللہ کے احکام کی تابعداری کرتا ہے جو پاکیزگی کا سبب بنتا ہے ”وما قبل ذلك فالكفر حجاب“ لیکن اس سے پہلے کفر حجاب ہے جس کی وجہ سے

انسان کتاب اللہ کی اطاعت سے دور رہتا ہے لہذا وہ شرک کی نجاست میں مبتلا رہتا ہے۔

نکتہ : حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعاء میں تزکیہ کا ذکر بعد میں ہے اور تعلیم کا ذکر پہلے اسلئے

کہ تزکیہ کا مطلب یہ ہے کہ قوت عملیہ کے لحاظ سے تکمیل نفس اور قوت نظریہ کے لحاظ سے تکمیل تہذیب۔

• تزکیہ ہر لحاظ سے ایک عظیم نعمت ہے تزکیہ پہلے ہو تعلیم زیادہ اثر انداز ہو یا تعلیم کے بعد کامل طور

پر تزکیہ پایا جائے ویسے اسے علت غائیہ کی حیثیت بھی حاصل ہے جو تصور کے لحاظ سے پہلے ہوتی ہے اور

وجود کے لحاظ پر بعد میں اس لئے ایک مقام پر مقدم ذکر کر دیا اور دوسرے مقام پر مؤخر۔ (از روح المعانی)

وَيُعَلِّمُكُم مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ : ”اور سکھاتا ہے تمہیں جو تم نہیں جانتے تھے“

یعنی تمہیں ہر وہ چیز سکھاتے ہیں جو تم نہیں جانتے تھے اور وہ وحی کے بغیر حاصل بھی نہیں ہو سکتیں اس میں

اس مسئلہ پر تنبیہ پائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو اس زمانہ میں مبعوث فرمایا جسے ”فترۃ“

کا زمانہ کہا جاتا ہے یعنی رسولوں کی آمد منقطع تھی اور امتیں جہالت میں مبتلا تھیں مخلوق متحیر (حیران) تھی

اور دین کے معاملہ میں وہ بھٹکے ہوئے تھے۔ ”فبعث اللہ تعالیٰ محمداً بالحق حتی علمہم ما

احتاجوا الیہ فی دینہم وذلک من اعظم النعم“ تو اللہ تعالیٰ نے محمد ﷺ کو حق سے مبعوث

فرمایا یہاں تک کہ لوگ دین میں جن چیزوں کے محتاج تھے انکی آپ نے ان لوگوں کو تعلیم دی۔ نبی کریم

ﷺ کا تشریف لانا اور تعلیم دینا لوگوں کے لئے سب نعمتوں سے عظیم نعمت تھی۔ (از کبیر و روح المعانی)

فائدہ جلیلہ : ”تکرار الفعل يدل على ان هذا التعليم من جنس آخر ولعل

المراد به العلم اللدنی الماخوذ من بطون القرآن ومن مشکوة صدر النبی ﷺ الذی لا

سبیل الی درکہ الا الانعکاس“

یعنی فعل دو مرتبہ (وَيُعَلِّمُكُم) ذکر کیا جو اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ پہلی تعلیم ظاہری ہے

اور دوسری تعلیم بنسبت پہلی کے علیحدہ ہے شاید اس سے مراد علم لدنی ہو جو قرآن پاک کے باطنی معانی

سے اور مصطفیٰ کریم ﷺ کے سینہ مبارک کے علوم سے حاصل ہوتا ہے۔ اس علم لدنی کا ادراک ظاہر سے

نہیں ہو سکتا صرف قرآن پاک کے انوار اور مصطفیٰ کریم ﷺ کے باطنی علوم کے انوار کی شعاؤں سے حاصل

ہو سکتا ہے ”واما درک درکہ فبعید عن القیاس“ اس علم کے ادراک کا تصور بھی قیاس سے بعید ہے۔

رئیس الصدیقین حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ”العجز عن درک

الادراک ادراک "ادراک کے درک سے عاجز ہونے کا نام بھی ادراک ہے۔ یعنی جب یہ معلوم ہو کہ علم لدنی کو عام طریقہ سے حاصل کرنا ممکن نہیں تو یہ بھی ایک علم ہے۔

☆ حضرت حظلہ بن ربیع اسیدی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں مجھے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ ملے تو آپ نے مجھ سے پوچھا اے حظلہ تمہارا کیا حال ہے؟ میں نے کہا "نافق حنظلہ" حظلہ تو منافق ہو گیا۔ آپ نے فرمایا سبحان اللہ یہ تم کیا کہہ رہے ہو:

"قلت نکون عند رسول اللہ ﷺ یذکرنا بالنار والجنة کانا رأی عین فاذا خرجنا من عند رسول اللہ ﷺ عافسنا الازواج والاولاد والضيعات نسینا کثیرا"

میں نے کہا ہم رسول اللہ ﷺ کے پاس ہوتے ہیں تو آپ ہمارے سامنے جنت و دوزخ کا ذکر کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہمارے سامنے ہیں جب ہم نبی کریم ﷺ سے نکل کر اپنی بیبیوں اولاد اور مال وغیرہ میں مشغول ہوتے ہیں تو ہم بہت کچھ بھول جاتے ہیں۔

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا حال تو ہمارا بھی اسی طرح ہے آپ کہتے ہیں میں اور ابو بکر چلے یہاں تک کہ نبی کریم ﷺ کے پاس گئے میں نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں عرض کیا "نافق حنظلہ یا رسول اللہ" یا رسول اللہ حظلہ منافق ہو گیا۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "وما ذاک" یہ کیا؟ (کہہ رہے ہو) میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ہم آپ کے پاس ہوتے ہیں تو آپ جنت و دوزخ کا ذکر کرتے ہیں تو ہم یہی سمجھتے ہیں کہ ہم جنت و دوزخ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں لیکن جب آپ (کی محفل) سے نکلتے ہیں اور اپنی بیبیوں اور اولاد اور مال وغیرہ میں مشغول ہو جاتے ہیں تو بہت کچھ بھول جاتے ہیں۔

"فقال رسول اللہ ﷺ والذی نفسی بیدہ لو تدومون علی ما تکنونون عندی وفی الذکر لصافحتکم الملائکة علی فرشکم وفی طرقکم ولكن یا حنظلہ ساعة وساعة ثلاث مرات"

(رواہ مسلم)

تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے اگر تم ہمیشہ اس حال پر رہو جو تمہیں میرے پاس ذکر کے وقت حاصل ہوتا ہے تو فرشتے تمہارے بستروں پر

آ کر تمہارے ساتھ مصافحہ کریں اور راستے میں تمہیں آ کر ملیں لیکن اے حظلہ یہ وقت وقت کی بات ہے تین مرتبہ آپ نے یہ ارشاد فرمایا۔

نبی کریم ﷺ نے گویا کہ اس طرف اشارہ فرمادیا کہ میرے پاس بھی یہ کیفیت کبھی تمہیں حاصل ہوتی ہے جب کہ خصوصی توجہ اور علم لدنی کی تعلیم جاری ہوتی ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا ارشاد گرامی اور زیادہ اس مضمون کو واضح کر رہا ہے۔

”عن ابی ہریرۃ قال حفظت رسول اللہ ﷺ وعائین فاما احدهما فبشئہ فیکم واما الآخر فلو بشئہ لقطع هذا البلعوم یعنی مجری العظام“ (رواہ البخاری)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ سے (علم کے) دو خزانے حاصل کئے ہیں۔ ایک میں نے تم پر پھیلا دیا (ظاہر کر دیا) ہے اور اگر میں دوسرا تم پر ظاہر کر دوں تو میری رگ طعام کٹ جائے۔

اس سے مراد بھی وہ خصوصی باطنی علم لدنی ہے جسے عام لوگوں پر ظاہر کرنا منع تھا وہ کیا علوم آپ نے حاصل کئے وہ تو عطاء کرنے والے جانیں یا حاصل کرنے والے جانیں ان دو ہستیوں کے بغیر صرف اللہ تعالیٰ جانتا ہے۔ تاہم ان علوم میں سے غیبی علوم بھی ہو سکتے ہیں۔

اس کی ایک مثال دیکھئے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ یزید کی حکومت کی طرف اشارہ کر کے فرماتے ”اعوذ باللہ من رأس الستین وامارة الصبیان“ میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں ساٹھ سال کے اختتام اور کم عمر لوگوں کی حکومت سے۔

ساٹھویں ہجری کے اختتام پر سینتیس سال کی عمر میں یزید پلید قانون کی دھجیاں بکھیر کر غاصبانہ انداز پر برسر اقتدار آ گیا جس کے بھیانک دور کو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے پہلے ہی بھانپ لیا۔ یہ ان خصوصی علوم کا ہی ایک حصہ ہے سبحان اللہ لوگ مصطفیٰ کریم ﷺ کے علم میں شک کرتے ہیں کتنے نادان ہیں جن کو یہ پتہ ہی نہیں کہ آپ نے تو اپنے صحابہ کو بھی غیبی علوم عطاء فرمادیئے۔ (از منظر)

☆☆☆☆☆

﴿ فَادْكُرُونِيْ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنَ ﴾

- (۱) ”تو میری یاد کرو میں تمہارا چرچا کروں گا اور میرا حق مانو اور میری ناشکری نہ کرو۔
(۲) تو یاد کرو تم مجھے میں یاد کروں گا تمہیں اور تم شکریہ ادا کرو میرا اور میری ناشکری نہ کرو۔

فَادْكُرُونِيْ اَذْكُرْكُمْ: ”فاء“ ماقبل سے رابطہ کے لئے ہے جیسا کہ ﴿ كَمَا اَرْسَلْنَا ﴾ میں ایک قول پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔

”الذكر“ (بکسر الذال) یاد کرنا، ذکر کرنا شہرت کہتے ہیں۔ ”له ذکر فی الناس“ اس کی لوگوں میں شہرت ہے۔

”الذكر“ (بضم الذال) یاد رکھنا (المجرد) دل سے یاد کرنا بھی اس کا معنی آتا رہتا ہے۔
ذکر کی تین قسمیں: زبان سے ذکر کرنا، دل سے ذکر کرنا، اعضاء سے ذکر کرنا۔

ذکر باللسان: ”فذكرهم اياه باللسان ان يحمده ويُسبحوه ويمجدوه ويقرؤا كتابه“
مومنوں کا رب تعالیٰ کو زبان سے ذکر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کریں اور رب تعالیٰ کی تسبیحات بیان کریں اور اس کی بزرگی کا ذکر کریں اور اس کی کتاب (قرآن پاک) کی تلاوت کریں۔

ذکر بالقلب: دل سے ذکر کرنے کی پھر تین قسمیں ہیں:

(۱) ان دلائل میں فکر کریں جو اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات پر دلالت کریں اگر ان دلائل پر کوئی اعتراض وارد ہونے کا گمان ہو تو اس کے جواب کو سوچیں۔

(۲) ان دلائل میں فکر کریں جو انسان کو مکلف بنانے کی تکالیف کی کیفیت پر دلالت کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے احکام، اوامر اور نواہی اور وعد و وعید پر دلالت کرتے ہوں۔

”فاذا عرفوا كيفية التكليف وعرفوا ما في الفعل من الوعد وفي الترك من الوعيد سهل فعله عليهم“

جب کیفیت تکلیف کا انہیں علم حاصل ہو جائے گا اور رب تعالیٰ کے اوامر کے مطابق عمل کرنے پر اس کی طرف سے ثواب کے وعدہ کو جان لیں گے اور رب تعالیٰ کی نواہی سے اجتناب نہ کرنے پر اس کی طرف سے سزا کی وعید کا جب پتہ چل جائے گا تو ان لوگوں پر عمل کرنا آسان ہوگا۔

(۳) اللہ تعالیٰ کی مخلوقات کے اسرار میں تفکر کرے یہاں تک کہ مخلوقات کے ذرات میں سے ہر ذرہ اس پر ایسے روشن ہو جائے جیسے کہ صاف و شفاف آئینہ کو عالم قدس کے مقابل رکھ دیا جائے۔
”فاذا نظر العبد اليها انعكس شعاع بصره منها الى عالم الجلال وهذا
المقام مقام لا نهاية له“

جب بندہ مخلوقات کے ذرات میں تفکر کرتا ہے تو اس کی نظر کا عکس عالم جلال کا علم اسے عطاء کرتا ہے اس منزل کی کوئی انتہاء نہیں۔ تفکر کرنے والوں کے مدارج کے لحاظ سے ان کے علم ذات باری تعالیٰ میں بھی اسی قسم کے مدارج ہوتے ہیں۔

ذکر بالجوارح : اعضاء سے ذکر کرنے کا مطلب یہ ہے ”تكون جوارحهم مستغرقة في الاعمال التي امروا بها وخالية عن الاعمال التي نهوا عنها“ کہ ان کے اعضاء ان اعمال میں مستغرق ہوں جن کا ان کو حکم دیا گیا ہے اور ان اعمال سے اعضاء کو دور رکھیں جن سے ان کو منع کیا گیا ہے۔

نماز تینوں ذکروں کا مجموعہ: رب تعالیٰ نے فرمایا: ﴿فَاسْعُوا إِلَىٰ ذِكْرِ اللَّهِ﴾ تو اللہ کے ذکر کی طرف دوڑو۔ اس مقام میں ”ذکر“ سے مراد نماز جمعہ ہے۔

جلالین میں مذکور ہے (فاذکرونی) بالصلاة والتسبیح ونحوہ ”تم مجھے نماز اور تسبیح وغیرہ سے یاد کرو۔ اس پر صاوی میں ہے:

”ونحوہ کالتہلیل والتحمید وانما قال بالصلاة لان الذکر اما باللسان او بالجوارح او بالجنان ولا شک ان الصلاة جامعة لكل ذکر فالقراءة والتکبیر والتسبیح والدعاء ذکر لسانی والركوع والسجود ذکر بالجوارح والخشوع والخضوع والمراقبة ذکر قلبی“

”ونحوہ“ سے مفسر رحمہ اللہ کا مطلب تہلیل و تحمید ہے مفسر رحمہ اللہ نے ذکر بالصلاة بیان کیا

ہے کیونکہ ذکر کی تین قسمیں ہیں، زبان سے ذکر، اعضاء سے ذکر اور دل سے ذکر۔ بلا شک و شبہ نماز ہر قسم کے ذکر پر مشتمل ہے کیونکہ نماز میں قراءت اور تکبیر اور تسبیح اور دعاء زبان کا ذکر ہے اور رکوع و سجود اعضاء کا ذکر ہے اور خشوع و خضوع اور مراقبہ دل کا ذکر ہے۔ (ماخوذ از کبیر، حلالیس، صاوی)

سب سے اعلیٰ ذکر: ”وقال اهل الحقيقة حقيقة ذكر الله تعالى ان ينسى كل شئ سواه“ اہل حقیقت کے نزدیک اللہ تعالیٰ کا حقیقی ذکر یہ ہے کہ اللہ کے سوا ہر چیز کو بھول جائے (روح المعانی) یعنی ہر وقت توجہ کا مرکز صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہو۔ مقصد عظیم اللہ تعالیٰ کی رضا کا حصول ہو اور تقرب الہی مقصود ہو اس مقصد میں کامیابی پر جنت کا حصول اور جہنم سے بچاؤ خود بخود حاصل ہوں گے۔

جمع اذکار پر مشتمل ذکر: ”روی عن سعید بن جبیر انه قال اذ کرونی بطاعتی“ حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رب تعالیٰ کے ارشاد ﴿اذ کرونی﴾ ”تم مجھے یاد کرو“ کا مطلب یہ ہے کہ تم میری طاعت کرو۔

”فصار الامر بقوله (اذ کرونی) متضمنا لجميع الطاعات“ لہذا ﴿اذ کرونی﴾ کا حکم تمام طاعات کو مشتمل ہے یعنی رب تعالیٰ کے اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ تم میری ہر قسم کی طاعت کرو۔ ہر طاعت جب ذکر میں آگئی تو ذکر بمعنی طاعت کے لینا تمام اذکار پر مشتمل ہو گیا۔ (ماخوذ از کبیر)

اذکروکم: امر کے جواب میں مضارع واقع ہے اس لئے مجزوم ہے ﴿اذکروکم﴾ کا مطلب بیان کرتے ہوئے علامہ آلوسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ”اجاز کم بالشواب وعبر عن ذلك للمشاكلة ولانه نتیجته ومنشأه“ میں تمہیں ثواب عطاء کر کے جزاء دوں گا ذکر کی جزاء کو مشاکلت کے طور پر ذکر سے تعبیر کر دیا کیونکہ درحقیقت جزاء خیر ہی ذکر کا نتیجہ اور منشأ ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے حدیث قدسی بیان فرمائی ”من ذکرنی فی نفسہ ذکرته فی نفسی ومن ذکرنی فی ملا ذکرته فی ملا خیر من ملائہ“ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے جو مجھے دل میں یاد کرے میں اسے دل میں یاد کرتا ہوں اور جو مجھے اشراف کی جماعت میں یاد کرے میں اس سے بہتر اشراف کی جماعت میں اسے یاد کروں گا ”الملا بالقصر الجماعة الاشراف“ الملاء (بالقصر) ایسی جماعت کو کہتے ہیں جو اشراف پر مشتمل ہو۔

اعتراض : نبی کریم ﷺ کی محفل میں صحابہ کرام رب تعالیٰ کا ذکر کرتے رہے اس سے بہتر اور اشرف کون سی محفل ہو سکتی ہے؟

پہلا جواب : " ان الشئی یشرف بما نسب الیہ فان المجلس ينسب لکبیرہ و فرق بین حضرة الله وملائکته و بین حضرة النبی واصحابہ "

کسی چیز کو شرافت جو نسبت کی وجہ سے حاصل ہوتی ہے وہ منسوب الیہ (جس کی طرف نسبت ہو) کی وجہ سے حاصل ہوتی ہے جس مجلس کی نسبت کبیر ذات کی طرف ہو وہ مجلس بھی اعلیٰ ہوگی اس لئے فرق واضح ہے کہ جس محفل میں رب تعالیٰ کے حضور ملائکہ ہوں گے وہ اعلیٰ ہوگی کیونکہ اس کی نسبت رب تعالیٰ کی طرف ہے اس محفل سے یقیناً اس محفل کا درجہ کم ہوگا جو نبی کریم ﷺ کے پاس صحابہ کرام کا حاضر ہونا ہے۔

دوسرا جواب، عظیم جواب :

" کون النبی ﷺ فی حضرة الله اشرف من نفسه فی حضرة اصحابہ
فمعنی قوله خیر من ملئه ذکرته فی حضرة النبی والملائكة المقربين
فی الملا الاعلی "

نبی کریم ﷺ کا رب تعالیٰ کے حضور ہونا اشرف اور اعلیٰ ہے نسبت نبی کریم ﷺ کے محفل میں صحابہ کرام کے ہونے کے رب تعالیٰ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ میں اس شخص کو بہتر مجلس میں یاد کروں گا جس میں نبی کریم ﷺ اور ملائکہ مقربین ہوں گے سبحان اللہ وہ کیسی عظیم محفل ہوگی جو رب تعالیٰ کے حضور ہوگی اور اس میں سید الانبیاء بھی موجود ہوں گے اور ملائکہ مقربین بھی ہوں گے۔ اللہ کا ذکر کرنے والا کتنا خوش قسمت ہوگا جس کا ذکر اس عظیم محفل میں ہوگا۔

" وقیل معنی اذ کرونی تذللوا للجلالی اذ کرکم اکشف الحجب عنکم وافیض علیکم رحمۃ واحسانی واحبکم وارفع ذکرکم فی الملا الاعلی "

اور معنی یہ ذکر کیا گیا ہے کہ گویا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا تم مجھے یاد کرو کہ میرے جلال کے سامنے اپنے عجز کا اظہار کرو میں تمہیں یاد کروں گا کہ تم سے حجابات کو اٹھا دوں گا، اور تم پر اپنے احسان اور رحمت کا فیضان کروں گا اور تم سے محبت کروں گا اور ملائکہ کی جماعت میں

تمہارا ذکر بلند کروں گا۔

(صاوی)

اعلیٰ حضرت کا ترجمہ اسی ﴿ارفع ذکرکم﴾ ”میں تمہارا چرچا کروں گا“ کا ہے کیا خوب نظر تفاسیر پر تھی۔

اللہ تعالیٰ کا ذکر زیادہ سے زیادہ کرے:

رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے ”والذاکرین اللہ کثیرا والذاکرات اعد اللہ لہم مغفرة واجرا عظیما“ اللہ تعالیٰ کا زیادہ ذکر کرنے والے مردوں اور عورتوں کے لئے اللہ نے مغفرت اور اجر عظیم تیار کر رکھا ہے۔

کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے خوف نہ کرے:

یا مبتغی طرق اہل اللہ والتسلک دع عنک اہل الہوی تسلیم عن التشکیک اللہ تعالیٰ کی راہ تلاش کرنے والے اور راہ سلوک اختیار کرنے والے خواہشات پر چلنے والے اور شک ڈالنے والوں کی کوئی پرواہ نہ کر۔

اس راہ میں بڑی دشواریاں ہیں۔ لوگ مجنون بھی کہتے ہیں، طرح طرح کی بیہودہ گفتگو اہل اللہ کے بارے میں اوباش لوگ کرتے ہیں، جو شخص ان پر غصہ کرے دل تنگی اختیار کرے وہ اس راہ میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ صابر و شاکر شخص ہی اس راہ میں کامیاب ہو سکتا ہے۔

(ار صاوی)

دل حاضر نہ ہو تو پھر بھی زبان سے ذکر نہ چھوڑے:

شیخ عارف احمد صاوی رحمہ اللہ کیا خوب فرماتے ہیں ”ولا تترك الذکر لعدم حضورک مع اللہ فیہ فر بما ذکر مع الغفلة یجر لذكر مع حضور“

اگر انسان کو ذکر کرتے وقت اللہ تعالیٰ کے ہاں حضور قلب حاصل نہ ہو اور غفلت کے ساتھ صرف زبانی ذکر کرے تو پھر بھی اللہ تعالیٰ کے ذکر کو نہ چھوڑے، کیونکہ بسا اوقات غفلت سے کئے ہوئے ذکر کی برکتوں سے انسان کو حضور قلب حاصل ہو جاتا ہے۔

زبان سے کئے ہوئے ذکر کی مثال چقماق کی ہے جس طرح چقماق کو ایک مرتبہ ماریں تو صرف چمک پیدا ہوتی ہے اس سے آگ نہیں سلگائی جاتی، لیکن رگڑتے رہیں تو اس سے آگ سلگائی جاسکتی ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ذکر زبان سے کرتے رہیں اگر ابتدائی طور پر حضور قلب حاصل نہیں ہوگا تو آخر کچھ دیر کے بعد حضور قلب حاصل ہوگا، جس سے تمام اعضاء روشن ہو جائیں گے۔

”فلا يقدر الشيطان على وسوسته“ تو شیطان اسے وسوسہ نہیں ڈال سکے گا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ اتَّقَوْا إِذَا مَسَّهُمْ طَائِفٌ مِّنَ الشَّيْطَانِ تَذَكَّرُوا﴾ (الاعراف ۲۰۱)

”بیشک وہ لوگ جو ڈر رکھتے ہیں جب ان کو شیطانی خیال کی ٹھیس پہنچتی ہے تو وہ ذکر کرتے ہیں۔“

اللہ کے ذکر سے انسان پر اللہ تعالیٰ کی عبادت آسان ہو جاتی ہے اسے کوئی تکلیف محسوس نہیں ہوتی کسی عارف باللہ نے کیا خوب کہا:

إذا رفع الحجاب فلا ملاله بتكليف الاله ولا مشقة

جب حجابات اٹھ جاتے ہیں تو نہ کوئی ملال ہوتا ہے اللہ کی طرف سے دی ہوئی تکلیف پر اور نہ کوئی مشقت

(ماخوذ از صاوی)

☆ ”وسئل ابو عثمان فقیل له بذكر الله ولا نجد في قلوبنا حلاوة ، فقال احمدوا الله تعالى على ان زين جارحة من جوار حكم بطاعته“

ابو عثمان رحمہ اللہ کی خدمت میں کچھ لوگوں نے ذکر کیا کہ ہم اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے ہیں لیکن اپنے دلوں میں اس کی حلاوت نہیں پاتے تو آپ نے فرمایا تم اللہ کی حمد بیان کرو، ذات باری تعالیٰ کا شکر ادا کرو جس نے تمہارے اعضاء میں سے ایک عضو (زبان) کو تو اپنی طاعت میں مزین کر رکھا ہے۔

(از فرطی)

سبحان اللہ بزرگان دین کی کیا تعلیمات تھیں کہ وہ یہ نہیں فرماتے تھے کہ اگر ذکر سے حضور قلب حاصل نہیں تو اللہ کا ذکر ہی چھوڑ دو، بلکہ وہ فرماتے تھے یہ بھی مقام شکر ہے کہ رب تعالیٰ نے تمہاری زبان کو اپنی طاعت سے زینت عطاء کر رکھی ہے۔ ذکر کرتے رہو ایک دن وہ بھی آئے گا جب تمہیں حضور قلب کی عظیم نعمت سے نواز دیا جائے گا۔ ہاں جب یہ کیفیت حاصل ہو جاتی ہے اس کے بعد ہی

صوفیاء کرام فرماتے ہیں ”قال رابگذار بنده حال شو“ قال کو چھوڑ کر حال کو اختیار کر۔

علامہ رازی رحمہ اللہ کا خوبصورت بیان:

آپ فرماتے ہیں ﴿فَاذْكُرُونِي اَذْكُرْكُمْ﴾ کے بیان میں مفسرین کرام نے مختلف عبارات پیش کی ہیں یقیناً ان کو دیکھنے سے عظمت قرآن سمجھ آئے گی کہ ایک جملہ میں معافی و مطالب کا کس قدر دریا موجزن ہے۔

”اذکرونی بطاعتی اذکرکم برحمتی“ تم مجھے میری طاعت سے یاد کرو میں تمہیں اپنی رحمت سے یاد کروں گا۔

”اذکرونی بالدعاء اذکرکم بالاجابة والاحسان“ تم مجھے دعاء سے یاد کرو میں دعاء کو قبول کرنے اور احسان سے تمہیں یاد کروں گا۔

اس کا مطلب تقریباً یہ ہو گیا ”ادعونی استجب لکم“ تو مجھ سے دعاء کرو تو میں تمہاری دعاء کو قبول کروں گا۔ ابو مسلم رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

امر الخلق بأن یزکروه راغبین راہبین و راجین خائفین ویخلصوا
الذکر له عن الشرکاء فاذا هم ذکروه بالاخلاص فی عبادتہ وربوبیتہ
و ذکرہم بالاحسان والرحمة والنعمة فی العاجلة والآجلة “

کہ اللہ تعالیٰ نے گویا کہ حکم دیا ہے مخلوق کو کہ وہ اس کا ذکر کریں اس کی طرف رغبت کرتے ہوئے اور اس سے ڈرتے ہوئے اور اس کی رحمت کی طرف امید کرتے ہوئے اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہوئے، اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراتے ہوئے خلوص سے اس کا ذکر کریں۔ جب لوگ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہوئے، اس کی ربوبیت کو مانتے ہوئے خلوص سے اس کا ذکر کریں گے تو وہ ان کو احسان اور رحمت سے یاد کرے گا اور وہ ان کو دنیا اور آخرت میں نعمتیں عطا کر کے یاد کرے گا۔

”اذکرونی بالثناء والطاعة اذکرکم بالثناء والنعمة“

تم مجھے یاد کرو میری حمد و ثناء بیان کر کے اور میری طاعت کر کے، میں تمہیں یاد کروں گا تمہاری

تعریف کر کے اور تمہیں نعمتیں عطاء کر کے۔

”اذکرونی فی الدنیا اذکرکم بالآخرة“ تم مجھے دنیا میں یاد کرو میں تمہیں آخرت میں یاد کروں گا۔
 ”اذکرونی فی الخلوات اذکرکم فی الفلوات“ تم مجھے خلوتوں میں یاد کرو میں تمہیں جنگلوں میں یاد کروں گا۔
 ”اذکرونی فی الرخاء اذکرکم فی البلاء“ تم مجھے آسانی میں یاد کرو میں تمہیں مصیبتوں میں یاد کروں گا۔
 ”اذکرونی بطاعتی اذکرکم بمعونتی“ تم مجھے طاعت سے یاد کرو میں تمہیں معاونت سے یاد کروں گا۔
 ”اذکرونی بمجاهدتی اذکرکم بھدایتی“ تم مجھے مجاہدہ سے یاد کرو میں تمہیں ہدایت سے یاد کروں گا۔
 ”اذکرونی بالصدق والاخلاص اذکرکم بالخلاص ومزید الاختصاص“

تم مجھے یاد کرو صدق و اخلاص سے میں تمہیں یاد کروں گا خلاص (آگ سے چھٹکارا) اور مزید اختصاص (خاص انعامات) سے۔

فضائل ذکر احادیث مبارکہ سے:

”عن ابی ہریرۃ وابی سعید قال قال رسول اللہ ﷺ لا یقعد قوم
 یذکرون اللہ الا حفتهم الملائکۃ وغشیتهم الرحمة ونزلت علیہم
 السکینۃ وذکرہم اللہ فیمن عنده“
 (رواہ مسلم)

حضرت ابو ہریرہ اور ابو سعید رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کوئی قوم اللہ تعالیٰ کے ذکر کے لئے نہیں بیٹھتی سوائے اس کے کہ فرشتے ان کا احاطہ کر لیتے ہیں اور رحمت ان کو ڈھانپ لیتی ہے اور سکینت ان پر نازل ہوتی ہے اور رب تعالیٰ ان کا مقربین میں ذکر فرماتا ہے۔

وضاحت حدیث: اگر ”قعود“ سے مراد ”قیام“ کی ضد یعنی بیٹھنا مراد ہو تو مطلب یہ ہوگا کہ اس انداز پر بیٹھ کر اللہ تعالیٰ کا ذکر کرے کہ تمام حواس اطمینان سے اپنا اپنا کام کریں خواہ وہ حواس ظاہرہ ہوں یا باطنہ ہوں۔ کہ رب تعالیٰ کا ذکر کرتے ہوئے کسی اور کی طرف توجہ مبذول نہ ہو۔

”وان کان کنایۃ عن الاستمرار ففیہ ایماء الی مداومۃ الذاکار“ اگر قعود سے مراد اشارۃ استمرار (ہمیشہ جاری رکھنا) ہو تو مطلب یہ ہوگا کہ ذکر ہمیشہ جاری رکھیں۔

حضرت ابن حجر رحمہ اللہ نے یہی معنی مختار قرار دیا ہے کہ غالب مقصد یہی ہوتا ہے کہ انسان ذکر

کرنے والوں کے ساتھ بیٹھ کر ذکر جاری رکھے تاکہ ان سے برکت حاصل کرے اور ان سے محبت کر کے اپنے بگڑی سنوارے۔

یہ معنی بہتر کیوں ہے؟ اسلئے کہ ”فلاننا فیہ قیامہ لطاعة“ رب تعالیٰ کی طاعت کیلئے اس کا ذکر کھڑے ہو کر اس حدیث کے مخالف نہیں۔ کیونکہ طواف کرنا اور دوران طواف ذکر کرنا اور مقامات مقدسہ کی زیارت کے وقت رب تعالیٰ کا ذکر کرنا، اور نماز جنازہ میں رب تعالیٰ کی ثناء اور علم کی طلب کیلئے جانا اور رب تعالیٰ کو یاد کرنا اور نصیحت سنتے وقت قیام کی حالت میں ذکر کرنا سب ہی محمود ہیں۔
الاحفتم الملائكة :

”ای احاطت بهم الملائكة الذین یطوفون فی الطرق یلتمسون اهل الذکر“
 یعنی وہ ملائکہ جو مختلف راستوں میں پھرتے رہتے ہیں ذکر والوں کو تلاش کرتے رہتے ہیں وہ ان ذکر کرنے والوں کا اپنی رحمت سے احاطہ کر لیتے ہیں۔
وغشيتهم الرحمة :

”ای غطتهم الرحمة الالهية الخاصة بالذاکرین اللہ کثیرا والذاکرات“
 اور رب تعالیٰ کی خصوصی رحمت ان مردوں اور عورتوں کو ڈھانپ لیتی ہے اور اپنی لپیٹ میں لیتی ہے جو اس کا ذکر کرتے ہیں۔

ونزلت علیہم السکينة : یعنی ذکر کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ سکینت اور وقار عطا کرتا ہے جیسا کہ رب تعالیٰ نے خود ہی فرمایا:

﴿أَلَا بِذِكْرِ اللَّهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ﴾ خبردار اللہ تعالیٰ کے ذکر سے دلوں کو اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ اور ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

﴿هُوَ الَّذِي أَنْزَلَ السَّكِينَةَ فِي قُلُوبِ الْمُؤْمِنِينَ لِيَزْدَادُوا إِيمَانًا مَعَ إِيمَانِهِمْ﴾
 ”وہ ذات جس نے مومنوں کے دلوں میں سکینت (چین) نازل کی تاکہ ان کے ایمان میں اور زیادہ پختگی ہو“
وذكرهم الله : اللہ تعالیٰ ان لوگوں کا فخر کے طور پر ذکر فرماتا ہے اور ان کا ذکر جمیل فرماتا ہے اور ان کو جزاء جزیل دینے کا وعدہ فرماتا ہے کہ یہ میرا ذکر کر رہے ہیں۔

فیمن عنده : ”ای من الملائكة المقربين و ارواح الانبياء والمرسلين“

یعنی اللہ تعالیٰ مقرب فرشتوں اور انبیاء کرام اور مرسلین کے سامنے ذکر کرنے والوں کی تعریف فرماتا ہے۔ یہاں ”عندہ“ کا یہی مطلب ہے کیونکہ رب تعالیٰ زمان اور مکان سے پاک ہے بلکہ ہر وہ چیز جس میں حدوث ہو اور نقصان ہو اس سے رب تعالیٰ پاک ہے۔

(مسلم، ترمذی، ابن ماجہ، مشکوٰۃ باب ذکر اللہ، مرقاۃ)

☆ ”عن ابی ہریرۃ قال کان رسول اللہ ﷺ یسیر فی طریق مکۃ فمر علی جبل یقال لہ جمدان فقال سیروا ہذا جمدان سبق المفردون قالوا وما المفردون یا رسول اللہ قال الذاکرون اللہ کثیرا والذاکرات“ (رواہ مسلم)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ مکہ کے راستہ میں چل رہے تھے آپ کا ایک پہاڑ کے قریب سے گزر ہوا جسے جمدان کہا جاتا ہے آپ نے فرمایا چلو یہ جمدان ہے مفردون سبقت لے گئے صحابہ کرام نے پوچھا یا رسول اللہ ”مفردون“ کون ہیں آپ نے فرمایا وہ مرد اور عورتیں ہیں جو اللہ تعالیٰ کو زیادہ سے زیادہ یاد کرتے ہیں۔

حدیث پاک کا مفہوم واضح ہے البتہ خیال رہے ”جمدان“ (بضم الجیم وسکون المیم وفی آخرہ نون) اور ”مفردون“ بتشدید الراء المکسورة وتخفیفها“ مراد اس سے وہ لوگ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ کے ذکر کے بغیر اطمینان حاصل نہ ہو وہ تمام دوستوں کو چھوڑ کر، وطن کی پرواہ کئے بغیر، تمام اسباب کو منقطع کر کے، شہوات کو چھوڑ کر، اور تمام چیزوں کی لذات کو چھوڑ کر صرف رب تعالیٰ کی رحمت کے دروازہ کو لازم پکڑیں، صرف رب تعالیٰ کے ذکر کی لذت حاصل کریں۔

☆ ”عن ابی موسیٰ قال قال رسول اللہ ﷺ مثل الذی یدکر ربہ والذی لا یدکر مثل الحی والمیت“ (رواہ البخاری ومسلم)

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتا ہے اور وہ جو ذکر نہیں کرتا ان کی مثال زندہ اور مردہ کی ہے۔

یعنی اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والا زندہ شخص کی طرح ہے جس طرح انسان کی ظاہری زینت نور حیات اور تصرف تام ہے اور باطنی زینت نور علم اور ادراک ہے اسی طرح ذکر کر نیوالے کو ظاہری زینت نور طاعت سے حاصل ہوتی ہے اور باطنی زینت نور معرفت سے حاصل ہوتی ہے۔ اور جو اللہ تعالیٰ

کا ذکر نہیں کرتا ” ظاہرہ عاطل و باطنہ باطل “ اس کا ظاہر بھی معطل ہے اور باطن بھی بیکار ہے۔
فائدہ جلیلہ: حدیث شریف میں اس طرف بھی اشارہ پایا گیا ہے:

” ان مداومة ذکر الحی الذی لا یموت تورث الحیاة الحقیقیة التي
لا فناء لها کما قيل اولياء الله لا یموتون ولكن يتقلون من دار الى دار “

کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر ہمیشگی سے کرنے والے کو زندگی حاصل ہوتی ہے وہ مرتا نہیں یعنی حیات حقیقیہ
اسے حاصل ہو جاتی ہے جس میں فناء نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ذکر کرنے والے کو مقام ولایت حاصل ہو جاتا
ہے اور اللہ تعالیٰ کے ولی مرتے نہیں بلکہ ایک جہان سے دوسرے جہان کی طرف منتقل ہو جاتے ہیں۔

خیال رہے کہ مسلم شریف میں یہ الفاظ مبارکہ ہیں ” البیت الذی یدکر اللہ فیہ والبت
الذی لا یدکر اللہ فیہ مثل الحی والمیت “ یعنی اس میں لفظ ” البیت “ ذکر ہے البیت سے
مراد دل ہے یعنی اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والے کا دل اللہ تعالیٰ کا گھر ہے ” فطوبی لمن احیاه
وعمره ویا حسرتی علی من اخربه “ کتنی خوشی اور برکت کا مقام ہے اس شخص کے لئے جو
اللہ تعالیٰ کے ذکر سے اپنے دل کو زندہ کرتا ہے اور اسے اللہ تعالیٰ کی رحمت سے آباد کرتا ہے اور کتنا
بدقسمت ہے وہ شخص جو اللہ تعالیٰ کا ذکر نہ کر کے اپنے دل کو مردہ کرتا ہے اور رب تعالیٰ کی رحمت سے محروم
کر کے برباد کر لیتا ہے۔

☆ ” عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ ﷺ يقول الله تعالى انا عند ظن عبدی بی وانا
معه اذا ذکرنی فی نفسہ ذکرتہ فی نفسی وان ذکرنی فی ملا ذکرتہ فی ملا خیر منهم “
(رواہ البخاری ومسلم)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میں اپنے
بندے کے گمان کے مطابق ہوتا ہوں اور میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں جب وہ مجھے دل میں یاد کرتا ہے
میں اسے دل میں یاد کرتا ہوں اور اگر وہ مجھے جماعت (مجلس) میں یاد کرے تو میں اسے بہتر اشراف کی
جماعت میں یاد کرتا ہوں۔

وضاحت حدیث: مطلب یہ ہوا ” انا اعاملہ علی حسب ظنہ بی وافعل بہ
ما یتوقعہ منی من خیر او شر “ کہ میں اپنے بندے سے وہی معاملہ کرتا ہوں جیسا وہ میرے متعلق

گمان رکھتا ہے اگر وہ مجھ سے خیر کی توقع رکھے (یعنی ایسے عمل کرے جو ذریعہ خیر ہوں) تو میں اس سے خیر سے درپیش آتا ہوں اور اگر وہ مجھ سے شر کی توقع رکھے تو میں بھی اس کی توقع کے مطابق اس سے سلوک رکھتا ہوں۔

”لا مانع لما أعطیت ولا معطى لما منعت“ یعنی رب تعالیٰ کے ذکر کرنے والے پر رب تعالیٰ کی رحمت ہوتی ہے اور نہ ذکر کرنے والا اس سے محروم رہتا ہے۔ گویا کہ رب تعالیٰ فرماتا ہے جسے میں عطاء کروں اس کو کوئی اس سے منع نہیں کر سکتا اور جسے میں محروم کروں اسے کوئی عطاء نہیں کر سکتا۔

جب بندے کا مقام توحید میں راسخ عقیدہ ہو جائے، اور ایمان اس کے دل میں جاگزیں ہو جائے اور اللہ تعالیٰ پر اسے کامل بھروسہ ہو جائے ”قرب منه ورفع له الحجاب بحیث اذا دعاه اجاب واذا سألہ استجاب“ تو اسے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہو جاتا ہے اس سے حجاب اٹھا لئے جاتے ہیں اس لحاظ پر کہ جب وہ دعاء کرتا ہے تو اس کی دعاء کو قبول کر لیا جاتا ہے اور جب سوال کرتا ہے تو اسے پورا کر دیا جاتا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا رب تعالیٰ کہتا ہے ”اذا علم عبدی ان له ربا یغفر الذنب“ جب میرا بندہ جانتا ہے کہ میں اس کا رب ہوں تو میں اس کی مغفرت کر دیتا ہوں۔

وانا معہ : ای بالتوفیق والحفظ والمعونة“ یعنی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میں اسے توفیق عطاء کرتا ہوں اور اس کی حفاظت کرتا ہوں اور اس کی امداد کرتا ہوں اور اس کے کلام کو سنتا ہوں اور اس کے حال کو جانتا ہوں خواہ وہ مجھے زبان سے یاد کرے یا دل سے یاد کرے۔

فان ذکرنی فی نفسہ ذکرته فی نفسی : اگر بندہ مجھے یاد کرے دل میں، پوشیدگی سے، آہستہ طور پر اور خلوص سے تو میں بھی اسے آہستہ طور پر خود اپنے دست قدرت سے ثواب عطاء کروں گا وہ ثواب فرشتوں کے سپرد نہیں کروں گا کہ وہ ذکر کرنے والے کو عطاء کریں۔

وان ذکرنی فی ملاء ذکرته فی ملاء خیر منهم : یعنی رب تعالیٰ فرماتا ہے اگر بندہ مجھے مومنوں کی جماعت میں یاد کرے اور مومنوں کے سامنے یاد کرے تو میں اسے ملائکہ مقررین اور

روح مرسلین میں یاد کروں گا اور اس کے ذکر کو شرف قبولیت عطاء کروں گا اس کی تعریف کروں گا اور سے بہت بڑا انعام عطاء کروں گا۔

تنبیہ: ”ان خواص البشر كالانبياء خیر من خواص الملائكة كجبريل واما عوام البشر فليسوا بخیر من الملائكة اصلا“

انسانوں میں سے خاص لوگ یعنی انبیاء کرام بہتر ہیں خاص ملائکہ سے جیسے جبریل وغیرہ۔ لیکن عام بشر ملائکہ سے بہتر نہیں لہذا عام مؤمنین کی محفل میں بندے کا رب تعالیٰ کو یاد کرنے سے رب تعالیٰ کا ملائکہ مقربین اور ارواح مرسلین میں یاد کرنا یقیناً بہتر ہے۔

☆ ”عن ابی ذر قال قال رسول اللہ ﷺ يقول الله تعالى من جاء بالحسنة فله عشر مثالا وأزيد ومن جاء بالسيئة فجزاء سيئة مثلها أو اغفر ومن تقرب مني شبرا تقربت منه ذراعا ومن تقرب مني ذراعا تقربت منه باعا ومن اتاني يمشی اتيته هرولة ومن لقيني بقرب الارض خطيئة لا يشرك بي شيئا لقيته بمثلها مغفرة“ (رواه مسلم)

حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا رب تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے جو شخص نیکی کرے اس کے لئے دس گنا بلکہ اس سے بھی زائد اجر و ثواب ہے اور جو شخص برائی کا عمل کرے تو اسے اس کی مثل ہی گناہ حاصل ہوگا یا میں اسے (اپنی رحمت) سے بخش دوں۔ اور جو شخص ایک بالشت میرے قریب ہوگا میں ایک ذراع اس کے قریب ہوں گا اور جو شخص ایک ذراع میرے قریب ہوگا میں دونوں بازوؤں کے پھیلانے کی مقدار فاصلے کی مقدار قریب ہوں گا اور جو شخص میرے پاس چل کر آئے گا میں اس کے پاس تیز چل کر آؤں گا اور جو شخص زمین کے قریب گناہ میرے پاس لائے سوائے شرک کے (مجھے میری رحمت کی امید سے ملے) تو میں اسی کے مطابق اسے مغفرت سے ملوں گا۔

وضاحت حدیث: من جاء بالحسنة ای غیر مبطلہ، جو شخص نیکی لائے لیکن وہ نیکی اس کی مقبول ہو مردود نہ ہو، ریاء کاری نہ ہو اور کوئی وجہ اس نیکی کو برباد کرنے والی نہ ہو تو اسے ایک نیکی کے بدلے دس نیکیوں کا ثواب حاصل ہوگا بلکہ نیکی کرنے والے کا جتنا خلوص بڑھتا چلا جائے گا، اسی قدر اس کے ثواب میں بھی زیادتی ہوتی چلی جائے گی وہ سات سو گنا، ایک لاکھ گنا بلکہ اس سے بھی زیادہ ثواب دیا جائے گا۔

ومن جاء بالسيئة فجزاؤه سيئة مثلها:

جو شخص برائی کرے گا اسے ایک برائی کا ہی گناہ حاصل ہوگا۔

نکات: (۱) الحسنۃ فرمایا گیا یہ نہیں فرمایا گیا ”من فعل الحسنۃ“ اس سے اشارہ کیا گیا کہ الحسنۃ سے معبودہ نیکی مراد ہے یعنی وہ مقبول ہو، مردود نہ ہو۔

(۲) الحسنۃ کے ساتھ جزاء کا ذکر نہیں اور السيئة کے ساتھ جزاء کا ذکر ہے اس میں وجہ فرق کیا ہے؟ علامہ طیبی رحمہ اللہ نے اس کی وجہ یہ بیان فرمائی:

”ما يقابل العمل الصالح كله افضال واکرام من الله وما يقابل السيئة فهو

عدل وقصاص فلا يكون مقصودا بالذات كالثواب فخص بالجزاء“

نیک اعمال پر ثواب اور وہ بھی کئی گنا زیادہ عطاء کرنا یہ صرف اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے حاصل ہونا ہے لیکن گناہوں کے بدلے عذاب کا دیا جانا عدل و قصاص کی وجہ سے ہوگا۔ ثواب کی طرح عذاب مقصود بالذات نہیں ہوتا اسی لئے گناہوں کے بدلے عذاب کو ”جزاء“ سے تعبیر کر دیا گیا ہے۔

(۳) سیئۃ کو دوبارہ نکرہ ذکر کیا گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلے معرفہ میں مطلق ذکر کیا گیا پھر نکرہ ذکر کر کے تنوین وحدت کی ذکر کر کے اس مبہم کی وحدت پر نص قائم کی گئی (یعنی اسے ظاہر کیا گیا ہے) کہ ایک گناہ پر سزا ایک گناہ کی ہی ہوگی، زیادہ نہیں ہوگی۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی خصوصی رحمت اور خصوصی انعام و اکرام اپنے بندوں پر ہوگا کہ اس کے انعامات تو زیادہ ہوں گے لیکن اس کی طرف سے سزائیں کم ہوں گی۔

(۴) ”فله عشر امثالها وازيد“ میں ”واو“ کو ذکر کرنے کے فوائد یہ ہیں کہ یا مراد ”ازيد“ سے اللہ تعالیٰ کی زیارت سے مشرف ہونا ہے جیسا کہ ”لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا الْحُسْنَىٰ وَزِيَادَةٌ“ میں ”وزيادة“ سے مراد رؤیۃ باری تعالیٰ ہے۔

اور ”ازيد“ سے مراد کئی گنا نیکیوں کے ثواب کی زیادتی جب مراد ہو تو ”واو“ بمعنی ”او“ کے ہوگی جو نوع پر دلالت کرتا ہے جس طرح اسی حدیث میں ”او اغفر“ میں ”او“ تنويع کے لئے استعمال ہے:

”والاظهر ما قاله ابن حجر من ان العشر والزيادة يمكن اجتماعهما“

بخلاف جزاء مثل السيئة ومغفرتها فانه لا يمكن اجتماعهما فوجب
ذكر او الدال على ان الواقع احدهما فقط

زیادہ ظاہر قول ابن حجر رحمہ اللہ کا ہے کہ ایک نیکی پردس گنا اور اس سے بھی زیادہ ثواب حاصل ہوتا ہے یہاں دس گنا اور اس سے زیادہ کو جمع کرنا ممکن ہے اس لئے ”واو“ اپنے حقیقی ”اجتماع“ کے معنی میں استعمال ہے لیکن برائی کی جزاء میں ”او“ ذکر کرنا ضروری ہے کیونکہ اس میں اجتماع ممکن نہیں بلکہ یا ایک گنا عذاب ہو جائے یا مغفرت ہو جائے۔

اس سے آگے حدیث پاک کے مجازی معانی معتبر ہیں ”ومن تقرب مني شبرا تقربت منه ذراعا“ کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص میرا قرب حاصل کرنے کے لئے تھوڑی مقدار میں میری طاعت کرتا ہے تو میں اپنی رحمت اسے زیادہ مقدار میں پہنچاتا ہوں۔

درحقیقت بندے کو اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس کا ذکر کرنے کی توفیق حاصل ہونا بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت اور مہربانی ہے، معنی یہ ہو گیا ”من تقرب الى بطاعتي تقربت اليه برحمتي“ جو شخص میری طاعت سے میرے قریب ہوتا ہے میں اپنی رحمت سے اس کے قریب ہوتا ہوں۔

”ومن تقرب مني ذراعا تقربت منه باعا“ اگرچہ ”باعا“ کا مطلب دونوں ہاتھوں کو پھیلانے سے جو فاصلہ ہوتا ہے اسے کہا جاتا ہے لیکن یہاں اس تمام جملے کا معنی یہ ہے ”كلما زاد العبد قربه من الله تعالى زاد الله رحمته“ کہ بندہ جتنا زیادہ اللہ تعالیٰ کی طاعت سے قرب حاصل کرتا ہے اللہ تعالیٰ بھی اپنی رحمت اتنی ہی زیادہ کرتا ہے۔

”ومن اتاني يمشی اتيته هرولة“ اگرچہ ”هرولة“ کا معنی تیز چلنا ہے، دوڑنا نہیں لیکن یہاں بھی مجازی معنی ہی مراد ہے کہ جو میری طاعت اور زیادہ کرے گا ”صببت عليه الرحمة“ میں اپنی رحمت کا اس پر اور ہی زیادہ فیضان کروں گا یا یوں کہا جائے ”من تقرب مني بسهولة وصل اليه رحمتي بسرعة“ جو شخص آسانی سے میرے قریب ہوا میری رحمت جلدی ہی اسے حاصل ہوگئی۔

”ومن لقيني بقراب الارض خطيئة لا يشرك بي شيئا لقيته بمثلها مغفرة“ اس

میں ”قرب“ لفظ استعمال ہوا ہے یہ ”قاف“ کے ضمہ اور کسرہ سے پڑھا گیا ہے ”قرب“ سے ماخوذ ہے معنی اس کا یہ ہے ”بما یقرب ملاھا من الصغائر والكبائر“ کہ زمین میں جتنی چیزیں ہیں ان کے قریب صغیرہ اور کبیرہ گناہ کر کے میرے قریب آجائے تو میری طرف سے اسی کے مطابق اسے رحمت حاصل ہوگی۔

حدیث پاک کا آخری حصہ قرآن پاک کے ان الفاظ مبارکہ کا ترجمان ہے ﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ﴾ بیشک اللہ تعالیٰ شرک کی مغفرت نہیں فرمائے گا، اس کے بغیر جو چاہے گا معاف فرمادے گا۔

حدیث پاک میں اس مقصد عظیم کو بھی واضح کیا گیا ہے ”دفع الیأس بکثرة الذنوب فلا ینبغی ان یغتر فی الاستکثار من الخطایا“ کہ زیادہ گناہوں سے ناامید بھی نہ ہو اور بہت زیادہ گناہوں میں مبتلا ہو کر دھوکہ میں بھی مبتلا نہ ہو۔

چونکہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے ”فانه یغفر لمن یشاء ویعذب من یشاء ولا یعلم انه من ایہم“ کہ وہ جس کی چاہے مغفرت فرمائے اور جسے چاہے عذاب دے چونکہ انسان کو معلوم تو نہیں کہ وہ کن لوگوں سے ہوگا اس کی مغفرت ہونی ہے یا عذاب میں مبتلا ہونا ہے یہ حدیث کے آخری حصہ کا مطلب ہے۔

حدیث کے اول حصہ میں ترغیب پائی گئی ہے طاعت میں مجاہدہ پر براہیجختہ کیا گیا ہے اور چستی سے عبادت کرنے کا حکم دیا گیا ہے سستی اور کوتاہی کو چھوڑنے کا حکم دیا گیا ہے۔

”فالحديث معجون مرکب نافع لا مراض قلوب السالکین ومحرک شوق الطالبین ومقول صدور المذنبین“

گویا کہ حدیث مرکب معجون کی طرح ہے جو راہ سلوک پر چلنے والوں کے دلوں کی امراض کیلئے نفع مند ہے اور طالبین کے شوق کو حرکت دینے کا ذریعہ ہے اور گناہگاروں کے سینوں کیلئے مقوی ہے۔ نتیجہ واضح ہوا ”ینبغی ان یکون المؤمن بین الخوف والرجاء“ کہ مومن کے لئے

لائق یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے عذاب کا خوف بھی رکھے اور اللہ تعالیٰ کی رحمت کی امید بھی رکھے۔

☆ "وعن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ ﷺ ان اللہ تعالیٰ قال من عادى لی ولیا فقد اذنتہ بالحرب وما تقرب الی عبدی بشئ احب الی مما افترضت علیہ وما یزال عبدی یتقرب الی بالنوافل حتی احببتہ فاذا احببتہ فکنت سمعہ الذی یسمع بہ وبصرہ الذی یشہد بہ ویدہ الی یمطش بہا ورجلہ الی یمشی بہا وان سألنی لا اعطینہ ولن استعاذنی لا عیذلہ وما ترددت عن شئی انا فاعلہ ترددی عن نفس المؤمن یکرہ الموت وانا اکرہ مساءتہ ولا بدلہ منہ" (رواہ البخاری)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ فرماتا ہے جو شخص میرے ولی سے دشمنی رکھے میں اسے لڑائی کی اطلاع دیتا ہوں اور میرا بندہ میرے قریب ہوتا ہے اس چیز سے جو مجھے پسند ہے یعنی جو میں نے اس پر فرض کیا ہے اور ہمیشہ میرا بندہ نوافل کے ذریعے میرے قریب ہوتا ہے یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں جب میں اس سے محبت کرتا ہوں تو میں اس کی سمع بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے اور میں اس کی بصر بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اور میں اس کے ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے اور میں اس کے پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے اور اگر وہ مجھ سے سوال کرے تو میں اسے عطاء کرتا ہوں اور اگر وہ مجھ سے پناہ طلب کرے تو میں اسے پناہ دیتا ہوں۔ اور مومن شخص جو موت کو مقام تردد میں سمجھتا ہے میں اس کے تردد کو زائل کرتا ہوں اور جو اس کے لئے ضروری ہے جس سے اس کا چھٹکارا نہیں اس میں اسے تکلیف دینے کو میں ناپسند کرتا ہوں۔

وضاحت حدیث: من عادى لی ولیا :

یعنی جو میرے ولیوں میں سے کسی ایک ولی کو ایذا پہنچائے "ولی" فاعیل کا وزن ہے بمعنی مفعول ہے :

"وهو من يتولى الله امره فلا يكله الى نفسه لحظة قال الله تعالى وهو

يتولى الصالحين"

یہ وہ شخص ہوتا ہے جو اپنے تمام امور کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دے ایک لحظہ بھر بھی اپنے امور کو اپنے سپرد نہ کرے اللہ تعالیٰ نے فرمایا "وہ نیک لوگوں کا والی ہے"

اور یہ بھی ہو سکتا ہے "فعل" فاعل کے معنی میں ہو اور اس میں مبالغہ پایا گیا ہو "وہو

المتولی عبادة الله وطاعته على التوالى بلا تخلل عصيان“ کہ ولی وہ ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی عبادت کا متولی ہو اور اس کی طاعت توالی (لگاتار) طور پر کرے عبادت کرنے میں گناہوں سے خلل نہ پیدا کرے۔

”ولی“ جب مفعول کے معنی میں ہو تو مراد اور مجذوب اور سالک کے درجہ میں ہوتا ہے اور جب فاعل کے معنی میں ہو تو مرید اور سالک اور مجذوب کے درجہ میں ہوتا ہے۔

تاہم یہ فرق ابتداء و انتہاء کے لحاظ سے ہے اور عنایت و رعایت کے لحاظ سے ہے کہ پہلے مرید ہوتا ہے اور وہ حق رکھتا ہے کہ اس کی رعایت کی جائے پھر وہ درجہ مراد میں پہنچ جاتا ہے پھر وہ دوسروں پر عنایت و مہربانی کرتا ہے۔

وما تقرب الی عبدی: عبدی سے مراد مومن بندہ ہے ”عبد“ اس لئے ذکر کیا کہ جس طرح غلام اپنے مالک کی رضا مندی حاصل کرنے کے لئے مختلف قسم کی خدمت بجالاتا ہے اور ہر قسم کی طاعت کرتا ہے تو بندے کو بھی چاہئے کہ وہ اپنے مالک کی ہر قسم کی طاعت کرے۔

بشئى احب الی مما افترضت علیہ: یعنی انسان اللہ تعالیٰ کی عبادت کر کے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرے جو عبادت اللہ تعالیٰ نے فرض کی اس پر عمل کرنے سے اللہ تعالیٰ کے حکم کو بجالایا گیا اور اللہ تعالیٰ کے نواہی سے اجتناب پایا گیا۔ اور ”احب“ کے قول سے پتہ چلا کہ اللہ تعالیٰ کے تقرب کے مختلف ذریعے ہیں ان میں سے اللہ تعالیٰ کو زیادہ پسند یہی ہے کہ فرائض کو ادا کیا جائے۔ مومن کا طریقہ یہ ہے کہ وہ فرائض کے ادا کرتے وقت نوافل بھی ادا کرتا ہے اسی وجہ سے ارشاد فرمایا گیا ”وما یزال عبدی یتقرب الی بالنوافل حتی احبته“ یعنی انسان جب فرائض سے زائد عبادت نوافل کے ذریعے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اس سے محبت کرتا ہے۔

فکنت سمعہ: کے مختلف مطالب ہیں۔

(۱) ”یسرت علیہ افعاله المنسوبة الی هذه الحالات ووفقته فیہا حتی کانی نفس

هذه الحالات“

یعنی بندہ جب رب تعالیٰ کا قرب حاصل کر لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے کانوں اور اس کی آنکھوں

اور اس کے ہاتھوں اور اس کے پاؤں پر آسان کر دیتا ہے اور ان کو توفیق دیتا ہے کہ وہ حق بات کو سنتے ہیں، حق راہ کو دیکھتے ہیں اور ہاتھوں سے وہی کام کرتے ہیں۔ جس سے رب تعالیٰ راضی ہوتا ہے اور پاؤں سے نیکی کی راہ پر چلتے ہیں۔ تو ان آلات کو درست راہ پر لگانے کو مالک الملک نے اپنی طرف منسوب کر دیا گویا یوں سمجھا جائے کہ نیک بندے کے کان اور آنکھیں اور ہاتھ اور پاؤں میں خود ہی ہوتا ہوں۔

(۲) اللہ تعالیٰ اپنے مقرب بندے کے حواس اور آلات کو اپنی رضا کا وسیلہ اور ذریعہ بنا دیتا ہے تو وہ صرف وہی سنتا ہے جس میں رب تعالیٰ کی رضا ہو اور صرف وہی دیکھتا ہے جسے رب تعالیٰ پسند کرتا ہے اور وہی کام ہاتھ سے کرتا ہے جس میں رب تعالیٰ راضی ہو۔ اور پاؤں سے چل کر اسی طرف جاتا ہے جو رب تعالیٰ کی پسند کے مطابق ہو۔ تو مطلب یہ ہوا کہ وہ رب تعالیٰ کے ذریعے سن رہا ہے اور دیکھ رہا ہے اور پکڑ رہا ہے اور چل رہا ہے۔

(۳) اللہ تعالیٰ اپنے مقرب بندے پر اپنی محبت اتنی زیادہ غالب کر دیتا ہے کہ وہ کسی چیز کو دیکھتا ہی نہیں سوائے اس کے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی محبت ہو۔ وہ کسی چیز کو رب تعالیٰ کی محبت کے بغیر سنتا ہی نہیں۔ وہ کسی چیز کو رب تعالیٰ کی محبت کے بغیر پکڑتا ہی نہیں وہ رب تعالیٰ کی محبت کے بغیر کسی راہ پر چلتا نہیں۔ ”و یكون الله سبحانه في ذلك له يدا وعونا وو كيلا يحمي سمعه وبصره ويده ورجله عما لا يرضاه“ گویا کہ اللہ تعالیٰ اس کے ہاتھ بن جاتا ہے اس کا مددگار اور کار ساز بن جاتا ہے جو اس کے کانوں اور آنکھوں اور ہاتھوں اور پاؤں کی حفاظت کرتا ہے جس کی وجہ سے اس کے اعضاء رب تعالیٰ کی رضا کے بغیر کوئی کام نہیں کرتے۔

(۴) اور معنی یہ ہے کہ گویا کہ اللہ تعالیٰ یہ فرماتا ہے:

”كنت اسرع الى قضاء حوائجه من سمعه في الاستماع وبصره في

النظر ويده في اللمس ورجله في المشي“

کہ جب میرا بندہ میرا قرب حاصل کر لیتا ہے تو اس کی حاجات کو میں جلدی پورا کر دیتا ہوں اگر وہ کہیں دور کی بات کو سننا چاہتا ہے تو اسے سنا دیتا ہوں اور کہیں دور دیکھنا چاہتا ہے تو اسے دکھا دیتا ہوں اور جہاں ہاتھ کو پہنچانا چاہے تو اس کے ہاتھ کو پہنچا دیتا ہوں اور جہاں چل کر جانا چاہے وہاں پہنچا دیتا ہوں۔

(۵) جب انسان فرائض کی ادائیگی کے ذریعے اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرتا ہے اور نوافل کے ذریعے فرائض کی تکمیل کر کے جب اور زیادہ قرب حاصل کرنا چاہے تو اسی قرب کے حصول کے ذرائع میں سے اللہ تعالیٰ کا ذکر بھی ہے:

”والذكر الموصل الى حضور الوصول وسرور الحصول ومقام
الفناء عن نفسه والبقاء بربه ظهر له آثار محبته الازلية وانكشف له
انوار قربته الابدية فرأى ان ما به الكمال من السمع والبصر وقوة
القوى انما هو من آثار سمعه وبصره وقدرته وقوته“

اور وہ ذکر رب تعالیٰ کے حضور پہنچانے کا ذریعہ ہے اور اسی سے سرور حاصل ہوتا ہے اور انسان اپنے آپ کو مقام فنا میں سمجھتا ہے اور اسے معلوم ہوتا ہے کہ صرف رب تعالیٰ کی ذات باقی ہے تو اس پر ازلی محبت کے آثار ظاہر ہوتے ہیں اور قربت ابدیہ کے انوار اس پر منکشف ہوتے ہیں پھر وہ اپنی سمع اور بصر اور ہر آلہ میں جو قوت دیکھتا ہے وہ درحقیقت رب تعالیٰ کی قدرت کے آثار ہی اس کی سمع و بصر و قدرت اور قوت میں پائے جاتے ہیں۔

(۶) علامہ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں گویا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرا مقرب بندہ کسی چیز کو سنتا نہیں اور کسی چیز کو دیکھتا نہیں اور کسی چیز کو پکڑتا نہیں اور کہیں چل کر جاتا نہیں مگر وہ یہ شہادت دیتا ہے کہ یہ سب رب تعالیٰ کے انعامات ہیں پھر وہ تمام اعضاء کو میری طاعت میں لگا لیتا ہے کسی عضو سے کوئی کام میری رضا کے بغیر نہیں لیتا۔ تو میں اس کے کان، آنکھ، ہاتھ اور پاؤں بن جاتا ہوں جن سے وہ سنتا، دیکھتا، پکڑتا اور چلتا ہے ”کما هو جلی عندائمة العرفان دون غیرهم“ جس طرح یہ مسئلہ صرف اہل معرفت پر ظاہر ہے ان کے بغیر اسے حقیقتہً کوئی نہیں سمجھ سکتا۔

وان سألنی لا عطینہ : اور اگر مجھ سے سوال کرے تو میں ضرور بر ضرور اسے عطاء کروں گا۔
نکتہ : یہاں ”ان“ سے کلام کو ذکر کیا جس سے اس طرف اشارہ کیا گیا ”قد یصل الی مقام
یترک فیہ السؤال اتکالا علی علمہ بالحال او لانه لا یطلب غیر الملک المتعال“
کہ اللہ کا مقرب بندہ کبھی اس مقام پر پہنچ جاتا ہے کہ وہ رب تعالیٰ سے سوال نہیں کرتا اس لئے کہ اسے

بھروسہ ہوتا ہے اس پر کہ جب وہ میرے حال کو جانتا ہے تو مجھے سوال کی ضرورت ہی کیا ہے وہ خود ہی مہربانی فرمائے گا۔

دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ ”ان مخففہ“ ہو جائے، تو مطلب یہ ہوگا کہ وہ سوال ہی جب مجھ سے کرتا ہے تو میں اسے ضرور بر ضرور اپنی رحمت عطاء کروں گا۔

ولئن استعاذنی لا عیذہ : اور اگر وہ مجھ سے پناہ پکڑے تو میں اسے ضرور پناہ دوں گا۔ یعنی اگر اللہ تعالیٰ کا مقرب بندہ کسی چیز سے دور رہنے کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعاء کرتا ہے رب تعالیٰ کی اس چیز سے پناہ طلب کرے تو رب تعالیٰ اسے ضرور بر ضرور پناہ دے گا۔

”وما ترددت عن شئی انا فاعلہ ترددی عن نفس المؤمن بکرہ

الموت وانا اکرہ مساءتہ ولا بدلہ منہ“

ان الفاظ مبارکہ کی وضاحت میں اہل علم کے مختلف قول ہیں کیونکہ ”وما ترددت“ کا ظاہری معنی مراد لینا ممکن نہیں تھا اس لئے تاویل کی ضرورت درپیش آئی، ابن حجر رحمہ اللہ نے فرمایا:

”التردد هو التحیر بین امرین لا یدری ایہما اصلح وهو محال علی

اللہ سبحانہ فاولوہ علی تردد بالاسباب والوسائط“

تردد کا معنی دو چیزوں کے درمیان حیران ہونا ہے یہ معلوم نہ ہو ان میں سے بہتر کیا ہے؟ یہ معنی اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق نہیں اسی وجہ سے اس کی تاویل یہ کی گئی ہے کہ اسباب و وسائط میں تردد پایا گیا ہے۔

”وقیل المراد من لفظ التردد ازالة کراهة الموت عن المؤمن بما

یتلیہ اللہ بہ من المرض والفاقة وغیرہما فاخذہ المؤمن عما تشبہ بہ

من حب الحیاة شینا فشینا بالاسباب التی ذکرنا یشبہ فعل المتردد

من حیث الصفة فعبر عنه بالتردد“

اور بیان کیا گیا ہے کہ لفظ تردد سے مراد مومن سے موت کے مکروہ سمجھنے کا زوال ہے جب کہ اللہ تعالیٰ مومن کو آزماتا ہے مرض اور فاقہ (بھوک) وغیرہ سے، مومن بھی چونکہ حیات کو پسند کرتا ہے اسی سے آہستہ آہستہ سہارا لگاتا ہے اسباب میں تردد کو فعل متردد سے بیان کر دیا گیا (راقم نے اسی کے مطابق ترجمہ کیا ہے) آسان مفہوم یہ ہے کہ مومن اگرچہ موت کو ناپسند کرتا ہے اور اس میں متردد ہوتا ہے کہ

کہیں مجھ پر موت نہ آ جائے لیکن میں اس کے تردد کو ناپسند سمجھتا ہوں اور اسے زائل کر دیتا ہوں۔
اعتراض : ” ان نفس الموت تحفة المؤمن یوصلہ الی لقاء اللہ فیکف یکرہ المؤمن “
 موت تو مومن کے لئے تحفہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی ملاقات کا ذریعہ ہے تو مومن کس طرح موت کو ناپسند کرتا ہے۔

جواب : ” المراد انہ یکرہ شدة الموت بمقتضى طبعه البشرى “

بعض اوقات انسان سے غیر ارادی طور پر بشری تقاضا کے مطابق کوئی نہ کوئی فعل سرزد ہوتا ہے
 موت بھی انسان کو بشری تقاضا کے مطابق تلخ معلوم ہوتی ہے ورنہ مومن خاص کر کے رب تعالیٰ کا
 مقرب بندہ کب چاہتا ہے کہ میری ملاقات رب ذوالجلال سے نہ ہو۔ اسلئے کہ مومن کی شان ہی یہ ہے
 ” فانہ لا ینبغی ان یکرہ الموت بل یحبہ فان من احب لقاء اللہ احب اللہ لقاءہ ومن
 کرہ لقاء اللہ کرہ اللہ لقاءہ “ کہ وہ موت کو ناپسند نہ کرے بلکہ موت سے محبت کرے جو شخص
 اللہ تعالیٰ کی ملاقات کو پسند کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس سے ملاقات کو پسند کرتا ہے اور جو شخص رب کو ملنا پسند
 نہیں کرتا رب بھی اس سے ملنا پسند نہیں کرتا۔

☆ ” عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ ﷺ ان للہ ملائکۃ یطوفون فی الطرق یلمسون
 اهل الذکر فاذا وجدوا قوما یدکرون اللہ تنادوا ہلموا الی حاجتکم قال فیحفونہم باجنحتہم
 الی السماء الدنیا قال فیسألہم ربہم وهو اعلم بہم ما یقول عبادی قال یقولون یسبحونک
 ویکبرونک ویحمدونک ویمجدونک قال فیقول هل رنونی قال فیقولون لا واللہ ما راوک
 قال فیقول کیف لو راونی قال فیقولون لو راوک کانوا اشد لک عبادۃ واشد لک تمجیدا
 واكثر لک تسیحا قال فیقول فما یسئلون قال یسألونک الجنة قال یقول وهل راوها فیقولون
 لا واللہ یا رب ما راوها قال یقول فکیف لو راوها قال یقولون لو انہم راوها کانوا اشد علیہا
 حرصا واشد لها طلبا واعظم فیہا رغبۃ قال فہم یتعذون قال یقولون من النار قال یقول فہل
 راوها قال یقولون لا واللہ یا رب ما راوها قال یقول فکیف لو راوها قال یقولون لو راوها کانوا
 اشد منها فرارا واشد لها مخافۃ قال فیقول فاشہدکم انی قد غفرت لہم قال یقول ملک من
 الملائکۃ فیہم فلان لیس منہم انما جاء لحاجة قال ہم الجلساء لا یشتی جلسہم “
 (رواہ البخاری)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ کے فرشتے راستوں میں پھرتے رہتے ہیں ذکر کرنے والوں کو تلاش کرتے رہتے ہیں جب وہ کسی قوم کو اللہ کا ذکر کرتے ہوئے پاتے ہیں تو ایک دوسرے کو پکارتے ہیں یہاں آ جاؤ تمہیں مقصد حاصل ہوگا نبی کریم ﷺ نے فرمایا وہ فرشتے آسمان دنیا تک ان کے اوپر پروں سے رحمت کا سایہ کر لیتے ہیں آپ نے فرمایا ان کا رب جاننے کے باوجود فرشتوں سے ان کے متعلق پوچھتا ہے میرے بندے کیا کہہ رہے تھے؟ آپ نے فرمایا وہ فرشتے کہتے ہیں وہ تیری تسبیح بیان کر رہے اور تیری تحمید کر رہے تھے اور تیری بزرگی بیان کر رہے تھے آپ نے فرمایا رب تعالیٰ کہتا ہے کیا انہوں نے مجھے دیکھا ہے؟ آپ فرماتے ہیں فرشتے کہتے ہیں قسم ہے اللہ تعالیٰ کی انہوں نے تجھے دیکھا تو نہیں، آپ فرماتے ہیں رب تعالیٰ کہتا ہے اگر وہ مجھے دیکھ لیتے؟ آپ فرماتے ہیں فرشتے کہتے ہیں اگر وہ تجھے دیکھ لیتے تو اور ہی زیادہ تیری عبادت کرتے، اور ہی زیادہ تیری بزرگی بیان کرتے، اور ہی زیادہ تیری تسبیح بیان کرتے، آپ فرماتے ہیں رب تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے وہ کسی چیز کا سوال کر رہے تھے؟ تو کہا کہ وہ جنت کا سوال کر رہے تھے حضور نے فرمایا اللہ تعالیٰ کہتا ہے کیا انہوں نے جنت کو دیکھا ہے؟ وہ کہتے ہیں قسم ہے اللہ کی اے ہمارے رب انہوں نے جنت کو نہیں دیکھا آپ فرماتے ہیں رب تعالیٰ فرمائے گا اگر وہ جنت کو دیکھ لیتے تو وہ کہتے ہیں اگر وہ جنت کو دیکھ لیتے تو اور حرص کرتے اور زیادہ اس کی طلب کرتے اور زیادہ اس میں رغبت کرتے رب تعالیٰ پوچھتا ہے وہ کس چیز سے پناہ طلب کر رہے تھے؟ آپ نے فرمایا وہ کہتے ہیں آگ سے پھر فرمایا رب کہتا ہے کیا انہوں نے آگ کو دیکھا ہے؟ فرشتے کہتے ہیں قسم ہے اللہ کی اے رب انہوں نے دیکھا تو نہیں، فرمایا رب کہتا ہے اگر وہ آگ کو دیکھ لیتے تو کیسے ہوتے؟ فرشتے کہتے ہیں اگر وہ دیکھ لیتے تو اور زیادہ اس سے دور بھاگتے اور زیادہ اس سے خوف رکھتے، فرمایا رب تعالیٰ کہتا ہے میں تمہیں گواہ بنا رہا ہوں کہ میں نے ان کی مغفرت کر دی، فرمایا ان فرشتوں میں سے ایک فرشتہ کہتا ہے فلاں شخص ان میں نہیں تھا (وہ ذکر کرنے کی غرض سے نہیں آیا تھا) وہ اپنے کام کے لئے آیا تھا۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے وہ ان کے ساتھ بیٹھا تو تھا میرا ذکر کرنے والے بندوں کے ساتھ بیٹھنے والا بد بخت نہیں ہو سکتا۔

حدیث پاک کا مفہوم ترجمہ سے ہی واضح ہے تاہم بعض الفاظ کو طلباء، کرام ذہن نشین کر لیں۔
 یلتمسون اہل الذکر: فرشتے ذکر کرنے والوں کو تلاش کرتے ہیں تاکہ ان کی زیارت کریں اور ان کے ذکر کو سنیں۔ ذکر سے مراد تسبیح، تکبیر، تحمید اور تمجید ہے جس کا ذکر آگے واضح طور پر آ رہا ہے۔ تنادوا، بعض بعض کو پکارتے ہیں ہلموا، جلدی آ جاؤ، الی حاجتکم، یعنی ذکر سننے اور ذکر کرنے والوں کی زیارت کے لئے۔ قال کاللفظ جہاں بھی ذکر ہے راقم نے ترجمہ کیا ”فرمایا“ اس کا فاعل نبی کریم ﷺ ہیں فیحفونہم باجنحتہم یعنی وہ ذکر کرنے والوں کے ارد گرد اپنے پروں کو پھیرتے ہیں قال ہم الجلساء لا یسقی جلیسہم رب تعالیٰ فرماتا ہے وہ کامل طور پر میرا ذکر کرنے والے ہیں ان کی محفل میں بیٹھنے والا ان کی برکات سے محروم نہیں رہ سکتا۔

”قال الطیبی ای ہم جلساء لا یخیب جلیسہم عن کرامتہم فیسقی“ علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ لوگ خالص میرا ذکر کرنے والے ہیں ان کے پاس بیٹھنے والا ان کی کرامات اور برکات سے محروم نہیں رہ سکتا کہ بد بخت ہی رہے۔

حدیث پاک میں ذکر والے حضرات کی محافل میں بیٹھنے کی رغبت دلائی گئی رب تعالیٰ نے بھی ارشاد فرمایا:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ﴾

”اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ ہو جاؤ“

فائدہ جلیلہ:

”قال بعض العارفين اصحبوا مع الله فان لم تقدروا فاصحبوا مع من يصحب مع الله“

عارفین حضرات فرماتے ہیں تم اللہ تعالیٰ کے مصاحب ہو جاؤ۔ اگر یہ قدرت تمہیں حاصل نہیں تو اللہ والوں کی محفل میں بیٹھوان کے فیوض و برکات کو حاصل کرو۔

تنبیہ: ”انہم زائدون علی الحفظۃ و غیرہم لا وظیفۃ لہم الا خلق الذکر“

یہ فرشتے کرانا کاتبین کے علاوہ ہوتے ہیں ان کی عبادت ہی یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بندوں کی ذکر کی محافل کو تلاش کریں اور اس میں شریک ہوں پھر رب تعالیٰ کے حضور جا کر اس کی خبر دیں۔

سوال عدم علم کی دلیل نہیں:

”فیسألہم اللہ وهو اعلم“ اللہ تعالیٰ جاننے کے باوجود اپنے بندوں کا حال فرشتوں سے پوچھتا ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسے علم نہیں ہوتا بلکہ رب تعالیٰ اپنے بندوں کی شان اپنے فرشتوں پر واضح کرتا ہے کہ میرے بندے کس شان سے میرا ذکر کر رہے ہیں۔

☆ ”عن ابی الدرداء قال قال رسول اللہ ﷺ الا انبئکم بخیر اعمالکم وازکاھا عند ملیکم وارفعھا فی درجاتکم وخیر لکم من انفاق الذهب والورق وخیر لکم من ان تلقوا عدوکم فتضربوا اعناقہم ویضربوا اعناقکم قالوا بلی قال ذکر اللہ“

(رواہ مالک و احمد و الترمذی و ابن ماجہ الا ان مالک وقفہ علی اسی الدرداء)

حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا میں تمہیں بہتر عمل اور تمہارے حاکم (اللہ تعالیٰ) کے پاکیزہ عمل اور تمہارے درجات کے بلند کرنے والا عمل اور تمہارا سونا اور چاندی خرچ کرنے سے بہتر عمل اور تمہاری دشمن سے ملاقات کہ تم ان کی گردنیں اڑاؤ اور وہ تمہاری گردنیں اڑائیں اس سے بہتر عمل کی خبر نہ دوں؟ صحابہ کرام نے عرض کیا ہاں یا رسول اللہ آپ خبر دیں آپ نے فرمایا وہ عمل اللہ تعالیٰ کا ذکر ہے۔

وضاحت حدیث: اس حدیث کی وضاحت میں ابن الملک رحمہ اللہ نے فرمایا ”المراد الذکر القلبی“ کہ جس ذکر کی تعریف رسول اللہ ﷺ نے فرمائی اس سے مراد ”دل کا ذکر ہے“ کیونکہ اسی ذکر کو مال اور جان کے قربان کرنے سے زیادہ فضیلت حاصل ہے کیونکہ یہ نفس کا عمل ہے ”وفعل القلب الذی ہو اشق من عمل الجوارح بل هو الجہاد الاکبر“ اور دل کا عمل ہی ظاہری اعضاء کے عمل سے زیادہ شاق ہے بلکہ جہاد اکبر سے بھی زیادہ شاق ہے۔ لیکن اس کے بعد ذکر لسانی (زبانی ذکر) کے متعلق جو الفاظ آپ نے ذکر فرمائے ان کو علامہ علی قاری رحمہ اللہ نے پسند نہیں فرمایا۔ ابن الملک رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”لا الذکر باللسان المشتمل علی صیاح وانز عاج وشدة تحریک العنق واعوجاج کما یفعلہ بعض الناس زاعمین ان ذلک جالب للحضور وموجب للسرور حاشا للہ بل موجب للغیبة والغرور“

جس ذکر کی تعریف نبی کریم ﷺ نے فرمائی اس سے زبانی ذکر جو بلند آواز سے کیا جائے جس میں زور زور سے چلایا جائے گردن کو پھیرا جائے مراد نہیں جیسا کہ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ رب تعالیٰ کے ہاں حضوری کا سبب ہے اور اس سے سرور حاصل ہوتا ہے ”حاشا للہ“ خدا را ایسا نہیں بلکہ یہ تو رب سے دوری اور دھوکا کا سبب ہے۔ علامہ علی قاری رحمہ اللہ اس کا رد فرماتے ہیں:

”ولا شک ان الذکر یطلق علی الجنانی وعلی اللسانی وان المدار علی القلب الذی یتقلب بسبب ذکر المذکور من الغیبة الی الحضور وانما اللفظی وسیلة“

یہ شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ ذکر کا اطلاق دل اور زبان کے دونوں ذکروں پر ہے قلب کا مطلب ہی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر دل کو پھیر دے اور رب تعالیٰ سے دوری کو قریب کر دے یہ کیفیت اسی وقت حاصل ہوگی جب پہلے زبانی ذکر حاصل ہوگا کیونکہ ہر وہ چیز جو مقصد تک پہنچنے کا ذریعہ ہے اسے پہلے حاصل کرنا ضروری ہے خصوصاً راہ سلوک میں ابتدائی طور پر قدم رکھنے والا پہلے زبانی ذکر ہی کرے گا پھر ذکر اور اہل ذکر کی برکات کی وجہ سے قلبی ذکر اسے خود بخود حاصل ہو جائے گا۔

تنبیہ: اصل میں دل سے رب تعالیٰ کو یاد کرنے کی وجہ سے ہی انسان رب تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کرتا ہے اور جہاد کرتا ہے اس لئے قلبی ذکر درحقیقت تمام عبادات کا ذریعہ ہے اور باقی عبادات اس پر موقوف ہیں اس لئے یہ ان سے اعلیٰ اور ارفع ہے اور یہ بھی واضح بات ہے کہ عبادات میں اصل مقصود تقرب الہی ہے ”والذکر انما هو المقصود الاسنی والمطلوب الاعلیٰ“ اور اس میں ذکر اعلیٰ مقصود اور اعلیٰ مطلوب ہے۔

رب تعالیٰ کا ارشاد ﴿فَاذْكُرُونِي اَذْكُرْكُمْ﴾ ”تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد کروں گا“ اور حدیث قدسی میں ارشاد باری تعالیٰ ہے ”وانا جلیس من ذکرنی“ جو مجھے یاد کرے میں اس کے ساتھ ہی ہوتا ہوں۔

اور رب تعالیٰ کا ارشاد حدیث قدسی میں ہے ”وانا معہ اذا ذکرنی“ اس شخص کو میری معیت (قربت) حاصل ہوتی ہے جو مجھے یاد کرتا ہے۔

افضل الذکر : ” فان قراءة القرآن من كل ذكر افضل ومن جملة الاذکار والادعية والاستغفار “

بیشک قرآن پاک کا پڑھنا ہر قسم کے ذکر سے افضل ہے تمام اذکار، تمام دعاؤں اور ہر قسم کی استغفار سے افضل ہے۔

” وفيه دليل على الاجتماع على الذكر مزية ومرتبة “ ذکر کی محافل قائم کرنا جمع ہو کر ذکر کرنا افضل و اعلیٰ ہے۔ (مرقاۃ ج ۵ ص ۵۶)

” لا ارياب ان افضل الذكر قول لا اله الا الله وهي القاعدة التي بني عليها اركان الدين وهي الكلمة العليا وهي القطب الذي يدور عليها رحي الاسلام وهي الشعبة التي اعلى شعب الايمان “ (مرقاۃ ج ۵ ص ۶۳)

اس میں کوئی شک نہیں افضل ذکر کلمہ ” لا اله الا الله “ ہے کیونکہ یہ دین کے ارکان کی بنیاد ہے یہی بلند مرتبہ کلمہ ہے اور یہی قطب (چکی کا کیل) ہے جس پر اسلام کی چکی چلتی ہے یہی ایمان کے شعبوں سے اعلیٰ شعبہ ہے۔ تمام عارفین اور ارباب قلوب و یقین اسی کلمہ کو تمام اذکار پر ترجیح دیتے رہے ان کو اسی طریقہ سے وجدان اور ذوق حاصل ہوتا رہا۔

حکایت : سید علی بن میمون مغربی کے ایک مدرس اور مفتی شیخ علوان حموی مرید ہوئے اور ان کے زیر تصرف آئے تو انہوں نے اپنے اس مرید کو تمام کام چھڑا کر ذکر باری تعالیٰ پر لگا دیا۔

” فطعن الجہال فیہ بانہ اضل شیخ الاسلام ومنعہ عن نفع الانام “ عام جاہل لوگوں نے اس پر طعنہ زنی شروع کی کہ شیخ نے مفتی کو راہ راست سے بھٹکا دیا ہے وہ جو لوگوں کو نفع پہنچا رہے تعلیم و افتاء سے اسے دور کر دیا۔ پھر شیخ کو معلوم ہوا کہ مفتی صاحب کبھی کبھی قرآن پاک کی تلاوت کرتے ہیں شیخ نے قرآن پاک پڑھنے کی بجائے ذکر کرنے کا ہی حکم دیا ” فقال الناس انه زنديق يمنع من تلاوة القرآن الذي هو قطب الايمان وغوث الايقان “ لوگوں نے کہا شیخ بے دین ہو گیا جو قرآن پاک کی تلاوت سے منع کرتا ہے وہ قرآن جو ایمان کا قطب ہے اور یقین کا غوث ہے۔

لیکن مرید جو مفتی اور مدرس بھی تھے وہ اپنے شیخ کی بات کو تسلیم کرتے رہے یہاں تک کہ

”حصل له المزيد وانجلت مرآة قلبه وحصل له مشاهدة ربه“ انہیں زیادہ رب تعالیٰ کا فضل و کرم حاصل ہو گیا ان کے دل کا آئینہ روشن ہو گیا، اور ان کو رب تعالیٰ کی تجلیات کا مشاہدہ حاصل ہو گیا۔ اب شیخ نے ان کو قرآن پاک پڑھنے کی اجازت دے دی:

” فلما فتح المصحف فتح عليه الفتوحات الازلية والابدية وظهر له كنوز المعارف والعوارف الظاهرية والباطنية“

جب انہوں نے قرآن پاک کو کھولا تو ان پر ازلی اور ابدی فتوحات کھل گئیں اور ظاہری اور باطنی معرفت کے خزانے ان پر ظاہر ہو گئے۔ اب شیخ نے بتایا کہ میں نے قرآن پاک کی تلاوت سے منع نہیں کیا تھا ”وانما كنت امنعك عن لقلقة اللسان والغفلة عما فيه من البيان في هذا الشأن والله المستعان“ میں اس لئے منع کرتا تھا کہ صرف زبان چلتی رہے قرآن پاک کے رموز سے انسان بے خبر رہے کہ قرآن پاک کی شان کیا ہے یہ نفع مند نہیں بلکہ ذکر الہی سے دل کو آئینہ کی طرح صاف کر کے رب تعالیٰ سے امداد طلب کرے۔

راقم کا موقف: راقم کے نزدیک درود شریف پڑھنا سب سے افضل ذکر ہے کیونکہ ذکر خدا بھی ہے اور ذکر مصطفیٰ بھی ہے اور دعاء بھی ہے۔ درود شریف کے فضائل تو اپنی جگہ پر آئیں گے ایک حدیث پاک کو دیکھئے تو راقم کی عقیدت سے آپ کو اتفاق نہ بھی ہو تو طعنہ زنی کی گنجائش بھی آپ کو نہیں مل سکے گی۔

☆ ”عن ابی بن کعب قال قلت یا رسول اللہ انی اکثر الصلوة علیک فکم اجعل لک من صلاتی فقال ما شئت قلت الربع قال ما شئت فان زدت فهو خیر لک قلت النصف قال ما شئت فان زدت فهو خیر لک قلت فالثلثین قال ما شئت فان زدت فهو خیر لک قلت اجعل لک صلاتی کلها قال اذا تکفی همک ویکفر لک ذنبک“

(رواہ الترمذی)

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نے عرض کی کہ یا رسول اللہ بیشک میں آپ پر زیادہ سے زیادہ درود شریف پڑھنے کا ارادہ رکھتا ہوں تو میں اپنے درود شریف پڑھنے میں کتنا وقت صرف کروں؟ تو آپ نے فرمایا جتنا وقت چاہتے ہو اتنا ہی صرف کرو۔ میں نے عرض کیا کیا (اپنے اذکار

وغیرہ کے اوقات سے) چوتھا حصہ وقت صرف کر لیا کروں؟ آپ نے فرمایا جو چاہتے ہو اگر زیادہ کر لو تو تمہارے لئے بہتر ہے میں نے عرض کیا آدھا وقت صرف کر لیا کروں؟ آپ نے فرمایا جو چاہتے ہو اگر زیادہ کر لو تو تمہارے لئے بہتر ہے میں نے عرض کیا دو تہائی وقت صرف کر لیا کروں؟ آپ نے فرمایا جتنا وقت چاہو صرف کر لو اگر اس سے بھی تم زیادہ کر لو تو تمہارے لئے بہتر ہے میں نے عرض کیا میں آپ پر درود تمام اوقات میں پڑھ لیا کروں؟ آپ نے فرمایا یہ تمہارے ارادہ کے لئے کافی ہے اور تمہارے گناہوں کو مٹا دے گا۔

(مشکوٰۃ باب الصلوٰۃ علی النبی ﷺ)

مختصر وضاحت: ”معنی الحدیث کم اجعل لک من دعائی الذی ادعو بہ

لنفسی ولم یزل یفاوضہ لیوقفہ علی حد من ذلک ولم یر النبی ﷺ ان یجد لہ ذلک لئلا تلبس الفضیلة بالفریضة اولا ثم لا یغلق علیہ باب المزید ثانیاً“

جب صحابی نے پوچھا کہ میں اپنی دعاؤں اور اذکار میں سے کتنا وقت آپ پر درود شریف پڑھوں وہ وقت کا تعین چاہتے تھے لیکن نبی کریم ﷺ نے وقت کا تعین نہیں فرمایا کہ صرف کچھ وقت کے لئے درود پاک معین اور فرض نہ ہو جائے۔ بلکہ آپ رغبت دلاتے رہے یہاں تک کہ صحابی کو دعاؤں اور اذکار کے تمام اوقات درود شریف پڑھنے کا حکم دیا جب صحابی نے آپ پر تمام اوقات درود شریف پڑھنے کے متعلق عرض کی تو آپ نے ارشاد فرمایا:

(اذن تکفی ہمک) ای ما اہمک من امر دینک ودنیاک وذلک لان الصلوٰۃ علیہ مشتملہ علی ذکر اللہ وتعظیم الرسول ﷺ والاشتغال باداء حقہ عن اداء مقاصد نفسہ وایثارہ بالدعاء علی نفسہ ما اعظمہ من خلال جلیلة الاخطار واعمال کریمۃ الآثار“

کہ اگر تم اپنی دعاء اور ذکر کے تمام اوقات درود شریف مجھ پر پڑھو گے تو تمہیں تمہارے دین اور دنیا کے امور کے ارادوں کے لئے کافی ہے وجہ درحقیقت اس کی یہ ہے کہ درود پاک اللہ تعالیٰ کے ذکر اور رسول اللہ ﷺ کی تعظیم اور آپ کے حقوق کو اداء کرنے میں مشغول ہونا اور انسان کا اپنے حقوق کو اداء کرنے میں مشغول ہونا اور اپنے لئے دعاء کرنے کی بجائے عظیم الشان ذکر میں مشغول ہونا ہے اور اعلیٰ آثار مرتب ہونے والے اعمال میں مشغول ہونا ہے۔

(مرقاۃ ج ۲ ص ۳۳۳)

سبحان اللہ کیا خوب ذکر ہے کیا شاندار کسی نے اپنا عقیدہ بیان کیا وہی راقم کا بھی عقیدہ ہے۔

میں سو جاؤں یا مصطفیٰ کہتے کہتے کھلے آنکھ صل علی محمد کہتے کہتے

☆ "عن عبد الله بن بسر قال جاء اعرابي الى النبي ﷺ فقال اي الناس خير قال طوبى لمن طال عمره وحسن عمله قال يا رسول الله اي الا عمال افضل قال ان تفارق الدنيا ولسانك رطب من ذكر الله"

(روہ احمد والترمذی)

حضرت عبد اللہ بن بسر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ایک اعرابی نبی کریم ﷺ کے پاس آئے تو اس نے عرض کی تمام لوگوں سے بہتر کون شخص ہے؟ آپ نے فرمایا وہ شخص اچھا ہے جس کی عمر زیادہ لمبی ہو اور اعمال اچھے ہوں پھر وہ اعرابی عرض کرنے لگے یا رسول اللہ عمل کون سے افضل ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ دنیا سے جاؤ تو تمہاری زبان اللہ کے ذکر سے تر ہو۔

وضاحت حدیث: (ای الناس خیر) ای افضل حالا واطیب مالا "لوگوں میں سے کون سا شخص وہ ہے جس کا حال افضل ہو اور پاکیزہ مال والا ہو؟ آپ نے فرمایا "طوبی لمن طال عمره وحسن عمله" اس مقام میں "طوبی" ذکر فرمایا جو "الطیب" سے ماخوذ ہے فعلی کا وزن ہے، اس سے مراد اس شخص کی تعریف ہے، اور دونوں جہانوں میں اس کے اچھے حال کا ذکر فرمایا اور اس سے مراد جنت کا درخت طوبی بھی ہو سکتا ہے اور جنت میں بھلائی کا حصول بھی ہو سکتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے خبر دی، بیان فرمایا کہ لوگوں میں سے اچھے کون لوگ ہیں؟ وہ لوگ ہیں جن کی عمر لمبی ہو اور اعمال اچھے ہوں "اور" طوبی "ذکر فرما کر ان کیلئے سعادت دارین کی خبر بھی دے دی۔ پھر جب رسول اللہ ﷺ نے خبر دی کہ اچھے اعمال میں سے اچھا اور بہتر عمل یہ ہے کہ تم دنیا سے جا رہے ہو تو تمہاری زبان اللہ کے ذکر سے تر ہو، اس ذکر سے مراد کون سا ذکر ہے؟

"والذكر يشمل الجلی والخفی واللسان یحتمل القلبی والقالبی ولا

منع من الجمع بل هو ادعی الی مقام الجمع"

ذکر جلی اور خفی دونوں کو شامل ہے کیونکہ حدیث شریف میں "لسانک" استعمال ہے جس سے مراد لسان قلبی (دل کی زبان) اور لسان قلبی (جسم کی زبان) دونوں ہی مراد ہو سکتے ہیں دونوں ذکر جمع کرنے میں کوئی ممانعت نہیں بلکہ زیادہ بہتر یہی ہے کہ حدیث شریف میں دونوں ذکر کو جمع

کرنا ہی مراد ہے۔

اور حدیث پاک سے یہ فائدہ حاصل ہوا ”افضل الاعمال ما یختم به الاحوال“ افضل اعمال یہ ہیں کہ انسان کا خاتمہ بالخیر ہو۔

فائدہ جلیلہ: فارق الدنیا سے مراد ”زهد الدنیا“ بھی ہو سکتا ہے اور ”رطب اللسان“ سے مراد اللہ تعالیٰ کا دل سے ذکر کرنا ہے ”فان الاناء یترشح بما فیہ ومن احب شیاً اکثر ذکرہ بفیہ“ یہ یقینی بات ہے جو چیز برتن میں ہوتی ہے وہی ٹپکتی ہے جس سے محبت ہو اسی کا انسان اپنے منہ سے بھی ذکر کرتا ہے۔

سبحان اللہ کیا خوب مسئلہ حاصل ہوا کہ جس کے دل میں نور معرفت ہو گا وہ رسول اللہ ﷺ کے فضائل بیان کرے گا۔ اور جس کے دل میں کدورت ہوگی وہ (معاذ اللہ) نقائص بیان کرے گا۔

ذرا غور کریں وہ شخص خوش قسمت ہے جو اپنی تمام عمر اپنے پیارے حبیب پاک ﷺ کے کمالات و فضائل تلاش کرنے اور بیان کرنے میں گزار دے یا وہ شخص جو اپنی عمر نبی کریم ﷺ کے کمالات اور فضائل کو کم کرنے کی تلاش میں رہے، نقائص بیان کرنے میں عمر گزار دے، یہ فیصلہ قارئین کرام خود فرمائیں۔ علامہ طیبی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ ”رطب اللسان“ سے مراد سہولت سے ادا کرنا۔ جس طرح ”یس اللسان“ کا معنی اس کی ضد ہے یعنی مشکل سے ادا کرنا۔

اب معنی یہ ہوگا ”افضل الذکر مداومۃ الذکر فان الذکر هو المقصود وسائر الاعمال وسائل الیہ“ کہ افضل ذکر وہ ہے جو ہمیشگی سے جاری رکھے بیشک ذکر ہی مقصود ہے بلکہ تمام اعمال ذکر کے وسائل ہی ہیں کیونکہ مقصد عظیم اللہ تعالیٰ کو یاد کرنا ہی ہے۔

ابن حبان، طبرانی اور بزار نے روایت حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے ذکر فرمائی کہ آپ کو جب نبی کریم ﷺ نے یمن کا حاکم بنا کر بھیجا تو یہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے جدا ہوتے وقت سوال کیا ”ای الاعمال احب الی اللہ قال ان تموت ولسانک رطب من ذکر اللہ“ اللہ تعالیٰ کو کون سے عمل زیادہ پسند ہیں؟ تو آپ نے فرمایا کہ تمہاری موت اس حال میں آئے کہ تمہاری زبان اللہ تعالیٰ کے ذکر سے تر ہو۔ طبرانی میں یہ الفاظ بھی زائد ہیں۔

”قلت یا رسول اللہ اوصنی قال علیک بتقوی اللہ ما استطعت واذکر اللہ عند کل حجر و شجر و ما عملت من سوء فاحذر للہ فیہ توبۃ السر بالسر و العلانیۃ بالعلانیۃ“

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں میں نے عرض کیا یا رسول اللہ مجھے نصیحت فرمائیں آپ نے فرمایا جب تک تم طاقت رکھو اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو (تقوی رکھو) اور ہر شجر و حجر کے پاس اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو اور تم سے اگر کوئی غلطی ہو جائے تو اللہ تعالیٰ سے توبہ کرو، پوشیدہ طور پر غلطی ہو تو پوشیدہ طور پر توبہ کرو اور اگر ظاہر طور پر کوئی غلطی سرزد ہو تو ظاہر طور پر ہی اللہ تعالیٰ سے توبہ کرو۔

☆ ”عن انس قال قال رسول اللہ ﷺ اذا مررتم برباض الجنة فارتعوا قالوا وما رباض الجنة قال خلق الذکر“ (رواہ الترمذی)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تمہارا جنت کے باغات سے گزر ہو تو ان سے نفع حاصل کر لیا کرو صحابہ کرام نے عرض کیا وہ جنت کے باغات کیا ہیں؟ تو آپ نے فرمایا ذکر کے حلقے۔

وضاحت حدیث: ”خلق“ (بکسر الہاء وفتح اللام) جمع ہے حلقہ کی، ذکر کے حلقوں کو جنت کے باغات کہا گیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ذکر جنت میں پہنچانے کا ذریعہ ہے۔

”حاصل المعنی اذا مررتم بجماعة یذکرون اللہ تعالیٰ فاذکروہ انتم موافقة لهم فانهم فی رباض الجنة“ مطلب یہ ہے کہ جب تمہارا اس جماعت سے گزر ہو جو اللہ تعالیٰ کا ذکر کر رہے ہوں تو تم بھی ان کے ساتھ مل کر اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو کیونکہ وہ جنت کے باغات میں ہیں

علامہ نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ”واعلم انه کما یستحب الذکر یستحب الجلوس فی خلق اہلہ“ یہ بات یقین سے جان لو کہ جس طرح ذکر کرنا مستحب ہے اسی طرح ذکر کے حلقوں میں بیٹھنا بھی مستحب ہے۔

”وهو قد یكون بالقلب وقد یكون باللسان وافضل منهما ما کان بالقلب واللسان جمیعا“ ذکر کبھی دل سے ہوتا ہے اور کبھی زبان سے ہوتا ہے لیکن افضل ذکر وہ ہے جو دل سے بھی ہو اور زبان سے بھی ہو۔

اگر دل سے ذکر حاصل نہیں تو زبان سے ذکر کو نہ چھوڑے۔ پہلے ذکر ہو چکا ہے تاہم مراقبہ کے حوالہ کو بھی ذہن نشین کر لیں۔

مریدین میں سے کسی نے اپنے شیخ کی خدمت میں عرض کیا ”انا اذکر اللہ وقلبی غافل“ میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتا ہوں لیکن میرا دل غافل رہتا ہے“ شیخ نے ارشاد فرمایا ”اذکرو اشکر ان شغل اعضا منک بذکرہ واسأله ان يحضر قلبک“ اللہ کا ذکر کرتے رہو اور رب تعالیٰ کا شکر یہ ادا کرو کہ اس نے آپ کے ایک عضو (یعنی زبان) کو اپنے ذکر میں مشغول رکھا ہوا ہے اور اس سے اپنے دل کے حضور کی بھی دعاء کرتے رہو۔

ایک اور حدیث حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوع طور پر مروی ہے:

”اذ امرتکم برياض الجنة فارتعوا قلت وما رياض الجنة قال
المساجد قلت وما الرتع يا رسول الله قال سبحان الله والحمد لله ولا
اله الا الله والله اكبر“

جب تمہارا جنت کے باغات سے گزر رہو تو وہاں سے نفع حاصل کر لیا کرو میں نے عرض کی وہ جنت کے باغات کیا ہیں؟ آپ نے فرمایا وہ مساجد ہیں میں نے عرض کی ان میں نفع مند چیزیں کیا ہیں؟ آپ نے فرمایا ”سبحان اللہ والحمد للہ ولا الہ الا اللہ واللہ اکبر“

☆ ”عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ ﷺ من قعد مقعدا لم يذكر اللہ فیہ کانت علیہ من اللہ ترة ومن اضطجع مضجعا لا يذكر اللہ فیہ کانت علیہ من اللہ ترة“

(رواہ ابو داؤد)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص کسی بیٹھنے کی جگہ پر بیٹھتا ہے اللہ کا ذکر نہیں کرتا اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے خسار ہے اور جو شخص کسی لیٹنے کی جگہ میں لیٹے ہوئے اللہ تعالیٰ کا ذکر نہیں کرتا ہے اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نقصان ہے۔

وضاحت حدیث: ”مقعدا“ کا معنی ”مجلسا او قعودا“ یعنی یا طرف ہے معنی بیٹھنے کی جگہ یا مصدر ہے معنی اس کا بیٹھنا ہے۔

”لم يذكر اللہ فیہ“ لفظ فیہ میں ضمیر کا مرجع ”مقعدا“ ہی ہے یعنی مجلس یا بیٹھنے میں اللہ تعالیٰ کا ذکر نہ کیا۔

علیہ، ای علی القاعد بیٹھنے والے پر۔ ”من اللہ ای من جهة حکمہ وامرہ وقضائہ وقدرہ“ اللہ تعالیٰ کے حکم اور اس کے امر اور اس کی قضاء و قدر سے۔

ترة، مصدر ہے ”عدة“ کی طرح اصل مادہ و تریتر ہے اور اس کا معنی ہے ”تبعہ و معاتبہ او نقصان و حسرة“ پیچھا کرنا، عتاب کرنا، نقصان دینا، حسرت و ندامت۔

جس طرح کہا جاتا ہے ”وترحقہ“ اس نے اپنے حق کو نقصان پہنچایا جو حسرت کا سبب ہے۔ اسی معنی کے مطابق رب تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَلَنْ يَتْرُكُكُمْ اَعْمَالُكُمْ﴾ ”اور وہ ہرگز تمہیں تمہارے اعمال میں نقصان نہیں دے گا“ (سورۃ محمد ۲۵) حدیث شریف کا مطلب واضح ہے کہ انسان بیٹھتے اور سوتے وقت جب اللہ تعالیٰ کو یاد نہ کرے وہ رب تعالیٰ کے انعام و اکرام سے محروم رہ کر خسارہ میں رہتا ہے۔

☆ ”عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ ﷺ ما من قوم یقومون من مجلس لا یذكرون اللہ فیہ الا قاموا عن مثل جیفۃ الحمار وکان علیہم حسرة“ (رواہ احمد و ابو داؤد) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کوئی ایسی قوم نہیں جو کسی مجلس سے اللہ تعالیٰ کے ذکر کے بغیر ہی اٹھ پڑیں سوائے اس کے کہ وہ مردار گدھے کی مثل سے اٹھے اور ان پر حسرت و ندامت ہے۔

وضاحت حدیث: قیام کے بعد ”عن“ آئے تو تجاوز اور دوری کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اس لئے ”قاموا عن مثل جیفۃ الحمار“ کا معنی یہ ہے:

”لا یوجد منهم قیام عن مجلسهم الا کقیام المتفرقین عن اکل الجیفۃ التی ہی غایۃ فی القدر والنجاسة“

جو لوگ کسی محفل سے بغیر اللہ تعالیٰ کے ذکر کے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں وہ ایسے ہی ہیں جیسے مردہ گدھے کا گوشت کھا کر اٹھ پڑیں جو نہایت گندہ اور نجس ہوتا ہے۔

”وقال ابن الملک وتخصیص جیفۃ الحمار بالذکر لانه ادون

الجیف من بین الحيوانات التی تخالطنا، او لکونه ابلد الحيوانات او

لکونه مخالطاً للشیطان ولہذا یتعوز نہیقہ بالرحمن“

ابن الملک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مردہ گدھے کا ذکر خصوصی طور پر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ بانی حیوانوں کی بنسبت گھٹیا جانور ہے اور اسی لئے اس کا مردار ہونا بھی گھٹیا ہے اور یہ تمام حیوانوں سے بے وقوف بھی ہے اور یہ وجہ بھی ہے کہ یہ شیطان سے ملتا ہے اسی لئے اس کے ہینگنے پر اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگنے کا حکم دیا گیا۔

یہی حدیث جس کی وضاحت ذکر کی جا رہی ہے۔ اسی مضمون کی حدیث نسائی اور ابن حبان نے بھی بیان فرمائی وہ اس طرح ہے:

”ما من قوم جلسوا مجلسا وتفرقوا منه ولم يذكروا الله فيه الا كانما تفرقوا عن جيفة حمار و كان عليهم حسرة يوم القيامة وما مشى احد ممشى لم يذكر الله فيه الا كان عليه ترة وما اوى احد الى فراشه ولم يذكر الله فيه الا كان عليه ترة“

کوئی قوم ایسی نہیں جو کسی مجلس میں بیٹھیں اور اس سے متفرق ہوں کہ اس میں انہوں نے اللہ تعالیٰ کا ذکر نہ کیا ہو مگر یہ کہ وہ ایسے ہی ہیں جیسے مردار گدھے سے متفرق ہوئے ہوں اور ان پر قیامت کے دن حسرت ہے اور جو شخص چلتے ہوئے اللہ تعالیٰ کا ذکر نہ کرے وہ نہیں سوائے نقصان اٹھانے والوں کے۔ اور جو شخص اپنے بستر پر آرام کرے اور اللہ کا ذکر نہ کرے وہ نہیں سوائے نقصان اٹھانے والوں کے۔

☆ ”وعن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ ﷺ ما جلس قوم مجلسا لم يذكروا الله فيه ولم يصلوا على نبيهم الا كان عليهم ترة فان شاء عذبهم وان شاء غفر لهم“

(رواہ الترمذی)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کوئی قوم کسی مجلس میں نہیں بیٹھتی کہ اس میں وہ اللہ تعالیٰ کا ذکر نہ کریں اور اپنے نبی (ﷺ) پر درود نہ پڑھیں مگر یہ کہ وہ خسارہ میں ہوتے ہیں، پس اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو ان کو عذاب دے اور چاہے تو ان کی مغفرت فرمائے۔

حدیث شریف کا مضمون بہت واضح ہے کہ ہر مجلس میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا جائے اور نبی کریم ﷺ پر درود شریف پڑھا جائے اگر مجلس اللہ تعالیٰ کے ذکر اور اس کے حبیب پاک ﷺ پر درود شریف پڑھنے سے خالی ہو تو وہ بے برکت اور باعث نقصان ہوتی ہے۔ ایسی محفل والوں کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے بخشش کا کوئی وعدہ نہیں ہوتا بلکہ رب تعالیٰ کی مشیت پر موقوف ہے چاہے تو ان کو عذاب دے اور

چاہے تو ان کی مغفرت فرمائے۔

☆ "عن ام حبیبة قالت قال رسول الله ﷺ كل كلام ابن آدم عليه لا له الا امر

بمعروف او نهی عن المنکر او ذکر الله" (رواه الترمذی وابن ماجه وقال الترمذی هذا حدیث غریب)

حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ابن آدم کا ہر کلام بے فائدہ ہے، اس کا اسے کوئی فائدہ نہیں سوائے، امر بالمعروف کے یا نہی عن المنکر یا اللہ کے ذکر کے۔

وضاحت حدیث: علی، ضرر کے لئے آتا ہے اور "لام" نفع کے لئے آتا ہے حدیث شریف میں "كل كلام ابن آدم عليه لا له" کا ظاہری معنی تو یہ ہے کہ ابن آدم (آدمی) کا ہر کلام اس کے لئے نقصان دہ ہے نفع مند نہیں۔

حدیث پاک کا یہ ظاہری معنی تو مراد ہو نہیں سکتا، کیونکہ انسان ہر وقت کلام کا محتاج ہے کتنے کلام وہ ہیں جو مباح ہیں ان تین کے علاوہ ہیں جو اس حدیث میں مذکور ہیں تو یہ کس طرح درست ہے؟

تو اس کا جواب یہ ہے "كل كلام ابن آدم حسرة عليه لا منفعة له فيه الا المذكورات وامثالها" کہ حدیث پاک سے مراد یہ ہے کہ انسان کو ہر کلام پر حسرت ہوگی کوئی فائدہ نہیں ہوگا سوائے ان تین کلاموں کے جن کا ذکر حدیث پاک میں ہے اور اسی طرح کا اور کلام جو خیر پر مبنی ہو۔ یہ حدیث پاک دراصل قرآن پاک کی اس آیت کا اقتباس ہے:

﴿لَا خَيْرَ فِي كَثِيرٍ مِّنْ نُّجْوَاهُمْ إِلَّا مَنْ أَمَرَ بِصَدَقَةٍ أَوْ مَعْرُوفٍ أَوْ إِصْلَاحٍ بَيْنَ النَّاسِ﴾
 "ان کے اکثر مشوروں میں کچھ بھلائی نہیں مگر جو حکم دے خیرات یا اچھی بات یا لوگوں میں صلح کرنے کا"

(النساء ۱۱۳)

یہ مسئلہ واضح ہو گیا کہ اس حدیث میں مفید کلام اور غیر مفید کلام کا ذکر ہے نقصان دہ اور نفع مند کا ذکر نہیں۔

امر بالمعروف: "مما فيه نفع الغير من الاوامر الشريعة"

امر بالمعروف سے مراد یہ ہے کہ وہ کلام جس میں غیر کا نفع ہو وہ یہ ہے کہ شریعت کے احکام کا حکم دے کہ لوگ ان پر عمل کر کے نجات حاصل کر سکیں۔

نہی عن منکر: "مما فيه موعظة النخلق من الامور المنهية"

یعنی نہی عن منکر سے مراد یہ ہے کہ مخلوق کو برے کاموں سے روکنے کی نصیحت کریں کہ

لوگ ان سے اجتناب کر کے رب تعالیٰ کا تقرب حاصل کر لیں۔

ذکر اللہ : ”ای ما فیہ رضاء اللہ من الاذکار الالہیۃ کالتلاوة والصلوة علی النبی ﷺ والتسبیح والتہلیل والدعاء للوالدین وما اشبه ذلک“

اللہ کے ذکر سے مراد وہ ذکر ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی رضاء پائی جائے، وہ اذکار الہیہ عام ہیں۔ تلاوت قرآن پاک ہو نبی کریم ﷺ پر درود شریف پڑھا جائے اور تسبیح (سبحان اللہ) پڑھنا اور تہلیل (لا الہ الا اللہ) پڑھنا اور والدین کے لئے دعاء کرنا اور اس کے مشابہ تمام قسم کے اوراد اور وظائف۔

حضرت علامہ قاری رحمہ اللہ نے کیا خوب مسئلہ حل کر دیا کہ والدین کے لئے دعاء کرنا بھی اللہ کا ذکر ہے اور لطف کی بات یہ ہے کہ اس کے ساتھ ”فی الحیاة“ کی قید نہیں لگائی بلکہ مطلق حکم بیان کیا جس سے واضح ہو رہا ہے کہ والدین کے لئے دعاء کرنا ان کی زندگی میں اور ان کی وفات کے بعد اللہ تعالیٰ کا ذکر ہی ہے۔

”وما اشبه ذلک“ سے اور واضح ہو رہا ہے کہ تمام مسلمان اقرباء کے لئے بلکہ تمام مسلمانوں کے لئے ان کی زندگی میں اور ان کی موت کے بعد دعاء کرنا اللہ تعالیٰ کا ذکر ہے، جب اللہ تعالیٰ کا ذکر انسان کے لئے نفع مند ہے اور اللہ تعالیٰ کو پسند ہے تو یقیناً والدین کے لئے اور دوسرے اقرباء اور مسلمانوں کے لئے دعاء کرنا نفع مند بھی ہے اور رب تعالیٰ کو پسند بھی ہے۔

☆ ”وعن ابن عمر قال قال رسول اللہ ﷺ لا تکثروا الکلام بغیر ذکر اللہ فان کثرة الکلام بغیر ذکر اللہ قسوة للقلب وان ابعد الناس من اللہ القلب القاسی“ (رواہ الترمذی)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کے ذکر کے بغیر زیادہ کلام نہ کرو بیشک اللہ تعالیٰ کے ذکر کے بغیر زیادہ کلام کرنا دل کو سخت کر دیتا ہے بیشک اللہ تعالیٰ کی رحمت سے اور لوگوں کی بنسبت زیادہ دور ہونے والا وہی شخص ہوگا جس کا دل سخت ہو۔

وضاحت حدیث: جب حدیث شریف میں زیادہ کلام سے منع کیا گیا ہے تو اسی سے واضح ہوا کہ دنیا کی کلام مطلقاً منع نہیں، بے مقصد، بے فائدہ کلام سے گریز کیا جائے، اچھا اور خیر پر مبنی کلام کیا جائے، جب یہودہ کلام دل کو سخت کرتا ہے تو یہودہ قہقہہ لگا کر ہنسنا قساوت قلب کا سبب کیوں نہیں، کیا دینی مدارس

کے طلباء نے کبھی سوچا کہ ہمارا اور کالج کے طلباء کا امتیاز ہی متانت اور بیہودگی کا ہے، ہاں دین کے طلباء کرام! بیہودہ قہقہے لگانے کی عادت کبھی نہ ڈالنا ورنہ دینی طلباء کی شرافت کا بھرم برباد ہو کر رہ جائے گا۔

قساوت قلب کیا ہے؟

”وہی النبو عن سماع الحق والمیل الی مخالطة الخلق وقلة الخشية وعدم الخشوع والبكاء وكثرة الغفلة عن دار البقاء“

قساوت قلب یہ ہے کہ انسان حق بات سننے سے دور ہو جائے اور مخلوق سے میل جول زیادہ رکھے، رب تعالیٰ کا خوف دل میں کم ہو جائے اور خشوع نہ پایا جائے، دل کی نرمی اور رب تعالیٰ کے خوف کے نہ پائے جانے کی وجہ سے روانہ آئے اور آخرت سے بہت زیادہ غافل ہو جائے۔

قساوت قلب کو رب تعالیٰ کے اس ارشاد سے سمجھا جائے:

﴿ثُمَّ قَسَتْ قُلُوبُكُمْ مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ أَوْ أَشَدُّ قَسْوَةً﴾ (البقرة ۷۴)

”پھر اس کے بعد تمہارے دل سخت ہو گئے تو وہ پتھروں کی مثل ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ سخت“

﴿الْمُ يَأْنِ لِلَّذِينَ آمَنُوا أَنْ تَخْشَعَ قُلُوبُهُمْ لِذِكْرِ اللَّهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ وَلَا يَكُونُوا كَالَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْأَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوبُهُمْ وَكَثِيرٌ مِنْهُمْ فَاسِقُونَ﴾ (الحديد ۱۶)

”کیا ایمان والوں کے لئے ابھی وقت نہ آیا کہ ان کے دل جھک جائیں اللہ کی یاد اور اس کے حق کیلئے جواترے اور ان جیسے نہ ہوں جن کو پہلے کتاب دی گئی پھر ان پر مدت دراز ہوئی تو ان کے دل سخت ہو گئے اور ان میں بہت فاسق ہیں۔“

☆ ”وعن ثوبان قال لما نزلت (والذين يكتزون الذهب والفضة) كنا مع النبي ﷺ في بعض اسفاره فقال بعض اصحابه نزلت في الذهب والفضة لو علمنا اى المال خير فنتخذة فقال افضل لسان ذاكر وقلب شاكر وزوجة مؤمنة تعينه عن ايمانه“

(رواه احمد والترمذى وابن ماجه)

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں جب یہ آیت کریمہ ﴿وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ﴾ نازل ہوئی تو ہم نبی کریم ﷺ کے ساتھ کسی سفر میں تھے تو بعض صحابہ کرام کہنے لگے کہ یہ آیت تو سونے اور چاندی (کی مذمت) کے بارے میں نازل ہوئی کاش ہمیں یہ معلوم ہو جائے کون سا

مال بہتر ہے تو ہم وہی حاصل کر لیں تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا تمام اموال سے بہتر چیز یہ ہے کہ ذکر کرنے والی زبان حاصل ہو اور شکر کرنے والا دل حاصل ہو اور ایمان دار زوجہ حاصل ہو اور وہ اس کے ایمان کی معاون ہو یعنی وہ شخص ایمان پر قائم ہو۔

وضاحت حدیث: نبی کریم ﷺ کے ساتھ سفر میں کچھ صحابہ کرام تھے اسی سفر کی حالت میں یہ آیہ کریمہ نازل ہوئی۔ ﴿وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يَنْفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ﴾ ”اور وہ جو جمع کر کے رکھتے ہیں سونا اور چاندی اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے انہیں خوشخبری سناؤ دردناک عذاب کی“

تو صحابہ کرام میں سے بعض نے کہا کہ یہ تو ہمیں معلوم ہو چکا ہے کہ سونے اور چاندی کی مذمت میں یہ آیہ کریمہ نازل ہوئی کاش کہ ہمیں یہ بھی معلوم ہو جائے کہ انسان کیلئے افضل کیا چیز ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ انسان کیلئے افضل ذکر کرنے والی زبان، شکر کرنے والا دل، اور ایمان دار زوجہ ہیں اور آپ نے فرمایا وہ عورت اس کے ایمان کی معاون ہو، یعنی اسے دین پر قائم رہنے، نماز ادا کرنے، روزہ رکھنے کی یاد دلاتی ہے، تاکہ وہ ان پر عمل کرے اور تمام عبادات کو بجالائے اور تمام گناہوں سے اجتناب کرے۔ صحابہ کرام کے سوال پر نبی کریم ﷺ نے جواب مال کے متعلق نہیں دیا ”لَا مَال لَا يَنْفَعُهُ وَلَا شَيْءٌ لِلرَّجُلٍ أَنْفَعُ مِمَّا ذَكَرَ“ اس لئے کہ مال انسان کے لئے نفع مند نہیں جن چیزوں کا ذکر فرمایا وہی نفع مند ہیں۔ ہاں البتہ یہ بھی خیال رہے کہ ان چیزوں پر عمل کرنے والے کم ہی ہیں۔ کیونکہ رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی اس پر واضح دلیل ہے ”وَقَلِيلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُورُ“ اور میرے بندوں سے تھوڑے ہی شکر گزار ہیں۔

☆ ”عن ابی سعید قال خرج معاوية علی حلقة فی المسجد فقال ما اجلسکم قالوا جلسنا لذكر الله قال الله ما اجلسکم الا ذلک قالوا الله ما اجلسنا غیره قال اما انی لم استحلفکم تهمة لکم وما کان احد بمنزلة من رسول الله ﷺ اقل عنه حدیثا منی وان رسول الله ﷺ خرج علی حلقة من اصحابه فقال ما اجلسکم ههنا قالوا جلسنا نذكر الله ونحمده علی ما هداانا للاسلام ومن به علینا قال الله ما اجلسکم الا ذلک قالوا الله ما اجلسنا الا ذلک قال اما انی لم استحلفکم تهمة لکم ولكنه اتانی جبریل فاخبرنی ان الله

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ مسجد کے ایک حلقہ میں تشریف لائے تو آپ نے فرمایا تمہیں یہاں کس چیز نے بٹھا رکھا ہے؟ انہوں نے کہا ہم اللہ تعالیٰ کے ذکر کے لئے بیٹھے ہیں، آپ نے فرمایا کیا تم اللہ تعالیٰ کی قسم اٹھا کر کہتے ہو تمہیں اس چیز کے بغیر کسی اور چیز نے نہیں بٹھایا؟ انہوں نے کہا ہاں اللہ تعالیٰ کی قسم ہے ہمارے بیٹھنے کی صرف یہی وجہ ہے، پھر آپ نے فرمایا میں نے تم سے قسم بدگمانی کے طور پر نہیں لی (بلکہ اس کی وجہ یہ ہے) کوئی ایک بھی میری طرح رسول اللہ ﷺ کے قریب رہ کر کم حدیثیں بیان کرنے والا نہیں۔

بیشک رسول اللہ ﷺ صحابہ کرام کے ایک حلقہ پر تشریف لائے تو آپ نے فرمایا تم یہاں کیوں بیٹھے ہو؟ انہوں نے عرض کیا ہم یہاں بیٹھ کر اللہ تعالیٰ کا ذکر کر رہے ہیں ہمیں جو اس نے اسلام کی ہدایت دے رکھی ہے، اور ہم پر جو اس نے احسان کیا ہوا ہے، ہم اس کی حمد کر رہے ہیں، آپ نے فرمایا کیا اللہ کی قسم تمہارے یہاں بیٹھنے کی صرف یہی وجہ ہے؟ انہوں نے عرض کیا قسم ہے اللہ تعالیٰ کی ہمارے یہاں بیٹھنے کی صرف یہی وجہ ہے، نبی کریم ﷺ نے فرمایا میں نے تم سے قسم کسی بدگمانی کی وجہ سے نہیں لی۔ میرے پاس ابھی جبریل آئے جنہوں نے خبر دی کہ اللہ تعالیٰ تمہاری وجہ سے فرشتوں پر فخر کر رہا ہے۔

وضاحت حدیث: حلقۃ فی المسجد، حلقۃ کے لام پر فتح بھی پڑھا گیا ہے اور سکون بھی۔ مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ مسجد میں ایک دوسرے کے سامنے دائرہ بنا کر بیٹھے ہوئے تھے۔

ما اجلسکم، میں ”ما“ استفہامیہ ہے سوال یہ کیا گیا کہ تمہیں کس سبب نے یہاں بٹھا رکھا ہے یعنی یہاں اس بیت پر اس طریقہ پر تمہارے بیٹھنے کی وجہ کیا ہے؟

آلہ، پہلے جو سوال میں ہے اس میں ”ہمزۃ الاستفہام وقعت بدلا عن حرف القسم ویجب الجر معها“ ہمزہ استفہام کے لئے ہے اور حرف قسم کا بدل ہے، اس کے بعد جر (زیر) ہے، تقریباً قسم اور استفہام کے دونوں معنی مراد ہیں کیا اللہ کی قسم ہے کہ تمہارے یہاں بیٹھنے کی اور کوئی وجہ نہیں؟

اور جواب میں جو ”اللہ“ استعمال ہے اس کا مطلب یہ ہے ”وقع الهمزة موقعها
مشاکلة وتقریرا لذلك وتقديره ای او نعم قسم الله“

کہ ہمزہ استفہام کے لئے ہے مشاکلت کے طور پر استعمال ہوا ہے استفہام تقریری ہے معنی یہ
ہے کہ ہاں اللہ کی قسم ہے کہ ہمارے بیٹھنے کی اور کوئی وجہ نہیں۔

”قال اما انی لم استحلفکم تهمة لكم وما كان احد بمنزلة من

رسول الله ﷺ اقل عنه حديثا منی“

”اما“ تنبیہ کے لئے ہے یا ”حقا“ کے معنی میں ہے آپ کے ارشاد کا مطلب یہ تھا کہ میں
نے تم سے جو قسم لی ہے اس کی وجہ یہ نہیں کہ مجھے تم پر کوئی بدگمانی تھی کہ تم جھوٹ بول رہے ہو درحقیقت
میں اس کلام کے مشابہ کلام کرنا چاہتا ہوں جو نبی کریم ﷺ نے اپنے صحابہ کرام سے ارشاد فرمایا تھا۔
”وقدم بيان قربه منه عليه الصلوة والسلام وقلة نقله من احاديثه الكرام دفعا لتهمة
الكذب عن نفسه فيما ينقله من الكلام“

آپ نے پہلے اپنا مقام بیان فرمایا جو آپ کو نبی کریم ﷺ کا قرب رہا، اور اپنے قلیل حدیث
بیان کرنے کی وجہ بیان کی۔ تاکہ کوئی آپ کی روایت کو جھوٹا نہ کہہ سکے۔

سبحان اللہ صحابہ کرام کا کیا مقام کشف ہے کہ آپ کو معلوم ہے کہ کئی بے دین اور بے ایمان
میرے متعلق لوگوں میں بدگمانیاں پیدا کریں گے، خود بھی گمراہ ہوں گے دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے۔

آئیے ذرا دیکھیں آپ اپنی شان کیا بیان کر رہے ہیں ”وما كان احد بمنزلة من
رسول الله ﷺ“ تمام حاضرین کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا تم میں سے کوئی ایک بھی رسول اللہ ﷺ
کے اتنا قریب نہیں جتنا میں ہوں۔ علامہ علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”لكونه محرما لام حبيبة اخته من امهات المؤمنين ولذا عبر عنه

المولوى فى المشئوى بخال المؤمنين ولكونه من اجلاء كتبة الوحى“

آپ کو اس لئے نبی کریم ﷺ سے قرب حاصل تھا کہ آپ ام المؤمنین رسول اللہ ﷺ کی زوجہ
مطہرہ کے بھائی تھے چونکہ حضور کی تمام بیبیاں مومنوں کی مائیں ہیں۔ قرآن پاک میں فرمایا

﴿وَأَزْوَاجَهُ أُمَّهَاتُهُمْ﴾ اور آپ کی ازواج ان (مومنوں) کی مائیں ہیں، ماں کا بھائی ماموں ہوتا ہے اسی لئے مولنا روم رحمہ اللہ نے آپ کو مومنوں کا ماموں قرار دیا

اور حدیث پاک سے یہ بھی ثابت ہے کہ ماموں کو باپ کا مقام حاصل ہوتا ہے تو اس لحاظ سے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ مومنوں کے ماموں اور باپ کے درجہ میں ہیں لیکن جب نبی کریم ﷺ کی ازواج کافروں کی مائیں نہیں تو یقینی بات ہے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا ان سے کوئی رشتہ نہیں۔ اقل عنہ حدیثا منی : آپ فرماتے ہیں مجھے حضور ﷺ سے قرابت بھی حاصل ہے لیکن پھر بھی میں آپ سے احادیث کم روایت کرتا ہوں اس کی وجہ یہ ہے:

” لا احتیاطی فی الحدیث والا کان مقتضی منزلتہ ان یکون کثیر

الروایۃ ولعلہ کان ممن لم یجوز نقل الروایۃ بالمعنی “

کہ آپ احتیاط فرماتے تھے کہ کہیں حدیث بیان کرتے ہوئے حضور کے الفاظ نہ بدل جائیں ورنہ آپ قرابت کے لحاظ سے زیادہ احادیث بیان فرماتے لیکن کئی حضرات صحابہ کرام حدیث کا مفہوم اپنے الفاظ میں بیان کرنا جائز نہیں سمجھتے تھے کہ آپ کے الفاظ بدلنے نہ پائیں اسی ڈر سے ان کی روایات بہت کم واقع ہیں۔

اس کے بعد حدیث پاک کا مضمون واضح ہے اور صحابہ کرام کا یہ عرض کرنا کہ ہمارے یہاں بیٹھنے کی صرف وجہ یہ ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے احسان اور اس نے ہمیں جو ہدایت عطاء کر رکھی ہے اس پر اس کی حمد کریں اور اس کا ذکر کریں۔

یہ ایسے ہی ہے جیسا کہ جنت والے حضرات کہیں گے ”الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ هَدَانَا لِهٰذَا وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِیْ لَوْ لَا اَنْ هَدَانَا اللّٰهُ“ سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں جس نے ہمیں ہدایت دی اس کی اگر اللہ تعالیٰ ہمیں ہدایت نہ فرماتا تو ہم ہدایت حاصل نہ کر پاتے۔

ان اللہ عزوجل یباہی بکم الملائکۃ : اس کا معنی یہ ہے:

” ان اللہ تعالیٰ یقول لملائکته انظروا الی عبیدی هؤلاء کیف سلطت

علیہم نفوسہم وشہواتہم، واهویتہم والشیطان وجنودہ ومع ذلک

قویت ہمتہم علی مخالفتہ ہذہ الدواعی القویۃ الی البطالۃ وترك
العبادۃ والذکر فاستحقوا ان یمدحوا اکثر منکم لانکم لا تجدون
للعبادۃ مشقۃ بوجہ

بے شک اللہ تعالیٰ فرشتوں سے فرمائے گا میرے ان بندوں کو دیکھو کس طرح میں نے ان پر ان
کے نفوس کو، ان کی خواہشات کو اور ان کی قلبی محبتوں کو اور شیطان کو اور شیطانی لشکر کو مسلط کر رکھا ہے جو
ان کو باطل راہ کی طرف لگانے والے ہیں عبادات اور ذکر سے روکنے والے ہیں لیکن یہ پھر بھی کتنی قوی
ہمت والے لوگ ہیں کہ تمام سازشوں اور رکاوٹوں کا مقابلہ کرتے ہوئے میرا ذکر کر رہے ہیں لہذا اے
فرشتو یہ لوگ تم سے زیادہ مدح کے مستحق ہیں کیونکہ تمہیں عبادت سے روکنے والے کوئی ذرائع نہیں تمہارا
عبادت کرنا آسان ہے۔

سبحان اللہ اے انسان اللہ تعالیٰ کے ذکر کی وجہ سے تیرا مقام کتنا بلند ہے کہ فرشتوں کے سامنے
رب ذوالجلال تیری تعریف کر رہا ہے۔

☆ "عن عبد اللہ بن بسر ان رجلا قال یا رسول اللہ ان شرائع الاسلام قد
کثرت علی فاخبرنی بشئی اتشبت بہ قال لا یزال لسانک رطبا من ذکر اللہ"

(رواہ الترمذی وابن ماجہ وقال الترمذی ہذا حدیث حسن غریب)

حضرت عبد اللہ بن بسر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ بیشک
شرائع اسلام مجھ پر کثیر ہو گئے آپ مجھے کسی ایسی چیز کی خبر دیں جس کے ساتھ میں سہارا پکڑوں (یعنی
جس پر میں عمل کروں) آپ نے فرمایا تم اپنی زبان کو ہمیشہ ذکر سے تر رکھو۔

وضاحت حدیث: شریعت کا لغوی معنی یہ ہے "اونٹوں کو جاری پانی پر پیش کرنا" لیکن اصطلاح میں
وہ کام جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کیلئے مشروع قرار دیئے یعنی فرائض اور واجبات پر شریعت کا اطلاق
زیادہ ہے "والظاہر ان المراد بہا ہنا النوافل" لیکن ظاہر یہی ہے کہ اس مقام پر مراد نوافل
ہیں۔ صحابی کے عرض کرنے کا مقصد یہ تھا کہ نفلی عبادات کثیر ہیں تمام پر عمل کرنا تو میرے لئے مشکل
ہے تو آپ مجھے کسی قلیل عبادت کی خبر دے دو جس پر ثواب زیادہ مرتب ہو "معناہ اخبرنی بشئی
یسیر مستجلب لثواب کثیر" یعنی ایسی عبادت ہو جو آسان بھی ہو اور اس کا ثواب بھی زیادہ ہو۔

”النشبت ای اتعلق به من عبادة جامعة غير شاقة مانعة في مكان دون مكان وزمان دون زمان وحال دون حال من قيام وقعود واكل وشرب ومخالطة واعتزال وشباب وهم وغير ذلك ويكون جابرا عن بقيتها مشتملا على كليهما“

مقصد یہ تھا کہ میں ایسی عبادت سے تعلق رکھوں ایسی عبادت پر عمل کروں جو کئی نفلی عبادات کو جامع اور شامل ہو اور اس عبادت کا تعلق کسی خاص مکان اور کسی خاص زمان اور کسی خاص حال سے نہ ہو نہ وہ عبادت کھڑے ہو کر کرنے سے مختص ہو اور نہ ہی بیٹھنے سے، وہ ایسی عبادت ہو جو کھانے اور پینے کے وقت بھی جاری رہ سکے اور وہ ایسی عبادت ہو جو لوگوں کی محفل میں بھی جاری رکھی جاسکے اور اکیلے بھی اس پر عمل ہو سکے جو انی میں بھی اس پر عمل جاری رہے اور بڑھاپے میں بھی اور باقی نفلی عبادات کی کمی بھی اس سے پوری کی جاسکے اور جتنی دود و چیزوں کا ذکر ہے ان تمام میں اس پر عمل کیا جاسکے؟ وہ عظیم عبادت نبی کریم ﷺ نے بیان فرمائی ”لا يزال لسانك رطبا من ذكر الله“ ہمیشہ تمہاری زبان اللہ تعالیٰ کے ذکر سے تر رہے۔ ”لسان“ سے مراد اس حدیث میں قلبی اور قلبی دونوں ہی ہیں یعنی زبان اور دل سے اللہ تعالیٰ کو یاد کرو۔

☆ ”وعن ابي سعيد ان رسول الله ﷺ سئل اي العباد افضل وارفع درجة عند الله يوم القيامة قال الذاكرون الله كثيرا والذاكرات قيل يا رسول الله ومن الغازی فی سبيل الله قال لو ضرب بسيفه فی الكفار والمشرکین حتی ينكسر ويختضب دما فان الذاکر لله افضل درجة“ (رواه احمد والترمذی وقال هذا حديث غریب)

حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا گیا کون سے بندے قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے ہاں افضل اور بلند درجہ رکھتے ہوں گے؟ آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والے خواہ مرد ہوں یا عورتیں، پھر آپ سے پوچھا گیا کیا یہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنے والوں سے بھی افضل ہوں گے؟ آپ نے فرمایا ہاں اگر ان کی تلوار کفار و مشرکین پر چلاتے ہوئے ٹوٹ بھی جائے اور وہ شخص اور اس کی تلوار خون آلود بھی ہو جائے تو پھر بھی اللہ تعالیٰ کے ذکر کرنے والوں کا درجہ بلند رہے گا۔

وضاحت حدیث: ذکر سے مراد اس پر ہمیشگی کرنا۔ خیال رہے کہ وہی ذکر قابل تعریف ہے جب کہ

فرائض اور واجبات کو ادا کیا جائے اور ناجائز کاموں سے اجتناب کیا جائے۔ جہاد چونکہ فرض کفایہ ہے اس لئے فرائض کی تکمیل اور ان کے بعد ذکر جہاد سے افضل ہوگا۔ لیکن جب جہاد فرض عین کے درجہ میں ہو تو اب مسجد میں بیٹھ کر اللہ اللہ کرنا کافی نہیں ہوگا بلکہ جہاد کرنا ضروری ہوگا۔

☆ "عن ابن عباس قال قال رسول الله ﷺ الشيطان جائم على قلب ابن آدم فاذا ذكر الله خنس واذا غفل وسوس" (رواه البخاری تعلیقا)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا شیطان انسان کے دل سے چمٹا رہتا ہے جب وہ اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتا ہے تو شیطان ہٹ جاتا ہے اور جب وہ اللہ تعالیٰ کے ذکر سے غافل رہتا ہے تو اسے وسوسہ ڈالتا ہے۔

وضاحت حدیث: "جائم ای لازم الجلوس ودائم اللصوق" حدیث شریف میں جو لفظ "جائم" استعمال ہوا ہے اس کا معنی ساتھ بیٹھے رہنا، اور ہمیشہ ساتھ چمٹے رہنا۔ خنس: ای انقبض الشيطان وتأخر عنه "یعنی انسان جب اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتا ہے تو شیطان غم کی وجہ سے مرجھا جاتا ہے اور اس سے دور ہو جاتا ہے اور چھپ جاتا ہے اور اس کا وسوسہ کم پڑ جاتا ہے اور اس کا ضرر کم ہو جاتا ہے۔ اور جب انسان اللہ تعالیٰ کے ذکر سے غافل ہو جاتا ہے تو شیطان وسوسہ ڈالنے پر قادر ہو جاتا ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مرفوع حدیث ثابت ہے:

"ان الشيطان واضع خرطومہ على ابن آدم فان ذكر الله خنس وان

نسى التقم قلبه، (اخرجه ابن ابی الدنيا ابو یعلیٰ والبیہقی)

کہ بے شک شیطان اپنا سونڈ انسان پر رکھتا ہے اگر وہ اللہ تعالیٰ کا ذکر کرے تو شیطان اس سے ہٹ جاتا ہے اور اگر وہ اللہ تعالیٰ کے ذکر کو ترک کر دے تو وہ اس کے دل کو لقمہ بنا لیتا ہے (یعنی اس کے دل پر اثر انداز ہو کر وسوسہ ڈالتا ہے)

اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں میں سے ایک نے رب تعالیٰ کے حضور عرض کیا کہ مجھ پر منکشف فرما کہ شیطان کس طرح لوگوں کے دلوں پر اثر کرتا ہے تو رب تعالیٰ نے اس پر منکشف کر دیا:

”فراہ جائما تحت غضروف الكتف الا یسر کالبعوض له خرطوم
طویل یدسه ثم الی ان یصل القلب فان راہ ذاکرا خنس وکف عنه او
غافلا مد خرطومہ الیہ والقی فیہ من جنایتہ ما اراد اللہ ثم لا یزال
کذلک الی ان لا یبقی فی القلب خیر قط“

اس نے دیکھا کہ شیطان بائیں کندھے کے نیچے پٹھے سے چمٹا ہوا ہے جس طرح مچھر چمٹ جاتا ہے
اس کی لمبی سوئڈ ہے جو چھوڑ رہا ہے یہاں تک کہ وہ دل تک پہنچ جاتی ہے پھر دیکھا کہ اگر انسان اللہ تعالیٰ کا
ذکر کرتا ہے تو وہ اس سے دور ہٹ جاتا ہے اور اگر انسان اللہ تعالیٰ کے ذکر سے غافل رہے تو وہ اپنی سوئڈ
کو بڑھا دیتا ہے اور انسان کی بد قسمتی میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو گناہ لازم آنے ہوتے ہیں وہ اس
کے دل میں ڈال دیتا ہے یہاں تک کہ اس کے دل میں نیکی کی کوئی جگہ نہیں رہتی۔

☆ ”وعن مالک قال بلغنی ان رسول اللہ ﷺ کان یقول ذاکر اللہ فی الغافلین
کالمقاتل خلف الفارین وذاکر اللہ فی الغافلین کفصن اخضر فی شجر یا بس وفی رواۃ
مثل الشجرة الخضراء فی وسط الشجر وذاکر اللہ فی الغافلین مثل مصباح فی بیت مظلم
وذاکر اللہ فی الغافلین یریہ اللہ مقعده من الجنة وهو حی وذاکر اللہ فی الغافلین یغفر له
بعدد کل فصیح واعجم والفصیح بنو آدم والاعجم البھائم“ (رواہ رزین)

حضرت مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں مجھے خبر ملی ہے کہ بیشک رسول اللہ ﷺ فرمایا کرتے تھے
کہ غافل لوگوں میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والا شخص ایسا ہے جیسا کہ میدان جنگ میں کچھ لوگ بھاگ
جائیں لیکن ان کے پیچھے کوئی کافروں کے مقابل جہاد میں ثابت قدم رہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے
والا غافلوں میں ایسا ہے جیسا کہ خشک درختوں میں سرسبز و شاداب درخت پایا جائے، ایک روایت میں
صرف اتنا ہے کہ درختوں کے درمیان سبز درخت پایا جائے اور غافل لوگوں میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے
والا ایسا ہے جیسے تاریک گھر میں چراغ پایا جائے اور غافل لوگوں میں اللہ تعالیٰ کے ذکر کرنے والے کو
اللہ تعالیٰ جنت میں اس کا مقام اس کی زندگی میں ہی دکھا دیتا ہے۔ اور غافلین میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے
والے شخص کے گناہ ہر فصیح اور اعجم کی تعداد کے برابر معاف کر دیئے جاتے ہیں فصیح سے مراد انسان اور
اعجم سے مراد حیوان ہیں یعنی انسانوں اور حیوانوں کی تعداد کے برابر گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں۔

وضاحت حدیث: میدان جنگ سے بھاگنے والوں کی شدید مذمت بیان کی گئی ہے اور جب دوسرے لوگ بھاگ جائیں اس وقت ثابت قدمی سے جنگ کرنا عظیم مرتبہ ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کے ذکر سے غافل رہنے والوں میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والے حضرات کا بلند و بالا مرتبہ ہے۔

بار بار لفظ ”ذاکر اللہ“ کو صراحتہ ذکر کیا صرف ضمیر کو نہیں لوٹا دیا:

”وکرره لنبیط به فی کل مرة غیر ما اناط به فی الاخری اعلاما بانه

امر عظیم له فوائد متعددة مستقلة“

اس لئے کہ یہ بتانا مقصود ہے کہ ہر مرتبہ علیحدہ ذکر کرنے میں خصوصی فوائد ہیں جو متعدد اور مستقل ہیں۔

”فی الغافلین“ کو ظرف مستقر کے طور پر ذکر فرمایا خاص متعلق بہ ذکر نہیں فرمایا، اشارہ کیا

ہے کہ غافل لوگ کہیں بھی ہوں مسجد میں یا بازار میں ہوں، گھر میں ہوں یا باہر، سفر میں ہوں یا حضر میں ان میں فضیلت رکھنے والا وہی شخص ہوگا جو اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والا ہی ہوگا۔

غافل لوگوں میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والا ایسے ہے جیسے خشک درختوں میں سرسبز و شاداب

درخت ہو ”وهو معنی مثل الحی والمیت“ یہی مطلب ہے زندہ اور مردہ ہونے کی طرح یعنی

ذکر نہ کرنے والے غافلین کے دل مردہ ہیں جیسے خشک درختوں پر مردگی چھائی ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کا

ذکر کرنے والوں کے دل اس طرح زندہ ہیں جس طرح سبز ہرا بھر درخت زندہ ہوتا ہے۔ غافلین میں

اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والا ایسے ہے جیسے تاریک گھر میں چراغ ہو اس کی وجہ یہ ہے۔ ”فان الذکر نور

وحضور وسرور والغفلة ظلمة وغیبة ونفور“ کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر نور ہے جس سے دل منور

ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے ذکر سے رب تعالیٰ کے ہاں حضوری حاصل ہوتی ہے، حضور قلب حاصل ہوتا

ہے، اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے ذکر میں سرور ہے۔ لیکن اس کے برخلاف

اللہ تعالیٰ کے ذکر سے غافل رہنے میں دل سیاہ ہو جاتا ہے اور رب تعالیٰ سے دوری حاصل ہوتی ہے اور

دل میں نفرت و کدورت پیدا ہوتی ہے۔

”یریه الله مقعده من الجنة ای ما اعدله“ غافلین میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والا ایسے

ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے جنت میں جو مقام تیار کر رکھا ہے اسے اس کی زندگی میں ہی دکھا دیا جاتا

ہے۔ زندگی میں اسے جنت کا مقام کیسے دکھا دیا جاتا ہے؟

”لعل الاراءة بالمكاشفة او بنزول الملائكة عند النزع لقوله تعالى“ ﴿إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةُ أَلَّا تَخَافُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَبْشِرُوا بِالْجَنَّةِ الَّتِي كُنتُمْ تُوعَدُونَ﴾ (حم السجدة ۳۰)

اس کی دوجہ ہیں ایک تو یہ کہ بعض بزرگوں کو کشف کے ذریعے ان کی زندگی میں جنت میں ان کا مقام دکھا دیا جاتا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ جن کا مقام اتنا بلند نہیں ہوتا ان کو جان کنی (جان کے نکلنے) کے وقت دکھا دیا جاتا ہے۔ جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا (ترجمہ) بیشک وہ جنہوں نے کہا ہمارا رب اللہ ہے پھر اس پر قائم رہے ان پر فرشتے اترتے ہیں کہ نہ ڈرو اور نہ غم کرو اور خوش ہو اس جنت پر جس کا تمہیں وعدہ دیا جاتا ہے۔

غافلین میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والوں کے گناہ مٹا دیئے جاتے ہیں یعنی اللہ تعالیٰ کے ذکر نے انہیں صدق دل سے توبہ کرنے کی توفیق عطاء فرمادی تو تمام صغیرہ اور کبیرہ گناہ معاف ہو گئے۔ اور اگر ابھی تک زبان تک ذکر محدود ہے دل پر کامل طور پر اثر انداز نہیں ہوا تو پھر بھی صغیرہ گناہ معاف ہوتے ہیں۔ رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

﴿فَإِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ﴾ ”بیشک نیکیاں گناہوں کو مٹا دیتی ہیں۔“

☆ ”عن معاذ بن جبل قال ما عمل العبد عملاً انجى له من عذاب الله من ذكر الله“ (رواه مالک و الترمذی و ابن ماجہ)

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ انسان کا کوئی عمل اللہ تعالیٰ کے عذاب سے زیادہ نجات دینے والا نہیں نسبت اللہ تعالیٰ کے ذکر کے۔

وضاحت حدیث: یہ حدیث حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کے قول پر موقوف ہے لیکن ضابطہ یہ ہے ”ومثله لا يقال من قبل الراى فهو فى حكم المرفوع“ کہ اس قسم کے اقوال انسان اپنی رائے سے تو قائم نہیں کر سکتا جو قول رائے سے پیش نہ کیا جاسکے اور صحابی کا وہ قول ہو وہ مرفوع حدیث کے حکم میں ہوتا ہے۔ بلکہ مسند احمد اور طبرانی اور مصنف ابن ابی شیبہ کی مرفوع حدیث اس کی تائید کر رہی ہے جس کے الفاظ مبارکہ یہ ہیں ”ما عمل آدمى عملاً انجى له من عذاب الله من ذكر الله“ الخ مطلب وہی جو بیان ہو چکا ہے۔

☆ ”وعن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ ﷺ ان اللہ تعالیٰ یقول انا مع عبدی اذا ذکرنی وتحركت بی شفتاہ“
(رواہ البخاری)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میں اپنے بندے کے ساتھ ہوتا ہوں جب وہ مجھے یاد کرتا ہے اور میرے ذکر سے اپنے ہونٹوں کو حرکت دیتا ہے۔

وضاحت حدیث: انا مع عبدی ، بالاعانة والتوفیق والرحمة والرعاية
یعنی رب تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرا بندہ جب میرا ذکر کرتا ہے تو اسے میری طرف سے امداد حاصل ہوتی ہے اور اسے میں ہی اپنی عبادت و ذکر کی توفیق عطاء کرتا ہوں اسے اپنی رحمت سے نوازتا ہوں اس پر اپنی مہربانیوں کی نوازش کرتا ہوں۔

”وقیل المعیة کنایة عن الشرف والقربة لما ورد انا جلیس من ذکرنی کما یقال فلان جلیس السلطان ای مقرب مشرف عنده“

اور اس کا مطلب یہ ہے کہ رب تعالیٰ کی معیت حاصل ہوگی یعنی اس انسان کو رب تعالیٰ کی قربت حاصل ہوگی اور شرافت حاصل ہوگی۔ جس طرح کہا جاتا ہے ”فلان جلیس السلطان“ تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ فلاں شخص کو بادشاہ کا قرب حاصل ہے اور وہ بادشاہ کا مقرب ہے۔

کیا ہی خوب: ”والحدیث ابلغ حیث لم یقل هو جلیس“ اے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والے، رب تعالیٰ نے کیا خوب تیری شان بیان فرمائی یہ ارشاد فرمایا ”انا مع عبدی“ یعنی انا جلیس مع عبدی میں اپنے بندے کے قریب ہوں گا، اسے اپنا مقرب بناؤں گا، اسے تقرب کی وجہ سے مشرف بناؤں گا۔ یہ نہیں فرمایا ”وہو معی“ یعنی ہو جلیس کہ وہ شخص جو میرا ذکر کرے گا وہ میرے پاس آئے گا وہ میرا مقرب بنے گا۔

سبحان اللہ کسی کا بننا اور ہے جب خود کوئی کسی کو بنائے وہ اور ہے رب تعالیٰ کا بننا بھی نعمت عظمیٰ ہے۔ لیکن رب تعالیٰ جب کسی کو اپنا بنالے وہ کتنا ہی خوش بخت انسان ہے جو بے نظیر و بے مثال ہے۔

اذا ذکرنی وتحركت بی شفتاہ: جب ”تحركت“ میں واو حال کیلئے ہو تو ”ذکرنی“ میں ”ذکر باللسان والقلب“ (زبان اور دل سے ذکر کرنا) مراد ہوگا۔ اور اگر واو عطف کے لئے ہو تو ”ذکرنی“ سے مراد ”دل سے یاد کرنا“ اور ”تحركت بی شفتاہ“ سے مراد ”زبان سے یاد کرنا“ ہوگا، زبان اور دل سے یاد کرنا مراد لینا بہتر ہے ”لان المؤثر النافع هو

الذكر باللسان مع حضور القلب " اسلئے کہ مؤثر اور نفع دینے والا وہی ذکر ہے جو زبان سے کیا جائے اور ساتھ ہی حضور قلب بھی حاصل ہو۔

"واما الذكر باللسان والقلب لاه فهو قليل الجدوى" زبان سے ذکر کرنا جب کہ دل لہو و لعب میں مشغول ہو، یعنی دل غافل ہو تو اس میں نفع کم ہے۔ لیکن پہلے تفصیل سے ذکر کیا جا چکا ہے کہ صرف زبان سے بھی ذکر نفع سے مکمل خالی نہیں۔ بلکہ مقام شکر ہے کہ رب تعالیٰ نے زبان کو اپنے ذکر میں لگا دیا ہے۔

☆ "وعن عبد الله بن عمر عن النبي ﷺ انه كان يقول لكل شئى صقالة وصقالة القلوب ذكر الله وما من شئى انجى من عذاب الله من ذكر الله قالوا ولا الجهاد فى سبيل الله قال ولا ان يضرب بسيفه حتى ينقطع"

(رواه البيهقى فى الدعوات الكبير)

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ ہر چیز کی صفائی ہے اور دلوں کی صفائی اللہ تعالیٰ کا ذکر ہے اور اللہ تعالیٰ کے ذکر سے بڑھ کر کوئی چیز اللہ تعالیٰ کے عذاب سے نجات دینے والی نہیں۔ صحابہ کرام نے پوچھا کیا اللہ کی راہ میں جہاد بھی (اس درجہ کا) نہیں؟ آپ نے فرمایا جہاد بھی یہاں تک کہ جہاد کرتے کرتے اس کی تلوار بھی کیوں نہ ٹوٹ جائے۔

وضاحت حدیث: ہر چیز زنگ آلود ہوتی ہے حقیقۃً یا حکماً صقالة مصدر ہے جس کا معنی "تجلیۃ و تخلیۃ و تزکیۃ و تصفیۃ" صاف کرنا (جلاء عطاء کرنا) اور زنگ اور میل کو دور کرنا، پاک کرنا اور صاف کرنا۔ تاہم علامہ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے "صقالة" کو آلہ بنایا ہے یعنی صفائی کا آلہ۔

وصقالة القلوب ذکر اللہ: اور دلوں کی صفائی اللہ تعالیٰ کا ذکر ہے۔ "فانه بذكره يسجل غبار الاغيار ويصير القلب مرآة لمطالعة الآثار" بیشک اللہ تعالیٰ کے ذکر سے دل اغیار (غیروں) کے غبار سے پاک و صاف ہو جاتا ہے کیونکہ اس کی توجہ صرف اللہ تعالیٰ کی طرف ہوتی ہے کسی اور کی طرف نہیں ہوتی اور ان کا دل احادیث اور اقوال صحابہ کے اثر انداز ہونے کیلئے آمینہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ علامہ طبری رحمہ اللہ نے فرمایا "وصدا القلوب الرین کما فی قوله تعالى كَلَّا بَلْ رَانَ عَلَى قُلُوبِهِمْ مَا كَانُوا يَكْسِبُونَ" کہ دلوں پر زنگ کو ہی قرآن پاک میں "رین" کہا گیا (ترجمہ) کوئی نہیں بلکہ ان کے دلوں پر زنگ چڑھا دیا ہے ان چیزوں نے جو وہ کسب کرتے تھے۔

ان کے دل پر زنگ چڑھنے کی وجہ ان کی خواہشات ہوتی ہیں۔ رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿أَفَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَهَهُ هَوَاهُ﴾ ”بھلا دیکھو تو وہ جس نے اپنی خواہش کو اپنا خدا ٹھہرا لیا“

(الحاثیہ: ۲۳)

”فکلمۃ لا الہ تخیلہا و کلمۃ الا اللہ تجلیہا“ ”لا الہ“ پڑھنے سے دل سے

خواہشات نکلتی ہیں اور ”الا اللہ“ پڑھنے سے دل منور ہو جاتا ہے۔ ابوعلی دقاق فرماتے ہیں:

”اذا قال العبد لا الہ صفا قلبہ وحضر سرہ فیکون ورود قولہ الا اللہ علی قلب

منفی و سر مصفی“

کہ انسان جب ”لا الہ“ پڑھتا ہے تو اس کا دل گناہوں اور اغیار کی طرف توجہ سے صاف ہو

جاتا ہے اور اس کے روح و قلب میں حضور آ جاتا ہے، پھر جب ”الا اللہ“ پڑھتا ہے تو وہ کامل طور پر

اثر انداز ہوتا ہے کیونکہ اس کا ورود ایسے دل پر ہو رہا ہے جو پہلے ہی ”لا الہ“ سے صاف ہو چکا ہے اور

روح و قلب کو پہلے سے جب جلاء حاصل ہے تو اب اور زیادہ جلاء حاصل ہو جائے گی۔

جہاد سے ذکر کو کب فضیلت حاصل ہوتی ہے اس کی تفصیل پہلے ذکر ہو چکی ہے۔

نوٹ: فضیلت ذکر کے متعلق جن احادیث اور ان کی وضاحت کا ذکر کیا گیا اور ان کا حوالہ مذکور نہ ہو

تو وہ ”مشکوٰۃ باب ذکر اللہ عز وجل والتقرب الیہ“ میں دیکھیں اور ان کی وضاحت مرقاۃ ج ۵

میں اسی باب میں ان احادیث کے ضمن میں ہی دیکھیں۔

☆ ”عن السدی فی قولہ تعالیٰ (فاذکرونی اذکروکم) قال لیس من عبد یدکر اللہ الا

ذکرہ اللہ لا یدکر اللہ مومن الا ذکرہ برحمة ولا یدکرہ کافر الا ذکرہ اللہ بعذاب“

(ابن جریر بحوالہ در مشور)

سدی رحمہ اللہ نے اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿فَاذْكُرُونِي اَذْكُرْكُمْ﴾ کی تفسیر میں ذکر کیا

ہے اللہ تعالیٰ کا بندہ جب اللہ کو یاد کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اسے یاد کرتا ہے۔ جب مومن اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا

ہے تو اللہ تعالیٰ اسے رحمت سے ہی یاد کرتا ہے اور کافر جب (کفر سے) رب تعالیٰ کو یاد کرتا ہے تو رب

بھی اسے عذاب سے ہی یاد کرتا ہے۔

☆ "اخرج ابن ابی الدنيا عن ابی المخارق قال قال النبی ﷺ مررت ليلة اسرى برجل فی نور العرش قلت من هذا ملک؟ قيل لا قلت نبی؟ قيل لا قلت من هذا؟ قال هذا رجل كان فی الدنيا لسانه رطب من ذکر الله وقلبه معلق بالمساجد ولم يستسب لو الدیه"

(در منثور)

ابوالمخارق کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں معراج کی رات عرش کے نور میں ایک شخص سے میرا گزر ہوا میں نے کہا یہ کون سا فرشتہ ہے؟ جواب دیا گیا یہ فرشتہ نہیں میں نے کہا کیا یہ نبی ہے؟ جواب دیا گیا یہ نبی بھی نہیں میں نے کہا یہ شخص کون ہے؟ جواب دیا گیا یہ وہ شخص ہے جس کی زبان اللہ تعالیٰ کے ذکر سے تر رہتی تھی۔ اور دل اس کا مساجد سے معلق (لٹکا رہنا، چمٹا رہنا) رہتا تھا اور اپنے والدین کو گالی دینے کا سبب نہیں بنتا تھا۔ یعنی دوسروں کے والدین کو گالی نہیں دیتا تھا کہ وہ اس کے والدین کو اس کے بدلے میں گالی دیں۔

☆ "اخرج ابن ابی الدنيا عن ابی ذر عن النبی ﷺ قال ما من يوم وليلة الا والله عز وجل فيه صدقة من بها علی من يشاء من عباده وما من الله علی عبد بافضل من ان يلهمه ذكره"

(در منثور)

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کوئی دن اور رات ایسا نہیں مگر اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جن پر احسان فرماتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے لئے صدقہ کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں پر سب سے زیادہ فضل یہ ہے کہ وہ ان کو ذکر کی توفیق عطا فرماتا ہے۔

☆ "اخرج ابن حبان عن ابی سعید الخدری ان رسول الله ﷺ قال لیذکرون الله اقوام فی الدنيا علی الفرش الممهدة یدخلهم الله الدرجات العلی"

(در منثور)

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کچھ قومیں اللہ تعالیٰ کا ذکر اپنے سونے کے بستروں پر کریں گے (یعنی سوتے وقت اللہ تعالیٰ کا ذکر کریں گے) اللہ تعالیٰ ان کو بلند درجات میں داخل کرے گا۔

(در منثور)

☆ "اخرج احمد والبخاری وابو یعلی والطبرانی عن انس عن رسول الله ﷺ قال ما من قوم اجتمعوا یذکرون الله لا یزیدون بذلك الا وجهه الا ناداهم مناد من السماء ان قوموا مغفورا لکم قد بدلت سیاتکم حسنات"

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب بھی کوئی قوم اللہ تعالیٰ کے ذکر کے لئے جمع ہوتی ہے ان کا مقصد صرف اللہ تعالیٰ کی رضا مندی کا حصول ہوتا ہے، تو ان کو ضرور آسمان سے نداء دینے والا نداء دیتا ہے کہ تمہارے اس ذکر کی محفل سے کھڑے ہونے پر تمہاری مغفرت ہو چکی ہوگی تحقیق میں نے تمہارے گناہوں کو معاف کر کے نیکیاں عطاء کر دی ہیں۔

☆ "اخرج الطبرانی عن ابی الدرداء قال قال رسول اللہ ﷺ لیبعثن اللہ اقواما یوم القیامۃ فی وجوہہم النور علی منابر اللؤلؤ یغبطہم الناس لیسوا بانبیاء ولا شہداء فقال اعرابی یا رسول اللہ حلہم لنا نعرفہم قال ہم المتحابون فی اللہ من قبائل شتی وبلاد شتی یجتمعون علی ذکر اللہ یدکرونہ" (درمنثور)

حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ ضرور بر ضرور قیامت کے دن بعض قوموں کو موتیوں کے منبروں پر بٹھائے گا ان لوگوں کے چہروں پر نور ہوگا لوگ ان پر رشک کر رہے ہوں گے حالانکہ وہ انبیاء کرام اور شہداء نہیں ہوں گے ایک اعرابی نے عرض کیا یا رسول اللہ آپ ہمیں ان کے بارے میں بتائیں تاکہ ہم ان کو پہچان لیں آپ نے فرمایا وہ لوگ اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر ایک دوسرے سے محبت کرنے والے ہیں جو مختلف قبائل سے ہوں گے اور مختلف شہروں سے آ کر ایک جگہ اللہ تعالیٰ کے ذکر کے لئے جمع ہو کر اللہ کا ذکر کرنے والے ہیں۔

سبحان اللہ بزرگان دین کے آستانے کتنے بابرکت ہیں کہ اس گئے گزرے دور میں بھی لوگ مختلف شہروں سے آ کر جمع ہوتے ہیں اور اللہ کا ذکر کرتے ہیں ان محافل میں کیا ہی خوب وجدانی کیفیت طاری ہوتی ہے۔

وَاشْكُرُوا لِي وَلَا تَكْفُرُونُ : "اور میرا شکر کرو اور میری ناشکری نہ کرو۔"

"وَاشْكُرُوا لِي" اور "وَاشْكُرُونِي" کا معنی ایک ہی ہے کہ "میرا شکر کرو" تاہم "وَاشْكُرُوا لِي" فصیح ہے۔

ذکر کو شکر سے پہلے ذکر فرمایا کیونکہ ذکر میں انسان رب تعالیٰ کی ذات میں مشغول ہوتا ہے اور شکر میں اس کی نعمتوں کی طرف مشغول ہوتا ہے "والاشتغال بذاتہ تعالیٰ اولی من الاشتغال

بنعمته “ رب تعالیٰ کی ذات میں مشغولیت بہتر ہے نسبت اس کی نعمتوں میں مشغول ہونے کے۔

وَلَا تَكْفُرُونَ: (واو) برائے عطف (لا) برائے نہی۔ مضارع کانون اعرابی محذوف۔ یہ موجودہ نون وقایہ ہے مکسور ہے یائے متکلم محذوف ہے یعنی میری نعمتوں کا انکار نہ کرو اور میرے حکم کی نافرمانی نہ کرو اور اس کا تعلق جمیع زمانوں سے ہے کہ کسی وقت بھی میری ان گنت نعمتوں کا کفران (انکار) نہ کرنا۔

(از روح المعانی)

شکر کیا ہے :

”الشکر تصور النعمة و اظهارها“ شکر نعمت کے تصور اور اس کے اظہار کو کہتے ہیں۔

شکر کو کثر سے مقلوب (الٹ کر کے بنانا) بھی تسلیم کیا گیا جس کا معنی ہے کشف یعنی کھولنا اور واضح کرنا۔ اس کی ضد کفر ہے جس کا معنی کفران نعمت ہے یعنی نعمت کو چھپانا اور بھول جانا اور انکار کرنا۔ شکر کا ایک معنی یہ بھی ہے کہ منعم کے ذکر سے بھرا ہوا رہنا۔ یعنی ہر وقت اللہ تعالیٰ کا شکر یہ ادا کرتے رہنا۔

شکر کی تین قسمیں ہیں:

- (۱) شکر القلب، دل سے شکر ادا کرے یعنی یہ تصور رکھے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اتنی نعمتیں عطاء کر رکھی ہیں جو شمار سے بھی باہر ہیں۔
- (۲) شکر اللسان، زبان سے شکر ادا کرنا ”و هو الشاء علی المنعم“ وہ اللہ تعالیٰ جو انعام عطاء کرنے والا ہے اس کی تعریف کرنا۔
- (۳) شکر سائر الجوارح، تمام اعضاء سے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا یعنی ہاتھوں سے نیکی کا کام کرنا۔ نیکی کے لئے پاؤں سے چل کر جانا، آنکھوں سے نیکی والی چیزوں کو دیکھنا وغیرہ۔ اسی طرح تمام اعضاء کو نیکی کی طرف لگانا اعضاء کا شکر ہے۔

ہر منعم کا شکر یہ ادا کرے:

اسی لئے تورب تعالیٰ نے فرمایا ﴿أَشْكُرْ لِي وَلِوَالِدَيْكَ﴾ میرا شکر ادا کرو اور اپنے

شکر کا فائدہ شکر کرنے والے کو حاصل ہوتا ہے:

رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿وَسَنَجْزِي الشَّاكِرِينَ﴾ اور ہم عنقریب شکر کرنے والوں کو جزاء دیں گے اور فرمایا ﴿وَمَنْ شَكَرَ فَإِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهِ﴾ اور جو شکر کرے گا وہ شکر اپنے لئے ہی کریگا۔

شکر گزار تھوڑے ناشکرے زیادہ ہیں:

”وَقَلِيلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُورُ“ رب تعالیٰ نے فرمایا میرے بندوں میں شکر کرنے والے تھوڑے ہیں۔ (از مفردات راغب)

ہم اس آیہ کریمہ کی طرف توجہ نہ کرنے کی وجہ سے بعض اوقات دل تنگ ہوتے ہیں لیکن جب رب تعالیٰ کے شکر گزار تھوڑے ہیں تو بندوں کا شکر یہ نہ ادا کرنے والے تھوڑے ہوں تو اس پر کیا تعجب ہے؟ جس پر مہربانیاں کریں وہی بے وفاء نظر آتا ہے لیکن یہ قانون قدرت ہے ایسا ہی ہونا چاہئے۔

شکر کی فضیلت میں احادیث و آثار:

”عن ابن مسعود قال قال رسول الله ﷺ من اعطى اربعا اعطى اربعا وتفسير ذلك في كتاب الله من اعطى الذكر ذكره الله لان الله يقول اذكروني اذ كرتم ومن اعطى الدعاء اعطى الاجابة لان الله يقول ادعوني استجب لكم ومن اعطى الشكر اعطى الزيادة لان الله يقول لنن شكرتم لازيدنكم ومن اعطى الاستغفار اعطى المغفرة لان الله يقول استغفروا ربكم انه كان غفارا“ (طبرانی، ابن مردويه، بیہقی، درمنثور)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص کو چار چیزیں عطاء ہوں اسے ان پر چار اور عطاء کی جاتی ہیں ان تمام کی تفاسیر کتاب اللہ میں موجود ہے جس کو ذکر کی توفیق عطاء کی جائے اللہ تعالیٰ اس کا ذکر کرتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿فَاذْكُرُونِي اَذْكُرْكُمْ﴾ تم

مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد کروں گا۔ اور جس شخص کو دعاء کرنے کی توفیق عطاء کی جائے اسے قبولیت عطاء کی جاتی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿ اَدْعُونِيْ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ﴾ تم مجھ سے دعاء کرو میں تمہاری دعاء کو قبول کروں گا۔ جس شخص کو شکر عطاء کیا گیا اسے زیادتی عطاء کی جاتی ہے کیونکہ رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿ لَ اِنْ شَكَرْتُمْ لَّاۤ اَزِيْدَنَّكُمْ ﴾ اگر تم شکر ادا کرو تو میں تمہیں زیادہ عطاء کروں گا۔ اور جس شخص کو استغفار کی توفیق عطاء کی جائے اسے مغفرت عطاء کی جاتی ہے کیونکہ رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿ اِسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا ﴾ اپنے رب تعالیٰ سے مغفرت طلب کرو بیشک وہ بخشنے والا ہے۔

☆ "عن زید بن اسلم ان موسیٰ علیہ السلام قال یا رب اخبرنی کیف اشکرک قال تذکرنی ولا تنسانی فاذا ذکرتنی شکرتنی واذا نسیتنی فقد کفرتنی"

(ابن ابی الدنیا، ابو حاتم، بیہقی، درمنثور)

حضرت زید بن اسلم رضی اللہ عنہ کہتے ہیں موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا اے میرے رب مجھے بتاؤ کہ میں تمہارا شکر کیسے ادا کروں، رب تعالیٰ نے فرمایا تم مجھے یاد کرو، میرے ذکر کو نہ چھوڑو جب تم نے میرا ذکر کر لیا تو میرا شکر یہ ادا کر دیا اور جب تم نے میرے ذکر کو چھوڑ دیا تو میری ناشکری کی۔

☆ "عن ابن عباس ان النبی ﷺ قال اربع من اعطیھن فقد اعطی خیر الدنیا والآخرۃ قلب شاکر ولسان ذاکر و بدن علی البلاء صابر و زوجۃ لا تبغیہ خونا فی نفسہا و مالہ"

(ابن ابی الدنیا، طبرانی، بیہقی، درمنثور)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں بیشک نبی کریم ﷺ نے فرمایا چار چیزیں جسے عطاء کی گئیں اسے دنیا اور آخرت کی بہتر چیزیں عطاء کی گئیں (وہ یہ ہیں) شکر کرنے والا دل، اور ذکر کرنے والی زبان اور مصیبت کے وقت صبر کرنے والا بدن اور زوجہ جو اپنے نفس اور خاوند کے مال میں خیانت نہ کرنے والی ہو۔

☆ "عن ابی ہریرۃ ان رسول اللہ ﷺ قال لھم اتحبون ایھا الناس ان تجتھدوا فی الدعاء قالوا نعم قال قولوا اللھم اعنا علی ذکرک وحسن عبادتک"

(بیہقی، درمنثور)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام کو فرمایا کیا تم پسند

کرتے ہوئے لوگوں کو تم اپنی دعاء میں کوشش کرو، انہوں نے کہا ہاں، آپ نے فرمایا تم یہ کہو ”اللہم اعنا علی ذکرک وشکرک وحسن عبادتک“ اے اللہ اپنے ذکر اور اپنے شکر اور اپنی اچھی عبادت کے لئے ہماری امداد فرما۔

☆ ”عن ابی جعفر قال ما من شئی احب الی اللہ من الذکر والشکر“ (ابن ابی شیبہ، درمنثور)

حضرت ابو جعفر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ کو ذکر اور شکر سے زیادہ کوئی چیز پسند نہیں۔

☆ ”عن ابن المنکدر قال کان من دعاء رسول اللہ ﷺ اللہم اعنی علی ذکرک وشکرک وحسن عبادتک“ (ابن ابی الدنیا، بیہقی، درمنثور)

ابن منکدر فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ دعاء فرماتے تھے ”اے اللہ اپنے ذکر اور اپنے شکر اور اپنی اچھی امداد پر میری امداد فرما۔“

☆ ”عن ابی الجلد قال قرأت فی مساء لہ موسیٰ علیہ السلام انه قال یا رب کیف لی ان اشکرک واصغر نعمتک وضعتها عندی من نعمک لا یجازی بها عملی کلہ فاتاہ الوحی ان یا موسیٰ الآن شکرتنی“ (اخرج احمد فی الزہد وابن ابی الدنیا والبیہقی، درمنثور)

ابو الجلد کہتے ہیں موسیٰ علیہ السلام نے رب تعالیٰ کے حضور عرض کیا اے میرے رب میں تیرا شکریہ کیسے ادا کروں تیری نعمتوں کو چھوٹا (تھوڑا) کیسے سمجھوں تو نے تو مجھے اتنی نعمتیں عطا کر رکھی ہیں کہ میرا کوئی عمل بھی ان کا بدل نہیں بن سکتا۔ تو آپ کے پاس وحی آئی اے موسیٰ تم نے اب میرا شکر ادا کر دیا۔ یعنی رب تعالیٰ کی نعمتوں کو ان گنت سمجھنا، اور رب تعالیٰ کی نعمتوں کا اعتراف کرنا اور اپنے آپ کو عاجز سمجھنا کہ میں کس طرح شکر کروں یہ بھی دل سے شکر ہے بلکہ یہ شکر بہت ہی کامل ہے۔

☆ ”عن سلیمان التیمی قال ان اللہ عزوجل انعم علی العباد علی قدرہ وکلفہم الشکر علی قدرہم“ (ابن ابی الدنیا، بیہقی، درمنثور)

حضرت سلیمان التیمی فرماتے ہیں بیشک اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر ان کی قدر کے مطابق انعام فرمایا ہے اور ان کی قدر کے مطابق ہی ان کو شکر کرنے کا مکلف بنایا۔

☆ عن اسحاق بن عبد اللہ بن ابی طلحہ ان رجلا کان یأتی النبی ﷺ فیسلم علیہ فیقول النبی ﷺ یدعولہ فجاء یوما فقال لہ النبی ﷺ کیف انت یا فلان قال بخیر ان

شکرت فسکت النبی ﷺ فقال الرجل يا نبي الله كنت تسألني وتدعولي وانك سألتني اليوم فلم تدع لي قال اني كنت اسألك فتشكر الله داني سألتك اليوم فشككت في والشكر“
(ابن ابی الدنيا ، بیہقی ، در منثور)

اسحاق بن عبد اللہ بن طلحہ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور آپ کو سلام کرتے تھے حضور ان کے سلام کا جواب دینے کے بعد ان کیلئے دعا فرماتے تھے۔ ایک دن وہ حاضر ہوئے نبی کریم ﷺ نے ان سے پوچھا اے فلاں تمہارا کیا حال ہے؟ انہوں نے عرض کیا بہتر حال ہے میں اس پر شکر گزار ہوں حضور خاموش ہو گئے وہ شخص عرض کرنے لگے اے اللہ کے نبی آپ مجھ سے سوال کرتے تھے اور میرے لئے دعا کرتے تھے آج آپ نے سوال کیا ہے دعا نہیں فرمائی؟ آپ نے فرمایا میں تم سے سوال کرتا تھا یعنی حال پوچھتا تھا تا کہ تم اللہ تعالیٰ کا شکر یہ ادا کر سکو (دعا بھی اسی وجہ سے کرتا تھا) لیکن آج میں نے اسی وجہ سے تمہارا حال پوچھا تھا کہ میں دیکھ سکوں کیا واقعی تم اللہ تعالیٰ کے شکر گزار بندے بن گئے ہو۔

☆ ”عن ابی بکر الصديق رضى الله عنه كان يقول فى دعائه اسألك تمام النعمة فى الاشياء كلها والشكر لك عليها حتى ترضى وبعد الرضاء“ (ابن ابی الدنيا ، در منثور)

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اپنی دعا میں عرض کرتے تھے اے اللہ میں تجھ سے تیری نعمتوں کی تمام اشیاء میں تکمیل طلب کرتا ہوں اور ان پر شکر گزار رہنے کی دعا کرتا ہوں تا کہ تو راضی ہو جائے اور تیری رضا کے بعد بھی میں شکر گزار رہوں۔

☆ ”عن عامر قال الشكر نصف الايمان والصبر نصف الايمان واليقين الايمان كله“
(ابن ابی الدنيا ، بیہقی ، در منثور)

حضرت عامر کہتے ہیں شکر نصف ایمان ہے اور صبر نصف ایمان ہے اور یقین کامل ایمان ہے۔

☆ ”عن سفیان بن عیینة قال قيل للزهري ما الزاهد قال من لم يغلب الحرام صبره ولم يمنع الحلال شكره“ (ابن ابی الدنيا ، بیہقی ، در منثور)

سفیان بن عیینہ کہتے ہیں حضرت زہری سے پوچھا گیا زاہد کی صفات کیا ہیں؟ تو آپ نے فرمایا وہ شخص جس کے صبر پر حرام غالب نہ آجائے اور حلال چیزیں اس کے شکر میں رکاوٹ نہ بنیں۔

☆ "عن ابی عبد الرحمن السلمی قال سئل الاستاذ ابو سهل محمد بن سلیمان الصعلوکی عن الشکر والصبر ایہما افضل فقال ہما فی الاستواء فالشکر وظیفۃ السراء والصبر فریضۃ الضراء"

(بیہقی، درمنثور)

ابو عبد الرحمن سلمی فرماتے ہیں استاذ ابو سهل محمد بن سلیمان صعلوکی سے سوال کیا گیا کہ شکر افضل ہے یا صبر؟ تو آپ نے فرمایا دونوں ہی اپنے اپنے مقام پر افضل ہیں کیونکہ نعمتوں کے حصول پر اور خوشی کے وقت شکر کرنا ضروری ہے اس وقت یقیناً شکر افضل ہوگا اور مصیبت کے وقت صبر کرنا ضروری ہے اس وقت یقینی بات ہے کہ صبر کرنا ہی افضل ہوگا۔

☆ "عن صہیب قال قال رسول اللہ ﷺ عجا لامر المؤمن ان امر المؤمن کلہ خیر ان اصابته سراء فشکر کان خیرا وان اصابته ضراء فصبر کان خیرا"

(مسلم، بیہقی، درمنثور)

حضرت صہیب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مومن کا ہر کام باعث تعجب ہے اگر اسے خوشی حاصل ہو تو وہ شکر ادا کرے تو یہ بھی اس کے لئے خیر ہے اور اگر مصیبت پہنچے تو صبر کرے تو یہ بھی اس کے لئے خیر ہے۔

☆ "عن محمد بن کعب القرظی قال یا ہؤلاء احفظوا ثنتین شکر النعمۃ واخلص الایمان" (الخرائطی، درمنثور)

محمد بن کعب قرظی کہتے ہیں اے لوگو دو چیزوں پر ہمیشہ عمل جاری رکھو نعمت پر شکر کرنا اور ایمان میں خلوص۔

☆☆☆☆☆

﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ إِنَّ اللَّهَ

مَعَ الصَّابِرِينَ ﴾

- (۱) ”اے ایمان والو صبر اور نماز سے مدد چاہو بے شک اللہ صابروں کے ساتھ ہے“
 (۲) ”اے ایمان والو مدد طلب کرو صبر اور نماز سے بیشک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے“

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ : (اے ایمان والو)

” وصفهم بالایمان اثر تعداد ما یوجبه ویقتضیه تنشیطالهم وحثا علی
 مراعاة ما یعقبه من الامر “ (ابو السعود)

ایمان والے کہہ کر پکارنے کی وجہ یہ ہے کہ جب مشکل احکام کا حکم دیا جاتا ہے تو ان کو پیار سے
 ”ایمان والو“ کہہ کر اس کام کو خوشی سے ادا کرنے پر چست کیا جاتا ہے اور احکام پر عمل کرنے کے لئے
 براہیختہ کیا جاتا ہے۔

اسْتَعِينُوا : امداد طلب کرو ”فی کل ماتأتون وما تذرون“ امداد طلب کرو ہر اس کام
 میں جس کے کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور ہر اس کام میں جس کے چھوڑنے کا حکم دیا گیا..... (ابو السعود)
 یہ عام معنی ان تمام خصوصی معانی کو شامل ہے:

” استعينوا بالصبر علی الذکر والشکر وسائر الطاعات من الصوم
 والجهاد وترك المبالاة بطعن المعاندين فی امر القبلة “

صبر سے امداد طلب کرو ذکر و شکر پر اور تمام طاعات پر خواہ روزہ ہو یا جہاد اور قبلہ کی تبدیلی کے
 معاملہ میں معاندین (مخالفین، عناد رکھنے والے) کے طعنوں کی کچھ پرواہ نہ کرتے ہوئے صبر سے امداد
 طلب کرو۔ (روح المعانی)

صبر کیا ہے: ”الصبر الامساک فی ضیق“ مشکلات میں، تنگی میں رک جانا۔

اصطلاح میں صبر کا معنی یہ ہے ”والصبر حبس النفس علی ما یقتضیه العقل والشرع“
 اپنے آپ کو ان کاموں پر روکنا (یعنی وہ کام کرنا) جو عقل اور شریعت کے مطابق ہوں۔ (از مفردات راغب)

لیکن یہ خیال رہے کہ عقل شریعت کے تابع ہے شریعت کے خلاف عقل کے مطابق کام کرنا
زندیقیت، یہودیت و نصرانیت ہے۔

صبر کی تین قسمیں ہیں:

- (۱) ”صبر علی ترک المحارم والمآثم“ حرام کاموں اور گناہوں سے رکنے اور ان سے باز رہنے کو صبر کہا جاتا ہے سب سے پہلے اسی کا مقام بھی ہے کیونکہ ترک کفر پہلے ہے ایمان بعد میں۔
- (۲) ”صبر علی فعل الطاعات والقربات“ نیکی اور قربت کے کاموں میں صبر کرنا یعنی نیکی کے کاموں میں مشقت کو برداشت کرنا یہی صبر عظیم ہے یہی مقصود ہے اسی پر اجر عظیم مرتب ہوتا ہے۔
- (۳) ”الصبر علی المصائب والنوائب“ مصیبتوں اور تنگیوں میں صبر سے کام لینا اور برداشت کرنا۔

(ابن کثیر)

صبر صرف انسانوں کے ساتھ خاص کیوں؟

جانوروں کو صبر کا حکم اس لئے نہیں دیا گیا کہ وہ صرف شہوت رکھتے ہیں عقل نہیں رکھتے، اور فرشتوں کو صبر کا حکم اس لئے نہیں دیا گیا کہ وہ صرف عقل رکھتے ہیں شہوت نہیں۔

انسان چونکہ ابتداء میں حیوانوں کی طرح ہی ہوتا ہے اسے صرف کھانے، پینے کی خواہش ہوتی ہے تھوڑا بڑا ہو تو کھیلنے کی خواہش پیدا ہوتی، بالغ ہوا تو خواہشات نفسانیہ (جماع وغیرہ کی خواہشات) کا غلبہ ہو جاتا ہے۔ جس طرح انسان آہستہ آہستہ عمر کے مدارج طے کرتا جاتا ہے اسی طرح عقل میں بھی ترقی ہوتی چلی جاتی ہے اگرچہ بڑھاپے میں پھر اس میں کمی آ جاتی ہے۔

بالغ ہونے کے بعد خواہشات کا تقاضہ یہ ہوتا ہے وہ جلدی سے لذات کو حاصل کرے خواہ وہ ناجائز طریقہ سے ہی کیوں نہ حاصل ہوں۔ اس وقت عقل سے کام لینے کی ضرورت ہے کہ ان خواہشات سے باز رہ کر سعادت مندی حاصل کرے عقل کو خواہشات پر غلبہ حاصل ہو گیا تو صبر خود بخود حاصل ہو گیا اگر خواہشات عقل پر غالب آ گئیں تو اسی کا نام بے صبری ہے۔

(از عزیز)

صبر کی تقسیم کا خوبصورت انداز:

صبر کی دو قسمیں ہیں بدنی اور نفسانی۔ بدنی کی پھر دو قسمیں ہیں فعلی اور انفعالی۔

صبر فعلی یہ ہے کہ مشکل کاموں پر عمل کرنا، یعنی اعمال شاقہ کو برداشت کرنا، اور ان پر عمل کرنا۔

صبر انفعالی یہ ہے کہ دکھ، درد، مصائب و آلام اور تکالیف کو برداشت کرنا اور ان پر صابر رہنا۔

صبر نفسانی یہ ہے کہ نفس کو اس کی طبیعت کے تقاضا سے دور رکھنا نفسانی خواہشات کا تقاضا ہی

برائی کا ہوتا ہے اگر پیٹ اور فرج کو بری خواہشات سے روک رکھے تو اسے عفت کہا جاتا ہے۔ اگر زیادہ

مال جمع کرنے کی حرص اور لالچ سے انسان اپنے آپ کو روک رکھے تو اسے زہد اور قناعت کہا جاتا ہے

اگر جزع و فزع، آہ و فغان، چیخ و پکار اور منہ پر طمانچہ مارنے اور گریبان چاک کرنے اور کپڑے

پھاڑنے سے مصیبت کے وقت باز رہے تو اسے عرف عام میں صبر کہا جاتا ہے جس کا نام صبر عرفی ہے۔

اگر غنی ہونے اور دولت مند ہونے کی صورت میں اپنے آپ کو تکبر سے بچا کر رکھے دوسروں کو

پست سمجھنے اور اپنے آپ کو بلند سمجھنے سے بچا کر رکھے تو اس صبر کو فراخی حوصلہ کہتے ہیں۔

اگر میدان جنگ سے اپنے آپ کو بھاگنے سے بچا کر رکھے اور ثابت قدم رہے تو اس صبر کو

شجاعت کہتے ہیں۔

اگر غیظ و غضب کی حالت میں کسی کو مارنے اور گالی دینے سے اپنے آپ کو روک کر رکھے تو اس

صبر کو حلم کہتے ہیں۔

اگر کسی اہم کام میں اضطراب اور حیرانگی سے بچ کر رہے تو اس صبر کو بھی وسعت حوصلہ کہتے ہیں۔

اگر انسان کسی کے راز کو دوسروں پر ظاہر کرنے سے رک جائے تو اسے رازداری کہتے ہیں۔ صبر کی

تمام قسمیں اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں پر شکر کرنا اور زیادہ نعمتوں کے حصول کا ذریعہ ہے۔

حقیقت صبر کیا ہے؟ حقیقت میں اسے صبر نہیں کہا جاسکتا کہ آدمی کو کسی مکروہ چیز کی کدورت

حاصل نہ ہو یا مکروہ چیز حاصل ہو لیکن یہ مکروہ نہ سمجھے۔ بلکہ حقیقت میں صبر یہ ہے کہ انسان باوجود کدورت

اور طبعی کراہیت کے جو عقل اور شرع کے منافی ہے اس پر جزع و فزع، چیخ و پکار سے اپنے آپ کو روک

رکھے۔ ہاں اگر تکالیف اور دکھ درد میں انسان کے بے اختیار آنسو نکل آئیں چہرے کا رنگ بے اختیار بدل جائے تو یہ صبر کے منافی (مخالف) نہیں۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ کے اپنے بیٹے ابراہیم کی وفات کے وقت آنسو جاری تھے اور آپ یہ فرما رہے تھے ”واللہ انا بفراقک یا ابراہیم لمحزونون“ قسم ہے اللہ تعالیٰ کی اے ابراہیم ہم تیرے فراق (موت) پر غمناک ہیں۔

اور آپ یہ فرما رہے تھے ”ان العین تدمع والقلب يحزن ولا نقول الا ما يرضی ربنا“ بیشک آنکھ آنسو بہا رہی ہے اور دل غمناک ہے اور ہم وہی بات کہتے ہیں جس پر ہمارا رب راضی ہو۔ ہم رب تعالیٰ کی رضا مندی کے خلاف کوئی بات نہیں کرتے۔

صرف غم اور ملال کا حاصل ہونا صرف آنسو بہانا لیکن جزع و فزع نہ کرنا اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے اسی قسم کی حالت کو یوں بیان کیا گیا ہے ”وانما یرحم اللہ من عبادہ الرحماء“ اللہ تعالیٰ اپنے رحم کرنے والے بندوں پر رحم فرماتا ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ غم اور پریشانی کا لاحق ہونا اور آنسو بہنا انسانی طاقت سے باہر ہے لہذا ان سے روکنا تکلیف مالا یطاق ہے۔ رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿لَا يَكْلِفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا﴾ اللہ تعالیٰ کسی نفس کو تکلیف نہیں دیتا سوائے اس کی طاقت کے“

(ماخوذ از عزیزی)

فضیلت صبر:

”الصابر علی البلاء یرفعہ اللہ ثلاثمائة درجة بین کل درجتین کما بین السماء والارض مرة والصابر علی دوام الطاعة یرفعہ اللہ ستمائة درجة بین کل درجتین کما بین السماء والارض مرتین والصابر عن المعصية یرفعہ اللہ تسعمائة درجة بین کل درجتین کما بین السماء والارض ثلاث مرات“

مصیبت پر صبر کرنے والے شخص کے اللہ تعالیٰ تین سو درجات بلند فرماتا ہے ہر دو درجہ میں اتنی بلندی ہوتی ہے جیسے زمین و آسمان میں ایک مرتبہ کا فاصلہ ہے۔ اور طاعت پر ہمیشہ صبر کرنے والے کے اللہ تعالیٰ چھ سو درجات بلند فرماتا ہے ہر دو درجہ میں اتنی بلندی ہوتی ہے جتنی زمین و آسمان میں دو مرتبہ بلندی پائی جاتی ہے اور گناہوں سے رک کر صبر کرنے والے کے اللہ تعالیٰ نو سو درجات بلند فرماتا ہے ہر دو

درجہ کے درمیان اتنا فاصلہ اور بلندی ہوتی ہے جتنا زمین و آسمان کے درمیان فاصلہ
تین مرتبہ پایا جائے۔
(صاوی)

اسی سے واضح ہو گیا کہ سب سے اعلیٰ درجہ گناہوں سے رکنا ہے کیونکہ اس کے اوپر نیکیوں کا عمل
مرتب ہے اور سب سے کم درجہ مصیبت پر صبر کرنا ہے۔ خیال رہے کہ ابن کثیر نے نیکیوں پر عمل کرنے کی
فوقیت کا ذکر کیا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

تاہم یہ خیال رہے کہ لوگوں کے ذہنوں میں صرف ایک صبر ہے جو سب سے کم درجہ کا صبر ہے اور
جو اعلیٰ درجہ کے صبر ہیں ان کو بھولے ہوئے ہیں۔

☆ "قال عبد الرحمن بن زید بن اسلم الصبر فی بابین الصبر لله بما احب وان ثقل
على النفس والابدان والصبر لله عما كره وان نازعت اليه الا هواء فمن كان هذا فهو من
الصابرین الذی یسلم علیہم ان شاء الله" (ابن کثیر)

عبد الرحمن بن زید بن اسلم کہتے ہیں صبر کی دو قسمیں عظیم درجہ رکھتی ہیں اللہ تعالیٰ کی رضا کے
لئے صبر کرے اس چیز پر جو رب تعالیٰ کو پسند ہے یعنی طاعت پر صبر کرے اگرچہ اس کے نفس اور بدن پر
بوجھ بھی محسوس ہو۔ اور اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کے لئے ان چیزوں سے جو رب تعالیٰ کو ناپسند ہیں
یعنی معصیت سے باز رہے اگرچہ اس کی خواہشات ان گناہوں سے رکنے پر کاوٹ ہی کیوں نہ بنیں۔
جس شخص میں یہ دونوں قسم کے صبر پائے جائیں گے وہی صابرین سے ہوگا اور ان کو سلام کرے
گا اگر اللہ نے چاہا۔

☆ "قال علی بن الحسین زین العابدین اذا جمع الله الاولین والآخرین ینادی مناد
ابن الصابرون لیدخلوا الجنة قبل الحساب قال فيقوم عنق من الناس فتلقاهم الملائكة
فيقولون الى اين يا بنی آدم فيقولون الى الجنة فيقولون وقبل الحساب قالوا نعم قالوا ومن
انتم قالوا نحن الصابرون قالوا وما كان صبرکم قالوا صبرنا على طاعة الله وصبرنا عن
معصية الله حتى توفانا الله قالوا انتم کما قلتم ادخلوا الجنة فنعم اجر العاملين" (ابن کثیر)
حضرت علی بن حسین زین العابدین فرماتے ہیں جب اللہ تعالیٰ اولین و آخرین کو جمع فرمائے گا
تو نداء دینے والا نداء دے گا صبر کرنے والے کہاں ہیں کہ وہ حساب سے پہلے ہی جنت میں داخل

ہو جائیں آپ فرمائے کچھ لوگ کھڑے ہوں گے فرشتے ان کو ملیں گے ان سے پوچھیں گے اے لوگو کہاں جا رہے ہو؟ وہ کہیں گے جنت میں جا رہے ہیں فرشتے کہیں گے کیا حساب سے پہلے ہی جنت میں جا رہے ہو؟ وہ کہیں گے ہاں فرشتے ان سے پوچھیں گے تم کون ہو؟ وہ کہیں گے ہم صبر کرنے والے ہیں فرشتے ان سے پوچھیں گے تمہارا صبر کیا ہے؟ وہ کہیں گے ہم اللہ تعالیٰ کی طاعت پر صبر کرتے رہے اور گناہوں سے صبر کرتے رہے یعنی گناہوں سے بچتے رہے ہم اسی حال میں رہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں فوت کر دیا فرشتے کہیں گے ہاں واقعی تم ایسے ہی تھے جیسے کہہ رہے ہو لہذا اب تم جنت میں داخل ہو جاؤ۔ پس اچھا عمل کرنے والوں کا اجر اچھا ہے۔ ابن کثیر کہتے ہیں کہ حضرت زین العابدین رحمہ اللہ کی اس روایت کو رب تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی سے تائید حاصل ہے:

﴿إِنَّمَا يُؤَفِّى الصَّابِرُونَ أَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾

”صبر کرنے والوں کو اجر بغیر حساب کے دیا جائے گا“ (ابن کثیر)

وَالصَّلَاةُ : اور نماز (سے امداد طلب کرو) ابھی تک صبر کی جو بحث کی گئی اس میں تمام طاعات کا ذکر ہو چکا ہے لیکن پھر نماز کا اس کے بعد ذکر کرنا اس وجہ سے ہے ”خصھا بعد التعمیم لرفعہ شانہا فانہا ام العبادات جامعۃ للطاعات معراج للمؤمن“ کہ یہ تخصیص بعد از تعمیم ہے (عمومی طور پر اگرچہ پہلے نماز کا ذکر ہو چکا ہے لیکن اب خصوصی طور پر ذکر کیا جا رہا ہے) تاکہ نماز کی شان کی بلندی واضح ہو جائے کیونکہ یہ تمام عبادات کی اصل ہے اور تمام طاعات کی جامع ہے اور مومن کی معراج ہے۔

☆ ”عن علی مرفوعاً الصلوة عماد الدین“ (رواہ صاحب مسند الفردوس)

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مرفوع حدیث مروی ہے کہ نماز دین کا ستون ہے۔

☆ ”وعن انس مرفوعاً الصلوة نور المؤمن“ (رواہ ابن عساکر)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مرفوع حدیث مروی ہے کہ نماز مومن کا نور ہے۔

”قال المجدد رضی اللہ عنہ غایۃ مقامات العابدین حقیقۃ الصلوة

والترقی ہناک بکثرة الصلوة“

”مجدد رحمہ اللہ نے فرمایا عابدین کے مقام کی انتہاء حقیقت نماز ہے اور کثرت نماز سے

(مظہری)

اس مقام سے ترقی حاصل ہوتی ہے۔

إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ : ”بیشک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔“

اللہ تعالیٰ تو ہر شخص کے ساتھ ہے تو صبر کرنے والوں کے ساتھ ہونے کا کیا مطلب ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں مراد معیت (سنگت) خاصہ ہے یعنی بالعون والنصر والاجابة یعنی معاونت اور نصرت اور دعا کی قبولیت کی معیت اللہ تعالیٰ کی صبر کرنے والوں کو حاصل ہے۔ قاضی محمد ثناء اللہ مظہری رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

”قلت بل معية غير متكيفة يتضح على العارفين ولا يدرك كنهه غير

احسن الخالقين“

اس معیت کی کیفیت بیان نہیں کی جاسکتی یہ تو صرف عارفین، اولیاء اللہ یعنی اللہ والے ہی جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے بلکہ اللہ والوں کی پہچان بھی ظاہری ہے اس معیت کی حقیقت کا ادراک سوائے اللہ تعالیٰ احسن الخالقین کے کوئی نہیں جانتا۔ (مظہری)

جب پہلے دو چیزوں کا ذکر ہے ”صبر اور نماز“ تو صرف ﴿إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ﴾ کہا گیا ہے لیکن ”ان الله مع المصلين“ نہیں کہا گیا اس کی کیا وجہ ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے ”لانه اذا كان مع الصابرين كان مع المصلين من باب اولی لاشتمال الصلوة علی الصبر“ کہ بیشک جب اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے تو نماز ادا کرنے والوں کے ساتھ بھی ہے یقینی طور پر، چونکہ نماز کا ذکر صبر میں آچکا تھا کہ نماز صبر اور تمام عبادات پر مشتمل ہے۔ (سورۃ فاتحہ کی وضاحت میں نجوم الفرقان کو دیکھیں) تو علیحدہ ذکر نہیں کیا۔ (از روح المعانی)

طلباء کرام یہ نہ سمجھیں کہ اس جواب میں تو تعارض ہے کہ امداد طلب کرنے میں تو صبر اور نماز کو علیحدہ ذکر کر دیا گیا تو معیت کے ذکر میں علیحدہ ذکر نہیں کیا اس کی وجہ کیا ہے؟ وجہ واضح ہے کہ نماز کی اہمیت کے لحاظ سے علیحدہ ذکر کیا گیا لیکن جب ایک مرتبہ ذکر کر دیا دو بارہ جب صبر سے نماز کا ذکر سمجھ آ رہا تھا تو علیحدہ ذکر نہیں کیا۔

﴿وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَكِنْ لَا تَشْعُرُونَ﴾

- (۱) ”اور جو خدا کی راہ میں مارے جائیں انہیں مردہ نہ کہو، بلکہ وہ زندہ ہیں ہاں تمہیں خبر نہیں“
(۲) ”اور نہ کہو جو اللہ کی راہ میں شہید کر دیئے گئے ان کو مردہ بلکہ وہ زندہ ہیں اور لیکن تمہیں شعور نہیں“

شان نزول: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ارشاد گرامی یہ ہے کہ ”نزلت الآية فی قتلى بدر“ یہ آیت بدر میں شہید ہونے والوں کے حق میں نازل ہوئی۔ بدر میں چودہ مسلمان شہید ہوئے چھ مہاجرین سے اور آٹھ انصار سے۔

مہاجرین شہداء کے اسماء گرامی: عبیدہ بن حارث بن عبدالمطلب اور عمرو بن ابی وقاص اور ذوالشمالین اور عمرو بن نفیلہ اور عامر بن بکر اور صہبہ جع بن عبد اللہ۔
انصار شہداء کے اسماء گرامی: سعید بن خثیمہ اور قیس بن عبدالمنذر اور زید بن حارث اور تمیم بن ہمام اور رافع بن معلیٰ اور حارثہ بن سراقہ اور معوذ بن عفراء اور عوف بن عفراء۔

لوگ جب ان شہداء کا تذکرہ کرتے تو یہ کہتے ”مات فلان، مات فلان“ فلاں فوت ہو گیا فلاں فوت ہو گیا۔ اسی طرح کافر اور منافق لوگ کہنے لگے ”ان الناس يقتلون انفسهم طلبا لمرضاة محمد من غير فائدة“ کہ یہ مسلمان بغیر کسی مقصد اور فائدہ کے صرف محمد کو راضی کرنے کے لئے اپنے آپ کو قتل کر رہے ہیں ”فنزلت هذه الآية“ تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی کہ تم ان کو مردہ نہ کہو وہ تو اللہ تعالیٰ کی راہ میں جان قربان کر کے حیات جاودانی (ہمیشہ کی زندگی) پا گئے۔ (از کبیر)
اور یہ بھی واضح ہو گیا کہ نبی کریم ﷺ کی رضا کو حاصل کرنے والوں کو بے فائدہ کام کرنے والے کہنا کافروں اور منافقوں کا کام ہے۔

فضیلت شہادت:

”عن ابی قتادة عن رسول الله ﷺ انه قام فيهم فذكر لهم ان الجهاد

فی سبیل اللہ والایمان باللہ افضل الاعمال فقام رجل فقال یا رسول اللہ
ارایت ان قتلت فی سبیل اللہ اتکفر عنی خطایای فقال رسول اللہ
ﷺ نعم ان قتلت فی سبیل اللہ وانت صابر محتسب مقبل غیر مدبر
الا الدین فان جبرئیل علیہ السلام قال لی ذلک

(مسلم ج ۲ ص ۱۴۳ باب من قتل فی سبیل اللہ کفرت خطایاه الا الدین)

حضرت ابوقحادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ ایک مرتبہ صحابہ کرام میں کھڑے
ہوئے ان کے سامنے اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنے اور رب تعالیٰ پر ایمان لانے کی
فضیلت بیان فرمائی۔ ایک صحابی کھڑے ہوئے عرض کیا یا رسول اللہ آپ کیا فرماتے
ہیں کہ اگر میں اللہ کی راہ میں شہید ہو جاؤں کیا میرے گناہ مٹا دیئے جائیں گے؟ نبی
کریم ﷺ نے فرمایا ہاں اگر تمہیں اللہ کی راہ میں شہید کر دیا گیا ایسے حال میں کہ تم نے
صبر اور خلوص سے جہاد کیا دشمن کے سامنے رہے پیٹھ پھیر کر نہ بھاگے (تو تمہارے تمام
گناہ مٹا دیئے جائیں گے) سوائے قرض کے بیشک جبریل نے مجھے ابھی آ کر بتایا۔

وضاحت حدیث: ”فیہ ہذہ الفضیلۃ العظیمۃ للمجاہد وہی تکفیر خطایاہ کلہا الا
حقوق الادمیین“

اس حدیث پاک میں اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے کی عظیم فضیلت ذکر کی گئی کہ اس کے تمام
گناہ مٹا دیئے جائیں گے لیکن لوگوں کے حقوق معاف نہیں ہوں گے۔

لیکن یہ فضیلت ان شرائط سے مشروط ہے ایک تو یہ کہ وہ جہاد کرنے میں صابر ہو مضطرب ہو کر
ادھر ادھر بھاگتا نہ پھرے۔

اور دوسری شرط یہ ہے کہ وہ محتسب ہو۔ اس مقام پر محتسب کا معنی یہ بیان کیا گیا ہے ”هو
المخلص للہ تعالیٰ“ کہ وہ صرف اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کے لئے خلوص سے جہاد کرے۔

اسی سے یہ مسئلہ خود بخود واضح ہو گیا کہ ”فان قاتل لعصبیۃ او لغنیمۃ او لصیت او
نحو ذلک فلیس لہ ہذا الثواب ولا غیرہ“ اگر کسی شخص نے خاندانی تعصب کے طور پر جہاد
میں حصہ لیا۔ یا مال غنیمت حاصل کرنے کے لئے جہاد میں شریک ہوا۔ یا شہرت اور چرچا حاصل کرنے
کے لئے یا اور اس قسم کے مقاصد حاصل کرنے کے لئے جہاد میں شریک ہوا جن میں خلوص نہیں پایا گیا تو

وہ ثواب سے محروم رہے گا۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا ”إِلَّا الَّذِينَ“ (سوائے قرض کے) ففیہ تنبیہ علی جمیع حقوق الادمیین وان الجهاد والشهادة وغيرهما من اعمال البر لا یکفر حقوق الادمیین وانما تکفر حقوق الله تعالیٰ“ اس سے آپ نے اس مسئلہ کی طرف متنبہ کیا کہ انسانوں کے تمام حقوق کسی عبادت سے معاف نہیں ہوتے خواہ جہاد ہو اللہ کی راہ میں، خواہ شہادت حاصل کر لے خواہ اور نیکی کا کوئی کام کرے ہاں البتہ اللہ تعالیٰ اپنے حقوق معاف فرما دیتا ہے۔

صحابی کے سوال میں ابتدائی طور پر مطلقاً ”نعم“ (ہاں تمام گناہ مٹ جائیں گے) فرمایا لیکن رب تعالیٰ نے جبریل کو بھیج کر بتایا کہ یا رسول اللہ آپ انکو بتادیں کہ حقوق العباد میں کسی عبادت سے معاف نہیں کروں گا۔ وہ حقوق ادا کر کے میرے پاس آئیں، نہیں تو پھر ایک اور حدیث میں بیان کر دیا گیا ہے کہ حساب کے وقت قیامت کے دن اس شخص کی نیکیاں اسے دی جائیں گی جس کا حق اس نے ادا نہیں کیا تھا اگر نیکیاں دینے سے بھی حق ادا نہ ہوا تو اس شخص کے گناہ اس پر ڈال دیئے جائیں گے جس نے حق دے دیا ہوا تھا۔

☆ ”عن مسروق قال سألنا عبد الله عن هذه الآية: ﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتًا بَلْ أَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ﴾ قال اما انا قد سألنا عن ذلك فقال ارواحهم في جوف طير خضر لها قناديل معلقة بالعرش تسرح من الجنة حيث شاءت ثم تاوي الى تلك القناديل فاطلع اليهم ربهم اطلاعة فقال هل تستهون شيأ قالوا أئى شئى نستهي ونحن نسرح من الجنة حيث شئنا ففعل ذلك بهم ثلاث مرات فلما رأوا انهم لن يتركوا من ان يسألوا قالوا يا رب ان ترد ارواحنا في اجسادنا حتى نقتل في سبيلك مرة اخرى فلما رأى ان ليس لهم حاجة تركوا“ (مسلم ج ۲ ص ۱۴۳ باب فی بیان ارواح شهداء فی الجنة الخ)

حضرت مسروق کہتے ہیں ہم نے سوال کیا حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے اس آیت کریمہ کے متعلق (ترجمہ) (اور ہرگز ہرگز گمان نہ کرو ان لوگوں کو جو اللہ کی راہ میں شہید کر دیئے گئے کہ وہ مردہ ہیں بلکہ وہ زندہ ہیں اپنے رب کے ہاں ان کو رزق دیا جاتا ہے) انہوں نے کہا بیشک ہم نے اس کا سوال (نبی کریم ﷺ سے) کیا تھا تو آپ نے فرمایا ان کی روئیں سبز رنگ کے پرندوں کے قالب میں رکھی

جائیں گے جن کی قنادیل عرش سے معلق ہوں گی وہ جنت کے پھل کھانے کے لئے جہاں چاہیں گے سیر کریں گے پھر وہ اپنی قندیلوں میں آجائیں گے تو رب تعالیٰ ان پر جلوہ گری فرمائے گا اور ارشاد فرمائے گا کیا تم کسی چیز کی خواہش رکھتے ہو تو وہ کہیں گے ہمیں اب کسی اور چیز کی خواہش کیا ہونی ہے جب کہ جنت سے منافع ہم حاصل کر رہے ہیں جہاں چاہتے ہیں ہم جاتے ہیں اسی طرح ان سے تین مرتبہ سوال و جواب ہونا ہے۔ جب وہ دیکھیں گے کہ ہم سے بار بار سوال کیا جا رہا ہے ہمیں جواب دینا ہی چاہئے تو وہ عرض کریں گے اے اللہ ہماری روحوں کو ہمارے جسموں میں لوٹا دے تاکہ ہم تیری راہ میں پھر شہید ہو جائیں۔ جب رب تعالیٰ دیکھے گا کہ ان کو کسی چیز کی اب کوئی حاجت نہیں تو ان کو اسی حال میں چھوڑ دیا جائے گا۔

وضاحت حدیث: مسلم شریف کے بعض نسخوں میں ”عبداللہ بن مسعود“ ہے یعنی مسروق نے سوال عبداللہ بن مسعود سے کیا اسی طرح بعض نسخوں میں ہے ”انا قد سألنا عن ذلک فقال یعنی النسبیؓ“ بیشک ہم نے اس کے متعلق سوال کیا تھا یعنی نبی کریم ﷺ سے (راقم نے اسی وجہ سے ترجمہ اسی کے مطابق کیا)

”وفیه بیان ان الجنة مخلوقة موجودة وهو مذهب اهل السنة وهي التي اهبط منها آدم وهي التي ينعم فيها المؤمنون في الآخرة هذا اجماع اهل السنة“

اس حدیث پاک سے یہ روز روشن کی طرح عیاں ہوا کہ بیشک جنت کی تخلیق ہو چکی ہے اور وہ اب بھی موجود ہے یہی مذہب اہل سنت کا ہے اور یہی وہ جنت ہے جس سے آدم علیہ السلام کو اتارا گیا اور یہی وہ جنت ہے جس میں مومن لوگوں کو آخرت میں نعمتوں سے نوازا جائے گا اسی پر اہل سنت کا اجماع ہے۔

مقرنہ اور بعض بدعتی لوگوں نے کہا کہ جنت اب موجود نہیں وہ جنت جو مومنوں کو حاصل ہونی ہے وہ قیامت کے بعد پیدا کی جائے گی اور جس جنت سے آدم علیہ السلام کو نکالا گیا وہ اور ہے۔ ”وظواهر القرآن والسنة تدل لمذهب اهل الحق“ قرآن پاک کی ظاہر اور روشن آیات اور

احادیث مبارکہ اہل حق کے مذہب پر دلالت کر رہی ہیں۔ ان شاء اللہ حق کا ہی بول بالا رہے گا باطل مٹ کر رہے گا۔ معتزلہ اور بدعتی لوگوں سے بھی چند قدم آگے یہود و نصاریٰ کے پروردہ لوگ نکل گئے معتزلہ اور بدعتی لوگوں نے دنیاوی زندگی تک شہداء کے مرتبہ کو کم کرنے کی کوشش کی نہ ابھی تک کوئی جنت ہے اور نہ ہی شہداء کو قیامت سے پہلے جنت سے کوئی فائدہ حاصل ہونا ہے۔ یہ قول بھی احادیث مبارکہ کا صریح طور پر انکار ہے لیکن یہودیوں اور نصرائیوں کے یاروں نے مکمل طور پر جنت کا انکار کر دیا۔ انہوں نے آخرت کے تصور کو ہی (معاذ اللہ) باطل قرار دیا۔ اور قبر کے عذاب کا بھی انکار کیا تاکہ مسلمانوں کے دلوں سے جذبہ جہاد کو نکال دیا جائے اور شوق شہادت سے مومنوں کے دلوں کو خالی کر دیا جائے جب آخرت اور قبر کے عذاب کا ڈر کسی کو حاصل نہیں ہوگا تو وہ من مانیوں کرتا رہے گا اس کو عیاشی کا کھلا موقع مل جائے گا یہی لوگ ملک و ملت کے دشمن ہیں۔

قیامت سے پہلے عذاب و ثواب: ”وفیہ اثبات مجازاة الاموات بالثواب والعقاب قبل القيامة“ اسی حدیث پاک سے یہ سمجھ آ گیا کہ مردہ لوگوں کو قیامت سے پہلے بھی ثواب عطا ہوگا اور اسی طرح قیامت سے پہلے کچھ لوگوں کو عذاب ہوگا۔ ثواب پر تو رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی جس کا ذکر اس حدیث میں ہے ﴿بَلْ اَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ﴾ دلالت کر رہا ہے۔

”واما غیرہم فانما یرض علیہ مقعدہ بالغداة والعشی کما جاء فی حدیث

ابن عمرو کما قال فی آل فرعون النار یرضون علیہا غدوا وعشیا“

لیکن مومنین کے بغیر کفار کو ان کا جہنم والا مقام صبح و شام قیامت سے پہلے پیش کیا جائے گا جیسا کہ حدیث ابن عمرو میں واضح ہے اور صریح طور پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی جو کہ آل فرعون کے متعلق ہے دلالت کر رہا ہے ﴿النار یرضون علیہا غدواً وعشیاً﴾ ان پر صبح و شام آگ کو پیش کیا جائیگا۔ کیونکہ قیامت کے بعد کا ذکر ان الفاظ مبارکہ کے بعد ہے ﴿وَيَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ اَدْخِلُوا آلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ﴾ اور جس دن قیامت قائم ہوگی (فرشتوں سے کہا جائے گا) آل فرعون کو سخت عذاب میں داخل کر دو۔

(نووی زہر حدیث مدکور)

تنبیہ: اسی مضمون کی احادیث میں الفاظ مختلف ہیں مسلم میں ہے ”فی جوف

طیر خضر " اور مسلم کے بغیر باقی احادیث کی کتب میں بعض جگہ " لطیر خضر " اور بعض احادیث میں " بحواصل طیر " ہے " جوف " کا معنی پیٹ " حواصل " کا معنی پوٹے ان تمام کا معنی صدر الافاضل حضرت مولانا نعیم الدین مراد آبادی رحمہ اللہ نے خوبصورت کیا (سبز پرندوں کے قالب میں ہوں گی) البتہ حدیث قتادہ میں " فی صورة طیر ابيض " ہے سفید پرندے کی صورت میں۔ ممکن ہے بعض روحمیں سفید پرندوں کی شکل کے قالب میں ہوں اور بعض سبز پرندوں کی شکل کے قالب میں ہوں۔

اعتراض : یہ تو تناخ ہے کہ اچھی صورتوں میں روحوں کو منتقل کرنا اور ان کو نعمت و راحت پہنچانا۔ اور بری صورتوں میں منتقل کرنا اور ان کو عذاب دینا جب یہ مذہب ملحدین کا ہے اور باطل ہے تو حدیث شریف کا مطلب کیا ہے۔

جواب اول : تناخ یہاں کیسے لازم ہے جب کہ حدیث شریف میں صراحت یہ بھی موجود ہے " حتی یرجعه اللہ الی جسده یوم یبعثہ یعنی یوم یجنی بجمیع الخلق واللہ اعلم " کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن جب سب مخلوق کو اٹھائے گا تو شہداء کی ارواح اپنے اپنے جسموں سے مل جائیں گی۔

جواب دوم : موطا امام مالک میں ہے " انما نسمة المؤمن طیر " مؤمن کے جسم کو پرندے کی شکل دے دی جائے گی " والنسمة تطلق علی ذات الانسان جسما وروحا وتطلق علی الروح مفردة وهو المراد بها " جسم انسان کے جسم اور روح کے مجموعہ کو بھی کہتے ہیں اور فقط روح کو بھی کہا جاتا یہاں فقط روح مراد ہے موطا امام مالک کی حدیث اور علامہ نووی کی وضاحت کے بعد واضح ہوا کہ شہداء کی ارواح کو ہی سبز رنگ کے پرندوں کی شکل دے دی جائے گی جو جنت کی سیر کریں گی بظاہر یوں محسوس ہوگا کہ شہداء کی روحمیں پرندوں کے قالب میں ہیں اس جواب سے تمام احادیث میں تطبیق ہو جائے گی۔

(ماخوذ از نووی بتغییر)

جواب سوم : معترضین کا اعتراض ہی غلط ہے کیونکہ وہ تناخ کے معنی کو ہی نہیں سمجھے کہ تناخ والوں کا کہنا کیا ہے؟ " من قالوا بالتناسخ فيقولون ان نفس زيد مثلاً اذا مات زيد تنتقل بعينه الی بدن المولود كعمرو " (حاشیہ زاہد ص ۱۱) تناخ کا مذہب رکھنے والے یہ کہتے ہیں کہ زید کی روح جب تک زید میں ہے اس وقت تک اسے زندہ رکھی ہوئے ہے اور اس کی نشوونما کا سبب ہے جب

زید مر جائے گا تو زید کے بدن سے روح کا تعلق ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گا پھر وہ روح زید کی طرف نہیں لوٹے گی بلکہ وہ روح عمرو کے پیدا ہونے پر عمرو کے جسم کی طرف منتقل ہو جائے گی اس طرح ایک روح ہزاروں بدنوں کی طرف منتقل ہوتی رہے گی۔ یہ بھی ضروری وہ نہیں سمجھتے کہ روح انسان کسی دوسرے انسان کی طرف ہی منتقل ہو جائے بلکہ ان کے نزدیک عام ہے کہ روح انسان کسی گدھے یا کتے یا خنزیر کے بدن میں منتقل ہو جائے۔ یہ لوگ ملحدین ہیں جن کے نزدیک قیامت نے نہ آنا ہے اور نہ ہی کوئی حساب و کتاب ہے اور نہ ہی کوئی ثواب و عذاب ہے ان کے نزدیک انسان کی روح انسان میں منتقل ہو جائے تو یہی ثواب ہے اور انسان کی روح کتے یا خنزیر میں منتقل ہو جائے تو یہی عذاب ہے۔

تناخ کا معنی سمجھنے کے بعد حدیث پاک کا مطلب واضح ہو گیا کہ شہداء کی روحوں کو سبز پرندوں کی شکل دی جائے گی۔ یا ان کے قالب میں بطور اعزاز منتقل کیا جائے گا وہ حقیقی پرندے نہیں ہوں گے ان کی کیفیت کو رب تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے پھر ہر ایک شہید کی روح قیامت کے دن اسی کے جسم سے منتقل ہو جائے گی۔

راقم کی وضاحت کو علامہ نووی کی اس عبارت میں دیکھیں جو اسی حدیث کے ضمن میں ہے:

”وشبهه بعض الملحدة القائلين بالتناسخ وانتقال الارواح وتنعيمها

فی الصور الحسان المرفهة وتعذيبها فی الصور القبيحة المسخرة

وزعموا ان هذا هو الثواب والعقاب وهذا ضلال بين وابطال لما

جاءت به الشرائع من الحشر والنشر والجنة والنار“ (نووی)

بعض ملحد (بے دین) لوگوں نے حدیث پاک کو تناخ سے تشبیہ دی ہے حالانکہ ان کے نزدیک تناخ روح کا انتقال اور اچھی صورت میں منتقل ہونا اسے راحت و نعمت دیا جانا ثواب ہے اور روح کا بری اور مسخر صورتوں میں منتقل ہونا عذاب۔

لیکن یہ ان کا قول واضح طور پر گمراہی ہے کیونکہ اس میں حشر و نشر اور جنت و دوزخ کو باطل کرنا اور انکار کرنا لازم آتا ہے جس کا ثبوت شریعت سے روز روشن کی طرح واضح ہے۔

☆ ”عن جابر قال رجل ابن انا يا رسول الله ان قتلت قال في الجنة فالقى تمرات كن في يده ثم قاتل حتى قتل وفي حديث سويد قال رجل للنبي ﷺ يوم احد“

(مسلم ج ۲ ص ۱۵۶ باب ثبوت الجنة للشهيد)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ اگر میں شہید کر دیا جاؤں تو کہاں ہوں گا؟ آپ نے فرمایا جنت میں تو اس صحابی نے اپنے کے ہاتھ سے کھجوروں کو ڈال دیا، قال (جہاد) کیا یہاں تک کہ شہید ہو گئے حضرت سید کی روایت کردہ حدیث میں ہے کہ یہ واقعہ احدثا ہے۔

فوائد: "فیہ ثبوت الجنة للشہید" اس حدیث پاک سے ثابت ہوا کہ شہید کے لئے جنت ثابت ہے جو اسے شہید ہوتے ہی حاصل ہو جائے گی۔ ابتدائی طور پر روح جنت میں سیر کرے گی اور اسے جنت کے منافع حاصل ہوں گے لیکن روح کا تعلق جسم سے بھی برقرار رہے گا جس طرح سورج کی شعاعوں کا تعلق زمین سے ہوتا ہے۔

"وفیہ مبادرۃ بالخیر" اور فائدہ یہ حاصل ہوا کہ نیکی کے کام میں جلدی کرنی چاہئے کیونکہ صحابی جنت کا ذکر سنتے ہی بغیر کسی تاخیر کے میدان قتال میں پہنچ گئے۔ "وانہ لا یشتغل عنہ بحفظ النفس" اور یہ سمجھ آیا کہ انسان نیکی کے مقابل اپنے ذاتی منافع کو چھوڑ دے، کیونکہ وہ صحابی کھجوریں کھا رہے تھے، لیکن نبی کریم ﷺ سے شہادت کی فضیلت سن کر کھجوریں ہاتھ سے نکال دیں۔ گویا کہ یہ کہتے ہوئے میدان جنگ میں کود پڑے کہ منصب عظیم اگر حاصل ہو گیا تو بہتر لیکن اگر شہادت جیسا عظیم منصب نہ حاصل ہوا تو کھجوریں کھانے کا وقت بہت ہے۔

جنت تلواروں کے سایہ میں:

"عن ابی بکر بن عبد اللہ بن قیس عن ابیہ قال سمعت ابی وهو بحضرة العد و یقول قال رسول اللہ ﷺ ان ابواب الجنة تحت ظلال السیوف فقام رجل رث الهيئة فقال یا ابا موسی انت سمعت رسول اللہ ﷺ یقول هذا قال نعم قال فرجع الی اصحابہ فقال اقرأ علیکم السلام ثم کسر جفن سیفہ فالقاه ثم مشی بسیفہ الی العدو فضرب بہ حتی قتل"

(مسلم ج ۲ ص ۱۴۷ باب ثبوت الجنة للشہید)

ابو بکر بن عبد اللہ بن قیس اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے اپنے باپ سے یہ کہتے ہوئے سنا جب وہ دشمن کے سامنے حاضر تھے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک جنت کے دروازے تلواروں کے سایے میں ہیں (یعنی شہید ہونا جنت میں جانے کا ذریعہ ہے) ایک شخص کھڑے ہوئے جو

پراگندہ حال میں تھے (یعنی پھٹے پرانے کپڑے، بال بکھرے ہوئے) وہ کہنے لگے اے موسیٰ واقعی تم نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا۔ انہوں نے کہا ہاں تو وہ شخص اپنے اصحاب کے پاس آئے اور کہا کہ میں تمہیں سلام کہتا ہوں پھر تلوار کے نیام کو توڑ کر پھینک دیا۔ پھر اپنی تلوار لے کر دشمن میں گھس گئے ان کو مارا یہاں تک کہ شہید ہو گئے۔

سبحان اللہ صحابہ کرام کا کتنا پختہ ایمان تھا کتنی زیادہ محبت تھی رسول اللہ ﷺ سے ادھر فرمان مصطفویٰ کی آواز کانوں میں پہنچی ادھر جان کی بازی لگا دی۔ جان قربان کرنے سے کفار کو سرنگوں کیا جاسکتا ہے آجکل کافر کی ذرا سی دھمکی پر مسلمانوں کے حکام کا پنہا شروع ہو جاتے ہیں۔

☆ "عن قتادة قال سمعت انس بن مالك يحدث عن النبي ﷺ قال ما من احد يدخل الجنة يحب ان يرجع الى الدنيا وان له ما على الارض من شئ غير الشهيد فانه يتمنى ان يرجع فيقتل عشر مرات لما يرى من الكرامة"

(مسلم ج ۲ ص ۱۴۲ باب فصل الجهاد فی سبیل اللہ)

حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے نبی کریم ﷺ کی حدیث بیان کرتے ہوئے سنا آپ نے فرمایا کوئی شخص جنت میں داخل ہو کر دنیا میں لوٹنا پسند نہیں کرے گا اور نہ ہی زمین میں کسی چیز کو پسند کرے گا سوائے شہید کے وہ تمنا کرے گا کہ میں دنیا میں لوٹ جاؤں پھر شہید کر دیا جاؤں اس طرح دس مرتبہ مجھے شہادت حاصل ہو جائے کیونکہ وہ شہادت کی وجہ سے کرامت (عزت) دیکھ چکا ہوگا۔

نبی کریم ﷺ کی تمنائے شہادت:

"عن ابی هريرة قال قال رسول الله كل كلم يكلمه المسلم في سبيل الله ثم تكون يوم القيامة كهيتها اذا طعنت تفجر دما اللون لوم دم والعرف (بافتح) عرف المسك وقال رسول الله ﷺ والذي نفس محمد بيده لو لا ان اشق على المؤمنين ما قعدت خلف سرية تغزو في سبيل الله ولكن لا اجد سعة فاحمهم ولا يجدون سعة فيتبعوني ولا تطيب انفسهم ان يقعدوا بعدى"

(مسلم ج ۲ ص ۱۴۱ باب فصل الجهاد والحروب في سبيل الله)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بروہ زخم جو مسلمان کو اللہ تعالیٰ

کی راہ میں آئے قیامت کے دن اس کو ایسی ہیئت (شکل) حاصل ہوگی جیسے اس پر نیزہ چلایا گیا ہو اور خون بہہ رہا ہو۔ رنگ خون کی طرح ہوگا، خوشبو کستوری کی طرح ہوگی اور نبی کریم ﷺ نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں محمد کی جان ہے اگر میں مومنوں پر مشکل نہ سمجھتا تو اللہ تعالیٰ کی راہ میں کی جانے والی کسی جنگ میں، میں پیچھے نہ رہتا لیکن اس میں مشکل یہی ہے کہ میرے جانے پر صحابہ بھی میری تابعداری کریں گے ان کو یہ پسند نہیں آئے گا کہ وہ پیچھے رہیں لیکن تمام کو شریک ہونے کی وسعت بھی حاصل نہیں ہوگی۔

فوائد : حدیث پاک سے حاصل ہوا: "ان الشهيد لا يزول عنه الدم بغسل ولا

والحكمة في مجيئه يوم القيامة على هيئته ان يكون معه شاهد فضيلته وبذله نفسه في طاعة الله تعالى" شہید کے خون کو غسل وغیرہ سے زائل نہیں کیا جائے گا اس میں یہ حکمت ہے کہ قیامت کے دن وہ اسی حالت پر اٹھایا جائے گا اس کی یہ حالت اس کی فضیلت اور اللہ کی اطاعت میں اس کے اپنی جان کو قربان کرنے پر گواہ بن جائے۔

اور فائدہ یہ حاصل ہوا کہ کسی بات کو پختہ کرنے کے لئے حجتی قسم اٹھانا جائز ہے جس طرح اس حدیث میں نبی کریم ﷺ نے قسم اٹھائی ارشاد فرمایا "والذي نفس محمد بيده" قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے۔

اور اس حدیث پاک سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ نبی کریم ﷺ مسلمانوں پر شفقت اور مہربانی فرماتے تھے یعنی آپ شفیق اور رؤف تھے "وانه كان يترك بعض ما يختاره للرفق للمسلمين" کہ آپ مسلمانوں پر رحمت اور نرمی فرماتے ہوئے بعض کام جو آپ کو پسند ہوتے ان کو چھوڑ دیتے۔

فرض کفایہ جہاد میں شریک ہونے سے بہتر یہ ہے کہ مسلمانوں کو مشقت سے بچانے کے فرض عین پر عمل کیا جائے۔

"وانه اذا تعارضت المصالح بدأ باهمها" اور فائدہ یہ حاصل ہوا کہ جب نیکی کیلئے دو کام آمنے سامنے ہوتے تو آپ اسے اختیار فرماتے جس کی زیادہ ضرورت اور اہمیت ہوتی۔

اور مسئلہ یہ ہے کہ "مراعاة الرفق بالمسلمين والسعي في زوال المكروه والمشقة

عنہم ”مسلمانوں کے معاملات میں ان سے رعایت کرنا اور مسلمانوں کی مشقت کو زائل کرنے میں اور مسلمانوں کی تکالیف کو دور کرنے کی مکمل کوشش کرنا رسول اللہ ﷺ کی سنت ہے۔

اور یہ فائدہ حاصل ہوا ”وفیہ فضیلة الشهادة والغزو“ کہ شہادت اور جہاد میں شریک ہونے سے بہت بڑی فضیلت حاصل ہوتی ہے۔

”وفیہ تمنی الشهادة والخیر“ اور یہ فائدہ حاصل ہوا کہ شہادت کی تمنا کرنا اور نیکی کے کاموں کی تمنا کرنا نبی کریم ﷺ کی سنت ہے ”وفیہ تمنی ما لا یمکن فی العادة من الخیرات“ اور حدیث پاک سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ جو چیز بظاہر عادت کے مطابق ممکن نہیں لیکن وہ بہتر ہو تو اس کی تمنا کرنا بھی ثواب ہے جیسا کہ نبی کریم ﷺ سے اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے ﴿وَاللّٰهُ یَعِصْمُکَ مِنَ النَّاسِ﴾ اور اللہ آپ کو بچائے گا لوگوں سے۔ لیکن نبی کریم ﷺ پھر بھی شہادت کی تمنا کرتے رہے۔ (انشاء اللہ مزید تفصیل بعد میں ذکر ہو رہی ہے)۔

شہید کو شہید کہنے کی وجوہ:

(۱) نصر بن شمل رحمہ اللہ نے فرمایا کہ شہید کو شہید کہنے کی وجہ یہ ہے:

”لانه حی فان ارواحهم شہدت و حضرت دار السلام وارواح غیرهم
انما تشہدها یوم القيامة“

کہ اسے زندگی حاصل ہوتی ہے اور شہداء کی روہیں ان کی شہادت کے ساتھ ہی جنت میں داخل ہو جاتی ہیں اور اس سے منافع حاصل کرتی ہیں۔ لیکن دوسرے لوگوں کی روہیں قیامت کو جنت میں منافع حاصل کریں گی اگرچہ نیک لوگوں کی روہیں اعلیٰ علیین میں ہوتی ہیں وہ مقام بھی جنت میں ہی ہے۔

(۲) ابن انباری رحمہ اللہ نے فرمایا کہ شہید کو شہید کہنے کی یہ وجہ بھی ہے کہ ”لان اللہ تعالیٰ وملائکتہ علیہم الصلوٰۃ والسلام یشہدون له بالجنة“ اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے شہداء کے لئے جنت کی گواہی دیتے ہیں۔ سبحان اللہ شہید کا کیا ہی خوب مقام ہے جس کے گواہ عظمت والے فرشتے اور خود مالک الملک ہو اس کی شان کی عظمت کیا ہوگی۔

(۳) ”وقیل لانه شهد عند خروج روحه ما اعدہ اللہ تعالیٰ له من الثواب والكرامة“

اور وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شہید کے لئے ثواب اور مقام عزت و تکریم جو تیار کر رکھا ہے اس کی روح کے نکلنے پر ہی اس کے پاس حاضر کر دیا جاتا ہے اس لئے اسکو شہید کہا جاتا ہے۔

(۴) ”وقیل لان ملائكة الرحمة يشهدونه فيأخذون روحه“ شہید کو شہید کہنے کی اور وجہ

یہ ہے کہ رحمت کے خاص فرشتے اس کے پاس اس کی روح کو حاصل کرنے کے لئے حاضر ہوتے ہیں۔

(۵) ”وقیل لانه شهد له بالایمان وخاتمة الخیر بظاہر حاله“ شہید کو شہید کہنے کی اور

وجہ یہ ہے اس کا ظاہری حال اس کے مؤمن ہونے پر اور اس کے خاتمہ بالخیر پر دلالت کرتا ہے۔

(۶) ”وقیل لان علیہ شاهدةا بكونه شهيدا وهو الدم“ اور بعض حضرات نے کہا کہ شہید کو

اس وجہ سے شہید کہا جاتا ہے کہ قیامت کے دن اس کا خون اس کے شہید ہونے کی گواہی دے گا۔

(۷) ”وقیل لانه ممن يشهد علی الامم يوم القيامة بابلاغ الرسل الرسالة اليهم“

اور وجہ شہید کو شہید کہنے کی یہ ہے کہ وہ پہلی امتوں پر گواہی دے گا کہ انبیاء کرام نے اللہ تعالیٰ کا پیغام ان

تک پہنچا دیا تھا۔ اگرچہ اس آخری وجہ پر علامہ نووی رحمہ اللہ نے فرمایا ”وعلى هذا القول

یشارکهم غیرهم فی هذا الوصف“ اس قول کے مطابق شہداء کے ساتھ اس وصف میں

دوسرے نیک لوگ بھی شریک ہوں گے کیونکہ امت کے تمام نیک لوگوں کو یہ مقام حاصل ہوگا۔

تاہم راقم کے نزدیک یہ کہنا بھی ممکن ہے کہ شہداء کو رفع درجات حاصل ہونے کی وجہ سے ان کو شہادت

خصوصیہ کا درجہ حاصل ہوا۔ واللہ اعلم بالصواب۔ (نووی بر مسلم ج ۲ ص ۱۴۲)

شہید کی زندگی:

”فذهب كثير من السلف الى انها حقيقة بالروح والجسد ولكن لا

ندرکھا فی هذه النشأة“

کثیر سلف صالحین (گزرے ہوئے بزرگ علماء کرام) کا مذہب یہ ہے کہ شہید کو حقیقی زندگی حاصل

ہوتی ہے جو روح اور جسم سے متعلق ہوتی ہے البتہ ہم اس زندگی کو سمجھ نہیں سکتے۔ اس پر ۱۰ عند ربہم

یُرْزَقُونَ ﴿۱۰﴾ ”ان کو رب کے ہاں رزق دیا جاتا ہے“ ارشاد باری تعالیٰ واضح طور پر دلالت کر رہا ہے۔

”وبان الحياة الروحانية التي ليست بالجسد ليست من خواصهم فلا

يكون لهم امتياز بذلك على من عداهم“

اور کثیر سلف صالحین نے اپنے موقف پر محکم دلیل قائم کی ہے کہ اگر یہ کہا جائے کہ شہداء کو صرف روحانی زندگی حاصل ہے تو اس میں ان کی تخصیص کیسے ثابت ہو سکتی ہے کیونکہ روحانی زندگی تو تمام مومنین کو حاصل ہے بلکہ کفار کو بھی حاصل ہے اسی لئے کفار کو برزخ میں عذاب ہوتا ہے۔ (از روح المعانی)

ان الله تعالى يعطى لا رواحهم قوة الاجساد فيذهبون من الارض

والسماء والجنة حيث يشاءون وينصرون اولياءهم ويدمرون

اعدائهم ان شاء الله تعالى“

بیشک اللہ تعالیٰ شہداء کی روحوں کو جسموں کی قوت عطاء فرماتا ہے وہ زمین و آسمان اور جنت میں جہاں چاہیں جاتے ہیں اور اپنے دوستوں کی امداد کرتے ہیں اور اپنے دشمنوں کو ہلاک کرتے ہیں ان شاء اللہ تعالیٰ۔

”ومن اجل ذلك الحياة لا تاكل الارض اجسادهم ولا اكفانهم“ شہداء کرام کو جب رب تعالیٰ زندگی عطاء فرماتا ہے تو اسی وجہ سے زمین ان کے جسموں اور کفنوں کو نہیں کھا سکتی۔

”قال البغوی قیل ان ارواحهم ترکع وتسجد کل لیلۃ تحت العرش الی یوم القيامة“ علامہ بغوی بیان کرتے ہیں کہ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ بیشک شہداء کی روحوں ہر رات کو عرش کے نیچے رکوع اور سجدہ کرتی ہیں یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا۔ (مظہری، بغوی)

اعتراض: شہید کی زندگی کس طرح ثابت ہے جب کہ ہم ظاہر طور پر دیکھتے ہیں کہ شہید بے حس و حرکت ہوتا ہے ہم اسے غسل دیتے ہیں اور اس کے جنازہ کو اٹھا کر لے جاتے ہیں۔

جواب: اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ”بَلْ اَحْيَاءٌ وَلٰكِنْ لَا تَشْعُرُونَ“، (بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تمہیں شعور نہیں) فرمایا ہے اگر ہماری عقل میں آتا تو یہ کہنے کی ضرورت ہی نہیں تھی آئیے تفسیر مظہری کو دیکھئے:

”فيه تنبيه على ان حياتهم ليست من جنس ما يحسه كل احد وانما

هي امر لا يدرك بالعقل ولا بالحس بل بالوحي او الفراسة الصحية

المقتبسة من الوحي“

رب تعالیٰ نے ﴿وَلَكِنْ لَا تَشْعُرُونَ﴾ کہہ کر اس پر متنبہ کر دیا کہ بیشک ان کی زندگی وہ نہیں جو ہر شخص کو محسوس ہو سکے اور نہ ہی یہ عقل میں آنے والی ہے اور نہ حواس میں بلکہ شہداء کی زندگی وحی سے حاصل ہوتی ہے یا اللہ تعالیٰ جن لوگوں کو وحی سے فیضان حاصل کرنے کی توفیق عطاء فرمادے اور اپنا مقرب بنالے وہ اپنی کامل فراست سے وحی سے اقتباس حاصل کر لیتے ہیں۔ (مظہری)

زندگی کے لئے حس و حرکت کا ہونا بھی ضروری نہیں ”لان العضو المفلوج حی حیث تحقق قوة الحياة فيه وان لم يترتب عليها الحس والحركة لمانع الفلج“ کیونکہ جو عضو مفلوج ہے وہ حس و حرکت نہیں کرتا اگرچہ زندگی اس میں پائی جاتی ہے (از شیخ زادہ) اور یہ بہت واضح ہے کہ اگر مفلوج عضو کو مردہ کہا جائے وہ گل سڑ جائے بدبودار ہو جائے حالانکہ ایسا نہیں۔

نفی قول سے مراد نفی اعتقاد: رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا

﴿وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ﴾
”جو اللہ کی راہ میں شہید کر دیئے گئے ان کو مردہ نہ کہو“

اصل مقصد یہ ہے کہ تم عقیدہ یہ رکھو وہ زندہ ہیں صرف زبان سے زندہ کہہ دینا اور عقیدہ اس کے خلاف رکھنا بلا مقصد ہے ہاں جب انسان کا عقیدہ یہ ہو کہ شہداء زندہ ہیں لیکن عام محاورہ کے مطابق وہ شہید کے متعلق کہہ دے کہ وہ فوت ہو گیا تو وہ شخص گنہگار نہیں ہوگا۔ پھر بھی اللہ تعالیٰ کا فضل ہے مسلمانوں پر کہ وہ کہتے بھی یہی ہیں کہ فلاں شخص شہید ہو گیا یہ کہتے ہی نہیں کہ وہ فوت ہو گیا۔

راقم نے یہ مسئلہ روح المعانی کی اس بحث سے استنباط کیا ہے ﴿بَلْ أَحْيَاءُ﴾ کا مفہوم یہ ہے ﴿بَلْ هُمْ أَحْيَاءُ﴾ بلکہ وہ زندہ ہیں یہ جملہ معطوفہ ہے اس کا عطف ﴿لَا تَقُولُوا﴾ پر ہے اور اسی سے اضراب (پھیرنا) ہے کیونکہ ﴿بَلْ﴾ اضراب کے لئے آتا ہے۔ عطف مفرد کا مفرد پر نہیں کہ چیز قول میں ہو اور مقصد یہ ہو کہ بلکہ تم کہو کہ وہ زندہ ہیں:

”لان المقصود اثبات الحياة لهم لا امرهم بان يقولوا في شأنها انهم احياء وان كان ذلك صحيحا“

کیونکہ مقصد ان کے لئے حیات ثابت کرنا ہے لوگوں کو یہ حکم دینا مقصود نہیں کہ تم ان کو ضروری زندہ کہو اگرچہ ان کو زبان سے زندہ کہنا بھی صحیح ہے..... واللہ اعلم بالصواب..... (از روح المعانی)

اعتراض: بیان یہ کیا جاتا ہے کہ شہداء کے جسم بھی زندہ ہوتے ہیں حالانکہ کئی مرتبہ مشاہدہ کیا جاتا ہے کہ ان کے جسم گل سڑ جاتے ہیں راکھ بن جاتے ہیں تو کس طرح کہنا صحیح ہے کہ ان کے جسموں کو زمین پر کھانا حرام کر دیا گیا ہے؟

اجمالی جواب: اگرچہ مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی معارف القرآن میں اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ ہو سکتا ہے ان کے جسموں کو زمین کے ذرات نقصان نہ پہنچائیں لیکن دوسری دھاتیں جن کی زمین میں آمیزش ہوتی ہے وہ نقصان پہنچائیں۔ یہ جواب بھی ممکن ہے تاہم زیادہ صحیح اور مختصر جواب یہ ہے کہ جو شہداء خلوص دل سے صرف رب تعالیٰ کی رضا کی خاطر اپنی جان قربان کرتے ہیں یہ مرتبہ صرف ان شہداء کو حاصل ہوتا ہے، جن کی نیت میں کسی قسم کا فتور لازم آجائے ان کو یہ مرتبہ حاصل نہیں ہوتا اگرچہ ہمیں کسی کی نیت کا علم حاصل نہیں ہوتا اس لئے ہم تو ہر اس شخص کو شہید کہیں گے جس نے بظاہر اللہ تعالیٰ کی راہ میں جان قربان کی جیسا کہ ہم ہر اس شخص کو مسلمان کہتے ہیں جو بظاہر ایمان رکھتا ہو ہم اس پر مسلمانوں والے احکام ہی جاری کرتے ہیں حقیقت میں اللہ تعالیٰ کے ہاں بھی وہ مومن ہے یا دل میں منافقت رکھتا ہے وہ صرف اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔

تفصیلی جواب: شہید کی تین قسمیں ہیں ایک وہ شہید ہیں جو صرف دنیا میں شہید کہلاتے ہیں آخرت میں نہیں، دوسرے وہ شہید ہیں جو دنیا اور آخرت دونوں میں شہید کہلاتے ہیں، اور تیسرے وہ ہیں جو آخرت کے لحاظ سے شہید ہیں دنیا میں ان پر احکام شہادت جاری نہیں ہوتے۔ (نووی برمسلمہ ج ۲ ص ۱۵۱)

دنیا میں شہید ہو آخرت میں نہ ہو:

”وہو من غل فی الغنیمۃ او قتل مدبراً“ یہ وہ شخص ہے جس نے غنیمت میں خیانت کی ہو یا پیٹھ پھیر کر بھاگتے ہوئے قتل کر دیا جائے۔ اسے دنیا میں تو شہید سمجھا جائے گا ظاہری طور پر احکام شہادت بھی جاری کر دیئے جائیں گے لیکن اسے شہادت کی وجہ سے خصوصی مرتبہ اور درجہ حاصل نہیں ہوگا یقینی بات

ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کے ہاں شہید نہیں ہوں گے ان کے جسموں کا زمین سے محفوظ رہنا بھی ضروری نہیں۔

احادیث مبارکہ جن سے بہت واضح ہے کہ فقط دنیاوی شہید درجات سے محروم رہتا ہے کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں شہید نہیں کہلاتا۔

”عن ابی موسیٰ الاشعری ان رجلا اعرابیا اتی النبی ﷺ فقال یا رسول اللہ الرجل یقاتل للمغنم والرجل یقاتل لیدکر والرجل یقاتل لیری مکانہ فمن فی سبیل اللہ فقال رسول اللہ ﷺ من قاتل لتکون کلمۃ اللہ اعلیٰ فهو فی سبیل اللہ“

(مسلم ج ۲ ص ۱۳۷ باب من قاتل لتکون کلمۃ اللہ ہی العلیا فهو فی سبیل اللہ)

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ایک اعرابی نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے عرض کیا یا رسول اللہ ایک شخص جہاد کرتا ہے کہ اسے مال غنیمت حاصل ہو جائے اور ایک شخص جہاد کرتا ہے کہ اس کا چرچا ہو جائے اور ایک شخص جہاد کرتا ہے کہ اس کا مقام دیکھا جائے (یعنی اس کی بہادری کا لوگوں کو پتہ چل جائے) ان میں سے کون سا وہ شخص ہے جس کے جہاد کو جہاد فی سبیل اللہ (اللہ کی راہ میں جہاد) کہا جائے؟ نبی کریم ﷺ نے فرمایا اللہ کی راہ میں اس شخص کا جہاد ہے جو اللہ تعالیٰ کے کلمہ کی بلندی کے لئے جہاد کرے۔

☆ ”عن ابی موسیٰ قال سئل رسول اللہ ﷺ عن الرجل یقاتل شجاعة ویقاتل حمیة ویقاتل رباء ای ذلک فی سبیل اللہ فقال رسول اللہ ﷺ من قاتل لتکون کلمۃ اللہ ہی العلیا فهو فی سبیل اللہ“ (مسلم ج ۲ ص ۱۳۸)

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ سے ایک شخص کے متعلق سوال کیا گیا کہ وہ بہادری دکھانے کے لئے جہاد کرتا ہے اور ایک شخص خاندانی رقابت یا غیرت کی وجہ سے جہاد کرتا ہے اور ایک شخص دکھلاوے کے طور پر جہاد کرتا ہے ان میں سے کون سا جہاد اللہ کی راہ میں ہوا؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے اللہ تعالیٰ کے کلمہ کو بلند کرنے کے لئے جہاد کیا وہی اللہ کی راہ میں جہاد ہے۔

وضاحت : نبی کریم ﷺ کا جواب کیسا خوب حکمت بھر مختصر تھا چونکہ جوامع الکلم (بات مختصر مطالب زیادہ) آپ کی خصوصیت تھی ایک ایک کو علیحدہ کر کے یہ نہیں فرمایا یہ بھی جہاد نہیں، یہ بھی جہاد نہیں، بلکہ فرمایا جہاد تو یہ ہے، یعنی صرف مقصود کو ذکر فرمایا غیر مقصود کی خود بخود نفی ہو گئی۔

”یقاتل لیذکر“ کا مطلب ہے ”لیذکرہ الناس بالشجاعة“ تاکہ لوگ اس کی شجاعت کا ذکر کریں چرچا کریں ”ویقاتل حمیة“ ہی الانفة والغیرة والمحاماة عن عشیرتہ“ یعنی ایک شخص اپنی ذاتی مخالفت، غیرت اور خاندانی رقابت یعنی خاندان کے دشمن سے خاندان کی حمایت کے لئے لڑائی کرتا ہے۔

نبی کریم ﷺ کے جواب کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے گویا کہ بیان فرمادیا:

”انما الاعمال انما تحسب بالنیات الصالحة وان الفضل الذی ورد فی المجاہدین فی سبیل اللہ یختص بمن قاتل لتكون کلمة اللہ ہی العلیا“

اعمال کی دار و مدار نیک نیت پر ہے بیشک فضیلت جس کا ذکر کیا جاتا ہے اس کا تعلق ان مجاہدین سے ہے جو صرف اللہ تعالیٰ کی رضا مندی کے لئے اور دین کی بلندی کے لئے جہاد کرتا ہے۔ (ازنوی)

☆ ”عن ابی ہریرۃ قال سمعت رسول اللہ ﷺ یقول اول الناس یقضی یوم القیامۃ علیہ رجل استشهد فاتی بہ فعرّفہ نعمتہ فعرّفہا قال فما عملت فیہا قال قاتلت فیک حتی استشهدت قال کذبت ولکنک قاتلت لان یقال جرنی فقد قیل ثم امر بہ فسحب علی وجہہ حتی القی فی النار، ورجل تعلم العلم وعلمہ وقرأ القرآن فاتی بہ فعرّفہ نعمہ فعرّفہا قال فما عملت فیہا قال تعلمت العلم وعلمتہ وقرأت فیک القرآن قال کذبت ولکنک تعلمت العلم لیقال عالم وقرأت القرآن لیقال هو قارئ فقد قیل ثم امر بہ فسحب علی وجہہ حتی القی فی النار، ورجل وسع اللہ علیہ واعطاه من اصناف المال کلہ فاتی بہ فعرّفہ نعمہ فعرّفہا قال فما عملت فیہا قال ما ترکت من سبیل تحب ان ینفق فیہا الا انفقت فیہا لک قال کذبت ولکنک فعلت لیقال هو جواد فقد قیل ثم امر بہ فسحب علی وجہہ ثم القی فی النار“ (مسلم ج ۲ ص ۱۴۸ باب من قاتل للربا)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ قیامت کے دن سب سے پہلے اس شخص کو فیصلہ کے لئے لایا جائے گا جو شہید کر دیا گیا تھا جب اسے لایا جائے گا تو اللہ تعالیٰ اسے اپنی نعمتوں کی پہچان کرائے گا وہ پہچان لے گا (یعنی اقرار کر لے گا) رب تعالیٰ فرمائے گا تو نے ان نعمتوں کے حق میں عمل کیا کیا؟ وہ کہے گا تیرے لئے لڑائی کی یہاں تک کہ مجھے شہید کر دیا گیا رب تعالیٰ فرمائے گا تو نے جھوٹ کہا ہے لیکن تو نے تو قتال کیا کہ تجھے بہادر کہا جائے وہ کہہ دیا

گیا، پھر حکم دیا جائے گا اسے چہرے کے بل گھیٹ کر آگ میں ڈال دیا جائے گا۔ اور ایک شخص نے علم حاصل کیا ہوگا اور پڑھایا ہوگا اور قرآن پڑھا، اسے لایا جائے گا اللہ تعالیٰ اسے اپنی نعمتوں کی پہچان کرائے گا وہ پہچان لے گا رب تعالیٰ فرمائے گا تو نے ان کی وجہ سے عمل کیا کیا؟ وہ کہے گا علم سیکھا اور سکھایا اور تیرے لئے قرآن پڑھا، رب تعالیٰ فرمائے گا تو نے جھوٹ کہا، لیکن تو نے علم حاصل کیا تھا کہ تجھے عالم کہا جائے اور قرآن پڑھا تھا تا کہ تجھے قاری کہا جائے وہ کہہ دیا گیا، پھر حکم دیا جائے گا اسے منہ کے بل گھیٹ کر آگ میں ڈال دیا جائے گا۔ ایک شخص کو اللہ تعالیٰ نے وسعت عطاء کی ہوگی اور اسے ہر قسم کا حال عطاء کیا ہوگا اسے رب تعالیٰ کے حضور لایا جائے گا تو رب تعالیٰ اسے اپنی نعمتوں کی پہچان کرائے گا وہ پہچان لے گا رب تعالیٰ فرمائے گا تو نے ان نعمتوں کے شکر یہ میں کیا عمل کئے وہ کہے گا میں نے کوئی ایسا راستہ نہیں چھوڑا جسے تو پسند کرتا تھا کہ اس میں مال خرچ کیا جائے میں نے وہاں تیرے لئے مال خرچ کیا رب تعالیٰ فرمائے گا تو نے جھوٹ کہا لیکن تو نے مال خرچ کیا تھا کہ تجھے جواد (سخی) کہا جائے وہ تو کہہ دیا گیا پھر حکم دیا جائے گا اسے منہ کے بل گھیٹ کر آگ میں ڈال دیا جائے گا۔

واضح ہوا کہ جن شہداء کی قرآن پاک اور احادیث مبارکہ میں تعریف کی گئی ان کی فضیلت بیان کی گئی اور ان کے مدارج اور منازل رفیعہ کا ذکر کیا گیا یہ وہ شہداء ہیں جو صرف اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے جہاد کرتے ہوئے شہید ہو جائیں اور ان کا مقصد صرف دین کی بلندی ہو ان کو ہی وہ زندگی حاصل ہوتی ہے جس سے روح اور جسم دونوں ہی زندہ رہتے ہیں۔ اور جن کی نیت میں فتور ہو ان کو فضیلت کیا حاصل ہونی ہے بلکہ وہ تو اللہ تعالیٰ کی گرفت میں آئیں گے لہذا قرآن پاک اور احادیث مبارکہ کے فیصلے پکے اور سچے ہیں۔

”قوله ﷺ فی الغازی والعالم والجواد وعقابهم علی فعلهم ذلک لغير الله وادخالهم النار دلیل علی تغلیظ تحریم الریاء وشدة عقوبته وعلی الحث علی وجوب الاخلاص فی الاعمال کما قال الله تعالیٰ وما امروا الا ليعبدوا الله مخلصین له الدین وفيه ان العمومات الواردة فی فضل الجهاد وانما هی لمن اراد الله تعالیٰ بذلک مخلصا وكذلك الشناء علی العلماء وعلی المنفقین فی وجوه الخیرات کله

نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی غازی اور عالم اور سخی کے متعلق کہ ان کو عذاب ہوگا اگر ان کے یہ افعال اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر نہ پائے گئے بلکہ ان میں دکھلاوا مقصود ہوا تو یہ آگ میں ڈال دیئے جائیں گے یہ دلیل ہے کہ ریاء کاری سخت حرام ہے اور اس میں شدید عذاب ہوگا اور حدیث پاک میں اعمال میں اخلاص کے وجوب پر براہیختہ کیا گیا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا (ترجمہ) اور ان کو نہیں حکم دیا گیا مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں اور دین کو اسی کے لئے خالص کریں۔

اور حدیث پاک سے یہ ثابت ہوا کہ جہاد کی فضیلت میں جو آیات و احادیث وارد ہیں ان سے یہی ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ یہی چاہتا ہے کہ وہ جہاد صرف اس کی رضا کے لئے کیا جائے اور اس میں خلوص پایا جائے۔

اسی طرح علماء اور سخی حضرات کی تعریف جو کی گئی اس سے مراد بھی وہی ہیں جو علم اور سخاوت میں خلوص رکھتے ہیں صرف اللہ تعالیٰ کی رضا مندی کے لئے کام کریں۔ نام و نمود نہ پایا جائے فقط دنیاوی اغراض نہ ہوں۔

اخروی شہید: وہ شہید جس کو ”شہید فی الآخرة“ کہا گیا ہے یعنی دنیا میں تو ان کو شہید نہیں کہا جاتا لیکن ثواب ان کو شہداء والا حاصل ہوگا۔ جب ان میں خلوص پایا جائے گا تو یقینی طور پر ان کو قرب الہی حاصل ہونا ہے۔

اخروی شہید پر احادیث مبارکہ:

☆ ”عن انس قال قال رسول اللہ ﷺ من طلب الشهادة صادقاً اعطيها ولو لم تصبه“
(مسلم ج ۲ ص ۱۴۹ باب استحباب طلب الشهادة فی سبیل اللہ)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے سچے دل سے شہادت کو طلب کیا (یعنی شہادت کے حاصل ہونے کی سچی تمنا کی) تو اسے شہادت کا ثواب عطاء کر دیا جائے گا اگرچہ بظاہر اسے شہادت حاصل نہ ہوئی۔

☆ ”عن سهل بن حنيف ان النبی ﷺ قال من سأل الله الشهادة بصدق بلغه الله

سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک نبی کریم ﷺ نے فرمایا جس شخص نے سچے دل سے شہادت طلب کی اللہ تعالیٰ اس کو شہداء کے مراتب تک پہنچا دے گا اگرچہ اس کی موت بستر پر ہی کیوں نہ آئے۔

دوسری حدیث پہلی کی تفسیر بیان کر رہی ہے کیونکہ اس میں زیادہ وضاحت موجود ہے بنسبت پہلی حدیث کے ”ومعناهما جميعا انه اذا سأل الشهادة بصدق اعطى من ثواب الشهداء وان كان علی فراشه ، وفيه استحباب سوال الشهادة واستحباب نية الخير“ دونوں احادیث کا معنی یہی ہے کہ جب کوئی شخص سچے دل سے شہادت طلب کرتا ہے تو اسے شہادت کا ثواب عطاء کر دیا جاتا ہے اگرچہ اس کی موت بستر پر ہی کیوں نہ آئے۔ اور حدیث پاک سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ شہادت کی تمنا اور شہادت کی طلب صدق دل سے کرنا مستحب ہے اور یہ ثابت ہوا کہ نیکی کے کاموں کی نیت مستحب ہے۔

(از نووی)

☆ ”عن جابر قال كنا مع النبي ﷺ في غزاة فقال ان بالمدينة لرجالا ماسرتم مسيرا ولا قطعتم واديا الا كانوا معكم حبسهم المرض“ (مسلم ج ۲ ص ۱۴۹)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ہم نبی کریم ﷺ کی معیت میں جہاد میں شریک تھے آپ نے فرمایا کہ مدینہ طیبہ میں کئی لوگ وہ ہیں جو تمہارے ساتھ چلے تو نہیں رہے اور نہ ہی کسی وادی کو طے کر رہے ہیں لیکن وہ تمہارے ساتھ ہی شریک ہیں کیونکہ ان کو مرض نے روک رکھا ہے ”وفی رواية الاشر کو کم فی الاجر“ ایک روایت میں ہے کہ وہ تمہارے ساتھ اجر و ثواب میں شریک ہیں۔

”وفی هذا الحديث فضيلة النية في الخير وان من نوى الغزو او غيره من الطاعات فعرض له عذر منعه حصل له ثواب نيته وانه كلما اكثر من التأسف على فوات ذلك وتمنى كونه مع الغزاة ونحوهم كثر ثوابه والله اعلم“

اس حدیث پاک سے واضح ہوا کہ نیکی کے کام کی نیت کرنا باعث فضیلت ہے اور جس شخص نے جہاد میں شرکت کی نیت کی یا اس کے بغیر نیکی کے کاموں کی نیت کی اسے کوئی عذر درپیش آ گیا جس کی

وجہ سے وہ اس میں شریک نہ ہو سکا تو اس کے سچے دل سے نیت کرنے کا اسے ثواب حاصل ہوگا اور خاص کر کے نیک کام میں شرکت رہ جانے پر جتنا افسوس کرے گا کہ کاش میں ان کے ساتھ شریک ہوتا اتنا ہی زیادہ اسے ثواب حاصل ہوگا۔ (نوری)

سبحان اللہ نبی کریم ﷺ غزوہ میں مدینہ طیبہ کے لوگوں کے دلوں کی تمنا اور تڑپ کا تذکرہ فرما رہے ہیں کاش کہ نور بصیرت حاصل ہو تو شانِ مصطفیٰ کریم ﷺ سمجھ آ جائے۔

☆ ”عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ ﷺ ما تعدون الشہید فیکم قالوا یا رسول اللہ من قتل فی سبیل اللہ فهو شہید قال ان شہداء امتی اذا لقلیل قالوا فمن ہم یا رسول اللہ قال من قتل فی سبیل اللہ فهو شہید ومن مات فی سبیل اللہ فهو شہید ومن مات فی الطاعون فهو شہید ومن مات فی البطن فهو شہید قال ابن المقسم اشہد علی ابیک فی هذا الحدیث انه قال والغریق شہید“ (مسلم ج ۲ ص ۱۵۱ باب بیان الشہداء)

حضرت سہیل اپنے باپ سے اور وہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم اپنے اندر کن لوگوں کو شہید شمار کرتے ہو۔ صحابہ کرام نے عرض کیا یا رسول اللہ جو شخص اللہ کی راہ میں جان قربان کر دے وہ شہید ہے تو آپ نے فرمایا اس طرح تو میری امت کے شہید بہت کم ہو جائیں گے اللہ کی راہ میں مقتول شہید ہے اللہ کی راہ میں فوت ہونے والا شہید ہے۔ طاعون سے فوت ہونے والا شہید ہے جو شخص پیٹ کی بیماری سے فوت ہو جائے وہ بھی شہید ہے۔

ابن مقسم نے سہیل کو کہا میں گواہی دیتا ہوں کی آپ کے باپ نے اس حدیث کو بیان کیا تھا کہ غرق ہونے والا بھی شہید ہے۔

”من مات فی سبیل اللہ فهو شہید“ سے مراد عام ہے دورانِ حج و عمرہ کوئی فوت ہو جائے طالب علم دینی علم حاصل کرتے ہوئے فوت ہو جائے کوئی عالم دین رب تعالیٰ کے دین کا کام کرتے ہوئے فوت ہو جائے وہ شہید ہے اس طرح کے نیکی کے کام کرتے ہوئے فوت ہو جانے والے شہید ہیں۔

(راقم) یہ تمام حضرات وہ ہیں جن کو دنیا میں تو شہید نہیں کہا جاتا ہے لیکن آخرت میں ان کو درجہ

شہادت حاصل ہوتا ہے۔

تنبیہ: جن اموات کا ذکر کیا گیا ہے ان کے متعلق علامہ نووی رحمہ اللہ نے ذکر فرمایا ”وانما كانت هذه الموات شهادة بتفضل الله تعالى بسبب شدتها وكثرة المها“ کہ یہ موتیں صرف اللہ تعالیٰ کے فضل کی وجہ سے شہادت کا درجہ رکھتی ہیں کیونکہ ان میں شدت اور درد کی کثرت شہادت کا سبب ہے۔

یہ بھی خیال رہے کہ شہادت کا مرتبہ صرف جن اموات کا ذکر یہاں کیا گیا ہے ان میں بند نہیں بلکہ دوسری احادیث میں اور بھی مذکور ہیں۔ دیوار وغیرہ گرنے سے نیچے آ کر فوت ہونے والا، نمونیہ کی مرض سے فوت ہونے والا، آگ میں قدرتی طور پر جل جانے والا، حاملہ عورت حمل کی تکلیف سے فوت ہو جائے یہ سب شہید ہیں۔

اسی طرح ایک حدیث میں آتا ہے ”من قتل دون ماله فهو شهيد ومن قتل دون اهله فهو شهيد“ جو شخص اپنے مال کی حفاظت کرتے ہوئے قتل کر دیا جائے وہ شہید ہے جو شخص اپنی اہل کی حفاظت کرتے ہوئے قتل کر دیا جائے وہ شہید ہے۔

ایک اور حدیث میں ہے ”ومن قتل دون دينه فهو شهيد“ جو شخص دین کی حفاظت کرتے ہوئے قتل کر دیا جائے وہ شہید ہے۔

دنیوی اور اخروی شہید: ”واما شهيد في الدنيا والآخرة فهو المقتول في حرب الكفار“ جو شخص دنیا میں بھی شہید کہلائے اور آخرت میں بھی شہید کا درجہ اسے حاصل ہے جو اپنے خلوص اور صدق دل سے اور صرف اللہ تعالیٰ کی رضا کیلئے اور دین کی بلندی کیلئے قتل کر دیا جائے۔

(نووی بر مسلم ج ۲ ص ۱۵۱)

پھر اس قسم کے شہداء کی دو قسمیں ہیں فقہی شہید، اور غیر فقہی شہید۔ اس کی تفصیل انشاء اللہ بعد میں ذکر کی جائے گی۔ پہلے ان شہداء کے جسموں کے محفوظ رہنے اور ان کی مزید فضیلت کا ذکر کیا جاتا ہے ”ان اجساد الانبياء والشهداء وبعض الصالحاء لا ياكلها الارض“ بیشک انبیاء کرام اور شہداء کرام اور بعض نیک لوگوں کے جسموں کو زمین نہیں کھاتی۔

☆ ”عن اوس ابن اوس قال قال رسول الله ﷺ ان الله حرم على الارض ان تاكل

اجساد الانبیاء“ (مستدرک حاکم، ابو داؤد، وَاخْرَجَ ابْنُ مَاجَهَ عَنْ ابْنِ الدَّرْدَاءِ نَحْوَهُ)

حضرت اوس بن اوس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ نے زمین پر حرام کر دیا ہے کہ وہ انبیاء کرام کے جسموں کو کھائے۔

☆ ”وَإِخْرَجَ مَالِكُ عَنْ عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ صَعْصَعَةَ أَنَّهُ بَلَغَهُ أَنَّ عَمْرُو بْنَ الْجُمُوحِ وَعَبْدَ اللَّهِ بْنَ جَبْرِ الْإِنصَارِي كَانَ قَدْ حَفَرَ السَّيْلَ قَبْرَهُمَا وَكَانَ قَبْرُهُمَا مِمَّا يَلِي السَّيْلَ وَكَانَا فِي قَبْرِ وَاحِدٍ وَهُمَا مِمَّنْ اسْتَشْهَدَ يَوْمَ أُحُدٍ، فَحَفَرَا لِغَيْرِهِمَا مِنْ مَكَانِهِمَا فَوَجَدَا لَهُمَا يَتَغَيَّرَانِ كَانَهُمَا مَاتَا بِالْأَمْسِ وَكَانَ بَيْنَ أَحَدٍ وَبَيْنَ حَفْرِ عَنْهَا سِتُّ وَارْبَعُونَ سَنَةً“

عبدالرحمن بن صعصعہ کہتے ہیں کہ عمرو بن جموح اور عبداللہ بن جبیر انصاری کی قبر کو پانی کی ندی نے گرا کر شروع کر دیا کیونکہ وہ پانی کی گزرگاہ کے ساتھ تھیں اور دونوں ایک ہی قبر میں دفن تھے یہ دونوں احد میں شہید ہوئے تھے ان کی قبر کو کھودا گیا تاکہ ان کو دوسری جگہ منتقل کر دیا جائے تو ان دونوں کو اسی حال میں پایا گیا جیسا کہ ان دونوں کا وصال کل ہی ہوا ہے ان میں ذرا بھی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ حالانکہ ان کی قبر کو کھودنے کے واقعہ اور احد کے درمیان چھیالیس سال گزر چکے تھے۔

☆ ”وَإِخْرَجَ الْبَيْهَقِيُّ أَنَّ مَعَاوِيَةَ لَمَّا ارَادَ أَنْ يَجْرِيَ كَطَامَةَ نَادَى مَنْ كَانَ لَهُ قَتِيلٌ بِأَحَدٍ فَلْيَشْهَدْ فَخَرَجَ النَّاسُ إِلَى قَتْلَاهُمْ فَوَجَدُواهُمْ رَطَابًا يَنْبُتُونَ فَاصَابَتْ الْمَسْحَاتُ رَجُلَ رَجُلٍ مِنْهُمْ فَانْبَعَثَ دَمًا وَلَقَدْ كَانُوا يَحْفَرُونَ التُّرَابَ فَحَفَرُوا نَشْرَةً مِنْ تُرَابٍ فَاحَ عَلَيْهِمُ رِيحُ الْمَسْكِ هَكَذَا أَخْرَجَ الْوَأَقْدِيُّ عَنْ شَيْوَخِهِ وَإِخْرَجَ ابْنُ أَبِي شَيْبَةَ نَحْوَهُ وَإِخْرَجَ الْبَيْهَقِيُّ عَنْ جَابِرٍ وَفِيهِ فَاصَابَتْ الْمَسْحَاتُ قَدَمَ حُمَزَةَ فَانْبَعَثَ دَمًا“

بیہقی نے بیان کیا ہے کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے جب ارادہ فرمایا کہ پانی کی گزرگاہ (چھوٹی نہر، نالی) بنائی جائے تو آپ نے اعلان فرمایا کہ جن لوگوں کے رشتہ دار احد میں شہید ہو گئے تھے وہ حاضر ہوں لوگوں نے اپنے اپنے شہداء کرام کو نکالنا شروع کیا تو ان کو تروتازہ حالت میں پایا۔

ایک شخص کے پاؤں پر کندال لگ گئی تو خون جاری ہو گیا۔ جب مٹی کھودتے تو مٹی کو باہر نکالنے سے اس طرح خوشبو اٹھتی جیسے کستوری کی خوشبو ہو۔ اسی طرح واقدی رحمہ اللہ نے اپنے شیوخ سے بھی بیان کیا اور ابن ابی شیبہ نے بھی اسی طرح بیان کیا۔ اور بیہقی نے ایک روایت حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کی

☆ جس میں یہ ذکر ہے کہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے قدم مبارک پر کندال لگ گئی تو خون جاری ہو گیا۔
☆ "واخرج الطبرانی عن ابن عمر قال قال رسول الله ﷺ المودن المحتسب كالشهيد المتشخط في دمه اذا مات لم يدود في قبره"

طبرانی نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی وہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا وہ مؤذن جو اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے خلوص سے اذان کہتا ہے اس کا ایسا درجہ ہے جیسا کہ شہید خون میں لتھڑا ہوا ہو۔ جب وہ فوت ہو جائے تو اس کی قبر میں کیڑے نہیں پڑتے۔

☆ "واخرج ابن ابی مندة عن جابر عن عبد الله قال قال رسول الله ﷺ اذا مات حامل القرآن اوحى الله الى الارض ان لا تاكل لحمه فيقول الارض اى رب كيف اكل لحمه وكلامك فى جوفه"

ابن ابی مندة رحمہ اللہ نے حضرت جابر بن عبد اللہ سے روایت بیان کی کہ رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمایا جب حافظ قرآن فوت ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ زمین کی طرف وحی کرتا ہے (یعنی زمین کو کہتا ہے) اس شخص کے گوشت کو نہ کھانا۔ زمین عرض کرتی ہے اے میرے رب میں کیسے اس کے گوشت کو کھا سکتی ہوں جب کہ اس کے سینہ میں تیرا کلام ہے۔ سبحان اللہ کیا مقام ہے حافظ قرآن کا جس کے سینہ میں قرآن ہونے کی برکت سے اللہ تعالیٰ اس کے جسم کو محفوظ رکھتا ہے زمین اسے نہیں کھاتی۔

☆ "واخرج المروزی عن قتادة قال بلغني ان الارض لا تسلط على جسد الذي لم يعمل خطيئة"

مروزی رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے کہ حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا مجھے یہ خبر ملی ہے کہ بیشک زمین اس شخص کے جسم پر مسلط نہیں ہو سکتی جس نے گناہ کا کوئی عمل نہ کیا ہو۔

یعنی نیک لوگوں کے جسم بھی محفوظ رہتے ہیں زمین ان کو بھی نہیں کھا سکتی۔ یہ بھی خیال رہے کہ صحابی کا وہ قول جو عقل سے نہ بیان کیا جاسکے وہ حدیث مرفوع کے درجہ میں ہوتا ہے کہ صحابی نے یقیناً رسول اللہ ﷺ سے سنا ہوگا۔ قاضی محمد ثناء اللہ مظہری فرماتے ہیں:

"قلت لعل المراد بالذى لم يعمل خطيئة الصالحون من عباد الله اعنى الاولياء لما كانوا محفوظين من الخطايا ومغفورين حتى صلحت"

میں کہتا ہوں کہ جن لوگوں کا ذکر ہے کہ انہوں نے گناہ نہ کئے ہوں ان سے مراد اللہ کے بندوں سے نیک لوگ ہیں یعنی اللہ تعالیٰ کے ولی جو گناہوں سے محفوظ ہیں۔ اور بخشے ہوئے ہیں یہاں تک کہ ان کے دل اور ان کے جسم درست ہوتے ہیں ان میں خاص صلاحیت پائی جاتی ہے۔ (از مظہری)

فقہی شہید: یعنی وہ شہید جسے ”شہید فی الدنیا والآخرۃ“ کہا گیا ہے اس کی ایک قسم فقہی شہید ہے جو دنیا اور آخرت میں شہید ہے اور اس پر ظاہری طور پر کئی احکام جاری ہیں جو غیر فقہی شہید پر جاری نہیں۔ فقہی شہید وہ ہے جو عاقل، بالغ، مسلمان اور طاہر ہوا سے ظلم قتل کر دیا جائے۔

جس قتل سے قصاص لازم آ سکتا ہو اگر ایسا قتل ہو جس سے مال لازم آئے تو اس قتل سے شہادت والے فقہی احکام جاری نہیں ہوں گے۔ اور اس نے دنیا کی زندگی کا کوئی نفع بھی حاصل نہ کیا ہو۔ اسی طرح جس شخص کو حربی کفار یا ڈاکو یا باغی قتل کر دیں خواہ کسی آلہ سے بھی قتل کریں۔ یا کسی مسلمان کی لاش میدان جنگ سے ملی ہے اس پر آثار قتل ہوں وہ فقہی شہید ہے۔

فقہی شہید کے احکام: اسے غسل نہیں دیا جائے گا۔ اور جو کپڑے اس نے پہن رکھے ہیں ان میں ہی اسے دفن کیا جائے گا اگر کفن سے زائد کپڑے ہیں، چمڑے یا اون وغیرہ کی کوئی وغیرہ پہن رکھی ہیں تو اتار دیئے جائیں۔ جوتے، ٹوپی وغیرہ اتار دیئے جائیں۔ اگر کفن سے کم کپڑے ہوں تو مکمل کر لئے جائیں عام حالات میں شلوار قمیص (کپڑوں کا جوڑا) پہنے ہوئے انسان شہید ہوتا ہے ایسی حالت میں بڑی چادر (لفافہ) پہنا دی جائے۔ شہید کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی اگرچہ شہید کے گناہ معاف ہو گئے لیکن نماز جنازہ میں اس کی تکریم پائی گئی ہے اور مدارج کی بلندی پائی گئی۔

غیر فقہی شہید کو غسل دیا جائیگا اور کفن بھی پہنایا جائے گا اور نماز جنازہ بھی پڑھی جائے گی۔ غیر فقہی شہید کی وضاحت سے فقہی شہید کی وضاحت بھی ہو جائے گی جس کو اجمالی طور پر ذکر کیا ہے۔ فقہی شہید میں ذکر کیا تھا۔ عاقل ہو، بالغ ہو لہذا نابالغ اور مجنون (پاگل) غیر فقہی ہوں گے ان کو غسل دیا جائے کیونکہ تلوار گناہوں کو مٹاتی ہے اور یہ گناہوں سے پاک ہوتے ہیں۔

خیال رہے مجنون جب نابالغ ہو تو وہ عام نابالغ کے حکم میں ہے بالغ ہو تو پھر بھی اسے غسل دیا جائے گا یعنی مجنون خواہ نابالغ ہو یا بالغ ہو اس کا حکم ایک ہی ہے۔

فقہی شہید کے متعلق ذکر کیا گیا تھا کہ وہ مسلمان ہو کیونکہ کافر کو اگرچہ کوئی شخص ظلماً قتل کر دے وہ شہید نہیں۔ نہ اسے فقہی شہید کہیں گے اور نہ ہی غیر فقہی ہاں اگر اس کا کوئی مسلمان رشتہ دار ہے تو اسے اس طرح غسل دے دے جس طرح ناپاک کپڑا دھویا جاتا ہے اور گڑھا کھود کر اسے دفن کر دے۔

فقہی شہید کے ساتھ پاک ہونے کی قید ذکر کی تھی کیونکہ اگر عورت حیض یا نفاس میں شہید کر دی گئی تو اسے غسل دیا جائے گا کیونکہ وہ غیر فقہی شہید ہے۔

اسی طرح جنبی آدمی نے غسل نہیں کیا تھا وہ اسی حال میں شہید ہو گیا تو اسے غسل دیا جائے گا وہ بھی غیر فقہی شہید کہلائے گا۔

اس پر دلیل یہ ہے کہ جب حضرت حنظلہ بن ابی عامر ثقفی شہید ہو گئے تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا ”ان صاحبکم حنظلة تغسله الملائكة فسألوا زوجته فقالت خرج وهو جنب“ بیشک تمہارے دوست حنظلہ کو فرشتے غسل دے رہے ہیں جب صحابہ کرام نے ان کی زوجہ سے پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ یہ جنبی تھے۔ (کیونکہ یہ شادی کی پہلی رات کے بعد ہی صبح اعلان جنگ سنتے ہی اسی طرح شریک ہو گئے تھے)۔

فقہی شہید میں ذکر کیا تھا کہ اس کے قتل پر قصاص لازم آتا ہو (جو ظلماً قتل کیا گیا) تو پھر وہ فقہی شہید ہوگا، یعنی اسے غسل نہیں دیا جائے گا یعنی ایسے آلہ سے قتل کیا جائے جو عام قتل کے لئے استعمال کیا جاتا ہو، تلوار، چھری وغیرہ سوئی وغیرہ سے قتل کر دیا تو وہ شبہ عمدہ ہے جس پر قصاص نہیں، دیت لازم ہے۔ ہاں اگر قصاص تو لازم ہونا تھا صلح کر لی گئی یا باپ نے بیٹے کو قتل کر دیا تو اس سے قصاص کو اٹھالیا گیا تو وہ فقہی شہید ہی ہوگا یعنی غسل نہیں دیا جائے گا۔

فقہی شہید میں یہ بیان کیا گیا تھا کہ اس نے کوئی نفع نہ حاصل کیا ہو۔ مطلب یہ ہے کہ وہ زخمی ہونے کے بعد کچھ دیر زندہ رہ گیا یعنی ہوش میں رہا اور دوا حاصل کر لی یا اس پر نماز کا وقت گزر گیا یا کوئی

وصیت کر لی تو وہ فقہی شہید نہیں کہلائے گا بلکہ اسے غسل دیا جائے گا۔

اس کا تعلق میدان جنگ سے فقط نہیں بلکہ یہ حکم عام ہے۔ ظلماً زخمی ہونے کے بعد زندہ رہا یا میدان جنگ سے جب اٹھایا گیا تو زندہ تھا:

”لما قتل عمر و علی غسلا لانہما ارتثا و عثمان اجہز علیہ فی مصرعہ ولم یرتث فلم یغسل کما فی البدائع“

جب حضرت عمر اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کو شہید کر دیا گیا تو ان کو غسل دیا گیا تھا کیونکہ وہ زخمی ہونے کے بعد کچھ وقت کیلئے زندہ رہے تھے، وصیتیں وغیرہ فرمائی تھیں لیکن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ زخمی ہونے کے ساتھ ہی شہید ہو گئے تھے اس لئے آپ کو غسل نہیں دیا گیا تھا۔ لہذا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ فقہی شہید ہوئے اور حضرت علی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما غیر فقہی شہید ہوئے۔

تنبیہ: جس شخص کو ظلماً قتل کیا گیا اس میں تو آلہ قتل کی قید تھی لیکن جو شخص میدان جنگ میں شہید ہو گیا اس کے ساتھ آلہ قتل کی قید نہیں وہ جس آلہ سے قتل کر دیا گیا ہو وہ فقہی شہید ہوگا اسے غسل نہیں دیا جائے گا۔

مسئلہ: میدان جنگ سے مسلمان کی لاش ملی اگر یہ معلوم ہو جائے کہ اس پر آثار قتل پائے گئے تو وہ فقہی شہید ہے اسے غسل نہیں دیا جائے گا اور اگر یہ شک ہو کہ ہو سکتا ہے اپنی موت سے فوت ہوا ہوگا تو وہ غیر فقہی شہید ہوگا اسے غسل دیا جائے گا۔ جیسا کہ آنکھ یا کان یا حلق سے صاف خون (یعنی منجمد خون نہ ہو) نکل رہا ہو تو یہی سمجھا جائے گا کہ اسے قتل کیا گیا ہے اور اگر ناک یا آلہ تناسل یا دبر یا حلق سے منجمد خون نکلا ہوا ہے تو اس میں شک ہے کیونکہ اس طرح خون عام موت کی حالت میں بھی نکل آتا ہے (قتل کرتے ہوئے کسی کو دیکھا نہیں صرف لاش میدان جنگ سے ملی ہے) تو اسے احتیاطی طور پر غسل دیا جائے گا غیر فقہی شہید تصور کیا جائے گا۔

مقام توجہ: اصل میں احد کے شہداء کو غسل نہیں دیا گیا تھا بلکہ ان کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”زملوہم بکلومہم ودمائہم“ (مداجم) ان کو زخموں اور خون میں ہی لپیٹ دو۔ مطلب یہ تھا کہ ان کو غسل نہ دو اس وقت ان شہداء کی جو حالت تھی اس سے ہٹ کر جو صورتیں درپیش ہو سکتی ہیں جن کا ذکر

کیا جا چکا ہے ان میں احتیاطاً غسل دیا جائے گا۔

مسئلہ : فقہی شہید ہو یا غیر فقہی شہید ہو کفار کے ساتھ لڑائی میں شہید ہو یا باغی اور ڈاکو شہید کر دیں یا ظلماً قتل کر دیا جائے سب ہی کامل شہید ہیں البتہ مدارج میں فرق ہو سکتا ہے۔

(از درمختار و شامی باب الشہید)

تنبیہ : جب دو مسلمان لڑیں ہر ایک چاہتا ہو کہ میں دوسرے کو قتل کر دوں تو وہ دونوں جہنمی ہیں ان میں سے قتل ہونے والا ظلماً قتل نہیں کیا گیا ان کے متعلق ہی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”القاتل والمقتول هما فی النار“ قاتل اور مقتول دونوں ہی جہنمی ہیں۔

شہید کے خون کا مسئلہ:

”و دم مسفوح من سائر الحيوانات الا دم شہید ای ولو مسفوحا اقتضاه كلامه وكلام البحر ما دام عليه فلو حمله المصلی جازت صلاته الا اذا اصابه منه لانه زال عن المكان الذي حکم بطهارته حموی ونحوه فی الحلبة“

(در مختار و شامی باب الانجاس)

تمام حیوانوں کا دم مسفوح یعنی بہنے والا خون، خواہ ذبح کرتے وقت وہ نکلے یا کسی انسان اور جانور کے زخمی ہونے سے وہ خون نکلے وہ نجاست غلیظہ ہے لیکن شہید کا خون خواہ دم مسفوح ہی کیوں نہ ہو وہ پاک ہے لیکن شرط یہ ہے کہ وہ خون شہید پر جب تک ہے اس وقت تک پاک ہے لیکن اگر وہ خون اس سے منتقل ہو جائے تو نا پاک ہو جائے گا کیونکہ جس مکان کو پاک ہونے کا حکم دیا گیا تھا اس سے منتقل ہو گیا اسی لئے خون آلود شہید کو اٹھائے ہوئے کوئی شخص نماز ادا کرے تو اس کی نماز ادا ہو جائے گی لیکن اگر شہید کا خون منتقل ہو کر اٹھانے والے تک پہنچ گیا تو اس شخص کو نجاست لاحق ہوگی۔ (از شامی)

اسی سے واضح ہو گیا کہ شہید کا خون کسی کنوئیں میں گر جائے یا شہید کے خون آلود کپڑے کنوئیں میں گر جائیں تو وہ کنواں نا پاک ہو جائے گا۔

انبیاء کرام اور اولیاء کرام زندہ ہیں: نبی کریم ﷺ کی زندگی کو مفتی اعزاز علی دیوبندی

حاشیہ نور الایضاح پر ان الفاظ سے پیش کرتے ہیں:

”مثله علیہ السلام بعد وفاته کمثل شمع فی حجرة اغلق بابها فهو مستور عن هو خارج الحجرة ولكن نوره كما كان بل ازيد وهذا حرم نکاح ازواجه بعده علیہ السلام لم یجر احکام الميراث فيما تركه لانهما من احکام الموت“

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مثال دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد اس طرح ہے جس طرح ایک شمع کو باہر سے کمرہ میں لے جائیں اور اس کا دروازہ بند کر دیا جائے اگرچہ وہ شمع کمرے سے باہر والوں سے چھپ گئی لیکن اس کی روشنی اس طرح ہے بلکہ پہلے سے بھی زیادہ کیونکہ باہر روشنی کم تھی اندر جا کر زیادہ ہو گئی (اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم قبر شریف میں اگرچہ باہر والے لوگوں سے مستور ہیں لیکن آپ کی زندگی پہلے سے بھی زیادہ ارفع و بلند ہے)۔ اسی وجہ سے آپ کے دنیا سے رخصت ہو جانے کے باوجود آپ کی ازواج مطہرات سے نکاح کرنا حرام ہے اور آپ کے ترکہ پر وراثت کے احکام جاری نہیں ہوتے کیونکہ یہ دونوں کام مردوں سے تعلق رکھتے ہیں آپ تو زندہ ہیں۔ تقریباً یہی مضمون مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی اپنی تفسیر معارف القرآن میں ذکر فرماتے ہیں آپ نے اسی زیر بحث آیت کریمہ کی تفسیر میں صالحین کی زندگی کا قول بھی کیا ہے۔

علامہ علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

فان الله تعالى قال في حق الشهداء من امته بل احياء عند ربهم يرزقون فكيف سيدهم بل رئيسهم لانه حصل لها ايضا مرتبة الشهادة مع مزيد السعادة“

بیشک اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے شہداء کے متعلق کہا کہ وہ اپنے رب کے پاس زندہ ہیں روزی پاتے ہیں ان کے سردار اور رئیس کو یہ مقام کیسے حاصل نہ ہو آپ کو بھی مرتبہ شہادت حاصل ہے بلکہ امت کے شہداء سے زیادہ سعادت حاصل ہے۔

چونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خیبر میں ایک یہودیہ نے زہر آلود بکری کا گوشت جو دیا تھا اگرچہ ایک دو لقمہ تناول فرمانے پر ہی خود گوشت نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا تھا کہ مجھے زہر آلود کیا گیا ہے تاہم آپ کے وصال کے وقت وہ زہر لوٹ کر آ گیا تھا جو (ایک دو لقمہ تناول کرنے پر مؤثر ہوا تھا وہی) اثر انداز ہو گیا

جس سے آپ کو شہادت حاصل ہوئی۔

اسی مقام پر علامہ علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں ”اولیاء اللہ لا یموتون ولكن ینتقلون من دار الفناء الی دار البقاء“ اللہ کے ولی نہیں مرتے بلکہ فانی دنیا سے باقی رہنے والے مقام کی طرف انتقال کرتے ہیں۔
(مرقاۃ باب الجمعة)

نبی کی زندگی شہید کی زندگی سے اعلیٰ ہے:

شہید کی زندگی نص قطعی سے ثابت ہے لیکن نبی کی زندگی سے کم درجہ ہے شہید کی بیوہ کو عدت گزارنے کے بعد نکاح کرنے کی اجازت ہے لیکن نبی کی زوجہ کو نکاح کرنے کی اجازت نہیں کیونکہ شہید زندہ ہونے کے باوجود دنیاوی احکام کے لحاظ سے اس پر مردہ ہونے والے احکام جاری ہو جاتے ہیں لیکن نبی کی زندگی اتنی کامل اور ارفع ہے کہ نبی کی زوجہ بیوہ نہیں ہوتی اور اس سے نکاح کرنے کی ممانعت فرمادی ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَا أَنْ تَنْكِحُوا أَزْوَاجَهُمْ مِنْ بَعْدِهِ أَبَدًا﴾ ”اور ان کے بعد کبھی ان کی بیویوں سے نکاح نہ کرو“ یہ نکاح کی ممانعت صرف نبی کریم ﷺ کی زندگی کی وجہ سے ہے آپ کی ازواج مطہرات کا مومنوں کی ماں ہونے کی وجہ سے نہیں اس لئے کہ مومنوں کی ماں ہونے کا شرف تمام ازواج مطہرات کو حاصل ہے، لیکن یہ صرف رتبہ کی وجہ سے، ورنہ حقیقی ماں کے تمام احکامات ان پر جاری نہیں ہوتے کیونکہ جس طرح ماں سے نکاح حرام ہے اسی طرح ماں کی بیٹی سے بھی نکاح حرام ہے حالانکہ حضرت علی، حضرت عثمان اور حضرت ابوالعاص رضی اللہ عنہم کے آپ کی بیٹیوں سے نکاح تھے جو تمام حضرت خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کی بیٹیاں ہیں۔

شہید کی زندگی سے نبی کی زندگی اس وجہ سے بھی بلند ہے کہ شہید کی باوجود زندہ ہونے کے وراثت تقسیم ہوتی ہے لیکن نبی کی وراثت تقسیم نہیں ہوتی اس سے یہ نتیجہ حاصل ہوتا ہے کہ شہید پر دنیا کے لحاظ سے فوت شدہ حضرات کے احکام جاری ہوتے ہیں اگرچہ اسے برزخی زندگی حاصل ہے۔

انبیاء کرام کی وراثت تقسیم نہ ہونے کی وجہ حدیث پاک میں ہے ”انا معاشر الانبیاء لانورث ولا نورث ما ترکناہ صدقة“ ہم انبیاء کرام نہ کسی کے وارث ہوتے ہیں اور نہ ہمارا کوئی وارث ہوتا ہے ہم جو مال چھوڑتے ہیں وہ صدقہ ہوتا ہے۔

علامہ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

آپ نے انبیاء کرام کی حیات پر ایک رسالہ تحریر فرمایا جس کا نام انباء الاذکیاء بحیاء الانبیاء ہے الحاوی للفتاویٰ میں یہ رسالہ شامل ہے جس سے مختصر طور پر کچھ بحث میں نقل کر رہا ہوں:

”حیاء النبی ﷺ فی قبرہ ہو وسائر الانبیاء معلومة عندنا علما قطعیا“

نبی کریم ﷺ کی قبر شریف میں زندگی اور باقی انبیاء کرام کی زندگی ہمیں قطعی طور پر معلوم ہے اس میں دلائل موجود ہیں اور خبریں تو اتر کے درجے تک موجود ہیں اسی وجہ سے بیہقی نے انبیاء کرام کی قبروں کی زندگی پر ایک باب تالیف کیا ہے۔

انبیاء کرام اپنی قبروں میں نماز پڑھتے ہیں:

”اخرجه مسلم عن انس ان النبی ﷺ لیلۃ اسری بہ مریموسی علیہ السلام وهو یصلی فی قبرہ“

مسلم شریف میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ معراج کی رات موسیٰ علیہ السلام کی قبر سے گزرے تو آپ اپنی قبر شریف میں نماز ادا کر رہے تھے۔ اسی طرح ابو نعیم نے بھی اس حدیث شریف کو کچھ مختلف الفاظ سے ذکر کیا ہے۔ بیہقی کتاب حیاء الانبیاء میں ذکر ہے ”عن انس ان النبی ﷺ قال الانبیاء احياء فی قبورهم یصلون“ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی گئی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ تمام انبیاء کرام اپنی اپنی قبروں میں زندہ ہیں وہ نماز ادا کرتے ہیں۔

نبی کریم ﷺ درود پاک سنتے ہیں:

”عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ ﷺ من صلی علی عند قبری سمعته ومن صلی علی نائیا بلغته“

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ نے فرمایا جو شخص میری قبر کے پاس درود شریف پڑھتا ہے میں اسے سنتا ہوں اور جو شخص مجھ پر دور سے درود پاک پڑھتا ہے وہ مجھ تک پہنچایا جاتا ہے۔

تنبیہ : اس حدیث پاک سے یہ مطلب لینا ”کہ آپ دور سے نہیں سنتے بلکہ آپ کے پاس فرشتے پہنچاتے ہیں“ درست نہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ سمیع و بصیر بھی ہے لیکن پھر بھی فرشتے اللہ تعالیٰ کے پاس بندوں کے اعمال پہنچاتے ہیں دوسری حدیث جس میں انشاء اللہ تفصیل سے بحث آئے گی اس میں قریب اور بعید کا کوئی ذکر نہیں بلکہ آپ ہر جگہ سے درود و سلام سنتے ہیں اور سلام کا جواب دیتے ہیں۔

”ما من احد یسلم علی الا رد اللہ روحی حتی ارد علیہ السلام“

جو شخص مجھ پر سلام بھیجتا ہے اللہ تعالیٰ میری توجہ اس کی طرف کر دیتا ہے یہاں تک کہ میں اس کے سلام کا جواب دیتا ہوں۔

نبی کریم ﷺ کا علم موت کے بعد ایسے ہی ہے جیسے زندگی میں تھا:

اصہبانی ترغیب میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں:

”قال رسول اللہ ﷺ من صلی علی مائة فی یوم الجمعة وليلة الجمعة قضی اللہ له مائة حاجة سبعین من حوائج الآخرة وثلاثین من حوائج الدنيا ثم وکل اللہ بذلك ملکا یدخله علی فی قبری کما یدخل علیکم الہدایا ان علمی بعد موتی کعلمی فی الحیوة“

نبی کریم ﷺ نے فرمایا جو شخص مجھ پر جمعہ کے دن اور جمعہ کی رات میں ایک سو مرتبہ درود پاک پڑھتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی ایک سو حاجتیں پوری کرتا ہے ستر حاجات آخرت کی اور تیس حاجات دنیا کی۔ پھر اللہ تعالیٰ اس پر ایک فرشتہ مقرر کر دیتا ہے جو میری قبر میں میرے پاس اس درود کو اس طرح پیش کرتا ہے جس طرح تمہارے پاس تحائف لائے جاتے ہیں بیشک میرا علم میری موت کے بعد ایسے ہی ہے جیسے میرا علم میری زندگی میں ہے۔

مقام توجہ: اس حدیث پاک میں مطلقاً درود شریف کو فرشتوں کے پہنچانے کا ذکر ہے خواہ درود پاک پڑھنے والا قریب ہو یا بعید۔

ان تمام احادیث کے مجموعی مضامین سے یہ واضح ہوا کہ درود پاک پڑھنے والے شخص کا درود پاک تحفہ کی طرح فرشتے نبی کریم ﷺ کے پاس پہنچاتے ہیں اور نبی کریم ﷺ خود بھی سنتے ہیں۔

کیونکہ فرشتوں کا کوئی عمل پہنچانا اپنے سننے سے مانع نہیں۔ جب کہ اللہ تعالیٰ خود سنتا بھی ہے اور فرشتے بندوں کے اعمال اس تک پہنچاتے بھی ہیں جس طرح وہاں فرشتوں کا پہنچانا اللہ تعالیٰ کے سننے کے منافی نہیں اسی طرح نبی کریم ﷺ کے پاس فرشتوں کا درود پاک پہنچانا آپ کے سننے کے منافی نہیں۔

نبی کریم ﷺ کی قبر سے اذان کا آواز آنا:

ابن سعد نے طبقات میں سعید ابن مسیب سے روایت کیا ہے وہ فرماتے ہیں:

انه كان يلزم المسجد ايام الحرة والناس يقتلون قال فكنت اذا حانت الصلوة اسمع اذانا يخرج من قبل القبر الشريف

سعید بن مسیب کہتے ہیں کہ میں مسجد نبوی میں ہی ہوتا تھا جب ایام حرہ کا واقعہ درپیش آیا (یزیدی دور میں جب مدینہ طیبہ پر حملہ کیا گیا ظلم و ستم ہوا مسجد نبوی میں تین دن تک اذانیں نمازیں بند رہیں اس واقعہ کو ایام حرہ سے تعبیر کیا گیا ہے) لوگ جنگ کرنے میں مشغول ہوتے ہیں قبر شریف سے نماز کے وقت اذان کی آواز سنتا تھا یہ حدیث کچھ مختلف الفاظ سے زبیر ابن بکار نے اخبار مدینہ میں سعید بن مسیب سے روایت کی اور دارمی نے بھی اپنی مسند میں سعید بن مسیب سے ہی روایت کی ہے۔

بیہقی نے کتاب الاعتقاد میں ذکر کیا ہے ”الانبياء بعد ما قبضوا ردت اليهم ارواحهم فهم احياء بهم كالشهداء“ انبیاء کرام کی وفات کے بعد ان کے ارواح لوٹا دیئے جاتے ہیں وہ اسی طرح زندہ ہیں جس طرح شہداء کو زندگی حاصل ہے علامہ سیوطی رحمہ اللہ فرماتے ہیں انبیاء کرام زندہ ہیں، موجود ہیں البتہ ہم ان کو دیکھ نہیں سکتے۔

اسی طرح جس طرح فرشتے زندہ ہیں موجود ہیں لیکن ہم میں سے کوئی انہیں دیکھ نہیں سکتا یہ ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے اولیاء کرام میں سے کسی کو خصوصی کرامت سے نواز دے تو وہ فرشتوں کو دیکھ سکے۔ (اسی طرح اولیاء کرام کو اپنے مزارات میں زندہ نماز پڑھتے دیکھ لیں تو یہ عقل سے بعید نہیں)۔

نبی کریم ﷺ اپنی امت کے اعمال کو جانتے ہیں: استاد ابو منصور عبد القاہر کہتے ہیں:

”المتكلمون المحققون من اصحابنا ان نبينا ﷺ حي بعد وفاته وان يسر بطاعات امته ويحزن بمعاصي العصاة منهم“

ہمارے اصحاب میں سے متکلمین محققین کہتے ہیں کہ ہمارے نبی کریم ﷺ اپنی وفات کے بعد زندہ ہیں اپنی امت کی نیکیوں پر خوش ہوتے ہیں اور اپنی امت کے نافرمانوں کے گناہوں سے پریشان ہوتے ہیں۔ علامہ قسطلانی شارح بخاری مواہب اللدنیہ میں فرماتے ہیں

”لا فرق بين موته وحياته ﷺ في مشاهدته لامته ومعرفته باحوالهم ونياتهم وعنائهم وخواطهم وذلك جلي عنده لا خفاء به“ (مواہب اللدنیہ مع زرقانی جلد ۸ ص ۲۰۵)

نبی کریم ﷺ کی موت و حیات میں کوئی فرق نہیں آپ ہر حال میں اپنی امت کا مشاہدہ فرما رہے ہیں اور ان کے احوال کو پہچانتے ہیں اور ان کی نیتوں کو جانتے ہیں اور ان کے ارادوں پر مطلع ہیں اور ان کے دل پر کھٹکنے والے واقعات سے باخبر ہیں اور یہ بہت واضح ہے اس میں کوئی خفاء نہیں۔ تقریباً یہی مضمون حضرت عبد اللہ بن مبارک رضی اللہ عنہ نے حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ سے نقل فرمایا ہے صاحب مواہب لدنیہ نقل فرماتے ہیں:

”عن عبد الله بن المبارك عن سعيد بن المسيب رضي الله عنه ليس من يوم الا ويعرض على النبي ﷺ اعمال امته غدوة وعشية فيعرفهم بسيماهم واعمالهم فلذلك يشهد عليهم“ (مواہب لدنیہ ج ۵ ص ۳۳۷)

حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ کوئی دن ایسا نہیں جس میں صبح و شام نبی کریم ﷺ کی خدمت میں امت کے اعمال پیش نہ ہوتے ہوں نبی کریم ﷺ اپنی امت کو اشکال و صورت اور ان کے اعمال کے ساتھ جانتے ہیں اسی لئے وہ ان پر گواہ ہوں گے قیامت کے دن۔

(و کذا فی الملہم ج ۱ ص ۲۱۳ بحوالہ جلاء الصدور)

اعتراض: مسند امام احمد، ابوداؤد اور بیہقی شریف میں ایک حدیث حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے ”ان رسول الله ﷺ قال ما من احد يسلم على الا رد الله روحى حتى ارد عليه السلام“ بیشک نبی کریم ﷺ نے فرمایا جو شخص مجھ پر سلام پیش کرتا ہے اللہ تعالیٰ میرے روح کو

لوٹاتا ہے میں اس کے سلام کا جواب دیتا ہوں۔

اس حدیث پاک سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کا روح آپ کے بدن سے کبھی جدا ہوتا ہے اور کبھی لوٹ کر آتا ہے تمام وقت آپ کی زندگی ثابت نہیں ہوتی کیونکہ تمام وقت روح موجود نہیں ہوتا اس اعتراض کے کئی جواب علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے دیئے جن میں سے کچھ نقل کئے جا رہے ہیں۔

پہلا جواب: حدیث شریف میں ”رد اللہ“ جو جملہ واقع ہے یہ جملہ حالیہ ہے جب فعل ماضی حال واقع ہو اس پر لفظ ”قد“ داخل ہوتا ہے ظاہر ہو یا مقدر جس طرح ”او جاء و کم حصرت صدورهم“ میں ”قد“ مقدر ہے اصل میں ”قد حصرت“ ہے۔

جملہ ماضیہ سلام پیش کرنے والے کے سلام سے پہلے واقع ہوگا اور حدیث شریف میں جو لفظ حتی ہے وہ تعلیلیہ نہیں بلکہ فقط عطف کیلئے ہے اب حدیث پاک کا مطلب ان الفاظ سے پیش کیا جائے گا۔
”ما من احد یسلم علی الا قد رد اللہ علی روحی قبل ذلک فارد علیہ السلام“

مجھ پر جب بھی کوئی سلام پیش کرتا ہے میں اس کا جواب دیتا ہوں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے میرے روح کو پہلے ہی لوٹا دیا ہے۔

یعنی روح سلام کی بعد نہیں لوٹتا بلکہ پہلے سے ہی جاودانی زندگی عطاء فرمادی ہے۔

غلطی کی وجہ یہ ہے کہ ”رد اللہ“ کو حال یا استقبال کے معنی میں لیا گیا ہے اور حتی کو تعلیلیہ بنایا گیا ہے اور ترجمہ اس طرح کیا گیا ہے ”کہ جب بھی کوئی شخص مجھ پر سلام پیش کرے گا اللہ تعالیٰ میرے روح کو لوٹائے گا یہاں تک کہ میں اس کے سلام کا جواب دوں گا“۔

حالانکہ صحیح ترجمہ ضابطہ کے مطابق وہ ہے جو اوپر پیش کیا جا چکا ہے۔

اگر حال اور استقبال کا معنی لیا جائے تو لازم یہ آئے گا بار بار مسلمان درود پاک پڑھیں گے بار بار نبی کریم ﷺ کے روح کو لوٹایا جائے گا بار بار روح کو لوٹانے میں چار قسم کی رکاوٹیں موجود ہیں۔

(۱) روح کا کئی مرتبہ ٹکنا اور لوٹنا جسم کو درد پہنچاتا ہے اس میں نبی کریم ﷺ کی عزت و تکریم نہیں ہوگی بلکہ درد پہنچانا لازم آئے گا جو آپ کی شان کے مخالف ہے۔

(۲) تمام لوگوں یعنی شہداء وغیرہ کی مخالفت لازم آتی ہے کسی کے متعلق قبر میں یعنی برزخی زندگی میں بار بار روح کا جدا ہونا پھر لوٹنا ثابت نہیں۔ نبی کریم ﷺ کے روح کا ہمیشہ رہنا بہت ضروری ہے کیونکہ آپ اعلیٰ مرتبہ والے ہیں۔

(۳) یہ قرآن پاک کے مخالف ہے کیونکہ قرآن پاک سے صرف دو موتیں اور دو زندگیاں ثابت ہیں اس تکرار سے تو کئی موتیں اور کئی زندگیاں ثابت ہوں گی۔ حالانکہ یہ باطل ہے۔

(۴) اس کا تکرار والا معنی لینا احادیث متواترہ کے مخالف ہے جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے جن سے ہمیشہ کی زندگی ثابت ہے۔ قانون یہ ہے جو حدیث احادیث متواترہ یا قرآن پاک کے مخالف ہو اس کی تاویل ضروری ہے اگر تاویل نہ ہو سکے تو اس پر عمل نہیں ہو سکتا اس کی تاویل جب ہو سکتی ہے تو ظاہری معنی مراد نہیں بلکہ تاویل کے مطابق ہوگا۔

دوسرا جواب: ”عود“ اور ”رد“ کا معنی عام طور پر لوٹنا اور لوٹنا ہوتا ہے لیکن کبھی ان کا معنی لوٹنا نہیں ہوتا بلکہ آ جانا، ہو جانا، موجود ہونا، اس قسم کے معانی ہوتے ہیں۔ جس طرح حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم کے کافر سرداروں نے آپ کو کہا یا تو آپ ہمارے دین میں آ جائیں ورنہ ہم تمہیں اپنی بستیوں سے نکال دیں گے آپ نے ان کے جواب میں یہ کہا ”قد افترینا علی اللہ کذباً ان عدنا فی ملتکم“ ضرور ہم اللہ پر جھوٹ باندھیں گے اگر ہم تمہارے دین میں لوٹ آئیں۔ یہ معنی اس وقت درست ہو سکتا ہے جب معاذ اللہ حضرت شعیب علیہ السلام پہلے ان کے دین میں ہوتے پھر ان کے دین کو چھوڑا ہوتا پھر ان کے مطالبے پر کہتے اگر میں تمہارے دین میں لوٹ آؤں حالانکہ آپ ان کے دین پر تھے ہی نہیں اب اس آیت کا صحیح ترجمہ یہ ہوگا ”ضرور ہم اللہ پر جھوٹ باندھیں گے اگر ہم تمہارے دین میں آ جائیں“۔

اسی طرح حدیث پاک کا ترجمہ یہ ہوگا اگر کوئی شخص مجھ پر سلام پیش کرے تو میں اس کے سلام کا جواب دوں گا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مجھے روح عطا فرمائی ہے۔

تیسرا جواب: رد روح سے مراد روح کا بدن سے جدا ہو کر لوٹنا مراد نہیں۔ نبی کریم ﷺ قبر شریف

میں احوال ملکوت میں مشغول ہیں اور اپنے رب کے مشاہدہ میں مستغرق ہوتے ہیں۔ جب کوئی سلام پیش کرے تو آپ اس استغراقی حالت سے جب اس انسان کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اس توجہ کو روح کے لوٹنے سے تعبیر فرمایا ہے۔ اس پر ایک اور حدیث شاہد ہے جس کا تعلق واقعہ معراج سے ہے وہ یہ ہے ”فاستيقظت وانا بالمسجد الحرام“ اس کا ظاہری معنی یہ ہے جب میں بیدار ہوا تو میں مسجد حرام میں تھا حالانکہ معراج شریف خواب کا واقعہ نہیں بلکہ جاگتے ہوئے درپیش آیا۔ اس حدیث کا مطلب بھی یہ ہے کہ آپ معراج کی رات ملکوت کے عجائب و غرائب دیکھنے کی وجہ سے وجدانی کیفیت میں تھے اس حالت سے واپس لوٹے اور مسجد حرام تشریف لائے اس حالت کو جاگنے سے تعبیر فرمایا۔

چوتھا جواب: ”ان الرد يستلزم الاستمرار لان الزمان لا يخلو من مصل عليه في اقطار الارض فلا يخلو من كون الروح في بدنه“

اس مقام پر ”رد“ کا لفظ خود ہیشتی کا تقاضا کرتا ہے کیونکہ کوئی ایسا زمانہ نہیں ہوگا جس میں اطراف زمین میں درود پاک پڑھنے والا نہ ہو لہذا کوئی ایسا وقت نہیں ہو سکتا جس میں روح بدن میں موجود نہ ہو یعنی ہر زمانہ، ہر وقت، ہر آن میں کوئی نہ کوئی شخص زمین کے کسی نہ کسی حصے میں درود پاک پڑھنے والا ہوتا ہے جب بھی کوئی شخص درود پڑھے تو آپ کی روح کا موجود ہونا ضروری ہوتا ہے۔ تو معلوم ہوا کہ آپ کی روح مبارک بدن میں ہمیشہ ہی موجود ہے۔

پانچواں جواب: ”ليس المراد بالروح روح الحياة بل الارتياح كما في قوله تعالى (فروح وريحان) فانه قرئ فروح بضم الراء والمراد انه ﷺ يحصل له بسلام المسلم عليه ارتياح وفرح وهشاشة لوجه ذلك فيحمله ذلك على ان يرد عليه“
روح سے مراد روح حیات نہیں بلکہ راحت محسوس کرنا جس طرح اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے (فروح وريحان) ایک قرأت راء کی پیش ہے مراد یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کو مسلمان کے سلام سے راحت اور خوشی حاصل ہوتی ہے اور اس کی محبت پر آپ خوش ہوتے ہیں۔ حدیث شریف میں روح کے لوٹانے کا یہی مطلب ہے۔
(از الحاوی للفتاوی)

شہید کی زندگی پر روح البیان کا بیان:

انسان میں دو روہیں ہیں ایک روح سلطانی جس کا مقام دل ہے اسی سے زندگی قائم ہے دوسری روح حیوانی جس کا مقام دماغ ہے جس سے ہوش و حواس برقرار رہتے ہیں روح حیوانی سونے کی حالت میں نکل جاتی ہے اور روح سلطانی بروقت موت خارج ہوتی ہے۔ یعنی روح حیوانی کے نکلنے کا نام نیند ہے اور روح سلطانی کے نکلنے کا نام موت ہے پھر جیسے نیند کی حالت میں روح حیوانی جسم سے نکل کر عالم کی سیر کرتی ہے اسی سیر کا نام خواب ہے مگر جسم سے اس کا تعلق رہتا ہے کیونکہ جو نہی کسی نے جسم کو ہاتھ لگایا یا پکارا فوراً ہی روح کو خبر ہوئی اور آنا فنا آ کر جسم میں داخل ہو گئی اور سونے والا جاگ گیا۔

ایسے بعد موت روح سلطانی کا کچھ تعلق جسم سے باقی رہتا ہے کہ جو کوئی قبر پر فاتحہ کے لئے آئے روح کو خبر ہو جاتی ہے اس سے اتنا معلوم ہوا کہ موت نہ تو روح کی فنا کا نام ہے نہ جسم کی۔ صرف جسم سے تعلق کے ضعیف ہونے کا نام ہے اب یہ روح اس جسم کی پرورش نہیں کرتی جسم گل سڑ جاتا ہے۔

(ماخوذ از نعیمی)

لیکن انبیاء کرام کے اجسام سے ان کی ارواح کا تعلق بہت زیادہ قوی ہوتا ہے اس کے بعد شہداء کے اجسام سے اسی لئے ان کے جسم محفوظ رہتے ہیں پھر صلحاء کے جسموں سے بھی ایسا تعلق رہتا ہے کہ ان کے جسم محفوظ رہتے ہیں۔ راقم کے پردادا قاضی غلام نبی رحمہ اللہ کی قبر بارشوں کی وجہ سے جب نقصان میں آئی تو اٹھارہ سال کے بعد بھی آپ کا جسم صحیح سلامت تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسا کہ آج ہی دفن کیا گیا آپ کی داڑھی مبارک میں غسل کے وقت کے پانی کے قطرات تک موجود تھے۔ (راقم)

﴿وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ ☆ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُمُ مُّصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ﴾

(۱) ”اور ضرور ہم تمہیں آزمائیں گے کچھ ڈر اور کچھ بھوک سے اور کچھ مالوں اور جانوں اور پھلوں کی کمی سے اور خوشخبری سنا ان صبر والوں کو کہ جب ان پر کوئی مصیبت پڑے تو کہیں ہم اللہ کے مال ہیں اور ہم کو اسی کی طرف پھرنا“

(۲) ”اور ضرور بر ضرور ہم آزمائیں گے تمہیں کسی نہ کسی چیز سے یعنی خوف اور بھوک سے اور کمی کر کے مالوں اور جانوں اور پھلوں میں سے اور آپ خوشخبری سنائیں صبر کرنے والوں کو وہ لوگ جب ان کو پہنچے کوئی مصیبت تو کہیں بیشک ہم اللہ کے لئے ہیں اور بیشک ہم اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں“

پہلی آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا کہ نماز اور صبر سے امداد طلب کرو اب بتایا جا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہاری ضرور بر ضرور آزمائش کرے گا اس وقت کامیابی تب ہی تم حاصل کرو گے جب صبر کرو گے۔
اعتراض: رب تعالیٰ نے پہلے ذکر فرمایا ﴿وَاشْكُرُوا لِي وَلَا تَكْفُرُونِ﴾ اور میرا شکر کرو اور میری نعمتوں کا انکار نہ کرو“

اور ارشاد فرمایا ﴿لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ﴾ ”اگر تم نے شکر کیا تو البتہ تمہیں زیادہ عطا کروں گا“ اس کے بعد ﴿وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ﴾ کا کیا مطلب ہے۔
شکر کرنے اور مزید نعمتیں عطا کرنے کے بعد خوف اور بھوک سے آزمانا اور مالوں اور جانوں اور پھلوں میں کمی کر کے آزمانا بظاہر عقل میں نہ آنے والی بات ہے۔

جواب اول: اللہ تعالیٰ نے خبر دی شرائع کو کامل کرنے سے نعمت کی تکمیل ہوگی۔ یعنی اگر تم نے شریعت کے مطابق عمل کر کے میری نعمتوں کا شکر کیا تو تم پر میری طرف سے اور نعمتوں کا فیضان ہوگا۔

”ثم اخبر ان القيام بتلك الشرائع لا يمكن الا بتحمل المحن“

پھر خبر دی کہ احکام شرع پر اس وقت تک بھی عمل کرنا کامل طور پر ممکن نہیں جب تک وہ مصائب و آلام میں آزمایا نہ جائے اس وقت آزمائش کے وقت صبر کرنا ضروری ہے۔

جواب دوم: اللہ تعالیٰ نے انعام عطاء فرما کے شکر کرنے کا حکم دیا پھر آزمائش میں مبتلاء ہونے پر صبر کا حکم دیا "لینال الرجل درجة الشاکرین والصابرین معافی کمل ایمانہ" تاکہ انسان شکر کرنے والے اور صبر کرنے والوں کا درجہ حاصل کر لے اور اس کا ایمان مکمل ہو جائے۔ اس لئے کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے "الایمان نصفان نصف صبر ونصف شکر" ایمان کے دو حصے ہیں نصف ایمان صبر ہے اور نصف ایمان شکر ہے۔

صبر سے امداد طلب کرنے کے بعد آزمائش کے ذکر کے فوائد:

(۱) پہلے حکم دیا صبر سے امداد طلب کرو تا کہ صبر کرنے کی جب عادت ہو جائے گی اور صبر ان کے نفسوں میں جگہ پکڑ جائے گا پھر جب ان پر آزمائش آئے گی "فیکون ذلک ابعدلہم عن الجزع واسهل علیہم بعد الورد" تو ان سے جزع و فزع دور رہے گی اور آزمائشوں پر پورا اترنا ان کے لئے آسان ہوگا۔

(۲) جب ان کو معلوم ہو جائے گا کہ ان کو شدید قسم کے امتحانات سے گزرنا پڑے گا تو ان پر خوف شدید ہو جائے گا "فیصیر ذلک الخوف تعجیلاً للابتلاء فیستحقون بہ مزید الثواب" تو یہ جلدی حاصل ہونے والا خوف بھی امتحان کا ہی ایک حصہ ہے گویا کہ امتحان سے پہلے ہی امتحان کے مزید (زیادہ) ثواب کے وہ مستحق ہو جائیں گے۔

(۳) کفار نے جب نبی کریم ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام کو دیکھا کہ یہ لوگ بہت بڑی آزمائشوں میں مبتلاء ہونے کے باوجود اپنے دین پر قائم ہیں "یعلمون ان القوم انما اختاروا هذا الدین لقطعہم بصحتہ فیدعوہم ذلک الی مزید التامل فی دلائلہ" تو وہ یقین کرنے لگے کہ یہ لوگ اتنی بڑی آزمائشوں میں مبتلاء ہونے کے باوجود جب دین پر قائم رہے تو یہ دین صحیح ہے اس طرح

وہ لوگ دین کی حقانیت کو سمجھنے کے لئے دلائل میں غور و فکر کرنے لگے۔

اور یہ بھی یقینی بات ہے کہ جب وہ ہستی جو دین اسلام کی دعوت دے رہی تھی وہ خود بڑی بڑی تکالیف برداشت کر رہے تھے تو آپ کے متبعین کو تکالیف برداشت کرنی آسان ہو گئیں اور منافقین کو سوچنے اور ایمان لانے کی توفیق ملنے لگی۔

(۴) رب تعالیٰ کے حکم کو نبی کریم ﷺ نے پہلے ہی بیان فرما دیا کہ تمہیں ضرور بر ضرور آزمائش میں مبتلا کیا جائے گا جب آپ کی خبر کے مطابق ہی واقعات رونما ہوئے ”فکان ذلک اخبارا عن الغیب فکان معجزا“ تو یہ غیب کا علم ہے جو نبی کریم ﷺ کا معجزہ ہے۔

سبحان اللہ عظیم مفسر، عظیم محقق علامہ رازی رحمہ اللہ نے کیا خوب بیان فرمایا کہ علم غیب نبی کریم ﷺ کا معجزہ ہے۔ یہ بھی خیال رہے کہ یہ ایسا معجزہ ہے کہ ایسا علم کسی اور کو حاصل ہونا تو دور کی بات ہے لوگوں کی عقلیں علم غیب کو سمجھنے سے بھی عاجز آ گئیں۔

(۵) بیشک منافقین نے نبی کریم ﷺ کی تابعداری کو ظاہر کیا جس کی وجہ سے مال و دولت کے حاصل کرنے کی طمع و لالچ اور رزق میں وسعت حاصل کرنے کی حرص تھی۔ لیکن جب ان کو پتہ چلا کہ اس دین میں قائم رہنے پر تو بہت بڑی آزمائشوں سے گزرنا پڑے گا:

”فعند ذلک یتمیز المنافق عن الموافق لان المنافق اذا سمع ذلک

نفر منه وترك دینه فکان فی هذا الاختبار هذه القادة“

تو اس کا یہ فائدہ حاصل ہوا کہ منافقین اور موافقین میں فرق نمایاں ہو گیا کیونکہ منافقین نے جب یہ سنا کہ اس دین میں رہنے سے تو خوف اور بھوک میں مبتلا ہونا پڑے گا اور جان و مال اور بچلوں کی کمی کی آزمائش سے گزرنا پڑے گا تو انہوں نے دین کو چھوڑ کر بھاگنا شروع کر دیا۔

(۶) ”ان اخلاص الانسان حالة البلاء ورجوعه الى باب الله تعالى اکثر من اخلاصه

حال اقبال الدنيا عليه فكانت الحکمة فی هذا الابتلاء ذلک“

بیشک انسان کو آزمائش کی حالت میں زیادہ خلوص حاصل ہوتا ہے اور وہ دنیا کی طرف توجہ کرنے کی بجائے اللہ تعالیٰ کے در اقدس کی طرف رجوع کرتا ہے اور عبادات خلوص سے ادا کرتا ہے۔

بشئی : ” شئی “ واحد ذکر کیا ہے جمع (اشیاء) ذکر نہیں کیا اس کی کیا وجہ ہے؟ اس کی دو وجہ ہیں:

” الاول لنلا یوهم باشیاء من کل واحد فیدل علی ضروب الخوف

والتقدیر بشی من کذا وشئی من کذا “

اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ جمع اس لئے نہیں ذکر فرمایا تا کہ یہ وہم نہ ہو کہ خوف کی تمام قسمیں مسلط کر کے آزمایا جائے گا فلاں خوف سے اور فلاں خوف سے آزمایا جائے گا۔ بلکہ پہلے ” شئی “ ذکر کیا کہ کسی نہ کسی چیز سے آزمایا جائے گا پھر ” من “ بیان یہ ذکر کیا یعنی آزمائش خواہ خوف سے ہو یا بھوک وغیرہ سے (خیال رہے راقم کا ترجمہ اسی کے مطابق ہے)

” والثانی معناه بشی قلیل من هذه الاشیاء “ دوسرا مطلب یہ ہے کہ ” شئی “ واحد ہے اور نکرہ ہے تنوین تقلیل پر دلالت کرتی ہے اب معنی یہ ہوگا کہ ہم ضرور بر ضرور تمہیں آزمائیں گے ان مذکورہ اشیاء میں سے تھوڑی تھوڑی چیزوں سے (اعلیٰ حضرت کا ترجمہ اس قول کے مطابق ہے)۔

مِنَ الْخَوْفِ : (خوف سے) اس مقام پر خوف سے مراد کیا ہے؟ اس مسئلہ کو سمجھنے کے لئے علامہ رازی رحمہ اللہ کی اس خوبصورت بحث کو مد نظر رکھیں آپ فرماتے ہیں:

انسان کو یا مکروہ (ناپسندیدہ) چیزوں سے واسطہ پڑتا ہے یا محبوب (پسندیدہ) چیزوں سے پھر ان کا تعلق ماضی سے ہوگا یا حال سے، یا استقبال سے

” فاذا خطر ببالک موجود فیما مضی سمی ذکرا وتذکرا “ ماضی کی چیزیں جب دل پر کھٹکیں تو ان کو ذکر اور تذکر کہا جاتا ہے یعنی وہ انسان کے لئے نصیحت کا سبب ہے۔

” وان کان موجودا فی الحال بسمی ذوقا ووجدا وانما سمی وجدا

لانہا حالة تجدھا “

اور اگر وہ حال میں موجود ہوں تو ان کو ذوق اور وجد کہا جاتا ہے وجد کہنے کی وجہ یہ ہے کہ انسان اس حالت کو پارہا ہے۔

” وان کان قد خطر ببالک وجود شئی فی الاستقبال وغلب ذلک

علی قلبک سمی انتظارا وتوقعا “

اگر تمہارے دل پر مستقبل میں کسی چیز کے واقع ہونے کا کھٹکا ہو اور وہ تمہارے دل پر غالب طور پر واقع ہو تو اسے انتظار اور توقع کہا جاتا ہے۔

”فان كان المنتظر مكروها حصل منه الم في القلب يسمى خوفا و اشفاقا“
اگر کسی ناپسندیدہ، پریشان کن چیز کے واقع ہونے کا خطرہ ہو جس سے دل میں درد ہو تو اسے خوف اور اشفاق کہا جاتا ہے۔

”وان كان محبوبا سمي ذلك ارتياحا والارتياح رجاء“ اور اگر مستقبل میں کسی محبوب چیز کے واقع ہونے کی انتظار ہو تو اسے ارتياح کہا جاتا ہے اور ارتياح (راحت حاصل کرنا) کو رجاء (امید کرنا) بھی کہا جاتا ہے۔

حاصل کلام یہ ہوا کہ جب دل کو درد اور تکلیف ہو کسی پریشان کن چیز کے واقع ہونے کے خطرہ سے تو اسے خوف کہا جائے گا۔ اور اگر دل میں خوشی ہو کہ مستقبل میں فلاں محبوب چیز حاصل ہونے والی ہے تو اس خوشی اور سرور کو ارتياح اور رجاء کہا جاتا ہے۔

شدید خوف مسلمانوں کو نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں دین کے معاملہ میں کفار سے مختلف مواقع پر حاصل ہوتا رہا لیکن سب سے زیادہ خوف اس وقت لاحق ہوا جب تمام اقوام عرب یہود و نصاریٰ اور مشرکین جمع ہو کر اپنے ناپاک ارادے لے کر مدینہ طیبہ کو معاذ اللہ تباہ کرنے کی غرض سے آگئے ان کا دفاع خندق کھود کر کیا گیا رب تعالیٰ نے ان کو ذلیل کیا اسی کو غزوہ احزاب اور غزوہ خندق سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

تاہم مسلمانوں کو بہت شدید خوف سے آزمایا گیا اس آزمائش کو رب تعالیٰ نے ان الفاظ مبارکہ سے بیان فرمایا ﴿هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُونَ وَزُلْزِلُوا زِلْزَالًا شَدِيدًا﴾ وہ جگہ تھی کہ مسلمانوں کی جانچ ہوئی اور خوب سختی سے جھنجھوڑے گئے۔
(ماخوذ از کبیر)

خوف سے اور آزمائش: ”وعن الشافعي رضي الله عنه الخوف خوف الله“

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں خوف سے مراد اللہ تعالیٰ کا خوف ہے۔ (بیضاوی)

یعنی اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو اپنے اوامر و نواہی سے آزما رہا ہے کہ یہ اپنے دلوں میں میرا خوف رکھتے ہوئے ان پر کتنا عمل کرتے ہیں یقیناً جس کے دل میں خوف الہی ہوگا وہی اس آزمائش میں کامیاب ہوگا۔

وَالْجُوع : اور بھوک سے، یعنی رب تعالیٰ کی طرف سے انسانوں کو بھوک سے آزمایا جائے گا بھوک سے آزمانے کا کیا مطلب؟ اس کا ایک مطلب تو یہ ہے جو امام شافعی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا ”والجوع صوم رمضان“ بھوک سے مراد رمضان کے روزے ہیں یعنی اللہ تعالیٰ نے رمضان کے روزوں کی فرضیت سے پہلے ہی خبر دے دی کہ ہم تمہیں ضرور بر ضرور آزمائیں گے بھوکا رہنے کا حکم دے کر کہ اس میں کون کامیاب ہوتا ہے۔

بھوک سے آزمائش کا اور مطلب:

”والمراد من الجوع القحط اقامة للمسبب مقام السبب“

بھوک سے آزمانے کا مطلب یہ ہے کہ قحط سالی سے رب تعالیٰ بندوں کو آزما رہا ہے۔ اس مقام پر ذکر بھوک کا لیکن مراد اس کا سبب ہے یعنی قحط سالی مسبب کو سبب کی جگہ رکھانے مجاز مرسل کہا جاتا ہے۔ (روح المعانی)

تنبیہ : قحط سالی سے آزمائش بعض قوموں کی ہوتی ہے اور بعض علاقوں میں قحط سالی سے تو رب تعالیٰ اپنے بندوں کو آزما رہا ہے لیکن ایسا نہیں کہ تمام مسلمان قحط سالی سے تباہ و برباد ہو جائیں کیونکہ نبی کریم ﷺ رحمۃ اللعالمین علیہ کی دعا پر عام قحط سے رب تعالیٰ نے محفوظ رکھنے کا وعدہ فرما دیا۔

☆ ”عن ثوبان قال قال رسول الله ﷺ ان الله زوى لى الارض فرايت مشارقها ومغاربها وان امتى سيلغ ملكها ما زوى لى منها واعطيت الكنزىن الاحمر والابيض وانى سالت ربى لامتى ان لا يهلكها بسنة عامة وان لا يسلط عليهم عدوا من سوى انفسهم ليستبيح بيضتهم وان ربى قال يا محمد انى اذا قضيت قضاء فانه لا يرد وانى اعطيتك لامتك انا لا اهلكهم بسنة عامة ولا اسلط عليهم عدوا من سوى انفسهم يستبيح بيضتهم ولو اجتمع عليهم من باقطارها حتى يكون بعضهم يهلك بعضها ويسبى بعضهم بعضا“

(مسلم ج ۲ ص ۳۹۸ کتاب الفتن)

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ نے میرے لئے زمین کو سمیٹ دیا میں نے اس کے مشارق و مغارب کو دیکھ لیا بیشک میری امت کی بادشاہت وہاں تک پہنچ جائے گی جہاں تک میرے لئے زمین کو سمیٹا گیا۔ اور دو خزانے دے دیئے گئے سرخ اور سفید۔ اور بیشک میں نے اپنے رب سے اپنی امت کے لئے سوال کیا کہ اسے عام قحط سالی سے ہلاک نہ کرنا۔ اور ان پر ان کے اپنے ہی نفسوں کے سوا ان کے دشمن کو مسلط نہ کرنا جو ان کی بادشاہی کو برباد کر دے اور بیشک میرے رب نے کہا اے محمد بیشک جب میں کوئی فیصلہ کر لیتا ہوں تو بیشک میں اسے رد نہیں کرتا۔ اور تحقیق میں نے آپ کی امت کو عطا کر دیا ہے کہ ان کو عام قحط سالی سے ہلاک نہیں کروں گا اور ان کے اپنے نفسوں کے سوا ان پر کسی دشمن کو مسلط نہیں کروں گا جو ان کی بادشاہی کو برباد کر دے اگرچہ وہ زمین کی ہر طرف سے کیوں نہ جمع ہو جائیں یہاں تک کہ بعض لوگ بعض کو ہلاک کریں گے اور بعض لوگ بعض کو قید کریں گے۔ وضاحت حدیث: ”ان اللہ زوی لی الارض“ زویت الشیء کا معنی ہے ”میں نے جمع کیا اور قبض کیا“ اس سے مراد کسی چیز کو دور سے قریب کر دینا تا کہ اسے دیکھ لے اور مطلع ہو جائے حاصل کلام یہ ہے ”طوی لاجلی الارض“ کہ میرے لئے رب تعالیٰ نے زمین کو سمیٹ دیا دور کو قریب کر دیا۔ ”وجعلها مجموعة کھینٹہ کف فی مرآة نظره“ اور اس زمین کے مجموعہ کو اس طرح نبی کریم ﷺ کے قریب کر دیا جیسے کسی کی ہتھیلی اس کی نظر کے آئینہ کے سامنے ہو۔

”ولذا قال فرأیت مشارقها ومغاربها“ اور اسی وجہ سے کہا میں نے اس کے مشارق و مغارب کو دیکھ لیا ”ای جمیعہا“ یعنی زمین کے تمام حصہ کو دیکھ لیا۔

سبحان اللہ رب تعالیٰ نے اپنے حبیب پاک ﷺ کو کتنا عظیم علم دیا۔ پتہ نہیں لوگ آپ کے علم کو پیمانہ سے کیوں ناپتے ہیں کم علم لوگو وہ تمہارے پیائش میں آنے والے علوم نہیں ”وان امتی سیلغ ملکھا ما زوی لی منها“ بیشک میری امت کی بادشاہی وہاں تک پہنچ جائے گی جہاں تک میرے لئے زمین کو سمیٹ دیا گیا۔

علامہ خطابی کہتے بعض لوگوں نے گمان کیا کہ ”منھا“ میں ”من“ تبعیضہ ہے جس کا مطلب ہے کہ زمین کے بعض حصوں پر مسلمانوں کی حکومت قائم ہوگی۔

”ولیس ذلک كما توهمه بل هی للتفصیل للجملة المتقدمة“ یہ کہنا صحیح نہیں کہ ”من“ تبعیضیہ ہے بلکہ ”من“ بیانیہ ہے پہلے جملہ کی تفصیل ہے مطلب اس کا یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ پر تو زمین ایک مرتبہ ہی لپیٹ دی گئی۔ لیکن آپ کی امت پر آہستہ آہستہ زمین فتح ہوگی اور ان کی حکومت قائم ہوگی۔ علامہ علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں شاید ”من“ تبعیضیہ کہنے والوں کی وجہ یہ ہو ”فالمراد بالارض ارض الاسلام“ کہ زمین سے مراد اسلام کی زمین ہو یعنی اسلام تو ہر جگہ پر پہنچ جائے گا البتہ مسلمانوں کی بادشاہت بعض علاقوں میں قائم ہوگی۔

راقم کے نزدیک محاکمہ یہی ہے کہ یوں بیان کیا جائے کہ جہاں تک زمین کو میرے لئے سمیٹ دیا گیا وہاں تک اسلام کی حکومت قائم ہوگی یعنی اسلام پہنچ جائے گا اس سے مراد ظاہری حکومت نہیں۔
واعطیت الكنزین الاخمر والابيض، یہ ماقبل سے بدل ہے یعنی میری امت کو دو خزانے سرخ اور سفید عطا کر دیئے گئے۔

سرخ اور سفید خزانوں سے مراد سونا اور چاندی بھی ہو سکتا ہے جس سے واضح ہوا کہ نبی کریم ﷺ نے جو خبر دی وہی ہوا کہ آپ کی امت آج کل سونے اور چاندی کی مالک ہے۔ اور سرخ و سفید سے مراد کسری اور قیصر کی بادشاہی بھی ہو سکتی ہے کہ میری امت کو فارس اور روم کی بادشاہی حاصل ہو جائے گی آپ کی یہ خبر بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں واقع ہو چکی ہے۔

”وانی سألت ربی لامتی ان لا یهلكها بسنة عامة“ النہ، سے مراد قحط اور خشک سالی ہے مطلب یہ ہے کہ میں نے اپنے رب سے اپنی امت کے لئے سوال کیا کہ ان کے تمام شہروں میں قحط نہ پڑے۔ ”ای لا اهلكم بقحط یعمهم بل ان وقع قحط فیکون فی ناحية یسيرة“ یعنی میں نے اپنے رب تعالیٰ سے سوال کیا کہ میری امت کو عام قحط سے ہلاک نہ کرنا کہیں کہیں مختلف علاقوں میں قحط سے آزاں لیا جائے۔

وان لا یسلط علیهم عدوا من سوی انفسهم فیستبیح بیضتہم، ”عدوا“ سے مراد کفار ہیں جو مسلمانوں کے دشمن ہیں۔ ”من سوی انفسهم“ یعنی اے اللہ تعالیٰ میری امت پر

کفار دشمنوں کو مسلط نہ کرنا سوائے ان کے اپنے نفسوں کے جو ان کو تباہ و برباد کر دیں۔

سوائے ان کے اپنے نفسوں کے آپ نے کیوں فرمایا۔ اس لئے کہ نبی کریم ﷺ اس سے پہلے یہ دعا کر چکے تھے۔

”عن سعد ان رسول الله ﷺ مر بمسجد بنی معاویة دخل فرکع فیہ رکعتین وصلینا معہ ودعا ربہ طویلاً ثم انصرف فقال سألت ربی ثلاثاً فاعطانی ثنتين ومنعی واحدة سألت ربی ان لا یهلك امتی بالسنة فاعطانیها وسألت ان لا یهلك امتی بالفرق فاعطانیها وسألت ان لا یجعل بأسهم بینهم فمنعنیها“ (رواه مسلم)

حضرت سعد رضی اللہ عنہ سے مروی ہے بیشک رسول اللہ ﷺ بنی معاویہ کی مسجد سے گزرے اس میں داخل ہوئے دو رکعت ادا فرمائیں ہم نے بھی آپ کے ساتھ نماز ادا کی آپ نے اپنے رب تعالیٰ سے لمبی دعاء کی پھر آپ وہاں سے پھرے تو آپ نے فرمایا میں نے اپنے رب سے تین چیزوں کا سوال کیا تو دو چیزیں رب تعالیٰ نے مجھے عطاء کیں اور ایک سے مجھے منع فرما دیا گیا۔ میں نے اپنے رب سے سوال کیا میری امت کو عام قحط سے ہلاک نہ کرنا تو رب تعالیٰ نے مجھے یہ عطاء کر دیا (یعنی اس دعاء کو قبول کر لیا) اور میں نے سوال کیا ”میری تمام امت کو غرق کر کے ہلاک نہ کرنا“ تو رب تعالیٰ مجھے یہ بھی عطاء کر دیا اور میں نے اپنے رب سے یہ سوال کیا کہ میری امت کو آپس میں ایک دوسرے سے لڑنے والا نہ بنانا تو رب تعالیٰ نے مجھے اس سے منع فرما دیا کہ یہ دعا نہ کرنا۔ اس لئے دوبارہ جب آپ نے دعاء فرمائی تو ”من سوی انفسهم“ کہہ کر خود ہی اس کو مستثنیٰ کر دیا۔

فیستبیح بیضتهم، بیضہ، انڈے کو کہا جاتا ہے انڈے سے تشبیہ دی اس لئے کہ انڈا ٹوٹ جائے تو مکمل تباہ ہو جاتا ہے بظاہر معنی تو یہ ہے کہ کفار ان کے انڈے کو مباح نہ سمجھیں لیکن اس سے مراد یہ ہے ”یستأصلهم ویهلكهم جمیعاً“ کہ دشمن میری امت کو مکمل طور پر تباہ و برباد نہ کر دیں ان کو جڑوں سے اکھاڑ نہ پھینکیں ”فیفهم انه قد یسلط علیهم عدو“ اسی سے یہ سمجھ آ گیا کہ مسلمانوں پر کبھی دشمن مسلط تو ہو جائیں گے لیکن مسلمانوں کو مکمل طور پر تباہ و برباد نہیں کر سکیں گے۔

وجہ واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کی دعاء کو قبول فرمایا اور ساتھ ہی وعدہ فرمایا کہ یہ ایسا فیصلہ ہے جو مہرم ہے معلق نہیں یعنی اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہونی۔ اور مسئلہ یہ واضح ہوا کہ مسلمان آپس میں لڑ کر اپنی طاقت کو کمزور کر کے یا غدار مسلمان کافروں کے ساتھ مل کر مسلمانوں کو جو نقصان پہنچا سکتا ہے وہ کفار نہیں پہنچا سکتے۔ (ماخوذ از نوری، مرقاة شرح مشکوٰۃ ج ۱۱ ص ۵۱ باب فضائل سید المرسلین ﷺ)

بھوک سے آزمانے کی ایک اور وجہ: کچھ لوگ اپنے آپ کو دین کے لئے وقف کر دیں ذریعہ معاش نہ ہو تو وہ بعض اوقات رب تعالیٰ کی طرف سے اس آزمائش میں مبتلاء ہوتے ہیں کہ بھوک ان پر مسلط ہوتی ہے لیکن اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو سخت آزمائش میں پورا اترنے کی توفیق بھی عطا فرماتا ہے۔

☆ "عن ابی ہریرۃ قال خرج رسول اللہ ﷺ ذات یوم او لیلة فاذا هو بابی بکر وعمر فقال ما اخرجکما من بیوتکما هذه الساعة قالوا الجوع یا رسول اللہ قال انا والذی نفسی بیدہ لا اخرجنی الذی اخرجکما قوموا فقاموا معہ فاتی رجلا من الانصار فاذا هو لیس فی بیتہ فلما رآہ المرأة قالت مرحبا واهلا فقال لہا رسول اللہ ﷺ این فلان قالت ذهب يستعذب لنا من الماء اذ جاء الانصاری فنظر الی رسول اللہ ﷺ وصاحبیہ ثم قال الحمد لله ما احد الیوم اکرم اضیافا منی قال فانطلق فجاء ہم بعدق فیہ بسر وتمر ورطب فقال کلوا من هذه واخذ المدیة فقال لہ رسول اللہ ﷺ ایاک والحلوب فذبح لہم فاکلوا من الشاة ومن ذلک العذق وشربوا فلما ان شعبوا ورووا قال رسول اللہ ﷺ لابی بکر وعمر والذی نفسی بیدہ لتسئلن عن هذا النعیم یوم القیامة اخرجکم من بیوتکم الجوع ثم لم ترجعوا حتی اصابکم هذا النعیم" (مسلم ج ۲ ص ۱۸۵ باب جواز اشباعہ غیرہ الخ)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ (گھر سے باہر) نکلے تو آپ کی ملاقات ابو بکر اور عمر رضی اللہ عنہما سے ہو گئی تو آپ نے فرمایا تمہیں تمہارے گھروں سے اس گھڑی کس چیز نے نکالا ہے؟ انہوں نے عرض کیا بھوک نے یا رسول اللہ، حضور ﷺ نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے اسی چیز نے مجھے بھی نکالا جس نے تمہیں نکالا۔ اٹھو (چلو) وہ آپ کے ساتھ چلے۔ ایک انصاری صحابی کے گھر تشریف لائے وہ اس وقت گھر میں نہیں تھے جب ان کی زوجہ نے حضور کو دیکھا تو خوش آمدید کہا تو حضور ﷺ نے اس عورت سے پوچھا فلاں

شخص (تمہارے خاوند) کہاں گئے ہیں؟ اسنے کہا وہ ہمارے پینے کے لئے پانی لینے گئے ہیں اسی بات کے دوران انصاری صحابی بھی پہنچ گئے تو انہوں نے نبی کریم ﷺ اور آپ کے دونوں ساتھیوں کو دیکھا پھر کہا الحمد للہ آج کے دن کے مہمانوں سے بڑھ کر میرے نزدیک کوئی اور مکرم نہیں پھر وہ گئے اور کھجوروں کا خوشہ لے کر آئے جس میں خشک اور پکی اور کچھ کچی کھجوریں تھیں آپ کی خدمت میں پیش کیں اور عرض کیا آپ تناول فرمائیں پھر انہوں نے (بکری ذبح کرنے کے لئے) چھری لی۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا دودھ والی سے اپنے آپ کو دور رکھنا۔ انہوں نے بکری ذبح کی حضور ﷺ اور آپ کے ساتھیوں نے گوشت اور کھجوریں کھائیں اور پانی پیا جب آپ نے سیر ہو کر کھانا کھالیا اور پانی پی لیا تو نبی کریم ﷺ نے حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کو فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے قیامت کے دن ضرور بر ضرورت تم سے ان نعمتوں کے بارے میں سوال کیا جائے گا کہ تمہیں گھروں سے بھوک نے نکالا پھر تم گھروں میں لوٹ کر نہیں گئے کہ تمہیں یہ نعمتیں عطا فرمادیں۔

وضاحت حدیث: اس حدیث پاک سے واضح ہوا کہ نبی کریم ﷺ اور آپ کے بڑے بڑے صحابہ کرام کے پاس دنیا کا مال تھوڑا رہا اور بھوک سے رب تعالیٰ نے ان کو آزمایا۔ ہاں یہ خیال رہے کہ نبی کریم ﷺ کے پاس کبھی مال آ جاتا اور آپ کو آسانی حاصل ہو جاتی اور کبھی مال ختم ہو جاتا اور مشکل پیدا ہو جاتی اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ آپ کو مال سے محبت نہیں تھی بلکہ جلدی ہی آپ مال خرچ کر دیتے تھے:

”فكان النبي ﷺ في وقت يوسر ثم بعد قليل ينفد ما عنده لا خراج

في طاعة الله من وجوه البر وإيثار المحتاجين وضيافة الطارقين

وتجهيز السرايا وغير ذلك“

نبی کریم ﷺ کو کبھی مال حاصل ہوتا اور آسانی حاصل ہوتی تو آپ جلدی ہی وہ مال ختم کر دیتے تھے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی طاعت میں نیکی کے مختلف کاموں میں وہ مال خرچ کر دیتے کبھی محتاج لوگوں کو مال عطاء فرماتے اور باہر سے آنے والے مہمانوں خصوصاً راستہ کو پہنچنے والوں کی مہمان نوازی اور دشمن کے مقابل لشکر کی تیاری میں اور اس قسم کے نیکی کے کاموں میں آپ مال خرچ کر دیا کرتے تھے خود پھر

حالت فقر میں آجاتے ”وہکذا کان خلق صاحبہ بل اکثر اصحابہ“ اسی طرح آپ کے یار حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کا طریقہ بھی تھا بلکہ آپ کے اکثر صحابہ کرام اسی طریقہ پر عمل کرتے تھے:

”کما ثبت فی الصحیح عن ابی ہریرۃ خرج رسول اللہ ﷺ من الدنیا ولم یشبع من خبز الشعیر“

جس طرح صحیح بخاری شریف میں ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ دنیا سے تشریف لے گئے لیکن آپ نے سیر ہو کر جو کی روٹی بھی نہیں کھائی۔

”وعن عائشۃ ما شبع آل محمد ﷺ مذ قدم المدینۃ من طعام ثلاث لیل تباعا حتی قبض وتوفی ﷺ ودرعہ مرہونۃ علی شعیر استدانۃ لاہلہ“

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں نبی کریم ﷺ جب سے مدینہ طیبہ میں تشریف لائے آپ نے اور آپ کے اہل و عیال نے تین دن مسلسل سیر ہو کر کھانا نہیں کھایا یہاں تک کہ اسی حال میں آپ دنیا سے تشریف لے گئے۔ بلکہ جب آپ کا وصال ہوا تو آپ کی زرہ رہن رکھی ہوئی تھی کیونکہ آپ نے اس رہن کی ضمانت پر اپنے اہل و عیال وغیرہ کے لئے جو قرض کے طور پر لئے ہوئے تھے۔

فوائد: حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما رب تعالیٰ کی طاعت میں رہتے اور عبادات میں مشغولیت کی وجہ سے اور مال کو اللہ کی راہ میں خرچ کر دینے کی وجہ سے خود بھوک میں مبتلا ہو گئے۔

ان دونوں حضرات کا گھر سے نکلنا بے صبری کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ عبادت میں ضعف کی وجہ سے کمی آرہی تھی صرف اس خیال سے نکلے تھے کہ کوئی دوست کھانا کھلا دے تاکہ عبادت دل جمعی سے ادا کی جائے۔

مسئلہ یہی ہے کہ اگر پیشاب، پاخانہ کی شدید حاجت ہو تو فارغ ہو کر نماز ادا کرے تاکہ نماز میں اضطراب نہ ہو اسی طرح اگر بھوک غالب ہو جو نماز میں خلل انداز ہو تو کھانا پہلے کھائے اور نماز بعد میں ادا کرے۔

نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد کہ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے مجھے بھی اسی چیز نے گھر سے نکالا ہے جس نے تمہیں نکالا ہے۔ اسی سے یہ واضح ہو گیا۔

” فیہ جواز ذکر الانسان ما یناله من الم ونحوہ لا علی سبیل التشکی
وعدم الرضا بل للتسلية والتصیر کفعلہ ﷺ هنا “

کہ انسان کے لئے یہ جائز ہے کہ وہ اپنے درد، تکلیف کو ذکر کرے، اس ذکر کرنے میں بے
صبری اور ناراضگی نہ پائی جائے بلکہ دل کو تسلی دینا اور صبر کرنا مقصود ہو جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے اس مقام
میں ذکر فرمایا۔

انصاری کی زوجہ نے نبی کریم ﷺ اور آپ کے ساتھیوں کو ”مرحبا واهلا“ کہا اسی سے
واضح ہو گیا کہ مہمانوں کے آنے پر ان کا خوشدلی سے استقبال کرنا اور ان کو خوش آمدید کہنا مستحب ہے۔
نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے ”من کان یؤمن بالله والیوم الآخر فلیکرم ضیفہ“ جو شخص اللہ تعالیٰ
اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو اسے چاہئے کہ وہ مہمان کی عزت کرے۔

انصاری صحابی نے نبی کریم ﷺ اور آپ کے ساتھیوں کو دیکھ کر خوشی سے ”الحمد لله“ کہا اس
سے واضح ہوا ”استحباب اظهار البشر والفرح بالضيف فی وجهه وحمد الله تعالى وهو یسمع“
مہمان کی آمد پر اس کے سامنے خوشی کا اظہار کرنا مستحب ہے اور ”الحمد لله“ کہنا مستحب ہے جب
کہ وہ مہمان سن بھی رہا ہو۔ اصل وجہ یہی ہے کہ مہمان کی عزت کرنے کا حکم خود نبی کریم ﷺ نے دیا۔
صحابی نے پہلے کھجوریں پیش کیں ”وفیہ دلیل علی استحباب تقدیم اکل الفاکهة علی
الخبز واللحم وغیرہما“ اور اس میں یہ دلیل پائی گئی ہے کہ مستحب ہے کہ پھل، روٹی اور گوشت
وغیرہ سے پہلے پیش کرنا مستحب ہے۔

اسی طرح مستحب یہ ہے کہ جب معلوم ہو کہ مہمان کو ضرورت درپیش ہے کہ اسے کھانے اور پینے
کی کوئی چیز جلدی دی جائے تو جو چیز بھی میسر ہو وہی پیش کر دی جائے۔

اور حدیث پاک سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ دودھ والے جانور کو بلا ضرورت اور بغیر کسی عذر کے
ذبح نہ کیا جائے تاکہ اس سے جو دودھ حاصل ہو رہا ہے اس سے محروم نہ ہو جائے۔

نبی کریم ﷺ اور آپ کے ساتھیوں نے کھانا سیر ہو کر کھایا:

”فیہ دلیل علی جواز الشبع وما جاء فی کراهة الشبع فمحمول علی

المدامۃ علیہ لانہ یفسی القلب وینسی امر المحتاجین

اس میں یہ دلیل پائی گئی ہے کہ سیر ہو کر کھانا جائز ہے ہاں البتہ ہمیشہ ہی سیر ہو کر کھانے کی عادت بنانا مکروہ ہے کیونکہ اس سے دل میں قساوت (ختی) پیدا ہوتی ہے اور محتاج لوگوں کا خیال دل میں نہیں آتا۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ تم سے ان نعمتوں کا سوال کیا جائے گا اس کا مطلب یہ ہے ”المراد السؤال عن القيام بحق شکرہ“ کہ یہ سوال کیا جائے گا کہ کیا تم نے میری نعمتوں کا شکریہ ادا کیا ہے۔

لیکن یہ خیال رہے کہ یہ ارشاد گرامی امت کی تعلیم کیلئے تھا ورنہ یہ ممکن ہی نہیں کہ ایسے جلیل القدر حضرات رب تعالیٰ کی نعمتوں کا شکریہ ادا نہ کریں اسی وجہ سے قاضی عیاض رحمہ اللہ نے بیان فرمایا:

”والذی نعتقده ان السؤال هنا سوال تعداد النعم و اعلام بالامتنان بها

واظهار الکرامة باسباغها لا سوال تو بیخ و تقریح و محاسبہ واللہ اعلم“

اس میں ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ سوال ان دونوں صاحبوں سے اپنی متعدد نعمتوں اور کامل احسان کرنے کے متعلق علم عطا کرنے اور کامل کرامت کو ظاہر کرنے کے لئے ہوگا اس میں ان کو توبیخ (ڈانٹ وغیرہ) اور کسی قسم کا محاسبہ کرنا مقصود نہیں ہوگا۔

☆ ”عن ابن عمر ان رسول اللہ ﷺ سمع رجلا یتجشا فقال اقصر من جشاءک فان اطول الناس جوعا یوم القيامة اطولهم شبعاً فی الدنیا“

(رواہ فی شرح السنة وروی الترمذی نحوه ، مشکوٰۃ کتاب الرفاق)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو ڈکار مارتے ہوئے سنا تو آپ نے فرمایا تھوڑے ڈکار مارو جو شخص دنیا میں زیادہ بھوکا رہے گا قیامت کے دن وہ دنیا میں سیر ہو کر کھانے والوں میں سے زیادہ شان والا ہوگا۔

اس حدیث پاک سے واضح ہوا کہ سیر ہو کر کھانا تو جائز ہے لیکن ہمیشہ سیر ہو کر کھانے کی عادت نہ بنائے اور حد سے زیادہ نہ کھائے جس سے ڈکار آتے رہیں۔

☆ ”عن ابی طلحۃ قال شکونا الی رسول اللہ ﷺ الجوع فرفعنا عن بطوننا عن

حجر حجر فرفع رسول اللہ ﷺ عن بطنہ عن حجرین ، رواہ الترمذی وقال هذا حدیث

(مشکوٰۃ باب فضل الفقر)

غریب“

حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ہم نے رسول اللہ ﷺ سے بھوک کی شکایت کی اور اپنے پیٹوں پر ایک ایک پتھر بندھا ہوا دکھایا تو رسول اللہ ﷺ نے ہمیں اپنے پیٹ پر دو پتھر بندھے ہوئے دکھائے۔

کتنا شدید امتحان تھا نبی کریم ﷺ کا اور آپ کے صحابہ کرام کا سبحان اللہ اتنے بڑے امتحان میں کامیاب ہونا بھی ان عظیم ہستیوں کا کام ہی تھا۔

پتھر باندھنے کی ایک حکمت تو راقم کو یہ سمجھ آتی ہے کہ جب پیٹ خالی ہو تو ہوا کی گردش سے اضطرابی کیفیت زیادہ ہوتی ہے اور جب اوپر سے پتھر وغیرہ رکھ کر دبا دیا جائے تو سکون ملتا ہے۔ اور وجہ علامہ علی قاری رحمہ اللہ نے اسی حدیث کے تحت مرقاۃ میں بیان فرمائی۔

”من اشتد جوعه وخمص بطنه ان يشتد علی بطنه حجرا لیتقوم به صلیہ“

صحابہ کرام کی عادت یہ تھی کہ جس شخص کو بہت شدید بھوک میں مبتلا ہونا پڑتا اور خالی پیٹ ہوتا وہ پیٹ پر پتھر باندھ لیتا تاکہ اس کی پیٹھ سیدھی رہے۔

وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ :

”اور کمی کر کے مالوں اور جانوں اور پھلوں میں“۔

مالوں میں کمی سے آزمانے سے مراد ”ہلاک الموائش“ موشیوں کو ہلاک کر کے مومنوں کو آزمایا جائے کہ وہ اس آزمائش میں پورے اترتے ہیں یا نہیں۔

”﴿وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ﴾ بسبب الاشتغال بقتال الکفار وقيل الجوائح المتلفة“ (قرطبی)

مالوں میں کمی کر کے آزمانے کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ کفار سے جہاد میں مشغول ہونے کی وجہ سے ان کے مالوں میں کمی واقع ہوگی۔ اسی طرح آفات و بلیات کی وجہ سے مالوں میں کمی آجائے۔

اس صورت میں مال سے مراد عام ہے خواہ مویشی ہوں یا سونا، چاندی، روپے وغیرہ میں کمی کر کے آزمایا جائے۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے فرمایا ”والنقص من الاموال الزکوات والصدقات“ کہ مال کی کمی سے مراد زکوٰۃ اور صدقات سے آزمانا یعنی اگرچہ زکوٰۃ و صدقات مال میں خیر و برکت کا ذریعہ ہیں لیکن انسان کو بظاہر مال میں کمی نظر آتی ہے اس لئے رب تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم تمہیں زکوٰۃ

فرض کر کے اور صدقات واجبہ سے آزمائیں گے کیا تم اس میں کامیابی حاصل کرتے ہو اور صبر و استقلال سے اس پر عمل کرتے ہو یا نہیں۔
(از روح المعانی)

جانوں میں کمی: ”وقد یكون النقص فی النفس بموت بعض الاخوان والاقارب“
یعنی تمہارے بعض بھائیوں اور رشتہ داروں کو فوت کر کے تمہیں آزمائیں گے کہ تم صبر کرتے ہو یا نہیں۔
یہاں ”ونقص من (الانفس)“ کا استعمال ایسے ہی ہے جیسا کہ ﴿وَلَا تَقْتُلُوا أَنْفُسَكُمْ﴾ کا ہے جس کا ظاہری معنی ہے تم اپنے آپ کو قتل نہ کرو لیکن مراد یہ ہے کہ تم اپنے بھائیوں کو قتل نہ کرو اسی طرح یہاں بھی مراد ہے کہ تمہارے بھائیوں اور رشتہ داروں کی جانوں میں کمی کر کے تمہیں آزمائیں گے۔

وَالْأَنْفُسِ: ”قال ابن عباس بالقتل والموت فی الجهاد“ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا جانوں سے آزمانے کا مطلب یہ ہے کہ جہاد میں تمہیں موت (طبعی طور پر آنے والی) یا شہید کر کے آزمایا جائے گا کہ تم اپنی موت کے آثار دیکھ کر یا آثار شہادت دیکھ کر کتنا صبر کرتے ہو؟
(از فرطی)

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ”ونقص من ﴿الْأَنْفُسِ﴾“ کا مطلب ہے ”ونقص من ﴿الْأَنْفُسِ﴾ بالامراض“ کہ ہم تمہیں بیمار کر کے جسمانی طور پر کمزور کر کے آزمائیں گے کہ تم اس میں کتنا صبر کرتے ہو۔
(روح المعانی ۴)

وَالشَّمَرَاتِ: ”اور پھلوں میں کمی سے“ اس سے مراد یہ ہے:

”واما نقص من الثمرات فقد يكون بالجدب وقد يكون بترك

عمارة الضیاع للاشتغال بجہاد الاعداء“

کبھی خشک سالی کی وجہ سے پھلوں میں کمی کر کے آزمایا جاتا ہے اور کبھی دشمنوں کے ساتھ جہاد کرنے کا حکم دے کر جہاد میں مشغول رکھ کر کھیتی باڑی اور باغات میں کام نہ کر سکنے کی وجہ سے پھلوں میں کمی کر کے آزمایا جاتا ہے کہ اس میں پورے اترتے ہیں یا نہیں۔
(کبیر)

”ومن نقص ﴿الشَّمَرَاتِ﴾ تلفها بالجوائح“ اور پھلوں میں کمی کرنے کا یہ مطلب بھی ہے کہ آفات و بلیات سے ان میں کمی کر دی جائے جیسا کہ کثیر بارشوں، آندھیوں، ژالہ باری، گرم لوکی

وجہ سے پھلوں میں نقصان پیدا کر دیا جائے اسی طرح کیڑے مکوڑے کپتے پھلوں کو کھا جائیں یہ سب آفات و بلیات ہیں۔
(از روح السعانی)

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ”ومن (الثمرات) موت الاولاد واطلاق الثمرة على الولد مجاز مشہور“ ثمرات میں کمی کر کے آزمانے کا یہ مطلب بھی ہے کہ تمہاری اولاد کو فوت کر کے تمہیں آزمایا جائے گا ثمرہ کا معنی ولد (بچہ رنجی) لینا بہت مشہور ہے یہ مجازی معنی ہے کیونکہ ثمرہ (پھل) سے فائدہ حاصل ہوتا ہے اولاد سے بھی فائدہ حاصل ہوتا ہے اس لئے ثمرات کا اطلاق اولاد پر ہے اسی معنی کی مناسبت سے کہا جاتا ہے ”ثمرة العلم العمل“ علم کا ثمرہ عمل ہے یعنی علم کے اوپر مرتب ہونے والا نفع عمل ہے۔ اس مجازی معنی پر ترمذی شریف کی حدیث شاہد ہے جو حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور حدیث حسن ہے نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

”اذا مات ولد العبد قال الله تعالى للملائكة“ اقبضتم ولد عبدی؟ فيقولون: نعم، فيقول: اقبضتم ثمرة قلبه؟ فيقولون: نعم، فيقول الله تعالى: ماذا قال عبدی؟ فيقولون: حمدك واسترجع، فيقول الله تعالى: ابنا العبدی بیتا فی الجنة وسموه بیت الحمد“

جب کسی بندے کا بچہ یا بچی فوت ہو جائے تو اللہ تعالیٰ فرشتوں کو کہتا ہے کیا تم نے میرے بندے کے ولد (بچہ رنجی) کی روح کو قبض کر لیا ہے؟ فرشتے کہتے ہیں ہاں (اے اللہ) رب تعالیٰ فرماتا ہے کیا تم نے اس کے دل کے ثمرہ کو قبض کر لیا ہے؟ وہ کہتے ہیں ہاں تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرے بندے نے کیا کہا؟ فرشتے کہتے ہیں اس نے ”اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ“ پڑھا اور ”اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاٰجِعُوْنَ“ پڑھا تو رب تعالیٰ فرماتا ہے میرے اس بندے کے لئے جنت میں گھر بنادو اور اس کا نام ”بیت الحمد“ رکھ دو۔

اس حدیث پاک سے واضح ہوا کہ ثمرہ کا اطلاق ولد پر مجازی طور پر عام اور مشہور ہے۔

اعتراض: اگرچہ یہ آیت کریمہ روزے اور زکوٰۃ کی فرضیت سے پہلے نازل ہوئی لیکن اللہ تعالیٰ کے خوف سے مومنوں کے دل پہلے ہی بھرے ہوئے تھے پھر آزمانے کا مفہوم سمجھ نہیں آتا۔ اسی طرح امراض اور اولاد کی موت تو پہلے سے واقع ہو رہی تھیں پھر آزمانے کا وعدہ کیسے صحیح ہو سکتا ہے؟ اسی طرح ”زکوٰۃ“ کا معنی ہی جب بڑھنا اور زیادتی ہے تو اس پر مال کی کمی سے آزمانے کا کیا مطلب؟

جواب : یہ بات قابل تسلیم ہے کہ مومنوں کے دل پہلے سے ہی اللہ تعالیٰ کے خوف سے بھر پور تھے لیکن ”لاینافی ابتلاء ہم فی الاستقبال بخوف آخر ، فان الخوف يتضاعف بنزول الآيات“ یہ مستقبل میں اور خوف لاحق کر کے آزمانے کے منافی نہیں کیونکہ مومنوں کا خوف آیات کے نازل ہونے سے بڑھتا ہی رہا۔

”و کذا الامراض وموت الأولاد امور متجددة یصح الابتلاء بها فی الآتی من الزمان“ اور اسی طرح امراض اور اولاد کی موت اگرچہ پہلے سے آرہی تھیں لیکن آنے والے زمانہ میں ان سے آزمائش کو جاری رکھنے کے ارشاد سے اور زیادہ خوف لاحق ہوتا ہے اس حال میں صبر کرنے سے کامیابی حاصل ہوتی ہے اور صبر نہ کرنے کی وجہ سے ناکامی حاصل ہوتی ہے۔

”والتعبیر عن الزکوة بالنقص لکونها نقصا صورة وان کانت زیادة معنی فعند الابتلاء سماها نقصا وعند الامر بالاداء سماها زکوة لیسهل اداؤها“

زکوٰۃ کو مال کی کمی سے تعبیر کرنے کا مقصد یہ ہے کہ انسان ظاہر طور پر یہ سمجھتا ہے کہ زکوٰۃ ادا کرنے سے میرا مال کم ہو جائے گا حالانکہ زکوٰۃ کا معنی بھی بڑھنا ہے اور برکت سے مال بھی بڑھتا ہے۔ اس لئے آزمائش کے وقت زکوٰۃ کو نقص مال سے تعبیر کر دیا گیا اور زکوٰۃ ادا کرنے کا جو حکم دیا گیا اس میں زکوٰۃ کا معنی بڑھنا ہی لیا جائے گا تا کہ زکوٰۃ ادا کرنا آسان ہو۔ (از روح المعانی)

سبحان اللہ قرآن پاک کی کیا ہی عظمت ہے کہ ایک ایک لفظ کتنے کتنے معانی پر مشتمل ہے۔ آزمائش کا مقصد: ”والابتلاء من الله لاظهار المطيع من المعاصي لا لیعلم شینا مما لم یکن عالما به“ (معالم التنزیل)

اللہ تعالیٰ کی طرف سے آزمائش کا مطلب یہ ہے کہ رب تعالیٰ کی اطاعت کرنے والا اور نافرمان ایک دوسرے سے ممتاز ہو جائیں نیک لوگ اور گھنہ کار لوگ ایک دوسرے سے علیحدہ علیحدہ ہو جائیں۔ دراصل لوگوں پر یہ فرق ظاہر کرنا مقصود ہے یہ مقصد نہیں کہ اللہ تعالیٰ کو پہلے علم حاصل نہیں ہوتا تو وہ آزمائش کر کے علم حاصل کرتا ہے۔

وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ : ”اور بشارت دو صبر کرنے والوں کو“ علی البلاء بالجنة“ یعنی اللہ تعالیٰ جب اپنے بندوں کو آزمائش میں مبتلا کرے تو وہ اس پر پورے اتریں تو ان کو جنت کی بشارت دے دو۔ (جلالین)

”بشر“ میں خطاب کس کے ہے؟ خطاب للنبی ﷺ اولکل من تتأی منه البشارة“ یہ خطاب نبی کریم ﷺ کو ہے کہ آپ صبر کرنے والوں کو بشارت دے دیں۔ یا ہر اس شخص کو ہے جس سے بھی بشارت دینے کی توقع ہو سکتی ہے۔

(روح المعانی)

راقم کے نزدیک پہلے خطاب تو نبی کریم ﷺ کو ہی ہے لیکن اس کے بعد ”العلماء ورثة الانبیاء“ علماء انبیاء کرام کے وارث ہیں۔ کے مطابق یہ خطاب علماء کرام کو ہے اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ علماء کرام جب انبیاء کرام کے بشیر ہونے کے وارث ہیں تو نذیر ہونے کے بھی وارث ہیں نیک لوگوں کو خوشخبری بھی دیں اور گنہگاروں کو ڈرامیں بھی صرف ایک رخ اختیار نہ کیا جائے۔

علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے فرمایا ﴿وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ﴾ ای بالثواب علی الصبر ”صبر کرنے والوں کو ثواب کی بشارت دے دو“ وثوابہ غیر مقدر ”ثواب کی کوئی حد ذکر نہیں فرمائی اس لئے کہ عطاء کرنے والا کریم ہے وہ اپنی شان کریمی کے مطابق بے حد و بے حساب ثواب عطاء فرماتا ہے۔

ہاں یہ بھی خیال رہے کہ صبر وہ ہے جو پہلے پہلے صدمہ پہنچے تو انسان صبر کرے پہلے تو جزع و فزع کرتا رہے پھر صبر کرنے کا کیا فائدہ کچھ دیر کے بعد تو بڑی سے بڑی مصیبتیں برداشت کر لی جاتی ہیں۔ اسی پر بخاری شریف کی حدیث جو حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے دلالت کر رہی ہے نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ”انما الصبر عند الصدمة الاولى“ بیشک صبر وہی معتبر ہے جو پہلے صدمہ کے وقت حاصل ہو۔ حدیث شریف کا مطلب یہ ہے ”انما الصبر الشاق علی النفس الذی یعظم الثواب علیہ انما هو عند هجوم المصیبة وحرارتها“ بیشک، صبر کرنا نفس کیلئے مشقت آمیز کام ہے اسی لئے اس پر عظیم ثواب حاصل ہوتا ہے لیکن یہ وہی صبر معتبر ہوگا جو مصیبت کے هجوم کے وقت کیا جائے جب وہ مصیبت بے قرار کر رہی ہو دل میں حرارت پائی جائے۔ کیونکہ اس وقت صبر کرنا انسان کی قوت قلب پر دلالت کرتا ہے اور صبر کرنے میں اسکی ثابت قدمی پر دلالت کرتا ہے ”واما اذا بردت حرارة المصیبة فکل احد یصیر اذا ذاک“ جب مصیبت کی حرارت ٹھنڈی پڑ جائے تو

(قرطبی)

برایک شخص اس وقت صبر کر لیتا ہے۔

غیر ممکن صبر کا حکم نہیں: فقال رحمہ اللہ نے بیان فرمایا:

”ليس الصبر ان لا يجد الانسان الم مكروه ولا ان لا يكره ذلك
لان ذلك غير ممكن“

صبر اس چیز کا نام نہیں کہ انسان کو کسی تکلیف اور مصیبت پر درد بھی لاحق نہ ہو یا انسان تکلیف کو
تکلیف ہی نہ سمجھے کیونکہ ایسا صبر انسان کے لئے ناممکن ہے۔

”انما الصبر هو حمل النفس علي ترك اظهار الجزع فاذا كظم
الحزن وكف النفس عن ابراز آثاره كان صاحبه صابرا وان ظهر دمع
عين او تغير لون“

صبر یہ ہے کہ انسان مصیبت کو برداشت کرے جزع و فزع نہ کرے، غم کو برداشت کر لے اور
اپنے نفس کو اس کے ظاہر کرنے سے روک کر رکھے جو شخص اس پر عمل کر لے گا وہ صابر کہلائے گا اگرچہ
اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوں یا اس کا رنگ زرد پڑ جائے۔ (کیر)

الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُمْ مُصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ :

”وہ لوگ جب پہنچے ان کو مصیبت تو کہیں بیشک ہم اللہ کے لئے ہیں اور بیشک ہم اسی کی طرف
لوٹنے والے ہیں۔

طلباء کرام کی توجہ کے لئے: جلالین میں ”الذین“ سے پہلے ”ہم“ نکالا گیا ہے یعنی خبر ہے
مبتداء محذوف کی اور اس میں ترکیب یہ ہے کہ یہ تمام جملہ مقام مدح میں منصوب ہو۔ ایک اور ترکیب یہ
ہے کہ ”اولئک“ اس کی خبر محذوف ہو جو مقدم ہو اور یہ جملہ مبتدا ہو۔

”وقيل ان الذين نعت للصابرين وهو احسنها“ اور یہ بیان کیا گیا ہے کہ ”الذین“ والا
جملہ صفت ہے ”صابرین“ کی یعنی مجرور محلا ہے یہی ترکیب سب سے بہتر ہے (از صاوی)

اعلیٰ حضرت کا ترجمہ اسی ترکیب کے مطابق ہے اور راقم نے اپنا ترجمہ گول مول کر دیا ہے تاکہ جس
ترکیب پر آپ محمول کرنا چاہیں کر سکیں۔

”مصیبة“ اصل میں ”مصبوبة“ ہے اس کی جمع ”مصائب“ ہے وہ بھی اصل میں ”مصابوب“ ہے ”المصیبة کل ما يؤذی المؤمن ویصیبه“ مصیبت ہر اس چیز کو کہا جاتا ہے جو مؤمن کو ایذا پہنچائے۔
(از قرطبی)

مصیبت عام ہے جس سے انسان کو تکلیف ہو خواہ اس تکلیف کا تعلق نفس سے ہو یا مال سے ہو، یا اہل سے ہو خواہ وہ تکلیف تھوڑی ہو یا زیادہ چھوٹی ہو یا بڑی۔
(از ابن کثیر)

اللہ تعالیٰ نے مصیبت کو اپنی طرف منسوب نہیں فرمایا کہ میری طرف سے جب ان کو مصیبت پہنچے بلکہ عام مصیبت کا ذکر کیا:

”فالظاهر انه یدخل تحتها کل مضرة ینالها من قبل الله تعالى وینالها من قبل العباد“

ظاہر بات یہ ہے کہ مصیبت سے مراد ہر وہ چیز ہے جو ضرر پہنچائے خواہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے پہنچے یا بندوں کی طرف سے پہنچے۔

دونوں صورتوں میں انسان کو تکلیف ہوتی ہے انسان کو جو تکلیف اللہ تعالیٰ کی طرف سے پہنچے ”یجب ان یعتقد فیہ انه حکمة و صواب وعدل وخیر و صلاح وان الواجب علیہ الرضا به وترک الجزع“ تو اس پر واجب ہو جاتا ہے کہ وہ اس میں عقیدہ یہ رکھے کہ بیشک اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکمت پائی گئی ہے اور رب تعالیٰ کا میرے حق میں یہ فیصلہ درست ہے اور انصاف پر مبنی ہے رب تعالیٰ کا ہر کام خیر اور صلاح پر مبنی ہے لہذا بندے کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس پر رضامندی کا اظہار کرے اور جزع و فزع نہ کرے۔ اس لئے کہ جب انسان ”اناللہ“ کہہ رہا ہے تو عبودیت کا اقرار کر رہا ہے تمام امور اللہ تعالیٰ کے سپرد کر رہا ہے تو اب اس پر ضروری ہو چکا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آزمائش کے فیصلہ میں رضامندی کا اظہار کرے اور اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے مطابق ﴿وَاللهُ يَقْضِي بِالْحَقِّ﴾ اور اللہ تعالیٰ حق فیصلہ فرماتا ہے ایمان رکھے کہ رب تعالیٰ کا کوئی فیصلہ ناحق نہیں ہوتا۔ اگر کوئی تکلیف اللہ تعالیٰ کے غیر یعنی بندوں کی طرف سے آئے تو اسے بھی رب تعالیٰ کی طرف سے ہی سمجھے غیظ و غضب کی صورت میں برداشت سے کام لے یہ بھی ”اناللہ“ میں

داخل ہے کیونکہ تمام امور درحقیقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی حاصل ہوتے ہیں۔ جس تکلیف کے حاصل ہونے میں کسی بندے کا دخل نہ ہو جیسے مریض ہونا اور کسی عزیز و قریبی رشتہ دار کا فوت ہو جانا وغیرہ اس کے متعلق انسان یہ کہے ”اِنَّا لِلّٰہِ یَدْبِرُ فِیْنَا کَیْفَ یَشَاءُ“ بیشک ہم اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں وہی ہم میں جیسے چاہے تدبیر فرماتا ہے۔ اور وہ تکلیف جو بظاہر بندوں کی طرف سے حاصل ہے اس کے متعلق یہ کہے ”اِنَّا لِلّٰہِ یَتَصَفَّ لَنَا کَیْفَ یَشَاءُ“ بیشک ہم اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں وہ جیسے چاہے ہم میں انصاف کرے۔

”اِنَّا لِلّٰہِ“ کہہ کر ہم یہ اقرار کرتے ہیں کہ بادشاہی صرف رب تعالیٰ کی ہے اور ”اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ“ کہہ کر ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ہم نے فوت ہونا ہے اور رب تعالیٰ کے حضور حاضر ہونا ہے۔ جب انسان کو یہ دونوں چیزوں کا علم ہو تو یقیناً وہ کامل طور پر صبر کر سکے گا اللہ تعالیٰ کے ہر فیصلہ پر صابر و شاکر رہے گا اور اسے ثواب اور عذاب حاصل ہونے کا بھی یقین ہو جائے گا۔ یعنی اسی سے قیامت پر یقین حاصل ہو جاتا ہے اور انسان کو جب اس چیز کا یقین ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ نے صبر کرنے والوں کو اچھی جزاء عطا کرنی ہے کیونکہ ”وَلَا یَضِیْعُ عِنْدَہٗ اَجْرُ الْمُحْسِنِ“ اس کے ہاں اچھا کام کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں ہوتا تو یقیناً انسان کامل طور پر صبر کرے گا۔ (ماخوذ از کبیر)

استرجاع پر احادیث مبارکہ: استرجاع کا مطلب ہے ”اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ“ پڑھنا چھوٹی مصیبت ہو یا بڑی یہ کلمات مبارکہ پڑھے خواہ کاٹنا چھو جائے، یا چھڑکاٹ جائے یا تسمہ ٹوٹ جائے یا چراغ بجھ جائے۔

☆ انقطع نعال النبی ﷺ فاسترجع فقالوا مصیبة یا رسول اللہ فقال رسول اللہ ﷺ (روح المعانی)

ما اصاب المؤمن مما یکرہ فہو مصیبة

(رواہ الطبرانی فی الکبیر من حدیث ابی امامۃ ولہ شواہد مرفوعة وموقوفة)

نبی کریم ﷺ نے نعلین کے ٹوٹنے پر ”اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ“ پڑھا۔ صحابہ کرام نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا یہ بھی مصیبت ہے؟ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مومن کو جو چیز بھی ناپسند پہنچے وہ اس کے لئے مصیبت ہی ہے۔

☆ "عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ ﷺ اذا انقطع شمع احدکم فليسترجع فانه المصاب"

(رواہ البیہقی فی شعب الایمان)

☆ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تم میں سے کسی ایک کے جوتے کا تسمہ ٹوٹ جائے تو وہ "اَنَا لِلّٰهِ وَاَنَا اِلَيْهِ رَاجِعُونَ" پڑھے کیونکہ یہ بھی مصیبت ہے

☆ "وفی الحدیث من استرجع عند المصیبة خیر اللہ مصیبتہ واحسن عقباہ وجعل له خلفا صالحا یرضاه"

☆ حدیث شریف میں ہے جس نے مصیبت کے وقت "اَنَا لِلّٰهِ وَاَنَا اِلَيْهِ رَاجِعُونَ" پڑھا اللہ تعالیٰ اس کی مصیبت کو خیر بنا دے گا اور اس کا انجام اچھا کر دے گا اور اس کے پیچھے اسے بہتری عطا کر دے گا جسے وہ پسند کرے گا۔

(از مظہری)

☆ "قال ابو سنانا دفنت ابی سنان و ابو طلحة الخولانی علی شفیہ القبر ، فلما اردت الخروج اخذ بیدی فانشطنی وقال الا ابشرک یا ابا سنان حدثنی الضحاک عن ابی موسی ان النبی ﷺ قال اذا مات ولد العبد قال اللہ لملائکته اقبضتم ولد عبدی فيقولون نعم فيقول اقبضتم ثمرة فوادہ فيقولون نعم فيقول فما ذا قال عبدی فيقولون حمدک واسترجع فيقول اللہ تعالیٰ ابنوا لعبدی بیتا فی الجنة وسموه بیت الحمد"

☆ حضرت ابو سنان رحمہ اللہ فرماتے ہیں میں نے اپنے بیٹے سنان کو جب دفن کیا (یعنی قبر کی لحد میں اتار کر پتھر رکھ لئے) تو مجھے ضحاک نے حدیث بیان فرمائی کہ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے فرمایا بیشک نبی کریم ﷺ نے فرمایا جب کسی بندے کی اولاد میں سے کوئی فوت ہو جائے تو اللہ تعالیٰ اپنے فرشتوں کو کہتا ہے کیا تم نے میرے بندے کے ولد (بچہ رنجی) کی روح کو قبض کر لیا ہے۔ وہ کہتے ہیں ہاں (اے اللہ) پھر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کیا تم نے اس کے دل کے ثمرہ کو قبض کر لیا؟ فرشتے کہتے ہیں ہاں (اے اللہ) تو رب تعالیٰ فرماتا ہے پھر میرے بندے نے کیا کہا؟ وہ کہتے ہیں اس نے "الْحَمْدُ لِلّٰهِ" پڑھا اور "اَنَا لِلّٰهِ وَاَنَا اِلَيْهِ رَاجِعُونَ" پڑھا۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرے اس بندے کے لئے جنت میں ایک مقام بنا دو اور اس کا نام بیت الحمد رکھ دو۔

(قرطبی)

☆ تنبیہ: یہی حدیث پہلے ایک اور مسئلہ بیان کرنے کے لئے ذکر کی یہاں اور مسئلہ بیان کیا گیا ہے

احادیث کی کتب کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں ایک ایک حدیث کئی جگہ مختلف مسائل بیان کرنے کے لئے آتی ہے۔

☆ "عن ام سلمة قالت اتاني ابو سلمة يوما من عند رسول الله ﷺ فقال لقد سمعت من رسول الله ﷺ قولا سررت به قال ولا يصيب احدا من المسلمين مصيبة فيسترجع عند مصيبته ثم يقول اللهم اجرني في مصيبتى اخلف لي خيرا منها الا فعل ذلك به قالت ام سلمة فحفظت ذلك منه فلما توفي ابو سلمة استرجعت وقلت اللهم اجرني في مصيبتى واخلف خيرا منها ثم رجعت الى نفسي فقلت من اين لي خير من ابى سلمة؟ فلما انقضت عدتي استاذن على رسول الله ﷺ وانا ادبغ اهابا لي فغسلت بيدي من القرظ واذنت له فوضعت له وسادة ادم حشوها ليف فقعد عليها فخطبني الى نفسي، فلما فرغ من مقالته قلت يا رسول الله مالي ان لا يكون بك الرغبة ولكني امرأة في غيرة شديدة فاخاف ان ترى مني شيئا يعذبني الله به وانا امرأة قد دخلت في السن وانا ذات عيال فقال اماما ذكرت من الغيرة فسوف يذهبها الله عز وجل عنك واماما ذكرت من السن فقد اصابني مثل الذي اصابك واماما ذكرت من العيال فانما عيالك عيالي قالت فقد سلمت لرسول الله ﷺ فتزوجها رسول الله ﷺ فقالت ام سلمة بعد ابدلني الله بابي سلمة خيرا منه رسول الله ﷺ"

(مسند احمد)

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں میرے پاس ایک دن ابوسلمہ (ان کے خاوند) رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر آئے تو انہوں نے کہا میں نے رسول اللہ ﷺ سے ایسا قول سنا جس سے میں خوش ہو گیا نبی کریم ﷺ نے فرمایا کسی ایک شخص کو مصیبت نہیں پہنچتی کہ وہ مصیبت کے وقت "إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ" پڑھے اور اس کے بعد یہ پڑھے "اللهم اجرني في مصيبتى واخلف لي خيرا منها" اے اللہ مجھے مصیبت میں اپنی حفاظت میں رکھ اور اس مصیبت کے بدلے مجھے بھلائی عطا فرما۔ مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ اسے مصیبت کے بعد بھلائی عطا فرمادیتا ہے۔ ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کے ارشاد گرامی کو یاد کر لیا۔ جب ابوسلمہ رضی اللہ عنہ فوت ہو گئے تو میں نے "إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ" پڑھا پھر میں نے یہ پڑھا "اللهم اجرني في مصيبتى واخلف لي خيرا منها" پھر میرے دل میں خیال آیا میں نے کہا ابوسلمہ سے میرے لئے اور بہتر کون

ہوگا؟ جب میری عدت ختم ہوگئی رسول اللہ ﷺ (تشریف لائے اور آپ) نے مجھ سے (گھر میں داخل ہونے کی) اجازت طلب کی میں اس وقت چڑا رنگ رہی تھی میں نے کیکر کی چھال والے ہاتھ دھوئے اور آپ کو اجازت دی (آپ تشریف لائے) میں نے آپ کے لئے چمڑے کا تکیہ رکھا جس میں کچھور کے پتے بھرے ہوئے تھے آپ تکیہ سے سہارا لگا کر بیٹھے تو آپ نے مجھے خطبہ کیا (یعنی اپنی ذات سے نکاح کرنے کے لئے مجھے ارشاد فرمایا) جب آپ اپنے کلام سے فارغ ہوئے تو میں نے عرض کیا یا رسول اللہ یہ بات تو نہیں کہ مجھے آپ کی طرف رغبت نہ ہو لیکن (میری مجبوریاں یہ ہیں) کہ میں غیرت والی عورت ہوں ہو سکتا ہے کہ (غیرت کی وجہ سے آپ کی دوسری ازواج سے کوئی ایسی ویسی بات ہو جائے) آپ مجھ میں کسی چیز کو دیکھ کر ناراض ہو جائیں تو رب تعالیٰ مجھے عذاب دے دے۔

(دوسری مجبوری یہ ہے کہ) میں عمر رسیدہ ہوں (مجھے نکاح کی خواہش نہیں)

(اور تیسری مجبوری یہ ہے) کہ میں عیال دار ہوں (میرے بچے بیکس ہو جائیں گے۔

آپ نے فرمایا ”جو تم نے غیرت (دوسرے کو دیکھ کر جلنا، پریشان ہونا) کا ذکر کیا ہے اسے اللہ تعالیٰ لے جائے گا“ (یعنی یہ کیفیت اللہ تعالیٰ کے فضل اور میری دعا اور میری زوجیت میں آنے کی برکت کی وجہ سے جاتی رہے گی) اور جو تم نے عمر کا ذکر کیا ہے میری بھی ایسی ہی عمر ہے جیسی تمہاری ہے اور جو تم نے بچوں کا ذکر کیا ہے بیشک تمہارے بچے میرے بچے ہیں (یعنی نکاح کی خواہش مجھے بھی نہیں میں بھی ایک بیوہ اور یتیم بچوں کی پرورش کرنا چاہتا ہوں)۔

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں میں نے اپنے آپ کو رسول اللہ کے سپرد کر دیا۔ ان کا نکاح رسول اللہ ﷺ سے ہو گیا اس کے بعد حضرت ام سلمہ کہتی ہیں کہ مجھے سمجھ آیا کہ واقعی اللہ تعالیٰ نے مجھے ابو سلمہ کے بدلے ان سے بہتر یعنی رسول اللہ ﷺ عطا کر دیئے۔ (صابونی)

استرجاع دل سے پڑھے: ”ولیس الصبر بالاسترجاع باللسان بل الصبر باللسان وبالقلب“ صبر صرف زبان سے ”إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ“ پڑھنے کا نام نہیں بلکہ زبان اور دل سے جب پڑھے تو صبر اسے کہا جائے گا۔

استرجاع اس امت کا خاصہ ہے:

”فقد اخرج الطبرانی وابن مردويه عن ابن عباس رضي الله عنه قال
قال النبي ﷺ، اعطيت امتي شيئا لم يعطه احد من الامم ان تقول عند
المصيبة انا لله وانا اليه راجعون“

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا میری امت کو وہ چیز عطا
کی گئی جو پہلی امتوں میں سے کسی امت کو عطا نہیں ہوئی وہ یہ کہ مصیبت کے وقت میری امت یہ پڑھے
”إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ“

”وفی رواية اعطيت هذه الامة عند المصيبة شيئا لم تعطه الانبياء
قبلهم انا لله وانا اليه راجعون ولو اعطيها الانبياء قبلهم لاعطيها
يعقوب اذ يقول يا اسفا على يوسف“

اور ایک روایت میں یہ ہے کہ اس امت کو مصیبت کے وقت وہ چیز عطا کی گئی ہے جو ان سے
پہلے انبیاء کرام کو بھی وہ عطا نہیں کی گئی ہے وہ چیز ہے ”إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ“ اگر یہ چیز پہلے
انبیاء کرام کو حاصل ہوتی تو حضرت یعقوب علیہ السلام کو حاصل ہوتی جب آپ کہہ رہے تھے ”یا اسفٰی
علیٰ یوسف“ اے افسوس یوسف پر۔

یعنی آپ کو اگر یہ کلمات عطا ہوتے تو آپ بھی یہ پڑھتے۔

☆ ”واخرج الطبرانی عن ابن عباس قال قال رسول الله ﷺ ان للموت فزعا فاذا
اتي احدكم وفاة اخيه فليقل انا لله وانا اليه راجعون وانا الى ربنا لمنقلبون“ (درمشور)
حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک موت سے گھبراہٹ
طاری ہوتی ہے جب بھی تم میں سے کسی ایک کے پاس اپنے بھائی کی موت کی خبر آئے تو وہ یہ پڑھے
”انا لله وانا اليه راجعون وانا الى ربنا لمنقلبون“ (طبرانی)

☆ ”واخرج الديلمي عن عائشة قالت اقبل رسول الله ﷺ وقد لدغته شوكة في
ابهامه فجعل يستر جمع منها ويمسحها فلما سمعت استرجاعه دنوت منه فنظرت فاذا اثر
حقير فضحكت فقلت يا رسول الله بابي انت وامی اكل هذا الاسترجاع من اجل هذه

الشوكة فتبسم ثم ضرب على منكبي فقال يا عائشة ان الله عز وجل اذا اراد ان يجعل الصغير كبيرا جعله واذا اراد ان يجعل الكبير صغيرا جعله “ (درمنثور)

دیلی نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ذکر کی آپ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کو انگوٹھے میں کانٹا چبھ گیا تو آپ اسی ہاتھ سے ملنے لگے اور ”اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُونَ“ پڑھنا شروع کیا جب میں نے آپ کو ”اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُونَ“ پڑھتے ہوئے سنا تو آپ کے قریب گئی میں نے دیکھا کہ بہت معمولی سا اثر ہے تو میں ہنسنے لگی میں نے کہا یا رسول اللہ میرے ماں باپ آپ پر قربان کیا ہر چیز پر یعنی کانٹا چبھنے پر بھی ”اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُونَ“ پڑھا جاتا ہے۔ تو آپ مسکرائے پھر میرے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے ارشاد فرمایا اے عائشہ بیشک اللہ تعالیٰ جب چاہے چھوٹی چیز کو بڑا بنادے اور جب چاہے بڑی چیز کو چھوٹا بنادے۔ (مسند دیلی، درمنثور)

یعنی انسان اگر کسی تکلیف کو چھوٹا سمجھ کر رب تعالیٰ کی طرف توجہ نہ کرے اور ”اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُونَ“ نہ پڑھے تو ہو سکتا ہے وہی تکلیف بڑی ہو جائے اور اگر کسی بڑی تکلیف پر ”اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُونَ“ پڑھ لے اور رب تعالیٰ کو یاد کر لے تو اس کی خیر و برکت سے وہ تکلیف دور ہو جائے۔

آنسو بہانے پر احادیث مبارکہ:

☆ ”واخرج ابن سعد عن خيثمة قال لما جاء عبد الله بن مسعود نعي اخيه عتبة دمعت عيناه فقال ان هذه رحمة جعلها الله لا يملكها ابن آدم“

ابن سعد نے خثیمہ سے روایت بیان کی کہ جب حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس ان کے بھائی عتبہ کی وفات کی خبر آئی تو ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے تو آپ نے فرمایا یہ رحمت ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسان کے لئے بنائی ہے کیونکہ انسان اس پر قادر نہیں (کہ آنسو بھی روک سکے)۔

(درمنثور)

☆ ”عن انس بن مالك قال قال رسول الله ﷺ ولد لي الليلة غلام فسميته باسم ابي ابراهيم عليه السلام ثم دفعه الي ام سيف امرأة قين يقال له ابو سيف فانطلق ياتيه واتبعته فانتهيانا الي ابي سيف وهو ينفخ بكيره قد امتلأ البيت دخانا فاسرعت المشي بين يدي رسول الله ﷺ فقلت يا ابا سيف امسك جاء رسول الله ﷺ فامسك فبدا النبي ﷺ

بالصبي فضمه اليه وقال ما شاء الله ان يقول فقال انس لقد رأيته وهو يكيد بنفسه بين يدي رسول الله ﷺ فدمعت عينا رسول الله ﷺ فقال تدمع العين ويحزن القلب ولا نقول الا ما يرضى ربنا والله يا ابراهيم انا بك لمحزونون“ (مسلم ج ۲ ص ۲۶۲ باب رحمته ﷺ الصبيان)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا رات کو میرے بچے کا تولد ہوا میں نے اس کا نام اپنے باپ ابراہیم کے نام پر رکھا۔ پھر وہ آپ نے ام سیف کو (پرورش کے لئے) دے دیا جو ایک لوہار ابو سیف کی زوجہ تھی نبی کریم ﷺ بچے کو ملنے کے لئے چلے میں بھی آپ کے پیچھے چلا ہم ابو سیف کے گھر پہنچے تو وہ آگ کی بھٹی کو دھونکنی کے ذریعے ہوا دے کر بھڑکار رہا تھا گھر دھوئیں سے بھرا ہوا تھا۔ میں جلدی جلدی رسول اللہ ﷺ کے آگے آگے چلا۔ میں نے ابو سیف کو کہا اے ابو سیف رک جاؤ۔ رسول اللہ ﷺ تشریف لارہے ہیں وہ رک گئے نبی کریم ﷺ تشریف لائے بچے کو طلب کیا سینے سے لگایا پھر آپ نے کچھ ارشاد فرمایا جو اللہ تعالیٰ کی مشیت میں تھا کہ آپ فرمائیں۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں میں نے دیکھا کہ نبی کریم ﷺ کے ہاتھوں میں ہی بچے کا سانس اکھڑنے لگا (نزع کا عالم طاری ہو گیا) نبی کریم ﷺ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے آپ نے فرمایا آنکھوں سے آنسو جاری ہیں دل غمناک ہے لیکن ہم کوئی ایسی بات نہیں کرتے جو رب تعالیٰ کی رضا کے خلاف ہو قسم ہے اللہ تعالیٰ کی اے ابراہیم ہم تیری وجہ سے غم زدہ ہیں۔

حدیث پاک سے واضح ہوا:

”جواز البكاء على المريض والخزن وان ذلك لا يخالف الرضا
بالقدر بل هي رحمة جعلها الله في قلوب عباده وانما المذموم النذب
والسياحة والدعاء بالويل والشور“

کہ مریض پر رونا جائز ہے اور غم کرنا جائز ہے یہ تقدیر پر رضا مندی کے خلاف نہیں بلکہ یہ رحمت ہے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے دلوں میں ڈال دی ہاں برا یہ ہے کہ واویلا کرنا، بال وغیرہ نوچنا، کسی کے لئے ہلاکت کی دعا کرنا۔

(نودی)

فائدہ جلیلہ : ”واخرج الطبرانی عن جابر بن سمرة قال قال رسول الله ﷺ من

دفن ثلاثة فصر عليهم واحتسب وجبت له الجنة فقالت ام ايمن واثنين قال واثنين قالت او واحد فسكت ثم قال وواحد

طبرانی نے حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے تین (نابالغ بچے) دفن کئے پھر ان پر صبر کیا اور اللہ تعالیٰ کی رضا پر شاکر رہا اس کے لئے جنت واجب ہے حضرت ام ایمن نے عرض کیا اور دو (یعنی دو بچے فوت ہو جائیں تو کیا حکم ہے) آپ نے فرمایا دو کا بھی یہی حکم ہے پھر انہوں نے پوچھا اگر ایک ہو تو؟ آپ ذرا خاموش رہے پھر آپ نے فرمایا ایک کا بھی یہی حکم ہے۔ (طبرانی، درمنثور)

راقم نے بریکٹ میں (نابالغ بچے) جو ذکر کیا ہے اس پر ترمذی شریف میں واضح طور پر ”لم يبلغوا الحنث“ کے الفاظ دلالت کر رہے ہیں۔

☆ ”عن ابن عباس انه سمع رسول الله ﷺ يقول من كان له فرطان من امتي ادخله الله بهما الجنة فقالت له عائشة فمن كان له فرط من امتك قال ومن كان له فرط يا موفقه قالت فمن لم يكن له فرط من امتك قال فانا فرط امتي لن يصابوا بمثلي“

(ترمذی جلد اول باب ما جاء فی ثواب من قدم ولدا)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا میری امت میں سے جس شخص کے دو بچے آگے منتظم ہوئے تو اللہ تعالیٰ اس شخص کو ان دونوں کے ذریعے جنت میں داخل کرے گا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا آپ کی امت میں سے جس کا ایک بچہ منتظم ہوا تو؟ آپ نے فرمایا اے توفیق دی گئی جس کا ایک بچہ منتظم ہوا اس کا بھی وہی حکم ہے پھر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ذکر کیا جس کا ایک بچہ بھی منتظم نہ ہوا تو؟ آپ نے فرمایا اس کا میں منتظم ہوں گا میری مثل کسی کو مصائب نہیں پہنچائی گئیں۔

وضاحت: فرط بالتحریک من يتقدم القافلة فهي لهم ما يحتاجون اليه ”فرط کی راء متحرک بالفتح ہے یہ اس شخص کو کہا جاتا ہے جو قافلہ سے آگے جا کر وہ چیزیں تیار کرے جن کے وہ محتاج ہوں۔

”والفرط هنا الولد الذي مات قبله فانه يتقدم ويهيى لوالديه منزلا في الجنة“

یہاں فرط سے مراد وہ نابالغ بچے ہیں جو والدین سے پہلے فوت ہو جائیں بیشک وہ آگے جا کر

اپنے والدین کے لئے جنت میں مہمان نوازی کا اور جنت میں مقام کا انتظام کریں۔

”ادخلہ اللہ الجنة بہما“ ان بچوں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اس شخص کو جنت میں داخل کرے گا
”یعنی مع الناجین اولا بالصبر علیہما“ یعنی بچوں کی وفات پر صبر کرنے کی وجہ سے ہی ابتدائی
طور پر جنت میں داخل کرے گا ”او الشفاعة منہما“ یا ان بچوں کی شفاعت سے اللہ تعالیٰ ان کے
والدین کو جنت میں داخل کرے گا۔

یا موفقة ای بالخیرات والاسولة الواقعة موقعها شفقة علی الامة“ نبی کریم ﷺ
نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو فرمایا ”اے توفیق دی ہوئی“ یعنی بھلائی کی توفیق دی ہوئی ”اور سوال جو
واقع ہوتے ہیں بر محل تم سے“ جو میری امت کے لئے شفقت کا سبب بنتے ہیں ان کی توفیق دی ہوئی۔

(از مرقاة بحوالہ حاشیہ ترمذی)

سبحان اللہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سوال نہ کرتیں تو کیسے پتہ چلتا کہ جس کا اور کوئی شفیع نہیں
ہوگا اس کے شفیع مصطفیٰ کریم ﷺ ہوں گے۔

”لن یصابوا بمثلی، ای بمثل مصیبتی لہم فان مصیبتی اشد علیہم

من سائر المصائب واکون انا فرطہم“

جس کا اور کوئی نہیں ہوگا اس کا جنت میں پہلے میں منتظم ہوں گا کیونکہ ان میں سے کسی کو بھی وہ
مصیبتیں حاصل نہیں ہوئیں جو مجھے حاصل ہوئیں اور میں ان کا شفاعتی اور منتظم ہوں گا۔

(مرقاة بحوالہ حاشیہ ترمذی)

خیال رہے کہ ”اصاب یصیب“ کا مطلقاً معنی پالینا، پہنچا دینا بھی آتا رہتا ہے علامہ
راغب اصفہانی فرماتے ہیں ”واصاب: جاء فی الخیر والشر، قال ”ان تصبک حسنة
تسؤہم“ وان تصبک مصیبة“ ولئن اصابکم فضل من اللہ“ کہ ”اصاب“ کا استعمال
خیر اور شر دونوں میں آتا رہتا ہے کیونکہ ”ان تصبک حسنة تسؤہم“ میں اور ”ولئن
اصابکم فضل من اللہ“ میں خیر کے لئے استعمال ہے ”وان تصبک مصیبة“ میں اور ”وان
تصبک سیئة“ میں مصیبت کے لئے استعمال ہے۔

” قال بعضهم الاصابة في الخير اعتبارا بالصوب اي بالمطر وفي

الشر اعتبارا باصابة السهم و كلاهما يرجعان الى الاصل “

بعض حضرات نے بیان کیا ہے کہ صوب کا معنی بارش کا ہونا، پانی کا اوپر سے اُنڈیلنا اس معنی کے لحاظ سے اس کا استعمال خیر کے لئے ہے اور ” اصابة السهم “ کا معنی تیر کا پہنچنا اس معنی کے لحاظ سے شر میں استعمال ہے۔

اس تمہید کے بعد راقم کا موقف یہ ہے کہ ” لن يصابوا بمثلي “ کا اگر یہ معنی کر لیا جائے کہ (جس کا کوئی فرط نہیں اس کا میں فرط ہوں) کیونکہ میرے جیسا شفیع اور میرے جیسا منتظم ان کو اور کوئی حاصل نہیں ہوگا تو بہت خوب سے خوب تر معنی نظر آئے گا..... واللہ اعلم بالصواب۔

دین میں بڑی مصیبتیں نبی کریم ﷺ پر آئیں:

” عن عطاء بن ابي رباح قال قال رسول الله ﷺ اذا اصاب احدكم

مصيبة فليذكر مصابه بي فانها من اعظم المصائب “

عطاء بن ابی رباح فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تم میں سے کسی ایک کو مصیبت پہنچے وہ میری مصیبتوں کو یاد کرے جو سب سے بڑی مصیبتیں ہیں۔

☆ ” قال ابو عمرو و صدق رسول الله ﷺ لان المصيبة به اعظم من كل مصيبة يصاب به المسلم بعده الى يوم القيامة “

ابو عمرو کہتے ہیں کیا خوب سچا ارشاد رسول اللہ ﷺ کا ہے کہ مسلمانوں کو میرے بعد بہت بڑی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑے گا جو قیامت تک سلسلہ جاری رہے گا۔ ابو عمرو کہتے ہیں واقعی ہم نے اس ارشاد کا مشاہدہ کیا جب سلسلہ وحی منقطع ہو گیا اور نبی کریم ﷺ کا وصال ہو گیا تو ” کان اول ظهور الشر بارتداد العرب وغير ذلك “ سب سے پہلی مصیبت جو مسلمانوں پر واقع ہوئی وہ کئی عرب کا مرتد ہو جانا تھا اس کے بغیر اور کئی فتنے نمودار ہو گئے۔ ” و کان اول انقطاع الخير و اول نقصانه “ نبی کریم ﷺ کے وصال کے بعد خیر و بھلائی کا انقطاع ہو گیا اور نقصان پیدا ہو گیا جو آہستہ آہستہ عظیم خلفشار تک پہنچ گیا۔

☆ "قال ابو سعید ما نقصنا ایدینا من التراب من قبر رسول الله ﷺ حتی انکرنا قلوبنا"

ابو سعید فرماتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ کی قبر شریف کی مٹی سے ابھی ہاتھ بھی نہیں جھاڑے تھے کہ آپ کے وصال کی وجہ سے خیر و برکت کے اٹھ جانے کی وجہ سے ہمارے دلوں میں شکوک و شبہات کی عجیب کیفیت پیدا ہو گئی جو آپ کے بعد بہت بڑی مصیبت تھی۔

☆ ابوالعاصیہ نے اس حدیث کا معنی نظم کی صورت میں خوبصورت انداز پر پیش کیا۔

اصبر لكل مصيبة وتجلد
واعلم بان المرء غیر مغلد
ہر مصیبت پر صبر کرو اور بہادری سے کام لو
اور یقین کر لو کہ کسی انسان نے ہمیشہ نہیں رہنا
او ما تری ان المصائب جمعة
وترى المنية للعباد بمر صد
کیا تو دیکھتا نہیں کہ بیشک مصیبتیں کثیر ہیں
اور تو موت کو دیکھ جو بندوں کے لئے گھات میں ہے
من لم یصب ممن تری بمصيبة
هذا سبیل لست فیہ با وحد
جن لوگوں کو تم دیکھ رہے ہو کون سا وہ شخص ہے جسے مصیبت نہ پہنچی
یہ وہ راستہ ہے جس میں تم اکیلے نہیں
فاذا ذكرت محمد او مصابه
فاذکر مصابک بالنبی محمد
جب تمہیں یاد آئے نبی کریم ﷺ اور آپ کی مصیبتوں کی
تو اپنی مصیبتوں کو نبی کریم ﷺ کی مصیبتوں کے مقابل یاد کرو۔
(ماخوذ از قرطبی)

نماز باجماعت رہ جانے پر استرجاع:

"واخرج عبد بن حمید عن الحسن قال اذا فاتتک صلوة فی جماعة
فاسترجع فانها مصيبة"

عبد بن حمید حضرت حسن بصری رحمہ اللہ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا جب تمہاری نماز جماعت سے رہ جائے تو "إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ" پڑھو کیونکہ یہ بھی ایک مصیبت ہے۔
(درمنثور)

☆ "واخرج عبد بن حمید عن سواد بن داود ان سعید بن المسيب جاء وقد فاتته
الصلوة فی الجماعة فاسترجع حتی سمع صوته خارجا من المسجد"
عبد بن حمید نے سواد بن داود سے روایت ذکر کی کہ بیشک سعید بن مسیب آئے اور ان کی نماز

جماعت سے رہ گئی تو انہوں نے بلند آواز سے ”إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ“ پڑھا یہاں تک کہ ان کی آواز مسجد سے باہر سنائی دی۔
(درمنثور)

کلام الامام فی تفسیر الآیت للاختتام:

علامہ رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ہم اس آیہ کی تفسیر کو قضاء پر رضاء کے بیان سے ختم کرتے ہیں بندے کا اللہ تعالیٰ کی تقدیر پر راضی رہنا دو طریقہ سے ہے ایک طریق تصرف سے اور دوسرا طریق جذب سے۔

طریق التصرف: تصرف کے طریقہ میں چند وجوہ ہیں:

(۱) بیشک جب کسی کا دل کسی چیز کی طرف مائل ہو اور اس کے دل کی توجہ کامل طور پر کسی چیز کی طرف ہو جائے تو وہ چیز اس کے لئے منشأ آفات بن جاتی ہے اس وقت دل کی توجہ عالم حدوث سے رب تعالیٰ کی طرف پھیر دی جائے (اس میں رب تعالیٰ کی طرف سے بھی توفیق حاصل ہو جاتی ہے):

”فان آدم علیه السلام لما تعلق قلبه بالجنة جعلها محنة عليه حتى زالت الجنة فبقى آدم مع ذكر الله“

حضرت آدم علیہ السلام کا دل جب جنت سے بہت زیادہ لگ گیا تو وہی جنت آپ کے لئے محنت و مشقت کا ذریعہ بن گئی جب جنت آپ سے زائل ہو گئی تو آپ اللہ تعالیٰ کے ذکر میں باقی رہے (یعنی اللہ تعالیٰ کے ذکر میں کامل مشغول ہو گئے)۔

”ولما استأنس يعقوب بيوسف عليهما السلام اوقع الفراق بينهما حتى بقي يعقوب مع ذكر الحق“

جب حضرت یعقوب علیہ السلام کو اپنے بیٹے حضرت یوسف علیہ السلام سے بہت زیادہ محبت ہو گئی، تو ان دونوں کے درمیان فراق پیدا کر دیا گیا، یہاں تک کہ حضرت یعقوب علیہ السلام فقط اللہ تعالیٰ کے ذکر میں مشغول رہے۔

”ولما طمع محمد ﷺ من اهل مكة في النصرة والاعانة صاروا من اشد الناس عليه حتى قال ، ما اوذى نبي مثل ما اوذيت“

اور نبی کریم ﷺ کو یہ تمنا لاحق ہوئی کہ اہل مکہ آپ کی نصرت و اعانت کریں تو وہی لوگ آپ کے شدید مخالف ہو گئے انہوں نے آپ کو اتنی تکالیف پہنچائیں جس کی مثال نہیں ملتی۔ اسی لئے آپ نے فرمایا کسی نبی کو اتنی تکالیف نہیں دی گئیں جتنی مجھے تکالیف دی گئیں۔ (اسی وجہ سے آپ کو مکہ مکرمہ سے ہجرت کا حکم دے دیا گیا تا کہ آپ دل جمعی سے کامل طور پر صرف اللہ تعالیٰ کے احکام کی تبلیغ اور اس کی عبادت میں منہمک ہو جائیں۔

(۲) انسان پر جب مصیبت آئے تو وہ اس مصیبت کو مصیبت ہی نہ سمجھے اس کو اس طرح دل سے نکال دے کہ اس کی طرف ذرا بھی توجہ نہ کرے وہ مصیبت اسے نہ تو مصیبت نظر آئے گا اور نہ ہی رحمت ”فحينئذ يرجع العبد الى الله تعالى“ پس اس وقت بندہ اللہ تعالیٰ کی طرف کامل طور پر رجوع کرے گا۔

(۳) بیشک بندے پر جب کوئی چیز واقع ہو تو وہ یہ سمجھے کہ یہ مصیبت اس ذات باری تعالیٰ کی طرف سے آئی ہے جو ہر طرف کی بھلائیاں عطاء فرماتا ہے اور وہ توقع رکھنے والے کو بغیر کسی واسطہ کے عطاء کرتا ہے جب بندے کو یہ حالت حاصل ہو جاتی ہے ”فیستحي العبد فيرجع الى باب رحمة الله“ تو بندے کو شرم آتی ہے کہ وہ رب تعالیٰ جس کے مجھ پر ان گنت انعام ہیں اس کی طرف سے اس معمولی آزمائش میں، میں صبر نہ کروں، واویلا کروں اور بے قراری میں رہوں یہ میرے لئے باعث شرم ہے، جب بندے کو شرم آتی ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کے دروازہ کی طرف رجوع کرتا ہے۔ یعنی اس کا رب تعالیٰ کی تقدیر پر راضی رہنا ہی رحمت کی طرف رجوع ہے۔ یعنی رب تعالیٰ کی طرف سے رحمت کا حاصل ہونا تو رحمت ہی ہے لیکن مصیبت پر صبر بھی رحمت ہے۔

طريق الجذب : جذب کے طریقہ کے متعلق نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ”جذبة من جذبات الحق توازي عمل الثقلين“ حق کے جذبات میں سے ایک جذبہ جن اور انسانوں کے عمل کے برابر ہے۔ جذبہ حق کی اجمالی طور پر تعریف یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو کامل طور پر رب تعالیٰ کی طرف متوجہ کر لے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ جس شخص کو حق تعالیٰ اپنی طرف کھینچ لے (متوجہ کر لے)

وہ مغلوب ہو جاتا ہے ”لان الحق غالب لا مغلوب“ اس لئے کہ حق غالب ہے مغلوب نہیں۔

”وصفة الرب الربوبية وصفة العبد العبودية والربوبية غالبية على

العبودية لا بالضد“

رب تعالیٰ کی صفت ربوبیت ہے اور بندے کی صفت عبودیت ہے اور ربوبیت کو عبودیت پر غلبہ حاصل ہے ایسا نہیں ہو سکتا کہ عبودیت کو ربوبیت پر غلبہ حاصل ہو جائے۔

”وصفة الحق حقيقة وصفة العبد مجاز والحقيقة غالبية على المجاز لا بالضد“

حق کی صفت حقیقت ہے اور بندے کی صفت مجاز ہے حقیقت کو مجاز پر غلبہ حاصل ہے مجاز حقیقت پر غالب نہیں ہو سکتا۔ غالب کو یہ حق حاصل ہے اور یہ قدرت حاصل ہے کہ مغلوب کو ایک صفت سے دوسرے صفت کی طرف منتقل کر دے اس لئے کہ وہ علیم وخبیر ہے جانتا ہے کہ اس بندے کے لائق کون سی صفت ہے۔

ذرا غور تو کریں بندہ جب کسی ہیبت ناک بادشاہ کے پاس جائے تو وہ اپنے آپ کو بھول جاتا ہے اپنے دل اور فکر اور حواس کو کامل طور پر اس کی طرف متوجہ کر لیتا ہے اسی کی طرف مشغول ہو جاتا ہے اور غیروں سے غافل ہو جاتا ہے۔ تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ بندہ جب بادشاہوں کے بادشاہ جس کے سامنے سب بادشاہ حقیر ہیں یعنی مالک الملک کے حضور اپنے آپ کو سمجھے تو پھر اپنے آپ کو فانی نہ سمجھے یقیناً جب انسان اپنے آپ کو رب تعالیٰ کے حضور فنا کے مقام پر سمجھتا ہے اور اپنی ذات کے فوائد کی طرف توجہ نہیں کرتا تو وہ رب تعالیٰ کے فیصلوں پر راضی رہتا ہے اور صبر و شکر سے کام لیتا ہے اسے رب تعالیٰ کی عبادت سے روگردانی کا تصور حاصل نہیں ہوتا۔

(ماخوذ از کبیر)

☆☆☆☆☆

﴿أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ﴾

(۱) ”یہ لوگ ہیں جن پر ان کے رب کی درودیں ہیں اور رحمت اور یہی لوگ راہ پر ہیں“

(۲) ”یہ لوگ ہیں جن پر مہربانیاں ہیں ان کے رب کی اور رحمت اور یہی لوگ ہدایت پر ہیں“

صلوات : جمع ہے صلوٰۃ کی، اگرچہ بظاہر وہم یہ ہوتا ہے کہ صلوٰۃ کا معنی بھی رحمت ہے پھر اس کے بعد رحمت کا ذکر تکرار ہے تو اس وہم کو مختلف وجوہ سے زائل کیا گیا ہے۔ ”الصلوة فی الاصل الدعاء“ صلوٰۃ کا اصل میں حقیقی معنی دعا ہے جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿وَصَلِّ عَلَيْهِمْ﴾ ای ادع لہم یعنی ﴿صَلِّ عَلَيْهِمْ﴾ کا معنی ہے آپ ان کے لئے دعا کریں۔ ”وَمِنَ اللّٰهِ التَّزْكِيَةُ وَالْمَغْفِرَةُ“ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر صلوات کا مطلب یہ ہے کہ وہ ان کا تزکیہ (پاکیزہ کرنا) فرماتا ہے اور ان کی مغفرت کرتا ہے۔

صلوات، کو جمع ذکر کیا ہے جس سے کثرت اور اس کی مختلف قسمیں واضح ہوتی ہیں جیسے ”لیک وسعدیک“ میں تکرار ہے (ورحمۃ) والمراد بالرحمة اللطف والاحسان ”رحمت سے مراد لطف اور احسان ہے۔ (از بیضاوی و شیخ زادہ)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ”صلوات“ کی تفسیر مغفرت سے کی ہے اور یہ ایسے ہی جیسے نبی کریم ﷺ نے رب تعالیٰ کے حضور عرض کیا۔ ”اللہم صل علی آل ابی اوفی ای ارحمہم واغفر لہم“ اے اللہ ابو اوفی کی آل کی مغفرت فرما اور ان پر رحم فرما۔ ”رحمۃ“ کو نکرہ ذکر کیا ہے جس میں تنوین تعظیم پر دلالت کرتی ہے معنی اس کا بھی ”رحمات“ (کئی رحمتیں) ہے لیکن جمع ذکر کرنے کی ضرورت درپیش نہ آئی۔

اللہ تعالیٰ کی رحمت ان چیزوں کو بھی شامل ہے جو انسان کے لئے باعث مسرت بنیں اور ان کو بھی شامل ہے جو ضرر کو دور کرنے کا ذریعہ ہیں خواہ دنیاوی ضرر ہو یا اخروی۔

تنبیہ : بعض حضرات نے بیان کیا کہ ”صلوات“ اور ”رحمۃ“ کا ایک ہی معنی ہے یعنی دونوں کا معنی رحمت ہی ہے اگرچہ الفاظ مختلف ہیں جیسا کہ ”سرہم ونجواہم“ میں مختلف الفاظ کا ایک ہی معنی ہے۔ لیکن یہ قول اتنا درست نہیں کیونکہ جب علیحدہ علیحدہ معنی ممکن ہو تو ایک ہی معنی لینے سے وہ بہتر ہے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی روایت بھی ایک ہی معنی کے خلاف ہے۔

”روی عن عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ انہ قال فی هذه الآية نعم

العدلان ونعم العلاوة“

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس آیت کریمہ میں دو بہتر عدل (بدلے) پائے گئے ہیں اور ان کے علاوہ ایک اور اچھی چیز پائی گئی ہے :

”وجعل قوله ﴿أُولَئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِنْ رَبِّهِمْ﴾ عدلا ولقوله

ورحمۃً عدلا ولو كان بمعنى لما كانا عدلين وجعل قوله تعالى

﴿وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ﴾ علاوة“

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ﴿أُولَئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِنْ رَبِّهِمْ﴾ کو ایک عدل (بدلہ) کہا ہے اور ”رحمۃ“ کو دوسرا عدل اگر دونوں کا معنی ایک ہو تو ایک بدلہ بنے گا دو بدلے نہیں بن سکتے اور اللہ تعالیٰ کے قول ﴿وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ﴾ کو ان دو بدلوں کے علاوہ رب تعالیٰ کا فیضان بیان کیا گیا ہے۔

(از شیخ زادہ)

وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ : ”للحق والصواب حيث استرجعوا واسلموا لقضاء الله تعالى“ یہی لوگ ہدایت پر ہیں یعنی حق اور درست راہ پر ہیں کیونکہ مصیبت کے وقت ”انا لله وانا الیہ راجعون“ پڑھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی تقدیر کو تسلیم کرتے ہیں۔

(بیضاوی)

”وقال ابن مسعود لان اخر من السماء احب الی من ان اقول قضاء

الله تعالى لیتہ لم یکن“

اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا میرے نزدیک آسمانوں سے نیچے گرنا زیادہ محبوب

ہے نسبت اس کے کہ میں اللہ تعالیٰ کی تقدیر اور فیصلے کے متعلق یہ کہوں ”کاش کہ یہ نہ ہوتا“ (کبیر)

”وحکی عن داود الطائی قال : الزهد فی الدنيا ان لا یحب البقاء فیہا

وافضل الاعمال الرضاء عن الله ولا ينبغي للمسلم ان يحزن لانه يعلم
ان لكل مصيبة ثوابا

داؤد طائی رحمہ اللہ فرماتے ہیں دنیا میں زہد یہ ہے کہ اس میں باقی رہنے سے محبت نہ کرے اور تمام اعمال سے افضل عمل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر پر راضی رہے کسی مسلمان کی شان کے لائق ہی نہیں کہ وہ کسی مصیبت پر غم کرے جب کہ وہ جانتا بھی ہے کہ ہر مصیبت پر ثواب حاصل ہوتا ہے۔ (کیر)

مقام توجہ: راقم نے ”صلوات“ کا ترجمہ ”بھلائیاں“ کیا ہے اور اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے ترجمہ ”درودیں“ کیا ہے مطلب ایک ہی ہے صرف آج کل کے عرف میں ”درود“ کا مفہوم لوگ صرف نبی کریم ﷺ پر پڑھا گیا ”درود“ سمجھتے ہیں لوگوں کو ”درود“ کا مطلب ”رحمت اور بھلائی“ پتہ ہی نہیں۔

یہ تراجم ابھی تک ذکر کی گئی تمام بحث کو شامل ہیں اور علامہ رازی رحمہ اللہ نے جو یہ بیان کیا ہے اسے بھی شامل ہے ”فاعلم ان الصلوة من الله هي الشاء والمدح والتعظيم واما رحمة فهي النعم التي انزلها به عاجلا ثم آجلا“ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ”صلوة“ کا مطلب یہ ہے کہ رب تعالیٰ تعریف فرماتا ہے مدح کرتا ہے اور عظمت عطا فرماتا ہے اور رحمت کا مطلب یہ ہے کہ وہ دنیا میں اور آخرت میں نعمتیں عطا کرتا ہے۔ (کیر)

گزشتہ سے پیوستہ:

”انا لله وانا اليه راجعون“ کو ظاہر آواز سے پڑھنا دل میں پڑھنے سے بہتر ہے۔

”فان في اظهاره فوائد جزیلة، منها ان غيره يقتدى به اذا سمعه، ومنها غيظ الكفار وعلمهم بجده واجتهاده في دين الله والاثبات عليه وعلى طاعته“

اس لئے کہ اس کے ظاہر کرنے میں بہت بڑے فوائد ہیں۔ کیونکہ اس سے سن کر دوسروں کو اس کی اقتداء کا فائدہ حاصل ہوگا کہ وہ بھی اپنی مصیبتوں کے وقت ”انا لله وانا اليه راجعون“ پڑھیں گے۔ اور کفار غیظ و غصب سے جل انھیں گے، جب ان کو معلوم ہوگا کہ یہ شخص اللہ کے دین میں بڑی کوشش اور محنت کر رہا ہے اور اس پر ثابت قدم ہے، اور اللہ تعالیٰ اور اس کے دین کی طاعت میں قائم ہے۔ (کیر)

☆ "عن جابر قال قال رسول الله ﷺ يود اهل العافية يوم القيامة حين يعطى اهل البلاء الثواب لو ان جلودهم كانت قرصت في الدنيا بالمقاريض رواه الترمذی وقال هذا حديث غریب"

(مظہری)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب مصیبت پر صبر کرنے والوں کو قیامت کے دن ثواب عطا کیا جائے گا تو اہل عافیت یہ تمنا کریں گے کاش کہ ان کے چمڑے دنیا میں قینچیوں سے کاٹ دیئے جاتے۔

☆ "عن ابی سعید الخدری عن النبی ﷺ قال ما یصیب المسلم من نصب ولا وصب ولا هم ولا حزن ولا اذى ولا غم حتى الشوكة يشاكها الا كفر الله بها من خطاياہ ، متفق علیہ"

(مظہری)

مشکل الفاظ کے معانی:

"قوله من نصب وقوله ولا وصب بفتحین فیہما اول التعب والالم الذی یصیب البدن من جراحة وغیرہا والثانی الالم اللازم من السقم الدائم"

"نصب" اور "و صب" دونوں کے پہلے اور دوسرے حرف پر فتح (زبر) ہے پہلے لفظ کا معنی "تھک جانا" اور وہ درد جو بدن کو زخم وغیرہ کی وجہ سے پہنچے۔ اور دوسرے لفظ کا معنی دائمی مرض کی وجہ دائمی درد۔

"الهم والحزن" ما یصیب القلب من الالم بفوت محبوب وقیل الهم یختص بما هو آت والحزن بما فات"

"هم" اور "حزن" کا بھی ایک ہی معنی آتا ہے وہ یہ کہ کسی محبوب چیز کے فوت ہونے پر دل کو جو مصیبت پہنچے اور کبھی فرق کر لیا جاتا ہے آنے والی تکلیف کو "هم" کہا جاتا ہے۔ اور گزری ہوئی پر صدمہ کو "حزن" کہا جاتا ہے۔

(مرقاۃ بحوالہ حاشیہ ترمذی ج ۱ ص ۱۶ باب ما جاء ثواب المریض)

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کسی شخص کو کوئی عارضی درد یا دائمی درد نہیں پہنچتا اور نہ آنے والی تکلیف سے کوئی غم پہنچتا ہے اور نہ فوت ہونے والی چیز سے۔ کوئی غم ہوتا

ہے اور نہ ہی انہیں کوئی تکلیف ہوتی ہے اور نہ ہی کسی قسم کا غم لاحق ہوتا ہے یہاں تک کہ کسی کو کوئی کاٹا بھی چبھ جائے مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ اس کے گناہوں کا ان تکالیف کو کفارہ بنا دیتا ہے۔ (از منبری)

﴿وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ﴾ میں چند وجوہ ہیں ایک یہ ہے ”انہم المہتدون لہذہ الطریقۃ الموصلة بصاحبہا الی کل خیر“ بیشک وہ اس راہ پر ہیں جس کی ہر سمت میں بھلائی ہی بھلائی ہے یعنی خیر کی راہ پر قائم ہیں۔

دوسری وجہ یہ ہے ”المہتدون الی الجنة الفائزون بالثواب“ جنت کی راہ پر قائم ہیں اور ثواب حاصل کرنے میں کامیاب ہیں۔

تیسری وجہ یہ ہے ”المہتدون لسانہ مالزمہم“ تمام اوامر و نواہی جو ان پر لازم ہیں ان پر عمل کرنے کی وجہ سے وہ ہدایت پر ہیں۔ (از کبیر)

فائدہ جلیلہ : ”اھتداء“ کا ایک معنی یہ ہے ”مطالب پر کامیاب ہونا“ اس معنی کے لحاظ سے ﴿وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ﴾ کا مطلب ہوگا:

”اولئک ہم الفائزون بمطالہم الدینیۃ والدنیویۃ فان من نال تزکیۃ اللہ تعالیٰ ورحمۃ لم یفتہ مطلب“

کہ یہی لوگ اپنے دینی اور دنیاوی مطالب میں کامیاب ہیں بیشک جو شخص اللہ تعالیٰ کی طرف سے تزکیہ (پاکیزگی) حاصل کر لے اور رب تعالیٰ کی رحمت حاصل کر لے اس کا کوئی مطلب فوت نہیں ہوتا (روح المعانی)

اسے درد پہنچے یا آرام ہر صورت میں اسے کامیابی حاصل ہوتی ہے کیونکہ اسے ثواب حاصل ہوتا ہے اور رب تعالیٰ کا قرب حاصل ہوتا ہے۔ اسی کا نام کامیابی ہے۔

﴿إِنَّ الصِّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللَّهِ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ
أَوْ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ أَنْ يَطَّوَّفَ بِهِمَا وَمَنْ تَطَوَّعَ
خَيْرًا فَإِنَّ اللَّهَ شَاكِرٌ عَلِيمٌ﴾

(۱) ” بیشک صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں سے ہیں تو اس گھر کا حج یا عمرہ کرے اس پر کچھ گناہ نہیں کہ ان دونوں کے پھیرے کرے اور جو کوئی بھلی بات اپنی طرف سے کرے تو اللہ نیکی کا صلہ دینے والا خبردار ہے۔“

(۲) ” بیشک صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں سے ہیں تو جو شخص حج کرے بیت اللہ کا یا عمرہ کرے تو نہیں گناہ اس پر کہ سعی کرے ان دونوں کی اور جو شخص زیادہ نیکی کرے تو بیشک اللہ اس کے شکر کو قبول کرنے والا علم والا ہے۔“

شان نزول: ”عن ابن عباس رضی اللہ عنہ انہ کان علی الصفا صنم علی صورة رجل یقال لہ اساف وعلی المروة صنم علی صورة امرأة تدعی نائلة زعم اهل الكتاب انهما زنيا فی الکعبة فمسخهما اللہ تعالیٰ حجرین فوضعا علی الصفا والمروة ليعتبر بهما فلما طالت المدة عبدا من دون اللہ تعالیٰ فکان اهل الجاهلية اذا طافوا بينهما مسحوا الوثنيين فلما جاء الاسلام وكسرت الاصنام كره المسلمون الطواف بهيئتهما لاجل الصنمين فانزل اللہ تعالیٰ“

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ بیشک صفا پر ایک بت مرد کی شکل میں تھا جسے اساف کہا جاتا تھا اور مروہ پر ایک بت عورت کی شکل کا تھا جسے نائلہ کہا جاتا تھا اہل کتاب کا گمان تھا (یہ کوئی یقینی بات نہیں) کہ یہ دونوں حقیقت میں انسان ہی تھے انہوں نے کعبہ میں زنا کیا تھا تو اللہ تعالیٰ نے ان کو پتھر بنا دیا۔ پھر ان دونوں کو صفا اور مروہ پر رکھ دیا گیا تا کہ لوگ ان دونوں سے عبرت پکڑیں۔ جب کچھ زیادہ ہی عرصہ گزر گیا تو لوگوں نے اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر ان کی عبادت شروع کر دی زمانہ جاہلیت میں اہل جاہلیت جب صفا اور مروہ کے درمیان چکر لگاتے (سعی کرتے) تو ان بتوں کو آ کر چھوتے (ہاتھ لگاتے) جب اسلام آ گیا اور بتوں کو توڑ دیا گیا مسلمانوں نے پھر بھی صفا اور مروہ کے درمیان

سعی کرنے کو ناپسند سمجھا کہ ان پر بت تھے لہذا ان میں سعی کرنا گناہ ہے تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کریمہ کو نازل کیا کہ بت پرستی تو منع ہے بتوں کو تبرک کے طور پر ہاتھ لگانا تو منع ہے لیکن صفا اور مروہ تو محترم مقامات ہیں اللہ کی نشانیوں میں سے نشانیاں ہیں حج اور عمرہ میں ان کے درمیان سعی کرنا کوئی گناہ نہیں خصوصاً جب کہ بت توڑ بھی دیئے گئے۔

(از روح المعانی)

إِنَّ الصَّفَا: صفا کو صفا کہنے کی وجہ ایک تو یہ ہے کہ ”صفا یصفو صفوا“ کا معنی خالص صاف ہونا صفا بھی چونکہ خالص پتھر کی چٹان ہے ایسی پہاڑی نہیں جس میں مٹی، ریت، بجر یا درخت پائے جائیں بلکہ خالص ہنر سیاہ رنگ کی چٹان ہے ”الصفا فی الاصل الحجر الاملس لا یخالطہ غیرہ من طین او تراب“ یعنی صفا خالص صاف پتھر کو کہا جاتا ہے جس کے ساتھ کچڑ اور خشک مٹی وغیرہ نہ پائی جائیں۔

صفا کو صفا کہنے کی اور وجہ یہ ہے ”وقیل سُمی (الصفا) لانه جلس علیہ آدم صفی اللہ“ کہ اس پر حضرت آدم صفی اللہ بیٹھے، ان کے بیٹھنے کی وجہ سے اس کا نام ہی صفا رکھ دیا گیا یعنی اس کے نام کی وجہ ”صفی اللہ“ سے تعلق ہے۔

(از روح المعانی)

مروہ کو مروہ کہنے کی وجہ: اصل میں سفید اور صاف پتھر کو مروہ کہا جاتا ہے لیکن بعد میں صفا کے مقابل دوسری پہاڑی کا نام مروہ ہے اگرچہ اسکے پتھر بھی صفا کی طرح ہی ہیں سفید سنگ مرمر کی طرح نہیں۔ دونوں پہاڑیوں کی چوٹیوں کو جوں کا توں چھوڑا ہوا ہے اگرچہ نیچے حصہ میں تمام سنگ مرمر کا فرش آجکل لگا ہوا ہے۔

مروہ کو مروہ کہنے کی دوسری وجہ یہ ہے ”وسمی المروۃ لانه جلست علیہ امرأۃ حواء“ مروہ کا نام مروہ اسلئے رکھا گیا ہے کہ بیشک اسکے اوپر حضرت آدم علیہ السلام کی زوجہ (امراۃ) حضرت حواء بیٹھی۔ تو گویا کہ (امراۃ) حضرت حواء کی نسبت سے وہ پہاڑ مروہ بن گیا۔

(از روح المعانی)

مِنْ شَعَائِرِ اللّٰهِ: ”بیشک صفا اور مروہ“ اللہ کی نشانیوں سے ہیں ”شعائر“ جمع ہی شعیرۃ کی یا شعار کی جس کا معنی ہے ”علامت“ (نشانی)۔

صفا اور مروہ کو ”شعار اللہ“ کہنے کی وجوہ:

- (۱) ”والمراد بهما اعلام المتعبدات“ مراد یہ ہے کہ صفا اور مروہ عبادت کے مقامات کی نشانیاں ہیں کیونکہ ان پر چکر لگانا عبادت ہے۔
- (۲) ”او العبادات الحجية“ صفا اور مروہ کو اس لئے اللہ تعالیٰ کی نشانیاں کہا گیا ہے کہ وہاں حج کے مناسک سے سعی ادا کی جاتی ہے تو حج کی عبادات میں سے عبادت کی نشانیاں ہیں۔
- (۳) ”وقيل المعنى ان الطواف بين هذين الجبلين من علامات دين الله“ اصل میں ان دونوں (صفا اور مروہ) کے درمیان طواف (چکر لگانا) اللہ تعالیٰ کے دین کی نشانیوں میں سے نشانی ہے۔
- اس کی وجہ سے ان دونوں کو بھی اللہ کی نشانیاں کہہ دیا گیا ہے گویا کہ ”اسم المحل باسم الحال“ والا قانون جاری کیا گیا ہے۔
- (۴) ”او انهما من المواضع التي يقام فيها دينه“ یا اس وجہ سے ان دونوں کو اللہ تعالیٰ کی نشانیاں کہا گیا ہے کہ یہ ان مقامات میں سے ہیں جن میں اللہ تعالیٰ کا دین قائم کیا جاتا ہے۔
- (۵) ”او من علاماته التي تعبد بالسعي بينهما لامن علامات الجاهلية“ ان کو اللہ تعالیٰ کی نشانیاں اس لئے کہا گیا ہے ان میں کیا جانے والا فعل اللہ تعالیٰ اور اس کے دین کی نشانی ہے جاہلیت کی رسوم میں سے اسلام کے آنے کے بعد کوئی رسم بتوں کو ہاتھ لگانے والی ادا نہیں کی جاتی۔

(از روح المعانی)

شعار اللہ کہنے کی عظیم وجہ: جیسا کہ پہلے پارہ میں بیان کیا جا چکا ہے ذرا بالا اختصار پھر دیکھئے:

”فان ابراهيم عليه السلام لما دع ربه بقوله ﴿وارنا مناسكنا﴾ علمه الله مناسك الحج وشعائره اجابة لدعوته ثم شرعها الله لامة محمد ﷺ والحكمة في شروع السعي بين الصفا والمروة ما حكى ان هاجر حين ضاق عليها الامر في عطشها وعطش ابنها اسمعيل سعت في هذا المكان الى ان صعدت الجبل ودعت فانبع الله ماء زمزم واجاب دعاءها فجعل فعلها طاعة لجميع المكلفين الى يوم القيامة“

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب رب تعالیٰ کے حضور دعا کی کہ اے اللہ ”ہمیں حج کے مناسک دکھا“ تو اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعا کو قبول کرتے ہوئے حج کے طریقہ اور نشانیاں آپ کو سکھا دیں پھر وہی طریقے نبی کریم ﷺ کی امت کے لئے بھی مقرر فرما دیئے گئے۔

صفا اور مروہ کے درمیان سعی شروع کرنے کی وجہ یہ ہے کہ حضرت ہاجرہ پر جب اپنی پیاس اور اپنے بچے کی پیاس کی وجہ سے معاملہ بے قراری کی حد تک پہنچ گیا تو آپ صفا پر چڑھتی ہیں دعا کرتی ہیں اور دیکھتی ہیں کوئی آبادی نظر آ جائے کوئی آدمی نظر آ جائے کہیں پانی نظر آ جائے۔

پھر وہاں سے مروہ پر آتی ہیں درمیان میں نشیبی جگہ جہاں سے بچہ نظر نہیں آتا وہاں آپ دوڑتی ہیں اسی طرح آپ نے سات چکر لگا دیئے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت، حضرت ہاجرہ کی دعاء حضرت اسماعیل علیہ السلام کی ایڑی کی رگڑ، اور حضرت جبریل کے پر مارنے سے زمزم کا چشمہ جاری کر دیا۔

آج وہی کام جو حضرت ہاجرہ نے کیا حاجیوں کے لئے واجب ہے حضرت ہاجرہ کے قدم لگنے سے ہی صفا اور مروہ اللہ تعالیٰ کی نشانیاں بن گئے بلکہ اس سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوا کی وجہ سے بھی ان دونوں مقامات کو عظمت مل چکی تھی۔

اس آیت کریمہ کا ماقبل سے تعلق: ابھی تک کی گئی بحث سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے حکم فرمایا ﴿فَاذْكُرُونِي اذْكَرْتُمْ﴾ تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد کروں گا۔ یہ حکم تمام عبادات کو شامل ہے اس کے بعد ہمیں حکم دیا:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ﴾

”اے ایمان والو نماز اور صبر سے امداد طلب کرو“

اس کے بعد جہاد کی رغبت دلائی کیونکہ شہداء کے مراتب اور ان کی زندگی بیان فرمائی پھر مصائب سے آزمائش اور ان پر صبر کرنے اور اس پر اجر عظیم عطا کرنے کا ذکر فرمایا۔ پھر اس آیت کریمہ میں صفا و مروہ کا ذکر فرمایا اور ان کے درمیان سعی کرنا جو عبادت اور باعث ثواب ہے۔ (از شیخ زادہ)

فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ أَوْ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ أَنْ يَطَّوَّفَ بِهِمَا :

تو جو شخص حج کرے بیت اللہ کا یا عمرہ کرے تو نہیں گناہ اس پر کہ سعی کرے ان دونوں کے درمیان۔
حج : کالغوی معنی ارادہ کرنا جس طرح کہا جاتا ہے ”رجل محجوج“ جب کہ کوئی شخص مقصود ہو اور کبھی کہا جاتا ہے ”مکان محجوج“ وہ جگہ جس کا ارادہ پایا جائے۔

”فكان الحج لما كان مقصودا بهذا النوع من العبادة سمي ذلك

الفعل حجا“

حج کو بھی حج اسی لئے کہا جاتا ہے کہ اس میں بیت اللہ شریف اور مقام عرفات اور دوسرے مقامات معظمہ کا ارادہ پایا جاتا ہے یعنی مقامات مقدسہ اس کا مقصود ہوتے ہیں اسی وجہ سے حج کا اصطلاحی معنی ہے ”القصود الى المعظم“ معظم مقامات کا ارادہ۔

”حج“ کالغوی معنی حلق کرنا (بال مونڈنا) بھی آتا ہے جیسے کہا جاتا ہے ”حج فلان ای حلق“ فلاں شخص نے بال منڈوائے۔ چونکہ حج میں بھی حلق کرایا جاتا (بال منڈوائے جاتے ہیں) اس لئے اسے حج کہہ لیا جاتا ہے ”حج“ کالغوی معنی کسی چیز کی طرف بار بار آنا جانا بھی آتا ہے:

”فمن زار البيت للحج فانه ياتيه اولا ليعرفه ثم يعود اليه للطواف ثم

ينصرف الى منى ثم يعود اليه لطواف الزيارة ثم يعود اليه لطواف الصدر“

جو شخص بیت اللہ شریف کی زیارت کا ارادہ کرتا ہے وہ پہلے بیت اللہ شریف کو دیکھنے کے لئے آتا ہے پھر اس کا طواف کرتا ہے پھر منی میں جاتا ہے پھر بیت اللہ شریف میں طواف زیارت کے لئے آتا ہے پھر بیت اللہ شریف میں طواف صدر کے لئے آتا ہے یعنی بیت اللہ شریف میں بار بار طواف کیلئے آنے جانے کی وجہ سے حج کو حج کہا جاتا ہے۔

علامہ رازی رحمہ اللہ نے اسی معنی کو ”اشبه للصواب“ (زیادہ درست) کہا ہے۔

اور فقہاء کرام نے قصد والا معنی ذکر کیا ہے راقم کو بھی اگرچہ علامہ رازی رحمہ اللہ کا قول ہی پسند ہے لیکن بار بار آنے جانے کی وجہ زیادہ معتبر راقم کو یہ بات نظر آتی ہے کہ ایک مرتبہ جو شخص حج کر لیتا ہے وہ بار بار حج کر سکے یا نہ کر سکے البتہ اس کے دل میں تڑپ پائی جاتی ہے وہ تمنا کرتا ہے کہ بار بار بیت اللہ

(ماخوذ از کبیر)

شریف کی زیارت کرے۔

عمرہ: کو عمرہ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ عمرہ کا معنی ”زیارت کرنا“ ہے یہ لفظ ”عمارة“ سے لیا ہوا ہے

چونکہ زیارت کرنے والا بھی مکان کو آباد کرتا ہے اس لئے اسے عمرہ کہا جاتا ہے (از روح المعانی)

عبدالقیس کے کلام میں مسجد، کلیہ، گرجا کو بھی عمرہ کہہ لیا جاتا ہے کیونکہ ان مقامات کی طرف بھی عبادت کرنے والے قصد کرتے ہیں مسلمان مسجد کا، یہود کلیہ کا اور عیسائی گرجا کا قصد کرتے ہیں۔

جناح: کا لغوی معنی ہے ”میلان کرنا“ جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿وَإِنْ جَنَحُوا لِلسَّلْمِ

فَاجْنَحْ لَهُا﴾ اور اگر وہ (کفار) صلح کی طرف میلان کریں تو تم میلان کرو اس کی طرف۔

”جنحت السفينة“ کشتی کا ڈولنا (میلان کرنا) جناح الطائر، پرندے کے پر۔ جناح کا معنی

زیادہ طور پر گناہ کر لیا جاتا ہے اس لئے کہ اس میں باطل اور گناہ کے کاموں کی طرف میلان پایا جاتا ہے۔

یطوف: طاء پر شد ہے اصل میں یتطوف ہے تاء کو طاء کر کے ادغام کیا گیا۔

طواف کا لغوی معنی پھیرے لگانا (چکر لگانا) اعلیٰ حضرت نے یہی ترجمہ کیا ہے۔ صرف طواف

کعبہ شریف کے ارد گرد پھیرے لگانے میں مشہور ہو چکا ہے اور سعی اگرچہ صفا اور مروہ کے درمیان نشی

جگہ میں تیز چلنے کا نام ہے لیکن صفا اور مروہ پر پھیرے لگانے کے لئے اصطلاح میں سعی زیادہ مشہور ہو

چکا ہے اس لئے راقم نے ترجمہ اس کے مطابق کر دیا ہے۔

سعی کرنا: ”عن صفیہ بنت شیبہ قالت اخبرتنی بنت ابی تجرة قالت دخلت مع نسوة

من قریش دار آل ابی حسین ننظر الی رسول اللہ ﷺ وهو یسعی بین الصفا والمروة

فرأیتہ یسعی وان منزرة لیدور من شدة السعی وسمعتہ یقول اسعوا فان الله کتب علیکم

السعی رواہ فی شرح السنة وروی احمد مع اختلاف“ (مشکوٰۃ باب دخول مکة والطواف)

صفیہ بنت شیبہ کہتی ہیں مجھے بنت ابی تجرة نے بتایا وہ کہتی ہیں میں قریش کی عورتوں کے ساتھ

آل ابی حسین کے گھر داخل ہوئی رسول اللہ ﷺ کو ہم دیکھ رہے تھے وہ صفا اور مروہ کے درمیان سعی فرما

رہے تھے میں نے آپ کو سعی کرتے ہوئے دیکھا کہ آپ کی چادر شدت سعی کی وجہ سے (آپ کے

پاؤں مبارک پر) چکر لگا رہی ہے اور میں نے آپ کو کہتے ہوئے سنا سعی کرو بیشک اللہ تعالیٰ نے تم پر سعی

کو لازم قرار دیا۔

☆ ”رواہ البیہقی بسند حسن بلفظ انه علیہ الصلوٰۃ والسلام استقبل الناس فی

المسعی وقال یا ایہا الناس اسعوا فان الله قد کتب علیکم السعی“

نبیہتی نے سند حسن سے روایت ذکر کی کہ بیشک نبی کریم ﷺ نے مقام سعی میں لوگوں کی طرف متوجہ ہو کر ارشاد فرمایا اے لوگو سعی کرو بیشک اللہ تعالیٰ نے تم پر سعی کو لازم کر دیا ہے۔

علامہ طیبی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ حدیث شریف میں ”کتب“ کا معنی ہے فرض کیا لہذا حدیث پاک اس پر دلالت کر رہی ہے۔ ”ان السعی فرض ومن لم یسع بطل حجہ“ بیشک سعی فرض ہے جس شخص نے سعی نہ کی اس کا حج باطل ہے یہی مذہب امام شافعی، امام مالک، امام احمد رحمہ اللہ کا ہے۔

”وقال ابو حنیفہ رحمہ اللہ السعی واجب لان الحدیث ظنی وکذا

المشی فیہ مع القدرة ویترک الواجب یجب دم“

امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ صفا و مروہ پر پھیرے لگانا واجب ہے اسی طرح نشیبی جگہ میں دوڑنا بھی واجب ہے کیونکہ حدیث ظنی ہے اگر کسی شخص نے صفا و مروہ پر چکر ہی نہ لگائے یا چکر تو لگا لئے لیکن نشیبی جگہ نہ دوڑ لگائی باوجود دوڑنے کی قدرت حاصل ہونے کے تو واجب چھوٹ گیا دم (جانور ذبح کرنا) واجب ہوگا۔

بعض صحابہ کرام سعی کو مستحب قرار دیتے ہیں۔ وہ حضرت ابن عباس اور ابن زبیر رضی اللہ عنہم ہیں اور تابعین میں سے بھی بعض حضرات کا یہی مذہب ہے۔ ان حضرات کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ أَنْ يَطَّوَّفَ بِهِمَا وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا﴾ اس میں صفا اور مروہ میں پھیرے لگانے سے گناہ کی نفی ہے اور بھلائی کا کام بطور نفل کرنے کا ذکر ہے۔

امام اعظم رحمہ اللہ کا اعظم مذہب: آپ فرماتے ہیں جب بعض حضرات سعی کو فرض قرار دیتے ہیں اور بعض حضرات سعی کو نفل قرار دیتے ہیں ”فالا وسط الا عدل انه واجب“ تو درمیان والی صورت ہی بہتر ہے وہ یہ ہے کہ سعی واجب ہے نہ فرض ہے نہ نفل۔

اعتراض: دارقطنی، ابن ابی شیبہ نے اس روایت کو ذکر کیا ہے اور صاحب تنقیح نے کہا ہے ”اسناہ

صحیح“ اس کی سند صحیح ہے تو اس حدیث کو ظنی کہہ کر وجوب ثابت کرنا فرض ثابت نہ کرنا کیسے صحیح ہے؟
جواب: ہم کہتے ہیں ”اذ مثله لا یزید علی افادۃ الوجوب“ اس قسم کی حدیث سے وجوب سے زیادہ کچھ ثابت نہیں ہو سکتا۔

”واما الرکن فانما یثبت عندنا بدلیل بہ فاثباتہ بهذا الحدیث اثبات بغیر دلیل“
فرضیت قطعی دلیل سے ہمارے نزدیک ثابت ہوتی ہے اس حدیث سے فرضیت ثابت کرنا بغیر دلیل کے ہوگا۔

اگر قطعی دلیل ہوتی تو صحابہ کرام اور تابعین سعی کے نفل ہونے کے قائل نہ ہوتے۔ (ماخوذ از مرقاۃ ج ۵ ص ۳۲۰)
”لا جُنَاحَ عَلَیْہِ“ سے فقط گناہ کی نفی ہے ﴿لَا جُنَاحَ عَلَیْہِ﴾ انہ لا اثم علیہ والذی یرصد علیہ انہ لا اثم فی فعلہ یدخل تحته الواجب والمندوبات والمباح“
﴿لَا جُنَاحَ عَلَیْہِ﴾ کا معنی یہ ہے کہ اس پر کوئی گناہ نہیں اس آیت کریمہ سے اتنا ہی سمجھ آتا ہے کہ اس فعل میں کوئی گناہ نہیں اس کے نیچے واجب اور مستحبات اور مباح داخل ہیں۔ ان تینوں میں سے جس کو بھی ثابت کرنا ہوگا اس آیت کے بغیر اور دلیل سے ثابت کرنا ہوگا۔ (از کبیر)
امام شافعی رحمہ اللہ نے فرضیت جس حدیث سے ثابت کی وہ اور اس کا جواب پہلے ذکر کیا جا چکا ہے۔

حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا اور اس کا جواب:

”وما روی مسلم عن عائشۃ انہا قالت لعمری ما اثم اللہ تعالیٰ حج من لم یسع بین الصفا والمروة ولا عمرته، لیس فیہ دلیل علی الفرضیۃ ایضا سلمنا لکنہ مذهب لہا والمسأله اجتہادیۃ فلا تلزم بہ علی انہ معارض بما اخرجہ الشعبي عن عروۃ بن مضرس الطائی انہ قال اتیت النبی ﷺ بالمزدلفۃ فقلت یا رسول اللہ جئت من جبل طی ما ترکک جبلا الا وقفت علیہ فهل لی من حج؟ فقال من صلی معنا هذه الصلوۃ ووقف معنا هذا الموقف وقد ادرك عرفة قبل ذلک لیلا او نهارا فقد تم حجہ وقضى تفثہ“

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں مجھے اپنی عمر کی قسم اس شخص کا حج اور عمرہ مکمل نہیں جس نے

صفا اور مروہ کے درمیان سعی نہیں کی۔

اس حدیث سے امام شافعی رحمہ اللہ فرضیت ثابت کرتے ہیں۔ لیکن ہم نے کہا کہ اس حدیث میں فرضیت پر کوئی دلالت نہیں پائی گئی۔ کیونکہ واجب کی ترک سے بھی کہا جاسکتا ہے کہ وہ کام مکمل نہیں ہوا کیونکہ واجب چھوٹ گیا۔ اگر ہم تسلیم کر بھی لیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سعی کی فرضیت کا مذہب رکھتی تھیں تو ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ ان کا مذہب تھا جو اجتہاد پر مبنی تھا۔

ہم اس سے فرضیت کو نہیں مانتے کیونکہ اس حدیث کے معارض عروہ بن مضر س طائی کی حدیث ہے جو سعی نے تخریج کی ہے وہ یہ ہے کہتے ہیں میں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں مزدلفہ میں حاضر ہوا میں نے کہا یا رسول اللہ میں طے پہاڑ سے آیا میں نے کوئی پہاڑ نہیں چھوڑا مگر یہ کہ میں اس پر ٹھہرا کیا میرا حج ہو گیا؟ تو آپ نے فرمایا جس شخص نے ہمارے ساتھ یہ نماز ادا کی اور ہمارے ساتھ اس مقام پر ٹھہرا اور وہ اس سے پہلے دن کو یا رات کو عرفات پر بھی ٹھہرا ہو تو اس نے اپنا حج مکمل کر لیا اور اپنے میل کچیل کو دور کر لیا۔

”فاخبر ﷺ بتمام حجه وليس فيه السعي بينهما ولو كان من

فروضه لبينه للسانه لعلمه بجهله“

نبی کریم ﷺ نے اس شخص کو حج کے مکمل کر لینے کی خبر دی لیکن اس میں سعی کا ذکر نہیں فرمایا اگر سعی فرض ہوتی تو آپ سائل کو ضرور بتاتے کیونکہ سائل نے پوچھا ہی اس لئے تھا کہ وہ نہیں جانتے تھے۔

(ار روح المعانی)

اعتراض: اس حدیث میں نبی کریم ﷺ نے طواف زیارت کا ذکر نہیں فرمایا حالانکہ وہ فرض ہے اسی طرح سعی کا ذکر نہیں فرمایا وہ فرض ہو جائے تو کیا حرج ہے؟

جواب: طواف زیارت ”دلالت النص“ سے سمجھ آ رہا ہے کیونکہ سائل نے مزدلفہ میں سوال کیا حضور ﷺ نے جب مزدلفہ میں اپنے ساتھ نماز میں شریک پایا تو واضح فرمایا کہ اس سے پہلے مقام عرفات پر وقوف (ٹھہرنا) لازم تھا اس پر جب تم ٹھہر چکے ہو تو پہلے فریضے احرام اور وقوف عرفات پر تو تمہارا عمل ہو چکا ہے۔ اب اس کے بعد تم نے ہمارے ساتھ ہی چلنا ہے آگے کے مسائل تم پر خود واضح ہوتے چلے

(احکام القرآن للحصاص مع الزیادة)

جائیں گے۔

سعی نفل نہیں بلکہ واجب ہے: نبی کریم ﷺ کا سعی کرنا ثابت ہے جب آپ اپنے حج میں سعی کرنے کی غرض سے صفا کے قریب گئے تو ارشاد فرمایا ﴿ إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللَّهِ ﴾ ابداء وابداء بما بدأ اللہ بہ “ بیشک صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں سے ہیں تم اسی سے ابتداء کرو جس سے رب تعالیٰ نے ابتداء فرمائی۔

نبی کریم ﷺ نے ابتداء صفا سے کی آپ صفا پر چڑھے یہاں تک کہ بیت اللہ شریف کو دیکھا:

” وَاذْثَبْتَ أَنَّهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ سَعَى وَجِبَ أَنْ يَجِبَ عَلَيْنَا السَّعَى لِلْقُرْآنِ

وَالْخَبَرِ ، أَمَّا الْقُرْآنُ فَقَوْلُهُ تَعَالَى ﴿ وَاتَّبِعُوهُ ﴾ وَأَمَّا الْخَبَرُ فَقَوْلُهُ عَلَيْهِ

السَّلَامُ ” خذوا عني مناسككم “

جب یہ ثابت ہو گیا کہ نبی کریم ﷺ نے سعی فرمائی تو ہم پر سعی کرنا قرآن پاک اور حدیث پاک سے واجب ہو گیا۔ کیونکہ قرآن پاک میں آپ کی تابعداری کرنے کا حکم دیا گیا ہے کہ ” تم ان کی تابعداری کرو “ اور حدیث پاک سے بھی ثابت ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ” تم مجھ سے اپنے حج کے مناسک سیکھ لو “ ﴿ اتَّبِعُوا ﴾ اور ﴿ خذوا ﴾ امر ہیں۔ امر وجوب کے لئے آتا ہے جب اس کے خلاف کوئی قرینہ نہ پایا جائے۔

اعتراض: جب رب تعالیٰ نے واضح طور پر سعی کے ساتھ ﴿ وَمِنْ تَطَوُّعٍ خَيْرًا ﴾ ذکر فرمادیا ہے تو اس سے پتہ چلتا ہے کہ سعی نفل ہے لہذا یہ کہنا کہ سعی نفل نہیں کیسے صحیح ہے؟

جواب: ﴿ وَمِنْ تَطَوُّعٍ خَيْرًا ﴾ سے سعی کے نفل ہونے پر دلیل پکڑنا ضعیف ہے۔

” لَانْ هَذَا لَا يَقْتَضِيْ اَنْ يَكُوْنَ الْمُرَادُ مِنْ هَذَا التَّطَوُّعُ هُوَ الطَّوَّافُ الْمَذْكُوْرُ “

یہاں جو ﴿ تَطَوُّعٍ ﴾ کا ذکر ہے اس سے مراد یہی سعی جس کا ذکر پہلے ہے ” مراد نہیں “ بلکہ اس سے مراد اور ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ﴿ وَعَلَى الَّذِينَ يَطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامِ مَسْكِيْنَ ﴾ یہاں سے شیخ فانی کو روزہ نہ رکھ سکنے کی وجہ سے فدیہ کو واجب قرار دیا۔ اس کے بعد ذکر فرمایا ﴿ فَمِنْ تَطَوُّعٍ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَهُ ﴾ اس سے یہ ثابت فرمایا کہ اگر مقرر حد سے زائد فقیر کو طعام دے

دیا گیا تو اس میں اور زیادہ ثواب حاصل ہوگا۔

اسی طرح یہاں بھی ذکر کرنے کا مقصد یہ ہے ”انہ یزید فی الطواف فیطوف اکثر من الطواف الواجب مثل ان یطوف ثمانیۃ او اکثر“ کہ وہ سعی میں سات پھیروں سے زیادہ ”آٹھ یا اس سے بھی زائد پھیرے لگا دے“۔ تو یہ نفل ہوں گے اسے ثواب حاصل ہوگا۔ اسے عبادت میں اس طرح کی زیادتی شمار نہیں کیا جائیگا (جیسا کہ نماز کی رکعتوں میں زیادتی منع ہے دو رکعت کو تین اور تین کو چار، اور چار کو پانچ رکعت ادا کرنا منع ہے) یا مراد یہ ہے:

”ان یتطوع بعد حج الفرض و عمرته بالحج و العمرة مرة اخرى حتى طاف بالصفاء و المروة تطوعاً“

کہ ایک مرتبہ فرض حج ادا کر کے یا احرام کی وجہ سے جو عمرہ اس نے اپنے آپ پر واجب کر دیا تھا وہ ادا کر لیا اس کے بعد حج یا عمرہ کرے وہ حج یا عمرہ چونکہ نفل عبادت ہوگی۔ لہذا اس میں سعی کو نفل کہنے کا یہ مطلب ہے کہ نفل عبادت کی سعی ہے اگرچہ وہ سعی بھی واجب ہوگی۔ (ماخوذ از کبیر)

ومن تطوع خیرا فان الله شاكر عليم: جس شخص نے طاعت کا فعل کیا خواہ فرض ہو یا نفل، یا فرض حج سے زائد ہو، یا عمرہ سے زائد ہو یا طواف میں زیادتی کرے یا نفل سعی کرے تو اس نے بھلائی کا کام کیا۔ بیشک اللہ تعالیٰ اسے ثواب عطا فرمائے گا کسی کا کوئی فعل اللہ تعالیٰ پر مخفی نہیں۔ (بیضاوی)

﴿شاكر﴾ کا لغوی معنی ”المظهر للانعام علیه“ جو اس پر انعام ہے اس کو وہ ظاہر کرنے والا ہو۔ یہ اللہ تعالیٰ کے حق میں محال ہے اس لئے اس لفظ کو جب رب تعالیٰ کے حق میں منسوب کیا جائے گا تو مجازی معنی ہوگا ”المجازی علی الطاعة“ کہ وہ طاعت پر جزاء دینے والا ہے۔

جزاء طاعت کو شکر کہنے کی وجوہ:

- (۱) ”ان اللفظ خرج مخرج التلطف للعباد مبالغة فی الاحسان الیہم“ اللہ تعالیٰ نے یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ اس کا اپنے بندوں پر بڑا احسان ہے اور وہ اپنے بندوں پر بہت مہربان ہے ”شاكر“ کے لفظ کو ذکر کیا جو درحقیقت یہ لفظ ان کے لئے استعمال ہوتا ہے جن پر احسان کیا جائے۔
- (۲) ”ان الشکر لما کان مقابلا للانعام او الجزاء علیہ سمی کل ما کان جزاء شکراً علی سبیل التشبیه“

بیشک شکر جب کہ انعام یا انعام پر جزاء کے مقابل استعمال ہوتا ہے تو ہر جزاء (ثواب) کو نشیہ کے طور پر جزاء سے تعبیر کر دیا گیا۔

(۳) اللہ تعالیٰ گویا کہ یہ کہتا ہے کہ میں تمہاری طاعت سے بے پرواہ ہوں مجھے اس کا کوئی نفع نہیں اگر بالفرض مجھے اس کا نفع ہوتا تو میں اس کا شکر گزار ہوتا "وبالجملة فالمقصود بیان ان طاعة العبد مقبولة عند الله تعالى وواقعة موقع القبول في اقصی الدرجات" حاصل کلام یہ ہے کہ بیان کرنا یہ مقصود ہے کہ بندے کی طاعت اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول ہے اور اسے اعلیٰ درجہ کا مقام قبولیت حاصل ہے۔

علیم : فالمعنى انه يعلم قدر الجزاء فلا يبخس المستحق حقه لانه تعالى عالم بقدره وعالم بما يزيد عليه من التفضل

اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ کس قدر یہ شخص جزاء کا مستحق ہے اس میں وہ کمی نہیں فرماتا بیشک اللہ تعالیٰ اس کی قدر کو بھی جانتا ہے اور جو زیادہ اس نے اپنا فضل عطا کرنا ہے اسے بھی جانتا ہے۔ (از کبیر)

نکتہ : اللہ تعالیٰ نے اپنی دو صفتوں کا ذکر کیا ایک "شاکر" اور دوسری "علیم"۔

"لان التطوع بالخير يتضمن الفعل والقصد فناسب ذكر الشكر باعتبار الفعل وذكر العلم باعتبار القصد"

اس لئے کہ بھلائی کا کام کرنا دو چیزوں سے متعلق ہوتا ہے ایک فعل یعنی اس پر عمل کرنا اور دوسرا قصد، یعنی اس کام کا ارادہ کرنا۔ اس لئے فعل کے اعتبار سے شکر ذکر کر دیا ہے اور قصد کے لحاظ سے علم کا ذکر کر دیا ہے۔ (روح المعانی)

خیال رہے کہ ﴿شاکر﴾ سے تعبیر کرنے کا مقصد یہ بھی ثابت کرنا ہے "مبالغة في الاحسان الى العباد" کہ رب تعالیٰ کا بندوں پر بہت بڑا احسان ہے اس لفظ میں مبالغہ پایا گیا ہے۔

اور اسی طرح ﴿علیم﴾ مبالغہ فی العلم بالاشياء فيعلم مقادير اعمالهم وکيفياتها فلا ينقص من اجورهم شيئا "اللہ تعالیٰ نے اپنی صفت "علیم" سے اشیاء کے علم میں مبالغہ بیان کیا ہے کہ وہ اعمال کی مقادیر کو جانتا ہے اور ان کی کیفیات کو جانتا ہے ان کے اجر میں کسی قسم کی کمی نہیں کرے گا۔

(از روح المعانی)

﴿ إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالْهُدَىٰ مِنْ
بَعْدِ مَا بَيَّنَّاهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتَابِ أُولَٰئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللَّهُ
وَيَلْعَنُهُمُ اللَّاعِنُونَ ☆ إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا وَأَصْلَحُوا وَبَيَّنَّوْا
فَأُولَٰئِكَ أَتُوبُ عَلَيْهِمْ وَأَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ﴾

(۱) ” بیشک وہ جو ہماری اتاری ہوئی روشن باتوں اور ہدایت کو چھپاتے ہیں بعد اس کے کہ لوگوں کے لئے ہم اس کتاب میں واضح فرما چکے ان پر اللہ کی لعنت ہے اور لعنت کرنے والوں کی لعنت۔ مگر وہ جو توبہ کریں اور سنواریں اور ظاہر کریں تو میں ان کی توبہ قبول فرماؤں گا اور میں ہی ہوں بڑا توبہ قبول کرنے والا مہربان۔“

(۲) ” بیشک وہ لوگ جو چھپاتے ہیں اس چیز کو جو نازل کی ہم نے یعنی واضح باتیں اور ہدایت، اس کے بعد جو بیان کیا ہے ہم نے اسے لوگوں کے لئے کتاب میں، ان لوگوں پر لعنت کرتا ہے اللہ اور لعنت کرتے ہیں ان پر لعنت کرنے والے۔ سوائے ان لوگوں کے جنہوں نے توبہ کی اور اصلاح کی اور واضح بیان کیا، تو ان لوگوں کی میں توبہ قبول کرتا ہوں، اور میں بڑا توبہ قبول کرنے والا رحم کرنے والا ہوں۔“

مختصر مطلب: اللہ تعالیٰ نے کتاب میں جن چیزوں کو لوگوں کے لئے واضح طور پر بیان فرما دیا ہے ان واضح اور روشن ارشادات کو اور ہدایت کو جو لوگ چھپاتے ہیں ان پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے اور لعنت کرنے والوں کی لعنت۔ ہاں البتہ وہ لوگ اس لعنت سے بچے ہوئے ہیں جنہوں نے توبہ کر لی اور اپنی اصلاح کر لی اور اللہ تعالیٰ کے ارشادات اور ہدایت کو واضح طور پر بیان کر دیا۔ ان لوگوں کی اللہ تعالیٰ توبہ قبول فرماتا ہے کیونکہ وہی بہت بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے وہی اپنے بندوں پر رحم فرمانے والا ہے۔

قدرے تفصیلی ذکر: آیہ کریمہ کے شان نزول میں چند احتمال ہیں۔

(۱) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول یہ ہے، انصار کے چند لوگ یہود کے پاس آئے، ان

کے اصحاب علم حضرات سے نبی کریم کی صفات کے متعلق پوچھا، اور کچھ احکام کے متعلق سوال کیا ”فکتموا فنزلت الآية“ تو انہوں نے چھپایا تو آیت کریمہ کا نزول ہوا۔

(۲) شان نزول میں دوسرا قول یہ ہے کہ یہ آیت کریمہ یہود اور نصاریٰ کے حق میں نازل ہوئی کہ دونوں فریق ہی حق کو چھپاتے تھے۔

(۳) ”انہ کلام مستانف یتناول کل من کتم شینا من الدین“ یہاں سے نئے کلام کو شروع کیا گیا ہے کہ ہر وہ شخص جو دین کے مسائل کو چھپاتا ہے وہی اس آیت کا مصداق ہے۔ اصل میں ان تین اقوال میں کوئی تعارض نہیں کیونکہ یہود نے بھی حق کو چھپایا اور نصاریٰ نے بھی۔ لہذا نزول کا سبب تو خاص تھا لیکن الفاظ کے عموم کے پیش نظر حکم عام ہے کوئی شخص بھی حق کو چھپائے گا تو اس پر یہی وعید ہوگی۔

”نزوله عند سبب معین لا یقتضی الخصوص علی ما ثبت فی اصول

الفقه ان العبرة بعموم اللفظ لا بخصوص السبب“

آیت کریمہ کا نزول کسی معین سبب کی وجہ سے تخصیص پیدا نہیں کرتا کیونکہ اصول فقہ میں یہ ضابطہ موجود ہے کہ اعتبار عموم لفظ کا ہوتا ہے خصوص سبب کا نہیں۔

”ثبت ایضا فی اصول الفقه ان ترتیب الحکم علی الوصف مشعر

بکون الوصف علة لذلك الحکم“

اصول فقہ میں یہ ضابطہ بھی موجود ہے کہ حکم کسی وصف پر مرتب ہوتا ہے جب کسی وصف میں اس حکم کے پائے جانے کی علت بننے کی صلاحیت ہو تو وہ حکم اس وصف پر ثابت ہوگا۔ جب کتمان حق (حق چھپانا) سبب ہے لعنت کا، تو اس حکم کو عام رکھنا ہی صحیح ہے اگرچہ بوجہ نزول خاص ہی کیوں نہ ہو۔

(از کبیر)

کتمان حق کب برا ہے: ”ان العالم اذا قصد کتمان العلم عسی، واذا لم یقصدہ لم یلزمہ التبلیغ اذا عرف انه مع غیرہ، واما من سئل فقد وجب علیہ التبلیغ لهذه الآية وللحدیث“

یشک جب علم کو ارادۃ چھپائے گا گنہگار ہوگا، جب مسائل کو چھپائے گا ارادۃ نہ ہو تو اس پر تبلیغ

لازم نہیں کیونکہ اسے معلوم ہے کہ میرے بغیر اور حضرات یہ فریضہ ادا کر رہے ہیں، ہاں اگر کسی سے کوئی مسئلہ پوچھا جائے تو اس پر لازم ہو جاتا ہے کہ وہ بیان کرے اس آیت کریمہ سے بھی یہی سمجھ آ رہا ہے اور احادیث سے بھی یہ مسئلہ واضح ہے انشاء اللہ آگے احادیث کا ذکر آ رہا ہے۔ (از قرطبی)

”الکتمان ترک اظهار الشئ مع الحاجة اليه وحصول الداعی الی اظهاره لانه متى لم یکن کذلک لا یعد کتماناً“

جب مسائل بیان کرنے کی حاجت ہو اور ان کو ظاہر کرنے کا مطالبہ پایا جائے تو ایسی صورت میں ان مسائل کو نہ بیان کرنا کتمان علم ہے لیکن جب اس قسم کی ضرورت نہ ہو تو کسی کے خاموش رہنے سے کتمان علم کی وعید اس پر صادق نہیں آئے گی۔ (از کبیر)

مقام توجہ : رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿مَا أَنزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالْهُدَىٰ﴾ آیت کریمہ میں ﴿الْبَيِّنَاتِ﴾ کا معنی کیا ہے؟ ”الآیات الواضحة الدالة علی الحق“ وہ آیات جو حق پر واضح دلائل ہیں ان کو ﴿بَيِّنَاتِ﴾ کہا جاتا ہے اور ﴿الْهُدَىٰ﴾ کا مطلب؟

”والمراد به ما یهدی الی الرشید مطلقاً ومنه ما یهدی الی وجوب اتباعه ﷺ والایمان به وهی الآیات الشاهدة علی صدقه علیه الصلوة والسلام“

جس چیز کے ذریعے بھلائی کی ہدایت مل جائے اسے ﴿الْهُدَىٰ﴾ کہا جاتا ہے لہذا وہ آیات جن سے نبی کریم ﷺ کی اتباع اور آپ پر ایمان لانے کی رہنمائی حاصل ہوا نہیں بھی ﴿الْهُدَىٰ﴾ کہا جاتا ہے اور وہ آیات جو واضح طور پر نبی کریم ﷺ کی صداقت پر دلالت کر رہی ہیں وہ بھی ﴿الْهُدَىٰ﴾ ہیں۔ (از روح المعانی)

اس سے واضح ہوا: جب رب تعالیٰ نے ﴿الْبَيِّنَاتِ وَالْهُدَىٰ﴾ ذکر فرمایا تو اسی سے واضح ہوا کہ جن چیزوں کی دین میں زیادہ ضرورت ہے کہ ان کو بیان کیا جائے۔ ان کو قصد اچھپانا اور کسی کے مسئلہ پوچھنے پر چھپانا کتمان حق ہے اسی طرح دنیاوی امور جن کو ظاہر کرنا ضروری ہو جائے مثال کے طور پر گواہی دنیا ضروری ہو تو گواہی نہ دینا بھی کتمان حق ہے۔

”وعلی هذا الوجه یمدح من یقدر علی کتمان السر لان الکتمان مما یشق علی النفس“

اسی سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ راز کو چھپانا اور ظاہر نہ کرنا اچھا کام ہے، کیونکہ راز کو ظاہر کرنا نفس پر شاق ہوتا ہے، لہذا وہ چیزیں جن کا ظاہر کرنا کسی نفس پر شاق گزرے ان سے اجتناب کتمان حق نہیں بلکہ قابل تعریف ہے۔

(از کبیر)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

”حفظت عن رسول اللہ ﷺ وعائین فاما احدهما فبشّته واما الآخر فلو بشّته قطع هذا البلعوم، اخرجه البخاری قال ابو عبد اللہ البلعوم مجری الطعام“

میں نے رسول اللہ ﷺ سے دو قسم کے یاد رکھنے والے مسائل یاد کئے ہیں ان میں سے ایک قسم کو میں نے بیان کر دیا ہے لیکن دوسری قسم کو بیان کر دوں تو میری حلقوم کٹ جائے۔ ابو عبد اللہ (بخاری رحمہ اللہ کی کنیت ہے) فرماتے ہیں ”البلعوم“ وہ رگ ہے جس سے طعام معدہ میں جاتا ہے۔ (از قرطبی) بعض شارحین نے تو یہ ہی بیان کیا ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے جن احادیث کو نہیں بیان کیا یہ وہی ہیں جن میں رسول اللہ ﷺ کے راز مذکور ہیں مرقاة اور نووی میں یہ وجہ مذکور ہے۔

تاہم علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے کہ جن احادیث کو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے نہیں بیان فرمایا ان کی اصل وجہ یہ ہے ”خاف علی نفسه فتنۃ او القتل“ کہ آپ کو یہ خطرہ تھا کہ اگر ان کو بیان کر دیا گیا تو مجھے مصیبتوں میں مبتلا ہونا پڑے گا یا مجھے قتل کر دیا جائے گا کیونکہ ان احادیث میں ”والنص علی اعیان المرتدین والمنافقین“ مرتدین اور منافقین کو معین کر کے ذکر کیا گیا ہے۔

(از قرطبی)

یہ مقامات کتمان حق میں نہیں آتے: ”لا يجوز تعليم الكافر القرآن والعلم حتی یسلم“ کافر کو قرآن پاک کی تعلیم دینا اور دیگر علوم کی اس وقت تک تعلیم دینا منع ہے جب تک وہ اسلام قبول نہ کر لے لہذا کافر کو تعلیم نہ دینا کتمان حق نہیں:

”وکذا لا يجوز تعليم المبتدع الجدل والحجاج لیجادل به اهل الحق“

اسی طرح بدعتی شخص یعنی دین کے خلاف امور کو رواج دینے والے کو تعلیم دینا جائز نہیں کیونکہ وہ تو ہے ہی جھگڑالو اور حجت باز اسے تعلیم دے کر اہل حق سے اور زیادہ جھگڑا کرنے پر قادر کرنا ہے لہذا

واضح ہوا کہ دین کے خلاف کام کرنے والے کو تعلیم نہ دینا کتمان حق نہیں۔

”ولا يعلم الخصم علی خصمه حجة یقطع بها ماله“ کوئی شخص اپنے مد مقابل جھگڑا کرنے والے کو ایسے دلائل کی تعلیم نہ دے جن کی وجہ سے وہ اس کا مال ہی ہتھیا لے۔

”ولا یرعلم السلطان تاویلا یتطرق به الی مکاره الرعية“ اور بادشاہ کو اس طرح کی تاویلات نہ سکھائے جن کی وجہ سے وہ رعیت کے لئے وبال جان ہی بن جائے۔

یہ تو صحیح تاویلات کا مسئلہ ہے غلط اور من گھڑت تاویلات سکھا کر بادشاہ کو ظالم بنانے والے اور اپنی عاقبت برباد کرنے والے بکاؤ مولویوں کا انجام کیا ہوگا۔

واضح ہوا کہ بادشاہ کو تاویلات کی تعلیم نہ دینا کتمان حق نہیں بلکہ رعیت پر مہربانی اور رحم ہے۔

”ولا ینشر الرخص فی السفهاء فیجعلوا ذلک طریقا الی ارتکاب المحظورات وترک الواجبات ونحو ذلک“

بے وقوفوں کو ایسے حیلے نہ سکھائے جن کی وجہ سے وہ شریعت میں ممنوع چیزوں کے مرتکب ہو جائیں اور واجبات کو چھوڑنے کے وہ مرتکب ہو جائیں۔

واضح ہوا کہ بے وقوفوں کو کھلی چھٹی دے کر ممنوعات کا مرتکب بنانا اور واجبات کو چھوڑنے والا بنانا منع ہے۔

یعنی بے وقوفوں کو حیلے، جھٹیں نہ سکھانا کتمان حق نہیں بلکہ حق ہے۔

☆ ”یروی عن النبی ﷺ انه قال ، لا تمنعوا الحکمة اهلها فتظلموهم ولا تضعوها فی غیر اهلها فتظلموها“

نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ جو لوگ علم حاصل کرنے کے اہل ہیں ان سے علم دور نہ رکھو ورنہ تمہاری طرف سے ان پر ظلم ہوگا۔ اور جو علم حاصل کرنے کے اہل نہیں ان کو علم سکھاؤ نہیں ورنہ ان پر ظلم ہوگا۔

ارشاد مصطفوی سے واضح ہوا کہ بدطینت کو علم سکھا کر لوگوں کو مصیبت میں ڈالنا ہے کیونکہ اس

سے خیر کی توقع نہیں ہو سکتی۔ وہ لوگوں کو گمراہ کرے گا ہدایت نہیں دے سکے گا۔

☆ ”وروی عنہ ﷺ انه قال لا تعلقوا الدر فی اعناق الخنازیر، یرید تعلیم الفلک من لیس من اہلہ“

نبی کریم ﷺ نے فرمایا خنزیروں کی گردنوں میں موتی نہ ڈالو۔ اس سے بھی مراد یہ ہے کہ جو فقہ کا علم حاصل کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا اسے نہ تعلیم دو۔ سبحان اللہ کیا ہی خوب تشبیہ ہے کہ نا اہل لوگ ناپاک ہیں ان کو پاک علم کی تعلیم دے کر ان کو اور زیادہ پاک لوگوں کے لئے مصیبت کا سبب بنانا ہے۔

(از قرطبی)

کتمان علم پر وعید: ”عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ ﷺ من سئل عن علم علمہ ثم کتمہ الجہنم یوم القیامۃ بلجام من نار“

(رواہ احمد و ابودؤد و الترمذی و رواہ ابن ماجہ عن انس، مشکوٰۃ کتاب العلم)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص سے علم کے متعلق سوال کیا گیا اس نے علم حاصل کیا پھر اسے چھپایا قیامت کے دن اسے آگ کا لگام ڈالا جائے گا۔ حدیث شریف میں ذکر ہے ”الجہنم“ لگام منہ میں ڈالا جاتا ہے، ”علم اور کلام بھی منہ سے نکلتے ہیں اس لئے جب اس سے سوال کیا جائے، وہ علم کو چھپائے تو منہ میں ہی لگام بھی ڈالا جائے گا۔

اور یہ واضح ہوتا ہے کہ حیوان سے تشبیہ دی گئی کیونکہ عالم کے لئے حق بات کو چھپانا اور بوقت ضرورت بیان نہ کرنا ایسا ہی ہے جیسا کہ حیوان ہو، وہ بے سمجھ ہے یہ بھی گویا کہ بے سمجھ ہے۔

تنبیہ: اس حدیث کو ابن حبان اور ابویعلیٰ نے بھی بیان کیا ہے اور اس کو تائید سخاوی رحمہ اللہ کی مقاصد حسنہ کی روایت سے ملتی ہے وہ یہ ہے ”من کتم علما یعلمہ الجہنم یوم القیامۃ بلجام من نار لجماعۃ“ اس حدیث کو ترمذی نے حسن کہا اور حاکم نے صحیح کہا ہے۔

زین العرب نے مندرجہ بالا حدیث پر خطابی کی تابعداری کرتے ہوئے یہ جو کہا

”وقد تکلم فی هذا الحدیث بعض العلماء بانہ ضعیف بل هو موضوع“

(از مرقاۃ)

(کہ یہ حدیث ضعیف ہے یا موضوع ہے)

راقم کے نزدیک زین العرب کا قول یقیناً علامہ علی قاری رحمہ اللہ کے نزدیک بھی غیر معتبر ہے

کیونکہ انہوں نے اس قول کو نقل کرنے کے بعد ”المقاصد الحسنة للسخاوی“ کی روایت کو نقل کیا اور کہا ہے ”وحسنہ الترمذی وصححه الحاکم“ کاش کہ ایک پہلو کو دیکھنے والے مسائل کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا کریں۔

☆ ”عن عائشة رضي الله عنها انها قالت من زعم ان محمدا عليه الصلوة والسلام كتم شيئا من الوحي فقد اعظم الفرية على الله والله تعالى يقول ان الذين يكتُمون ما انزلنا من البينات الخ“

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں جن لوگوں نے گمان کیا کہ بیشک محمد ﷺ نے وحی سے کچھ چیزوں کو چھپایا انہوں نے اللہ تعالیٰ پر بہت بڑا بہتان باندھا۔ پھر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے یہی آیت پڑھی:

”إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالْهُدَى“ (از کبیر)

سبحان اللہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا کلام کتنا ہی علم کا دریا ایک کوزہ میں بند ہے۔ جب وحی کے چھپانے کی نسبت نبی کریم ﷺ کی طرف کی جائے تو یہ اللہ تعالیٰ پر بہت بڑا افتراء ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا نبی اللہ کے حکم کی خلاف ورزی کرے یہ ممکن ہی نہیں۔ جب رب تعالیٰ نے علم کو چھپانے والوں کی مذمت بیان کی اور ان کو لعنت کا مستحق قرار دیا تو اللہ تعالیٰ کے نبی سے کتمان علم کا گمان کرنا درحقیقت رب تعالیٰ پر افتراء کہ اس کا نبوت کا انتخاب غلط ہے۔ (معاذ اللہ)

☆ ”عن ابی ہریرۃ رضي الله عنه قال لو لا آية في كتاب الله تعالى ما حدثت احدا بشئني ابدا ثم تلا هذه الآية“ (رواه البخاری وابن ماجہ وغیرہما)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں اگر اللہ تعالیٰ کی کتاب (قرآن مجید) میں ایک آیت نہ ہوتی تو میں کسی کے سامنے کوئی ایک حدیث بھی نہ بیان کرتا پھر آپ نے یہی (زیر بحث) آیت پڑھی۔

(روح المعانی)

مِنْ بَعْدِ مَا بَيَّنَّاهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتَابِ: جس طرح شان نزول میں اقوال پیش کئے جا چکے ہیں ان کے مطابق اگر ﴿الْكِتَابِ﴾ سے مراد توراۃ ہو اور اس میں جو بیان کیا گیا ہے اس سے مراد نبی کریم ﷺ ہوں ”فعلى هذا يكون المراد بالناس علماء بنی اسرائیل“ تو ﴿النَّاسِ﴾

سے مراد بنی اسرائیل کے علماء ہوں گے۔

”ومن قال ان المراد بالكتاب جميع ما انزل الله على الانبياء من الاحكام قال المراد بالناس العلماء كافة“

جن حضرات نے یہ کہا کہ ”کتاب“ سے مراد تمام انبیاء کرام پر نازل ہونے والے احکام ہیں انہوں نے کہا کہ ﴿النَّاسُ﴾ سے مراد ہر زمانہ کے تمام علماء کرام ہیں۔ (خازن)

ابو السعد رحمہ اللہ نے ﴿الناس﴾ کو عام رکھا ہے کہ تمام لوگوں پر جو بیان کیا گیا۔

أُولَئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللَّهُ: ”ان لوگوں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے۔

﴿أُولَئِكَ﴾ کا اشارہ ﴿إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مِنَ الْآيَاتِ﴾ ”بیشک وہ لوگ جو آیات کو چھپاتے ہیں“ کی طرف ہے۔ (خازن) ﴿يَلْعَنُهُمُ اللَّهُ﴾ اللہ ان کو اپنی رحمت سے دور کرتا ہے ”واصل اللعن فی اللغة الطرد والابعاد“ اصل میں لغت میں لعنت کا معنی ہی ”ہانکنا“ اور دور کرنا ہے۔ (خازن)

طلباء کرام توجہ فرمائیں: پہلے بیان ہوا ﴿من بعد بيناه﴾ جمع متکلم کا صیغہ ہے ”بینا“ اب اس کے مطابق ”نلعنهم“ ہونا چاہئے تھا لیکن غائب کا صیغہ اور فاعل اسم ظاہر لفظ ”اللہ“ ذکر فرمایا اس میں تکلم سے غیب کی طرف التفات پایا گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے:

”والالتفات الى الغيبة باظهار اسم الذات لتربية المهابة والاشعار بان مبدأ صدور اللعن صفة الجلال المغائرة لما هو مبدأ الانزال والتبيين من صفة الجمال“

کہ یہ بتانا مقصود ہے کہ لعنت کا صدور رب تعالیٰ کی صفت جلال سے متعلق ہے اس لئے رب تعالیٰ نے اپنا اسم گرامی ذکر فرمایا جو تمام صفات کمالیہ پر دلالت کرتا ہے ان صفات میں صفت جلالیہ بھی ہے۔ لیکن احکام و آیات کو نازل کرنا اور ان کو بیان کرنا صفت جمال ہے۔

اس لئے ان کے بیان میں متکلم کا صیغہ ذکر کیا تا کہ یہ بھی واضح ہو جائے کہ دونوں ایک دوسرے کے مغائر ہیں۔

ويلعنهم اللاعنون: ”اور لعنت کرتے ہیں ان پر لعنت کرنے والے“

لعنت کرنے والے کون ہیں؟ اس میں عموم پایا گیا ہے کہ ان پر فرشتے لعنت کرتے ہیں اور تمام لوگ ان پر لعنت کرتے ہیں۔ جن میں انبیاء کرام اور صالحین حضرات بھی ہیں۔ (کبیر)

﴿يَلْعَنُهُمُ اللَّاعِنُونَ﴾ کی تفسیر میں جلالین میں مذکور ہے:

”الملائكة والمؤمنون او كل شئ بالدعاء عليهم باللعنة“

ان پر ملائکہ اور مؤمنین لعنت کرتے ہیں بلکہ ہر چیز ان پر لعنت کی دعا کرتی ہے۔

”او کل شئی“ جلالین کی عبارت کی وضاحت صاوی میں یوں کی گئی ہے ”ای حتی

الجمادات والحیتان فی البحر“ ہر چیز سے مراد جمادات اور دریا کی مچھلیاں ہیں۔

اس پر حدیث پاک شاہد ہے ”العاصی یلعنه کل شئ حتی الحیتان فی البحر“

گنہگار شخص پر ہر چیز لعنت کرتی ہے یہاں تک کہ دریا میں مچھلیاں بھی اس پر لعنت کرتی ہیں۔

خیال رہے ”او کل شئی“ میں ”او“ تنویع کے لئے ہے شک کے لئے نہیں، اسی لئے

راقم نے اس کا ترجمہ ”بلکہ“ کیا ہے۔ (از جلالین و صاوی)

”وقال مجاهد وعكرمة هم الحشرات والبهائم يصيبهم الجذب

بذنوب علماء السوء الكاتمين فيلعنونهم“

مجاہد اور عکرمہ کا قول یہ ہے کہ حشرات الارض (سانپ، بچھو، کیڑے مکوڑے وغیرہ) اور

چوپائے ان پر لعنت بھیجتے ہیں کیونکہ علماء سوء (برے علماء) حق کو چھپانے والوں کی نحوست کی وجہ سے وہ

قط میں مبتلاء ہو جاتے ہیں انہیں پانی میسر نہیں ہوتا۔ (قرطبی)

براء بن عازب اور ابن عباس رضی اللہ عنہم کا استدلال:

”اللاعنون كل المخلوقات ما عدا الثقلين الجن والانس وذلك ان

النبي ﷺ قال، الكافر اذا ضرب في قبره فصاح سمعه الكل الا

الثقلين ولعنه كل سامع“

”لاعنون“ سے مراد تمام مخلوق ہے سوائے ثقلین یعنی جنوں اور انسانوں کے۔

اس پر دلیل یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کافر کو جب قبر میں مارا جاتا ہے تو تمام مخلوق اس کے چلانے کو سنتے ہیں سوائے ثقلین (جن وانس) کے اور ہر سننے والا اس پر لعنت بھیجتا ہے (فرطی)

یہ استدلال معتبر نہیں کیونکہ قبر کے عذاب کو جنوں اور انسانوں سے مخفی رکھنے کی یہ وجہ ہے کہ دنیا امتحان کا مقام ہے اگر ان پر عذاب ظاہر ہو جائے تو سب نیک ہو جائیں امتحان کا مقصد فوت ہو جاتا ہے سننے والوں کی لعنت کا ذکر ہے نہ سننے والوں کا لعنت نہ بھیجنے کا ذکر نہیں بلکہ آنے والی آیت میں کفار پر ملائکہ اور تمام انسانوں کی لعنت کا ذکر ہے۔

عربی گرامر کا قانون: جب ذوی العقول اور غیر ذوی العقول پر اجتماعی طور پر کسی لفظ کا اطلاق ہو تو ذوی العقول کو غالب سمجھتے ہوئے قاعدہ تغلیب جاری کرتے ہیں الفاظ اس طرح ذکر کریں گے جو ذوی العقول کے لئے استعمال ہوتے ہیں جیسے ﴿الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ﴾ میں ”عالمین“ جمع یا ”نون“ سے آئی ہوئی ہے جو ذوی العقول کے لئے آتی ہے۔

اگر صرف غیر ذوی العقول کے لئے الفاظ کا استعمال کیا جائے لیکن صیغے جمع مذکر کے ہوں یا جمع مذکر سالم کا استعمال ہو تو پہلے غیر ذوی العقول کو ذوی العقول کے درجے میں رکھا جاتا پھر ان کے مناسب صیغے استعمال کئے جاتے ہیں جیسے:

﴿وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ رَأَيْتُهُمْ لِي سَاجِدِينَ ، يَا أَيُّهَا النَّاسُ ادْخُلُوا مَسَاجِدَكُمْ ، وَقَالُوا لَجُلُودِهِمْ لَمْ شَهِدْتُمْ عَلَيْنَا ، وَكُلٌّ فِي فُلْكَ يَسْبَحُونَ﴾

”لا عنون“ کا اطلاق جب ذوی العقول اور غیر ذوی العقول تمام پر ہوگا تو قاعدہ تغلیب جاری ہوگا۔ اگر براء بن عازب اور ابن عباس رضی اللہ عنہما کے استدلال کو دیکھا جائے کہ صرف غیر ذوی العقول کو شامل ہے تو دوسرا قانون جاری ہوگا۔

﴿إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا وَأَصْلَحُوا وَبَيَّنُوا فَاُولَٰئِكَ أَتُوبُ عَلَيْهِمْ وَأَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيمُ﴾
”سوائے ان لوگوں کے جنہوں نے توبہ کی اور اصلاح کی اور واضح بیان کیا تو ان لوگوں کی میں توبہ قبول کرتا ہوں اور میں بڑا توبہ قبول کرنے والا، رحم کرنے والا ہوں۔“

پہلے ذکر فرمایا کہ جو لوگ آیات کو چھپاتے ہیں وہ لعنت کے مستحق ہیں اس سے استثناء کرتے ہوئے فرمایا

ہاں وہ لوگ اس لعنت سے دور رہیں گے جنہوں نے توبہ کر لی اور اپنی اصلاح کر لی اور واضح بیان کیا تو ان لوگوں کی میں توبہ قبول کرتا ہوں میں بڑا توبہ قبول کرنے والا، رحم کرنے والا ہوں۔

توبہ میں صرف یہ کہنا دینا کافی نہیں میں نے توبہ کی ”حتیٰ یظهر منه فی الثانی خلاف الاول“ یہاں تک کہ وہ جس کام سے توبہ کر رہا ہے اس کے خلاف کام پر عمل کرے۔ اگر مرتد ہو گیا تھا تو اس کی توبہ یہ ہے اسلام کی طرف لوٹے اور شرائع اسلام کو ظاہر کرے۔

اگر گنہگار اپنے گناہوں سے توبہ کر رہا ہے تو اس کی توبہ یہ ہے کہ وہ نیک اعمال پر عمل کرے گناہوں کو چھوڑ دے۔ اور اگر بت پرست تھا تو اس کی توبہ یہ ہے کہ بت پرستوں سے اجتناب کرے اور اہل اسلام سے مل جائے۔ اسی طرح جس کام سے توبہ کر رہا ہو اس کو چھوڑ دے اور اس کے خلاف پر عمل کرے۔ (قرطبی)

اللہ تعالیٰ نے جب کتمان آیات پر عظیم وعید فرمائی تو اس سے وہم ہوتا تھا کہ شاید یہ وعید ان کو ہمیشہ لاحق رہے گی تو اس کا ازالہ فرمایا کہ ”اذا تابوا تغیر حکمهم ودخلوا فی اهل الوعد“ جب وہ توبہ کر لیں گے تو اہل وعد میں داخل ہو جائیں۔

خیال رہے وعید کا استعمال عذاب کے لئے ہے اور وعد کا استعمال ثواب کے لئے ہے جب توبہ کا مطلب ہے ”ان لا توبة عبارة عن الندم علی فعل القبیح“ کہ برے فعل پر نادم ہو جانا۔ پھر توبہ میں اخلاص ضروری ہے یعنی ”لا بدله بعد التوبة من اصلاح ما افسده“ جو فساد کے کام کئے تھے ان میں اصلاح پیدا کرنا درحقیقت توبہ میں اخلاص ہے اسی لئے رب تعالیٰ نے ﴿تَابُوا﴾ کے بعد ﴿وَاَصْلَحُوا﴾ ذکر فرمایا۔

پھر یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ ”ان التوبة لا تحصل الا بترك كل ما ينبغي وبفعل كل ما ينبغي“ بیشک توبہ یہ ہے کہ تمام غیر مناسب کاموں کو چھوڑ دینا اور جو مناسب کام ہیں ان پر عمل کرنا۔

اسی لئے رب تعالیٰ نے ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یُكْتُمُونَ مِنَ الْبَیِّنَاتِ﴾ کے بعد توبہ کرنے والوں کا ذکر فرماتے ہوئے بیان فرمایا ﴿وَبِیْنُوا﴾ کہ ان کی توبہ تب قبول ہوگی جب وہ کتمان آیات کو چھوڑ کر

(از کبیر)

ان کو واضح طور پر بیان کرنا شروع کریں گے۔

معتزلہ کا مذہب: آیہ دلالت کرتی ہے کہ بعض گناہوں سے توبہ اور بعض گناہوں پر قائم رہنا توبہ نہیں "لأن قوله تعالى ﴿وَأَصْلَحُوا﴾ عام فی الكل" اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿وَأَصْلَحُوا﴾ یہ عام ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ تمام کام اچھے کرے۔

اہل سنت کا مذہب یہ ہے کہ جس گناہ سے توبہ کرے اسے چھوڑ دے اور اس کے خلاف اچھا کام کرے تو اس گناہ کی توبہ قبول ہو جاتی ہے اگرچہ دوسرے گناہ، گناہ ہی ہیں۔ "ان اللفظ المطلق يكفى فى صدقه حصول فرد واحد من افرادہ" بیشک مطلق لفظ کا ایک فرد پر صادق آنا بھی کافی ہے۔

اور دلیل یہ ہے کہ توبہ کا قبول کرنا عقلاً واجب نہیں رب تعالیٰ اپنے فضل سے توبہ قبول کرتا ہے اور اسی وجہ سے رب تعالیٰ نے "ذكر ذلك فى معرض الممدح والثناء على نفسه ولو كان ذلك واجبا لما حسن هذا الممدح" توبہ کی قبولیت کو اپنی ذات کے مقام مدح و ثناء میں ذکر فرمایا اگر توبہ قبول کرنا رب تعالیٰ پر واجب ہوتا تو اسے مقام مدح میں ذکر نہ کیا جاتا۔

جب رب تعالیٰ پر توبہ قبول کرنا واجب نہیں بلکہ اپنے فضل و کرم سے توبہ قبول فرماتا ہے تو اس کی شان کریمی کے یہی لائق ہے کہ بندہ جس گناہ سے توبہ کرے اسے قبول فرمالے اگرچہ وہ کسی اور گناہ میں مبتلا ہی کیوں نہ ہو۔

اور دلیل یہ ہے کہ "معنى ﴿أَتُوبُ عَلَيْهِمْ﴾ اقبل توبتهم وقبول التوبة يتضمن ازالة عقاب ماتاب منها" ﴿أَتُوبُ عَلَيْهِمْ﴾ کا معنی یہ ہے کہ میں ان کی توبہ قبول کرتا ہوں، توبہ کا قبول کرنا یہی تو ہے کہ جس گناہ سے توبہ کرے اسے رب تعالیٰ اپنے فضل سے قبول فرمالے۔

(ماخوذ از کبیر)

اعتراض: ﴿فَأُولَٰئِكَ أَتُوبُ عَلَيْهِمْ﴾ کا معنی توبہ کی قبولیت پر جزاء اور ثواب دینا کیوں نہیں مراد لیا جاتا جیسا کہ طاعت کی قبولیت پر جزاء اور ثواب دینا مراد لے لیا جاتا ہے۔

جواب: طاعت کا فائدہ ہی استحقاق ثواب ہے اس کے بغیر اور کوئی استحقاق نہیں یہی غرض ہے اس

کے فعل کی لیکن توبہ کی قبولیت اصل میں عذاب کے دور کرنے کے لئے وضع ہے اور وہی اس کے فعل کی غرض ہے۔ ہاں البتہ اگر تمام گناہوں سے توبہ کر لی تو مستحق ثواب بھی ہو گیا لیکن یہ مجازی معنی ہے۔

وانا التواب الرحیم: ﴿التَّوَابُّ﴾ القابل لتوبة كل ذی توبة فهو مبالغة فی هذا الباب “ ﴿التَّوَابُّ﴾ کا مطلب ہے ہر توبہ قبول کرنے والے کی توبہ قبول کرنے والا یہ مبالغہ کا صیغہ ہے۔ اسی وجہ سے اعلیٰ حضرت نے ترجمہ کیا (بڑا توبہ قبول کرنے والا) راقم نے بھی یہی نقل کیا۔ اس کے بعد ﴿الرَّحِيمُ﴾ ذکر کیا جس سے واضح کیا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر رحم کرنے والا ہے وہ گناہ بھی کرتے ہیں اور اعمال میں کوتاہیاں بھی لیکن اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ان کی توبہ قبول فرماتا ہے۔

(از کبیر)

مسئلہ: ” لا خلاف فی جواز لعن الکفار فاما الکافر المعین فقد ذهب جماعة من العلماء انه لا يلعن لانا لا ندری بما یختتم الله له “

کافروں پر لعنت کرنے کے جواز میں کوئی اختلاف نہیں البتہ کسی معین کافر کا نام لے کر لعنت جائز نہیں کیونکہ ہمیں علم نہیں کہ اس کا خاتمہ ایمان پر ہوا یا کفر پر (صابونی)

ہاں البتہ جن لوگوں کا کفر قرآن پاک اور حدیث پاک سے یقینی طور پر ثابت ہے ان پر شخصی لعنت بھی جائز ہے جیسا کہ ابو جہل، ابولہب، فرعون وغیرہ۔

خیال رہے مسلمان خواہ کتنا ہی گنہگار کیوں نہ ہو اس پر لعنت اس معنی کے لحاظ سے جائز نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مطلقاً محروم رہے البتہ گنہگار کے لئے رحمت خاصہ سے محرومیت کے معنی میں لعنت جائز ہے۔ (راقم)

گزشتہ سے پیوستہ: ” عن مجاهد فی قوله ویلعنهم اللاعنون قال ان البهائم اذا اشتدت علیهم السنة قالت هذا من اجل عصاة بنی آدم لعن الله عصاة بنی آدم “

حضرت مجاہد نے ﴿وَيَلْعَنُهُمُ اللَّاعِنُونَ﴾ کی تفسیر میں ذکر کیا ہے کہ چوپاؤں پر جب سال سخت ہو جاتا ہے یعنی قحط پڑ جاتا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ یہ گنہگار انسانوں کی نحوست کی وجہ سے تو وہ کہتے ہیں اللہ کی لعنت ہو گنہگار انسانوں پر۔

(درمنثور)

☆ ” عن مجاهد فی قوله تعالى ﴿وَيَلْعَنُهُمُ اللَّاعِنُونَ﴾ قال دواب الارض العقارب

والخنافس يقولون انما منعنا القطر بذنوبهم فيلعنونهم ، اخرجہ ابو نعیم فی الحلیۃ والبیہقی فی شعب الایمان “

حضرت مجاہد نے اللہ تعالیٰ کے ارشاد ﴿وَيَلْعَنُهُمُ اللَّاعِنُونَ﴾ کی تفسیر میں ذکر کیا کہ زمین پر چلنے والے تمام جانور یہاں تک کہ بچھو اور بھونڈ بھی کہتے ہیں کہ ہمیں پانی کے قطرہ سے ان لوگوں کے گناہوں کی وجہ سے محروم کر دیا گیا ہے ان پر اللہ کی لعنت ہو۔ (درمنثور)

☆ ”عن ابن مسعود فی هذه الآية قال هو الرجل يلعن صاحبه فی امر یری ان قد اتی الیه فترفع اللعنة فی السماء سريعا فلا تجد صاحبا التي قيلت له اهلا فترجع الى الذي تكلم بها فلا تجده لها اهلا فتطلق فتقع على اليهود فهو قوله ﴿وَيَلْعَنُهُمُ اللَّاعِنُونَ﴾ فمن تاب منهم ارتفعت عنه اللعنة “

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے اس آیت کی تفسیر میں ذکر کیا ہے کہ جب کوئی شخص کسی پر لعنت بھیجتا ہے تو وہ لعنت جلدی ہی آسمانوں کی طرف بلند ہوتی ہے جس شخص پر لعنت کی گئی اگر وہ لعنت کا مستحق نہ ہو تو وہ اس شخص کی طرف لوٹ کر آتی ہے جس نے لعنت کی اگر وہ بھی مستحق نہ ہو تو وہ لعنت چلتے چلتے یہود پر واقع ہو جاتی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ﴿وَيَلْعَنُهُمُ اللَّاعِنُونَ﴾ ہاں اگر کوئی شخص ان سے توبہ کر لے تو وہ لعنت اس سے اٹھ جاتی ہے۔ جیسا ﴿إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا﴾ سے سمجھ آیا۔ (درمنثور)

☆☆☆☆☆

﴿ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَمَاتُوا وَهُمْ كُفَّارٌ أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ ﴾ خَالِدِينَ فِيهَا لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُونَ ﴿

- (۱) ” بیشک وہ جنہوں نے کفر کیا اور کافر ہی مرے ان پر لعنت اللہ اور فرشتوں اور آدمیوں سب کی ہمیشہ رہیں گے اس میں نہ ان پر سے عذاب ہلکا ہوا اور نہ انہیں مہلت دی جائے۔“
- (۲) ” بیشک وہ جنہوں نے کفر کیا اور مر گئے ایسے حال میں کہ وہ کافر تھے، وہ لوگ ان پر لعنت اللہ اور فرشتوں اور لوگوں سب کی ہمیشہ رہیں گے وہ اس میں نہیں تخفیف کی جائے گی ان سے عذاب کی اور نہ ان کو مہلت دی جائے گی۔“

اس آیت کریمہ میں دو احتمال ہیں ایک یہ ہے کہ اس میں استیناف (نیا کلام) پایا جائے اور حکم عام کافروں کو شامل ہے کہ تمام کافر جن کی موت کفر پر آئے ان پر اللہ اور فرشتوں اور تمام لوگوں کی لعنت ہے۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہ آیت ﴿ إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ ﴾ پر مرتب ہے اب مطلب یہ ہوگا کہ وہ لوگ جو واضح مسائل و احکام اور ہدایت کو چھپاتے ہیں ان کی زندگی میں ان پر لعنت ہو پھر ان میں سے توبہ کرنے والوں کا حال ذکر کیا پھر ذکر کیا کہ جن کی موت بغیر توبہ کے حالت کفر پر آ جائے ان پر لعنت ہے اللہ اور فرشتوں اور تمام لوگوں کی ” فكَأَنَّهُ قِيلَ إِنَّهُمْ مَلْعُونُونَ حَالِ الْحَيَاةِ وَبَعْدَ الْمَوْتِ الْأَمِنْ تَابَ مِنْهُمْ “ گویا کہ یہ کہا گیا ہے کہ کتمان آیات والے زندگی میں اور موت کے بعد لعنت کے مستحق ہیں سوائے انکے جنہوں نے ان میں سے توبہ کر لی۔

زمخشری نے بھی یہ ذکر کیا ہے ” لَعْنَتُهُمْ أَحْيَاءُ وَلَعْنَتُهُمْ أَمْوَاتًا “ ان پر لعنت ہے حالت حیات میں بھی اور حالت ممات میں بھی۔

اعتراض : جب پہلے بھی ذکر ہو چکا ہے ﴿ أُولَٰئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللَّهُ ﴾ تو پھر ﴿ أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللَّهِ ﴾ کے ذکر کا کیا فائدہ ہے۔

جواب: پہلے جملہ میں خبر جملہ فعلیہ ہے جو حدوث اور تجدد پر دلالت کرتا ہے دوسرے جملہ میں خبر اسم ہے جو دوام و استمرار پر دلالت کرتا ہے اس لئے ﴿أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمُ لَعْنَةُ اللَّهِ﴾ کا مطلب یہ ہے ”استقر علیہم اللعن من اللہ“ ان پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہمیشہ کے لئے ثابت ہے۔

(از شیخ زادہ و بیضاری)

تنبیہ: ﴿وَهُمْ كُفَّارٌ﴾ ”الواو واو الحال“ ﴿وَهُمْ كُفَّارٌ﴾ میں واو حال کے لئے ہے۔

(قرطبی)

اگرچہ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ بھی حال کے مطابق ہی ہے لیکن میں نے ترجمہ حال کے مطابق واضح طور پر ذکر کیا ہے تاکہ طلباء کرام صحیح سمجھ سکیں۔

مقام توجہ: بعض حضرات نے ابن عربی کے اس قول ”والصحيح عندی جواز لعنه لظاهر حاله ولجواز قتله وقتاله“ (میرے نزدیک صحیح یہ ہے کہ ہر شخص کے ظاہر حال کو دیکھ کر لعنت کرنی جائز ہے۔ اسی طرح اس کے ظاہر حال کو دیکھ کر اس سے قتل و قتل جائز ہے) پر اعتراض کیا ہے کہ مسلمانوں پر لعنت جائز نہیں۔ لیکن یہ قول درست نہیں کیونکہ جیسا پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ مسلمانوں پر لعنت بمعنی رحمت خاصہ سے محرومی کے جائز ہے۔ (ابن عربی رحمہ اللہ کا قول درست ہے) نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ”لعن الله السارق يسرق البيضة فتقطع يده“

اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو اس چور پر جو انڈا (چاندی یا سونا انڈے کے برابر) چوری کر لے اور اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے۔

(قرطبی)

”كل من جاهر بالمعاصي كشراب الخمر و آكلة الربو ومن تشبه من النساء بالرجال ومن الرجل بالنساء الى غير ذلك مما ورد في الاحاديث لعنه“

ہر وہ شخص جو معاصی کا مرتکب ہو جیسے شراب پینے والا اور سود کھانے والا اور مردوں کی مشابہت کرنے والی عورتوں پر اور وہ مرد جو عورتوں کی مشابہت کرنے والے ہیں ان پر احادیث مبارکہ سے لعنت کرنا ثابت ہے۔

(ماخوذ از قرطبی)

اعتراض: اس آیت کریمہ میں ذکر کیا گیا ہے ﴿وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ﴾ سب لوگ ان پر لعنت

کرتے ہیں حالانکہ ان کے اپنے دین اور مذہب والے ان پر لعنت نہیں کرتے تو کس طرح کہنا صحیح ہے کہ سب لوگ ان پر لعنت کرتے ہیں۔

جواب اول: ان پر ان کے اپنے دین والے بھی آخرت میں لعنت کریں گے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿ثُمَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ يَكْفُرُ بَعْضُكُم بِبَعْضٍ وَيَلْعَنُ بَعْضُكُم بَعْضًا﴾

”پھر قیامت کے دن بعض، بعض سے کفر کریں گے اور تم میں سے بعض، بعض پر لعنت بھیجیں گے“

جواب دوم: قتادہ اور ربیع کا قول یہ ہے کہ ﴿وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ﴾ سے مراد مومن لوگ ہیں۔ گویا کہ غیر کا اعتبار ہی نہیں کیا گیا ”و حکم بان المؤمنین هم الناس لا غیر“ اور حکم یہ لگایا گیا کہ صرف مومن ہی انسان کہلانے کے حقدار ہیں کفار انسانیت سے ہی دور ہیں۔

جواب سوم: ہر شخص ظالم اور جاہل پر لعنت کرتا ہے کیونکہ ظلم اور جہالت کو ہر شخص قبیح سمجھتا ہے۔ چونکہ تمام کافر جاہل اور ظالم ہیں اس لئے ظالم اور جاہل پر لعنت کرنے کی وجہ سے ہر کافر دوسرے کافر پر لعنت بھیج رہا ہے۔

جواب چہارم: مستحق لعنت پر ہر شخص لعنت بھیجتا ہے اس طرح کفار بھی مستحق لعنت پر لعنت کرتے ہیں جو لعنت حقیقت میں ان کفار پر ہی لوٹ کر آتی ہے کیونکہ وہ سمجھتے نہیں کہ لعنت کے مستحق تو کفار ہی ہیں۔

(ارکب)

خَالِدِينَ فِيهَا: فیہا کی ضمیر یا تو لعنت کی طرف لوٹ رہی ہے، مطلب اس کا یہ ہے کہ وہ ہمیشہ لعنت میں رہیں گے ضمیر یا تو نار (آگ) کی طرف لوٹ رہی ہے اگر چہ نار کا پہلے ذکر نہیں لیکن نار ذہن میں ہے۔ اس لئے کہ جب ان پر لعنت کا ذکر کیا گیا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مکمل طور پر دور ہیں۔ ”فهذا يستلزم الخلود في النار خارجا وذهنا“ جو شخص لعنت کا مستحق ہو وہ خارجی اور ذہنی طور پر آگ میں ہمیشہ رہنے کا مستحق ہوتا ہے۔

خیال رہے کہ موت کا کفر کے حال میں آنا خارجی طور پر تو آگ میں ہمیشہ رہنے کو مستلزم ہے لیکن ذہنی طور پر نہیں کیونکہ ذہن یہ بھی کہتا ہے کہ ہو سکتا ہے وہ ظاہری طور پر کفر پر مرا ہو لیکن باطنی طور پر ایمان دار ہو۔

(ماخوذ از روح المعانی)

لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ الْعَذَابُ : ”نہیں تخفیف کی جائے گی ان سے عذاب کی“ اس میں ایک

احتمال ہے استیناف کا یعنی پہلے لعنت کا ذکر کیا کہ ان پر اللہ اور فرشتوں اور سب لوگوں کی لعنت ہے یہ عذاب ہے اور اس کی کثرت تعداد کے لحاظ پر ذکر کی گئی کہ ان پر بے شمار لعنتیں ہوں گی۔ اب یہاں کیفیت کے لحاظ پر کثرت عذاب کو ذکر کیا جا رہا ہے ان پر شدید عذاب ہوگا جس میں تخفیف نہیں ہوگی۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ جملہ ﴿خَالِدِينَ فِيهَا﴾ سے حال واقع ہو وہ ہمیشہ لعنت اور آگ میں رہیں گے حال یہ ہے کہ ان سے عذاب میں تخفیف نہیں ہوگی۔ (از ابو السعود)

وَلَا هُمْ يُنْظَرُونَ : ”اور نہیں ان کو مہلت دی جائے گی“

جب لَا يَنْظُرُونَ کو انتظار سے لیا جائے تو معنی ہوگا ”امہال“ اور ”تأجيل“۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں ”لَا يَمْهَلُونَ لِلرَّجْعَةِ وَلَا لِلتَّوْبَةِ وَلَا لِلْمَعْذِرَةِ“ ان کو واپس لوٹنے اور توبہ کرنے اور عذر پیش کرنے کی مہلت نہیں دی جائے گی۔ یہی معنی اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿هَذَا يَوْمٌ لَا يَنْطِقُونَ﴾ ”یہ وہ دن ہے جس میں وہ بول نہیں سکیں گے“ اور ”وَلَا يُؤْذِنُ لَهُمْ فَيَعْتَذِرُونَ“ (ان کو) قیامت کے دن) اجازت نہیں دی جائے گی کہ وہ عذر پیش کریں) سے سمجھ آ رہا ہے جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے پیش کیا۔

﴿يُنْظَرُونَ﴾ میں ایک احتمال یہ ہے کہ یہ لفظ انتظار سے نہ لیا جائے بلکہ نظر سے لیا جائے اب اس کے دو مطلب ہوں گے ایک انتظار کرنا جیسا کہ رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی میں اس معنی میں بھی استعمال ہے ﴿انظرونا نقتبس من نوركم﴾ ای انتظار کرنا ”ہماری انتظار کرو ہم تمہارے نور سے اقتباس (روشنی) حاصل کر لیں“ اس معنی کے لحاظ پر مطلب ہوگا ”لَا يَنْظُرُونَ لِيَعْتَذِرُوا“ ان کو انتظار کا وقت نہیں دیا جائے گا کہ وہ عذر پیش کریں۔ اور یا ”نظر“ کا معنی ”دیکھنا“ ہوگا اب مطلب یہ ہوگا ”لَا يَنْظُرُ إِلَيْهِمْ نَظَرُ الرَّحْمَةِ“ ان کی طرف نظر رحمت نہیں کی جائے گی۔ (از بیضاوی و شیخ زادہ)

آثار مبارکہ : ”اخرج ابن جرير وابن ابی حاتم عن ابی العالیة قال ان الکافر یوقف

یوم القيامة فیلعنه الله ثم تلعه الملائكة ثم یلعنه الناس اجمعون“

ابو العالیہ کہتے ہیں کہ کافر کو قیامت کے دن کھڑا کیا جائے گا تو اس پر اللہ تعالیٰ لعنت کرے گا پھر

فرشتے اس پر لعنت کریں گے پھر اس پر تمام لوگ لعنت کریں گے۔ (درمنثور)

☆ "اخرج عبد بن حمید وابن جریر عن قتادة فی قوله اولئک علیہم لعنة الله والملائكة والناس اجمعین یعنی بالناس اجمعین المؤمنین"

حضرت قتادہ فرماتے ہیں (ان پر اللہ تعالیٰ کی لعنت اور فرشتوں کی اور تمام لوگوں کی) اللہ تعالیٰ کے ارشاد ﴿وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ﴾ سے مراد تمام مؤمنین ہیں (حقیقت میں انسان کہلانے کے حقدار وہی ہیں)۔

☆ "اخرج ابن جریر عن السدی فی الآیة قال لا یتلا عن اثنان مؤمنان ولا کافران فیقول احدهما لعن الله الظالم الا رجعت تلک اللعنة علی الکافر لانه فکل احد من الحق یلعنه"

سدی رحمہ اللہ نے آیہ کی تفسیر میں ذکر کیا ہے کہ دو مؤمن لعنت نہیں کرتے اور نہ ہی دو کافر "یہاں تک کہ ایک ان میں سے کہتا ہے اللہ کی لعنت ہو ظالم پر" مگر یہ کہ وہ لعنت کافر کی طرف لوٹ کر آتی ہے مخلوق میں سے ہر ایک اس پر لعنت کرتا ہے۔ (درمنثور)

☆ "اخرج ابن جریر عن ابی العالیة فی قوله تعالیٰ خالدین فیہا بقول خالدین فی جہنم فی اللعنة وفی قوله ولا هم ینظرون بقول لا ینظرون فیعتمدون"

ابوالعالیہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿خَالِدِينَ فِيهَا﴾ کا مطلب ہے کہ وہ جہنم میں لعنت میں ہمیشہ رہیں گے اور ﴿وَلَا هُمْ يُنْظَرُونَ﴾ کا مطلب ہے کہ ان کو مہلت نہیں دی جائے گی کہ وہ عذر پیش کریں۔ (درمنثور)

☆ "واخرج ابن ابی حاتم عن ابن عباس فی قوله ولا هم ینظرون قال لا یؤخرون" ابن حاتم حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول پیش کرتے ہیں کہ ﴿وَلَا هُمْ يُنْظَرُونَ﴾ کا مطلب ہے ان کو تاخیر کا موقع نہیں عطا کیا جائے گا۔ (درمنثور)

☆☆☆☆☆

﴿وَالْهَكْمُ إِلَهٌ وَاحِدٌ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الرَّحْمَنُ الرَّحِيمُ﴾

(۱) ”اور تمہارا معبود ایک معبود ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں مگر وہی بڑی رحمت والا مہربان“

(۲) ”اور تمہارا معبود ایک معبود ہے نہیں معبود سوائے اس کے وہی بہت بڑی رحمت والا مہربان ہے“

شان نزول: قریش کے کفار نے کہا ”یا محمد صف لنا ربک وانسبه فانزل الله هذه الآية وسورة الاخلاص“ اے محمد تم ہمیں اپنے رب کے اوصاف بتاؤ اور اس کا نسب بیان کرو تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیہ اور سورة اخلاص نازل فرمائی۔
(خازن)

پہلی آیات میں کتمان آیات سے ڈرایا گیا ہے اور انہیں لعنت کا مستحق قرار دیا گیا ہے اس آیہ میں ذکر کیا گیا ہے ”ان اول ما يجب اظهاره ولا يجوز كتمانہ امر التوحيد“ کہ سب سے پہلے جس چیز کو ظاہر کرنا ضروری ہے اور اس کا چھپانا جائز نہیں وہ امر توحید ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی توحید کو دلائل سے ذکر فرمایا اور انسان کو نظر و فکر کرنے کی دعوت دی کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق اور اس کی صنعت کے عجائب میں تفکر کرے تو اسے خود بخود سمجھ آ جائے گا ”انه لا بدله من فاعل لا يشبهه شئ“ کہ مخلوق کا خالق ہونا ضروری ہے اور مصنوع کا صانع ہونا ضروری ہے اور کوئی چیز اس کی مثل نہیں ہو سکتی وہ ذات بے مثل ہے۔
(از قرطبی)

والهکم: کیا ”الہ“ کی نسبت تمام مخلوق کی طرف ہو سکتی ہے یا صرف مکلفین کی طرف؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ”الہ“ کا مطلب ہے ”مستحق عبادت“ جب اس وصف کی وجہ سے ذات باری تعالیٰ کا معبود ہونا ضروری ہے تو نسبت بھی ان کی طرف ہوگی جن سے اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنا متصور ہو سکے۔
”فاذن هذه الاضافة صحيحة بالنسبة الى كل المكلفين، والى جميع من تصح صيرورته مكلفا تقديرا“ تو ”الہ“ کی نسبت ان کی طرف ہی ہو سکتی ہے جو حقیقت میں مکلفین ہیں یا تقدیری طور پر ان کو مکلف تصور کیا جائے۔
(از کبیر)

الہ واحد: ”ومعنى الوحدة الانفراد“ وحدت کا معنی ہے منفرد ہونا یعنی اللہ تعالیٰ منفرد ہے پھر منفرد ہونے کی دو قسمیں ہیں ذات میں منفرد ہونا اور صفت میں منفرد ہونا:
”وحقيقة الواحد هو الشئ الذى لا يتبع بعض ولا ينقسم“

حقیقت اور ذات میں واحد ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس کی تقسیم نہیں ہو سکتی اور اس کے حصے نہیں ہو سکتے۔ یعنی جسموں کے متعلق تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ عناصر اربعہ (آگ، مٹی، پانی، ہوا) سے مرکب ہیں اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ یہ اس کے اعضاء (ہاتھ، پاؤں وغیرہ) ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ مرکب ہونے سے اور اعضاء وغیرہ سے پاک ہے وہ منفرد ہے ذات میں۔ صفت کے لحاظ پر منفرد ہونے کا یہ مطلب ہے ”لا نظیر لہ ولیس کمثلہ شئی وقیل واحد فی الوہیتہ وربوبیتہ لیس لہ شریک“۔ کہ اس کی کوئی نظیر نہیں کیونکہ رب تعالیٰ نے خود اپنی شان بیان کی کہ اس کی مثل کوئی چیز نہیں بعض حضرات نے کہا کہ اس کا صفت میں واحد ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ ”الوہیت اور ربوبیت“ میں واحد ہے اس کا کوئی شریک نہیں۔ مشرکوں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہرائے ہوئے تھے تو اللہ تعالیٰ نے ان کا رد کیا اور فرمایا۔ ”والہکم الہ واحد“ یعنی اس کا الوہیت میں کوئی شریک نہیں اس کی ربوبیت میں کوئی نظیر نہیں۔

توحید کیا ہے؟ ”والتوحید هو نفی الشریک والقسیم والشبیہ“ توحید کا مطلب یہ ہے کہ اس کا کوئی شریک نہیں اس کی کوئی جز نہیں اس کی کوئی شبیہ نہیں۔

فَاللّٰهُ تَعَالٰی وَاحِدٌ فِیْ اَفْعَالِهِ لَا شَرِیْکَ لَہٗ یَشَارُکَہٗ فِیْ مَصْنُوْعَاتِہٖ وَوَاحِدٌ

فِیْ ذَاتِہٖ لَا قِسْمَ لَہٗ وَوَاحِدٌ فِیْ صِفَاتِہٖ لَا یَشْبَہُ شَیْءٌ مِّنْ خَلْقِہٖ

اللہ تعالیٰ اپنے افعال میں ایک ہے اس کی مصنوعات میں اس کا کوئی شریک نہیں وہ اپنی ذات میں ایک ہے اس کا کوئی قسم نہیں یعنی اس کی کوئی جز اور کوئی حصہ نہیں۔ اور وہ اپنی صفات میں واحد ہے اس کی مخلوق میں اس کوئی کے مشابہ نہیں۔

(خازن)

لا الہ الا هو : (کوئی معبود نہیں سوائے اس کے) اس کلمہ کی پہلی جز نفی ہے اور دوسری اثبات۔ صرف ”لا الہ“ کا ورد کرنا اور صرف اتنا ہی کلمہ پڑھتے رہنا کفر ہے اور ”الا اللہ“ ملائے۔ یا ”الا هو“ ساتھ ملائے تو ایمان ہے۔ کیونکہ پہلے کلمہ میں معبودان باطلہ کی نفی پائی گئی اور دوسرے کلمہ میں معبود حق کا ثبوت پایا گیا ہے۔

☆ ”قال رسول اللہ ﷺ من کان آخر کلامہ لا الہ الا اللہ دخل الجنة ، خرجه الموطأ والبخاری ومسلم وغيرہم“

نبی کریم ﷺ نے فرمایا جس کا آخری کلام ”لا الہ الا اللہ“ ہو وہ جنت میں داخل ہوگا۔
 ”خرجہ مسلم والمقصود القلب لا اللسان“ مسلم نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ مقصد دل سے
 ”لا الہ الا اللہ“ کہنا ہے صرف زبان سے کہنے سے مقصد حاصل نہیں ہوتا۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی وحدانیت
 پر صرف اسی کے معبود ہونے پر عقیدہ ہوا اگر عقیدہ اس کے خلاف ہو تو زبان سے کہنا بے مقصد ہے۔
مسئلہ: ”فلو قال لا الہ ومات ومعتقده وضميره الوحداية وما يجب له من الصفات
 لكان من اهل الجنة باتفاق اهل السنة“

اگر کسی شخص نے زبان سے ”لا الہ“ پڑھا۔ اس کی موت اسی حال میں آگئی لیکن اس کا عقیدہ
 اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے متعلق کامل تھا اور اس کے دل میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت تھی اور اللہ تعالیٰ کی
 صفات کاملہ پر اس کا ایمان تھا اور اسے یقین تھا تو وہ شخص جنتی ہے اس پر اہل سنت کا اتفاق ہے۔
 حضرت شیخ شبلی رحمہ اللہ کا تقویٰ: حضرت شبلی رحمہ اللہ ”اللہ، اللہ“ کا ورد کرتے تھے لیکن ”لا الہ
 الا اللہ“ کا ورد نہیں کرتے تھے جب آپ سے پوچھا گیا کہ آپ کلمہ طیبہ (جو نفی و اثبات پر مشتمل ہے)
 کا وظیفہ نہیں پڑھتے صرف ”اللہ، اللہ“ کا وظیفہ پڑھتے ہیں اس کی وجہ کیا ہے؟ انہوں نے فرمایا:
 ”اخشى ان اخذ في كلمة الجحود ولا اصل الى كلمة الاقرار“

میں ڈرتا ہوں کہ میں نفی والا کلمہ پڑھ لوں اور اثبات و اقرار والے کلمہ تک پہنچ ہی نہ سکوں تو میری
 موت آجائے مقصد یہ تھا کہ میں نہیں چاہتا کہ میری موت ”لا الہ“ کے کلمہ پڑھنے پر آجائے بلکہ میں یہ
 چاہتا ہوں کہ میری زبان پر ”اللہ، اللہ“ جاری ہو تو میری موت آجائے۔
 تاہم یہ خیال رہے کہ یہ صرف تقویٰ کی بات ہے ورنہ مسئلہ وہی ہے جو پہلے ذکر کر دیا گیا ہے۔
 اسی وجہ سے علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے فرمایا:

”قلت وهذا من علومهم الدقيقة التي ليست لها حقيقة“ میں یہ کہتا ہوں کہ یہ
 صوفیاء کرام کے مسائل دقیقہ ہیں جو ان کے تقویٰ کے مطابق ہو تو وہ جنتی ہے۔ (ماخوذ از قرطبی)
 راقم کا موقف یہ ہے کہ مسئلہ کی دار و مدار نیت پر ہے اگر کوئی یہ تمنا رکھے کہ میری موت ”اللہ، اللہ“
 کے ذکر پر آجائے تو اس کا ”اللہ، اللہ“ کرنا اور ”لا الہ الا اللہ“ نہ پڑھنا ہی باکمال ہے۔ اور اگر کوئی

اصل مسئلہ پر عمل کرے کہ جب کلمہ طیبہ ”لا الہ الا اللہ“ پڑھنے کی فضیلت حدیث شریف سے ثابت ہے تو اسی کا ورد کروں گا اگر میری موت ”لا الہ“ پر آ بھی گئی تو میں اپنے عقیدہ کے صحیح ہونے کی وجہ سے رب تعالیٰ کی رحمت سے محروم نہیں رہوں گا تو اس کا ”لا الہ الا اللہ“ کا وظیفہ کرنا بھی باکمال ہے (راقعہ)

الرحمن الرحیم : اللہ تعالیٰ نے جب اس سے پہلے اپنی دو صفتوں کا ذکر فرمایا ایک الوہیت اور دوسری وحدانیت ”یفید القہر والعلو“ تو ان کے ذکر سے یہ فائدہ حاصل ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ کو قہر اور بلندی مرتبت یعنی دبدبہ حاصل ہے تو ان کے پیچھے اللہ تعالیٰ نے اپنی صفات رحمن اور رحیم کو ذکر فرمایا ”ترويحاً للقلوب عن هیبة الالہیة وعزة الفردانية“ تاکہ میرے بندوں کے دلوں کو چین حاصل ہو جائے کہ بیشک وہ الہ ہے اور واحد ہے یقیناً اسے قہر و دبدبہ بھی حاصل ہے لیکن وہ رحمن و رحیم بھی ہے۔

”واشعارا بان رحمته سبقت غضبه وانه ما خلق الخلق الا للرحمة والاحسان“

اسی سے یہ بھی واضح کر دیا کہ اس کی رحمت کو اس کے غضب پر سبقت حاصل ہے اس نے اپنی تمام مخلوق کو فقط رحمت اور احسان کے لئے بھیجا ہے۔ (از کبیر)

یعنی مخلوق خود اپنے کفر کی وجہ سے اپنے آپ کو رحمت خاصہ سے محروم کر دے اور غیظ و غضب کا مستحق بنالے تو اس میں مخلوق خود ہی قصور وار ہے۔

رحمن اور رحیم کی تفصیلی بحث سورۃ فاتحہ میں بیان کی جا چکی ہے یہاں اتنا یاد کر لیا جائے کہ رحمن کے معنی میں مبالغہ ہے اس کا معنی ہے زیادہ رحم کرنے والا اور رحیم میں یہ مبالغہ نہیں پایا گیا۔

﴿الرحمن الرحیم﴾ سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ وہ تمام نعمتوں کا مالک ہے خواہ وہ اصول ہوں یا فروع اللہ تعالیٰ کے بغیر کسی اور کو یہ مقام حاصل نہیں۔ کیونکہ اس کے بغیر یا تو نعمت ہوگی۔ یا جن پر نعمتیں ہوں گی۔ لیکن اللہ تعالیٰ پر کسی کا کوئی انعام نہیں ”وہو المنعم علی خلقه الرحیم بہم“ وہ اپنی مخلوق پر انعام کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

☆ ”عن اسماء بنت یزید قالت سمعت رسول اللہ ﷺ يقول اسم الله الاعظم في هاتين الآيتين والھکم الہ واحد لا الہ الا ھو الرحمن الرحیم، وفاتحة آل عمران

الم الله لا اله الا هو الحي القيوم“ (اخرجه ابو داؤد والترمذی وقال حدیث صحیح)

حضرت اسماء بنت یزید کہتی ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا اللہ تعالیٰ کا اسم اعظم ان دو آیتوں میں ہے ایک ﴿والهکم الله واحد لا اله الا هو الرحمن الرحیم﴾ میں اور دوسری سورۃ آل عمران کی پہلی آیت میں ﴿الم ☆ الله لا اله الا هو الحي القيوم﴾ (خازن) طلباء کرام کے لئے: لفظ ”ہو“ میں اسرار معنویہ کو دیکھا جائے تو عجیب مسائل سمجھ آئیں گے۔ الفاظ کی دو قسمیں ہیں اسم ظاہر اور اسم ضمیر۔ لیکن اسم ظاہر یہ وہ الفاظ ہیں جو ماہیات مخصوصہ پر دلالت کرتے ہیں اس لحاظ پر کہ وہ ماہیات مخصوصہ ہیں جیسے سواد و بیاض، حجر اور انسان۔ مضمرات یہ وہ الفاظ ہیں جو کسی نہ کسی چیز پر دلالت کرتے ہیں۔ خواہ وہ متکلم ہو یا مخاطب ہو یا غائب ضمائر کی دلالت معین ماہیات پر نہیں ہوتی۔

اصل ضمیریں تین ہیں ”انا“ اور ”انت“ اور ”ہو“ ان میں سے اعراف (زیادہ معروفہ) ”انا“ ہے پھر ”انت“ پھر ”ہو“ اس ترتیب کے صحیح ہونے پر دلیل یہ ہے کہ جب مجھے اپنی ذات کا تصور آئے گا اور میں گویا کہ جب یوں کہوں ”انسی انا“ بیشک میں، میں ہی ہوں اس میں کوئی اشتباہ نہیں ہوگا۔ ”فانه من المستحيل ان اصير مشتبهاً بغيري او يشبهه بي غيري“ یہ محال ہوگا کہ میں کسی غیر سے مشتبہ ہو جاؤں یا کوئی غیر مجھ سے مشتبہ ہو جائے۔

یعنی مجھے اپنا تصور آنے کے بعد میں یہ نہیں کہہ سکوں گا کہ میں فلاں شخص ہوں۔ یا فلاں شخص میں ہوں۔ بخلاف اس کے کہ جب میں ”انت“ کہوں ”فانک قد تشبه بغيرک و غیرک يشبه یک فی عقلی و ظنی“ تو تم کبھی اپنے غیر سے مشتبہ ہو جاؤ گے اور تمہارا غیر تمہارے مشتبہ ہوگا میرے عقل اور میرے گمان میں پھر ”انت“ اعراف ہے ”ہو“ سے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ ضمیروں سے ”انا“ سے زیادہ معرفت حاصل ہوتی ہے اور ”ہو“ سے بہت کم اور ”انت“ سے متوسط درجہ کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔

متکلم کا اعراف ہونا اس سے بھی واضح ہو جاتا ہے کہ متکلم کی ضمیر خواہ متصل ہو یا منفصل ہو واحد ہو تو مذکر اور مؤنث میں مشترک ہے اور جمع کی ضمیر تشبیہ مذکر اور مؤنث اور جمع مذکر اور مؤنث کو شامل ہے

کیونکہ اس میں التباس کم لازم آتا ہے۔ اس کے بعد واضح ہوا کہ جتنی معرفت کسی کو اپنی ذات کی ہوتی ہے اتنی غیر کو نہیں ہوتی اسی وجہ سے یہ کہا جائے گا ”فالعرفان التام باللہ لیس الا للہ“ اللہ تعالیٰ کی کامل معرفت اللہ تعالیٰ کے بغیر کسی اور کو نہیں۔ اسی وجہ سے رب تعالیٰ اپنی ذات کے متعلق کہتا ہے ”انا اللہ“ میں اللہ ہوں دوسرا کوئی شخص اس لفظ کا استعمال نہیں کر سکتا۔

اعتراض: مشہور تو یہ ہے کہ ارواح بشریہ جب اس حقیقت کی معرفت سے منور ہو جاتی ہیں تو عاقل اور معقول متحد ہو جاتے ہیں اس اتحاد کے وقت عارف کو یہ کہنا صحیح ہے ”انا اللہ“ تو کس طرح یہ کہنا صحیح ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بغیر کوئی دوسرا ”انا اللہ“ نہیں کہہ سکتا۔

جواب: ”ان القول بالاتحاد غیر معقول“ بیشک اتحاد کا قول ہی عقل کے خلاف ہے لہذا باطل ہے اس لئے کہ اتحاد کے وقت دونوں فنا ہو جاتے ہیں یا ایک فنا ہو جاتا ہے ”فذاک لیس باتحاد“ یہ اتحاد نہیں ہو سکتا۔ ”وان بقیا فہما اثنان لا واحد“ اگر دونوں باقی رہیں تو ایک نہ ہوئے جب ایک نہ ہوئے تو اتحاد کیسے؟

مقصد: جب کوئی شخص ”انا اللہ“ نہیں کہہ سکتا تو اب دو احتمال باقی ہیں کہ انسان رب تعالیٰ کو ”انت“ کہے یا ”ہو“ کہے۔

”انت“ کا استعمال: ”اما انت فہو للحاضرين فی مقامات المکاشفات والمشاہدات لمن فنی عن جمیع الحظوظ البشریة“ جو لوگ مکاشفہ کا مقام حاصل کر لیتے ہیں اور رب تعالیٰ کے حضور حاضر ہوتے ہیں اور انسانی خواہشات کو فناء کر کے مقام مشاہدہ حاصل کر لیتے ہیں وہ ”انت“ کا استعمال کرتے ہیں۔

حضرت یونس علیہ السلام کی رب تعالیٰ نے خبر دی کہ آپ نے کہا ”فنادی فی الظلمات ان لا الہ الا انت“ (تو انہوں نے تاریکیوں میں (مچھلی کے پیٹ میں) پکارا یہ کہ کوئی معبود نہیں سوائے تیرے) لیکن یہ آپ نے اسی وقت کہا جب آپ نے آثار حدوث اور عالم حدوث کی تاریکیوں سے اپنے آپ کو فناء کے درجہ میں پہنچا کر مقام شہود تک پہنچ گئے۔

نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ”لا احصى ثناء علیک انت کما اثنت علی نفسک“ میں تیری ثناء کو اس طرح شمار میں نہیں لا سکتا جیسا کہ تو نے اپنی ذات کی تعریف کی۔

ہاں البتہ یہ خیال رہے کہ اصل میں ”انت“ کا استعمال ان خواص کے لئے ہے جو مقام شہود میں پہنچے ہوتے ہیں۔ لیکن بوقت دعاء عام انسان بھی یہ خیال کرتے ہوئے کہ وہ ذات تو میرے قریب ہے میں اس کے سامنے حاضر ہوں اگرچہ مجھے مقام شہود حاصل نہیں ”انت“ کا استعمال کر لیتے ہیں۔ ”ہو“ کا استعمال: ”اما“ ”ہو“ ”فللغائبین“ لیکن ”ہو“ کا استعمال غائبین کے لئے ہے یعنی جن لوگوں کو مکاشفہ اور مشاہدہ حاصل نہیں ہوتا وہ درجہ غائبین تک پہنچے ہوتے ہیں۔ ”ان“ ”ہو“ فی حقہ اشرف الاسماء ”بیشک“ ”ہو“ رب تعالیٰ کے حق میں اشرف الاسماء (بہتر نام) ہے اس مسئلہ کو سمجھنے کے لئے پہلے یہ سمجھا جائے کہ اسم یا کلمی ہو گا یا جزئی۔ کلمی کا نفس تصور شرکت سے مانع نہیں۔ لیکن جزئی کا نفس تصور شرکت سے مانع ہے اسی سے واضح ہو گیا کہ رب تعالیٰ کا اسم کلمی نہیں ہو سکتا کیونکہ رب تعالیٰ معین ذات ہے اور کلمی سے معین ذات کا پتہ نہیں چلتا۔ یہی وجہ ہے کہ ”الرحمن، الرحیم، الحکیم، العلیم، القادر“ یعنی تمام اسماء مشتقہ لغوی معنی کے لحاظ پر رب تعالیٰ کی ذات سے خاص نہیں کیونکہ شرکتہ بین کثیرین سے مانع نہیں۔

ہاں البتہ جزئی کا استعمال رب تعالیٰ کے لئے صحیح ہے کیونکہ اس سے معین اور مخصوص ذات کا پتہ چلتا ہے پھر اس میں دو صورتیں علم ذکر کریں یا ضمیر ہر حال میں معین اور مخصوص ہونا واضح وہ جائے گا لہذا ”یا اللہ“ کہیں یا کہ ”یا انت“ کہیں اور یا کہ ”یا ہو“ کہیں ان میں کوئی فرق نہیں سب سے تعین حاصل ہو گئی۔ بلکہ یہ بھی خیال رہے کہ علم ضمیروں کی فرع ہے ”والاصل اشرف من الفرع“ اصل فرع سے اشرف اور افضل ہے۔ ”فقلنا یا انت یا ہو، اشرف من سائر الاسماء بالکلیۃ“ اس لئے ہم یا انت کہیں یا کہ ”یا ہو“ کہیں یہ تمام اسماء سے افضل ہیں۔ لیکن ”انت“ کا استعمال حاضرین کے لئے ہے اور ہو کا غائبین کے لئے جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے۔

فائدہ: ”ہو“ کا استعمال اس صورت کے لئے ہوتا ہے جو عقل میں آئے جب ”ہو“ کو اس صورت کے لئے تم استعمال کرو گے تو وہ صورت تمہارے ذہن میں حاضر ہوگی۔ ”فقد عاد القول الی ان“ ”ہو“ ایضا لا يتناول الا الحاضر“ تو اس سے یہ واضح ہو جائے گا کہ ”ہو“ کا استعمال بھی حاضر کے لئے ہے۔ اگرچہ انسان کو مکاشفہ اور مشاہدہ کا درجہ بھی حاصل ہو لیکن وہ رب تعالیٰ کی صفات کو اپنے ذہن میں لا کر درجہ حضور جاصل کر لیتا ہے تو کہتا ہے ”یا ہو“

لفظ ”ہو“ کا اور کمال: بیشک ہم دلیل پیش کرتے ہیں کہ حقیقت حق تمام تراکیب کی اقسام سے پاک ہیں رب تعالیٰ کی ذات فرد مطلق ہے اس کی نعت ذکر کر کے اس کی حقیقت کو بیان نہیں کیا جاسکتا:

”لان النعت يقتضى المغایرة بین الموصوف والصفة وعند حصول
الغیرية لا تبقى الفردانية“

کیونکہ نعت چاہتی ہے کہ موصوف اور صفت میں مغایرت پائی جائے اور جب غیریت ثابت ہو تو فردانیت باقی نہیں رہتی۔ یہاں یہ خیال رہے کہ کوئی یہ اعتراض نہ کرے کہ رب تعالیٰ کی صفات نہ اس کا عین ہیں اور نہ غیر ہیں تو غیریت کیسے ثابت ہوئی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں صفت کی بات نہیں ہو رہی۔ بلکہ بیان صفت کی بات ہو رہی ہے کہ بیان صفت حقیقت حق کا عین نہیں۔ اور رب تعالیٰ کی حقیقت کے متعلق خبر بھی نہیں دی جاسکتی۔ ”لان الاخبار يقتضى مخبراً عنه ومخبراً به وذلك ینافی الفردانية“ کیونکہ خبر دینے کا تقاضا یہ ہے کہ مخبر عنہ اور مخبر بہ پائے جائیں یہ فردانیت کے منافی ہے اسی سے یہ واضح ہو گیا کہ جمیع اسماء مشتقہ حقیقت حق کی کنہ تک پہنچنے سے قاصر ہیں۔

”واما لفظ ”هو“ فانه یصل الی کنہ تلك الحقيقة المفردة المبراة
عن جمیع جهات الكثرة فهذه اللفظة لو صولها الی کنہ الحقيقة،
وجب ان تكون اشرف من سائر الالفاظ التي یمتنع وصولها الی
تلك الحقيقة“

لیکن لفظ ”هو“ اس ذات کی حقیقت تک پہنچتا ہے جو کثرت کی تمام جہات سے پاک ہے اور حقیقت مفردہ ہے جب یہ لفظ حقیقت حق کی کنہ تک پہنچتا ہے تو ان تمام الفاظ سے اس لفظ کو فوقیت حاصل ہوگئی جو حقیقت حق تک رسائی سے قاصر ہیں۔

لفظ ”هو“ کا اور کمال: جو الفاظ مشتق ہیں وہ ذات کی صفت کے حصول پر دلالت کرتے ہیں۔ پھر حق تعالیٰ کی صفات کی ماہیات بھی غیر معلوم ہیں وہ بھی عالم حدوث سے متعلق ہونے کی وجہ سے ان کی علامات ظاہر ہوتی ہیں۔ مخلوق کو دیکھ کر اس کی صفت خالقیت کا پتہ چلتا ہے مرزوق کو دیکھ کر اس کی صفت رازقیت کا پتہ چلتا ہے لیکن اس معرفت سے اس کی حقیقت کا پتہ نہیں چلتا جس سے یقین کا درجہ حاصل ہو جائے۔ ہاں البتہ اس کی قدرت کا ان اشیاء سے پتہ چلتا ہے لیکن ساتھ ساتھ عالم حدوث کا دخل بھی

ہوتا ہے جب انسان دو چیزوں کی طرف نظر کرتا ہے تو کسی ایک چیز کو بھی مکمل طور پر حاصل نہیں کر سکتا بلکہ اس کی معرفت قاصر ہوتی ہے۔

”فاذن جميع الاسماء المشتقة لا تفيد كمال الاستغراق في مقام معرفة

بل كانها تصير حجابا بين العبد وبين الاستغراق في معرفة الرب“

تو واضح ہوا کہ تمام اسماء مشتقہ رب تعالیٰ کی معرفت میں کامل طور پر مستغرق ہونے کا فائدہ نہیں دیتے بلکہ اس معرفت میں عالم حدوث کا بھی دخل ہوتا ہے اس لئے یہ اسماء مشتقہ بوجہ عالم حدوث کے ساتھ معلق ہونے کی وجہ سے بندے اور رب تعالیٰ کی معرفت میں مستغرق ہونے کے درمیان حجاب بن جاتے ہیں۔ لیکن لفظ ”ہو“ رب تعالیٰ کی ذات پر دلالت کرتا ہے ذاتی طور پر اس میں کسی چیز کی اضافت و نسبت نہیں پائی جاتی ”فكان لفظ ”هو“ يوصلك الى الحق ويقطعك عما ما سواه“ لفظ ”هو“ رب تعالیٰ تک براہ راست پہنچاتا ہے اس کی ذات کے ماسواہ تعلق کو منقطع کر دیتا ہے لیکن اس کے ماسواہ الفاظ رب تعالیٰ کی ذات کے ماسواہ رابطہ منقطع نہیں کرتے اسی لئے لفظ ”هو“ اشرف ہے۔

لفظ ”هو“ کا اور کمال: ابھی تک جو بحث ذکر کی گئی ہے اس سے واضح ہوا کہ ”منبع الجلال والعزة هو الذات“ جلال اور عزت کا منبع اس کی ذات ہے صفات کے ذریعے اس کی ذات کی تکمیل نہیں۔ ”بل ذاته لكمالها استلزمت صفات الكمال“ بلکہ اس کی ذات اپنے کمال کی وجہ سے صفات کے کمال کو مستلزم ہے

”ولفظ هو يوصلك الى ينبوع الرحمة والعزة والعلو وهو الذات

وسائر الالفاظ لا توقفك الا في مقام النعوت والصفات فكان لفظ

(ماخوذ از کبیر)

”هو“ اشرف ہے۔

لفظ ”هو“ تمہیں رحمت اور عزت اور علو کے چشمہ تک پہنچا دیتا ہے اور وہ ذات ہے باقی الفاظ تمہیں صرف مقام نعوت اور صفات تک پہنچاتے ہیں لہذا لفظ ”هو“ جب ذات تک پہنچاتا ہے تو وہ اشرف ہے۔

(از کبیر)

☆☆☆☆☆

﴿ اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ
وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِي تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ
وَمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ مَّاءٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ
مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ وَتَصْرِيفِ الرِّيَّاحِ وَالسَّحَابِ
الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ لَاٰيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُوْنَ ﴾

(۱) ” بیشک آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور رات دن کا بدلتے آنا اور کشتی کہ دریا میں لوگوں کے فائدے لے کر چلتی ہے اور وہ جو اللہ نے آسمان سے پانی اتار کر مردہ زمین کو اس سے جلا دیا اور زمین میں ہر قسم کے جانور پھیلانے اور ہواؤں کی گردش اور وہ بادل کہ آسمان زمین کے بیچ میں حکم کا باندھنا ہے ان سب میں عقل مندوں کے لئے ضرور نشانیاں ہیں۔“

(۲) ” بیشک آسمانوں اور زمین کی مخلوق میں اور رات اور دن کے بدلنے میں، اور کشتیوں میں جو چلتی ہیں دریاؤں میں کہ نفع پہنچائیں لوگوں کو اور نازل کرنے اللہ کے آسمانوں سے پانی میں زندہ کیا جس کے ذریعے زمین کو بعد مرنے اس کے اور پھیلانے اس میں ہر قسم کے جانوروں میں اور ہواؤں کے چلانے میں اور بادلوں میں جو مسخر ہیں (حکم کے پابند ہیں) درمیان آسمانوں اور زمین کے یقیناً نشانیاں ہیں اس قوم کے لئے جو عقل رکھتے ہیں۔“

جب اللہ تعالیٰ نے اس سے پہلی آیت میں اپنی وحدانیت کا ذکر فرمایا تو اس آیت میں آٹھ قسم کے دلائل کا ذکر کیا جن سے عقل مند انسان اس کے وجود پر دلائل حاصل کر لیتے ہیں۔ اس کے بعد دوسری آیات میں اللہ تعالیٰ نے اپنی وحدانیت اور ضد اور مثل سے پاک ہونے پر دلائل قائم فرمائے ہیں۔

(کبر)

شان نزول:

(۱) ابن جریر نے اس آیت کریمہ کا شان نزول یہ بیان کیا ہے کہ عطا کہتے ہیں جب نبی کریم ﷺ

مدینہ طیبہ میں آئے تو آیہ کریمہ ﴿وَالْهَکُمُ إِلَهٌ وَاحِدٌ﴾ نازل ہوئی تو مکہ کے قریش جو کافر تھے ان کو جب پتہ چلا تو وہ کہنے لگے ”کیف یسع الناس الہ واحد“ ایک ہی خدا تمام لوگوں کو کیسے کافی ہے تو اللہ تعالیٰ نے اس آیہ کریمہ کو نازل کیا اس میں آٹھ نشانیوں کا ذکر کیا جو اس کی قدرت پر دلالت کر رہی ہیں جن سے عقل والوں کو معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ ایک ہی ذات ہے اس کی کوئی مثل نہیں۔

(۲) سعید بن مسروق کہتے ہیں قریش نے یہود سے سوال کیا کہ تم ہمیں بتاؤ موسیٰ علیہ السلام کون کون سے معجزات لائے؟ انہوں نے بتایا کہ وہ عصا اور ید بیضاء لائے۔ اور قریش نے نصاریٰ سے بھی یہی سوال کیا کہ عیسیٰ علیہ السلام کو کون کون سے معجزات عطا کئے گئے۔ انہوں نے جواب دیا ”مادر زاد اندھے کو نظر عطا کرنا، برص والے شخص کی مرض کو دور کرنا، اور مردے زندہ کرنا۔ تو قریش نے نبی کریم ﷺ کو کہا کہ تم ہمارے لئے دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ ہمارے لئے صفا پہاڑ کو سونا بنا دے تاکہ ہمیں یقین ہو جائے (کہ تم نبی ہو) اور ہمیں دشمن پر قوت حاصل ہو جائے۔

تو نبی کریم ﷺ نے رب تعالیٰ کے حضور عرض کیا کہ قریش یہ کہتے ہیں تو رب تعالیٰ نے فرمایا کہ میں ان کو عطا تو کر دوں گا ”ولکن ان کذبوا بعد ذلک عذبناہم عذابا لا اعذبہ احدا من العالمین“ لیکن اس کے بعد اگر انہوں نے تکذیب کی تو میں ان کو ایسا عذاب دوں گا جو تمام جہان والوں میں سے کسی ایک کو ایسا عذاب نہیں دوں گا۔

”فقال علیہ السلام ذرنی وقومی ادعوہم یوما فیوما“

تو نبی کریم ﷺ نے عرض کیا اے اللہ مجھے اور میری قوم کو اسی حال پر رہنے دے میں ان کو ہر دن دعوت اسلام دیتا رہوں گا۔

تو اللہ تعالیٰ اس آیہ کریمہ کو نازل فرمایا اور ان کے لئے بیان فرمایا کہ اگر وہ چاہتے ہیں کہ صفا سونا بنے تو وہ ایمان لائیں گے اور انہیں یقین زیادہ ہوگا ”فخلق السموات والارض وسائر ما ذکر اعظم“ تو آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں اور دوسری نشانیاں جو ذکر فرمائی ہیں ان میں رب تعالیٰ کی قدرت کی عظیم نشانیاں موجود ہیں ان میں تفکر کر کے انہیں زیادہ یقین آنا چاہئے لیکن وہ تو ایمان لانا ہی نہیں چاہتے بلکہ حجت بازی میں وقت گزارنا چاہتے ہیں۔ (از کبیر)

(۳) بیہقی نے ابواسمعی سے روایت ذکر کی کہ مشرکین کے کعبہ کے ارد گرد تین سو ساٹھ بت رکھے ہوئے تھے جب انہوں نے ﴿وَالْهَکُمُ اللّٰهُ وَاحِدٌ﴾ آیہ کو سنا تو تعجب کرنے لگے اور انہوں نے نبی کریم ﷺ کو کہا ”ان كنت صادقات بآية نعرف بها صدقك“ اگر تم سچے ہو تو کوئی نشانی لاؤ جس سے ہمیں پتہ چل جائے کہ تم سچے ہو تو اس وقت یہ آیہ کریمہ نازل ہوئی کہ ان نشانیوں میں تم غور و فکر کیوں نہیں کرتے۔
(ار روح المعانی)

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ : سب معطوف علیہ اور معطوف پر مرتب ہے
﴿لَا يَاتِ لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ﴾ تو گویا کہ مفہوم یہ ہوا بیشک آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے میں نشانیاں ہیں اس قوم کے لئے جو عقل رکھتے ہیں آسمانوں کا بغیر ستونوں کے قائم رہنا اور اوپر سے بھی کسی چیز سے بندھا ہوا نہ ہونا یہ رب تعالیٰ کی قدرت کاملہ کی نشانی ہے۔ اور یہ کام عام عادت کے خلاف ہے:
”ولو جاء نبی فتحدی بوقوف جبل فی الهواء دون علاقة کان معجزاً“

اگر نبی سے مطالبہ کیا جائے کہ تم زمین اور آسمان کے درمیان فضاء میں پہاڑ کو معلق کر کے دکھاؤ نبی یہی کام کر دکھائے تو یہ نبی کا معجزہ ہوگا۔

اور یہ محال بھی نہیں کیونکہ جبریل کا مقام تمام انبیاء کرام سے کم ہے اگر جبریل طور پہاڑ کو بنی اسرائیل کے سروں پر معلق کر سکتے ہیں تو نبی بھی یہ کام کر سکتے ہیں جبریل کو بھی طاقت رب تعالیٰ نے ہی دی ہے اور رب تعالیٰ ہی انبیاء کرام کو معجزات بھی عطا کرتا ہے۔

اسی طرح سورج اور چاند، سیارے اور ستارے سب اللہ تعالیٰ کی نشانیاں ہیں کیونکہ وہ طلوع ہوتے ہیں اور غروب ہوتے ہیں کبھی روشن ہوتے ہیں کبھی ان کی روشنی نہیں رہتی۔ یہ تمام رب تعالیٰ کی قدرت سے کام ہو رہا ہے یہ اس ذات کبریاء کی قدرت اور بے مثل ہونے کی نشانیاں ہیں۔ اور زمین میں دریاؤں اور سمندروں کا پایا جانا اور ہر قسم کی معدنیات کا پایا جانا، اور درختوں کا پایا جانا اور کہیں سے زمین کا نرم ہونا اور کہیں سے سخت ہونا یہ رب تعالیٰ کی قدرت کی نشانیاں ہیں۔ (از قرطبی)

سماوات جمع اور ارض واحد کیوں؟ ”انما جمع السموات وافرد الارض لانها طبقات متفاصلة بالذات مختلفة بالحقیقة بخلاف الارضین“

سماوات کو جمع ذکر کیا کیونکہ وہ مختلف طبقات ہیں اور ان کے درمیان ذالی طور پر فاصلہ موجود ہے لیکن ”ارض“ کو مفرد ذکر کیا کہ زمینوں میں فاصلہ نہیں بلکہ وہ تہہ بہ تہہ ہیں۔ (بیضاوی)

دوسری وجہ یہ ہے ”جمع السماوات لانها اجناس مختلفة كل سماء من جنس غير جنس الاخرى ووحدة الارض لانها كلها تراب“ واللہ تعالیٰ اعلم۔ سماوات کو جمع ذکر کیا کہ تمام آسمان مختلف جنس ہیں ہر آسمان دوسرے آسمان سے علیحدہ جنس ہے اور ارض کو واحد ذکر کیا کیونکہ تمام زمینیں ایک جنس یعنی مٹی سے ہیں۔ (قرطبی)

خلق : کا معنی مخلوق ہے یا مخلوق کا غیر ہے اس پر علامہ رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ”فقال عالم من الناس الخلق هو المخلوق“ لوگوں میں سے عظیم عالم کا یہ قول ہے کہ خلق بمعنی مخلوق ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ﴿ اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾ پر مرتب فرمایا ﴿ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ﴾ کو اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ آیات (نشانیاں) صرف مخلوق ہی ہے :

” لان المخلوق هو الذى يدل على الصانع فدلّت هذه الآية على ان الخلق هو المخلوق “

کیونکہ مخلوق وہ ہے جو صانع پر دلالت کرتی ہے لہذا آیہ کریمہ اس پر دلالت کر رہی ہے کہ خلق بمعنی مخلوق ہے راقم نے اسی وجہ سے یہ ترجمہ کیا ہے تاکہ یہ قول بھی واضح ہو جائے۔

ایک اور خیال بھی رہے ”فقال عالم من الناس“ کا ترجمہ راقم نے کیا ”لوگوں میں سے عظیم عالم کا یہ قول ہے“ یہ ترجمہ تنوین کو تعظیم کی سمجھتے ہوئے کیا ہے اگر تنوین کو تکثیر کے لئے بنایا جائے تو مطلب ہوگا ”لوگوں میں سے کثیر علماء نے یہ کہا ہے“ یہ ترجمہ اور زیادہ خوب ترین ہے۔ کچھ حضرات نے خلق کو غیر مخلوق کہا یعنی مصدری معنی ذکر کیا ہے (پیدا کرنا) ان کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مخلوق سے پہلے ہی خالق ہے لہذا مخلوق سے پہلے خلق موجود ہے اعلیٰ حضرت کا ترجمہ اس قول کے مطابق ہے۔ (از کبیر) وَاخْتِلَافِ اللَّیْلِ وَالنَّهَارِ : ”اور رات اور دن کے بدلنے میں (نشانیاں ہیں اس قوم کیلئے جو عقل رکھتے ہیں“ ﴿ اَخْتِلَافِ ﴾ کا معنی ایک کا آنا اور دوسرے کا جانا۔ یعنی رات کے آنے کے بعد دن کا جانا۔ اور دن کے آنے کے بعد رات کا جانا، اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیاں ہیں وہ واحد

اور بے مثل ذات ہی اس قدرت کی مالک ہے کسی اور کو یہ قدرت حاصل ہونے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اسی اختلاف کو رب تعالیٰ نے بیان فرمایا ﴿وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً﴾ وہ ذات جس نے رات اور دن کو ایک دوسرے کے پیچھے بنایا۔

”وَالثَّانِي ارَادَ اخْتِلَافَ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ فِي الطُّولِ وَالْقَصْرِ وَالنُّورِ وَالظُّلْمَةِ وَالزِّيَادَةِ وَالنَّقْصَانِ“

اور دوسری وجہ یہ ہے کہ ﴿اِخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ رات اور دن کے لمبا اور چھوٹا ہونے میں اور روشن اور تاریک ہونے میں اور زیادتی اور نقصان ہونے میں نشانیاں ہیں عقل والوں کے لئے۔

اور تیسری وجہ ﴿اِخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ﴾ کی یہ ہے کہ جس طرح دن رات کا لمبا ہونا اور چھوٹا ہونا زمانہ سے متعلق ہے ایسے ہی مکانات کے اختلاف کی وجہ سے بھی دن رات کے لمبے اور چھوٹے ہونے میں اختلاف ہوتا ہے۔ ایک ہی وقت میں ایک جگہ صبح ہے اسی وقت دوسری جگہ ظہر ہے اور اسی وقت اور جگہ عصر ہے اور اسی وقت اور جگہ میں مغرب ہے اور اسی وقت میں اور مقام میں عشاء ہے۔ اس کی وجہ طول البلد میں اختلاف ہے لیکن عرض البلد کے اختلاف کی وجہ سے جن شہروں اور ملکوں کا عرض شمالی ہوگا ان میں گرمیوں کے دن لمبے اور راتیں چھوٹی اور سردیوں کے دن چھوٹے اور راتیں لمبی ہوں گے۔

پاکستان بھی ان ممالک میں ہی آتا ہے۔ لہذا واضح ہوا کہ طول البلد اور عرض البلد کے اختلاف سے عجیب نشانیاں پائی جاتی ہیں جو رب تعالیٰ کی قدرت کاملہ پر دلالت کرتی ہیں۔

دن رات کا اختلاف وجود صانع پر دلالت کرتا ہے: اس میں پھر کئی وجوہ ہیں:

- (۱) رات اور دن کے احوال کا اختلاف حرکات شمس سے مرتبط ہے یعنی سورج کی حرکات سے متعلق ہے ”وہی من الآیات العظام“ اللہ تعالیٰ کی بڑی نشانیوں میں سے یہ ایک بڑی نشانی ہے۔
- (۲) دن کبھی لمبے ہوتے ہیں اور کبھی راتیں لمبی ہوتی ہیں اس اختلاف کی وجہ سے مختلف موسم آتے ہیں کبھی موسم بہار اور کبھی گرمیوں کا موسم اور کبھی موسم خزاں اور کبھی سردیوں کا موسم ”وہو من الآیات

العظام“ یہ بھی اختلاف بڑی نشانیوں میں سے ہے جو رب تعالیٰ کی قدرت پر دلالت کر رہا ہے۔

(۳) بندوں کا دن کو کسب کرنا اور معیشت کے لئے رزق کو طلب کرنا اور رات کو سونا اور آرام کرنا بھی دن اور رات کے اختلاف پر مبنی ہے جو بڑی نشانیوں میں سے ہے اللہ تعالیٰ کی قدرت عقل والوں کو سمجھ آتی ہے۔

(۴) مخلوق کی مصلحتوں کے حصول کے لئے رات اور دن ایک دوسرے سے تعاون کر رہے ہیں ”مع ما بینہما من التضاد والتنافی من الآیات العظام“ باوجود اس کے کہ ان دونوں کے درمیان تضاد اور منافاة ہے لیکن پھر ان کا بندوں کی مصلحتوں کے حصول کے لئے ایک دوسرے سے تعاون کرنا بڑی نشانیوں میں سے ہے جو اللہ تعالیٰ کی قدرت پر دلالت کر رہا ہے حالانکہ عقل کا تقاضا یہ ہے کہ جن دو چیزوں میں تضاد اور منافاة ہو وہ ایک دوسرے سے تعاون نہیں کرتیں بلکہ فساد برپا کرتی ہیں۔

(۵) مخلوق کا رات کے اول حصہ میں سونے کی طرف متوجہ ہونا اس موت کے مشابہ ہے جو اسرافیل کے پہلی مرتبہ صور پھونکنے پر آئے گی۔ پھر مخلوق کا صبح جاگنا اس زندگی کے مشابہ ہے جو دوسری مرتبہ صور پھونکنے پر حاصل ہونی ہے تو واضح ہوا کہ دن رات کا بدلنا قیامت کی یاد دلاتا ہے جو عقل والوں کے لئے قدرت باری تعالیٰ پر دلالت کرنے والی بڑی نشانی ہے۔

(۶) رات کی تاریکی کا صبح کے آنے پر پھٹ جانا اس طرح کی بڑی نشانی ہے جیسے صاف پانی کی چھوٹی نہر گد لے (نیا لے رنگ کے) پانی کے دریا کے ساتھ چل رہی ہو نہ صاف پانی نیا لے کو صاف کرے اور نہ ہی نیا لے رنگ کا پانی صاف کو نیا لے کرے یہ نشانی بھی دن رات کے بدلنے سے حاصل ہوتی ہے۔

(۷) رات اور دن کا معتدل مقدار پر ہونا اور لوگوں کی مصلحتوں کے مطابق ہونا کہ وہ ان مقامات میں سکونت اختیار کر سکیں جہاں دن رات کا یہ نظام ہو یہ بھی قدرت باری تعالیٰ کی ایک عظیم نشانی ہے جسے عقل والے سمجھتے ہیں بخلاف اس کے جن مقامات میں قطب بالکل سیدھا سر کے مقابل ہو وہاں سال میں چھ ماہ کی رات ہوتی ہے ”وہناک لا یتیم النضج ، ولا یصلح المسکن لحيوان ولا یتھیا فیہ شئی من اسباب المعیشتہ“ اور وہاں پھلوں اور کھیتی وغیرہ کا پکنا مکمل نہیں ہوتا۔ اور جاندار چیزوں کا وہاں رہنا بہت مشکل ہے اور وہاں اسباب معیشت کا مہیا ہونا بھی مشکل کام ہے۔

(۸) صبح کے وقت سورج کا طلوع ہونا اور روشنی کرنا اور شام کو غروب ہونا اور تاریکی چھا جانا یہ کیفیت بھی دن اور رات کے بدلنے سے حاصل ہوتی ہے جس سے عقل والے لوگ رب تعالیٰ کی قدرت پر نشانی حاصل کر لیتے ہیں۔ (از کبیر)

وَالْفُلْکِ الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ :

اور کشتیوں میں (نشانیاں ہیں عقل والوں کے لئے) جو چلتی ہیں دریاؤں میں کہ نفع پہنچائیں لوگوں کو۔ طلباء کے لئے: فلک، بضم الفاء اور بفتح الفاء، کا مادہ ایک ہی ہے جس کا معنی ہے گھومنا پھر ہر گول چیز کو فلک (بفتح الفاء) کہا جاتا ہے۔ کشتی کو ”فلک“ (بضم الفاء) کہا جاتا ہے کیونکہ یہ پانی میں آسانی سے گھومتی ہے۔ فلک (بضم الفاء) واحد اور جمع دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے البتہ جب واحد مراد لیا جائے گا تو اس وقت اس کے ساتھ مذکر صیغہ استعمال کئے جائیں گے کیونکہ یہ لفظ مذکر ہو گا اور جمع کی صورت میں مؤنث ہو گا کیونکہ جمع مکسر حکم مؤنث میں ہوتی ہے۔

طلباء کرام کی توجہ کے لئے: ”البحر سمی بحرا لاستبحاره وهو سعة وانبساطه“ بحر کو بحر اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس میں استبحار یعنی وسعت اور بساطت پائی جاتی ہے۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے ”استبحر فلان فی العلم، تبهر فلان فی العلم“ فلاں شخص کو علم میں وسعت حاصل ہے اسی طرح کہا جاتا ہے ”تبهر فلان فی المال“ فلاں کا مال وسیع ہے ”والبحر الشق ومنه البحيرة“ بحر کا ایک معنی ہے پھٹنا اسی معنی کے لحاظ سے بحیرہ کا استعمال ہے بحر میں دونوں معانی معتبر ہو سکتے ہیں کہ اس میں وسعت پائی جاتی ہے اور وہ زمین کے پھٹنے سے واقع ہے۔ مشہور بحر پانچ ہیں:

(۱) بحر ہند اسی کو بحر چین بھی کہا جاتا ہے۔ (۲) بحر مغرب۔

(۳) بحر شام و روم و مصر۔ (۴) بحر خطش۔ (۵) بحر جرجان۔

تنبیہ: طلباء کرام اس مسئلہ کو نہ بھولیں کہ ”بحر“ کا اطلاق سمندر پر بھی ہے اور دریا پر بھی ہے اور ”نہر“ کا اطلاق دریا پر بھی ہے اور نہر پر بھی۔ اس لئے عربی کتب میں سیاق و سباق کو دیکھ کر ترجمہ کیا جائے کہ

یہاں مراد کون سا معنی لیا گیا ہے۔

بحر ہند: اس کا طول مشرق سے مغرب کی جانب ہے حبشہ کی زمین کی انتہاء سے شروع ہوتا ہے اور ہند اور چین کی طرف آتا ہے ”یکون مقدار ذلک ثمانمانۃ الف میل“ طول کے لحاظ پر اس کی مقدار آٹھ لاکھ میل ہے ”وعرضہ الفی وسبعمانۃ میل“ اس کی مقدار عرض کے لحاظ دو ہزار سات سو میل بنتی ہے اور خط استواء سے دو ہزار سات سو میل متجاوز ہے۔

اس بحر کی ایک خلیج (الخلیج، من البحر، کھاڑی، ہندی، خلیج النہر، دریا کے دونوں کنارے) (المخج) یہاں مراد بڑے دریا ہیں جو سمندروں میں گرتے ہیں۔ حبشہ کی زمین سے بربر کے کنارے تک ہے اسے خلیج بربری بھی کہتے ہیں اس کا طول پانچ سو میل کی مقدار ہے اور عرض ایک سو میل ہے۔

دوسری خلیج: بحر ایلہ ہے، اسی کو بحر قلزم بھی کہا جاتا ہے اس کا طول ایک ہزار چار سو میل ہے اور عرض سات سو میل ہے اس کی انتہاء اس بحر تک ہے جسے بحر احضر، اس کے کنارے پر قلزم واقع ہے اسی لئے اسے بحر قلزم بھی کہا جاتا ہے اور اس کی مشرقی جانب یمن اور عدن کی زمین ہے اور مغربی جانب حبشہ ہے۔

تیسری خلیج: بحر ارض فارس ہے اس کو خلیج فارسی کہا جاتا ہے وہ بحر بصرہ اور فارس ہے اس کی مشرقی جانب تبر اور مکران ہیں اور اس کی مغربی جانب عمان ہے اس کا طول ایک ہزار چار سو میل ہے اور عرض پانچ سو میل ہے۔ ان دو خلیجوں یعنی خلیج ایلہ اور خلیج فارس کے درمیان حجاز اور یمن کی زمین ہے اور تمام ممالک عرب ان کے درمیان ہی ہیں ان دو خلیجوں کے درمیان مسافت ایک ہزار پانچ سو میل ہے۔

چوتھی خلیج: تیسری خلیج سے ہی چوتھی خلیج نکلتی ہے جو ہند کے ممالک تک پھیلی ہوئی ہے اسے خلیج احضر کہا جاتا ہے اس کا طول ایک ہزار پانچ سو میل ہے۔

جزیرہ بحر ہند: میں کئی جزائر ہیں کوئی آباد ہیں اور کوئی غیر آباد ہیں کل ایک ہزار تین سو ستر جزیرے ہیں اسی بحر احضر کی انتہاء میں ہند کی زمین کے مقابل چین کے متصل مشرقی کنارے میں جزیرہ سراندیپ ہے۔ جس کا احاطہ تین ہزار میل ہے اس میں بڑے بڑے پہاڑ ہیں اور بہت سے دریا ہیں ان مقامات میں سرخ رنگ کا یا قوت پایا جاتا ہے۔

آباد جزائر: اس جزیرہ کے ارد گرد انیس جزیرے آباد ہیں ان میں شہر آباد ہیں اور دیہات آباد

ہیں۔ اسی بہرہا حضر کے جزیروں میں سے جزیرہ کلتہ ہے جس میں رصاص (قلعی) پائی جاتی ہے۔ اور اسی بحر کے جزائر میں جزیرہ سریرہ ہے جس میں کافور پائی جاتی ہے۔

بحر مغرب: کا نام محیط بھی ہے یونانیوں نے اس کا نام اوقیانوس رکھا ہے اسی کے ساتھ بحر ہند متصل ہے اس کا طول معلوم نہیں سوائے مغربی اور شمالی کناروں کے۔ یہ روس اور صقالیہ کی زمین کے مقابل ہے جنوبی جانب کی انتہاء سے شروع ہوتا ہے سوڈان کی زمین کے مقابل ہے سوس کی انتہائی حدود سے گزرتا ہے طنجہ، تاہرت، اندلس، جلالقہ اور صقالیہ سے گزرتا ہے پھر وہاں سے پہاڑوں کے پیچھے گزرتا ہے جن پر لوگ نہیں جاتے پھر اس کے ساتھ ساتھ غیر آباد زمین ہے پھر یہ بحر مشرق کی طرف آ جاتا ہے۔ اس بحر میں کشتیاں نہیں چلتیں (یہ علامہ رازی کے زمانہ کی بات ہے) بلکہ لوگ مشکینوں (ہماری پنجابی میں سنٹرا ہی کہا جاتا ہے) کے ذریعہ اس میں تیرتے ہیں۔

حبشہ کی زمین کے مقابل اس میں چھ جزیرے ہیں جن کو جزائر خالدات کہتے ہیں اس بحر مغرب سے ایک عظیم خلیج شمال صقالیہ میں نکلتی ہے اور یہ بلغاریہ میں مسلمانوں کے علاقہ تک پھیلی ہوئی ہے۔ اس کا طول مشرق سے مغرب کی طرف تین سو میل اور عرض ایک سو میل ہے۔

بحر روم: جو افریقہ اور مصر اور شام تک وسیع ہے اس کا طول پانچ ہزار میل کی مقدار ہے اور اس کی عرض چھ سو میل ہے اور اسی سے ایک خلیج شمالی کنارہ کی طرف نکلتی ہے جو روم کے قریب ہے اس کی لمبائی پانچ سو میل ہے اور اس کی چوڑائی چھ سو میل ہے۔ اور اسی سے ایک اور خلیج نکلتی ہے جو ارض سرین کی طرف جاتی ہے جس کی لمبائی دو سو میل ہے اس بحر روم میں ایک سو باسٹھ جزیرے آباد ہیں جن میں سے پچاس جزیرے بہت بڑے ہیں۔

بحر نیطش: یہ لاذقیہ سے قسطنطنیہ کے خلف کی طرف ہے روس اور صقالیہ کی زمین میں واقع ہے اس کی لمبائی ایک ہزار تین سو میل ہے اور چوڑائی تین سو میل ہے۔

بحر جرجان: اس کی لمبائی مغرب سے مشرق کی جانب تین سو میل ہے اور چوڑائی چھ سو میل ہے اس میں دو جزیرے آباد ہیں اسے ”بحر آب سکون“ بھی کہا جاتا ہے یہ طبرستان، دیلم، نہروان، باب الاہواب اور اران کے کنارہ تک پھیلا ہوا ہے یہ کسی اور بحر سے متصل نہیں۔ یہ بڑے بڑے بحروں

کے متعلق مختصر بحث پیش کی گئی اور ان سے چھوٹے جن کو بحیرہ کہا جاتا ہے وہ پھر کثیر تعداد میں ہیں جیسا کہ بحیرہ خوارزم اور بحیرہ طبریہ وغیرہ۔ ارسطو نے بیان کیا ہے کہ بحر اوقیانوس کو زمین میں مرکزی حاصل ہے جیسا کہ کمر بند کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔

بما ینفع الناس : ”وہ کشتیاں جو دریاؤں میں چلتی ہیں“ جن سے لوگ نفع حاصل کرتے ہیں (وہ عقل والوں کے لئے نشانیاں ہیں)۔ لوگوں کو کشتیوں سے نفع کیسے حاصل ہے؟ وہ یہ ہے کہ ان پر سوار ہونا مباح ہے اور ان کے ذریعے مال حاصل کرنا اور تجارت کرنا جائز قرار دے دیا گیا ہے اور دریا کی سیر سے لذت حاصل کرنا کشتیوں کے ذریعے ہی ہوتا ہے یہ سب لوگوں کے لئے منافع ہیں۔

کشتیوں کا دریاؤں میں چلنا نشانیاں کیسے؟ اس میں چند وجوہ پائی گئی ہیں جن سے انہماں سمجھ سکتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کی عظیم نشانیاں ہیں:

(۱) کشتیاں اگرچہ لوگ تیار کرتے ہیں لیکن وہ آلات وغیرہ جن سے کشتیوں کو بنایا جاتا ہے وہ سب اللہ تعالیٰ کی تخلیق ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ ان چیزوں کو نہ پیدا کرتا تو کشتیاں بھی نہ بنائی جاسکتیں۔ اس لئے یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کی عظیم نشانیاں ہیں۔

(۲) کشتیوں کے چلاتے وقت اگر ہوائیں سازگار نہ ہوں تو پھر بھی کشتیوں کا چلانا اور ان سے نفع حاصل کرنا ممکن نہیں۔ ہواؤں کو سازگار بنانا، اور کشتیوں کا مددگار بنانا رب تعالیٰ کی ہی قدرت ہے۔ جس کا پتہ عقل والوں کو کشتیوں کے چلانے سے حاصل ہوتا ہے۔

(۳) اگر ہوا کو مکمل طور پر رب تعالیٰ بند کر دے یا ہوا کو ہمیشہ آندھی کی شکل میں چلائے تو کشتیاں تباہ و برباد ہو کر رہ جائیں ہواؤں کو ان کیفیات سے بچانا اور اصل کشتیوں کو بچانا اور نفع مند بنانا ہے یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی قدرت عظیمہ پر دلالت کر رہا ہے۔

(۴) اگر اللہ تعالیٰ بندوں کے دلوں کو قوت نہ عطا فرماتا تو وہ کشتی پر سوار ہونے سے ڈر محسوس کرتے کوئی مقصد حاصل نہ ہو سکتا، اللہ تعالیٰ نے بندوں کی مصلحت کے لئے اور منافع حاصل کرنے کے لئے اور تجارت کے طریقوں پر عمل کرنے کے لئے کشتیوں میں بیٹھنے کی ان کے دلوں میں

قوت بھی پیدا کر دی جو اللہ تعالیٰ کی قدرت عظیمہ پر دلالت کر رہی ہے۔

(۵) اللہ تعالیٰ نے جہان میں ہر طرف میں کوئی نہ کوئی معین اشیاء پیدا فرمادی ہیں جو وہاں ہی مل سکتی ہیں دوسری جگہ نہیں مل سکتیں اگر ہر چیز ہر جگہ ملتی تو لوگ نہ سفر کرنے کے محتاج ہوتے اور نہ ہی کشتیوں پر سوار ہونے کی ضرورت درپیش آتی، اس لئے کشتیوں پر سوار ہو کر خصوصی منافع حاصل کرنے میں عقل والوں کے لئے اللہ تعالیٰ کی قدرت کی عظیم نشانی پائی جاتی ہے۔

(۶) اللہ تعالیٰ کا دریاؤں کو کشتیوں کا بوجھ اٹھانے کے لئے مسخر کرنا اس کی قدرت کی عظیم نشانی ہے ورنہ دریاؤں کی طغیانی، فراوانی، موجوں کا اٹھنا پانی کا حرکت کرنا کشتیوں کو تہہ بالا کر کے رکھ دیتا لیکن اللہ تعالیٰ کی قدرت سے ہی ایسا ممکن ہے۔

(۷) بڑی بڑی وادیاں جیسے جیون اور سیحون بحیرہ خوارزم میں گرتی ہیں حالانکہ وہ دریا ہے یعنی چھوٹا سمندر ہے لیکن پھر بھی وہ نہ زیادہ ہوتا ہے اور نہ لمبا ہوتا ہے۔

”فالحق سبحانه وتعالى هو العالم بكيفية حال هذه المياه العظيمة التي تنصب فيها“

اللہ تعالیٰ ہی اس کیفیت کو بہتر جانتا ہے کہ اتنے بڑے پانی ایک بحیرہ میں گر کر اسے نہ بڑھائیں یہ اس کی قدرت کی عظیم نشانی ہے۔

(۸) دریا میں بڑے بڑے عظیم جانور، بڑی بڑی مچھلیاں ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ ان سے کشتیوں کو محفوظ فرماتا ہے اور ان کو صحیح و سلامت کنارے پر پہنچا دیتا ہے۔ اگر انسان اس میں تہہ برفرمائے تو یقیناً سمجھ جائے گا کہ ہاں واقعی اس میں اللہ تعالیٰ کی عظیم قدرت کی عظیم نشانی پائی گئی ہے۔

(۹) دریاؤں میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کی عجیب نشانی جس سے انسانی عقل و نگ رہ جاتی ہے کہ یہ کام صرف رب تعالیٰ کی قدرت میں ہے انسان کو یہ طاقت رب تعالیٰ نے عطاء ہی نہیں کی کہ وہ ایسا کام کر سکے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيَانِ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَا يَبْغِيَانِ﴾

اس نے دو سمندر بہائے کہ دیکھنے میں معلوم ہوں ملے ہوئے اور ہے ان میں روک کہ ایک

وَهُوَ الَّذِي مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ هَذَا عَذْبٌ فَرَاتٌ وَهَذَا مِلْحٌ اجاجٌ وَجَعَلَ بَيْنَهُمَا بَرْزَخًا وَحِجْرًا مَّحْجُورًا ﴿٥٣﴾ (الفرقان ۵۳)

”اور وہی جس نے ملے ہوئے رواں کئے دو سمندر یہ میٹھا ہے نہایت شیریں اور یہ کھاری ہے نہایت تلخ اور ان کے بیچ میں پردہ رکھا اور روکی ہوئی آڑ“

یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت ہے کہ دو سمندر اور دو دریا ایک ساتھ چل رہے ہوں بظاہر ان میں کوئی آڑ نہ ہو لیکن ایک کے پانی کا رنگ اور ہو دوسرے کا اور ہو ایک دوسرے پر تجاوز نہ کرے اسی طرح ایک کا پانی میٹھا ہو دوسرے کا نمکین ہو کوئی ایک دوسرے پر تجاوز نہ کرے عقل والوں کے لئے اس میں نشانی ہے کہ اس میں ضرور کسی ذات کی حفاظت اور تدبیر کا دخل ہے جس کی حکمرانی ان دریاؤں اور سمندروں پر بھی ہے۔

(ماخوذ از کبیر)

وَمَا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ مَّاءٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا:

اور جو نازل کیا اللہ نے آسمانوں سے پانی تو زندہ کیا اس کے ذریعے زمین کو اس کے مرنے کے بعد (اس میں نشانیاں ہیں عقل والوں کیلئے)۔ یعنی بارش برسانا اور اس کے ذریعے خشک زمین کو سرسبز و شاداب کرنا اللہ تعالیٰ کی قدرت ہے وجود صانع پر نشانی ہے اس کے نشانی ہونے میں چند وجوہ ہیں۔

(۱) یہ اجسام ہیں ان کے ساتھ جو صفات قائم ہیں رقت اور رطوبت اور میٹھا ہونا۔ ”ولا يقدر احد على خلقها الا الله تعالى“ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی ایک بھی پانی کی صفات کو پیدا کرنے پر قادر نہیں تو واضح ہوا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی عظیم قدرت کی نشانی ہے۔ رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ أَصْبَحَ مَاؤُكُمْ غَوْرًا فَمَنْ يَأْتِيكُمْ بِمَاءٍ مَعِينٍ﴾ (سورۃ الملک ۲۰)

”تم فرماؤ بھلا دیکھو تو اگر صبح کو تمہارا پانی زمین میں دھنس جائے تو وہ کون ہے جو تمہیں پانی

لا دے نگاہ کے سامنے بہتا۔“

(۲) بیشک اللہ تعالیٰ نے پانی کو حیات انسان کا سبب بنایا اور انسان کے رزق کا ذریعہ بنایا۔

رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿وَفِي السَّمَاءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوعَدُونَ﴾ (الذاریات، ۲۲) اور آسمان میں

تمہارا رزق ہے اور جو تمہیں وعدہ دیا جاتا ہے۔ کہ اسی (آسمان) کی طرف سے بارش کر کے زمین کو پیداوار سے مالا مال کیا جاتا ہے اور آخرت کے ثواب و عذاب کا (جو تمہیں وعدہ دیا جاتا ہے) وہ سب آسمان (لوح محفوظ) میں مکتوب ہے۔
(حرائر العرفان)

(۳) بادل اور بادلوں میں بہت بڑے پانی جن سے بڑی بڑی وادیاں بہتی ہیں ان کو آسمانوں کی فضاء میں معلق رکھنا یہ اللہ تعالیٰ کی بڑی بڑی نشانیوں میں سے بڑی نشانی ہے کیونکہ جب چاہے پانی کو نازل فرمائے اور جب چاہے بارشوں کو روک رکھے۔

(۴) پانی کو ہی اللہ تعالیٰ نے انسان کی زندگی کا سبب بنایا اور انسان کے اکثر منافع کی دار و مدار پانی پر ہی ہے رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ أَفَرَأَيْتُمُ الْمَاءَ الَّذِي تَشْرَبُونَ ؕ أَنْتُمْ أَنْزَلْتُمُوهُ مِنَ الْمُزْنِ أَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُونَ ۝

”تو بھلا بتاؤ تو وہ پانی جو پیتے ہو کیا تم نے اسے بادل سے اتارایا ہم ہیں اتارنے والے“

(الواقعة: ۶۹)

(۵) جب انسان بارش کے محتاج ہوں تو اپنے گناہوں کی معافی طلب کرتے ہوئے عاجزی اور زاری سے رب تعالیٰ کے حضور جب دعا کریں تو اللہ تعالیٰ ان کو عظیم منافع عطا فرماتا ہے یعنی بارش عطا کرتا ہے جو عظیم منافع کا ذریعہ ہے یہ اللہ تعالیٰ کی عظیم قدرت کی عظیم نشانی ہے۔

نوح علیہ السلام کی حکایت بیان کرتے ہوئے رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ إِنَّهُ كَانَ غَفَّارًا يُرْسِلُ السَّمَاءَ عَلَيْكُمْ مِدْرَارًا ۝

(سورة نوح: ۱۰۰)

”تو میں نے کہا اپنے رب سے معافی مانگو وہ بڑا معاف فرمانے والا ہے تم پر موسلا دھار بارش برسائے گا“

(ما حود اور کعبہ)

سوال: ایک آیت کریمہ میں ہے ﴿ وَأَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً ۝ ﴾ جس سے پتہ چلا کہ بارش آسمانوں سے آتی ہے دوسری آیت کریمہ میں ہے ﴿ ؕ أَنْتُمْ أَنْزَلْتُمُوهُ مِنَ الْمُزْنِ أَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُونَ ۝ ﴾ جس سے سمجھ آتا ہے کہ بارش بادل سے آتی ہے۔ اور فلاسفہ کا مشہور قول ہے کہ سورج کا زمین میں اثر ہوتا ہے زمین کا پانی بخار بن کر اوپر جاتا ہے جب وہ ٹھنڈی فضاء میں پہنچتا ہے تو وہ بخارات ٹھنڈے ہو

کر پانی کی شکل اختیار کر لیتے ہیں تو وہ بارش کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ ان میں تطبیق کیسے ہے؟ کس قول پر عمل کیا جائے اور کس قول کو چھوڑا جائے۔

جواب: اللہ تعالیٰ آسمانوں سے پانی نازل فرماتا ہے جیسا کہ رب تعالیٰ نے اس آیت میں ذکر فرمایا ﴿وَهُوَ الصَّادِقُ فِي خَبْرِهِ﴾ اور وہ اپنی خبر میں سچا ہے۔ البتہ اللہ تعالیٰ بادلوں میں پانی کو روک کر رکھتا ہے ”فای بعد فی ان یمسکہ فی السماء“ تو کون سی بعید بات ہے کہ وہ آسمانوں میں پانی کو روک کر رکھے۔ یعنی رب تعالیٰ آسمانوں میں پانی کو روک کر رکھتا ہے پھر اسے بادلوں میں روک کر رکھتا ہے جب چاہتا ہے بارش برسا کر پانی کو زمین پر نازل کر دیتا ہے۔

البتہ یہ قول کہ زمین سے بخار اٹھتے ہیں اور اوپر جا کر فضاء میں ٹھنڈے ہو کر بارش کی شکل میں آتے ہیں اس کے متعلق اگر یہ عقیدہ رکھا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے اسباب میں سے یہ بھی ایک سبب بنایا ہے تو جائز ہے۔ لیکن اگر مستقل طور پر اسی کو سبب مانا جائے اور رب تعالیٰ جو قادر مختار ہے اس کے قول کی نفی کی جائے تو جائز نہیں بلکہ یہ کفر ہے۔ (ماخوذ از کبیر) (زیادہ تفصیل پہلے پارہ میں گزر چکی ہے)۔
زمین کو زندہ کرنے کا کیا مطلب؟ بیشک یہ حیات مختلف وجہ سے پائی گئی ہے۔

(۱) بارش کی وجہ سے گھاس اور پودے وغیرہ اگتے ہیں اگر یہ نہ پائے جائیں ”لما عاشت دواب الارض“ تو زمین پر چلنے والے جانور زندہ نہ رہیں۔ تو گویا کہ زمین کی زندگی سے مراد زمین کی پیداوار سے جانوروں کو زندگی عطا کرنا ہے۔

(۲) اگر بارش نہ ہو زمین کی پیداوار نہ ہو ”لما حصلت الاقوات للعباد“ تو بندوں کو روزی حاصل نہیں ہو سکتی تو پتہ چلا کہ بارش سبب ہے زمین میں مختلف چیزوں کے پیدا ہونے کا جو بندوں کی زندگی کا سبب ہے اس لئے زمین کو زندہ کرنے سے تعبیر کر دیا۔

(۳) اللہ تعالیٰ ہر چیز کو بقدر حاجت پیدا فرماتا ہے کیونکہ اس نے اپنے فضل و کرم سے بندوں کے رزق کو اپنے ذمہ لے لیا ارشاد فرمایا ﴿وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا﴾ تو گویا کہ تمام ذی روح چیزوں کی زندگی کا سبب بارش اور زمین ہیں اسی وجہ سے بارش کے ذریعہ زمین کو زندہ کرنے سے ذکر فرما دیا۔

(۴) زمین میں رنگ برنگ پودے پیدا فرمائے مختلف کھانے کی چیزیں اور مختلف خوشبودار پھول اور لباس بنانے کے لئے کپاس وغیرہ بارش کے ذریعے پیدا فرمائے ”لان ذلک کلمہ مما لا یقدر علیہ الا اللہ“ اس لئے کہ ان تمام چیزوں کی تخلیق پر اللہ تعالیٰ کے بغیر کوئی قادر نہیں گویا کہ رب تعالیٰ نے بارش کے ذریعے ان چیزوں کو پیدا فرما کر زمین کو زندگی عطا فرمائی۔

(۵) اللہ تعالیٰ بارش کی وجہ سے زمین میں حسن اور سبزہ اور تازگی اور رونق پیدا فرماتا ہے ”فذلک هو الحیاء“ اسی کو حیات سے تعبیر کیا گیا ہے۔

تنبیہ: اللہ تعالیٰ نے بارش کے ذریعے زمین کو زندہ کرنے کا جو ذکر فرمایا اس کا مجازی معنی لیا گیا ہے ”لان الحیاء لا تصح الا علی من یدرک ویصح ان یعلم“ اس لئے کہ زندگی کا اطلاق اس وقت تک صحیح نہیں جب تک ادراک اور علم نہ پایا جائے اسی طرح موت کا اطلاق بھی وہاں ہوتا ہے جہاں حیات پائی جائے ہاں البتہ جسم جب زندہ ہوتا ہے تو اس میں حسن و جمال اور نشوونما پائے جاتے ہیں تو زمین میں جب یہی چیزیں پائی جائیں تو ان پر مجازی طور پر حیات کا ذکر فرما دیا ہے ”وهذا من فصیح الکلام الذی علی اختصار یجمع المعانی الكثيرة“ یہ فصیح کلام ہے جو مختصر ہونے کے باوجود بہت بڑے معانی کو جامع ہے۔

زمین کا زندہ ہونا نشانی کیسے؟

اللہ تعالیٰ کے صانع ہونے اور اس کی قدرت پر اس میں چند وجوہ سے نشانی پائی گئی ہے:

(۱) ”احدها نفس الزرع لان ذلک لیس فی مقدور احد علی الحد الذی یخرج علیہ“

ایک ان میں کھیتی ہے کیونکہ کسی اور کی قدرت میں یہ داخل نہیں کہ رب تعالیٰ کے بغیر کوئی اور پیدا کرے اور رب تعالیٰ کی قدرت سے باہر ہو ایسا نہیں ہرگز نہیں۔

(۲) ”وثانیها اختلاف الوانها علی وجه لا یکاد یحد ویحصی“

اور دوسری نشانی یہ ہے کہ مختلف رنگوں کی اشیاء کا پیدا ہونا ایسے طریقہ پر کہ وہ رب تعالیٰ کی قدرت کے بغیر ان کی کوئی حد ہی نہ ہو اور شمار میں آ ہی نہ سکیں۔

(۳) ”وثالثها اختلاف طعوم ما یظهر علی الزرع والشجر“

اور تیسری نشانی یہ ہے کہ مختلف ذائقوں والے طعام جو کھیتی اور درختوں سے پیدا ہوتے ہیں وہ صرف رب تعالیٰ کی قدرت میں ہیں اس لئے یہ رب تعالیٰ کی قدرت پر نشانی ہے۔

(۴) ”ورابعها استمرار العادات بظهور ذلك في اوقاتھا المخصوصة“

چوتھی نشانی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عادت شریف یہ ہے کہ وہ مقررہ وقت میں کھیتی اور درختوں سے غلہ اور درختوں سے پھل پیدا فرماتا ہے۔ (ازکبیر)

یعنی ایک ایک چیز میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کی کئی کئی نشانیاں موجود ہیں ہاں البتہ انسان کو اسی وقت رب تعالیٰ کی قدرت کی عظیم نشانی حاصل ہوگی جب اسے ان میں تفکر اور تدبر حاصل ہوگا۔
وَبَتْ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ :

اور پھیلائے اس میں ہر قسم کے جانوروں میں (نشانوں میں عقل والوں کے لئے)

یعنی زمین میں ہر قسم کی جاندار مخلوق کو پھیلائے میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیاں پائی جاتی ہیں۔ جو صانع کے موجود ہونے اور خالق ہونے پر دلالت کر رہی ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی عجیب صنعت پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی دلیل: ایک شخص حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس حاضر ہوا اور کہنے لگا میں شطرنج کے معاملہ میں بہت تعجب کرتا ہوں کہ ایک ذراع (ڈیڑھ فٹ) کا ٹکڑا ہوتا ہے اگر انسان کروڑ مرتبہ بھی کھیلے تو دو مرتبہ بھی ایک چال پر متفق نہیں ہو سکتا۔ یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں تمہیں اس سے زیادہ تعجب والی چیز بتاتا ہوں وہ یہ ہے کہ انسان کے چہرہ کی مقدار ایک باشت ہے پھر اعضاء اس میں پائے جانے والے سب انسانوں میں دو ابرو دو آنکھیں، ناک اور منہ ہیں جن میں کوئی تبدیلی نہیں:

”ثم انك لا ترى شخصين في الشرق والغرب يشتبهان في فما

اعظم تلك القدرة والحكمة التي اظهرت في هذه الرفعة الصغيرة

هذه الاختلاف التي لاحد لها“

پھر بیشک تم نہیں دیکھتے ہو کہ مشرق و مغرب کوئی دو شخص ایک دوسرے کے مشابہ نہیں ہوتے اللہ تعالیٰ کی قدرت اور حکمت سے بڑھ کر کسی اور کو یہ مقام کب حاصل ہو سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت

وحکمت کی یہ چھوٹی سی رفعت حاصل ہے اس طرح اسکی قدرت کے مختلف مقامات کی کوئی حد نہیں۔

انسان اپنے آپ کو دیکھ کر رب تعالیٰ کی قدرت کا اندازہ کرے:

رب تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا جس کی ابتداء نطفہ سے ہے پھر اس سے خون، پھر اس سے گوشت اور ہڈیوں کو پیدا کرنا، پھر انسان کو شعور اور ادراک اور علم اور حکمت عطاء کرنا ہی واضح کر رہا ہے کہ اس کا کوئی مدبر بھی ہے اور اس کو اعضاء عطاء کرنے والا اور قوت عطاء کرنے والا اور اعضاء میں ترکیب پیدا کرنے والی قادر ذات موجود ہے۔

حیوانات قدرت باری تعالیٰ پر دلالت کر رہے ہیں:

حیوانوں کی تخلیق ان کے اعضاء ان میں قوت ترکیب کا پیدا کرنا، پھر مختلف حیوانات کی مختلف طاقت، مختلف حرکات یہ سب چیزیں اللہ تعالیٰ کی قدرت پر دلالت کر رہی ہیں اور صانع کے موجود ہونے پر دلالت کر رہی ہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا شاندار قول: سبحان من بصر بشحم، واسمع بعظم، وانطق بلحم، وہ ذات پاک ہے جس کو عظیم قدرت حاصل ہے جس نے چربی کو (آنکھ کی چربی) دیکھنے کی طاقت عطاء کی۔ اور ہڈیوں کو سننے کی طاقت عطاء (مراد اس سے کان کے پٹھے ہیں ہیں) اور گوشت کو بولنے کی طاقت عطا کی (مراد اس سے زبان کا گوشت ہے) عناصر اربعہ سے تخلیق قدرت کی نشانی:

انسان ہو یا دوسرے حیوان ہوں ان کی تخلیق عناصر اربعہ سے ہوئی آگ، ہوا، پانی اور مٹی سے۔ اس میں عقل کا تقاضا یہ ہے کہ تمام عناصر سے اوپر آگ ہونی چاہیے کیونکہ اس میں حرارت اور پیوستہ (گرمی، خشکی) پائی جاتی ہیں اور اس سے کم لطافت میں ہوا ہے یعنی ریح کا درجہ اوپر نیچے دوسرے مقام پر ہونا عقل کا تقاضا ہے اور اس کے بعد درجہ ہے پانی کا اور اس کے بعد درجہ ہے زمین کا۔ بدن انسان کی ترکیب میں عقل تقاضا کے مطابق مٹی (یعنی پیوستہ و بروہة) کو سب سے نیچے ہونا چاہئے لیکن

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس کی عقل کے تقاضا کے بالکل خلاف بنایا ہے۔

سب سے اوپر ہڈیوں یعنی سر کی کھوپڑی کو رکھا جن میں زمین کی طبیعت (یعنی مٹی کی تاثیر) برودۃ اور یبوستہ کو رکھا اور اس کے نیچے دماغ کو رکھا جس میں پانی کی تاثیر یعنی برودۃ اور رطوبۃ پائی جاتی ہے۔ اور اس کے نیچے نفس (سانس) کو رکھا جس میں ہوا کی تاثیر یعنی حرارت اور رطوبت پائی جاتی ہے۔ اور سب سے نیچے دل کو رکھا جس میں آگ کی تاثیر یعنی حرارت اور یبوستہ پائی جاتی ہے۔

”فسبحان من بیدہ قلب الطبائع یرتبھا کیف یشاء و یرکبھا کیف اراد“

اللہ تعالیٰ کی پاک ذات کے قبضہ قدرت میں ہی طبائع کو بدلنا ہے جسے جس طرح چاہے مرتب فرمادے اور جیسے ارادہ فرمائے اسی طرح مرکب کر دے۔

یعنی انسان اگر عقل سے کام لے تو صرف اپنی بناوٹ کی طرف توجہ کرے تو رب تعالیٰ کی قدرت کا اسے پتہ چل جائے کہ رب تعالیٰ نے عقل کے تقاضا کے خلاف کس طرح عناصر اربعہ کو مرکب کیا جب کہ ان کی تاثیرات وہی ہیں جو پہلے تھیں عقل کا تقاضا یہ ہے کہ اس طرح ترکیب ہو نہیں سکتی لیکن قدرت باری تعالیٰ سے کوئی چیز بعید نہیں۔

عناصر اربعہ پر شکل کو مرتب کرنا ایک اور قدرت ہے:

برصانع اپنی صنعت کے نقش و نگار جس چیز پر قائم کرنا چاہے۔ اسے مٹی سے بچاتا ہے۔ تاکہ مٹی اس کے نقوش کو مکر نہ کر دے۔ اور پانی سے بچاتا ہے، تاکہ پانی اس کے نقش و نگار کو مٹانہ دے۔

اور ہوا سے اس چیز کو بچا کر رکھتا ہے۔ تاکہ میری صنعت کے نقوش اس کی طراوت اور لطافت کی زد میں نہ آجائیں۔ اور آگ سے اس چیز کو بچاتا ہے۔ تاکہ آگ اس چیز کو ہی جلا کر رکھ نہ کر دے جس کے نقوش بھی زائل نہ ہو جائیں۔ ”ثم انه سبحانه وتعالى وضع نقش خلقته علی هذه

الاشیاء“ پھر رب سبحانہ کی قدرت دیکھو کہ اس نے اپنی مخلوق پر اپنی خلقت کے ان چیزوں پر ہی نقوش بنائے ہیں جن سے لوگ اپنی مصنوعات کو بچا کر رکھتے ہیں۔ رب تعالیٰ نے فرمایا:

”ان مثل عیسیٰ عند اللہ کمثل آدم خلقه من تراب“

”بیشک عیسیٰ اللہ کے ہاں آدم کی طرح ہیں ان کو پیدا کیا مٹی سے“

اور ارشاد فرمایا: ﴿وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ﴾ ”ہم نے پانی سے ہر چیز کو زندگی عطاء کی“

اور فرمایا: ﴿فَنَفَخْنَا فِيهِ مِنْ رُوحِنَا﴾ ”ہم نے اس میں اپنی طرف سے روح پھونکی“

اور فرمایا: ﴿وَوَخَّلَقَ الْجَانَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ﴾ ”اور جن کو پیدا فرمایا آگ کی لو سے“

”وہذا يدل على ان صنعته بخلاف صنع كل احد“ اسی سے واضح ہو گیا اللہ تعالیٰ کی صنعت اور اس کی قدرت اس کی مخلوق کی صنعت اور قدرت سے بالاتر ہے۔

سبحان اللہ خالق و مخلوق کی طاقت کے امتیاز پر ہر چیز دلالت کر رہی۔ انسان اپنے آپ کو ہی دیکھ لے تو اسے پتہ چل جائے، انسان تفکر ہی نہ کرے تو فرعون بن جائے تو اس کی اپنی بد قسمتی۔

بچے کا قدرت باری تعالیٰ کی نشانی ہونا:

بچے کا ماں سے جدا ہونے یعنی پیدا ہونے میں تفکر کرو اور دیکھو کہ اگر بچے کے منہ اور ناک پر کپڑا رکھ دیں تو اس کا سانس رک جائے تو وہ مر جائے گا:

”ثم انه بقى فى الرحم الضيق مدة مديدة مع تعذر النفس هناك ولم يموت“

لیکن بچے کا تنگ رحم (بچہ دانی) میں کتنی مدت تک رہنا باوجود اس کے بچے کو وہاں سانس لینے میں تنگی محسوس ہونا اور بچے کا نہ مرنا بلاشبہ رب تعالیٰ کی قدرت کی نشانی ہے۔ پھر بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو اس وقت وہ ضعیف و ناتواں ہوتا ہے اور سمجھ سے دور ہوتا ہے وہ آگ اور پانی میں فرق نہیں کر سکتا اور نقصان دہ اور لذت والی چیزوں میں فرق کرنے کی اس میں صلاحیت نہیں پائی جاتی۔ وہ یہ نہیں سمجھتا کہ یہ میری ماں ہے یا کہ اور کوئی عورت ہے۔

جب یہ معلوم ہو گیا کہ بچہ ابتدائی پیدائش میں سمجھ سے دور ہوتا ہے لیکن آہستہ آہستہ اسے فہم اور عقل اور ادراک میں کمال حاصل ہوتا ہے تو وہ تمام حیوانات سے بڑھ جاتا ہے اور کمال درجہ حاصل کر لیتا ہے ”ليعلم ان ذلك من عطية القادر الحكيم“ اس کا معلوم ہو جائے کہ یہ اللہ تعالیٰ قادر و حکیم کی طرف سے عطیہ ہے۔ اگر انسان طبعی طور پر پیدائش کے وقت ہی ذکی ہوتا تو فہم و ادراک کی تکمیل حاصل کرنے میں اسے اور زیادہ کمال حاصل ہوتا حالانکہ اس طرح نہیں بلکہ

ابتدائی پیدائش میں مجھ سے خالی ہوتا ہے پھر آہستہ آہستہ اسے فہم و ادراک میں کمال حاصل ہوتا ہے
 ”علمنا ان کل ذلک من عطیۃ اللہ الخالق الحکیم“ تو اسی سے ہمیں معلوم ہو گیا کہ یہ
 اللہ تعالیٰ خالق و حکیم کی طرف سے عطیہ ہے۔

واضح ہوا کہ انسان اپنے آپ کو ”ماں کے پیٹ میں ہونے اور پیدا ہونے کے وقت اور علم کے
 کمال تک مختلف حالات سے گزرنے کو دیکھے تو اسے قدرت کی عظیم نشانیاں نظر آئیں گی۔

انسانوں کے مختلف مزاج قدرت کی نشانی ہیں:

جب ہم دیکھتے ہیں کہ جنگلی اور پہاڑی حیوانات ایک دوسرے کے بہت مشابہ ہیں پھر ہم
 انسانوں کو دیکھتے ہیں جو صورت میں ایک دوسرے سے بہت زیادہ مختلف ہوتے ہیں پھر ان کی
 زبانیں مختلف ہیں اور ان کی طبیعتیں مختلف ہیں اور ان کے مزاج مختلف ہیں اگر ہر انسان ایک دوسرے
 کے کامل طور پر مشابہ ہوتا اور ہر انسان ایک دوسرے کے برابر ہوتا تو معیشت برباد ہو کر رہ جاتی۔

کیونکہ حاکم اور محکوم کے فرق سے ہی نظام دنیا قائم ہے کوئی کھیتی باڑی کرتا ہے کوئی کپڑے سلائی
 کرتا ہے کوئی جوتے بناتا ہے کوئی مکان تعمیر کرتا ہے اور کوئی لکڑی کا کام کرتا ہے تو کوئی لوہے کا کام کرتا
 ہے کوئی معالج ہے کوئی قاضی ہے یہ تمام صورتیں مختلف طبائع اور مختلف مزاجات کی وجہ سے ہی حاصل
 ہیں اسی سے معاشرہ قائم ہے اسی سے نظام معیشت قائم ہوتا ہے۔

”واستقصاء الکلام فی هذا النوع لا مطمع فیہ لانه بحر لا ساحل له“

علامہ رازی رحمہ اللہ نے ”وہبث فیہا من کل دابة“ کی تفسیر میں قدرت کی نشانیوں پر
 دلائل کو ذکر فرماتے ہوئے آخر میں ذکر کیا کہ اس نوع میں کلام کو انتہاء پر پہنچانا تو مقصد ہی نہیں کیونکہ یہ تو
 ایسا سمندر ہے جس کا کوئی کنارہ ہی نہیں۔
 (ماخوذ از کبیر)

وَتَصْرِيفِ الرِّيَّاحِ: ”اور ہواؤں کے چلانے میں (نشانیوں میں عقل والی قوم کے لئے)

ہواؤں کا چلنا قدرت کی نشانی کیسے؟ ہوا اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے جو تصرف (ایک جگہ سے دوسرے جگہ پھیرنے) کو قبول کرتی ہے ہوا میں رقت اور لطافت پائی جاتی ہے پھر اللہ تعالیٰ اس کو اکثر اوقات ایسے طریقہ سے چلاتا ہے جس میں انسانوں اور حیوانوں اور نباتات کا عظیم فائدہ پایا جاتا ہے۔ پھر اس کی نشانی ہونے میں چند وجوہ ہیں ایک تو یہ کہ ہوا سانس کی اصل ہے اگر ایک گھڑی بھی سانس رک جائے تو انسان مر جائے اور یہ ہے کہ جس چیز کی حاجت زیادہ پائی جاتی ہے وہ چیز آسانی سے حاصل ہوتی ہے۔

چونکہ انسان ہوا کا محتاج ہے، ہوا ”اعظم الحاجات“ ہے اس لئے کہ ایک لحظہ بھی ہوا ختم ہو جائے تو انسان مر جائے اسی وجہ سے تمام چیزوں کی بنسبت ہوا آسانی سے حاصل ہوتی ہے۔ ہوا سے کم لیکن باقی چیزوں سے زیادہ پانی کی ضرورت ہوتی ہے اس لئے پانی کا پایا جانا بھی آسان ہے، لیکن ہوا سے کچھ مشکل کیونکہ پانی کنوئیں سے نکالنا پڑتا ہے نہر وغیرہ سے چلو بھرنے پڑتے ہیں۔ لیکن ہوا کے حاصل کرنے میں تکلفات کی ضرورت درپیش نہیں آتی۔ پھر پانی کے بعد طعام کی ضرورت درپیش آتی ہے لیکن پانی سے کم ضرورت درپیش آتی ہے یہی وجہ ہے کہ طعام کا حاصل کرنا بنسبت پانی کے حاصل کرنے کے مشکل ہے۔ طعام کے بعد انسان کو اپنی زندگی میں بیماری کی حالت میں معجونوں اور دواؤں کی ضرورت درپیش آتی ہے لیکن ان کی ضرورت کم درپیش آتی ہے اسی لئے ان کو حاصل کرنا مشکل ہے۔ ادویات کے بعد زرد اور یا قوت وغیرہ کی انسان کو بہت ہی کم ضرورت درپیش آتی ہے اسی لئے ان کو حاصل کرنا بھی بہت مشکل ہوتا ہے۔

جب یہ واضح ہو گیا کہ جس چیز کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے وہ آسانی سے حاصل ہوتی ہے اور جس چیز کی ضرورت کم درپیش ہوتی ہے وہ مشکل سے حاصل ہوتی ہے۔

”وما ذاك الا رحمة منه على العباد“ یہ صرف اللہ تعالیٰ کی بندوں پر رحمت کی وجہ سے ہے

اسی سے نتیجہ یہ حاصل ہوا:

”ولما كانت الحاجة الى رحمة الله تعالى اعظم الحاجات فمرجو ان يكون وجد

انہا اسهل من وجدان كل شئ

کہ جب اللہ تعالیٰ کی رحمت کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے تو ہم امید رکھتے ہیں کہ سب چیزوں سے آسان ہمیں اللہ تعالیٰ کی رحمت ہی میسر ہوگی کیا خوب کسی شاعر نے کہا:

سبحان من خص القليل بعزه والناس مستغنون عن اجناسه

واذل انفاس الهواء وكل ذي نفس لمحتاج الى انفاسه

پاک ہے وہ ذات جس نے قلیل کو عزیز بنا دیا اور ہوا میں سانس لینے کو آسان کر دیا
لوگ مستغنی ہوتے ہیں اس قسم کی چیزوں سے اور ہر ذی روح چیز سانس لینے کی محتاج ہے

ہواؤں کے چلنے میں قدرت کی اور نشانی یہ ہے کہ اگر ہوا میں نہ چلتیں تو کشتیاں بھی نہ چلتیں اس پر اللہ تعالیٰ کے بغیر اور کسی کو قدرت حاصل نہیں۔ اگر دنیا کے لوگ تمام اپنی طاقت صرف کر دیں تو کسی کو یہ طاقت حاصل نہیں کہ وہ شمالی ہوا کو جنوبی بنا دے اور نہ ہی کسی کو یہ طاقت حاصل ہے کہ رکی ہوا کو چلا دے۔

ہواؤں کی چار قسمیں ہیں:

- (۱) شمال (بفتح الشین) جو شمالی نقطہ سے چلتی ہے۔ (۲) جنوب (بفتح الجیم) جو جنوبی نقطہ سے چلتی ہے۔
- (۳) دبور (بفتح الدال) جو مغرب کی طرف سے چلتی ہے۔ (۴) صبا، یہ مشرقی جانب سے چلتی ہے اس کا دوسرا نام قبول (بفتح القاف) بھی ہے۔

(از کبیر)

ريح کی وجہ تسمیہ:

"قال ابن الانباري انما سميت الريح ريحا لان الغالب عليها في

هبوبها المعجى بالروح والراحة وانقطاع هبوبها يكسب الكرب والغم

فهى مأخوذة من الروح"

ابن انباری فرماتے ہیں ریح کا نام ریح اس لئے رکھا گیا ہے کہ اس کے چلنے سے خوشی اور راحت محسوس ہوتی ہے۔ اور جب یہ رک جائے تو غم اور مصیبت حاصل ہوتی ہے یہ روح سے ماخوذ ہے۔

(از کبیر)

اعتراض: تم نے ریح کو خوشی اور راحت کا سبب کہا ہے حالانکہ حدیث شریف میں ریح کو مصیبت

کہا گیا ہے۔ حدیث شریف میں ہے:

”انہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کان اذا اہبت الريح قال ، اللهم اجعلها رياحا ولا تجعلها ريحا“
نبی کریم ﷺ جب ہوا چلتی تھی تو یہ دعا فرماتے تھے اے اللہ اے ”ریاح“ بنادے اور اے اللہ
اسے ”رتح“ نہ بنانا۔ اس سے تو پتہ چلا کہ ”ریاح“ باعث راحت ہے اور ”رتح“ باعث اضطراب ہے۔
جواب: رتح کا لغوی معنی راحت اور خوشی ہے بلکہ صرف ہوا کا چلنا بھی لغوی معنی ہے ہاں البتہ قرآن
پاک میں زیادہ طور پر ”رتح“ کا اطلاق اس ہوا پر ہے جو آندھی کی شکل میں عذاب کا سبب ہو جیسا کہ
ارشاد ہوا ﴿وَفِي عَادٍ إِذْ أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الرِّيحَ الْعَقِيمَ﴾ اور ارشاد ہوا ﴿إِنَّا أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ
رِيحًا صَرْصَرًا﴾ ان مقامات میں ”رتح“ کا استعمال بغیر بارش کے آندھی کی شکل میں ہوا پر کیا گیا
ہے اور ﴿وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ يُرْسِلَ الرِّيحَ مُبَشِّرَاتٍ﴾ اور اللہ کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ ہواؤں
کو (رحمت کی) بشارت بنا کر بھیجا۔ اس مقام میں ”ریاح“ کو رحمت اور راحت کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔

نتیجہ واضح ہوا کہ ”رتح“ کا لغوی معنی مطلقا ہوا ہے جو زیادہ طور پر راحت کا سبب ہوتی ہے لیکن
ہوا کبھی آندھی کی شکل میں عذاب کا سبب بھی بنتی ہے اس لئے قرآن پاک میں استعمال کے لحاظ پر مفرد
اور جمع میں فرق کر لیا گیا ہے مفرد کا زیادہ استعمال اس ہوا کے لئے کیا گیا ہے جس میں عذاب ہوا اور جمع کا
استعمال زیادہ طور پر راحت والی ہواؤں پر کیا گیا ہے۔
(ماخوذ از کبیر و مفردات راغب)

وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ :

”اور بادلوں میں جو مسخر ہیں آسمانوں اور زمین میں (نشانیاں ہیں عقل والوں کے لئے)“ ”سحاب“
ماخوذ ہے۔ ”سحب“ سے۔

جس کا ایک معنی کھینچنا، گھسیٹنا بھی آتا ہے جیسے کہا جاتا ہے ”فلان يسحب ذيله“ فلاں
شخص اپنے دامن کو گھسیٹتا ہے۔ بادلوں کو سحاب کہا جاتا ہے کیونکہ یہ فضاء میں پھیلے ہوئے ہوتے ہیں بعض
بعض کو اپنی طرف کھینچتے ہیں ”ومعنى التسخير التذليل“ کسی چیز کو مسخر کرنے کا مطلب ہے ”حکم
کا پابند کرنا“ اور حکم کے سامنے اپنے آپ کو عاجزی سے مطیع کر لینا، مسخر ہو جانا ہے۔

بادلوں کے مسخر ہونے میں قدرت کی نشانیاں:

(۱) بیشک پانی کی طبع میں ثقل ہے ثقیل چیز اوپر سے نیچے اترنے کا تقاضا کرتی ہے پانی کا فضاء میں ٹھہرے رہنا اس کی طبیعت کے خلاف ہے۔ ”فلا بد من قاسر قاهر يقهره على ذلك فلذلك سماه بالمسخر“ اس لئے ضروری ہے کہ یہ تسلیم کیا جائے کہ فضاء میں پانی کا بلندی پر بغیر کسی رکاوٹ کے رکنا ایسی ذات کی وجہ سے ہے جسے ہر چیز پر قہر اور غلبہ حاصل ہے جس نے اسے روک کر رکھا ہوا ہے اسی کا نام تسخیر ہے کہ بادلوں میں پانی کو اپنے حکم کا پابند کیا ہے یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کی ذات کے وجود پر بہت عظیم نشانی ہے۔

(۲) بادل اگر ہمیشہ چھائے رہتے تو سورج کی روشنی زمین پر نہ پڑتی اور زیادہ بارشیں ہوتیں زمین لگا تا رنماک رہتی تو کھیتیاں، نباتات وغیرہ نہ پائے جاتے کیونکہ سورج کی روشنی کے بغیر بھی بہت کم ہی کوئی پودا پایا جاتا ہے اور زمین ہمیشہ ہی تر رہے پانی سے جل تھل رہے تو پودا جات نہیں پائے جاتے۔ اور اگر بارش ہمیشہ کے لئے منقطع رہے تو قحط ہی قحط نظر آئے ہر طرف درخت، نباتات، گھاس وغیرہ خشک نظر آئیں کہیں بھی کوئی چیز سرسبز و شاداب نظر نہ آئے۔

”فكان تقديره بالمقدار المعلوم هو المصلحة فهو كالمسخر لله

سبحانه ياتي به وقت الحاجة ويرده عند زوال الحاجة“

ایک خاص مقدار کے مطابق بارشوں کو برسانے میں مصلحت پائی جاتی ہے جتنی ضرورت ہو اور جب ضرورت ہو اس وقت بارشوں کا برسانا اور جب ضرورت نہ ہو اس وقت بارشوں کو روک رکھنا رب تعالیٰ کی قدرت اور حکمت پر دلالت کرتا ہے اور اسی کا نام تسخیر ہے۔

(۳) بادل ایک معین جگہ میں نہیں رکتے بلکہ اللہ تعالیٰ جہاں چاہے ان کو ہواؤں کے ذریعہ چلاتا ہے یہ تسخیر بھی ہے اور رب تعالیٰ کے وجود اور اس کی صنعت کی نشانی بھی ہے۔

لَا يَأْتِ لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ : ”نشانیاں ہیں اس قوم کے لئے جو عقل رکھتے ہیں“

”آیات“ لفظ جمع ہے احتمال ہے کل کی طرف راجع ہو کہ یہ تمام آٹھ چیزیں جن کا ذکر کیا گیا

ہے وہ عقل والوں کے لئے نشانیاں ہیں اور اس میں ایک اور یہ بھی احتمال پایا جاتا ہے کہ ”آیات“ کا تعلق ہر ایک ایک سے ہو اور مطلب یہ ہو کہ ایک چیز میں کئی کئی نشانیاں پائی جاتی ہیں۔ یہی معنی زیادہ درست ہے کیونکہ جن چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے ان میں قدرت کی ان گنت، ان گنت نشانیاں ہیں یہ وہ سمندر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں پھر بھی چند چند قسمیں ذکر کر دی گئیں۔

عقل والوں کے لئے نشانیاں کہا کیونکہ جو لوگ ان چیزوں میں نظر کریں گے اور ان سے دلیل پکڑیں گے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر اور اللہ تعالیٰ کے عدل پر اور حکمت پر تو وہ اس کا شکر ادا کریں گے اور اس کی عبادت کریں گے اور اس کی طاعت کریں گے۔

فائدہ جلیلہ: نعمتوں کی دو قسمیں ہیں دنیاوی نعمتیں اور دینی نعمتیں۔ یہ آٹھ امور جن کو اللہ تعالیٰ نے ذکر فرمایا ہے بظاہر یہ دنیاوی نعمتیں ہیں دنیا میں انسان ان سے نفع حاصل کرتا ہے:

”فاذا تفكر العاقل فيها واستدل بها على معرفة الصانع صارت نعماً دينية“

جب عقل مند انسان ان نعمتوں میں تفکر کریں اور رب تعالیٰ کی صنعت کی معرفت میں ان سے دلائل حاصل کریں تو یہی دینی نعمتیں بن جاتی ہیں۔ لیکن دنیاوی نعمتوں سے انسان اس وقت تک نفع حاصل نہیں کر سکتا جب تک اس کے حواس صحیح و سلامت نہ ہوں اور اس کا مزاج صحیح نہ ہو۔

”فكذا لا انتفاع بها من حيث انها نعم دينية لا يكمل الا عند سلامة

العقول وانفتاح بصر الباطن فلذلك قال لآيات لقوم يعقلون“

اسی طرح دینی نعمتوں سے نفع حاصل کرنا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک عقل میں سلامتی نہ ہو اور باطنی نظر ان کی نہ کھلے اسی لئے رب تعالیٰ نے ان امور کو عقل والوں کے لئے نشانیاں کہا ہے۔

(ماخوذ از کبیر)

اس آیت کریمہ کے متعلق آثار کا تذکرہ:

☆ ”اخرج أبو عبيد وابن أبي الدنيا في كتاب المطر وابن المنذر وابن أبي حاتم وأبو الشيخ في العظمة عن ابن عمر وقال الرياح ثمان اربع منها رحمة واربع عذاب فاما الرحمة فالناشرات والمبشرات والمرسلات والذاريات واما العذاب فالعقيم والصرصر وهما في البر والعاصف والقاصف في البحر“

حضرت ابن عمرو (بن العاص) رضی اللہ عنہ نے فرمایا رحمت والی ہواؤں کے چار نام ذکر کئے گئے ہیں ناشرات اور مبشرات اور مرسلات اور ذاریات۔ اور عذاب والی ہواؤں کے بھی چار نام ہیں دو خشکی میں ”عقیم اور صرصر“ اور دو دریاؤں میں ”عاصف اور قاصف“ (در منشور)

☆ ”واخرج عبد الله بن احمد بن حنبل في زوائد الزهد و ابو الشيخ في العظمة عن كعب قال لو احتبست الريح عن الناس ثلاثة ايام لانتن ما بين السماء والارض“ حضرت كعب کہتے ہیں اگر ہوا لوگوں پر تین دن بند ہو جائے تو زمین و آسمان کے درمیان تمام چیزیں (گل سڑ کر) بدبودار ہو جائیں۔ (در منشور)

☆ ”واخرج ابو الشيخ عن انس قال قال رسول الله ﷺ الجنوب من ریح الجنة“ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا نبی کریم ﷺ نے فرمایا جنوبی ہوا جنتی ہوا ہے۔ (در منشور)

☆ ”واخرج الترمذی والنسائی وعبد الله بن احمد في زوائد المسند عن ابی بن كعب قال قال رسول الله ﷺ لا تسبوا الريح فانها من روح الله وسلوا الله خیرها وخیر ما فیها وخیر ما ارسلت به وتعوذوا بالله من شرها وشر ما فیها وشر ما ارسلت به“

ابی بن كعب کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”ہوا کو گالیاں نہ دو کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے اللہ تعالیٰ سے اس کی خیر اور اس میں جو کچھ ہے اس کی خیر اور جو اس کی ذریعہ بھیجا گیا ہے اس کی خیر کا سوال کرو اور اس کے شر اور اس میں جو کچھ ہے اس کے شر اور اس کے ذریعے جو عطا کی جائے اس کے شر سے پناہ طلب کرے۔ (در منشور)

☆ ”واخرج ابو الشيخ عن الحسن انه كان اذا نظر الى السحاب قال فيه والله رزقكم ولكنكم تحرمونه بذنوبكم“

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ جب بادل کو دیکھتے تو فرماتے کہ اللہ کی قسم اس میں تمہارا رزق ہے لیکن تم اپنے گناہوں کی وجہ سے اپنے آپ کو محروم کر دیتے ہو۔ (در منشور)

اس سے واضح ہوا کہ بارشوں کا بروقت نہ ہونا یا حد سے زیادہ بارشیں برسیں تو ان کے اسباب میں سے لوگوں کے گناہ بھی سبب ہوتے ہیں جن کی وجہ سے کھیتیاں برباد ہوتی ہیں قحط پڑ جاتا ہے۔

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَتَّخِذُ مِنْ دُونِ اللَّهِ أَنْدَادًا يُحِبُّونَهُمْ كَحُبِّ اللَّهِ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ وَلَوْ يَرَى الَّذِينَ ظَلَمُوا إِذْ يَرُونَ الْعَذَابَ أَنَّ الْقُوَّةَ لِلَّهِ جَمِيعًا وَأَنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعَذَابِ﴾

- (۱) ”اور کچھ لوگ اللہ کے سوا اور معبود بنا لیتے ہیں کہ انہیں اللہ کی طرح محبوب رکھتے ہیں اور ایمان والوں کو اللہ کے برابر کسی کی محبت نہیں اور کیسی ہوا گردیکھیں ظالم وہ وقت جب کہ عذاب ان کے سامنے آئے اس لئے کہ سارا زور خدا کو ہے اور اس لئے کہ اللہ کا عذاب بہت سخت ہے۔“
- (۲) ”اور بعض لوگ بنا لیتے ہیں اللہ کے سوا اور (اس کی) مثل محبت کرتے ہیں ان سے جیسے محبت کرتے ہیں اللہ سے اور وہ لوگ جو ایمان والے ہیں وہ بہت شدید محبت کرتے ہیں اللہ سے اور اگر معلوم کر لیں وہ لوگ جو ظالم ہیں اس وقت کو جب دیکھیں گے عذاب بیشک قوت اللہ کے لئے ہی ہے سب اور بیشک اللہ سخت عذاب دینے والا ہے۔“

وضاحت: جب پہلی آیات میں اللہ تعالیٰ نے اپنی وحدانیت کا ذکر فرمایا اور اپنی قدرت کی نشانیوں کا ذکر فرمایا تو اس آیت کریمہ میں ان لوگوں کا ذکر فرمایا جو عقل رکھنے کے باوجود بے عقل بنے بیٹھے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہیں جو بتوں کی پوجا کرتے ہیں ان کے لئے شدید عذاب ہوگا۔

(از قرطبی)

”بیان لحال المشرکین بعد بیان الدلائل الدالة علی توحیدہ“

پہلے وہ دلائل ذکر کئے جو اللہ تعالیٰ کی توحید پر دلالت کر رہے اب اس آیت کریمہ میں مشرکوں کا حال بیان کیا جا رہا ہے۔

(روح المعانی)

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَتَّخِذُ مِنْ دُونِ اللَّهِ أَنْدَادًا :
اور بعض لوگ بنا لیتے ہیں اللہ کے سوا (اس کی) مثل۔

﴿يَتَّخِذُ﴾ اخذ سے لیا ہوا ہے باب افتعال ہے دو مفعولوں کی طرف متعدی ہوتا ہے اور ”جعل“ کے قائم مقام ہوتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارَىٰ أَوْلِيَاءَ﴾
”اے ایمان والو نہ بناؤ یہود و نصاریٰ کو دوست“ (مفردات راغب)

یہاں بھی اسی معنی میں استعمال ہے اس کا ایک مفعول ﴿مِنْ دُونِ اللَّهِ﴾ ہے اور دوسرا مفعول ﴿أَنذَادًا﴾ ہے۔

دون: جو چیز کسی دوسری چیز سے گھٹیا ہوا سے ”دون“ کہا جاتا ہے اب حقیقی معنی تو اس طرح بنا اور بعض لوگ بنا لیتے ہیں اللہ سے گھٹیا کو (اس کی) مثل۔ البتہ مراد یہ ہے کہ اللہ کے بغیر اوروں کو اسی لئے زیادہ طور پر ”دون“ کا معنی (سوا، علاوہ) کیا جاتا ہے اور کبھی ”دون“ ”دنو“ سے مقلوب ہو کر آتا ہے اس وقت اس کا معنی کیا جاتا ہے ”قریب ہونا“ (از مفردات راغب بزيادة)

ند: ”ندید الشئى مشارکہ فی جوہرہ وذلك ضرب من المماثلة فان المثل يقال فی اى مشاركة كانت“

ایک چیز کا دوسری چیز کے اصل میں شریک ہونا ”ند“ کہلاتا ہے یہ مماثلت کی ایک قسم ہے اسی لئے ہر ”ند“ کو مماثل کہہ لیا جاتا ہے۔ لیکن یہ بات بھی ذہن میں رہے ”فکل ند مثل وليس کل مثل ندا“ ہر ”ند“ کو تو مثل کہا جاسکتا ہے لیکن ہر مثل کو ند کہنا غلط ہے۔ (از مفردات راغب)

”اندادا“ جمع ہے ندکی۔

آیت کریمہ میں ”اندادا“ کا مطلب کیا ہے؟ اس کے اگرچہ مختلف مطالب بیان کئے گئے ہیں لیکن سب کا مطلب یہ ہے کہ رب تعالیٰ سے دور کر دینے والا اس کی مثل کسی کو نہ بنایا جائے۔

(۱) اس کا ایک مطلب یہ ہے ”انہا ہی الاوثان التى اتخذوها آلهة لتقربہم الى الله زلفی“ کہ بعض لوگوں نے بتوں کو معبود بنا لیا کہ یہ ان کو اللہ کے قریب کر دیتے ہیں۔ بت پرست لوگ اپنے بتوں سے نفع اور نقصان حاصل کرنے کی امید کرتے تھے اور اپنے مسائل میں ان کی طرف ہی قصد کرتے تھے اور ان کے لئے ہی نذریں مانتے تھے اور ان کے لئے قربانیاں کرتے تھے ”وہو قول

(از کبیر)

اکثر المفسرین "یہی قول اکثر مفسرین کرام کا ہے۔

اعتراض: اس قول کے مطابق بتوں کو ﴿انداد﴾ کیسے کہا گیا ہے جب کہ "انداد" کا معنی "مثل" ہے بت تو اللہ تعالیٰ کی مثل ہو نہیں سکتے۔

پہلا جواب: "وعلى هذا الاصنام انداد بعضها لبعض اى امثال ليس لها انداد الله"

اس قول کے مطابق بتوں کو "انداد" کہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ بت ایک دوسرے کی مثل ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی مثل نہیں۔ اب مطلب یہ ہو گیا بعض لوگوں نے اللہ کے بغیر اور معبود بنائے ہیں جو سب عاجز ہونے میں معبود بننے کے قابل نہ ہونے میں ایک دوسرے کی مثل ہیں۔

دوسرا جواب: "انها انداد الله تعالى بحسب ظنونهم الفاسدة"

بیشک بت وغیرہ معبودان باطلہ تمام ہی اللہ تعالیٰ کی مثل نہیں ہو سکتے لیکن مشرکین اپنے فاسد گمانوں کے مطابق ان کو اللہ تعالیٰ کی مثل سمجھتے تھے اسی وجہ سے ان کی عبادت کرتے تھے۔ (از کبیر)

☆ "واخرج عبد بن حميد عن عكرمة "ومن الناس من يتخذ من دون الله اندادا اى شركاء"

بعض لوگوں نے اللہ کے سوا اس کے شریک بنائے (اس سے مراد بھی بت وغیرہ ہی ہیں)

(درمنثور)

☆ "واخرج عبد بن حميد عن قتادة فى قوله ﴿يُحِبُّونَهُمْ كَحُبِّ اللَّهِ﴾ قال يحبونهم يحبون اولئانهم"

قنادہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿يُحِبُّونَهُمْ كَحُبِّ اللَّهِ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ وہ مشرکین اپنے بتوں سے ایسی محبت کرتے ہیں جیسے اللہ سے محبت کی جاتی ہے۔ (درمنثور)

"الانداد، الامثال والمراد بها الاصنام كما هو الشائع فى القرآن" انداد کا معنی امثال ہے مراد اس سے بت لئے گئے ہیں "انداد" کا اطلاق بتوں پر قرآن پاک میں واضح طور پر موجود ہے۔ (از روح المعانی)

خیال رہے ابھی تک جو وضاحت کی گئی اعلیٰ حضرت کا ترجمہ اسی کے مطابق ہے راقم نے انداد کا

لغوی معنی ”مثل“ ذکر کیا ہے تاکہ دوسرے اقوال کو بھی شامل ہو سکے۔ یہ قول قتادہ اور مجاہد اور اکثر مفسرین کا ہے (روح المعانی) ”وہو قول اکثر المفسرین“ یہی قول اکثر مفسرین کا ہے۔ (کبیر)

(۲) ”اندادا“ کا اس آیت کریمہ میں دوسرا مطلب یہ ہے:

﴿وَتَأْتِيهَا مِنْهَا السَّادَةُ الَّذِينَ كَانُوا يَطِيعُونَهُمْ فَيَحْلُونَ لِمَكَانٍ طَاعَتُهُمْ مَا حَرَّمَ اللَّهُ وَيَحْرُمُونَ مَا أَحَلَّ اللَّهُ﴾

کہ اس سے مراد ان کے بڑے سرکردہ راہنما، رئیس، لیڈر ہیں کیونکہ یہ لوگ ان کی فرمانبرداری کرتے تھے ان کو انہوں نے رب تعالیٰ کی مثل بنا رکھا تھا اس لئے کہ اپنے رئیسوں کی اطاعت میں جن چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے حرام کیا وہ ان کو حلال کرتے تھے اور جن چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے حلال کیا وہ ان کو حرام کرتے تھے۔ یعنی جب ان کے رئیس کسی چیز کو حلال کہہ دیتے تو ان کی تابعداری کرنے والے لوگ اسے حلال ہی کہتے خواہ اس چیز کو رب تعالیٰ (اور اس کے رسول ﷺ) نے حرام ہی کیوں نہ کیا ہو۔ اور ان کے رئیس اگر کسی چیز کو حرام کہہ دیتے تو وہ اسے حرام ہی کہتے تھے حالانکہ وہی چیز رب تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے حلال کی ہوتی۔ (کبیر)

”وقال ابن عباس والسدي المراد بـالانداد الرؤسا المتبعون

يطيعونهم في معاصي الله“

حضرت ابن عباس اور سدی رضی اللہ عنہم کا قول یہ ہے کہ ”انداد“ سے مراد ان کے رئیس تھے جن کی تابعداری کی جاتی تھی اور یہ لوگ ان کی گناہوں میں اطاعت کرتے تھے۔ (قرطبی)

نتیجہ واضح ہوا: ﴿وَمِنَ النَّاسِ﴾ سے مراد کفار اور مشرکین لوگ ہیں خواہ ”اندادا“ سے مراد بت لئے جائیں یا ان کے رئیس لئے جائیں کیونکہ رب تعالیٰ کی طرف سے حرام کی ہوئی چیزوں کو حلال سمجھنا اور رب تعالیٰ نے جن چیزوں کو حلال کیا ان کو رئیسوں کی تابعداری میں حرام کرنا کفر ہی تو ہے۔

مقام افسوس: کافروں کے حق میں نازل ہونے والی آیات کو مسلمانوں پر اور بتوں کے حق میں نازل ہونے والی آیات یا رب تعالیٰ کے مقابل حلال اور حرام کرنے والے لوگوں کے متعلق نازل ہونے والی آیات کو انبیاء کرام اور اولیاء کرام پر چسپاں کرنا ظلم عظیم نہیں تو اور کیا ہے۔

مودودی صاحب کی تفسیر کے یہ الفاظ (یعنی خدائی کی جو صفات اللہ کے لئے خاص ہیں ان میں سے بعض کو دوسروں کی طرف منسوب کرتے ہیں اور خدا ہونے کی حیثیت سے بندوں پر اللہ تعالیٰ کے جو حقوق ہیں وہ سب یا ان میں سے بعض حقوق یہ لوگ ان دوسرے بناوٹی معبودوں کو ادا کرتے ہیں مثلاً سلسلہ اسباب پر حکمرانی، حاجت روائی، مشکل کشائی، فریادری، دعائیں سننا اور غیب و شہادت ہر چیز سے واقف ہونا یہ سب اللہ کی مخصوص صفات ہیں)۔

اسی مضمون کو پیش کر رہے ہیں جو اوپر ذکر کیا گیا ہے انبیاء کرام اور اولیاء کرام کو کس طرح مسلمان کس طرح حاجت روا، مشکل کشا، اور فریادرس سمجھتے ہیں اس کا ذکر راقم نے ﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ﴾ کی بحث میں کر دیا ہے۔ اور انبیاء کرام کے علم غیب کی بحث انشاء اللہ اپنے محل پر آ جائے گی البتہ ضمنی طور پر کئی مقام پر علامہ رازی رحمہ اللہ کے اقوال سے (نبی کریم ﷺ کا علم غیب آپ کا معجزہ ہے) بیان ہو چکا ہے۔

نبی کریم ﷺ دعا فرمائیں تو صاف آسمان پر بادل آ جائیں اسی وقت برسا شروع کر دیں اور جب تک آپ دعا نہ فرمائیں بارش رُکے نہیں یہ اسباب پر حکمرانی نہیں تو اور کیا ہے؟ ہاں البتہ یہ حکمرانی رب تعالیٰ نے آپ کو عطا کی ہے اور رب تعالیٰ کی حکمرانی ذاتی ہے کسی کی عطا سے حاصل نہیں رب تعالیٰ کی عطاء پر بھی کسی کا دل جلے تو کیا کہا جاسکتا ہے؟ اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کی زبان میں یہی کہہ دینا کافی ہے

جلتے ہیں جل جائیں گے سب اعداء تیرے نہ مٹا ہے نہ مٹے گا کبھی چرچا تیرا

اعتراض: صوفیاء کرام خود کہتے ہیں ”غیر اللہ“ (اللہ کے سوا اوروں) کی طرف دھیان نہ دو صرف رب تعالیٰ کی طرف توجہ کرو تم کہتے ہو ”انبیاء کرام اور اولیاء کرام“ بھی رب تعالیٰ کی عطاء سے حاجت روا ہیں کیا یہ تعلیمات اولیاء کرام کے مخالف تمہارا قول نہیں؟ علامہ رازی رحمہ اللہ صوفیاء کرام کا قول نقل فرماتے ہوئے رقم طراز ہیں:

”القول الثالث فی تفسیر الانداد قول الصوفیة والعارفین وهو ان کل شئی شغلت قلبک به سوی اللہ تعالیٰ فقد جعلته فی قلبک ندا للہ تعالیٰ“ (کبیر)

”اَنْدَاذَا“ کی تفسیر میں تیسرا قول صوفیاء کرام اور عارفین کا ہے کہ ہر وہ چیز جو تمہارے دل کو اللہ تعالیٰ کے سوا اوروں کی طرف لگا دے وہ اللہ تعالیٰ کی ”ند“ ہے۔

اس سے پتہ چلا کہ اللہ کے سوا اوروں کی طرف توجہ کرنا رب تعالیٰ کے ”انداد“ ماننے کے مترادف ہے۔

جواب: اولیاء کرام کے اقوال کو سمجھنا محبان اولیاء کرام کا ہی کام ہے بھلا عام انسان کیا سمجھے؟ صوفیاء کرام نے یہ فرمایا ہر وہ چیز جو تمہیں رب تعالیٰ سے ہٹا کر اوروں کی طرف لے جائے وہ رب تعالیٰ کی ”ند“ ہے لیکن انبیاء کرام اور اولیاء کرام کی طرف توجہ سے تو رب ملتا ہے یہ رب تعالیٰ سے ہٹانے والے نہیں بلکہ ملانے والے ہیں یہ اللہ والے ہیں جو اللہ سے ملا دیتے ہیں۔

آئیے ولی کامل کی تفسیر کو دیکھئے ”ولسی ولی منی شناسد“ (ولی کو ولی پہچانتا ہے) کے مطابق اقوال اولیاء کرام کو سمجھتے ہوئے کیا خوب کہا میری مراد اس سے پیر محمد کرم شاہ الازہری بھیروی رحمہ اللہ ہیں آپ فرماتے ہیں صوفیاء کرام نے ”انداد“ کی تفسیر یہ فرمائی ”کل ما کان مشغلا عن اللہ مانعا من امثال امرہ“ ہر وہ چیز جو انسان کو اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل کر دے اور اس کے احکام کی تعمیل سے روک دے وہ ”انداد“ سے ہے خواہ وہ بت ہوں گمراہ رئیس ہوں مال و دولت ہو فرزند و زن ہوں یا علم و فن ہر چیز جو اللہ تعالیٰ سے دور کرنے والی ہو وہ ”ند“ ہے اور پاش پاش کر دینے کے لائق۔

حضور نبی کریم ﷺ سے ہمیں جو عشق و عقیدت اور اولیاء کرام سے ہمیں جو محبت ہے وہ صرف اس لئے ہی تو ہے کہ وہ محبوبان خدا ہیں اور محبوب کا محبوب بھی محبوب ہی ہوا کرتا ہے جو اپنے دل میں اللہ تعالیٰ کے محبوب رسول اللہ ﷺ کے لئے محبت محسوس نہیں کرتا وہ یہ سمجھ لے کہ اسے اللہ تعالیٰ سے بھی محبت نہیں۔ (فیاء القرآن)

راقم بھی پیر صاحب اور دوسرے پیران عظام سے اسی لئے محبت کرتا ہے کہ یہ محبوبان محبوب خدا ہیں۔ حضرت پیر صاحب کو میں روح جان، دل کی دھڑکن سے تعبیر کرتا ہوں یہ میری ان سے والہانہ عقیدت و محبت ہے۔ (راقم)

يُحِبُّونَهُمْ كَحُبِّ اللَّهِ: محبت کرتے ہیں ان سے جیسے محبت کرتے ہیں اللہ سے

محبت کیا ہے؟ محبة ماخوذ ہے حب (بفتح الحاء) سے جس کا معنی ہے ”دانہ“ جیسے کہا جاتا

ہے حبة الحنطة (کندم کا دانہ) حبة الشعیر (جو کا دانہ)۔ دل کے دانہ (نقطہ) کو عام دانہ سے تشبیہ دی گئی پھر مجازی طور پر ”حب القلب“ کا معنی ”میلان قلب“ لے لیا گیا۔ کہا جاتا ہے ”حبت فهو محبوب الی اصاب حبه حبة قلبی ورسخ فیها“ میں نے اس سے محبت کی وہ میرا محبوب ہے اس کی محبت میرے دل کے نکتہ تک پہنچ گئی یعنی دل کی گہرائی تک پہنچ گئی اور راسخ ہو گئی۔ اور کہا جاتا ہے ”احبته فانا محب ای حبته بحبة قلبی“ میں نے اس سے محبت کی کیونکہ میں اس کا محبت ہوں یعنی میں نے دل کی گہرائی سے اس کے ساتھ محبت کی۔

بندے کی محبت رب تعالیٰ سے:

”ومحبة الله للعبد ارادة اكرامه واستعماله فی الطاعة وصونه عن المعاصی“
یعنی اللہ تعالیٰ کے ساتھ بندے کی محبت کرنے کا مقصد یہ ہے، کہ بندہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا ارادہ رکھتا ہے، اور اس کی ذات کو راضی کرنے کی مکمل کوشش کرتا ہے، اور یہی اس کا مقصد عظیم ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی محبت بندے سے:

”ومحبة الله للعبد ارادة اكرامه واستعماله فی الطاعة وصونه عن المعاصی“
یعنی بندے کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی محبت کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے بندے کو اپنا مکرم بنانے کا ارادہ رکھتا ہے اور بندے کو طاعت کی توفیق عطا فرماتا ہے اس لئے بندہ اس کا مطیع بن جاتا ہے اور بندے کو رب تعالیٰ گناہوں سے بچا لیتا ہے۔
(ماخوذ از بیضاوی و شیخ زادہ)

﴿يُحِبُّونَهُمْ كَحُبِّ اللَّهِ﴾ کا مطلب کیا ہے؟ زیادہ واضح اور صحیح قول تو یہ ہے:

”﴿يُحِبُّونَهُمْ﴾ يعظمونهم ويطيعونهم ﴿كَحُبِّ اللَّهِ﴾ كتعظيمه“

وہ ان سے جن کو اللہ کے سوا معبود بنائے ہوئے ہیں محبت کرتے ہیں یعنی ان کی تعظیم کرتے ہیں اور ان کی اطاعت کرتے ہیں جیسا کہ اللہ سے محبت کرتے ہیں اور اس کی تعظیم کرتے ہیں۔ (بیضاوی)

﴿يُحِبُّونَهُمْ كَحُبِّ اللَّهِ﴾ ای یسرون بین الاصنام و بین الله تعالیٰ فی

المحبة قال ابو اسحق وهذا القول الصحيح“

ابو احق نے کہا ہے کہ صحیح قول یہ ہے کہ اس کا مطلب ہے کہ وہ بتوں اور اللہ تعالیٰ سے محبت میں
برابری کرتے ہیں۔ (فرطی)

﴿ كَحَبِّ اللَّهِ ﴾ فِيهِ ثَلَاثَةُ اقْوَالٍ قِيلَ فِيهِ كَحَبِّهِمْ لِلَّهِ وَقِيلَ فِيهِ كَالْحَبِّ
الَّذِي عَلَيْهِمُ اللَّهُ وَقِيلَ فِيهِ كَحَبِّ الْمُؤْمِنِينَ لِلَّهِ

اس میں تین قول ہیں ایک یہ کہ وہ اپنے بنائے ہوئے معبودوں سے ایسی محبت کرتے جیسے اللہ
تعالیٰ سے محبت کرتے یہ ان حضرات کا قول ہے جو یہ کہتے ہیں کہ وہ رب تعالیٰ کو پہچانتے تھے لیکن پھر بھی
انہوں نے رب تعالیٰ کے شریک بنائے ہوئے تھے۔ اس کے بعد دو قول اور ذکر کرنے کے بعد علامہ
رازی رحمہ اللہ نے اسی قول کے متعلق تحریر فرمایا ”والقول الاول اقرب“ پہلا قول زیادہ قریب ہے۔
دوسرا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے بتوں اور رئیسوں سے اس طرح محبت کرتے جس طرح ان پر
اللہ تعالیٰ سے محبت کرنا لازم تھا اگرچہ وہ اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے نہیں تھے۔

تیسرا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے بتوں اور رئیسوں سے اس طرح محبت کرتے تھے جس
طرح مومن اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہیں۔ یہ دونوں قول ان حضرات کے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ وہ
لوگ اللہ تعالیٰ کو نہیں پہچانتے تھے۔ (از کبیر)

مبرد نے کہا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے ”يَحْبُونَ اصْنَامَهُمْ عَلَى الْبَاطِلِ كَحَبِّ
الْمُؤْمِنِينَ لِلَّهِ عَلَى الْحَقِّ“ وہ اپنے بتوں سے باطل طریقہ سے محبت کرتے تھے جیسے مومنین اللہ
تعالیٰ سے محبت کرتے ہیں حق طور پر زجاج نے کہا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے:
”اَيُّهُمْ مَعَ عَجْزِ الْاَصْنَامِ يَحْبُونَهُمْ كَحَبِّ الْمُؤْمِنِينَ لِلَّهِ مَعَ قُدْرَتِهِ“

کہ وہ بتوں کے عاجز ہونے کے باوجود ان سے ایسی محبت کرتے جیسی مومنین اللہ تعالیٰ سے
محبت کرتے ہیں جو قادر ذات ہے۔ (فرطی)

تاہم راقم کے نزدیک بھی پہلا قول ہی زیادہ معتبر ہے کہ وہ اپنے بنائے ہوئے معبودوں سے
محبت کرتے جیسے اللہ سے محبت کرتے کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی معرفت رکھتے تھے اس پر اللہ تعالیٰ کا
ارشاد گرامی بہت واضح ہے:

﴿وَالَّذِينَ اتَّخَذُوا مِنْ دُونِهِ أَوْلِيَاءَ مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللَّهِ زُلْفَى﴾ (زمر ۳)

”اور وہ جنہوں نے اس کے سوا اور والی بنائے (کہتے ہیں) ہم تو انہیں صرف اس لئے پوجتے ہیں کہ یہ ہمیں اللہ کے قریب کر دیں۔“

بندہ رب تعالیٰ سے محبت کرتا ہے اس میں اختلاف نہیں:

امت کا اس میں اختلاف نہیں کہ یہ کہنا درست ہے کہ بندہ رب تعالیٰ سے محبت کرتا ہے قرآن پاک سے یہ مسئلہ واضح طور پر ثابت ہے یہ آیت جس کی وضاحت جاری ہے اس میں سے۔

وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ : ایمان والے اللہ سے زیادہ محبت کرتے ہیں۔ اور دوسری آیت کریمہ میں ﴿يُحِبُّوهُمْ وَيُحِبُّونَهُ﴾ رب ان سے محبت کرتا ہے اور وہ رب سے محبت کرتے ہیں۔

(از کبیر)

حضرت ابراہیم علیہ السلام رب تعالیٰ کے محب و محبوب:

ابراہیم علیہ السلام کے پاس ملک الموت (عزرائیل) آئے کہ آپ کی روح کو قبض کر لیں تو آپ نے اس فرشتے کو کہا ”ہل رأیت خلیلاً یمیت خلیلاً“ کیا تم نے دیکھا ہے کہ کوئی دوست اپنے ہی دوست کو مار دے۔ یعنی میں جب رب تعالیٰ کا خلیل ہوں تو رب تعالیٰ کا تمہیں میرے پاس روح قبض کرنے کے لئے بھیجنا عجیب سا معلوم ہوتا ہے اللہ تعالیٰ نے آپ کی طرف وحی کی ارشاد فرمایا ﴿ہل رأیت خلیلاً یموت لقاء خلیلاً﴾ کیا تم نے دیکھا ہے کہ دوست اپنے دوست سے ملنے کو ناپسند کرے۔ تو آپ نے یہ سنتے ہی ملک الموت کو کہا ”یا ملک الموت الآن قاقبض“ اے ملک الموت اب روح قبض کر لے۔

(از کبیر)

نبی کریم ﷺ کی محبت جنت کا ذریعہ:

”وجاء اعرابی الى النبی ﷺ فقال یا رسول اللہ متی الساعة؟ فقال ما اعددت لها؟ فقال ما اعددت کثیر صلوة ولا صیام الا انی احب اللہ ورسولہ فقال علیہ الصلوۃ والسلام المرء مع من احب فقال انس فما رأیت المسلمین فرحوا بشئی بعد الاسلام فرحهم بذلك“

ایک اعرابی نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے عرض کرنے لگے ”یا رسول اللہ قیامت

کب آئے گی؟ آپ نے فرمایا تم نے قیامت کے لئے تیاری کیا کی؟ تو وہ کہنے لگے میں نے بہت (نفل) نمازیں تو نہیں ادا کیں اور بہت (نفل) روزے تو نہیں رکھے البتہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے محبت کرتا ہوں آپ نے فرمایا انسان اسی کے ساتھ ہوگا جس سے وہ محبت کرتا ہے حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نے مسلمانوں کو اسلام لانے کے بعد کسی چیز پر اتنا خوش ہوتے ہوئے نہیں دیکھا جتنا آپ کے اس ارشاد گرامی پر خوش ہوئے۔

واضح ہوا کہ محبت حبیب خدا قرب الہی کا ذریعہ ہے اور جنت میں جانے کا ذریعہ ہے اللہ تعالیٰ محبت مصطفیٰ کریم ﷺ پر ہی قائم رکھے یہی مسلمان کا سرمایہ ہے۔ (از کبیر)

عیسیٰ علیہ السلام کا ارشاد: حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا تین آدمیوں پر گزر ہوا جن کے بدن کمزور تھے اور ان کے رنگ بدلے ہوئے تھے آپ نے ان سے پوچھا تمہارا حال جو میں دیکھ رہا ہوں اس کی وجہ کیا ہے؟ ”فقالوا الخوف من النار“ تو انہوں نے کہا آگ کے خوف سے ہمارا یہ حال ہے۔ ”فقال حق علی اللہ ان یؤمن الخائف“ تو آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے اپنے ذمہ یہ لگا رکھا ہے کہ وہ خوف کرنے والوں کو امن میں رکھے۔

پھر آپ کا گزرتین اور آدمیوں پر ہوا وہ ان پہلے آدمیوں سے زیادہ کمزور تھے اور ان کے رنگ بدلے ہوئے تھے آپ نے ان سے پوچھا تمہیں اس حال پر کس چیز نے پہنچایا ہے؟ ”قالوا الشوق الی الجنة“ انہوں نے کہا جنت کے شوق نے ہمیں اس حال پر پہنچا دیا ہے ”فقال حق علی اللہ ان یعطیکم ما ترجون“ تو آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ کرم پر لیا ہوا ہے کہ وہ تمہیں وہ چیز عطا کرے جس کی تم امید کرتے ہو۔

پھر آپ کا تین اور آدمیوں سے گزر ہوا جو پہلے تمام کی بنسبت زیادہ کمزور تھے اور ان کے رنگ بدلے ہوئے تھے اور گویا کہ ان کے چہروں پر نور نظر آ رہا تھا آپ نے ان سے پوچھا تم اس حال پر کیسے پہنچ گئے ہو؟ ”قالوا بحب اللہ“ انہوں نے کہا اللہ تعالیٰ سے محبت کرنے کی وجہ سے ہم اس حال پر پہنچ گئے ہیں۔

”فقال علیہ الصلوٰۃ والسلام انتم المقربون الی اللہ یوم القیامۃ“

تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا قیامت کے دن تم اللہ تعالیٰ کے مقرب ہو گے۔

فائدہ: قیامت کے دن امتوں کو ان کے انبیاء کرام کے ناموں سے بلایا جائے گا ”یا امة موسیٰ ، یا امة عیسیٰ ، یا امة محمد“ اے موسیٰ علیہ السلام کی امت ، اے عیسیٰ علیہ السلام کی امت ، اے محمد مصطفیٰ ﷺ کی امت۔ ”غیر المحبین منهم فانهم ینادون یا اولیاء اللہ“ جو ان میں سے محبت کرنے والے نہیں ہوں گے بیشک ان کو ندا دی جائے گی اے اللہ کے دوستو۔ (یعنی تمہارے مومن ہونے کی وجہ سے رب تعالیٰ نے تمہارے ساتھ محبت کو نہیں چھوڑا وہ تمہیں اپنا دوست سمجھتا ہے)

”وفی بعض الكتب، عبدی انا وحقک لک محب فبحقی علیک
کن لی محبا“

اور بعض کتب میں ہے کہ اللہ تعالیٰ فرمائے گا اے میرے بندے میں نے اپنے ذمہ کرم پر یہ لگایا ہے کہ میں تیرے ساتھ محبت کروں اور تیرا حق یہ ہے کہ تو میرے ساتھ محبت کر۔ (از کبیر)

رب تعالیٰ سے عوام کی محبت:

”فاذا قلنا نحب الله فمعناه نحب طاعة الله وخدمته او نحب ثوابه واحسانه“

جب ہم کہتے ہیں ہم اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہیں تو اس کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ ہم اس کی طاعت اور خدمت سے محبت کرتے ہیں یا اس کا مطلب یہ ہوگا ہم اس کی طرف سے حاصل ہونے والے ثواب اور احسان سے محبت کرتے ہیں۔

عارفین کی رب تعالیٰ سے محبت:

”واما العارفون فقد قالوا، العبد قد يحب الله تعالى لذاته واما حب

خدمته او حب ثوابه فدرجة نازلة“

عارفین حضرات یہ فرماتے ہیں کہ کبھی بندہ اللہ تعالیٰ کی ذات پاک سے بلا کیف محبت کرتا ہے رب تعالیٰ کی خدمت یعنی طاعت سے محبت کرنا اور اس کی طرف سے حاصل ہونے والے ثواب سے محبت کرنا یہ گھٹیا درجہ ہے یعنی درجہ عوام کا ہے اور ذات کبریا سے محبت کرنا عارفین کا درجہ ہے۔

عارفین کی دلیل:

عارفین حضرات یہ کہتے ہیں کہ ہم دیکھتے کہ لذت ذاتی طور پر محبوب ہے اور کمال بھی ذاتی طور پر محبوب ہے۔

لذت سے ذاتی طور پر محبت کیسے؟

وہ اس طرح ہے کہ جب ہم سے پوچھا جائے تو تم کسب کیوں کرتے ہو؟ تو ہم کہتے ہیں ہم مال حاصل کرنے کے لئے کسب کرتے ہیں اگر پوچھا جائے تم مال کیوں حاصل کرتے ہو؟ تو ہم جواب دیتے ہیں کہ ہم مال اس لئے حاصل کرتے ہیں تاکہ کھانے اور پینے کی چیزیں حاصل کر سکیں پھر اگر ہم سے پوچھا جائے کہ تم کھانے اور پینے کی چیزیں کیوں حاصل کرتے ہو؟ تو ہم کہتے ہیں اس لئے کہ لذت حاصل کریں اور درد کو دور کریں۔

”فاذا قيل لنا ولم تطلبون اللذة وتكرهون الالم؟ قلنا هذا غير معلل“

جب ہم سے یہ کہا جائے کہ تم لذت حاصل کیوں کرتے ہو اور درد کو ناپسند کیوں کرتے ہو؟ تو ہم جواب دیتے ہیں اس کی کوئی اور وجہ نہیں۔ کیونکہ اگر ہر چیز کی علت ہی پیش کی جائے تو دور یا تسلسل لازم آئے گا جو محال ہے اس لئے ضروری ہے کہ مطلوب تک اسباب کا سلسلہ ختم ہو جائے مطلوب کے حصول کی اور کوئی وجہ نہ پائی جائے۔

”واذا ثبت ذلك فنحن نعلم ان اللذة مطلوبة الحصول لذاتها والالم مطلوب الدفع لذاته“

جب یہ بات ثابت ہوگئی تو اسی سے ہمیں معلوم ہو گیا کہ لذت کا حصول ذاتی طور پر مطلوب ہے اور اسی طرح درد و تکلیف کو منفع کرنا بھی ذاتی طور پر مطلوب ہے۔

کمال محبوب لذاتہ کیسے؟

”واما الكمال فلا نأحب الانبياء والاولياء لمجرد كونهم موصوفين

بصفات الكمال“

جب ہم انبیاء کرام اور اولیاء کرام سے محبت کرتے ہیں تو اس کی وجہ صرف یہ ہوتی ہے کہ وہ کمال سے متصف ہیں یعنی ان کے کمال کو دیکھ کر ان سے محبت کرنا ذاتی طور پر کمال سے ہی محبت ہے۔ جب ہم بعض بہادروں کے واقعات سنتے ہیں اور ان کی شجاعت کے واقعات سنتے ہیں جیسے رستم اور اسفندیار کے تو ”مالت قلوبنا اليهم“ ہمارے دل ان کی طرف میلان کرتے ہیں یعنی ہمیں ان سے محبت ہو جاتی ہے۔

”حتی انه قد یبلغ ذلک المیل الی انفاق المال العظیم فی تقریر تعظیمه وقد ینتہی ذلک الی المخاطرة بالروح“

یہاں تک کہ وہ محبت اس درجہ تک پہنچ جاتی ہے کہ ہم اس محبوب کی عظمت کو ثابت کرنے کے لئے عظیم مال خرچ کرتے ہیں اور کبھی اس محبت کی انتہاء روح کے سرور اور وجدانی کیفیت کی حرکت تک پہنچا دیتی ہے۔

مقام توجہ: ”وكون اللذة محبوبة لذاتها لا ینافی كون الکمال محبوبا لذاته“

لذت کا ذاتی طور پر محبوب ہونا کمال کے ذاتی طور پر محبوب ہونے کے منافی نہیں یعنی ایک چیز کی لذت بھی مطلوب ہو اور وہ چیز بھی مطلوب ہو ایسا ممکن ہے اس میں کوئی منافات نہیں۔ مذکورہ بالا بحث سے نتیجہ حاصل ہوا: جن لوگوں نے اللہ تعالیٰ سے محبت کو اس کی طاعت کی محبت اور اس سے حاصل ہونے والے ثواب سے تعبیر کیا ”فهؤلاء هم الذين عرفوا ان اللذة محبوبة لذاتها ولم يعرفوا ان الکمال محبوب لذاته“ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے صرف لذت کو ہی ذاتی طور پر محبوب سمجھا وہ کمال کو ذاتی طور پر محبوب نہ سمجھ سکے۔ یہ لوگ درحقیقت عارفین کے درجہ میں نہیں پہنچے اسی وجہ سے ان کی نظر کوتاہ ہے۔

”اما العارفون الذين قالوا انه تعالى محبوب فی ذاته ولذاته فهم الذين

انکشف لهم ان الکمال محبوب لذاته“

عارفین حضرات نے کہا کہ بیشک اللہ تعالیٰ ہی کی ذات محبوب ہے اور اس کی محبت میں کوئی واسطہ نہیں بلکہ اس کی محبت ذاتی ہے ان حضرات پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ کمال محبوب لذاته ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اکمل اکاملین ہے اس لئے کہ وہ واجب الوجود ہے اور اپنے سے سوا ہر کسی سے بے پرواہ ہے اس کو کسی کی محتاجی نہیں۔

”وكمال كل شئی فهو مستفاد منه وانه سبحانه وتعالى اکمل

اکاملین فی العلم والقدرة“

بلکہ ہر چیز کو کمال اللہ تعالیٰ سے ہی حاصل ہے وہی ذات علم و قدرت میں اکمل اکاملین ہے جب

ہم کسی عالم انسان سے محبت کرتے ہیں تو اس کے علم کے کمال کی وجہ سے اس سے محبت کرتے ہیں۔ اور جب ہم کسی شجاع انسان سے محبت کرتے ہیں تو اس کی شجاعت کے کمال کی وجہ سے اس سے محبت کرتے ہیں اور جب ہم زاہد سے محبت کرتے ہیں تو اس کے غیر مناسب افعال سے بری ہونے کی وجہ سے اس سے محبت کرتے ہیں۔

”فكيف لا نحب الله وجميع العلوم بالنسبة الى علمه كالعدم وجميع القدرة بالنسبة الى قدرته كالعدم وجميع ما للخلق من البراءة عن النقائص بالنسبة الى ما للحق من ذلك كالعدم“

تو ہم اللہ تعالیٰ سے کیوں محبت نہ کریں جب کہ اسکے علم کے سامنے تمام مخلوق کے علوم نہ ہونے کے برابر ہیں اور اس کی قدرت کے سامنے تمام مخلوق کی قدرت نہ ہونے کے برابر ہے اور اس کے نقائص سے پاک ہونے کے سامنے تمام مخلوق کا نقائص سے پاک ہونا نہ ہونے کے برابر ہے ”فلزم القطع بان المحبوب الحق هو الله تعالى“ یقینی طور پر واضح ہوا کہ حقیقی محبوب حق تعالیٰ کی ذات پاک ہی ہے اسی کی ذات محبوب ہے اس کی ذات کے محبوب ہونے میں کوئی واسطہ نہیں پایا گیا۔ اللہ تعالیٰ کی معرفت کا ذریعہ: جب یہ نکتہ بیان ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ سے محبت ہی کمال لذاتہ ہے تو اسی سے یہ واضح ہو جانا چاہیے کہ عام بندے کی رسائی (سوائے انبیاء کرام کے) اللہ تعالیٰ کی ذات اور کمال تک ممکن نہیں جب تک وہ کائنات کو نہ دیکھے کیونکہ تمام کائنات اللہ تعالیٰ کی مخلوق اور مملوک ہے انسان جب اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں نظر و فکر کرے گا تو وہ اللہ تعالیٰ کی حکمت اور قدرت کے دقائق پر مطلع ہوگا۔

”ولما كان لانهاية لمراتب وقوف العبد على دقائق حكمة الله تعالى“

فلا جرم لانهاية لمراتب محبة العباد لجلال حضرة الله تعالى“

جب اللہ تعالیٰ کی حکمت کے دقائق پر بندے کی معرفت کے مراتب کی کوئی انتہا نہیں تو یقیناً اس کے اوپر مرتب ہونے والی محبت جو بندوں کو اللہ تعالیٰ سے ہے اس کے مراتب کی بھی کوئی حد نہیں۔ محبت کے مراتب کے اسباب: جب یہ واضح ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں اس کی قدرت اور حکمت کے دقائق میں نظر و فکر کرنے سے رب تعالیٰ کی محبت حاصل ہوتی ہے تو اسی سے یہ واضح ہو گیا کہ

بندہ جتنا زیادہ اللہ تعالیٰ کی حکمت کے دقائق کا مطالعہ کرے گا اسی قدر اسے اللہ تعالیٰ کی محبت میں ترقی حاصل ہوگی جتنا یہ مطالعہ اور غور و فکر بڑھتا چلا جائے گا اتنا ہی وہ بندے کے دل پر محبت باری تعالیٰ کے غلبہ کا ذریعہ ہوگا۔

رب تعالیٰ کی محبت بارش کی مثال ہے جس طرح کثیر مقدار موسلا دھار بارش جب برتی ہے تو باوجود اس کے کہ بارش میں لطافت ہے لیکن وہ پتھر میں سوراخ کر دیتی ہے ”فاذا غاصت محبة الله في القلب تكيف القلب بكيافيتها واشتد الفه بها“ جب اللہ تعالیٰ کی محبت دل میں اثر انداز ہو جاتی ہے تو دل کی کیفیت بدل جاتی ہے اس میں وجدانی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور محبت میں شدت آ جاتی ہے۔

محبت کا اعلیٰ معیار:

”وكلما كان الالف اشد كانت النفرة عما سواه اشد لان الالتفات الى ما عداه يشغله عن الالتفات اليه والمانع عن حضور المحبوب مكروه فلا تزال تتعاقب محبة الله ونفرته عما سواه على القلب“

جب رب تعالیٰ سے محبت زیادہ ہوتی چلی جائے گی تو اس کے ماسوا سے اسی طرح نفرت شدید ہوتی چلی جائے گی کیونکہ وہ رب تعالیٰ کی ذات کی طرف متوجہ نہیں ہونے دیتے۔ یہ یقینی بات جو چیز محبوب سے روکے وہ مکروہ نظر آتی ہے لہذا محبت تعاقب کرتی رہتی ہے جو ماسوا سے دل میں نفرت پیدا کر دیتی ہے۔ نفرت اسے ماسوا سے دور کر دیتی ہے وہ رب تعالیٰ کے ماسوا کو درجہ فنا میں سمجھتا ہے:

”فيصير ذلك القلب مستنيراً بانوار القدس مستضيئاً باضواء عالم العصمة فانما عن الحظوظ المتعلقة بعالم الحدوث وهذا المقام اعلیٰ الدرجات“

تو اس کا دل انوار قدس سے روشن ہو جاتا ہے جو چیزیں رب تعالیٰ سے دور ہونے سے اسے بچاتی ہیں ان کی روشنی سے وہ روشنی حاصل کرتا ہے اور جو چیزیں اسے رب تعالیٰ سے دور کر کے اس عالم حادث (فانی دنیا) کی طرف لگاتی ہیں وہ ان سے مکمل طور پر درجہ فنا میں سمجھتا ہے یہی محبت کا اعلیٰ معیار ہے۔

غلط فہمی کا ازالہ: غیر اللہ سے مدد نہ مانگو کی رٹ لگانے والے علامہ رازی رحمہ اللہ کی اس عبارت کو تو پیش کر دیتے ہیں کہ انبیاء کرام اور اولیاء کرام تمام کو فانی سمجھ کر رب تعالیٰ سے محبت کرو اگر ایسا نہیں کرو گے تو تمہیں اللہ تعالیٰ کی کامل محبت حاصل نہیں ہوگی۔ لیکن حقیقت بات یہ ہے کہ وہ علم سے دور ہیں عبارات کی اصل روح کو سمجھنے سے غافل ہیں کاش کہ وہ علامہ رازی رحمہ اللہ کی ان عبارات ”لان الالتفات الی ما عداہ یشغله عن الالتفات الیہ“ ماسوا کی طرف توجہ کرنے سے رب تعالیٰ سے توجہ ہٹ جائے۔

”والمانع عن حضور المحبوب مکروه“ جو چیز محبوب کے ذکر سے روکے وہ مکروہ ہے ”مستضیاء باضواء عالم العصمة“ جو چیزیں اللہ تعالیٰ سے دور ہونے سے بچائیں ان سے وہ اپنے آپ کو روشن کریں۔ ”فانیا عن الحظوظ المتعلقة بعالم الحدوث“ وہ چیز جو انسان کو فانی دنیا کی طرف لگا دیں ان کو دور پھینک دے۔ (ازکبر) کو محبت سے پڑھیں نفرت سے نہ پڑھیں علم سے پڑھیں، جہالت سے نہ پڑھیں۔ غور سے پڑھیں بغیر سوچنے کے نہ پڑھیں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے میرے علم سے پڑھیں۔ تو ان کو یہ بات سمجھ آ جائے کہ جو چیزیں اللہ تعالیٰ سے دور کریں ان سے وہ بھی دور رہے اور جو چیزیں اللہ تعالیٰ کے قریب کریں ان کے یہ بھی قریب رہے۔

گناہ، معاصی اللہ تعالیٰ سے دور کرتے ہیں ان سے دور رہے انبیاء کرام کی محبت اور اولیاء کرام کی محبت کو رب تعالیٰ کی محبت کا ذریعہ سمجھے اور یہ عقیدہ رکھے کہ اللہ تعالیٰ سے محبت کرنا ہی دراصل مقصود ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے محبوب اس کی محبت کا ذریعہ ہیں اس لئے ان سے محبت کرنا دراصل رب تعالیٰ سے ہی محبت ہے جس طرح نماز کے صحیح ادا کرنے میں اس کے لئے شرائط ہیں طہارت اور نیت وغیرہ ان کا نماز کے ساتھ پایا جانا ضروری ہے وہ نماز سے جدا نہیں۔ (راقم)

شوق الی اللہ کا مطلب: شوق اس وقت تک متصور نہیں ہوتا جب تک اس چیز کا کچھ ادراک (علم) پایا جائے اور کچھ نہ پایا جائے ”فاما الذی لم یدرک اصلا فلا یشواق الیہ“ جب کسی چیز کا ذرا بھی ادراک نہ پایا جائے انسان اس کا مشتاق نہیں ہوتا اس لئے کہ جب کسی کو دیکھا ہی نہ ہو اور کسی چیز کے اوصاف کا ہی پتہ نہ ہو تو اس کے مشتاق ہونے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ ”ولو ادرك

کمالہ لا یشتاۃ الیہ“ اور اگر ایک چیز کی ذات کو کامل طور پایا گیا تو اس کا اشتیاق بھی باقی نہیں رہتا۔ محبوب کے اشتیاق کی دو وجہ: ایک ان میں سے یہ ہے کہ محبوب کو دیکھا لیکن محبوب غائب ہو گیا تو محبت کو خیالات آتے ہی رہیں گے اس کا اشتیاق بڑھتا ہی چلا جائے گا کہ وہ مجھ سے دور کیوں ہو گیا۔ اس کے غائب ہونے کی کیا وجہ ہے کاش کہ وہ پھر نظر آئے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ محبوب کے چہرہ کی ایک جھلک نظر آئی لیکن اس کے گیسو نہیں دیکھے اس کی آنکھوں کا مشاہدہ نہیں کیا اس کے دیگر محاسن نہیں دیکھے تو یہ مشتاق ہوتا ہے کہ میں اسے کامل طور پر دیکھ لوں اس کے تمام محاسن نظر آجائیں۔

بندے کا رب تعالیٰ کا مشتاق ہونا: دونوں وجہ جو بیان کی گئی ہیں انکے لحاظ سے بندہ رب تعالیٰ کا مشتاق ہوتا ہے اگرچہ اسکی کیفیت وہ نہیں جو بندہ کسی بندے کا مشتاق ہو تو اس کی کیفیات جو بیان کی گئی ہیں۔ رب تعالیٰ کے اشتیاق کی ایک وجہ یوں بیان کی جاتی ہے۔ عارفین پر اگرچہ امور الہیہ بہت زیادہ واضح ہوتے ہیں لیکن پھر بھی وہ اور خیالات سے مکمل طور پر پاک نہیں ہوتے ہیں خیالات کا اس جہان میں پایا جانا ضروری ہے حکایات اور تمثیلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اسلئے رب تعالیٰ کی تجلیات آخرت میں ہی حاصل ہونی ہے لہذا ان تجلیات کے حاصل ہونے کا اشتیاق ہر عارف کو رہتا ہے۔

دوسری وجہ اللہ تعالیٰ کے اشتیاق کی یہ ہے کہ امور الہیہ کی کوئی انتہا نہیں بندے پر بعض امور منکشف ہوتے ہیں اور باقی امور پوشیدہ رہتے ہیں جن کی کوئی انتہا نہیں۔ جب عارف کو جن امور کا ادراک حاصل ہوتا ہے وہ کم ہیں اور جن کا ادراک حاصل نہیں ہوتا وہ زیادہ ہیں۔ ”فانہ لا یزال یکون مشتاقا الی معرفتھا“ بیشک وہ ہمیشہ ان کی معرفت کا مشتاق رہتا ہے۔

تنبیہ: پہلی قسم کا اشتیاق دار آخرت میں ختم ہو جائے گا کیونکہ اس میں طلب اللہ تعالیٰ کو دیکھنے اور ملاقات کرنے اور مشاہدہ کرنے کی پائی گئی ہے وہ آخرت میں حاصل ہو جائے گی تو لازمی طور پر اشتیاق بھی باقی نہیں رہے گا۔

دوسری وجہ کا اشتیاق ختم نہیں ہوگا کیونکہ اللہ تعالیٰ کے افعال کی حکمت کی کوئی انتہا نہیں اسی وجہ سے ان کے اشتیاق کی بھی کوئی انتہا نہیں۔

(ماخوذ از کبیر)

مومنوں کو رب تعالیٰ سے محبت کیسے؟ متکلمین حضرات بیان فرماتے ہیں کہ مومنوں کو رب تعالیٰ سے محبت دو وجہ سے ہے۔ ایک یہ ہے کہ مومنین کی محبت کی دار و مدار اس بات پر ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی تعظیم کرتے ہیں اور اس کی مدح اور ثناء بیان کرتے ہیں اور عبادت صرف اسی ذات کی کرتے ہیں جو شرک سے پاک ہوتی ہے اور غیر مناسب اعتقادات سے وہ پاک ہوتے ہیں۔ لیکن مومنوں کے بغیر کفار اور مشرکین، یہود اور نصاریٰ اور ہنود رب تعالیٰ سے اس طرح کی محبت نہیں کرتے۔

دوسری وجہ مومنین کی رب تعالیٰ سے محبت کی یہ ہے کہ اس کے ساتھ امید اور ثواب ملے ہوئے ہوں اور اس کے عظیم مرتبہ کی رغبت پائی جائے اور عذاب کا خوف پایا جائے اور عذاب سے خلاصی کی راہ تلاش کی جائے۔

”ومن یعبد اللہ ویعظمہ علیٰ هذا الحد تكون محبته لله اشد“

اور جو شخص اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا ہو اور اس کی تعظیم اس حد تک کرتا ہو جو ہم نے بیان کی تو اسے اللہ تعالیٰ سے بہت محبت حاصل ہے۔ عارفین حضرات کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی محبت کا سبب اس کی معرفت ہے وہ اللہ تعالیٰ کو بقدر طاقت بشریہ کے پہچانیں۔ کیونکہ معرفت کو محبت لازم ہے جیسے جیسے معرفت بڑھتی چلی جائے گی ایسے ہی ان کی محبت بھی بڑھتی چلی جائے گی۔

مومنین کی رب تعالیٰ سے محبت زیادہ کیسے؟

بظاہر ایک وہم پیدا ہوتا ہے کہ مومنوں کو اللہ تعالیٰ سے محبت زیادہ کیسے ہے:

”مع انا نری الہنود یاتون بطاعات شاقۃ لا یأتی بشئی منها احد من

المسلمین ولا یاتون بها الا للہ تعالیٰ ثم یقتلون انفسہم حبا للہ تعالیٰ“

حالانکہ ہندو لوگ بھی مشقت آمیز عبادت و طاعت بجالاتے ہیں مسلمان اس طرح مشقت نہیں برداشت کرتے ان کی طاعات بھی اللہ تعالیٰ کے لئے ہی ہوتی ہیں پھر وہ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی محبت میں قتل بھی کر دیتے ہیں۔

پہلا جواب: بیشک مومنین اپنے عجز اور خشوع و خضوع میں صرف اللہ تعالیٰ کی رضا طلب کرتے ہیں بخلاف مشرکین کے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتے ہیں جب انہیں کوئی حاجت درپیش آتی ہے

جب ان کی حاجت زائل ہو جاتی ہے تو وہ اپنے معبودان باطلہ کی طرف رجوع کر لیتے ہیں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿فَإِذَا رَكِبُوا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ فَلَمَّا نَجَّاهُمْ إِلَى الْبَرِّ إِذَا هُمْ يُشْرِكُونَ﴾
(عنکوت ۱۵)

پھر جب کشتی میں سوار ہوتے ہیں اللہ کو پکارتے ہیں خالص کرتے ہیں اسی کے لئے دین پھر جب وہ نجات دیتا ہے ان کو خشکی کی طرف ج بھی شرک کرنے لگتے ہیں۔

”والمومن لا يعرض عن الله في الضراء والسراء والشدة والرخاء
والكافر قد يعرض عن ربه فكان حب المؤمن اقوى“

اور مومن اللہ تعالیٰ سے اعراض نہیں کرتا خواہ تنگی ہو یا خوشی ہو خواہ مشکل ہو یا آسانی ہو لیکن کافر کبھی اللہ تعالیٰ سے اعراض بھی کر لیتا ہے اسی وجہ سے مومن کی اللہ تعالیٰ سے محبت قوی اور کثیر ہے۔
دوسرا جواب: جو شخص اللہ تعالیٰ کے غیر کسی چیز کی قضاء پر راضی ہو گیا تو اس نے اللہ تعالیٰ کی ملکیت میں غیر کو شریک کر لیا حالانکہ اس کی ملکیت میں کسی کو تصرف کا کوئی حق حاصل نہیں۔

”فاللئک الجہال قتلوا انفسہم بغیر اذنہ اما المؤمنون قد یقتلون
انفسہم باذنہ وذلك في الجهاد“

یہ جاہل لوگ اپنے آپ کو قتل کرتے ہیں لیکن ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی حکم نہیں ہوتا بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی اجازت نہیں ہوتی، اپنے آپ کو آگ لگا دینا، بھوک سے اپنے آپ کو مار دینا رب تعالیٰ کو ناراض کرنا ہے نہ کہ راضی کرنا، یہ اللہ تعالیٰ کی محبت نہیں بلکہ اس کے احکام سے عدولی کر کے اس سے بغاوت ہے۔ لیکن مؤمنین اپنی جانوں کو اللہ تعالیٰ کی اجازت سے قربان کرتے ہیں یعنی جہاد میں اپنی جانیں قربان کرتے ہیں کیونکہ کافروں سے جہاد کرنے کا حکم اللہ تعالیٰ نے دیا ہے لہذا اس میں اس کی رضا پائی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ مومن کو اللہ تعالیٰ سے بہت زیادہ محبت ہے اور اتنی محبت کفار کو کبھی نہیں ہو سکتی۔

تیسرا جواب: کافر کو جب شدید عذاب میں مبتلا کیا جائے گا تو اسے رب تعالیٰ کی معرفت حاصل نہیں

رہے گی جو اس نے کام کئے تھے وہ باطل ہو جائیں گے۔ لیکن مومن کے اعمال ضائع نہیں ہوں گے اسے اپنے نیک اعمال کی جزاء حاصل ہوگی مومن اگر گناہوں کی وجہ سے زیر عتاب آ بھی گئے تو وہ رب تعالیٰ کو نہیں بھولیں گے انہیں رب تعالیٰ کی معرفت حاصل رہے گی یہی وجہ ہے کہ مومن کو اللہ تعالیٰ سے بہت زیادہ محبت حاصل ہے۔

چوتھا جواب: "قال ابن عباس ان المشرکین کانوا یعبدون صنما فاذا راوا اشياء احسن منه ترکوا ذلک و اقبلوا علی عبادۃ الاحسن"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ بیشک مشرکین ایک بت کی عبادت کرتے جب اس سے اور کوئی خوبصورت بت مل گیا تو پہلے خدا کو پھینک دیتے تو نئے خوبصورت معبود کی عبادت شروع کر دیتے۔

کیا ہی گھٹیا معیار تھا ان کی عبادت کا، لیکن بفضلہ تعالیٰ مومن کی عبادت کا معیار بہت بلند و بالا ہے وہ صرف رب تعالیٰ کی ہی محبت کرتا ہے اسی لئے اس کی عبادت کرتا ہے باقی تمام محبوبان خدا سے مومنین کی محبت درحقیقت محبت خدا کا ذریعہ ہے اس لئے مومن کسی نبی کو کسی ولی کو معبود نہیں مانتا۔

پانچواں جواب: مومنین صرف ایک رب تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں اسے "وحدہ لا شریک لہ" مانتے ہیں لیکن کافر کئی کئی بتوں کی عبادت کرتے ہیں لہذا اگر وہ کسی ایک بڑے بت کو اپنا معیاری خدا بھی مانے تو پھر اس کے ساتھ اور بتوں کو شریک کرنے کی وجہ سے اس ایک سے ان کی محبت میں کمی واقع ہوتی ہے۔ "اما لا لہ الواحد فتنضم محبة الجميع الیہ" لیکن مومنین کا فقط ایک ہی معبود ہے اس لئے مومنوں کی تمام محبتیں اسی ایک کے ساتھ آ کر مل جاتی ہیں۔ (از کبیر)

یہ الفاظ ذرا غور و فکر سے ایمان اور محبت سے پڑھیں تو خود بخود سمجھ آئے گا کہ مومنوں کی محبت اللہ تعالیٰ کے بغیر کسی اور سے معبود سمجھ کر نہیں اور نہ ہی خالق سمجھ کر اللہ تعالیٰ کی مخلوق سمجھ کر اور اس کے برگزیدہ بندے سمجھ کر جب ان سے محبت ہوئی تو وہ تمام محبوبان خدا سے محبت درحقیقت خدا سے ہی محبت ہے کاش کہ اللہ بے سمجھوں کو سمجھ عطا کر دے حق و باطل میں تمیز کر سکیں۔ (رافع)

کافروں کا اپنے معبودوں سے دلچسپ سلوک:

”ويعبدون الصنم زمانا ثم يرفضونه الى غيره وربما اكلوه كما يحكى
ان باهلة كانت لهم اصنام من حيس فجاءوا في قحط اصابهم
فاكلوها“

کافر اپنے بتوں کی عبادت کرتے رہتے تھے لیکن پھر ان کو چھوڑ کرنے بت تراش لیتے تھے گویا
یوں سمجھیں کہ ان کے خدا پرانے ہو جاتے تھے پھر نئے بنا لیتے تھے۔ وہ اپنے خداؤں کو کبھی کھا لیتے تھے
بنی بابلہ (ایک قبیلہ کا نام ہے) نے اپنے بت حیس (کھجور، کھویا اور میدہ سے بنے ہوئے حلوے) سے
بنار کھے تھے جب وہ قحط سالی میں بھوکے ہوئے تو انہوں نے اپنے معبودوں کو کھا لیا ”ان باهلة كانت
لهم اصنام من حيس فجاءوا في قحط اصابهم فاكلوها“ (روح المعانی)

محبت کی زیادتی ثبات سے حاصل ہوتی ہے:

”ليس المراد الزيادة في اصل الفعل بل الرسوخ والثبات وهو
ملاك الامر ولهذا نزل (فاستقم كما امرت) وكان احب الاعمال
اليه ﷺ ادومها“

زیادتی سے مراد اصل فعل میں زیادتی نہیں بلکہ عمل میں راسخ ہونا اور ثبات قدم رہنا یہی تمام
امور کا بادشاہ ہے اسی لئے رب تعالیٰ نے فرمایا ثبات رہو جیسا تمہیں حکم دیا گیا۔ نبی کریم ﷺ کو کسی عمل
پر ہمیشہ عمل کرنا پسند تھا۔ (خواہ وہ عمل قلیل ہی کیوں نہ ہو)۔ یہی وجہ ہے کہ رب تعالیٰ نے ﴿اَشِدُّ
حُبًّا﴾ کہا ہے ”احب“ نہیں فرمایا تا کہ کسی کو وہم نہ ہو کہ کبھی کا فر مقدار کے لحاظ پر طاعت زیادہ کر
لیتے ہیں تو مؤمنین کی محبت رب تعالیٰ سے زیادہ کیسے۔

جب یہ واضح ہو گیا کہ مؤمنین کی طاعت اور عبادت کرنے میں ہمیشگی پائی گئی ہے تو اسی سے پتہ چل
گیا کہ مؤمنین کی محبت بوجہ ثبات اور قرار کے ”اشد“ ہے کافروں کی محبت بوجہ زوال کے ”غیر اشد“ ہے۔

(ما حود اور روح المعانی)

وَلَوْ يَرَى الَّذِينَ ظَلَمُوا إِذْ يَرُونَ الْعَذَابَ أَنَّ الْقُوَّةَ لِلَّهِ جَمِيعًا :

اور اگر معلوم کر لیں ظالم اس وقت کو جب دیکھیں گے عذاب بیشک قوت اللہ کے لئے ہی ہے سب۔
راقم نے محذوف الفاظ کے بغیر لفظی ترجمہ کیا ہے جس سے مطلب اتنا واضح نہیں جتنا کہ اعلیٰ
حضرت کے ترجمہ سے واضح ہے۔ (اور کیسی ہوا اگر دیکھیں ظالم وہ وقت جب عذاب ان کے سامنے
آئے گا اس لئے کہ سارا زور خدا کو ہے)۔

علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے ﴿وَلَوْ يَرَى﴾ کا معنی ”لو يعلم“ کیا ہے (اگر ان کو علم حاصل ہو
جائے) اب مطلب یہ ہوگا اور اگر ظالموں کو ابھی سے معلوم ہو جائے کہ ان کے لئے عذاب تیار کیا گیا
ہے جو عذاب وہ قیامت کو دیکھیں گے تو ان کو ابھی سے یہ بھی پتہ چل جائے کہ بیشک تمام قوت اللہ تعالیٰ
کو حاصل ہے۔ بلکہ دوسرا معنی اس سے زیادہ واضح ہے

﴿وَلَوْ يَرَى الَّذِينَ ظَلَمُوا﴾ اندادہم لا ينفع لعلموا ﴿أَنَّ الْقُوَّةَ لِلَّهِ
جَمِيعًا﴾ لا ينفع ولا يضر غيره“

اگر ظالموں کو ابھی پتہ چل جائے کہ ان کے معبودان باطلہ انہیں نفع نہیں دے سکتے جو علم ان کو
قیامت کے دن عذاب دیکھ کر ہوگا تو ان کو ابھی سے یہ بھی پتہ چل جائے کہ بیشک قوت تمام اللہ تعالیٰ کو
ہی حاصل ہے اس کے بغیر دوسرے معبودان باطلہ نفع و نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ (ماخوذ از روح المعانی)
وَأَنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعَذَابِ : اور بیشک اللہ تعالیٰ سخت عذاب والا ہے۔ اس میں قوی احتمال تو یہ
ہے کہ اس میں استیناف (نیا کلام) پایا گیا ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کو عذاب سے ڈراتے ہوئے یہ
ارشاد فرمایا ”کہ بیشک اللہ تعالیٰ کا عذاب سخت ہے“۔ اور ایک احتمال یہ بھی ہے کہ ان کے قول کے ساتھ
ہی متعلق ہو۔ کہ انہیں علم حاصل ہو جائے کہ بیشک قوت تمام رب تعالیٰ کو حاصل ہے اور وہ یہ کہیں کہ
بیشک اللہ تعالیٰ سخت عذاب والا ہے۔ (از روح المعانی)

☆☆☆☆☆

﴿ اِذْ تَبَرَّأَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا مِنَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا وَرَأَوْا الْعَذَابَ
وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْأَسْبَابُ ﴾

(۱) ”جب بیزار ہوں گے پیشوا اپنے پیروں سے اور دیکھیں گے عذاب اور کٹ جائیں گی ان
سب کی ڈوریں“

(۲) جب بے زار ہوں گے وہ جن کی تابعداری کی گئی ان سے جنہوں نے تابعداری کی جب
دیکھیں گے عذاب اور منقطع ہو جائیں گے (کٹ جائیں گے) ان کے اسباب (تعلقات)“

مختصر مطلب: یعنی قیامت کے دن جب مشرکین کے قائد اپنے آپ سے عذاب کو دور نہیں کر سکیں
گے تو اپنے متبعین سے وہ بے زار ہو جائیں گے اور ان کے تعلقات ختم ہو جائیں گے خواہ وہ ان کے
تعلقات رشتہ داری کے تھے یا دوستی کے تھے اسی طرح ان کے معاہدے بھی ختم ہو جائیں کوئی ایک
دوسرے کی امداد نہیں کر سکے گا ہر ایک کو اپنی فکر ہوگی۔
(ماخوذ از خازن)

قدرے تفصیل: جب پہلے ذکر کیا گیا کہ کفار نے رب تعالیٰ کی مثل اس کے شریک بنائے اس کے
بعد ان سے بطور تہدید (دھمکی آمیز) کلام کی ﴿ اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ ﴾۔ اب مزید وعید کی گئی (ان کو
ڈرایا گیا) اور کہا گیا ﴿ اِذْ تَبَرَّأَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا مِنَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا ﴾۔

آیت کریمہ کا مطلب یہ ہے: ”ان الذين افنوا عمرهم في عبادتهم واعتقدوا انهم من
اوكد اسباب نجاتهم فانهم يتبرؤن منهم عند احتياجهم اليهم“

بیشک وہ لوگ جنہوں نے معبودان باطلہ کی عبادت میں عمریں گزار دیں اور یہ عقیدہ رکھا کہ
بیشک یہ ان کی نجات کے اسباب ہیں قیامت کے دن جب ان کو شدید محتاجی ہوگی اس وقت ان کے
معبودان سے بیزار ہو جائیں گے۔

اسی کی اور مثالیں قرآن پاک سے:

﴿ وَقَالَ إِنَّمَا اتَّخَذْتُم مِّن دُونِ اللَّهِ أَوْثَانًا مَّوَدَّةَ بَيْنِكُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ثُمَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ يَكْفُرُ

بعضکم ببعض ویلعن بعضکم بعضا وما واکم النار وما لکم من نصرین ﴿۲۵﴾ (عنکبوت ۲۵)
اور ابراہیم نے فرمایا تم نے اللہ کے سوا یہ بت بنائے ہیں جن سے تمہاری دوستی یہی دنیا کی زندگی تک
بے پھر قیامت کے دن تم میں ایک دوسرے کے ساتھ کفر کرے گا اور ایک دوسرے پر لعنت ڈالے گا اور
تم سب کا ٹھکانا جہنم ہے اور تمہارا کوئی مددگار نہیں۔“

﴿الْأَخِلَاءُ يَوْمَئِذٍ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ إِلَّا الْمُتَّقِينَ﴾ (الزخرف: ۶۷)

”گہرے دوست اس دن (قیامت کے دن) ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے مگر پرہیزگار“

یعنی نیک لوگوں کی دوستی قیامت کے دن بھی کام آئے گی اور کافر دنیا میں ایک دوسرے کے دوست
ہوتے ہیں لیکن قیامت کے دن ایک دوسرے سے بے زار ہوں گے اور ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے۔

﴿كُلَّمَا دَخَلَتْ أُمَّةٌ لَعْنَتْ أُخْتَهَا﴾ (الاعراف: ۳۸)

”جب ایک گروہ داخل ہوتا ہے دوسرے پر لعنت کرتا ہے“

﴿إِنِّي كَفَرْتُ بِمَا أَشْرَكْتُمُونِ مِنْ قَبْلُ﴾ (ابراہیم: ۲۲)

”وہ جو پہلے تم نے مجھے شریک ٹھہرایا تھا میں اس سے سخت بے زار ہوں“

(از کبیر)

متبوعین کی تابعین سے بے زاری کیوں؟ جن لوگوں کی تابعداری کی گئی وہ تابعداری کرنے
والوں سے اس لئے بے زار ہوں گے کہ جب وہ عذاب دیکھیں گے تو عذاب سے چھٹکارا حاصل کرنے
میں کوئی چارہ ان کو نظر نہیں آئے گا۔ رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْأَسْبَابُ﴾ کا
ایک مطلب یہ بھی ہے کہ جب وہ عذاب کو دیکھ کر اپنے آپ کو اور اپنے متبعین (تابعاری کرنے
والے) کو چھڑانے سے عاجز آجائیں گے اور کلی طور پر ناامید ہو جائیں گے اور سمجھ جائیں گے کہ آج
وہ اپنے آپ کو اور اپنے متبعین کو بچا نہیں سکتے ان کے بچاؤ کے اسباب سب ختم ہو جائیں گے۔ (از کبیر)
متبوعین سے مراد کون؟ اس میں مختلف اقوال ہیں جو تمام ہی معتبر ہیں۔

(۱) ”انهم السادة والرؤساء من مشرکی الانس“ مشرکین جن لوگوں کی تابعداری
کرتے تھے وہ بھی مشرک لوگ ہی تھے جو ان کے سردار اور رئیس تھے جن کا کام حرام کو حلال کرنا اور حلال
کو حرام کرنا تھا۔

(۲) مشرکین شیاطین جنوں کی تابعداری کرتے تھے اور وہ ان کے دلوں میں وسوسہ ڈالتے تھے۔

(۳) ”انہم شیاطین الجن والانس“ مشرکین شیطان جنوں اور شیطان انسانوں کی تابعداری کرتے تھے جو ان کو گمراہ کرتے تھے کبھی شرک کی راہ چلاتے یعنی بت پرستی کراتے اور کبھی حلال کو حرام کر کے اور کبھی حرام کو حلال کر کے ان کو کافر بناتے۔

(۴) ”الاوثان الذین کانوا یسمونها بالآلہة“ مشرکین کے متبوعین یعنی جن کی یہ تابعداری کرتے تھے وہ ان کے بت تھے جن کی وجہ سے یہ لوگ راہ راست سے بھٹکے ہوئے تھے۔

راقم کے نزدیک تو تمام اقوال اجتماعی طور پر معتبر ہیں تاہم علامہ رازی رحمہ اللہ نے پہلے قول کو ترجیح دی کہ ان کے انسانوں میں سے رئیس اور سردار ہی معتبر ہیں زیادہ صحیح قول یہ ہے کیونکہ ان سے امر اور نہی ممکن ہے جن امور اور نواہی پر چل کر یہ گمراہ ہوتے۔ اسی قول کی ترجیح ایک اور آیت کریمہ سے سمجھ آتی ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

﴿إِنَّا أَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَاءَنَا فَأَضَلُّونَا السَّبِيلَا﴾ (الاحزاب)

”پیشک ہم نے اپنے سرداروں اور بڑوں کی اطاعت کی انہوں نے ہی ہمیں سیدھی راہ سے بھٹکا دیا“

(ارکب)

متبوعین اپنے متبعین سے کیسے بے زار ہوں گے: ان کی بے زاری چند طرح ہوگی۔

(۱) ”احدها ان يقع منهم ذلک القول“ بے زاری کا ایک طریقہ تو یہ ہوگا کہ وہ ظاہر طور پر

اپنے متبعین سے کہہ دیں گے کہ آج ہم تم سے بے زار ہیں ہماری امداد کی کوئی توقع نہ رکھو۔

(۲) ”وثانیہا ان یكون نزول العذاب بهم وعجزم عن دفعهم عن انفسهم فكيف عن غیرهم فتبرؤا“

اور دوسری وجہ یہ ہوگی کہ ان پر جب عذاب نازل ہوگا وہ اپنے آپ سے عذاب کو دور کرنے سے

عاجز ہوں گے تو غیروں سے عذاب کو کیسے دور کر سکیں گے یہی ان کا عجز ہی ان سے بے زاری ہوگی۔

(۳) ”وثالثہا انه ظهر فیہم الندم علی ما کان منهم من الکفر باللہ والاعراض عن

انبیائہ ورسلہ فسمی ذلک الندم تبرؤا“

اور تیسرا طریقہ انکی بے زاری کا یہ ہوگا کہ وہ جو دنیا میں اللہ تعالیٰ سے کفر کرتے رہے اور انبیاء کرام

اور اللہ تعالیٰ کے رسولوں سے اعراض کرتے رہے قیامت کے دن وہ اس پر نادم ہوں گے ان کی اس ندامت کو ہی بے زاری سے تعبیر کیا گیا کیونکہ جب وہ خود نادم ہوں گے تو اوروں کی کیا امداد کریں گے۔

(ماخوذ از کبیر)

وَرَأَوْا الْعَذَابَ : ”جب دیکھیں گے عذاب“ ”الواو للحال ای یتبرؤن فی حال رؤیتهم العذاب“ اس مقام پر ”واو“ حال کے لئے ہے یعنی وہ بے زار ہوں گے اس حال میں کہ جب وہ عذاب دیکھیں گے۔

راقم نے اسی لئے واو کا معنی ”جب“ کیا ہے۔ تاہم اس میں اور اقوال بھی ہیں اسی لئے اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے ”واو عطف“ کا معنی کیا ہے (اور)۔

”وہذا اولی من سائر الاقوال لان فی تلك الحالة یزداد الهول والخوف“

اور یہ حال والا قول تمام اقوال سے زیادہ بہتر ہے اسلئے کہ اس حالت میں ڈر اور خوف زیادہ ہوتا ہے

(از کبیر)

وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْأَسْبَابُ : ”اور ان سے اسباب کو منقطع کر دیا جائے گا“۔ ”سبب“ کا لغوی معنی ہے ”رسی“ جس کے ذریعے نیچے سے اوپر چڑھے یا اوپر سے نیچے آئے پھر ہر وہ چیز جو کسی جگہ تک پہنچائے یا کسی حاجت تک پہنچائے اسے سبب کہا جاتا ہے۔ محبت اور قرابت داری کو بھی سبب کہا جاتا ہے کہ یہ ایک دوسرے کے درمیان تعلق کا ذریعہ ہے اسی لئے کہا جاتا ہے ”ما بینی و بینک سبب“ میرے اور تمہارے درمیان کوئی محبت اور قرابت نہیں۔

راستے کو بھی سبب کہا جاتا ہے کہ وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ تک پہنچاتا ہے ”فاتبع سببا“ اسے نے راستہ اختیار کیا۔ آسمان کے دروازوں کو بھی ان میں داخل ہو کر آسمانوں تک پہنچانے کا ذریعہ ہیں ﴿أَسْبَابَ السَّمَوَاتِ﴾ میں اسباب کا معنی دروازے ہیں۔

آیت کریمہ میں اسباب سے مراد: اس میں بھی چند وجوہ ہیں جو تمام ہی یہاں مراد ہیں۔

(۱) ”الاول انہا المواصلات التی کانوا یتواصلون علیہا“ پہلا قول یہ ہے کہ آیت کریمہ میں اسباب سے مراد وہ اسباب اور ذرائع ہیں جن کے واسطے سے متبوعین اور متبعین ایک دوسرے سے تعلق قائم کئے ہوئے ہیں۔

(۲) ”والثانی الارحام التی کانوا یتعاطفون بها“ اسباب سے مراد دوسرا قول یہ ہے کہ ”قربابت داری مراد ہے جس کی وجہ سے وہ ایک دوسرے پر مہربانی کرتے تھے لیکن قیامت کے دن ان کے درمیان رشتہ داری کا تعلق ختم ہو جائے گا کوئی ایک دوسرے کا حال پوچھنے والا نہیں ہوگا۔

(۳) ”الاعمال التی کانوا یلزمونها“ ان کے وہ اعمال جن کو وہ لازم پکڑے ہوئے تھے قیامت کے دن وہ ختم ہو جائیں گے اس لئے ان کے اعمال بھی ان کو قیامت کے دن کوئی نفع نہیں پہنچا سکیں گے۔

(۴) ”والرابع العہود والحلف التی کانت بینہم یتوادون علیہا“ چوتھا قول یہ ہے کہ ان کے وعدے اور قسمیں جو انہوں نے دوسروں لوگوں سے ملنے کے لئے اٹھا رکھی تھیں وہ ختم ہو جائیں گی۔

(۵) ”والخامس ما کانوا یتواصلون بہ من الکفر“ پانچواں قول اس میں یہ ہے کہ یہاں اسباب سے مراد وہ ذرائع ہیں جن کے ذریعے وہ کفر تک پہنچتے تھے قیامت کے دن وہ سب ختم ہو جائیں گے۔

(۶) ”السادس المنازل التی کانت لہم فی الدنیا“ چھٹا قول یہ ہے کہ اسباب سے مراد اس آیت کریمہ میں ان کے وہ مراتب ہیں جو انہیں دنیا میں حاصل تھے یعنی قیامت کے دن ان کی سرداری ختم ہو جائے گی اسی وجہ سے وہ اپنے قبیعین کی امداد نہ کر سکنے کی وجہ سے بے زار ہو جائیں گے۔

(۷) ”السابع اسباب النجاة فتطعت عنہم“ ساتواں قول یہ ہے کہ اسباب نجات ان سے منقطع ہو جائیں گے۔

(۸) آٹھواں قول ہی وہ قول ہے جو زیادہ معتبر ہے جس میں پہلے سات قول سمٹ کر آ جاتے ہیں وہ یہ ہے کہ یہاں اسباب سے مراد کل ہیں کیونکہ منقطع ہو جانے کا معنی ”نہ رہنا ہے“ یہ نفی ہے جو عموم کو چاہتی ہے اس لئے مطلب یہ ہوگا۔ ”زال عنہم کل سبب یمکن ان یتعلق بہ“ ان سے ہر سبب زائل ہو جائے گا جس سے بھی تعلق ممکن ہو سکتا ہو۔ ان کو مراتب اور اسباب اور نسب اور قسمیں اور آپس میں باندھے ہوئے عقد اور معاہدے کام نہیں آئیں گے۔ ان کو انتہائی ناامیدی ہوگی۔ (از کبیر)

وَقَالَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا لَوْ أَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّأَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوا
مِنَّا كَذَلِكَ يَرِيهِمُ اللَّهُ أَعْمَالَهُمْ حَسَرَاتٍ عَلَيْهِمْ وَمَا هُمْ
بِخَارِجِينَ مِنَ النَّارِ

(۱) ”اور کہیں گے پیروکار ہمیں لوٹ کر جانا ہوتا (دنیا میں) تو ہم ان سے توڑ دیتے جیسے انہوں نے ہم سے توڑی یونہی اللہ انہیں دکھائے گا ان کے کام ان پر حسرتیں ہو کر اور وہ دوزخ سے نکلنے والے نہیں۔“

(۲) ”اور کہیں گے وہ لوگ جنہوں نے تابعداری کی کاش کہ ہمیں لوٹ کر جانا ہوتا (دنیا میں) تو ہم بیزار ہو جاتے ان سے جیسا کہ وہ بیزار ہوئے ہم سے اسی طرح دکھائے گا ان کو اللہ ان کے اعمال جو حسرتیں ہوں گی ان پر اور نہیں وہ نکلنے والے آگ سے۔“

مختصر مطلب: جن لوگوں نے اپنے رئیسوں، سرداروں، بتوں اور شیاطین کی تابعداری کی جب ان سے قیامت کے دن وہ بے زار ہوں گے جن کی انہوں نے تابعداری کی ہوگی تو یہ حسرت بھری تمنا کر رہے ہوں گے کاش کہ ہمیں بھی دنیا میں لوٹنا نصیب ہو جائے اور ہمارے ساتھ ہی یہ ہمارے متبوعین بھی دنیا میں چلے جائیں تو ہم بھی ان سے ایسے ہی بے زار ہو جائیں جیسے یہ ہم سے بے زار ہو گئے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ ان کو دکھائے گا ان کے اعمال جو ان پر حسرت ہوں گے اور وہ آگ میں ہمیشہ ہمیشہ کیلئے رہیں گے جس سے ان کو نکلنا نہیں ہوگا۔

قدریہ تفصیل:

وَقَالَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا لَوْ أَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّأَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوا مِنَّا:
یہاں ”لو“ کا استعمال معنی کیلئے ہے اسی وجہ سے جواب میں ”قاء“ آئی ہوئی ہے ”کرۃ“ کا معنی ہے ”رجعۃ“ اور ”عود“ یعنی لوٹنا۔ اب معنی یہ ہوگا ”لیت لنا کرۃ الی الدنیا فنتبرأ منہم کما تبرأوا منا“ کاش کہ ہمیں دنیا میں لوٹنا ہو تو ہم ان سے بے زار ہو جائیں جیسا کہ وہ ہم سے بیزار ہوئے

(از بیضاوی و شیخ زادہ)

وہ رجوع کی تمنا کیوں کریں گے؟ اس لئے کہ وہ یہ خواہش کریں گے کہ ہمیں دنیا میں لوٹا دیا جائے تاکہ ہم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کریں اور ہمارے متبوعین جس طرح آج ہم پر غصے میں ہیں اور ہم سے دور ہیں اسی طرح دنیا میں ہم بھی ان پر غصے کا اظہار کریں اور ہم بھی ان سے دور رہیں۔

خیال رہے کہ ان کی یہ تمنا دنیا میں اسی لئے نہیں پائی گئی کہ وہ عذاب کو نہیں دیکھ پائے قیامت کے دن جب عذاب کو دیکھیں گے تو پھر وہ تمنا کریں گے۔
(از روح المعانی)

كَذَلِكَ يُرِيهِمُ اللَّهُ أَعْمَالَهُمْ حَسَرَاتٍ عَلَيْهِمْ:

”اسی طرح دکھائے گا ان کو اللہ ان کے اعمال جو ان پر حسرت ہوں گے۔“ یہاں دو احتمال ہیں ایک یہ ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے انہیں یہ دکھایا کہ ان کے متبوعین ان سے بیزار ہو گئے اسی طرح ان کے اعمال ان کو دکھائے گا جن پر ان کو حسرت ہوگی۔ ان کو اعمال دکھانے کی وجہ بھی یہ ہوگی کہ یہ ایک دوسرے سے کامل طور پر بے زار ہو کر نادام ہو جائیں۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ جس طرح ان کو اللہ تعالیٰ نے عذاب دکھایا اسی طرح ان کو اعمال دکھائے گا جن پر یہ حسرت کریں گے اور ان کو یقین ہو جائے گا اب ہماری بربادی ہی بربادی ہے۔

کون سے اعمال ان کو دکھائے جائیں گے: اس میں کئی احتمال ہیں تاہم وہ سب ہی مجتمع ہوں گے۔

(۱) ”الاول الطاعات يتحسرون لم ضيعوها“ ان میں سے پہلا یہ قول ہوگا کہ ان کو طاعات دکھائی جائیں گی جن پر یہ حسرت کریں گے کہ ان اچھے اعمال کو ہم نے کیوں ضائع کر دیا کہ آج ہم عذاب میں مبتلا ہیں اور ہماری کوئی نجات نہیں۔ ”الثانی المعاصی واعمالهم الخبیثة يتحسرون لم عملوها“ دوسرا قول یہ ہے کہ ان کو ان کے گناہ اور ان کے خبیث اعمال دکھائے جائیں گے جن پر وہ حسرت کریں گے کہ یہ اعمال انہوں نے کیوں کئے تھے۔

”الثالث ثواب طاعاتهم التي اتوا بها فاحبطوه بالكفر“

تیسرا قول ان میں سے یہ ہے کہ ان لوگوں کو ان کی اچھائیوں کا ثواب دکھایا جائے گا کہ تمہیں یہ ثواب دیا جانا تھا لیکن تم نے کفر کے ذریعے اس ثواب کو ضائع کر دیا ہے۔

”الرابع ، اعمالهم التي تقربوا بها الى رؤسائهم من تعظیمهم

والانقياد لامرهم“

چوتھا قول یہ ہے کہ اعمال سے مراد ان کے وہ اعمال ہیں جن کی وجہ سے وہ اپنے رئیسوں کے قریب ہوئے یعنی ان کی تعظیم اور ان کی اطاعت۔

”والظاهر ان المراد الاعمال التي اتبعوا فيها السادة وهو كفرهم ومعاصيهم“

ظاہر یہ ہے کہ ان کے وہ اعمال مراد ہیں جو انہوں نے اپنے رئیسوں اور سرداروں کے کہنے پر کئے ہوں گے یعنی ان کا کفر اور ان کے گناہ معتبر ہوں گے۔

وہ اعمال ان پر حسرت ہوں گے: جب وہ اپنے اعمال یعنی کفر اور معاصی کو اپنے نامہ اعمال میں دیکھیں گے۔ تو ان کو دیکھ کر حسرت ہوگی اور انہیں یقین ہو جائے گا کہ ان کو اب اس کی جزاء ضرور دی جانی ہے حالانکہ ان پر ممکن تھا وہ ان کو چھوڑ دیتے اور طاعات پر عمل کرتے۔

حسرت کیا ہے؟ اصل میں ”الحسر“ کا معنی ”کشف“ کھولنا، ظاہر کرنا ہے جس طرح کہا جاتا ہے ”حسر عن ذراعيه“ فلاں شخص نے اپنی کلائیوں کو کھولا یعنی ان سے کپڑا ہٹایا۔ ”الحسرة“ کا معنی شدید ندامت ہے کیونکہ ندامت کے وقت نادم کا حال کھل جاتا ہے۔ اور ”الحسیر“ ایسے کپڑے مکوڑے کو بھی کہا جاتا ہے جس میں بظاہر کوئی نفع نہ ہو۔ اس معنی کی مناسبت سے ”الحسرة“ کا معنی شدید ندامت ہوگا کیونکہ نادم شخص اس کپڑے کی طرح ہی ہو جاتا ہے جس میں کوئی نفع نہ پایا جائے۔ اور ”الحسور“ کا معنی تھک جانا بھی ہے اس معنی کے لحاظ سے ”الحسرة“ کا معنی یہ ہوگا کہ نادم کا ندامت کی وجہ سے تھک ہار جانا۔

وَمَا هُمْ بِخَارِجِينَ مِنَ النَّارِ : اور وہ آگ سے نکلنے والے نہیں۔ چونکہ ذکر ہی کفار و مشرکین کا ہو رہا ہے اس لئے ان کو جہنم سے کبھی نہیں نکالا جائے گا۔ دوسری آیت کریمہ اس پر دلالت کر رہی ہے:

﴿وَإِنَّ الْفُجَّارَ لَفِي جَحِيمٍ يَصْلَوْنَهَا يَوْمَ الدِّينِ وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَائِبِينَ﴾ (الانفطار)

”اور بیشک فاجر (کافر) لوگ جہنم میں ہوں گے قیامت کے دن اس میں وہ چلیں گے اور وہ اس سے غائب نہیں ہوں گے۔“ وثبت ان المراد بالفجار ههنا الكفار لدلالة هذه الآية معلوم ہو گیا کہ فجار سے مراد کفار ہیں کیونکہ یہ آیت اس پر دلالت کر رہی ہے۔ روز روشن کی طرح واضح ہو گیا کہ ان آیات میں کفار کا ذکر ہے کیونکہ یہاں ذکر ہو رہا ہے ان کو جہنم سے نہیں نکالا جائے گا۔

”وان اصحاب الكبيرة من اهل القبلة يخرجون من النار“

بیشک کبیرہ گناہ والوں کو تو جہنم سے نکال لیا جائے گا اس پر اہل سنت کا اجماع ہے۔ (از کبیر)

﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلَالًا طَيِّبًا وَلَا تَتَّبِعُوا خُطَوَاتِ الشَّيْطَانِ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُبِينٌ﴾

(۱) ”اے لوگو کھاؤ جو کچھ زمین میں حلال پاکیزہ ہے اور شیطان کے قدم پر قدم نہ رکھو بیشک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔“

(۲) ”اے لوگو کھاؤ جو کچھ زمین میں حلال پاکیزہ ہے اور نہ تابعداری کرو شیطان کے قدموں کی بیشک وہ تمہارا دشمن ہے کھلا۔“

ما قبل سے رابطہ: اللہ تعالیٰ نے پہلے توحید کو ذکر فرمایا اور اس پر دلائل قائم فرمائے پھر اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو تسلیم کرنے والوں کا ثواب ذکر فرمایا۔ اس کے بعد ﴿وَمَنْ يَتَّخِذْ مِنْ دُونِ اللَّهِ أَنْدَادًا﴾ سے مشرکین کے شرک کو بیان فرمایا۔ پھر رئیس کافروں کی تابعداری کرنے والے کفار کا ذکر فرمایا اس کے بعد اس آیت میں دونوں فریقوں پر انعام کا ذکر فرمایا اور ان پر احسان کو بیان فرمایا۔ اور یہ بیان فرمایا کہ جو شخص گناہوں میں مبتلا ہوگا وہ گھنگار ہوگا کفر کی وجہ سے کافر ہوگا لیکن اللہ تعالیٰ کا احسان ان پر برقرار رہے گا ”لَمْ تَوْثَرْ فِي قَطْعِ احْسَانِهِ وَنِعْمَهُ عَنْهُمْ“ یعنی ان کے گناہ اور کفر رب تعالیٰ کے احسان اور نعمتوں کو ختم کرنے کا ذریعہ نہیں ہوں گے۔ (ازکبیر)

شان نزول: چند واقعات کے بعد آیت کریمہ کا نزول ہوا جو تمام ہی شان نزول ہیں۔ (راقم)

(۱) یہ آیت کریمہ مشرکین کے متعلق نازل ہوئی جب کہ انہوں نے اپنے آپ پر بحیرہ اور سائبہ اور وصیلہ اور حام حرام قرار دے دیئے تھے تو ان کو اس آیت کریمہ میں اس سے منع کیا گیا کہ حلال پاکیزہ جانوروں کو کھاؤ حلال کو اپنے آپ پر حرام نہ کرو۔ (ازروح المعانی)

خیال رہے کہ زمانہ جاہلیت میں کفار کا یہ دستور تھا کہ جو اونٹنی پانچ مرتبہ بچے جنتی اور آخر مرتبہ اس کا بچہ نہ ہوتا اس کا کان چیر دیتے پھر نہ اس پر سواری کرتے نہ اس کو ذبح کرتے نہ پانی اور چارے سے اسے ہانکتے اس کو بحیرہ کہتے۔ اور جب سفر پیش ہوتا یا کوئی بیمار ہوتا تو یہ نذر کرتے کہ اگر میں سفر سے

بخريت واپس آؤں یا تندرست ہو جاؤں تو میری اونٹنی سائبہ (بجار) ہے اور اس سے بھی بحیرہ کی طرح نفع اٹھانا حرام سمجھتے اور اسے آزاد چھوڑ دیتے۔ اور بکری جب سات مرتبہ بچے جن چکتی تو اگر ساتواں بچہ نہ ہوتا تو اس کو مرد کھاتے اور اگر مادہ ہوتا تو بکریوں میں چھوڑ دیتے اور ایسے ہی اگر نرمادہ دونوں ہوتے اور کہتے کہ یہ اپنے بھائی سے مل گئی اس کو وصلہ کہتے۔ اور جب نراونٹ دس گیا بھ (دس مرتبہ مؤنٹ گا بھن ہوتی) حاصل ہو جاتے تو اس کو چھوڑ دیتے نہ اس پر سواری کرتے نہ اس سے کام لیتے نہ اسے چارے پانی سے روکتے اس کو ”حامی“ کہتے۔ (خزائن العرفان)

(۲) شان نزول میں ایک اور قول یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن سلام پہلے یہودیت میں تھے انہوں نے اور ان کے چند ساتھیوں نے ایمان قبول کر لیا یہودیت میں اونٹ کا گوشت حرام تھا انہوں نے اسلام لانے کے بعد بھی اپنے آپ پر حرام کر لیا تو یہ آیہ نازل ہوئی۔

(۳) تیسرا قول شان نزول میں یہ ہے کہ ثقیف اور بنی عامر بن صعصہ اور خزاعہ اور بنی مدج نے جب اپنے آپ پر کھجور اور پنیر کو حرام کر لیا تو یہ آیہ کریمہ نازل ہوئی۔ (ازروح المعانی)

(۴) چوتھا قول شان نزول میں یہ ہے کہ بعض لوگوں نے اپنے آپ پر اچھے طعام اور اچھے لباس حرام کر لئے تھے تو یہ آیہ کریمہ نازل ہوئی۔

اعتراض: قاضی ابوالسعود محمد بن محمد عمادی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”وقيل نزلت في قوم من المؤمنين حرموا على انفسهم رفيع الاطعمة والملابس ويرده قوله عز وجل ﴿وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ﴾ اى لا تقتدوا بها في اتباع الهوى فانه صريح في ان الخطاب للكفرة كيف لا وتحريم الحلال على نفسه تذهبا ليس من باب اتباع خطوات الشيطان“

بعض حضرات نے کہا کہ یہ آیہ کریمہ مومنوں کے بارے میں نازل ہوئی جنہوں نے اپنے آپ پر اچھے طعام اور اچھے لباس حرام کر لئے تھے لیکن یہ قول صحیح نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی: ﴿وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ﴾ ”اور نہ تابعداری کرو شیطان کے قدموں کی“ اسے رد کر رہا ہے کیونکہ ان الفاظ مبارکہ کا مطلب یہ ہے کہ تم اپنی خواہشات کی تابعداری کرتے ہوئے شیطان

کی اقتداء نہ کرو شیطان کی اقتداء صریح کفر ہے۔ یہ قول کس طرح درست نہ ہو جب کہ زہد کے لئے اپنے آپ پر کسی چیز کو حرام کر لینا شیطان کے قدموں کی تابعداری نہیں۔ (ابو السعد)

اس تفسیر سے تو واضح ہوا کہ آخری تینوں شان نزول درست نہیں کس طرح ان کو جلیل القدر مفسرین کرام نے بیان کیا ہے۔

جواب: اصل میں ان تمام اقوال میں محاکمہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص حلال چیز کو اپنے پر حرام کرے لائمی کی وجہ سے جیسا کہ حضرت عبداللہ بن سلام اور ان کے ساتھیوں (رضی اللہ عنہم) نے اپنے آپ پر اونٹ کا گوشت حرام کیا تھا یہ کفر نہیں۔ اگر کوئی شخص زہد کی خاطر اپنے آپ پر کسی حلال چیز کو حرام کرے تو پھر بھی کفر نہیں لیکن اگر سنت سے اعراض لازم آئے تو منع ہے۔

شیطان کی تابعداری سے منع کیا گیا ہے تو اس کا صرف یہ مطلب نہیں کہ تم اس کی تابعداری کر کے کافر نہ ہو جاؤ بلکہ شیطان کی تابعداری کر کے گناہوں میں مبتلا ہونا بھی تو منع ہے۔ یہی وجہ ہے جب چند صحابہ نے اپنے آپ پر عبادات کو لازم کیا اور ایک صحابی نے کہا ”انا اعتزل النساء فلا اتزوج ابدا“ میں عورتوں سے جدا رہوں گا اور کبھی شادی نہیں کروں گا تو ان کے جواب میں نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ”فمن رغب عن سنتی فلیس منی“ جس نے میری سنت سے اعراض کیا وہ مجھ سے نہیں۔

(مشکوٰۃ کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ)

اس لئے تمام اقوال ہی صحیح ہیں ابو السعد رحمہ اللہ کا رد کرنا درست نہیں۔ (راقم)

حلالا: حلال کا معنی ہے کھولنا شریعت میں حلال اس چیز کو کہیں گے جس سے ممانعت کو ختم کر دیا جائے تنبیہ: حرام کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جو حرام ہوتا ہے خبث (نا پاک) کی وجہ سے جیسے مردار کا گوشت خنزیر کا گوشت، دم مسفوح (بہنے والا خون)۔ اور ایک حرام وہ ہوتا ہے جو خبث کی وجہ سے تو نہیں لیکن شریعت نے اس سے منع کر دیا جیسا کہ غیر کی ملکیت چیز خواہ وہ پاک اور ستھری ہی کیوں نہ ہو شریعت کی طرف سے اجازت نہ ہونے کی وجہ سے وہ حرام ہے۔ حلال میں یہ دونوں قیدیں نہیں۔ (ازکیر)

امام مالک رحمہ اللہ نے فرمایا:

”الحلال ما یجده فم الشرع لذیذا لا یعافہ ولا یکرہ او تراہ عینہ

حلال وہ ہے جسے شریعت کا منہ لذیذ سمجھے اس سے نفرت نہ کرے اور اسے ناپسند نہ سمجھے۔ اور مطلب یہ ہے کہ شریعت کی آنکھ جس چیز کو شبہات کی میل سے پاک سمجھے وہ حلال ہے۔ (روح المعانی) یعنی شریعت اسے چکھنے کی اجازت دے منع نہ کرے تو گویا کہ شریعت کے منہ نے اسے لذیذ سمجھا۔ اور اس میں حرام ہونے کا کوئی شبہ نہ پایا جائے تو گویا کہ اسے آنکھ نے حلال سمجھا یہی مطلب ہے شریعت کی آنکھ کے حلال سمجھنے کا۔ (راقم)

طیبا : ”الطیب فی اللغة قد يكون بمعنى الطاهر“ طیب کا لغت میں معنی پاک ہونا بھی آتا ہے۔ اور حلال کو بھی طیب کہا گیا ہے کیونکہ اس کے مقابل حرام کو خبیث کہا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿قُلْ لَا يَسْتَوِي الْخَبِيثُ وَالطَّيِّبُ﴾ (اے محبوب) آپ فرمادیں حرام اور حلال برابر نہیں۔ اصل میں طیب کا مطلب ہے وہ چیز جس سے لذت حاصل ہو اور طبیعت اسے اچھا سمجھے، چونکہ اس کا وصف اصل میں طاہر ہوتا ہے۔ حلال کو بھی اس مناسبت کی وجہ سے طیب کہا جاتا ہے کیونکہ شریعت حرام سے منع کرتی ہے لہذا حرام میں شرعی طور پر لذت نہیں پائی جاتی بلکہ حلال میں ہی شرعاً لذت ہے۔ اس آیت کریمہ میں اگرچہ طیب کا معنی حلال بھی کیا جاسکتا ہے لیکن اس میں تکرار لازم آئے گا حلال اور طیب کا ایک معنی ہوگا۔

لہذا بہتر یہ ہے کہ طیباً کا معنی پاکیزہ، لذت دار، طبیعت کے مطابق ہو بشرطیکہ شرعاً اس میں ممانعت نہ پائی گئی ہو۔

(از کبیر)

”والمراد بالحلال ما نص الشارع على حله وبهذا (ای الطیب) مالم يرد فيه النص ولكنه مما يستلذ ويشتهي الطبع المستقيم ولم يكن في الشرع ما يبدل على حرمة كاسكار وضور“

حلال سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے اس کے حلال ہونے کو بیان کیا ہو طیب کو بیان تو نہیں کیا البتہ اس سے لذت حاصل ہوتی ہے اور طبع مستقیم (درست طبیعت) اس کی خواہش رکھتی ہے لیکن شرع میں اس کی حرمت کو بیان نہیں کیا گیا۔ کیونکہ نشہ والی چیزیں اور نقصان دینے

والی چیزوں سے شریعت نے منع کیا ہے اس لئے وہ طیب نہیں۔

اسی سے ایک اعتراض اٹھ گیا کہ اگر کوئی یہ کہے کہ اللہ تعالیٰ نے طیب کے کھانے کا حکم دیا ہے اس کا یہ مطلب ہے کہ جو طیب نہیں تو اس کا کھانا حرام ہو جائے جب کہ طیب کا معنی بیان کیا گیا ہے کہ اس سے لذت حاصل ہو اور طبع مستقیم اس کی خواہش کرے تو اس سے یہ سمجھ آئے گا کہ سیر ہو کر کھانے کے بعد چونکہ لذت نہیں آتی۔ بیمار آدمی کی طبع مستقیم نہیں ہوتی تو ان حالات میں کھانا منع ہو جائے۔ اس کا جواب پہلے آچکا ہے کہ جس چیز سے شریعت نے منع کیا ہو وہ غیر طیب ناجائز ہوگی جس سے شریعت نے منع نہیں کیا وہ منع نہیں کیونکہ مفہوم مخالف ثابت کرنا ہمارے نزدیک کوئی دلیل نہیں۔

(ماخوذ از روح المعانی)

وَلَا تَبِعُوا خُطَوَاتِ الشَّيْطَانِ : ”اور تا بعداری نہ کرو شیطان کے قدموں کی“ خطوة (بفتح الخاء وسكون الطاء) اور ”خطوة“ (بضم التین) کا معنی ایک ہی ہے دو قدموں کے درمیان فاصلہ کو ”خطوة“ کہا جاتا ہے۔

(فرطی)

مطلب یہ ہوا: ”لا تعتقدوا به وتستنوا فتحرموا الحلال وتحللوا الحرام“ تم شیطان کے ساتھ عقیدت نہ رکھو اس کے طریقہ پر نہ چلو کہ تم حلال کو حرام بناتے رہو یا حرام کو حلال بناتے رہو یعنی شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو۔ اعلیٰ حضرت کے ترجمہ میں (قدم پر قدم نہ رکھو) کا یہی مطلب ہے۔

تنبیہ: طلاق کی قسم اٹھانا، حرام کاموں اور گناہ والے کاموں کی نذر ماننا اور اللہ تعالیٰ کے نام کے غیر کی قسم اٹھانا یہ تمام کام شیطان کی تا بعداری میں آتے ہیں۔

(از روح المعانی)

إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ : بیشک وہ تمہارا دشمن ہے کھلا، ﴿مُبِينٌ﴾ باب افعال سے ہے یعنی ”ابانہ“ سے لیا ہوا ہے اصل مادہ ”بان یبین بیاناً“ ہے اس کا معنی ہے ”ظاہر طور“ یعنی بیشک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔

اعتراض: کھلے دشمن سے تو انسان دھوکے میں نہیں آتا شیطان تو دوست بن کر ورغلاتا ہے۔ دوسرے مقام پر رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿وَالَّذِينَ كَفَرُوا أُولِيَائِهِمُ الطَّاغُوتُ﴾ کافروں کے

دوست شیطان ہیں کھلا دشمن کہنا کیسے صحیح ہے۔

جواب: ”انہ ظاہر العداوة عند ذوی البصيرة وان کان يظهر الولاية لمن يغويه“

جو لوگ بصیرت رکھتے ہیں ان کے سامنے اس کی عداوت ظاہر ہے اور جن کو بھٹکانا چاہتا ہے ان کے لئے اس کی دوستی ظاہر ہے۔ لہذا کھلا دشمن کہنا بھی صحیح ہے ”اور دوست بن کر بھٹکانے والا“ کہنا بھی صحیح ہے۔

(ماخوذ از روح المعانی)

فائدہ: آج کل صاف ستھری چیزوں کے کھانے پر بہت زور دیا جاتا ہے گلی سڑی چیزوں کے کھانے سے پرہیز کرنے کی تلقین کی جاتی ہے کہ گلی سڑی چیزیں صحت کے لئے نقصان دہ ہیں لیکن مقام افسوس یہ ہے کہ حرام اور حلال میں کوئی فرق نہیں کیا جاتا نہ ہی حرام سے بچنے کی ترغیب دی جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ مسلمان ذلیل و حقیر ہو رہے ہیں۔

کاش کہ اللہ تعالیٰ کے اس حکم کو مد نظر رکھا جاتا کیا خوب حکم فرمایا کہ حلال چیزیں کھاؤ تا کہ تمہارا باطن پاکیزہ رہے اور پاکیزہ اور صاف ستھری چیزیں کھاؤ تا کہ تمہارا ظاہری بدن صحیح و سلامت رہے۔ آج کل ظاہری علاج کی طرف زیادہ توجہ دی جاتی ہے لیکن قرآن پاک نے باطنی اور ظاہری علاج پر زور دیا ہے۔

(ماخوذ از ضیاء القرآن)

قبولیت دعاء رزق حلال پر موقوف ہے: ابن مردویہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت بیان فرمائی کہ نبی کریم ﷺ کے پاس یہی آیت ﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلَالًا طَيِّبًا﴾ پڑھی گئی۔

”فقام سعد بن ابی وقاص فقال یا رسول اللہ ادع اللہ ان يجعلنی مستجاب الدعوة فقال یا سعد اطب مطعمک تکن مستجاب الدعوة والذی نفس محمد بیدہ ان الرجل لیقذف اللقمة الحرام فی جوفه فما یقبل منه اربعین یوما وایما عبد نبت لحمه من السحت والربا فالنار اولی به“

تو سعد بن ابی وقاص کھڑے ہوئے عرض کرنے لگے یا رسول اللہ اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائیں کہ وہ مجھے دعا کی قبولیت کا شرف عطا کر دے (میری دعا قبول ہو جایا کرے) تو آپ نے فرمایا اے سعد تم اپنا طعام

پاکیزہ اور حلال رکھو تو اللہ تعالیٰ تمہاری دعا کو قبول فرمایا کرے گا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے بیشک جب کوئی شخص حرام لقمہ اپنے پیٹ میں ڈالتا ہے تو چالیس دن اس کی عبادت کو قبول نہیں کیا جاتا۔ جس کی نشوونما ہی حرام مال سے ہو اور ربو (سود) کے مال سے ہو وہ جہنم کا مستحق ہے۔ (درمنثور)

تین چیزوں میں نجات:

”وقال ابو عبد الله الساجي واسمه سعيد بن يزيد خمس خصال بها تمام العلم وهي معرفة الله عز وجل ومعرفة الحق واخلاص العمل لله والعمل على السنة واكل الحلال فان فقدت واحدة لم يرفع العمل“

ابو عبد اللہ ساجی جن کا نام سعید بن یزید ہے وہ فرماتے ہیں پانچ چیزوں سے علم کی تکمیل ہوتی ہے وہ یہ ہیں: اللہ تعالیٰ کی معرفت، حق راہ کی معرفت اور عمل صرف اللہ تعالیٰ کے لئے خلوص سے کرنا اور سنت کے مطابق عمل کرنا اور حلال مال کھانا ان پانچ میں سے کوئی ایک بھی حاصل نہ ہو تو اس کے عمل کو رب تعالیٰ کے ہاں شرف قبولیت حاصل نہیں ہوگا۔ (قرطبی)

جب یقین ہو حلال میں پھر کھائے: ”قال سهل ولا يصح اكل الحلال الا بالعلم“
سہل کہتے ہیں اس وقت تک حلال مال کو کھانا بھی صحیح نہیں جب تک یقین نہ ہو یعنی اگر شک ہو کہ یہ مال حلال ہے یا حرام ہے تو اس کا کھانا جائز نہیں۔ (از قرطبی)

حلال مال کا چھ چیزوں سے پاک ہونا ضروری ہے:

”ولا يكون المال حلالا حتى يصفو من ست خصال الربا والحرام والسحت (وهو اسم مجمل) والغلول والمروءة والشبهة“

اس وقت تک مال حلال نہیں ہو سکتا جب تک وہ چھ چیزوں سے پاک نہ ہو ربو (سود) سے پاک ہو اور حرام ہونے سے پاک ہو اور ایسا مال ہو جس میں اللہ تعالیٰ کی ناراضگی نہ پائی گئی ہو اور مال غنیمت میں خیانت والا مال نہ ہو اور شرعاً مکروہ مال نہ ہو اور ایسا مال جس میں حرام ہونے کا شبہ پایا گیا ہو اس سے پاک ہو۔ (قرطبی)

مقام توجہ : رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿وَلَا تَتَّبِعُوا خُطَوَاتِ الشَّيْطَانِ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ﴾ اور تابعداری نہ کرو شیطان کے قدموں کی بیشک وہ تمہارا دشمن ہے کھلا۔

”والصحيح ان اللفظ في كل ما عدا السنن والشرائع من البدع والمعاصي“ صحیح یہ ہے کہ ﴿خطوات﴾ عام ہے اس لئے سنتوں اور شرعی احکام کے بغیر ایسی بدعات جو بری ہوں شریعت کے مخالف ہوں یعنی جن میں معصیت پائی جاتی ہو (گناہ کے کام ہوں) وہ سب شیطانی عمل ہوں گے ان پر چلنا شیطان کی تابعداری کہلائے گا۔ (قرطبی)

شیطان سے بچنے کا حکم رب تعالیٰ نے کئی مقامات پر دیا: ایک اسی آیت کے آخری الفاظ مبارکہ ﴿وَلَا تَتَّبِعُوا خُطَوَاتِ الشَّيْطَانِ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ﴾ اور شیطان کے قدموں کی تابعداری نہ کرو بیشک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔ اور آنے والی آیت کریمہ میں ﴿إِنَّمَا يَأْمُرُكُمْ بِالسُّوءِ وَالْفَحْشَاءِ﴾ بیشک وہ تمہیں برائی اور بے حیائی کا حکم دیتا ہے اور ارشاد فرمایا ﴿الشَّيْطَانُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَأْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَاءِ﴾ ”شیطان تمہیں فقر (غریب ہو جانے) سے ڈراتا ہے اور حکم دیتا ہے تمہیں بے حیائی کا“۔

﴿وَيُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَنْ يُضِلَّهُمْ ضَلَالًا بَعِيدًا﴾

”اور ارادہ رکھتا ہے شیطان کی تمہیں بہت بڑی گمراہی میں مبتلا کر دے“

﴿إِنَّمَا يُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَنْ يُوقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ﴾

”بیشک شیطان ارادہ رکھتا ہے کہ واقع کرے تمہارے درمیان دشمنی اور بغض“

﴿إِنَّهُ عَدُوٌّ مُضِلٌّ مُبِينٌ﴾ ”بیشک وہ دشمن بھٹکانے والا ہے کھلا“

﴿إِنَّ الشَّيْطَانَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوهُ عَدُوًّا﴾ ”بیشک شیطان تمہارا دشمن ہے اسے دشمن ہی سمجھو“

ان آیات میں شیطان سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے کہ وہ تمہارا دشمن ہے اور تمہیں بھٹکانے والا جب تم دشمن کو دشمن سمجھو گے تو اس کے مکر سے محفوظ رہو گے اگر تم نے اسے اپنا یار بنالیا تو ذلیل و خوار ہو جاؤ گے قرآن پاک میں اور بھی بہت مقامات میں شیطان کا ذکر کیا گیا ہے۔ (از قرطبی)

☆ ”وقال عبد الله بن عمر ان ابليس موثق في الارض السفلى فاذا تحرك فان كل

شر فی الارض بین اثین فصا عدا من تحرکہ

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں بیشک شیطان جب سب سے نیچے والی زمین میں ہو اس طرح جیسا کہ اسے مضبوطی سے باندھ دیا گیا ہو تو پھر بھی جب وہ حرکت کرے دو شخصوں کے درمیان یا زیادہ لوگوں کے درمیان واقع ہونے والے فسادات اس کی حرکت کی وجہ سے ہی ہوتے ہیں۔
(فرطی)

☆ ترمذی نے ابو مالک اشعری سے روایت ذکر کی جس میں رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد موجود ہے۔

”وَأَمْرُكُمْ أَنْ تَذَكُّرُوا اللَّهَ فَإِنْ مَثَلَ ذَلِكَ كَمَثَلِ رَجُلٍ خَرَجَ الْعَدُو فِي

أَثَرِهِ سَرَاعًا حَتَّى إِذَا اتَى عَلَى حَصْنٍ حَصِينٍ فَاحْرَزَ نَفْسَهُ مِنْهُمْ

كَذَلِكَ الْعَبْدُ لَا يَحْزِرُ نَفْسَهُ مِنَ الشَّيْطَانِ إِلَّا بِذِكْرِ اللَّهِ“

(هذا حديث حسن صحيح غريب)

اور میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ تم اللہ کا ذکر کرو بیشک اس کی مثال ایسے ہے جیسے کسی شخص کے پیچھے اس کا دشمن جلدی جلدی بھاگے آ رہا ہو یہاں تک کہ وہ شخص ایک مضبوط قلعہ میں آ جائے تو وہ اپنے آپ کو بچا لیتا ہے اسی طرح بندہ اپنے آپ کو شیطان سے سوائے اللہ تعالیٰ کے ذکر کے بچا نہیں سکتا۔
(فرطی)

یعنی اللہ تعالیٰ کا ذکر شیطان کے مکرو فریب سے بچنے کے لئے ایک مضبوط قلعہ کی حیثیت رکھتا ہے جس نے اللہ کا ذکر کیا وہ مضبوط قلعہ میں آ گیا اس نے اپنے آپ کو بچا لیا۔ جو غافل رہا وہ شیطان کی زد میں آ گیا۔

☆☆☆☆☆

﴿ إِنَّمَا يَأْمُرُكُمْ بِالسُّوءِ وَالْفَحْشَاءِ وَأَنْ تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴾

- (۱) ”وہ تو تمہیں یہی حکم دے گا بدی اور بے حیائی کا اور یہ کہ اللہ پر وہ بات جو زوجہ جس کی تمہیں خبر نہیں“
(۲) بیشک وہ تو تمہیں حکم دیتا ہے برائی اور بے حیائی کا اور یہ کہ تم کہو اللہ پر وہ جو تم نہیں جانتے“

اس سے پہلی آیت کریمہ میں شیطان کی تابعداری کرنے سے منع فرمایا گیا اور شیطان کی دشمنی کا ذکر کیا گیا اس آیت کریمہ میں شیطان کی تابعداری کے نقصانات اور اس کے بھٹکانے کی قسمیں بیان کی جا رہی ہیں۔

عداوت کے تین امور (چیزوں) کا ذکر:

- (۱) ”اولها السوء وهو متناول جميع المعاصي سواء كانت تلك المعاصي من افعال الجوارح او من افعال القلوب“

ان میں سے پہلی چیز ”السوء“ ہے جو تمام برائیوں کو شامل ہے خواہ ان برائیوں کا تعلق ظاہری اعضاء سے ہو یا وہ باطنی افعال ہوں۔

- (۲) ”وثانيها، الفحشاء وهي نوع من السوء لانها اقبح انواعه وهو الذي يستعظم ويستفحش من المعاصي“

ان میں دوسری چیز ”الفحشاء“ یہ بھی برائیوں میں برائی ہی ہے لیکن بہت بڑا گناہ اور گناہوں میں سے بے حیائی کا کام ہے۔

- (۳) ”وثالثها أَنْ تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ“ وکانه اقبح انواع الفحشاء لانه وصف الله تعالى بما لا ينبغي من اعظم انواع الكبائر“

ان میں تیسری چیز یہ ہے ﴿ اَنْ تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴾ شیطان تمہیں یہ وسوسہ ڈالے گا کہ تم اللہ تعالیٰ کے لئے وہ کہو جو تم نہیں جانتے۔ یہ اور ہی زیادہ بڑا گناہ اور بڑی بے حیائی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے وہ اوصاف بیان کئے جائیں جو اس کے شان کے لائق نہیں۔ (از کبیر)

جو چیزیں اللہ تعالیٰ نے حرام نہیں کیں ان کو حرام کہہ کر اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرنا کہ یہ اللہ تعالیٰ نے حرام کی ہیں اور اس طرح حرام چیزوں کے متعلق یہ کہنا کہ یہ اللہ تعالیٰ نے حلال کر دی ہیں یہ شیطانی جال ہے اور اللہ تعالیٰ کی اولاد ماننا، اور اللہ تعالیٰ کا عام جسموں کی طرح جسم ماننا، اور اللہ تعالیٰ کو معاذ اللہ معطل ماننا تمام شیطانی مکر و فریب ہیں۔ (راقم)

شیطان کے حکم دینے کا مطلب: شیطان انسانوں کے دلوں میں وسوسہ ڈالتا ہے جس طرح کوئی آہستہ آہستہ کلام کر کے کسی کو ورغلائے اس کے وسوسہ میں بھی آہستہ کلام ہوتی ہے اگرچہ اسے کوئی سنتا نہیں لیکن اس کا اثر ہوتا ہے۔

☆ حدیث صحیح میں وارد ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ”ان الشیطن یجری من ابن آدم مجری الدم“ بیشک شیطان انسان میں اس طرح اثر انداز ہوتا ہے جس طرح انسان میں خون کا دوران ہوتا ہے۔ (از خازن)

☆ ”عن ابن مسعود قال قال رسول اللہ ﷺ ان للشیطن لمة بابن آدم وللملك لمة فاما لمة الشیطن فایعاد بالشر وتکذیب بالحق واما لمة الملك فایعاد بالغير وتصديق بالحق فمن وجد ذلك فليعلم انه من الله فليحمد الله ومن وجد الاخرى فليتعوذ بالله من الشیطن ثم قرأ الشیطن یعدکم الفقر ویأمرکم بالفحشاء“ (رواہ الترمذی)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ انسان پر شیطان کا بھی اثر ہے اور فرشتے کا بھی اثر ہوتا ہے شیطان کا اثر یہ ہے کہ ان کو وہ شر کاموں میں لگا دیتا ہے اور حق کی تکذیب کرتا ہے اور انسان پر فرشتے کا اثر یہ ہے کہ وہ نیکی کے کاموں پر لگا دیتا ہے اور حق کی تصدیق کرتا ہے۔ پھر آپ نے (بطور دلیل) پڑھا ﴿الشَّيْطَانُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَأْمُرُكُم بِالْفَحْشَاءِ﴾ شیطان تمہیں (اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے سے) فقر سے ڈراتا ہے (غریب ہو جاؤ گے) اور تمہیں بے حیائی کا حکم دیتا ہے۔

☆ ”وفی حدیث ابن عباس قوله ﷺ الحمد لله الذی رد امره الى الوسوسة“

(رواہ ابو داؤد)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا نبی کریم ﷺ نے فرمایا سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کی جس

(مظہری)

نے شیطان کے امر کو وسوسہ کی طرف پھیر دیا۔

یعنی شیطان لازمی طور پر حکم نہیں دے سکتا بلکہ صرف دل میں وسوسہ ڈال سکتا ہے اسی لئے اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں پر اس کا داؤ نہیں چلتا اگر وہ لازمی طور پر حکم چلانے کی صلاحیت رکھتا تو سب کو بھٹکا تارہتا۔ اسی حدیث پاک سے یہ واضح ہو گیا کہ آیہ کریمہ میں شیطان کے حکم دینے سے مراد اس کا وسوسہ ڈالنا ہے۔

تنبیہ: ﴿إِنَّمَا﴾ کا معنی ”ما الا“ والا ہوتا ہے جو حصر کا فائدہ دیتا ہے اس کے معنی کو اس طرح بیان کیا جاتا ہے سوائے اس کے کہ نہیں اعلیٰ حضرت کے ترجمہ سے یہ بخوبی واضح ہے۔ اسی سے پتہ چل گیا کہ شیطان ہمیشہ برائیوں کا حکم دیتا ہے نیکی کی راہ پر نہیں چلاتا ہاں البتہ بعض عارفین نے کہا کہ کبھی نیکی کی راہ پر بظاہر چلاتا ہے لیکن مقصد اس کا شر ہوتا ہے۔ جیسا کہ ایک نیکی کا کام افضل (زیادہ فضیلت والا) ہو اور دوسرا کام فاضل (فضیلت والا) ہو لیکن زیادہ فضیلت والا نہ ہو۔ تو شیطان کبھی افضل سے ہٹا کر فاضل کی طرف لگا دیتا ہے حالانکہ فاضل بھی نیکی کا کام ہی ہوتا ہے لیکن اس کے بعد فاضل کام چھڑا کر شر کی طرف لے جانا اس کے لئے آسان ہو جاتا ہے۔

اور کبھی فاضل آسان سے ہٹا کر افضل مشکل کی طرف لے جاتا ہے تاکہ اس شخص کو دین سے نفرت ہو جائے عام لوگوں پر اس طرح یہ کامیابی حاصل کر لیتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے مقبول بندوں پر اس کا داؤ نہیں چلتا بلکہ وہ افضل مشکل کام کو ترجیح دیتے ہیں۔

(ماخوذ از کبیر)

مقام توجہ: فلاسفہ اور صوفیاء ملک (فرشتہ) جو خیر کی طرف دعوت دیتا ہے اسے قوت عقلیہ کہتے ہیں اور شیطان جو شر کی طرف دعوت دیتا ہے اسے قوت غصبیہ اور قوت شہویہ کہتے ہیں

(از کبیر)

السوء کا لغوی معنی: ”ساء یسوء سوءاً (بفتح السین) مساءة“ غم میں ڈالنا۔ گناہ چونکہ انسان کو برے انجام کی وجہ سے غم میں ڈالتے ہیں اس لئے گناہ کو ”سوء“ کہا جاتا ہے۔ (قرطبی) ”الفحشاء“ کا لغوی معنی قبیح المنظر (بد صورت) جیسا کہ کہا گیا ہے ”وجید کمجید الریم لیس بفاحش“ (اور اس کی گردن ہرن کی گردن کی طرح ہے بد صورت نہیں) پھر برے مقاصد کے لئے ”الفحشاء“ بولتے ہیں۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنْزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا أَلْفَيْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا أَوْ لَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ شَيْئاً وَلَا يَهْتَدُونَ

(۱) ”اور جب ان سے کہا جائے اللہ کے اتارے پر چلو تو کہیں بلکہ ہم تو اس پر چلیں گے جس پر اپنے باپ دادا کو پایا کیا اگرچہ ان کے باپ دادا نہ کچھ عقل رکھتے ہوں نہ ہدایت۔“

(۲) ”اور جب کہا جاتا ہے ان کو تابعداری کرو اس چیز کی جو نازل کی ہے اللہ نے وہ کہتے ہیں بلکہ تابعداری کرتے ہیں ہم اس چیز کی پایا ہم نے جس پر اپنے باپ دادا کو پایا جب کہ ان کے باپ دادا نہیں سمجھتے ہیں کچھ چیز اور نہ ہی ہدایت (سیدھی راہ) پر ہیں۔“

وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنْزَلَ اللَّهُ: اور جب کہا جاتا ہے ان کو تابعداری کرو اس چیز کی جو نازل کی ہے اللہ نے یہ کن لوگوں سے کہا گیا؟ اس میں تین احتمال ہیں کہ ”لہم“ میں ضمیر کا مرجع کیا ہے (۱) اس میں ایک احتمال یہ ہے کہ ضمیر ”من“ کی طرف لوٹے جو ﴿مَنْ يَتَّخِذْ مِنْ ذُنُوبِ اللَّهِ أَزْدَادًا﴾ میں ہے معنوی لحاظ پر ”من“ میں عموم پایا جاتا ہے اس لئے جمع کی ضمیر لوٹنا درست ہے۔ مراد اس سے مشرکین ہیں یعنی مشرکین کو کہا گیا کہ تم اس چیز کی تابعداری کرو جو اللہ تعالیٰ نے نازل کی تو وہ کہتے ہیں ہم تو اس چیز کی تابعداری کرتے ہیں جس پر ہمارے آباء و اجداد (باپ دادا) تھے۔

(۲) دوسرا احتمال یہ ہے کہ ﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ﴾ میں جو ”الناس“ ہے ضمیر اس کی طرف لوٹ رہی ہے پہلے تو خطاب کر کے ان کو حکم دیا گیا۔ اب لوگوں میں سے جو قرآن پاک کے احکام سے عدولی کر کے اپنے آباء و اجداد کے دین پر چلنے والے کافر تھے ان کی طرف غائب کی ضمیر لوٹنا کر قاعدہ التفات پر عمل کرتے ہوئے عقلاء کو گویا کہ خطاب کرتے ہوئے یوں کہا ﴿انظروا الى هؤلاء الحمقى ماذا يقولون﴾ ان بیوقوفوں کو دیکھو یہ کیا کہتے ہیں۔

(۳) تیسرا احتمال یہ ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ارشاد یہ ہے کہ یہ آیت کریمہ یہود کے متعلق نازل ہوئی جب ان کو نبی کریم ﷺ نے دعوت اسلام دی تو انہوں نے کہا ”نتبع ما وجدنا“

علیہ آباءنا فہم کانوا خیرا منا واعلم منا “ ہم تو اس چیز کی تابعداری کرتے ہیں جس پر ہم نے اپنے آباء و اجداد کو پایا وہ ہم سے بہتر تھے اور ہم سے زیادہ علم رکھتے تھے۔ (ازکبر)

راقم کے نزدیک تمام صورتیں مجموعی طور پر آیہ کریمہ کا شان نزول ہیں۔

قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا أَلْفَيْنَا عَلَيْهِ آبَاءُنَا:

وہ کہتے ہیں بلکہ تابعداری کرتے ہیں ہم اس چیز کی پایا ہم نے جس پر اپنے باپ دادوں کو۔

یہ جملہ ان کے حال ماضی کی حکایت ہے اسی وجہ سے ترجمہ راقم نے حال والا کیا ہے۔ یعنی وہ کہتے کہ ہم تو اپنے آباء و اجداد کے دین پر ہیں وہ بت پرستی کرتے تھے تو ہم بھی بت پوجتے ہیں جن چیزوں کو وہ حلال کہتے رہے ہم تو وہی حلال مانتے ہیں اور جن کو وہ حرام کہتے رہے ہم صرف ان چیزوں کو ہی حرام کہتے ہیں ہمیں کیا غرض ہے اس چیز سے جو اللہ تعالیٰ نے نازل کی۔

طلباء کرام توجہ فرمائیں: ” بل “ اضراب کے لئے آتا ہے جب ان کو کہا گیا تم اس چیز کی تابعداری کرو جو اللہ تعالیٰ نے نازل کی تو انہوں نے کہا ہم ایسا نہیں کریں گے بلکہ ہم تو اسی چیز کی تابعداری کرتے ہیں جس چیز پر ہم نے اپنے آباء و اجداد کو پایا۔ ﴿الْفَيْنَا﴾ کا معنی ہے ” وجدنا “ ہم نے پایا چونکہ دوسری جگہ صراحۃً لفظ ” وَجَدْنَا “ آیا ہوا ہے۔

﴿بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ آبَاءُنَا﴾

” بلکہ ہم تو تابعداری کرتے ہیں اس چیز کی جس پر پایا ہم نے اپنے آباء و اجداد کو “

أُولَٰئِكَ كَانُوا أَبَاؤُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ:

کیا جب کہ ان کے باپ دادے نہیں سمجھتے ہیں کچھ چیز اور نہ ہی ہدایت (سیدھی راہ) پر ہیں:

” الواو للحال والهمزة بمعنى الرد والتعجب معناه يتبعونهم ولو كان

آباؤهم لا يعقلون شيئا من الدين ولا يهتدون للصواب “

واو حال کے لئے ہے ہمزہ استفہام انکاری کیلئے ہے ان (کی حماقت) پر تعجب کرتے ہوئے کہا

گیا ہے ان پر تعجب ہے کیا وہ تابعداری کرتے ہیں اپنے آباء و اجداد کی جب کہ ان کے آباء و اجداد دین

کی کسی چیز کو سمجھتے نہیں اور سیدھی راہ پر قائم نہیں۔ (مدارک)

مدارک کی اس تفسیر کے مطابق راقم نے ترجمہ کیا ہے کبیر میں واؤ کو عطف کے لئے بنایا گیا ہے۔ اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ اس کے مطابق ہے۔ اگرچہ مدارک کی تفسیر کے مطابق اعتراض وجواب کی گنجائش نہیں تاہم زیادتی وضاحت کے لئے علامہ رازی رحمہ اللہ کے اعتراض وجواب کو ذکر کیا جاتا ہے۔

﴿ لَا يَعْقِلُونَ شَيْئًا ﴾ لفظ عام ومعناه الخصوص لانهم كانوا يعقلون
كثيرا من امور الدنيا فهذا يدل على جواز ذكر العام مع ان المراد به
الخاص فالمراد انهم لا يعلمون شيئا من الدين (كبير)

یعنی اگر کوئی یہ اعتراض کرے کہ ﴿ لَا يَعْقِلُونَ شَيْئًا ﴾ (وہ نہیں سمجھتے کچھ چیز) کا کیا مطلب ہے جب کہ وہ دنیاوی معاملات کثیر مقدار میں جانتے تھے تو اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ لفظ عام بول کر خاص مراد لینا عربی قانون میں جائز ہے یہاں بھی ذکر عام ہے اور مراد خاص ہے یعنی مراد یہ ہے کہ وہ دین کے معاملہ میں کچھ بھی نہیں جانتے تھے۔ (از کبیر)

تقلید کے متعلق علامہ قرطبی رحمہ اللہ کا ارشاد:

”تعلق قوم بهذه الآية في ذم التقليد لزم الله تعالى الكفار باتباعهم
لآبائهم في الباطل واقتدائهم بهم في الكفر والمعصية وهذا في الباطل
صحيح ، اما التقليد في الحق فاصل من اصول الدين وعصمة من
عصم المسلمين يلجأ إليها الجاهل المقصر عن درك النظر“

بعض لوگوں نے اس آیت کریمہ کو تقلید کی مذمت پر چسپاں کیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کفار کی مذمت اسی وجہ سے اس آیت کریمہ میں بیان کی ہے کہ وہ باطل نظریات میں اپنے آباء و اجداد کی تقلید کرتے تھے اور کفر و معصیت میں ان کی اقتداء کرتے تھے۔ اگر اس دلیل کا مطلب کفر کی حد تک ہو تو صحیح ہے یعنی کافروں کی تقلید ناجائز اور حرام ہے۔ لیکن حق میں تقلید تو دین کے اصول میں سے ایک اصل ہے (یعنی دین کے قوانین میں سے ایک قانون ہے) اور مسلمانوں کو باطل راہ پر چلنے سے بچانے کا ایک خاص ذریعہ ہے جاہل لوگ جو خود مسائل میں علم اور نظر و فکر نہیں رکھتے۔ وہ مجتہدین کرام کی محنتوں سے

فائدہ اٹھا لیتے ہیں اور ان کے علم کی آغوش میں بھٹکانے والوں سے بچ کر پناہ لے لیتے ہیں۔

تقلید کا معنی: ”وہو فی اللغة ماخوذ من قلادة البعير“ یہ لغت میں اونٹ کے قلادہ (گلے کی رسی) سے ماخوذ ہے اصطلاح میں ”التقلید عندنا حقیقۃ قبول قول بلا حجة“ تقلید ہمارے نزدیک اس کی حقیقت یہ ہے کہ کسی کے قول کو بغیر کسی حجت کے قبول کر لیا جائے۔

تقلید فروع میں: ”واما جوازہ فی مسائل الفروع فصحيح“ فروع (مسائل و احکام) میں تقلید صحیح ہے۔

اصول میں صحیح یہ ہے تقلید نہیں: ”واختلف العلماء فی جواز فی مسائل الاصول“ اصول یعنی عقائد میں تقلید کے پائے جانے یا نہ پائے جانے میں اختلاف ہے بعض حضرات کے نزدیک توحید میں تقلید صحیح ہے لیکن یہ قول درست نہیں اس لئے کہ توحید ”لا یحصل الا من جهة الكتاب والسنة“ نہیں ہوتی سوائے کتاب اور سنت کے۔

عقائد میں تقلید کے متعلق صحیح اور درست قول یہ ہے ”قال ابن عطية اجمعت الامة على ابطال التقليد فى العقائد“ ابن عطیہ نے کہا امت کا اس مسئلہ میں اجماع ہے کہ عقائد میں تقلید باطل ہے۔

تقلید کے مخالفین ٹیڑھے ہیں: علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے تقلید کے مخالفین کو ”اهل الزيغ“ (نیڑھی راہ پر چلنے والے) کہا ہے اور بیان کیا ہے کہ انہوں نے دلائل قرآن پاک کی ان آیات سے پیش کئے ہیں۔ ﴿رَبَّنَا اِنَّا اطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَاءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيلَا﴾

”اے ہمارے رب ہم اپنے سرداروں اور اپنے بڑوں کے کہنے پر چلے تو انہوں نے ہمیں راہ سے بہکا دیا“

(الاحزاب ۶۷) ﴿بَلْ قَالُوا اِنَّا وَجَدْنَا آبَاءَنَا عَلَىٰ اٰمَةٍ وَّاِنَّا عَلٰی اٰثَارِهِمْ مُهْتَدُونَ﴾ وَاِنَّا عَلٰی اٰثَارِهِمْ مُقْتَدُونَ ﴿قَالَ اُولُو جَنَّتِكُمْ بِاٰهْدٰی مِمَّا وَجَدْتُمْ عَلٰیہِ اٰبَاءُكُمْ قَالُوا اِنَّا بِمَا اُرْسِلْتُمْ بِهِ كٰفِرُونَ﴾ فَاَنْتَمُنَا مِنْهُمْ فَاَنْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكْذِبِيْنَ ﴿ (الزخرف، ۲۴ تا ۲۵)

بلکہ بولے ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک دین پر پایا اور ہم ان کی لکیر پر چل رہے ہیں اور ایسے ہی ہم نے تم سے پہلے جب کسی شہر میں کوئی ڈرسانے والا بھیجا وہاں کے آسودہ حال والوں نے یہی کہا کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک دین پر پایا اور ہم ان کی لکیر کے پیچھے ہیں۔ نبی نے فرمایا اور کیا جب بھی کہ میں تمہارے پاس وہ لاؤں جو سیدھی راہ ہو اس سے جس پر تمہارے باپ دادا تھے بولے جو کچھ تم لے کر بھیجے گئے ہم اسے نہیں مانتے۔ تو ہم نے ان سے بدلہ لیا تو دیکھو جھٹلانے والوں کا کیسا انجام ہو“

(کنز الایمان)

ان مندرجہ بالا آیات سے دلیل پکڑنا باطل ہے کیونکہ یہ کفار کے حق میں نازل ہیں کافروں کی اپنے آباء واجداد اور اپنے سرداروں اور بڑوں کی تقلید کفر ہی تھی کیونکہ جن کی وہ تقلید کر رہے تھے وہ بھی کافر ہی تو تھے۔ ”و اولئک نسبوا افکھم ای اهل الا باطیل فازدادوا فی التضلیل“ ان لوگوں نے اپنے چھوٹے عقائد باطل راہ پر چلنے والوں کی طرف منسوب کئے اسلئے یہ اور زیادہ بھٹک گئے۔

نیک لوگوں کی تابعداری: انبیاء کرام کی (اور نیک لوگوں کی یعنی ائمہ مجتہدین کی) تابعداری ”و هو الدین الخالص الذی ارتضاه اللہ“ وہ خالص دین ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے پسند فرمایا ہے ”کان اتباعہ آباءہ من صفات المدح“ اس قسم کے آباء واجداد کی اتباع کی رب تعالیٰ نے تعریف فرمائی جیسا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے کلام کا ذکر قرآن پاک میں فرمایا:

﴿ اِنِّیْ تَرٰکْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَهُمْ بِالْآخِرَةِ هُمْ کٰفِرُوْنَ ☆ وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ آبَائِیْ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ مَا کَانَ لَنَا اَنْ نُّشْرِکَ بِاللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ ذٰلِکَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَیْنَا وَ عَلٰی النَّاسِ ﴾

(یوسف ۳۷، ۳۸)

بیشک میں نے ان لوگوں کا دین نہ مانا جو اللہ پر ایمان نہیں لاتے اور وہ آخرت سے منکر ہیں اور میں نے اپنے باپ دادا ابراہیم اور اسحاق اور یعقوب کا دین اختیار کیا ہمیں نہیں پہنچتا کہ کسی چیز کو اللہ کا شریک ٹھہرائیں یہ اللہ کا فضل ہے ہم پر اور لوگوں پر۔

(کنز الایمان) (بحث ماخوذ از فرطی)

نوٹ: اس مسئلہ کی زیادہ وضاحت کیلئے جس سے عوام اور طلباء کرام یکساں فائدہ حاصل کریں اپنے رسالہ ”فقہ اور امام اعظم“ کو یہاں شامل کر رہا ہوں تاکہ مسئلہ نکھر کر واضح ہو جائے۔

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

”الحمد لله رب العلمین ☆ والصلوة والسلام علی رسولہ رحمة للعلمین ☆

وعلی الہ وصحابہ اجمعین“

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”فقیہ واحد اشد علی الشیطان من الف عابد“ (ترمذی، ابن ماجہ، مشکوٰۃ کتاب العلم

یعنی ایک فقیہ شیطان پر ہزار عابد سے زیادہ سخت ہوتا ہے۔

ہزار عابد سے مراد معین تعداد نہیں بلکہ ”المراد الکثرة“ مراد کثیر عبادت گزار لوگ ہیں خواہ ہزار سے زائد ہی کیوں نہ ہوں، ایک فقیہ کثیر عابدوں کی بنسبت شیطان پر سخت اور بھاری کیوں ہے؟ اس لئے کہ جب شیطان مکرو فریب کے دروازے کھولتا ہے تو فقیہ اسے جانتا ہے وہ اپنی تقریر و تحریر کے ذریعے دوسرے لوگوں کو بھی اس کے مکرو فریب سے آگاہ کرتا ہے اس طرح وہ شیطانی راستے کو بند کرتا ہے کیونکہ جب لوگ شیطان کے جال میں نہیں پھنستے تو وہ رسوا ہو جاتا ہے۔ لیکن عابد اپنی عبادت میں مشغول رہتا ہے اسکی توجہ ہی شیطانی مکرو فریب کی طرف نہیں ہوتی، اس لئے وہ تو خود شیطانی جال کی زد میں ہوتا ہے دوسروں کو کیا بچائے گا خیال رہے کہ فقیہ یعنی عالم سے مراد باعمل عالم ہے اور عابد سے مراد بے علم عابد ہے۔

اعتراض: اس حدیث کے متعلق تو طبرانی نے لکھا ہے ”سندہ ضعیف ولہ شواہد اسانیدہا ضعیفہ“ اس کی سند ضعیف ہے اور اس کے ضعیف ہونے پر کثیر شواہد پائے جاتے ہیں؟
جواب: طبرانی نے اگرچہ اسی حدیث کے متعلق لکھا ہے لیکن سند اس کی دوسری ہے وہ بیہقی نے شعب میں اور طبرانی نے اوسط میں ذکر کی ہے جسکی سند حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ تک پہنچتی ہے۔ ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”لکن کثرة طرقہ تخرجه من الضعف خصوصا حیث اعتضدہ بروایۃ

الترمذی وابن ماجہ عن ابن عباس“

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث بے شک راویوں کے لحاظ سے ضعیف ہے لیکن

کثرت طرق کی وجہ سے ضعف سے خارج بلکہ حسن لغیرہ ہے خصوصاً جب اس کو تائید حاصل ہے
ترمذی اور ابن ماجہ کی روایت سے جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ واضح ہوا کہ حضرت
ابن عباس کی سند سے مروی حدیث نے تو حضرت ابو ہریرہ سے مروی حدیث کو بھی ضعف سے نکال دیا
ہے، یہ خود ضعیف نہیں۔
(مرقاۃ جلد ۱ ص ۲۸۴)

اجتہاد کے درجہ کا علم فرض کفایہ ہے:

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”طلب العلم فريضة على كل مسلم ومسلمة“

ہر مسلمان پر علم کا حاصل کرنا فرض ہے۔ ہر مسلمان پر جس علم کا حاصل کرنا فرض عین ہے یہ وہ علم
ہے کہ جس کے بغیر کوئی چارہ کار ہی نہیں۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کے موجود ہونے، خالق ہونے کا علم،
اس کی وحدانیت کا علم اور اس کے رسولوں کی نبوت کا علم، اور نماز کی کیفیت کا علم فرض عین ہے یعنی یہ
باتیں ہر شخص کو جاننا ضروری ہیں اگر کوئی ان چیزوں سے بے خبر رہا تو گناہگار ہوگا۔

”واما بلوغ رتبة الاجتهاد والفتيا ففرض كفاية“ (ازمرقاۃ ج ۱ ص ۲۸۴)

یعنی اجتہاد اور فتویٰ دینے کی حد تک علم حاصل کرنا فرض کفایہ ہے۔ تقریباً ستاون میل کے اندر کوئی
ایک بھی ایسا عالم پایا جائے جو تفصیلی علم رکھتا ہو تو دوسرے لوگ گنہگار نہیں ہونگے ورنہ تمام گناہگار ہونگے۔
اس سے واضح ہوا کہ تفصیلی علم حاصل کرنا ہر شخص پر فرض نہیں لیکن مسائل کا خود علم نہ رکھنے
کی وجہ سے مجتہد عالم کی طرف رجوع کرنا ضروری ہوگا۔

فائدہ: ”فان قيل ما الفرض قبل الفرض فقل العلم قبل العمل وان قيل

ما الفرض في الفرض فقل الاخلاص في العلم والعمل وان قيل ما الفرض بعد

العمل فقل الخوف والرجاء“ (مرقاۃ ج ۱ ص ۲۸۴)

اگر کہا جائے کہ فرض سے پہلے کیا فرض ہے تو تم کہو عمل سے پہلے علم یعنی فرض دونوں ہی ہیں
لیکن علم پہلے اور عمل بعد میں (اگر کہا جائے کہ فرض میں فرض کیا ہے تو تم کہو علم اور عمل میں
خلوص (یعنی جس طرح علم اور عمل فرض ہیں اسی طرح ان میں خلوص بھی فرض ہے) اگر کوئی
کہے عمل کے بعد کیا چیز فرض ہے تو تم کہو خوف اور امید (یعنی عمل بھی فرض ہے اور عمل کے بعد یہ

بھی فرض ہے کہ انسان بخشش کی امید بھی رکھے اور اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرتا بھی رہے، یہ امید و بیم بھی فرض ہے۔

فقہ کیا ہے؟

فقہ کا لغوی معنی ہے ”سمجھنا“ اور اہل شرع کے نزدیک فقہ ایک خاص علم کا نام جسکی تعریف یہ ہے:

”الفقه هو العلم الحاصل بجملة من الاحكام الشرعية الفرعية بالنظر

والاستدلال“

(مقدمہ سورۃ الانوار)

فقہ وہ علم ہے کہ نظر و استدلال سے تمام احکام شرعیہ فروعیہ حاصل ہوں۔

فقہ کی تعریف میں لفظ علم استعمال کیا گیا ہے یہ بمعنی یقین کے ہے یعنی جس کے ذریعے احکام شرعیہ فروعیہ کا یقین حاصل ہوا اگر گمان حاصل ہوا تو وہ حقیقی معنی کے لحاظ سے فقہ نہیں اگرچہ مجازاً اسے فقہ کہہ لیا جاتا ہے۔ اور یہ بیان کیا ہے کہ تمام احکام کا علم حاصل ہو اسلئے کہ اگر کسی کو ایک دو مسئلے آجائیں تو اس کے علم کو فقہ نہیں کہا جائے گا۔

یہ کہا گیا کہ احکام بھی شرعی ہوں، اس لئے کہ اگر عقلی یا حسی اشیاء کا علم حاصل ہو جائے تو اسے فقہ نہیں کہتے۔ فروعیہ کہا گیا ہے جسکا مطلب ہے کہ وہ علم جو خود دلیلوں کے حجت ہونے کا ہے یعنی قرآن سنت (حدیث)، اجماع اور قیاس دلائل فقہ ہیں اس چیز کے جاننے کا نام فقہ نہیں بلکہ ان سے حاصل ہونے والے مسائل کا نام فقہ ہے نیز اصولی اشیاء کا علم بھی فقہ نہیں تو حید باری تعالیٰ رسالت و نبوت، قیامت کا علم جنت و دوزخ وغیرہ اس قسم کے عقائد کا علم فقہ نہیں۔

فقہ کون ہے؟

”ولم يطلق الفقيه الاعلى المستنبطين منهم يعني يشترط لهم ملكة الاستنباط

(از توضیح)

الصحيح وهو ان يكون مقرونا بشرائطه“

یعنی فقہ وہ ہوگا جسے تمام احکام شرعیہ فروعیہ کے استنباط صحیح کا ملکہ حاصل ہو اور استنباط صحیح کی تمام شرائط پائی جائیں یعنی مجتہد ہو اور اجتہاد کی شرائط اسکی پائی گئی ہوں۔

وشرط الاجتهاد ان يحتوى علم الكتاب بمعانيه اللغوية والشرعية ووجوهه التي

قلنا من الخاص والعام والامر والنهی وسائر الاقسام السابقة وعلم السنة بطرقها المذكورة وان يعرف وجوه القياس بطرقها وشرائطها. (از مار و نور الانوار ص ۲۳۶)

اجتہاد کی شرط یہ ہے کہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ کے معانی لغویہ اور شرعیہ پر انسان حاوی ہو اور اصول فقہ کے تمام ضوابط یعنی خاص، عام، مشترک، مآول، ظاہر، نص، منسوخ، محکم، خفی، مشکل، مجمل، متشابہ، حقیقت، مجاز، صریح، کنایہ، عبارة النص، دلالة النص، اشارة النص، اقتضاء النص، اور امر و نہی وغیرہ کو جانتا ہو، اور تمام طریقوں کا علم اسے سنت میں بھی حاصل ہو جیسے قرآن پاک کا علم ان طریقوں کے مطابق ہونا ضروری ہے نیز قیاس کے تمام طریقے اور انکی شرائط کو جانتا ہو۔

خیال رہے کہ جو مسائل کتاب و سنت و اجماع سے ثابت ہوں ان میں قیاس و اجتہاد نہیں ہوگا البتہ ایک مسئلہ مختلف احادیث سے مختلف طریقوں سے ثابت ہو رہا ہو تو ان احادیث میں تطبیق دینا اور مسئلہ کا استنباط کرنا مجتہد کا کام ہے اسی طرح قرآن پاک کی آیت اور حدیث میں اگر بظاہر تعارض نظر آ رہا ہو تو اس تعارض کو ختم کرنے کے لیے اجتہاد ہوگا۔

اسلام کے پہلے فقیہ و مجتہد:

رسول اللہ ﷺ کے صحابی حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ ہیں آپ سے پوچھا گیا کہ ایک عورت کا خاوند جماع سے پہلے ہی فوت ہو گیا اور نکاح کے وقت اسکا مہر بھی مقرر نہیں کیا گیا تھا اسکا کیا حکم ہے یعنی وہ عورت کتنا مہر لینے کی حقدار ہے؟ آپ نے فرمایا:

”اجتهد فيها برأى ان اصبحت فممن الله وان اخطأت فممنى ومن الشيطان“

میں اپنی رائے سے اس میں اجتہاد کروں گا اگر میں نے درست بیان کر دیا تو یہ اللہ تعالیٰ کا فضل اور مہربانی ہوگی اور اگر میں نے اس میں غلط فیصلہ کیا تو میرے اجتہاد میں میری اپنی ہی غلطی ہوگی یا شیطان کی طرف سے شک ڈالا گیا ہوگا۔

آپ نے اس مسئلہ میں ایک ماہ تک اجتہاد کرنے کے بعد یہ فیصلہ صادر فرمایا ”اری لہا مہر مثل نسائها لاوکس ولا شطط“ میں نے اپنے اجتہاد سے یہ مسئلہ حاصل کیا کہ اسکا مہر اس کے خاندان کی اس جیسی عورتوں کی مثل ہوگا یعنی وہ مہر مثل کی حقدار ہے نہ اس سے کچھ کم ہوگا اور نہ زائد۔

آپ کا یہ قول سکر ایک صحابی نے کہا کہ حضور ﷺ نے بھی ایک عورت کے متعلق یہی فیصلہ کیا تھا۔ یہ سن کر عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بہت خوش ہوئے کہ میرا اجتہاد نبی کریم ﷺ کے فیصلہ کے مطابق ہو گیا کیونکہ آپ نے پہلے اس مسئلہ کے متعلق کسی سے نہیں سنا تھا کہ نبی کریم ﷺ نے بھی اس میں کوئی حکم فرمایا ہے۔

”وكان ذالك بمحضر من الصحابة ولم ينكر عليه احد منهم“

حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ اجتہاد کئی صحابہ کرام کی موجودگی میں فرمایا اور کسی نے انکار نہیں کیا لہذا اس مسئلہ پر اجماع صحابہ ہو گیا کہ اجتہاد کیا جاسکتا ہے، اور اجتہاد میں غلطی کا بھی گمان ہو سکتا ہے اور اجتہاد صحیح بھی ہو سکتا ہے۔

مجتہد کو اجتہاد کر نیک ثواب ہر حالت میں حاصل ہوگا اگر درست فیصلہ ہوا تو دو ثواب حاصل ہونگے ایک اجتہاد کا، اور دوسرا درست فیصلے کا اور اگر خطا ہوگئی تو بھی اجتہاد کا ثواب ضرور حاصل ہوا۔

(از نور الانوار ص ۲۳۶)

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے بعد کے فقہاء کرام:

حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بعد مزید فقہ کی مزید وضاحت حضرت علقمہ بن قیس نے کی، یہ ابراہیم نخعی کے ماموں ہیں۔ نبی کریم ﷺ کی ظاہری حیات میں ہی پیدا ہو گئے تھے انہوں نے حضرت ابن مسعود، حضرت علی، حضرت ابوالدرداء اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہم سے علم حاصل کیا اور ان سے ہی قرآن پاک پڑھا۔ ان کے بعد ابراہیم بن یزید نخعی نے مختلف فوائد و نواد جمع کئے اور ان کے بعد مزید وضاحت اور چھان بین حضرت حماد مسلم کوئی نے کی۔

ان کے بعد اثر اصول و ضوابط امام الائمہ سراج الائمہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہ نعمان بن ثابت رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے مرتب فرمائے، سب سے پہلے فقہ کو تدوین کرنے والے آپ ہی ہیں آپ نے ہی فقہ کی کتب کو کتاب باب وغیرہ میں مرتب فرمایا اور آج تک اسی پر فقہی کتب مرتب ہو رہی ہیں خیال رہے کہ امام مالک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے بھی اپنے مؤطا میں امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی ترتیب ہی کی

تابع داری کی ہے۔ کتاب الفرائض اور کتاب الشروط کو بھی سب سے پہلے مرتب کرنے والے امام اعظم ہی ہیں، آپ کے بعد امام ابو یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ نے امام صاحب کے بیان کردہ اصول وضوابط میں مزید نظر فرمائی اور فروع کا استنباط کیا ان کے بعد مزید وضاحت اور استنباط امام محمد بن حسن شیبانی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے کہا۔

(شامی جلد ۱ ص ۳۵)

تقلید کیا ہے؟

”التقلید اتباع الرجل غیرہ فیما یقول او فی فعلہ علی زعم انہ محقق بلا نظر فی الدلیل فکان المقلد جعل قول الغیر او فعلہ قلادۃ فی عنقہ کذا فی مختصر المنار“

(حاشیہ نور الانوار ص ۲۰۶)

تقلید کا لغوی معنی ہے گردن میں قلادہ یعنی پٹا ڈالنا۔ اور اصطلاحی معنی یہ ہے کہ غیر کے قول اور فعل کی تابع داری کرنا یہ قوی اور غالب گمان کرتے ہوئے کہ اس شخص کا قول اور فعل حق ہے اس کے دلائل کو بھی نہ دیکھا جائے کہ اس کے دلائل کس درجہ کے ہیں لغوی اور اصطلاحی معنی میں مطابقت واضح ہے کہ تقلید کرنے والے نے گویا اپنے گلے میں غیر کے قول و فعل کا قلادہ ڈال لیا ہے۔

تقلید صرف مجتہد کی ہوگی:

صاحب منار نے تحریر فرمایا ہے ”تقلید الصحابی واجب یتروک بہ القیاس“ صحابی کی تقلید واجب ہے اس کے ذریعے قیاس کو چھوڑ دیا جائیگا۔ اس عبارت کی وضاحت میں صاحب قمر الاقمار فرماتے ہیں

”والمراد بالصحابی الصحابی المجتہد کذا فی التلویح فان رواۃ الصحابی الغیر المجتہد قد تترک اذا کالف القیس من کل وجہ فوله اولی بالترک“

(نور الانوار ص ۲۰۶)

صحابی سے مراد وہ صحابی ہے جو مجتہد ہو یعنی مجتہد صحابی کے قول کے خلاف اگر قیاس ہو تو اسے چھوڑ دیا جائیگا۔ جیسا کہ اصول فقہ کی مشہور کتاب تلویح میں بھی ذکر ہے لیکن غیر مجتہد صحابی کی روایت جب قیاس کے سراسر مخالف ہو اور ان میں تطبیق کی کوئی وجہ نہ ہو تو وہاں قیاس پر عمل

ہوگا اور قول صحابی کو چھوڑ دیا جائے گا۔

مذہب اربعہ حق ہیں :

مذہب حنفی، مذہب مالکی، مذہب شافعی اور مذہب حنبلی چاروں حق ہیں ان چاروں مذاہب میں جس کسی کی تقلید کی جائے صحیح ہے تقلید کرنے والا گناہ گار نہ ہوگا کیونکہ مجتہد سے اپنے اجتہاد میں خطا بھی ہو جائے تو وہ گناہ گار نہیں۔ وہ اپنے اجتہاد کے مطابق عمل کرے تو اس کا عمل صحیح ہوگا اور اس کی تقلید بھی اس اجتہاد میں صحیح ہوگی۔

”ان المجتہد یخطئ ویصیب والحق فی موضع الخلاف واحد لکن لا یعلم ذلک الواحد بالیقین فهذا قلنا بحقیقہ المذاهب الاربعۃ ای الحنفی والشافعی والمالکی والحنبلی“
(منار، نور الانوار، قمر الاقمار ۲۴۶)

بے شک مجتہد سے اجتہاد میں کبھی خطا ہو جاتی ہے اور کبھی اس کا اجتہاد درست ہوتا ہے جب مجتہدین کے اجتہادات میں اختلاف ہو تو حق صرف ایک میں ہے ہوگا کیونکہ یقینی طور پر معلوم نہیں کہ کس اجتہاد میں حقانیت ہے اسلئے چاروں مذاہب یعنی حنفی، شافعی مالکی اور حنبلی حق ہونگے۔ خیال رہے کہ ایک کے حق ہونے سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان میں سے حق ایک ہی ہے۔

”ان للہ تعالیٰ فی کل مسئلۃ فیہا المجتہدون حکما معینا فمن اصابہ اصاب ومن اخطا اخطا“
(قمر الاقمار حاشیہ نور الانوار ص ۲۴۶)

یعنی جس مسئلہ میں مجتہدین کا اختلاف ہوگا ان مختلف اجتہادات میں سے اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایک ہی حکم معین ہوگا جس کو اس کی طرف سے توفیق کامل حاصل ہوئی اس نے راہ حق کو پایا اور دوسرے سے خطا واقع ہوگئی۔ لیکن خیال رہے کہ تقلید کرنے والے صرف دلائل کی برتری اور طرز استدلال کو دیکھ کر کسی ایک مذہب کو ترجیح دیں گے اسلئے جس مذہب کو غالب سمجھ کر کسی نے تقلید کر لی وہی اس کے حق میں درست ہوگا۔

مذہب اربعہ کے بغیر تقلید منع ہے :

”ولا یجوز تقلید ماعدا المذاهب الاربعۃ ولو وافق قول الصحابة والحديث“

الصحيح والاية فالخارج عن المذاهب الاربعة ضال مضل وربما اذاه ذالك الى الكفر لان الاخذ بظواهر الكتاب والسنة من اصول الكفر

(صاوی، سورۃ الکہف ایتہ وادکر ربک اداسبت)

ان چاروں مذاہب کے علاوہ کسی اور مذہب کی تقلید درست نہیں اگرچہ وہ بظاہر صحابہ کے قول اور حدیث اور کسی آیت کے مطابق ہی کیوں نہ ہو، جو ان چاروں مذاہب سے خارج ہے وہ گمراہ ہے اور گمراہ کرنے والا ہے کیونکہ بسا اوقات یہ کفر تک پہنچا دیتا ہے اسلئے کہ قرآن وحدیث کے ظاہری معانی مراد لینا اور انکی حقیقت کو نہ سمجھنا کفر کی جڑ ہے۔

تقلید بہت ضروری ہے:

رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا.....! فاسئلوا اهل الذکر ان کنتم لاتعلمون تم اہل علم سے پوچھ لو اگر تم خود نہیں جانتے۔ اہل ذکر سے مراد کون ہیں؟ فاسئلوا المؤمنین العالمین من اهل القرآن (خازن) یعنی جو مومن ہیں اور قرآن کا علم رکھتے ہیں ان سے پوچھ لو اگر تم خود نہیں جانتے۔ مندرجہ بالا آیت کی تفسیر میں علامہ سیوطی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ درمنثور میں فرماتے ہیں:

”اخرج ابن مردويه عن انس قال سمعت النبي ﷺ يقول ان الرجل يصلی ويصوم ويحج ويغزو وانه لمنافق قالوا يا رسول الله بما ذا دخل عليه النفاق قال لطنه على امامه وامامه من قال قال الله في كتابه فاسئلوا اهل الذکر ان كنتم لاتعلمون“

ابن مردویہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت کی ہے کہ وہ کہتے ہیں میں نے نبی کریم ﷺ کو کو فرماتے سنا کہ بیشک ایک شخص نماز پڑھتا ہوگا، روزے رکھتا ہوگا، حج کرتا ہوگا اور جہاد کرتا ہوگا لیکن وہ منافق ہوگا۔ صحابہ نے عرض کی، یا رسول اللہ ﷺ! وہ کس وجہ سے منافق ہوگا؟ آپ نے فرمایا! اپنے امام پر طعنہ کرنے کی وجہ سے، امام کون ہے؟ فرمایا، رب تعالیٰ کا ارشاد ہے: فاسئلوا اهل الذکر ان كنتم لاتعلمون۔

تقلید مذاہب اربعہ ہی کی کیوں ضروری ہے:

صرف ان چاروں ائمہ کی ہی تقلید ہو سکتی ہے کسی اور کی نہیں کیونکہ ان حضرات نے ہی وہ قوانین وضوابط

مرتب فرمائے ہیں جن کے ذریعہ مسائل کا حل نکالا جاسکتا ہے اور باقی تمام لوگ ان کے ہی پیروکار ہیں۔ خیال رہے کہ غیر مقلدین بھی اپنے دلائل وہی پیش کرتے ہیں جو کسی نہ کسی امام کے مذہب میں پیش کیے گئے ہیں۔ تمام حنفی فقہاء امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے مقلد ہیں۔
تمام فقہاء کے کل سات درجے ہیں :

پہلا درجہ ان حضرات کا جو مجتہد فی الشرع ہیں جس طرح چاروں امام یعنی امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی، اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہم انہی حضرات نے فقہ کے قواعد و اصول مرتب فرمائے ہیں۔

دوسرا درجہ ان حضرات کا ہے جو مجتہد فی المذہب ہیں جیسے امام ابو یوسف، امام محمد، رحمۃ اللہ علیہما اور امام اعظم کے دیگر شاگرد جن کو یہ طاقت حاصل تھی کہ وہ اپنے امام اور استاذ کے بتائے ہوئے قوانین کے ذریعے قرآن و حدیث سے مسائل نکال سکتے تھے۔

تیسرا درجہ مجتہدین فی المسائل کا ہے یہ وہ حضرات ہیں جو اصول اور فروع میں اپنے امام کے مقلد ہیں ہاں البتہ جن مسائل میں کوئی نص نہیں پائی جاتی یہ حضرات وہ مسائل اپنے امام کے بنائے ہوئے اصول و قوانین سے نکالنے کی طاقت رکھتے ہیں۔ جیسے خصاف، ابو جعفر طحاوی، ابوالحسن کرخی، شمس الائمہ حلوانی، شمس الائمہ سرخسی، فخر الاسلام بزدوی، فخر الدین قاضیخان وغیرہ۔

چوتھا درجہ مقلدین میں اصحاب تخریج کا ہے یہ حضرات اجتہاد پر تو بالکل قادر نہیں ہوتے لیکن انہیں قوانین اور ماخذ کا علم ہوتا ہے اگر کوئی مسئلہ مجمل ہوتا اور اس میں دو وجوہات ہوتیں یا اسی طرح کوئی مسئلہ مبہم ہوتا جس میں دو احتمال پائے جاتے تو یہ ترجیح دے سکتے تھے جیسے رازی وغیرہ۔

پانچواں درجہ مقلدین میں اصحاب ترجیح کا ہے یہ وہ حضرات ہیں جو روایات کے متعلق یہ فیصلہ کرنے کی طاقت رکھتے تھے کہ یہ اولیٰ ہے، یہ اصح ہے، یہ لوگوں کی لئے بہتر اور آسان ہے جیسے ابوالحسن قدوری اور صاحب ہدایہ۔

چھٹا درجہ مقلدین میں سے ان حضرات کا ہے جو زیادہ قوی اور قوی اور ضعیف کے درمیان فرق

کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے اور ظاہر اور روایات نادرہ وغیرہ میں تمیز کر سکتے تھے جیسے متأخرین فقہاء کرام جنہوں نے وہ کتب تصنیف کیں جنہیں متن کہا جاتا ہے جیسے صاحب کنز، صاحب مختار، صاحب وقایہ، صاحب مجمع وغیرہ۔ یہ حضرات اقوال مردود اور روایات ضعیفہ نقل نہیں کرتے۔

ساتواں درجہ ان فقہائے کرام کا ہے جو ان چھ مذکورہ مدارج میں سے کسی درجہ پر نہیں ہوتے بلکہ انہیں صرف یہ مقام حاصل ہوتا ہے کہ وہ فقہ کی کسی کتاب کو دیکھ کر مسئلہ بتا سکتے ہیں۔ جو فقہ کی کتب کو اچھی طرح سمجھ سکتا ہو اسے ہم فقیہ اعظم اور فقیہ العصر کے القاب دیتے ہیں یہ کامل طور پر مقلد ہوتے ہیں۔

(ارشامی ج ۱ ص ۵۷)

تنبیہ : ایک درجہ کے فقہاء ایک دوسرے کے مقلد نہیں ہوتے لیکن اوپر والے درجہ کے فقہاء کے مقلد کی حیثیت میں ہوتے ہیں اگرچہ درحقیقت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ ہی کے مقلد ہوتے ہیں۔

امام اعظم کے شاگردوں کا آپ سے کئی مسائل میں اختلاف کیوں؟

ایک مرتبہ امام اعظم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے ایک بچہ کو کچیز میں کھیلتے ہوئے دیکھ کر فرمایا، دیکھنا کہیں گرنہ جانا۔ اس بچے نے عرض کی :

” احذر انت السقوط فان فی سقوط العالم سقوط العالم “

آپ احتیاط کرنا کیونکہ ایک عالم کے پھسلنے اور گرنے سے تمام جہان گر جاتا ہے۔

یعنی عالم کی غلطیوں سے لوگ غلطی میں پڑ جاتے ہیں۔ اس واقعہ کے بعد امام صاحب نے اپنے اصحاب کو حکم دیا :

” ان توجه لکم دلیل فقولوا بہ “

اگر تمہیں کوئی دلیل نظر آئے تو اس کے مطابق تم مسئلہ بیان کر دیا کرو، آپ کا یہ ارشاد آپ کے مکمل تقویٰ پر دلالت کرتا ہے آپ کے اس ارشاد کے باوجود آپ کے تلامذہ نے آپ کے بیان کردہ اصول و ضوابط کے خلاف کوئی قانون نہیں وضع کیا بلکہ آپ کے اصولوں کے مطابق ہی مسائل میں اجتہاد کیا ہے۔

امام ابو یوسف فرماتے ہیں :

” ما قلت قولا خالفت فیہ ابا حنیفۃ الا قولا قد کان قوله “

یعنی میں نے امام اعظم علیہ الرحمۃ کے کسی قول کی سوائے ایک قول کے مخالفت نہیں کی۔
امام زفر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”ماخالفت اباحنیفۃ فی شئی الاقد قالہ ثم رجع عنہ“

میں نے امام صاحب کے کسی قول کی مخالفت نہیں کی ہاں البتہ آپ کا ایسا کوئی قول ہو جس سے آپ نے خود ہی رجوع فرمالیا ہو تو اس کی مخالفت اگرچہ میں نے کی لیکن وہ بھی درحقیقت مخالفت نہیں کیونکہ آپ نے اسے ترک کر دیا تھا۔

”فہذا اشارۃ الی انہم ماسلکوا الطريق الخلاف بل قالوا ما قالوا عن اجتہاد وراۃ اتباعا لما قالہ استاذہم ابو حنیفۃ رحمہ اللہ تعالیٰ“ (درمختار و شامی ج ۱ ص ۴۹، ۵۰)
اس سے واضح ہوا کہ امام صاحب کے شاگردوں نے آپ کے مخالف کسی راہ کو اختیار نہیں کیا بلکہ انہوں نے اپنے اجتہاد یا اپنی رائے سے جو مسئلہ بھی بیان کیا ہے اس میں انہوں نے اپنے استاذ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ہی کی تابعداری کی ہے۔

اس بحث سے واضح ہوا کہ تمام فقہاء کے طبقات امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے ہی مقلد ہیں اور آپ کے شاگرد بھی آپ ہی کے مقلد ہیں ایک درجے کا فقیہ اپنے ہی درجے کے فقیہ کا مقلد نہیں نیز ہمارے زمانے کے سب فقہاء پہلے تمام فقہاء کے تابع ہیں۔

تقلید کن مسائل میں جائز ہے؟

علامہ اسماعیل حقی رحمۃ اللہ علیہ تفسیر روح البیان میں آیۃ ”نصیبہم غیر منقوص“ کی تفسیر میں فرماتے ہیں۔

”وفی الایۃ ذم التقليد وهو قبول قول الغير بلا دلیل وهو جائز فی الفروع والعملیات ولا یجوز فی اصول الدین والاعتقادات بل لا بد من النظر والاستدلال“

تقلید صرف فروعی مسائل اور عملیات میں ہے اصول دین اور اعتقادی مسائل میں تقلید جائز نہیں بلکہ ان میں نظر و استدلال ضروری ہے آیت کریمہ میں جس تقلید کی مذمت کی گئی ہے وہ یہی ہے کہ اعتقادات اور اصول دین کو بغیر نظر و استدلال کے صرف کسی شخص کے کہنے پر تسلیم

نہ کیا جائے۔

اپنے امام کے مذہب کو حق ماننا واجب ہے :

”اذا سئلنا عن مذهبنا ومذهب مخالفنا قلنا وجوباً مذهبنا صواب يحتمل الخطاء
ومذهب مخالفنا خطاء يحتمل الصواب“ (مقدمہ در مختار)

جب ہم سے ہمارے مذہب (مذہب حنفی) اور دوسروں کے مذہب کے متعلق سوال کیا جائے
تو ہم پر واجب ہوگا کہ ہم یہ جواب دیں، ہمارا مذہب حق اور درست ہے اور غلطی کا اس میں
بہت ہی کم احتمال ہے جبکہ ہمارے غیر کا مذہب درست نہیں اور اس کے صحیح ہونے کا بہت ہی
کم احتمال ہے۔

”واذا سئلنا عن معتقدنا ومعتقد خصومنا قلنا وجوباً بالحق ما نحن عليه والباطل
ما عليه خصومنا“ (در مختار)

اور جب ہم سے پوچھا جائے کہ ہمارا عقیدہ سچا ہے یا ہمارے مخالفین کا تو ہم پر یہ جواب دینا
واجب ہے کہ ہمارا عقیدہ حق، اور سچ اور درست ہے اور ہمارے مخالفین کا عقیدہ باطل ہے۔

یعنی ہمیں اپنے عقیدے کی اور اپنے مذہب کی حقانیت پر کامل یقین ہو کیونکہ یہ ضروری ہے کہ ہم
اپنے عقیدے اور مذہب میں متزلزل اور متردد نہ ہوں۔

در مختار کی اس عبارت پر علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں :

”عن معتقدنا ای عما نعتقدہ من غیر المسائل الفرعیۃ مما یجب اعتقاده علی کل
مكلف بلا تقلید لاحد وهو ما علیہ اهل السنة والجماعة وهم الاشاعرة
والماتریدیۃ وهم متوافقون الا فی مسائل یسیرۃ اربعہا بعضهم الی الخلاف
اللفظی“ (شامی ج ۱ ص ۳۶)

عقیدہ سے مراد فروعی مسائل کے بغیر اصول دین ہیں عقائد میں ہر مکلف یعنی عاقل و بالغ کے
لئے ضروری ہے کہ وہ کسی شخص کی تقلید کے بغیر ان پر اعتقاد رکھے۔ (فروعی مسائل میں تقلید
واجب ہوگی) عقائد صحیحہ صرف وہی ہونگے جن پر اہل سنت و جماعت یعنی اشاعرہ اور
ماتریدیہ کا اجماع ہے، انکا آپس میں بہت ہی کم اختلاف ہے وہ بھی بعض حضرات کے نزدیک
لفظی اختلاف ہے۔

علامہ شامی کی اس تحقیق کے بعد یہ واضح ہو گیا کہ اعتقادات یعنی اصول دین میں تقلید نہیں، صرف فروعی مسائل میں تقلید ہوگی۔ اسی وجہ سے صاحب درمختار نے بھی مذہب اور عقیدہ کا الگ الگ ذکر کیا ہے کیونکہ مذہب سے مراد فروعی مسائل میں امام کی تقلید ہے اور عقیدہ سے مراد اصول دین ہیں جنہیں بغیر تقلید کے تسلیم کرنا اور ان پر قائم رہنا واجب ہے۔

خیال رہے کہ صریح احکام جن میں احادیث متعارض نہیں ان میں بھی تقلید نہیں اور نہ ہی ان میں کسی امام کا اختلاف ہے جیسے نماز کی رکعتیں یعنی فجر کی نماز دو رکعت فرض ہیں اور ظہر کی چار، اسی طرح رمضان کے پورے مہینے کے روزے فرض ہیں، اس قسم کے مسائل میں تقلید نہیں۔

صحابہ کرام پر کس کی تقلید ضروری تھی؟

جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا کہ فقہاء کرام کے کئی طبقات ہیں ہر طبقہ کے لوگوں کو اپنے ہی درجے کے لوگوں کا مقلد ہونا ضروری نہیں البتہ اپنے سے اوپر والے درجے کے فقہاء کا مقلد ہونا ضروری ہے اس سے واضح ہو گیا کہ صحابہ کرام کو آقائے دو جہاں ﷺ کے ہوتے ہوئے کسی کی تقلید کی ضرورت نہ تھی وہ جب چاہتے نبی کریم ﷺ سے مسائل پوچھ لیتے تھے اسلئے انکو دین سمجھنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آتی تھی۔

اسی طرح تابعین صحابہ کرام کی طرف رجوع فرما لیتے تھے اور انکو بھی کسی ایسے امام کی ضرورت نہیں تھی لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا گیا مسائل کو سمجھنا اور احادیث میں تطبیق دینا دشوار ہوتا چلا گیا اسلئے بعد کے لوگوں کو ائمہ کی تقلید کرنا واجب ہوا کیونکہ ان ائمہ نے مسائل کے حل اور احادیث میں تطبیق کے لئے اصول و ضوابط مقرر فرما دیئے۔

امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب کو فوقیت کیوں؟

1: مذہب حنفی کی فضیلت کی سب سے بڑی وجہ تو یہ ہے کہ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ تابعی ہیں اور تابعی کا قول حدیث قولی ہے اور تابعی کا فعل حدیث فعلی ہے اور تابعی کے سامنے کوئی کام کیا جائے اور وہ اس سے نہ روکے تو وہ حدیث تقریری ہے یعنی جس طرح نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام کے اقوال و افعال اور ان کا کسی کام کے کرنے سے نہ روکنا احادیث ہیں اسے طرح تابعی کے بارے میں بھی یہی حکم ہے

قوت اور ضعف کا فرق ہوگا لیکن حدیث ہونے سے انکار نہیں کیا جاسکتا اور خصوصاً جبکہ تابعی بھی وہ ہو جسے علم اور تقویٰ کا اعلیٰ مقام حاصل ہو تو یقیناً اس کے اقوال نے حجت ہونا ہی ہے۔
امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کا تابعی ہونا:

(مقدمہ در مختار)

”ادرك بالسن نحو عشرين صحابيا“

آپ نے اپنی عمر میں تقریباً بیس صحابہ کرام سے ملاقات کی۔

جن کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔

ابن نفیل، واثلہ، عبداللہ بن عامر، ابن ابی اوفی، ابن جزء، عتبہ، مقداد، ابن بسر، ابن ثعلبہ، بہل بن سعد، انس، عبدالرحمن بن یزید، محمود بن لبید، محمود بن ربیع، ابوامامہ، ابوالطفیل، عمرو بن حریت، عمرو بن سلمہ، ابن عباس، بہل بن مزیف رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین۔

”وصح ان اباحیفة سمع الحديث من سبعة من الصحابة“ (مقدمہ در مختار)

صحیح طور پر یہ بات ثابت ہے کہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے سات صحابہ کرام سے احادیث بلا واسطہ سنیں ہیں:

”ولم یثبت ذلک لاحد من ائمة المعاصرين له کالاوزاعی بالشامی والحمادین بالبصرة والثوری بالكوفة ومالک بالمدينة الشریفة واللیث بن سعد بمصر“

(شامی ج ۱ ص ۴۸)

علامہ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں کہ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے کوفہ میں صحابہ کی ایک جماعت کو پایا اور یہ مقام آپ کے زمانے کے دوسرے اکابر ائمہ کو حاصل نہیں ہو سکا جن میں ملک شام میں اوزاعی، بصرہ میں حمادین، کوفہ میں ثوری، مدینہ طیبہ میں امام مالک اور مصر میں لیث بن سعد علیہم الرحمۃ تھے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے لئے دعا:

دوسری وجہ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب کی فوقیت کی یہ ہے کہ آپ کے لئے شیر خدا، حیدر کرار حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے دعا فرمائی جو یقیناً قبول ہوئی اسی وجہ سے کسی امام کو آپ کا

سامرتب حاصل نہ ہوا دعا کی۔ یقینی قبولیت کا میں نے اسلئے ذکر کیا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سید الاولیاء اور مستجاب الدعوات ہیں۔

وقد ثبت ان ثابتاً ادرک الامام علی بن ابی طالب فدعا له ولذریته بالبرکة

(مقدمہ درمختار)

یعنی تحقیق یہی ہے کہ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے والد حضرت ثابت بن نعمان (آپ اپنے دادا کے ہم نام ہیں) نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں حاضری دی تو انہوں نے ان کے لئے اور انکی اولاد کے لئے برکت کی دعا فرمائی۔

اسی لئے امام اعظم کے پوتے اسماعیل بن حماد بن نعمان بن ثابت فرماتے ہیں، نحن نرجو ان یکون اللہ تعالیٰ قد استجاب لعلیٰ فینا۔ یعنی ہم امید کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے حق میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی دعا قبول فرمائی ہے۔ قد استجاب کا معنی یہ ہے یقیناً دعا قبول فرمائی ہے۔ یہ بھی خیال رہے کہ یہ دعا امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی پیدائش سے پہلے کی ہے کیونکہ آپ کی پیدائش ۸۰ھ میں جبکہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت ۴۰ھ میں ہوئی اصل میں جو مشہور ہے کہ امام اعظم کے والد آپ کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس لے گئے اس کی وجہ یہ ہے کہ تاریخ ابن خلکان کے بعض نسخوں میں امام صاحب کے پوتے اسماعیل بن حماد کا قول اس طرح بیان کیا گیا ہے:

”ولد جدی ابو حنیفۃ سنة ثمانین وذهب ثابت بجدی الی علی ابن ابی طالب“

یعنی میرے دادا ابو حنیفہ ۸۰ھ میں پیدا ہوئے اور انکے باپ ثابت انہیں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس لے گئے، لیکن صحیح نسخہ میں ”ذهب ثابت بجدی“ کے الفاظ ہیں۔ یعنی میرے دادا ثابت حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس گئے۔

”والظاهر ان لفظة بجدی من زیادة النسخ او الباء زائدة واصله جدی لان علیاً

(شامی ج ۱ ص ۴۷)

مات سنة اربعین من الهجرة“

ظاہر یہی ہے کہ بجدی یا تو کتابت کی غلطی اور یا لفظ باء زائد ہے اصل جدی ہے کیونکہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ۴۰ھ میں شہید ہو گئے۔

آپ کی فضیلت میں حضور علیہ السلام کے ارشادات:

تیسری وجہ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے مذہب کی برتری کی یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کے کئی ارشادات ایسے ہیں جو امام صاحب کی افضلیت پر دلالت کر رہے ہیں اگرچہ بعض احادیث میں صراحت کے ساتھ بھی ذکر ملتا ہے کہ حضور ﷺ نے آپ کا نام لے کر آپ کی افضلیت بیان کی ہے لیکن ان احادیث پر بعض حضرات نے جرح کی ہے۔

حدیث نمبر ۱:

”وعنه عليه الصلوة والسلام ان ادم افتخر بي وانا افتخر برجل من امتي اسمه

نعمان و كنيته ابو حنيفة هو سراج امتي“

نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں آدم علیہ السلام کو مجھ پر فخر تھا اور مجھے اپنی امت کے ایک شخص پر فخر ہے جس کا نام نعمان ہوگا اور کنیت ابو حنیفہ۔ وہ میری امت میں ایک چراغ کی حیثیت رکھے گا۔

حدیث نمبر ۲:

”وعنه عليه الصلوة والسلام ان سائر الانبياء يفتخرون بي وانا افتخر بابي حنيفة

من احبه فقد احبني ومن ابغضه فقد ابغضني“

حضور ﷺ فرماتے ہیں، بیشک تمام انبیاء کرام نے مجھ پر فخر کیا اور مجھے ابو حنیفہ پر فخر ہے جس نے اس سے محبت کی وہ میری محبت کی وجہ سے ہی اس سے محبت کرتا ہوگا اور جس نے اس سے بغض رکھا وہ میرے ساتھ بغض رکھنے کی وجہ سے ہی اس سے بغض رکھے گا۔

ان دونوں حدیثوں کے متعلق ابن جوزی نے کہا ہے کہ یہ موضوع ہیں اگرچہ صاحب درمختار نے اسکا رد ان الفاظ سے کیا ہے۔

”وقول ابن الجوزي انه موضع تعصب لانه روى بطرق مختلفة“

ابن جوزی کا موضوع کہنا صرف تعصب کی وجہ سے ہے کیونکہ یہ مختلف طریقوں سے مروی ہے جو حسن لغیرہ کے درجہ میں ہے لیکن علامہ شامی کہتے ہیں کہ ان احادیث کو کئی اور حضرات نے بھی موضوع کہا ہے۔ اسلئے علامہ ابن حجر عسقلانی شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب خیرات الحسان میں فرمایا:

”ومن اطلع على ماياتي في هذا الكتاب من احوال ابي حنيفة وكراماته و اخلاقه

وسیرتہ علم انہ غنی عن ان یستشهد علی فضلہ بخبر موضوع
جو شخص اس کتاب میں امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے احوال، کرامات اخلاق اور
سیرت پر مطلع ہوگا اسے معلوم ہو جائے گا کہ آپ کے فضائل پر موضوع احادیث کے دلیل
بنانے کی ضرورت نہیں کیونکہ صحیح احادیث آپ کی شان پر دلالت کر رہی ہیں۔

حدیث نمبر ۳:

”روی عنہ علیہ الصلوٰۃ والسلام انہ قال ترفع زینۃ الدنیا سنۃ خمسین وماء“

نبی کریم ﷺ نے فرمایا ایک سو پچاس سن ہجری میں دنیا کی زینت کو اٹھالیا جائے گا۔ اس حدیث
کی شرح میں شمس الائمہ کردی بیان کرتے ہیں ”ان هذا الحديث محمول علی ابی
حیفۃ لانہ مات تلک السنۃ“ یعنی بے شک یہ حدیث امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی شان کو
واضح کر رہی ہے کیونکہ آپ کا وصال ۱۵۰ھ میں ہی ہے۔

بخاری اور مسلم نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اور طبرانی نے حضرت ابن مسعود
رضی اللہ عنہ سے یہ حدیث روایت کی۔

حدیث نمبر ۴:

”ان النبی ﷺ قال لو کان الایمان عند الثریا لتناولہ رجال من ابناء فارس“
بیشک نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اگر ایمان ثریا یعنی آسمان کے پاس بھی ہوا تو فارس کے شخص
اسے حاصل کر لیں گے۔

ابونعیم نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اور شیرازی اور طبرانی نے قیس بن سعد بن عبادہ سے
روایت کی ہے:

”ان النبی ﷺ قال لو کان العلم معلقا عند الثریا لتناولہ رجال من ابناء فارس“
بیشک نبی کریم ﷺ نے فرمایا، اگر علم آسمان کے پاس بھی لٹکا ہوا ہوگا تو فارس کے شخص اسے
حاصل کر لیں گے۔

طبرانی کے الفاظ قیس کی روایت سے یہ ہیں:

”لا تنالہ العرب لئالہ رجال من ابناء الفارس“

یعنی جسے عرب حاصل نہیں کر سکیں گے اسے فارس کے شخص حاصل کر لیں گے۔

مسلم نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا:

”لو كان الايمان عند الثريا لذهب به رجل من ابناء فارس حتى يتناوله“
اگر ایمان آسمان کے پاس بھی ہوا تو فارس سے ایک شخص جائے گا اور اسے حاصل کر لے گا۔

بخاری اور مسلم نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا:

”والذي نفسي بيده لو كان الدين معلقا بالثريا لتناوله رجل من فارس“
ارشاد نبوی ہے، قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے، اگر دین آسمان کے ساتھ بھی ہوا تو فارس کا ایک شخص اسے حاصل کر لے گا۔

اعتراض: امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ ۸۰ھ میں عبد الملک بن مروان کے زمانے میں کوفہ میں پیدا ہوئے، جب آپ شیراز وغیرہ کے نہیں تو یہ حدیثیں آپ پر کیسے صادق آرہی ہیں؟

جواب: جس طرح فقہ وغیرہ کی کتب میں اردو، پنجابی، سرائیکی وغیرہ تمام زبانوں کو ہندیہ کہا گیا ہے اور ہندوستان و پاکستان کے تمام علاقوں کو ملک ہند بولا گیا ہے اسی طرح حجاز سے باہر کے علاقے جن پر اس وقت بلاد عرب کا اطلاق نہیں ہوتا تھا بلکہ ان کو بلاد عجم کہا جاتا تھا، ان علاقوں کے لیے فارس ہی بولا جاتا تھا اس لیے فارس سے مراد خاص شیراز وغیرہ کا علاقہ نہیں ”ولیس المراد بفارس البلاد المعروفة بل جنس من العجم“ فارس سے مراد خاص فارس کا خطہ نہیں بلکہ اسی کی جنس سے دوسرے عجمی علاقے بھی فارس کہلاتے ہیں۔

دیلمی میں مذکور ہے ”خیر العجم فارس“ یعنی عجم میں سے بہتر حضرات کو فارس کہا جاتا تھا۔
وقد كان جد ابي حنيفة من فارس على ما عليه الاكثرون۔ دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے دادا محترم خاص مشہور ملک فارس کے تھے اسلئے بھی آپ کو فارس کا شخص کہا گیا ہے جیسا کہ ہمارے علاقہ میں ہندوستانی، کشمیری وغیرہ کے الفاظ ان لوگوں پر بھی استعمال ہو رہے ہیں جن کے آباؤ اجداد ہندوستان یا کشمیر سے تشریف لائے تھے۔

علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

” هذا الحديث الذي رواه الشيخان اصل صحيح يعتمد عليه في الاشارة لابي حنفيه و هو متفق على صحته “

یہ حدیث جو بخاری اور مسلم نے بیان کی ہے اسکے صحیح ہونے پر اہل علم کا اتفاق ہے اور اسی پر کامل اعتماد کیا جاسکتا ہے کہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی شان کی طرف یہ حدیث واضح طور پر اشارہ کر رہی ہے اسلئے موضوع احادیث کا سہارا لینے کی ضرورت نہیں۔

مواہب کے حاشیہ پر علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک شاگرد علامہ شامی (یہ اور شامی ہیں، مشہور علامہ شامی نہیں) فرماتے ہیں:

” ما جزم به شيخنا من ان اباحنيفة هو المراد من هذا الحديث ظاهر لا شك فيه لانه لم يبلغ من ابناء فارس في العلم مبلغه احد “ (شامی ج ۱ ص ۳۹، ۴۰)

ہمارے شیخ علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے اس پر یقین کیا ہے کہ بخاری و مسلم کی حدیث سے مراد امام ابو حنیفہ ہی ہیں، یہ ظاہر بات ہے اور اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کیونکہ فارس کے علاقوں میں سے کوئی ایک بھی امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے منصب پر نہیں پہنچ سکا۔

امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کا علمی مقام:

چوتھی وجہ امام اعظم اور آپ کے مذہب کی برتری کی یہ ہے آپ کے علمی مقام کو کسی اور امام نے نہ پایا، ابھی آپ کے علمی مقام کی طرف حدیث پاک میں اشارہ ہونا ثابت ہو چکا ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ تقوی کا بادشاہ اور احادیث میں کامل علم رکھنے والا علامہ سیوطی حنفی نہیں، جس نے ثابت کیا ہے کہ حدیث میں بلا شک اشارہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ہی کی طرف ہے۔ امام اعظم کے علمی مقام کو سمجھنے کے لئے پہلے آپ کے دو مشہور شاگردوں کے علم کا اندازہ کریں پھر خود بخود سمجھ میں آئے گا کہ آپ کا مقام کیا ہے۔

امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ:

آپ کا نام یعقوب ہے، کنیت سے ہی مشہور ہیں، امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے بیان کردہ اصول و قواعد میں آپ نے دقیق نظر فرمائی، فروع و احکام کے استنباط میں آپ نے اجتہاد فرمایا، قاضی القضاة

(چیف جسٹس آف سپریم کورٹ) کے منصب پر قائم رہے، آپ نے حنفی مذہب کو مختلف علاقوں تک پہنچایا
”وہو افقہ اہل عصرہ ولم يتقدمہ احد فی زمانہ وکان النہایۃ فی العلم والحکم
والریاسۃ“

آپ اپنے زمانے میں تمام اہل علم سے زیادہ فقیہ تھے آپ کے زمانہ میں کوئی ایک شخص بھی آپ
سے زیادہ فقہ میں مہارت نہیں رکھتا تھا آپ کو علم و حکمت و ریاست میں اعلیٰ مقام حاصل تھا۔

آپ کی پیدائش ۱۱۳ھ میں ہوئی اور وفات بغداد میں ۱۸۲ھ میں ہوئی۔ (شامی ج ۱ ص ۳۷)
آپ کو موضوع احادیث ہی ہزاروں کی تعداد میں یاد تھیں تاکہ اگر کوئی شخص کسی مسئلہ پر موضوع
حدیث کو بطور دلیل پیش کرے تو دفاع کیا جاسکے اور اسے بتایا جاسکے کہ یہ حدیث تو موضوع ہے۔ صحیح
حدیثیں آپ کو بہت ہی کثیر تعداد میں یاد تھیں یہاں سے ہی ایک اور سوال خود بخود رد ہو گیا کہ امام اعظم
رحمۃ اللہ علیہ کو احادیث کا علم نہیں تھا، یہ بہتان عظیم ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت احادیث لکھنے
کا رواج کم تھا یاد کرنے کا ہی زیادہ رواج تھا، آپ کو ہزاروں بلکہ لاکھوں احادیث یاد تھیں۔ جس شخص
نے صحابہ کرام سے بلا واسطہ احادیث سنیں ہوں اور وہ خود بھی تابعی ہو اور اسے جلیل القدر تابعین کے
ساتھ بیٹھنے اٹھنے کے ہزاروں مواقع میسر آئے ہوں اس کے متعلق یہ تصور کرنا باطل ہے۔

آپ کی کتاب مسند امام اعظم اور آپ کے شاگرد امام محمد کی مؤطا امام محمد اس پر شاہد
ہیں کہ آپ سے بڑھ کر کسی حدیث کا علم ہو سکتا ہے۔ صرف یہ خیال کر کے کہنا کہ آپ سے کم احادیث
مروی ہیں یا آپ نے کتابی شکل میں احادیث کو جمع نہیں کیا اس لئے آپ کو احادیث کا علم نہیں تھا، یہ ایسی
عظیم غلطی ہے کہ اس سے معاذ اللہ یہ لازم آئے گا کہ کسی صحابی کو بھی حدیث میں کوئی دسترس حاصل نہ
ہو۔ کیونکہ کسی نے بھی کتابی شکل میں احادیث کو جمع نہیں کیا۔ نیز خلفاء راشدین کا علم حضرت ابو ہریرہ
رضی اللہ عنہ سے کم ماننا پڑے گا کیونکہ خلفاء راشدین سے مروی احادیث کی تعداد حضرت ابو ہریرہ رضی
اللہ عنہ سے مروی احادیث سے بہت ہی کم ہے، لیکن یہ دلیل ہی باطل ہے۔

مقام تفکر:

امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی ولادت ۸۰ھ میں اور وفات ۱۵۰ھ میں ہوئی جبکہ امام بخاری کی
پیدائش ۱۹۴ھ میں اور وفات ۲۵۶ھ میں ہوئی اور امام مسلم کی ولادت ۲۰۴ھ میں اور وفات ۲۶۱ھ

میں اب آپ خود غور و فکر کریں کہ دو سو سال تک مسلمان کیا دین سے اور علم حدیث سے بے خبر تھے؟

لوگوں کو گمراہ کرنے کی ایک سازش یہ کی جاتی ہے کہ صرف وہ حدیثیں معتبر ہیں جو صحاح ستہ میں ہیں یہ بھی ایک غلط روش ہے کیونکہ صحیح احادیث صرف صحاح ستہ ہی میں نہیں ہیں۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”وقد حدث هذا فرقة من المبتدعة اطلوا السنتهم بالطعن على ائمة الدين بان

مجموع ماصح عندكم من الاحاديث لم يبلغ زهاء الاف“

ایک نیا بدعتی فرقہ ایجاد ہو چکا ہے جو ائمہ کرام پر طعن کی زبانیں لمبی کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تمہارے پاس تو دس ہزار تک صحیح حدیثیں نہیں پہنچیں۔

حالانکہ ان کا یہ قول سراسر باطل ہے کیونکہ امام بخاری خود کہتے ہیں:

”حفظت من الصحاح مائة الف حديث ومن غير الصحاح مائة الف“

یعنی میں نے صحیح حدیثیں ایک لاکھ حفظ کیں اور غیر صحیح حدیثیں یعنی حسن، ضعیف وغیرہ دو لاکھ۔

حالانکہ بخاری نے اپنی کتاب میں صرف سات ہزار دو سو پچتر (۷۲۷۵) احادیث جمع کیں جبکہ کثیر حدیثیں تکرار سے آئی ہوئی ہیں اگر تکرار کو حذف کیا جائے تو صرف چار ہزار حدیثیں باقی رہ جاتی ہیں۔ یہ بھی خیال رہے کہ بخاری اور مسلم نے یہ نہیں کہا کہ صحیح حدیثیں صرف وہی ہیں جو ہم نے جمع کی ہیں بلکہ امام بخاری کہتے ہیں۔

”ما اوردت في كتابي هذا الا ماصح ولقد تركت كثيرا من الصحاح“

یعنی میں نے اپنی صحیح میں صرف صحیح حدیثوں کو جمع کیا ہے لیکن بہت سی صحیح حدیثوں کو جمع نہیں بھی کیا۔

امام مسلم کہتے ہیں: ”الذي اوردت في هذا الكتاب من الاحاديث صحيح ولا اقول

ان ما تركت ضعيف“

یعنی میں نے اس کتاب میں جو احادیث جمع کی ہیں وہ صحیح ہیں لیکن میں یہ نہیں کہتا کہ میں نے جن کو ذکر نہیں کیا وہ ضعیف ہیں۔

واضح ہوا کہ یہ رٹ لگانا کہ حدیث وہی معتبر ہے جو صحاح ستہ میں ہو۔ یہ اپنی زبان سے اپنی

جہالت کا ثبوت پیش کرنا ہے:

”ولقد صنف الآخرون من الأئمة صحاحا مثل ابن خزيمة وصحيح ابن حبان وصحيح الحاكم أبي عبد الله النيشابوري المسمى بالمستدرک وصحيح ابن عوانه وابن السكن والمنتقى لابن جارود وهذه الكتب كلها مختص بالصحاح، ولقد اورد السيوطي في كتاب جمع الجوامع من كتب كثيرة يتجاوز خمسين مشتملة على الصحاح والحسن والضعاف“ (از مقدمہ مشکوٰۃ)

یعنی دوسرے ائمہ نے بھی صحیح احادیث جمع کی ہیں جیسے صحیح ابن خزیمہ اور صحیح ابن حبان اور حاکم ابو عبد اللہ نیشاپوری کی صحیح جس کا نام مستدرک ہے اور صحیح ابن عوانہ اور صحیح ابن جارود کی صحیح منتقی، یہ سب کتب صحیح احادیث پر مشتمل ہیں علامہ سیوطی نے جمع الجوامع میں احادیث کی پچاس سے زائد کتب کا ذکر کیا ہے جن میں صحیح حسن اور ضعیف حدیثوں کا ذکر ہے۔

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ دن رات یہ رٹ لگانے والے کہ ہم تو صرف قرآن و حدیث کو مانتے ہیں اور اسکے بعد کی کسی کتاب کو نہیں مانتے، تو وہ جب حدیث کی سند پر بحث کرتے ہیں یہ حدیث ضعیف ہے تو قرآن سے کیسے ثابت کریں گے کہ یہ ضعیف ہے اور رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام اور تابعین عظام کے اقوال سے کیسے ثابت کریں گی کہ یہ حدیث ضعیف ہے۔ جب وہ بعد کی لکھی ہوئی کتب سے اسماء الرجال کی بحثوں کو صحیح مانتے ہیں تو فقہی مسائل کو تسلیم کرنے میں انہیں کیا تکلیف ہوتی ہے جبکہ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے اجتہادات امام بخاری و مسلم کی پیدائش سے بھی پہلے کے ہیں۔ بات صرف ضد اور ہٹ دھرمی کی ہے اور اس کا کوئی علاج نہیں، حقیقت پسندی ہی انسانیت ہے۔

امام محمد رحمۃ اللہ علیہ:

آپ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد ہیں اور امام اعظم کے شاگرد امام ابو یوسف کے بھی شاگرد ہیں۔ جو مسائل آپ نے امام اعظم سے بلا واسطہ سنے ان کو آپ نے جس کتاب میں جمع کیا اس کا نام جامع کبیر ہے اور جو مسائل امام ابو یوسف کے واسطہ سے سنے ان کو اپنی کتاب جامع صغیر میں جمع کیا اور جو ثقہ راویوں سے آپ تک امام صاحب کے مسائل تو اتر اور مشہور طریقے سے پہنچے ان کو آپ نے جمع کیا وہ اصل یعنی مسبوط اور ظاہر الروایۃ ہیں۔

نوادر کو آپ نے اپنی دوسری کتب کیسانیات، ہارونیات، جرجانیات، رقیات، میں جمع کیا اس طرح آپ کی کتاب سیر صغیر ہے جب کچھ لوگوں نے اس کے مختصر ہونے پر چہ میگوئیاں کیں تو آپ نے سیر کبیر تصنیف فرمائی۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ آپ کے شاگرد ہیں:

امام شافعیؒ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد ہیں اور یہ بھی خیال رہے کہ جس دن امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی وفات ہوئی اسی دن امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی پیدائش ہوئی اور آپ کے والد کے فوت ہونے پر آپ کی والدہ نے امام محمد رحمۃ اللہ علیہ سے نکاح کر لیا یوں امام شافعی امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے زیر تربیت زیر پرورش اور زیر تعلیم رہے۔

امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تصنیف کردہ کتب بھی انکے ہی حوالے کر دی تھیں اسی لئے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ انصاف کرتے ہوئے، حقیقت پسندی سی کام لیتے ہوئے فرماتے ہیں:

”من اراد الفقه فليسلم اصحاب ابي حنيفة فان المعاني قد تسرت لهم والله ماصرت فقيها الا بكتب محمد بن الحسن“
(مقدمہ در مختار)

یعنی جو شخص فقہ کا علم حاصل کرنا چاہتا ہے وہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے شاگردوں کے پاس جائے، ان سے فیض حاصل کرے کیونکہ وہ آسانی سے مسائل و معانی کو سمجھتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی قسم! میں امام محمد بن حسن شیبانی کی کتابوں کو پڑھنے سے ہی فقیہ بنا ہوں۔

”روی الخطيب عن الربيع قال سمعت الشافعي يقول الناس عيال على ابي حنيفة في الفقه كان ابو حنيفة ممن وفق له الفقه“
(شامی ج ۱ ص ۳۷)

خطیب نے ربیع سے روایت کیا ہے، وہ کہتے ہیں نے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ تمام لوگ حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے بچے ہیں کیونکہ امام اعظم ہی وہ شخص ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے فقہ کے علم میں خاص توفیق عطا فرمائی، باقی امام آپ کے شاگردوں کے شاگرد ہیں صرف امام مالک رحمۃ اللہ علیہ آپ کے شاگرد نہیں لیکن امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کو سات صحابہ کرام ہی بلا واسطہ روایت بیان کرنے کی وجہ سے ان پر بھی برتری حاصل ہے اور آپ کے طرز استدلال سے انکا بھی مقابلہ نہیں۔

امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کا علمی مقام کافی حد تک واضح ہو چکا ہے لیکن ایک دو مثالوں سے اندازہ کریں کہ آپ کا علمی مقام کتنا بلند ہے۔

نماز کی تکبیر تحریمہ کے وقت ہاتھوں کا اٹھانا سنت ہے۔ ہاتھ کہا تک اٹھائے جائیں؟ اس بارے میں ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ ”کان یرفع یدیه حذو منکبہ اذا افتتح الصلوۃ“ جب نماز کو شروع فرماتے تو ہاتھ کانوں تک اٹھاتے تھے، اور دوسری روایت میں ہے:

کان رسول اللہ ﷺ اذا کبر رفع یدیه حتی یحاذی بہما اذنیہ
حضور ﷺ جب نماز شروع فرماتے اور تکبیر کہتے تو اپنے ہاتھ کانوں کے برابر اٹھاتے تھے۔
ایک اور روایت میں ہے۔

”یرفع ابهامہ الی شحمة اذنیہ“ رسول اللہ ﷺ جب ہاتھ اٹھاتے تو آپ کے ہاتھوں کے انگوٹھے کانوں کی لو (نرم حصہ) تک آتے تھے۔

ایک اور روایت میں ہے، ”الی فروع الاذنین“ کانوں کے اوپر تک ہاتھ اٹھاتے تھے اب اس مسئلہ میں امام مالک اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہما ہاتھوں کے کندھوں تک اٹھانے کے قائل ہیں اس طرح ان کے مسلک میں صرف ایک روایت پر عمل ہوتا ہے۔ دوسری روایات پر عمل نہیں ہوتا لیکن امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ ہاتھوں کے انگوٹھوں کو کانوں کی لو تک اٹھانے کا حکم فرماتے ہیں اس پر عمل کرنے سے تمام روایات پر عمل ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ہاتھوں کی ہتھیلیاں کندھوں کے برابر ہوں گی، انگوٹھے کانوں کی لو کے برابر ہوں گے اور انگلیاں کانوں کے اوپر ہوں گی۔

یعنی امام اعظم کے مسلک کو مد نظر رکھتے ہوئے اور ہاتھوں کے اٹھانے کی روایات کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ واقعہ ایک ہی ہے جسے صحابہ کرام نے اپنے اپنے انداز پر بیان کر دیا، جس نے ہتھیلیوں کو دیکھا اسے کندھوں کے برابر اٹھانے کا ذکر کر دیا، جس نے ہاتھ کے انگوٹھوں کو دیکھا اس نے کہا کہ آپ نے ہاتھ کانوں تک اٹھائے اور جس نے آپ کی انگلیوں کو دیکھا اس نے کہا کہ آپ نے اپنے ہاتھ کانوں کے اوپر تک اٹھائے، واقعہ ایک ہے مگر انداز بیاں مختلف ہے۔

اس پوری تفصیل پر ابوداؤد شریف کی حدیث حضرت وائل بن حجر سے مروی شاہد ہے، وہ کہتے ہیں:
”انہ بصر النبی ﷺ حین قام الی الصلوۃ رفع یدیه حتی کاننا بحیال منکبہ

ایک اور مثال دیکھئے امام صاحب اور دوسرے اہل علم حضرات ایک ولیمہ میں شریک تھے میزبان نے اپنی دو بیٹیوں کا نکاح دو بھائیوں سے کر دیا تھا، ولی مکان سے باہر آیا اور اس نے کہا ہم سخت مصیبت میں پڑ گئے ہیں کیونکہ رات کو غلطی سے دہنیں بدل گئیں اور ایک کی زوجہ سے دوسرے نے اور اس دوسرے کی زوجہ سے اس نے وطی کر لی ہے اب کیا کیا جائے؟ اس پرسفیان نے کہا، کوئی حرج نہیں ہر شخص جس سے اس نے وطی کی ہے اسے مہر دے اور پھر اپنی زوجہ واپس لے اور دوسری مرتبہ مہر اسے دے۔

شرعی نکتہ نظر سے مسئلہ کا یہ حل بھی ٹھیک ہے کیونکہ شبہ سے جو وطی ہو جائے اس کا مہر ادا کرنا لازم آتا ہے اور اپنا نکاح برقرار رہتا ہے لیکن اس میں خرابی یہ تھی کہ ہر ایک جس نے وطی کی اسکے دل میں اس سے تعلق برقرار رہتا ہے جس سے کئی خرابیاں پیدا ہوتیں۔ امام اعظم نے دونوں لڑکوں کو بلایا اور پوچھا، تم نے جس جس عورت سے وطی کی ہے وہ تمہیں پسند بھی ہے؟ ہر ایک نے کہا ہاں ہمیں وہ پسند ہے آپ نے فرمایا تم دونوں اپنی اپنی زوجہ کو یعنی جس سے نکاح ہوا ہے اسے طلاق دو اور پھر جس جس سے وطی کی ہے اس سے نکاح کر لو۔ مسئلہ کا یہ حل بہت زیادہ اچھا تھا اس لئے تمام حاضرین نے آپ کو داد دی۔

(خیرات الحسان)

امام ابو حنفیہ رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب:

”قد صح عنه انه قال اذا صح الحديث فهو مذهبي“ (شامی ج ۱ ص ۵۰)

صحیح طور پر یہ بات ثابت ہے کہ امام اعظمؒ نے فرمایا، جو حدیث صحیح ہوگی وہی میرا مذہب ہے۔ آپ کے اس ارشاد سے واضح ہوا کہ آپ کا مذہب احادیث صحیح کے مطابق ہے ان کے مخالف نہیں۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ:

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کئی ایسی احادیث سے مسائل کو حاصل کرتے ہیں جن سے امام صاحب نے مسائل کو حاصل نہیں کیا۔

”ظن الناس ان مذهبه مخالف لاحادیث والحال ان ههنا احادیث اصح واقوى من

تلك الاحادیث التي تمسك بها الشافعي تركها ابو حنيفة لاجلها

یعنی لوگوں نے سمجھا کہ آپ کا مذہب احادیث کے مخالف ہے حالانکہ امام صاحب نے ان احادیث سے زیادہ صحیح اور قوی احادیث کو بطور دلیل پیش کیا۔

خیال رہے کہ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے جو احادیث بطور دلیل پیش کیں ان پر اصحاب شافعی اور بعد والوں نے جو ضعف کا قول کیا ہے ان کے اس قول سے امام صاحب کے مذہب پر کوئی عیب نہیں لگایا جاسکتا، کیونکہ آپ تابعی ہیں آپ کے پاس پہنچنے والی بعض احادیث صحابہ کرام سے بلا واسطہ ہیں اور بعض احادیث آپ کے پاس تابعین کے ذریعے پہنچی ہیں۔ حدیث کا ضعیف ہونا راوی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ یعنی راوی ثقہ نہ ہو تو حدیث میں ضعف آئے گا۔

”ولکم بضعف الحديث من جهة الراوى لا يستلزم الحكم بضعفه

فی الزمان المتقدم الذى لم يكن هذا الراوى موجودا فيه“

(مقدمہ مرفاۃ شرح مشکوٰۃ ص ۸۰)

راوی کی وجہ سے ان احادیث کو ضعیف کہنا جو امام صاحب نے بطور دلائل پیش کی ہیں، درست نہیں کیونکہ متاخرین کے پاس وہ احادیث کئی واسطوں سے پہنچی ہیں اور ان میں کوئی راوی ضعیف ہو تو حدیث ضعیف ہو جائے گی لیکن امام اعظم کے پاس تو وہ حدیث صحابی سے بلا واسطہ پہنچی ہے یا صرف ایک واسطہ تابعی کا ہے اور جب آپ کا ارشاد ہی یہ ہے کہ میرا مذہب وہی ہے جو صحیح احادیث سے ثابت ہے تو پھر ان احادیث کو امام صاحب کے زمانہ میں ضعیف کیسے کہا جاسکتا ہے۔

خیال رہے کہ صحابہ کرام کے زمانہ میں کوئی حدیث بھی ضعیف، حسن، معلل، شاذ وغیرہ نہیں بلکہ سب حدیثیں صحیح تھیں اسی طرح نبی کریم ﷺ سے براہ راست سننے والے کے لئے آپ کے ارشاد پر عمل کرنا اتنا ہی ضروری تھا جتنا قرآن پاک کے احکام پر عمل کرنا ضروری تھا اور یہ بھی خیال رہے کہ احادیث کے راویوں کے متعلق کئی حضرات نے بحثیں کی ہیں۔ بعض حضرات نے کسی راوی کو غیر ثقہ کہا، بعض دوسرے حضرات نے اسے ثقہ کہا ہے، یہ اپنے اپنے علم کے مطابق کہا ہے۔ اس لئے کسی حدیث کو مطلقاً غیر ثقہ راوی کی روایت نہیں کہا جائے گا۔

حضرت ابن ہمام فرماتے ہیں:

”کم من راو یختلف فیہ الناس باجتهادہم ومن جارح واعدل فعسی ان یکون

کتنے راوی ایسے ہیں جن میں لوگوں کا اپنے اپنے اجتہاد کی وجہ سے اختلاف ہے کسی نے راوی پر جرح کی تو کسی نے عادل کہا، ہو سکتا ہے کہ بعض راویوں کو دوسرے حضرات عادل کہیں۔ اور وہ ہمارے نزدیک عادل نہ ہوں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کسی راوی کو دوسرے حضرات ضعیف کہیں اور وہ ہمارے نزدیک ثقہ راوی ہو۔

”لاترجیح بکثرة الرواة وانما هو بفقہ الراوی وهکذا لاترجیح بکثرة الروایات وانما هو بقوة الروایة“

کثیر راویوں کی وجہ سے روایت کو ترجیح نہیں دی جاتی بلکہ راوی کی فقاہت سے ترجیح دی جاتی ہے اسی طرح کثیر روایات وجہ ترجیح نہیں بلکہ روایت کا قوی ہونا وجہ ترجیح ہے۔ یہ کہنا ہی غلط ہے کہ فلاں مسئلہ میں ہمارے عقیدہ کے مطابق اتنی حدیثیں ہیں جو تمہارے مسلک کے مطابق پیش کردہ حدیثوں سے زائد ہیں، بات دلیل کی قوت و ضعف پر مبنی ہے، کثرت و قلت پر نہیں۔

بخاری یا مسلم میں آنے والی کئی حدیثیں منسوخ بھی ہیں جن پر عمل نہیں کیا جائے گا، کئی حدیثیں دوسری حدیثوں سے متعارض بھی ہیں ان میں یا تطبیق دی جائے گی یا تعارض کو ختم کرنے کے لیے ایک حدیث کو چھوڑنا پڑے گا۔ اہل علم کو انصاف سے لوگوں کو حق بات بتانی چاہیے صرف قوم کو انتشار میں مبتلا کر کے دین سے برگشتہ کرنا علم و عقل سے دوری کی علامت ہے۔

امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے اساتذہ و شاگردو:

علامہ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں، امام صاحب کے اساتذہ بی شمار ہیں جن کے لیے یہ مختصر کتاب گنجائش نہیں رکھتی، امام ابو حفص کبیر نے آپ کے اساتذہ کی تعداد چار ہزار بیان کی ہے اور دوسروں نے کہا ہے کہ صرف تابعین میں سے آپ کے اساتذہ کی یہ تعداد ہے اور غیر تابعین میں بھی آپ کے اساتذہ ہیں۔

امام صاحب کے شاگرد بھی اتنی کثیر تعداد میں ہیں کہ جن کا ذکر کرنا دشوار ہے اسی وجہ سے بعض علماء نے کہا ہے کسی کے اتنے زیادہ شاگرد نہیں ہوئے جتنے امام صاحب کے شاگرد ہیں اور عام لوگوں کو کسی اور سے اس قدر فائدہ نہ پہنچا جتنا امام صاحب اور ان کے شاگردوں سے احادیث مشتبہ کی تفسیر،

مسائل کی تفسیر اور مسائل مستنبط اور نوازل وقضا و احکام کے بیان میں فائدہ پہنچا، اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو بہتر جزا دے۔ بعض متاخرین نے امام صاحب کے تذکرہ میں آٹھ سو شاگردوں کا ذکر کیا ہے اور ان کے نام و نسب کو بھی بیان کیا ہے۔
(الخیرات الحسان)

امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے تقویٰ کی ایک جھلک:

”وقد صلی الفجر بوضوء العشاء اربعین سنة“

آپ نے چالیس سال عشاء کے وضو سے صبح کی نماز ادا کی۔ یعنی جس وضو سے عشاء ادا کرتے اسی وضو سے فجر کی نماز ادا کرتے، اگر سو جاتے تو یقیناً فجر کی نماز کے لیے تازہ وضو کرنا پڑتا کیونکہ سہارا لگا کر یا لیٹ کر سونے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ آپ تمام رات عبادت میں مشغول رہتے تھے۔ ”وحج خمسا وخمسین حجة“ آپ نے پچپن حج ادا فرمائے، جب ایک ہی حج کرنے سے انسان صغیرہ گناہوں سے اس طرح پاک ہو جاتا ہے جس طرح پیدائش کے دن گناہوں سے پاک ہوتا ہے تو آپ اندازہ کریں کہ پچپن حج کرنے والے کی بزرگی اور تقویٰ کا کیا مقام ہوگا۔ آپ نے اپنے آخری حج میں کعبہ شریف کے دربانوں سے اجازت طلب کی اور اندر تشریف لے گئے پھر!

”فقام بین العمودین علی رجلہ الیمنی حتی ختم نصف القرآن ثم رکع وسجد ثم قام علی رجل الیسری حتی نصف القرآن یعنی مع وضع القدمین علی الارض بدون رفع احدہما“

آپ دو ستونوں کے درمیان کھڑے ہو گئے آپ نے پہلی رکعت میں اپنے دائیں پاؤں پر زور رکھا اور بائیں پر دباؤ نہیں تھا اگرچہ دونوں پاؤں زمین پر تھے اس حال میں آپ نے نصف قرآن کی تلاوت کی اور پھر رکوع کیا اور سجدہ کیا پھر دوسری رکعت میں کھڑے ہوئے بائیں پاؤں پر زور رکھا اور نصف قرآن پڑھ کر اس رکعت کا رکوع اور سجدہ کیا اس طرح آپ نے دو رکعت نفل نماز میں مکمل قرآن شریف کی تلاوت کی۔

(خیال رہے کہ یہ جو ذکر ملتا ہے کہ ایک پاؤں پر کھڑے ہوئے اور دوسرے پاؤں کو پیٹھ کی طرف کر دیا اسے علامہ شامی نے رد کیا کہ یہ سنت کے خلاف ہے، صحیح وہی ہے جو ذکر کیا گیا)
”فلما سلم بکسی وناجی ربہ وقال الہی ما عبدک هذا العبد الضعیف حق“

عبادتک لکن عرفک حق معرفتک

جب آپ نے سلام پھیرا تو روتے ہوئے رب کے حضور عرض کیا، الہی! اس تیرے ضعیف بندے نے تیری عبادت کا حق تو ادا نہیں کیا لیکن تجھے پہچانا ہے ایسے جیسے تجھے پہچاننے کا حق ہے۔

یعنی اگر صرف یہ کہا جاتا کہ اے اللہ تیرے بندے نے تیری عبادت کا حق ادا نہیں کیا تو وہم ہوتا شاید آپ نے اللہ تعالیٰ کو پہچانا ہی نہ ہو اس لئے عبادت کا حق ادا نہ کیا ہو، جب یہ کہا کہ الہی تجھے ایسے پہچانا جیسے پہچاننے کا حق ہے تو اب اس وہم کا ازالہ ہو گیا۔ البتہ یہ خیال کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ کو پہچانا انسان کی طاقت میں نہیں۔ پھر آپ نے عرض کیا، اے اللہ! اگرچہ ادائیگی خدمت میں تو نقصان ہے لیکن پہچاننے میں کمال ہے لہذا اسی کے طفیل تو اپنا احسان فرمایا تو آپ کو غیبی طور پر آواز آئی، اے ابوحنیفہ! تم نے ہمیں ایسا پہچانا جیسے پہچاننے کا حق ہے اور تم نے ہماری عبادت کے ذریعے ہماری ایسی خدمت کی جسے ہم نے اچھا پایا، ہم نے تمہاری مغفرت کردی اور قیامت تک تمہاری اتباع کرنے والے تمہارے مذہب پر چلنے والوں کی بھی مغفرت کردی۔

(مقدمہ در مختار، شامی ج ۱ ص ۳۸)

امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے مقلدین اولیاء کرام:

وقد اتبعه على مذهبه كثير من الاولياء الكرام ممن اتصف ثبات المجاهدة
وركض في ميدان المشاهدة.

کثیر اولیاء کرام نے آپ کے مذہب کی تابعداری کی اور اولیاء کرام بھی وہ کہ جن کا مجاہدہ اور مشاہدہ کی میدان میں سبقت لے جانا واضح طور پر ثابت ہے۔

فلو وجدوا فيه ما اتبعوه ولا اقتدوا به ولا وافقوه .

اگر وہ اس میں ذرا بھر بھی شبہ پاتے تو کبھی آپ کی تابعداری نہ کرتے اور نہ ہی آپ کی اقتداء کرتے اور نہ ہی آپ کی موافقت کرتے۔ وہ جلیل القدر اولیاء کرام ایسی ہستیاں ہیں، ابراہیم بن ادہم، شفیق بلخی، معروف کرخی، ابویزید بسطامی، فضیل بن عیاض، داؤد طائی، ابو حامد لفاف، خلف بن ایوب، عبد اللہ بن مبارک، وکیع بن جراح، ابوبکر وراق، رحمہم اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین۔ یہ تو چند مشہور و معروف حضرات تھے ”و غیرہم ممن لا یحصى“ ورنہ ان کے علاوہ اتنے اہل علم، اہل کشف، علماء و صلحاء، اولیاء اللہ آپ کے مذہب کے قابعین اور آپ کے مقلدین تھے جو شمار میں نہیں آ سکتے۔ (مقدمہ در مختار)

امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ طریقت کے بادشاہ:

ابوالقاسم قشیری جو شافعی المذہب تھے اور اپنے مذہب میں بہت پختہ تھے وہ کہتے ہیں میں نے اپنے استاذ ابوعلی دقاق کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ میں نے طریقت کو ابوالقاسم نصر سے حاصل کیا اور انہوں نے امام ابو بکر شبلی سے اور انہوں نے ابوالحسن سری سقطی سے اور انہوں نے معروف کرخی سے اور انہوں نے داؤد طائی سے اور انہوں نے علم اور طریقت کو امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے حاصل کیا ان تمام حضرات نے آپ کے علم اور تقویٰ کی تعریف کی ہے، یہ سب لوگ طریقت و شریعت کے امام تھے۔

(مقدمہ در مختار)

امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ اور امام باقر رضی اللہ عنہ:

امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی مدینہ طیبہ میں امام باقر سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے فرمایا، سنا ہے کہ تم قیاس کی بناء پر ہمارے نانا (حضور ﷺ) کی احادیث کی مخالفت کرتے ہو؟ عرض کی یہ بہتان ہے، دیکھیے عورت مرد سے کمزور ہے لیکن وراثت میں اس کا حصہ مرد سے نصف ہے اگر میں قیاس کرتا تو فتویٰ دیتا کہ عورت کو مرد سے دو گنا حصہ ملنا چاہیے لیکن میں ایسا نہیں کرتا، اسی طرح نماز، روزے سے افضل ہے اگر میں قیاس کرتا تو حائضہ عورت کو نماز کی قضاء کا حکم دیتا مگر میں حدیث کے مطابق روزہ ہی کی قضاء کا حکم دیتا ہوں۔ یہ سن کر امام باقر اس قدر خوش ہوئے کہ انہوں نے آپ کی پیشانی کو بوسہ دیا۔ آپ نے ایک مدت تک ان سے اکتساب فیض کیا۔

(مناقب الامام للموفق)

اللہ تعالیٰ ہمیں ان اولیاء کرام کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے اور امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے مذہب پر طعن کرنے والے مردودین و مبتدعین سے محفوظ رکھے۔

آمین ثم آمین بجاہ النبی الکریم ﷺ

﴿وَمَثَلُ الَّذِينَ كَفَرُوا كَمَثَلِ الَّذِي يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ إِلَّا

دُعَاءَ وَنِدَاءٍ صُمُّ بُكْمٌ عُمَىٰ فَهُمْ لَا يَعْقِلُونَ﴾

(۱) ”اور کافروں کی کہادت اس کی سی ہے جو پکارے ایسے کو کہ خالی چیخ پکار کے سوا کچھ نہ سنے بہرے اندھے تو انہیں سمجھ نہیں۔“

(۲) اور مثال ان لوگوں کی جنہوں نے کفر کیا مثل اس شخص کے ہے جو آواز دے ایسی چیزوں کو جو نہ سنیں سوائے چیخ و پکار کے، بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں تو وہ عقل نہیں رکھتے۔“

اس مثال سے یہ واضح کیا گیا کہ جس طرح چرواہا بھیڑ بکریوں کو آواز دے تو ان کو بات کا مطلب تو سمجھ نہیں آتا بلکہ وہ فقط چیخ و پکار سنتی ہیں۔ اسی طرح یہ کافر بھی چوپاؤں کی طرح ہیں ان کو دعوت ایمان دیں تو یہ بھی اسے دل کے کانوں سے نہیں سنتے اور نہ ہی حق بات بولتے ہیں اور نہ ہی حق راہ دیکھ سکتے ہیں تو وہ عقل نہیں رکھتے۔ (از قرطبی)

یعنی کافر اپنے آباء و اجداد کی تقلید میں اس طرح منہمک (گھرے ہوئے) ہیں اور گمراہی میں ہمیشہ کیلئے قائم ہیں ان کے سامنے قرآن پاک کی آیات تلاوت کی جائیں تو وہ ان کی طرف اپنے ذہن نہیں لگاتے جب ان کے سامنے کسی چیز کو بیان کیا جائے تو وہ اسے سوچتے نہیں غور و فکر نہیں کرتے بلکہ چوپاؤں کی طرح صرف آواز کی طرف کان لگاتے ہیں کہ انکی سمجھیں ختم ہو چکی ہیں۔ (از روح المعانی)

”والنعیق التابع فی التصویت علی البہائم للزجر“

چوپاؤں کو ڈانٹنے کے لئے جو آواز بار بار دی جائے اسے ”نعق“ کہا جاتا ہے۔ ”لَا يَسْمَعُ إِلَّا دُعَاءَ وَنِدَاءَ، كُنَايَةٌ عَنْ عَدَمِ الْفَهْمِ وَالِاسْتِجَابَةِ“ یعنی رب تعالیٰ کے ارشاد ﴿لَا يَسْمَعُ إِلَّا دُعَاءَ وَنِدَاءَ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ وہ سمجھ نہیں سکتے اور نہ ہی قبول کرتے ہیں:

”قِيلَ نَعِبٌ بِالنَّعْبِ وَالنَّعْبُ بِالنَّعْبِ وَمَعْنَى وَقِيلَ إِنَّ الدُّعَاءَ مَا يَسْمَعُ

وَالنَّدَاءُ قَدْ يَسْمَعُ وَقَدْ لَا يَسْمَعُ“

نعب اور نداء اور دعا کا بعض حضرات نے ایک ہی معنی لیا ہے یعنی پکارنا اور بعض حضرات نے بیان کیا کہ ”دعا“ اس پکار کو کہتے ہیں جو کبھی سنی جائے اور نداء اس پکار کو کہتے ہیں جو کبھی سنی جائے اور کبھی نہ سنی جائے کیونکہ نداء قریب کے لئے بھی ہوتا ہے اور بعید کے لئے بھی۔ (از روح المعانی)

تنبیہ: کو جب گردن اٹھا کر اور گردن کو حرکت دے کر آواز نکالے تو اس وقت ”نغق الغراب (بالمعجمة)“ کہتے ہیں اور جب وہ بغیر گردن کے اٹھانے اور حرکت دینے کے آواز نکالے تو اس وقت نغق الغراب (بالمہملۃ) کہتے ہیں۔ (از روح المعانی)

فَهُمْ لَا يَعْقِلُونَ : ”ای لا یدر کون شیاً لفقدان الحواس الثلاثة“ تو وہ عقل نہیں رکھتے۔ یعنی تینوں حواس سننا، دیکھنا اور بولنا ہی جب ان میں نہیں پائے گئے تو وہ کسی چیز کو نہیں سمجھ سکتے۔ اسی وجہ سے کہا جاتا ہے ”من فقد حساً فقد فقد علماً“ جس شخص نے حواس کھو دیئے تحقیق اس نے علم ضائع کر دیا یہاں عقل کی حقیقی نفی نہیں بلکہ سمجھنے کی صلاحیت سے جو ثمرات مرتب ہوتے ہیں ان کی نفی ہے۔ (از روح المعانی)

☆ ”اخرج ابن جریر وابن ابی حاتم عن ابن عباس فی قوله ومثل الذین کفروا کمثل الذی ینعق بما لا یسمع قال کمثل البقر والحمار والشاة، ان قلت لبعضهم کلاماً لم یعلم ما تقول غیر انه یسمع صوتک وكذلك الکافر ان امرته بخیر او نهیته عن شر او وعظنه لم یعقل ما تقول غیر انه یسمع صوتک“

ابن جریر اور ابن حاتم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول بیان فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ﴿وَمَثَلُ الَّذِينَ كَفَرُوا كَمَثَلِ الذِّي يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ کافر بھیڑ، بکریوں اور بیل اور گدھے کی طرح ہیں اگر تم ان سے کلام کرو تو وہ نہیں جانتے تم کیا کہہ رہے ہو وہ صرف تمہاری آواز سنتے ہیں۔ اسی طرح کافر کو اگر تم اچھے کام کا حکم دو یا برے کام سے منع کرو یا نصیحت کرو تو وہ نہیں سمجھتے کہ تم کیا کہہ رہے ہو وہ صرف تمہاری آواز سنتے ہیں۔ (درمنشور)

☆ ”واخرج ابن جریر عن ابن عباس فی الآية قال مثل الدابة تنادی فتسمع ولا تعقل ما یقال لها كذلك الکافر یسمع الصوت ولا یعقل“

ابن جریر نے بیان فرمایا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس آیت کے متعلق بیان فرمایا کہ جس طرح چوپاؤں کو ندا دی جائے تو وہ سنتے ہیں اور سمجھتے نہیں اسی طرح کافر آواز سنتا ہے اور سمجھتا نہیں۔ (درمنشور)

☆ ”واخرج وکیع عکرمۃ فی قوله ینعق بما لا یسمع الا دعاء ونداء قال مثل الکافر مثل البهیمۃ تسمع الصوت ولا تعقل“

وکیع نے حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ سے اس آیت کریمہ کے متعلق یہی بیان کیا کہ کافر چوپاؤں کی طرح ہیں آواز سنتے ہیں اور سمجھتے نہیں۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ
وَاشْكُرُوا لِلَّهِ إِن كُنتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ

- (۱) ”اے ایمان والو کھاؤ ہماری دی ہوئی ستھری چیزیں اور اللہ کا احسان مانو اگر تم اسی کو پوجتے ہو“
(۲) ”اے وہ لوگو جنہوں نے ایمان لایا کھاؤ پاکیزہ چیزیں جو ہم نے عطا کیں اور شکر کرو اللہ کا اگر تم اسی کی عبادت کرتے ہو“۔

پہلے عام لوگوں کو حلال اور پاکیزہ چیزیں کھانے کا حکم دیا اب اس آیت کریمہ میں ایمان والوں کی عظمت کے پیش نظر ان کو علیحدہ حکم پھر دیا حالانکہ ان کا ذکر بھی ﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلَالًا طَيِّبًا﴾ ”اے لوگو کھاؤ جو چیزیں زمین میں ہیں حلال اور پاکیزہ“ میں آچکا تھا۔ اسے تخصیص بعد از تعمیم کہا جاتا ہے کہ عمومی ذکر کے بعد خصوصی ذکر ہوتا کہ خاص کا عظیم الشان اور رفیع الشان ہونا پتہ چل جائے۔
(از روح المعانی)

طیب قرآن پاک میں چار معانی میں استعمال ہے:

- (۱) ”طیب بمعنی حلال“ رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے ﴿وَلَا تَبَدَّلُوا الْخَبِيثَ بِالطَّيِّبِ﴾ ای ولا تبدلوا الحرام بالحلال ﴿اور تم حلال کے بدلے حرام کو حاصل نہ کرو۔
(۲) طیب بمعنی طاہر (پاک) ارشاد باری تعالیٰ ہے ﴿فَتَيَمَّمُوا صَعِيدًا طَيِّبًا﴾ تو تیمم کرو پاک مٹی سے۔
(۳) طیب بمعنی حسن (اچھا) رب قدوس نے ارشاد فرمایا ﴿إِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ﴾ اسی کی طرف اچھے کلمات چڑھتے ہیں یعنی رب تعالیٰ کے ہاں مومنین کے اچھے کلمات کو شرف قبولیت حاصل ہوتا ہے۔
(۴) طیب بمعنی مومن رب قدوس نے ارشاد فرمایا ﴿لَيَمِيزَ اللَّهُ الْخَبِيثَ مِنَ الطَّيِّبِ﴾ تاکہ اللہ تعالیٰ جدا کر دے کافر کو مومن سے۔
(شیخ زادہ)

دونوں کلاموں کے فرق میں عجیب نکتہ: پہلے خطاب میں فرمایا:

﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلَالًا طَيِّبًا﴾

اس آیت کریمہ میں ارشاد فرمایا: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ﴾ پہلا حکم عام لوگوں کو ہے ان کو حکم دیتے ہوئے وسعت فرمائی سوائے حرام کے زمین میں پائی جانے والی تمام چیزوں کو مباح قرار دیا گویا کہ حکم یوں پایا گیا ﴿کلوا حلالا﴾ حلال چیزیں کھاؤ۔

”تنبیہ علی انه لم یخطر علیہم الا تناول المحرم“ حلال چیزوں کے کھانے کا حکم دے کر اس پر تنبیہ کی گئی ہے کہ ان پر حرام چیزوں کے کھانے کے بغیر کوئی چیز منع نہیں۔ اسی وجہ سے اس کے بعد ﴿وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ﴾ کو ذکر کیا گیا کہ تم شیطان کے قدموں کی تابعداری نہ کرو کہ اتنی وسعت دینے کے باوجود وہ پھر بھی تمہیں حرام چیزوں کے کھانے کی رغبت دلائے گا اگر تم نے اس کی تابعداری کی تو وہ اپنی دشمنی کی وجہ سے تمہیں برباد کر دے گا۔

مومنین کو خطاب:

اس آیت کریمہ میں مومنین کو خطاب ہے جس میں صرف طیب چیزوں کے کھانے کا حکم دیا:

”وامرهم ان لا يتوسعوا فی تناول ما رزقوه بل يتخبروا من الطیب

بخیر الناس مما فی الارض“

یعنی مومنین کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ تم اپنے کھانے میں جو تمہیں رب تعالیٰ نے حلال مال دے رکھا ہے وسعت نہ پیدا کرو زیادہ کھانے کے عادی نہ بن جاؤ بلکہ پاک چیزیں اتنی ہی اختیار کرو جتنی بہتر لوگوں یعنی اللہ تعالیٰ کے مقرب لوگوں کی شان کے لائق ہے کہ وہ زمین میں پائی جانے والی حلال چیزوں کو بھی بقدر ضرورت استعمال کرتے ہیں۔

پہلی آیت میں عام لوگوں کو شیطان کی تابعداری سے منع کیا گیا اور شیطان کے مزین کئے ہوئے گناہوں سے بچنے کا حکم دیا لیکن یہاں مومنین کو شکر کرنے کا حکم دیا ”الذی هو ارفع منازل للعباد“ جو بندوں کے لئے بلند مرتبہ کا ذریعہ ہے۔ بلکہ

”اِنْ كُنْتُمْ اِیَّاهُ تَعْبُدُوْنَ“ سے اس پر تنبیہ کر دی ”ان عبادتہ تعالیٰ لا تتم الا بشکرہ“ کہ بیشک اللہ تعالیٰ کی عبادت اس وقت تک مکمل ہی نہیں جب تک اس کا شکر ادا نہ کیا جائے۔

شکر کا حکم وجوبی ہے: یہ امر ﴿واشکروا للہ﴾ اباحت کے لئے نہیں بلکہ وجوب کے لئے ہے

اس لئے کہ ہر عقل مند آدمی کے دل میں یہ اعتقاد ہوتا ہے:

”ان من اوجده وانعم علی بما لم یخص من النعم الجلیلة مستحق

لغایة التعظیم وان یتظهر بلسانه وبسائر جوارحه“

بیشک وہ ذات جس نے اسے موجود کیا ہے اور بہت بڑی بڑی نعمتیں عطاء کی ہیں یہ ان نعمتوں کے لئے کوئی مختص تو نہیں تھا وہ ذات بہت ہی تعظیم کے مستحق ہے یعنی دل میں اس کی عظمت کا لحاظ کیا جائے اور اس کی عظمت کو ظاہر کرنے کے لئے زبان اور باقی اعضاء سے اظہار (ظاہر) کیا جائے اسے ہی شکر کہا جاتا ہے۔

(از شیخ زادہ)

احادیث مبارکہ: ”عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ ﷺ ان اللہ طیب لا یقبل الا الطیب وان اللہ امر المؤمنین بما امر المرسلین فقال ﴿يَا أَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوا مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَاعْمَلُوا صَالِحًا﴾ وقال ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ﴾ ثم ذکر الرجل یطیل السفر یمدیده الی السماء یا رب یا رب اشعث اغبر مطعمه حرام ومشربه حرام وملسبه حرام وغذی بالحرام فانی یتعجب لذلك“

(رواہ مسلم)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ طیب (پاک) ہے وہ سوائے طیب کے کسی اور چیز (یعنی خبیث چیز) کو قبول نہیں کرتا۔ اور بیشک اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو وہ حکم فرمایا جو حکم رسولوں کو فرمایا یعنی رب تعالیٰ نے رسولوں کو حکم دیتے ہوئے ارشاد فرمایا: ﴿يَا أَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوا مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَاعْمَلُوا صَالِحًا﴾

”اے رسولو کھاؤ پاکیزہ چیزیں اور اچھے عمل کرو“

اور مومنین کو حکم دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ﴾

”اے ایمان والو کھاؤ پاکیزہ چیزیں جو ہم نے تمہیں عطا کیں“

پھر ایک شخص کا ذکر فرمایا کہ ایک شخص لمبا سفر کر کے آتا ہے اس کے بال بکھرے ہوتے ہیں اس کی حالت پراگندہ ہوتی ہے وہ کہتا ہے اے رب اے رب (یعنی دعا کرتا ہے) اس کی دعا کو کیسے قبول کیا جائے گا۔ جب اس کا کھانا حرام ہو اور پینا حرام ہو اور لباس حرام ہو اور غذا حرام ہو۔

☆ "عن النبی ﷺ يقول الله تعالى اني والانس والجن في نأ عظيم اخلق ويعبد غيره وارزق ويشكر غيري ، اخرج الطبراني في مسندات الشاميين والبيهقي في شعب الايمان والديلمي من حديث ابي الدرداء"

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کہتا ہے بیشک میں اور انسان اور جن ایک عظیم خبر میں ہیں (یعنی میرا اور انسانوں اور جنوں کا معاملہ عجیب ہے) پیدا میں کرتا ہوں اور وہ عبادت غیروں کی کرتے ہیں اور رزق میں دیتا ہوں وہ شکر غیروں کا ادا کرتے ہیں۔

(از مطہری)

☆ "واخرج ابن ابي شيبة واحمد ومسلم عن انس قال قال رسول الله ﷺ ان الله ليرضى عن العبد ان ياكل الاكلة ويشرب الشربة فيحمد الله عليها"

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ اپنے بندے سے یہ پسند کرتا ہے کہ کھانے کی کوئی چیز کھائے اور پینے کی کوئی چیز پئے تو اس پر اللہ تعالیٰ کی حمد کرے۔

(از درمشور)

یعنی رب تعالیٰ کا دل سے شکر کرے یہی شکر اس کا معتبر ہے کیونکہ جب تک رب تعالیٰ کی تعظیم دل میں نہ ہو صرف زبان سے شکر کرنا یا صرف اعضاء سے شکر کرنا حقیقت میں مطلوب نہیں۔

(از کبیر)

☆☆☆☆☆

﴿ إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيرِ وَمَا أُهِلَّ بِهِ لِغَيْرِ اللَّهِ فَمَنْ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴾

(۱) ”اس نے یہی تم پر حرام کئے ہیں مردار اور خون اور سور کا گوشت اور وہ جانور جو غیر خدا کا نام لے کر ذبح کیا گیا تو جو ناچار ہونہ یوں کہ خواہش سے کھائے اور نہ یوں کہ ضرورت سے آگے بڑھے تو اس پر گناہ نہیں بیشک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔“

(۲) ”بیشک جو حرام کئے اللہ نے تم پر وہ مردار اور خون اور گوشت سور کا اور وہ جانور جو ذبح کئے گئے ہوں اللہ کے غیر کا نام لے کر اور جو مجبور ہو جائے وہ تجاوز نہ کرے اور حد سے نہ بڑھے تو نہیں گناہ اس پر بیشک اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔“

طلباء کرام کی توجہ کے لئے: بظاہر اعتراض یہ ہے کہ ﴿إِنَّمَا﴾ حصر کا فائدہ دیتا ہے اس کا ترجمہ ہوتا ”جز ایس نیست“ (سوائے اس کہ نہیں) اس ترجمہ سے تو یہ صورت بنے گی کہ چار چیزوں کے بغیر اور کوئی چیز حرام نہیں وہ چار چیزیں جو اس آیت میں رب تعالیٰ نے بیان فرمادی ہیں مردہ جانور اور خون اور سور کا گوشت اور جن جانوروں پر ذبح کے وقت اللہ کے بغیر کسی اور کا نام لیا جائے۔

حالانکہ ان کے بغیر اور بھی کتنی چیزیں حرام ہیں تو یہاں حصر کا معنی کیسے صحیح ہے؟ اس کے جواب کو سمجھنے کے لئے پہلے یہ سمجھا جائے کہ ﴿إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ﴾ میں تین قراءتیں ہیں۔ ایک یہ کہ ﴿الْمَيْتَةَ﴾ منصوب ہے اور ”حرم“ فعل معروف ہے (مبنی للفاعل) اس صورت میں ”ان“ حرف مشبہ بالفعل ہے اور ”ما“ کافہ ہے یعنی ان کو عمل سے روک رہا ہے اب اس صورت میں دو مذہب ہیں ایک یہ کہ ﴿إِنَّمَا﴾ حصر کا فائدہ دے رہا ہے اور دوسرا مذہب یہ ہے کہ اس صورت میں ﴿إِنَّمَا﴾ حصر کا فائدہ نہیں دے رہا۔ اسی مذہب کو اختیار کرتے ہوئے جواب دیا گیا:

”قلنا المختار عند الحنفية ما قال نحاة الكوفة ان كلمة انما ليست

للقصر بل هي مركبة من ان للتحقيق وما الكافة

ہم نے کہا احناف کے نزدیک کوفہ کے نحویوں کا قول معتبر ہے وہ یہ کہتے ہیں کلمہ ﴿ اِنَّمَا ﴾ قصر (حصر) کا فائدہ ہی نہیں دیتا۔ کیونکہ یہ مستقل کلمہ ہی نہیں بلکہ یہ ”ان“ حرف تحقیق اور ”ما“ کا ذی سے مرکب ہے۔

”وعلى تقدير التسليم فالقصر اضافى بالنسبة الى ما حرمه الكفار من بحيرة وسائبة ووصيلة وحام ونحوها“

اگر بصرہ والے نحویوں کے قول کو تسلیم کر کے قصر (حصر) والا معنی لیا جائے تو قصر اضافی ہے قصر حقیقی نہیں کہ اعتراض وارد ہو سکے بلکہ اضافی ہے بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ حرام تو وہ چیزیں ہیں جو رب تعالیٰ نے حرام کی ہیں کافر لوگ جو خود اپنے آپ پر حرام کرتے ہیں یہ ان کا باطل مذہب ہے جیسا کہ انہوں نے بحیرہ اور سائبہ اور وصیلہ اور حامی اپنے آپ پر حرام کر لئے ہیں۔

(ماخوذ از مختصر المعانی و کواشی و مظہری)

خیال رہے کہ ”حامی“ سے یاء بوجہ کسرہ کے گرانے اور لقاء ساکنین یاء اور تنوین کے درمیان لازم کی وجہ سے حذف ہو گئی پچھلی آیات میں ان کا ذکر کر دیا گیا ہے۔

قراءت میں دوسری صورت یہ ہے کہ ”حرم“ فعل معروف ہو اور ”میتة“ پر رفع ہو بوجہ خبر کے اور ﴿ اِنَّمَا ﴾ میں ”ان“ حرف تحقیق ہو اور ”ما“ موصول ہو اور صلہ میں ضمیر بوجہ قرینہ کے پائے جانے کے حذف ہو اب اس میں پھر دو مذہب ہیں کوفہ کے نحویوں کے نزدیک قصر نہیں تقدیر عبارت یہ ہے ”انما حرمه الله عليكم الميتة“ بیشک جس چیز کو اللہ نے حرام کیا ہے وہ مراد ہے۔ راقم نے اسی ترجمہ کو اختیار کیا ہے۔

اور بصری نحویوں کے نزدیک قصر والا معنی ہوگا تقدیر عبارت کی یہ ہوگی ﴿ اِنَّمَا حرمه الله عليكم هو الميتة ﴾ اللہ تعالیٰ نے تم پر صرف میتہ وغیرہ کو حرام کیا۔ اب بھی جواب وہی ہوگا کہ یہاں قصر اضافی ہے قصر حقیقی نہیں۔

(ماخوذ از کواشی و مختصر المعانی مع وضاحت راقم)

قراءت میں تیسری صورت یہ ہے کہ ”حسرم“ فعل مجہول ہے اور المیتۃ مفعول مالم یسم فاعله ہے۔ کلمہ ”ما“ میں دو احتمال ہیں کہ ”ما“ کافہ ہو یا موصولہ پھر اسی طرح دو مذہب ہیں کہ قصر ہے یا نہیں قصر نہ ہونے کی صورت میں کوئی اعتراض نہیں اور قصر پائے جانے کی صورت میں قصر اضافی ہوگا۔

(از مختصر المعانی و کواشی مع وضاحت رافق)

میتہ سے مراد کیا ہے: میتہ اس جانور کو کہا جاتا ہے جو خود بخود مرد جائے اس کو کسی نے ذبح نہ کیا ہو یا کسی نے ذبح تو کیا ہے لیکن اس میں ذبح کی شرائط نہیں پائی گئی۔ (احکام القرآن للجصاص)

زندہ جانور سے گوشت کاٹنے کا حکم: زمانہ جاہلیت میں یہ دستور تھا کہ زندہ جانوروں کے جسموں سے کہیں سے گوشت کاٹ کر پکالیا جاتا تھا اور کھالیا جاتا تھا اس کے متعلق ارشاد نبوی یہ ہے:

”عن ابی واقد اللیثی قال قال رسول اللہ ﷺ ما قطع من البھیمة حیة

فہو میتة“ (اخرجه ابو داؤد والترمذی حسنہ)

ابو واقد لیثی فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو گوشت زندہ جانور سے کاٹا وہ مردار ہی ہے یعنی وہ اسی طرح حرام ہے جس طرح مردہ جانور حرام ہے۔ (مظہری)

مردہ جانور سے نفع حاصل کرنا منع ہے:

اس پر اجماع ہے کہ مردہ جانور کو بیچنا اور اس کی قیمت سے نفع حاصل کرنا حرام ہے اسی طرح اس کی چربی سے نفع حاصل کرنا منع کیا گیا ہے اور مردہ جانور کے چمڑے سے دباغت (چمڑے کو خشک کر کے اس سے خون وغیرہ کو دور کر کے کارآمد بنانا) سے پہلے نفع حاصل کرنا منع ہے۔

☆ ”عن جابر انه سمع رسول اللہ ﷺ یقول عام الفتح وهو بمکة ان اللہ ورسوله حرم بیع الخمر والمیتة والخنزیر والاصنام فقیل یا رسول اللہ ارأیت شحوم المیتة فانه یطلى بها السفن ویدهن بها الجلود ویستصبح بها الناس فقال لا هو حرام ثم قال عند ذلک قاتل اللہ الیہود ان اللہ لما حرم شحومها اجملوه ثم باعوه فاکلوا ثمنه“

(بخاری ومسلم)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو فتح مکہ کے دن مکہ میں فرماتے ہوئے سنا بیشک اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے شراب اور مردار اور سوراہتوں کی خرید و فروخت حرام

کر دی۔ پھر آپ سے سوال کیا گیا یا رسول اللہ مردہ جانوروں کی چربی کے متعلق آپ کی رائے کیا ہے؟ کیونکہ اس کے ذریعے کشتیوں کو تیل لگایا جاتا ہے اور چمڑے کو چربی کا تیل لگایا جاتا ہے اور اس سے لوگ چراغ جلاتے ہیں تو آپ نے فرمایا نہیں (چربی سے نفع حاصل کرنا بھی جائز نہیں) وہ حرام ہے۔ پھر آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ یہود کو برباد کرے بیشک اللہ تعالیٰ نے ان پر مردہ جانوروں کی چربی کو حرام کیا لیکن انہوں نے چربی کو ڈھال کر تیل نکال کر اسے بیچنا شروع کر دیا اور اس کی قیمت کو کھانا شروع کر دیا۔

(از مظہری)

☆ ”عن عبد الله بن عكيم قال اتانا كتاب رسول الله ﷺ الا لا تستفعا من الميتة باهاب ولا عصب“
(رواه احمد والشافعي واصحاب السنن الاربعة)

حضرت عبد اللہ بن عکیم رضی اللہ عنہ کہتے ہیں ہمارے پاس رسول اللہ ﷺ کا خط آیا آپ نے فرمایا خبردار مردہ جانور کے چمڑے اور پٹھوں سے نفع حاصل نہ کرو۔ (مظہری)

خیال رہے کہ ”اہاب“ اس چمڑے کو ہی کہا جاتا ہے جس کو دباغت نہ دی جائے دباغت کے بعد ہر چمڑہ پاک ہو جاتا ہے اس سے نفع حاصل کرنا جائز ہے سوائے انسان کے چمڑے کے کیونکہ انسان رب تعالیٰ کی مخلوق میں مکرم ہے اس لئے اس کے اعضاء سے نفع حاصل کرنا منع ہے۔ اسی طرح خنزیر (سور) کے چمڑے سے دباغت کے بعد بھی نفع حاصل کرنا جائز نہیں وہ مکمل طور پر ناپاک ہے۔

☆ ”عن ابن عباس قال سمعت رسول الله ﷺ يقول اي اهاب دبغ فقد طهر“
(رواه مسلم)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے جو چمڑہ بھی دباغت دے دیا جائے وہ پاک ہو جاتا ہے۔ (از مظہری)

☆ ”وعن عائشة ان رسول الله ﷺ امر ان ينتفع بجلود الميتة اذا دبغت“

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے حکم فرمایا کہ مردہ جانور کے چمڑے کو دباغت دے کر اس سے نفع حاصل کیا جائے۔ (مظہری)

تنبیہ: جن احادیث میں درندے کے چمڑے سے نفع حاصل کرنا منع کیا گیا ہے ان سے مراد بھی دباغت سے پہلے نفع حاصل کرنا مراد ہے دباغت کے بعد جائز ہے۔

دباغت کیا ہے؟ دباغت کی دو قسمیں ہیں حقیقی اور حکمی۔ دباغت حقیقی یہ ہے کہ کیکر کی چھال وغیرہ سے چمڑے کو تیار کیا جائے جیسے آج کل کیمیائی اجزاء کے استعمال سے چمڑے کو تیار کیا جاتا ہے۔ دباغت حکمی یہ ہے کہ چمڑے پر مٹی وغیرہ ڈال کر اور دھوپ میں رکھ کر خشک کر لیا جائے۔ (از کتب فقہ)

مسئلہ: ہر جانور خواہ ذبح کیا گیا ہو یا مردار ہو اس کے بالوں اور ہڈیوں اور خشک پٹھوں اور سینگوں اور پاؤں کی ہڈی سے نفع حاصل کرنا جائز ہے۔ (از مظہری)

انتباہ: بعض ائمہ نے خنزیر کے بالوں سے سلاہوا جوتا استعمال کرنا بوقت ضرورت جائز قرار دیا۔ لیکن ابن ہمام رحمہ اللہ نے فرمایا ”ان الضرورة ليست ثابتة في الخرز به بل يمكن ان يقام بغيره“ بیشک ضرورت جوتے کی سلائی میں نہیں پائی جاتی اور دھاگہ وغیرہ سلائی کے لئے حاصل کرنا ممکن ہے ایسے جوتوں کی خرید و فروخت منع ہے۔

”وقد كان ابن سيرين لا يلبس خفا خزر بشعر الخنزير“

حضرت ابن سیرین رحمہ اللہ بھی وہ جوتا استعمال نہیں کرتے تھے جس میں سور کے بال ہوں۔ کیا کوئی جانور ذبح کرنے کے بغیر حلال ہے؟

جی ہاں اس مسئلہ پر رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی موجود ہے:

☆ ”عن ابن عمر قال قال رسول الله ﷺ احلت لنا ميتتان ودمان فاما الميتتان فالجراد والسمك واما الدمان فالطحال والكبد“

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دو جانور بغیر ذبح کرنے کے ہی ہم پر حلال ہیں اور دو خون ہم پر حلال ہیں دو غیر مذبوح سے مراد مکڑی اور مچھلی اور دو خونوں سے مراد تلی کا خون اور جگر کا خون۔ (از حصص)

واضح ہوا کہ مکڑی اور مچھلی ذبح کرنے کے بغیر ہی حلال ہیں۔

تنبیہ: ”عن جابر عن عبد الله قال قال رسول الله ﷺ اذا وجدتموه حيا فكلوه وما القى البحر حيا فمات فكلوه وما وجدتموه ميتا طافيا فلا تاكلوه“

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تم مچھلی کو زندہ

پکڑو تو اسے کھا سکتے ہو اور جسے دریائے زندہ ہی باہر پھینک دیا پھر وہ مر گئی اسے بھی کھا سکتے ہو اور جسے تم مردہ پانی پر تیرتا ہوا پاؤ اسے نہ کھاؤ۔
(جصاص)

بعض لوگوں نے اس حدیث پاک سے غلط مطلب سمجھا انہوں نے کہا اس مچھلی کا پانی میں رہنا مراد ہے اور یہی وجہ حرام ہونے کی ہے اگر کوئی جانور ذبح کر کے پانی میں پھینک دیا جائے اور وہ پانی کی سطح میں آجائے تو وہ حرام ہو جائے گا۔ یہ قول غلط اور باطل ہے ذبح کیا ہوا جانور پانی میں ڈالنے سے حرام نہیں ہوتا۔

”ان السمک لو مات ثم طفا علی الماء لا کل ولو مات حتف انفه
ولم یطف علی الماء لم یؤکل والمعنی فیہ عندنا هو موتہ فی الماء
حتف انفه لا غیر“

مچھلی کو زندہ پکڑا وہ مر گئی پھر اسے پانی میں ڈال دیا گیا وہ پانی کی سطح پر آ گئی اسے کھایا جائے جو مچھلی خود بخود مر جائے بیشک وہ پانی پر نہ تیرے اسے نہیں کھایا جائے گا۔
مردہ مچھلی کو نہ کھانے کی اصل وجہ اس کا خود بخود مر جانا ہے اور کوئی وجہ نہیں لہذا وہ مچھلی پانی میں ہو یا باہر کنارے میں ہو یہ معلوم نہ ہو کہ پانی نے اسے زندہ ہی باہر پھینکا ہے تو اس کا کھانا جائز نہیں۔

(الجامع لا حکام القرآن للجصاص)

جانوروں کے پیٹ میں بچے کا حکم: جب کسی گائے، بھینس، بکری اور اونٹنی وغیرہ کو ذبح کیا تو اس کے پیٹ سے مردہ بچہ نکلا تو اس بچے کے گوشت کو کھانا حرام ہے اور اگر زندہ نکلا ذبح نہیں کیا اور مر گیا پھر بھی وہ حرام ہے اور اگر زندہ نکلا اور اسے ذبح کر لیا گیا تو اس کے گوشت کا کھانا حلال ہے یہ قول امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا ہے یہی درست ہے۔

بعض ائمہ نے کہا جب اس بچے کی ماں کو ذبح کر دیا گیا تو یہ اس بچے کے لئے کافی ہے وہ حلال ہونے یا حرام ہونے میں اپنی ماں کے تابع ہے۔ اس لئے بچہ زندہ نکلے یا مردہ اس کے جسم پر بال نکل آئے تھے یا نہیں نکلے ہر حال میں وہ حلال ہے کیونکہ اس کی ماں ذبح کی وجہ سے حلال ہو گئی۔ ان حضرات نے اپنے موقف پر یہ حدیث پاک پیش کی ”عن علی وابن عمر قالا ذکاة الجنین

ذکاة امہ “ حضرت علی اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہم نے فرمایا ماں کے پیٹ میں بچے کا ذبح اس کی ماں کا ذبح ہی ہے اس کا جواب یہ ہے ” وھذہ الاخبار کلھا واھیۃ السند “ اس مسئلہ میں اس قسم کی آنے والی تمام روایات کی اسناد میں ضعف پایا گیا ہے ضعیف حدیثوں سے کسی حرام چیز میں حلت ثابت نہیں ہو سکتی۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ جو حدیث پیش کی گئی ہے اس میں دو احتمال پیش کئے گئے ہیں ایک تو وہی جو بعض حضرات نے بطور دلیل پیش کیا ہے کہ ” ذکاة الجنین ذکاة امہ “ کا معنی یہ ہوگا ” ان ذکاة امہ ذکاة لہ “ بیشک اس کی ماں کا ذبح کرنا اس کا ذبح کرنا ہے۔

لیکن دوسرا احتمال یہ ہے کہ بچے کو ذبح کرنے کا وجوبی طور پر حکم دیا گیا ہو حدیث پاک کا مطلب یہ ہو ” تذکیتہ کما تذکی امہ “ اس بچے کو ذبح کرنے کا وہی حکم ہے جو اس کی ماں کے ذبح کرنے کا حکم ہے ” کاف “ عام طور پر محذوف ہوتا رہتا ہے جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿ جَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمَوَاتُ وَالْأَرْضُ ﴾ اس کا معنی ہے ” کعرض السموات والارض “ جنت کی چوڑائی آسمانوں اور زمین کی چوڑائی کی طرح ہے۔ اسی طرح کہا جاتا ہے ” قولی قولک “ یعنی ” قولی کقولک “ میرا قول تمہارے قول کی طرح ہے۔ اور کہا جاتا ہے ” مذہبی مذہبک “ میرا مذہب تمہارے مذہب کی طرح ہے یعنی ” مذہبی کمذہبک “ کسی شاعر نے اپنی محبوبہ کو ہر نی سے تشبیہ دے کر اس کی تعریف کرتے ہوئے محبوبہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

فعیناک عیناھا وجیدک جیدھا سوی ان عظم الساق منک دقیق

تو تمہاری آنکھیں اس کی آنکھوں کی طرح ہیں اور تمہاری گردن اس کی گردن کی طرح ہے سوائے اس کے کہ اس کی پنڈلی کی ہڈی تم سے باریک ہے۔

اس شعر میں بھی کاف محذوف ہے۔ واضح ہوا کہ اس حدیث پاک کا زیادہ واضح مطلب ہی یہ ہے کہ اس بچے کو ایسے ہی ذبح کیا جائے جیسا کہ اس کی ماں کو ذبح کیا گیا ہے۔

(ماخوذ از الجامع لاحکام القرن للجمامی)

چو ہے وغیرہ کا گھی میں مرجانے کا حکم:

”عن الزهري عن سعيد بن المسيب عن ابي هريرة قال سئل
النبي ﷺ عن الفأرة تقع في السمن فقال عليه السلام ان كان جامدا
فالقوها وما حولها وان كان مائعا فلا تقربوه“

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا گیا کہ چوہا گھی میں گر
جائے تو اس کا کیا حکم ہے؟ آپ نے فرمایا اگر گھی منجمد (جماد ہوا) ہے تو جہاں گرا ہے اس کے ارد گرد سے گھی
نکال لیا جائے اور چوہے کو بھی نکال کر پھینک دیا جائے اور اگر گھی پگھلا ہوا ہے تو اس کے قریب نہ جاؤ۔

تنبیہ: حدیث شریف میں جو حکم بیان ہے اس کا تعلق کھانے سے ہے اگر یہی گھی جو پگھلا
ہوا تھا اور چوہا اس میں گر کر مر گیا وہ بیچ دیا اور یہ واضح کر دیا جائے کہ اس میں چوہا گر کر مر گیا ہے تو اس کا
بیچنا جائز ہے اس لئے چراغ جلانے کشتیوں وغیرہ کی لکڑیوں پر اسے استعمال کرنا جائز ہے۔ یعنی جس
طرح گدھے وغیرہ کو بیچنا جائز ہے کہ اس سے نفع حاصل کیا جائے لیکن اسے کھایا نہ جائے یہی حکم اس گھی
کا بھی ہے کیونکہ یہ نجس العین نہیں۔

(از حصص)

ہنڈیا میں پرندہ گر کر مرجانے کا حکم:

علی بن مسہر کہتے ہیں کہ میں امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے پاس تھا آپ کے پاس ابن مبارک آئے جنہوں نے
خراسانی ہیت (شکل) اختیار کی ہوئی تھی انہوں نے امام صاحب سے سوال کیا کہ ایک شخص نے ہنڈیا کو
آگ پر چڑھایا اس میں گوشت تھا ایک پرندہ اس پر سے گزرتے ہوئے گر کر مر گیا تو اس کا حکم کیا ہے؟

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے اپنے اصحاب سے پوچھا کہ تمہارے نزدیک اس کا کیا حکم ہے؟ انہوں
نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول سے دلیل پیش کرتے ہوئے کہا کہ شور بانڈیل دیا جائے اور
گوشت دھو کر کھالیا جائے۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے فرمایا کہ ہم بھی یہی کہتے ہیں لیکن اس میں تفصیل
ہے وہ یہ ہے۔

”فان كان وقع فيها في حال سكونها فكما في هذه الرواية وان وقع
فيها في حال غليانها لم يؤكل اللحم ولا المرق“

اگر پرندہ گرا ہے جب کہ ہنڈیا جوش نہیں مار رہی تھی تو پھر یہی حکم ہی کہ شور با انڈیل دیا جائے اور گوشت دھو کر کھالیا جائے لیکن پرندہ اگر ہنڈیا کے جوش مارتے وقت گرے تو شور با اور گوشت دونوں چیزوں کو کھانا منع ہے۔

حضرت ابن مبارک نے اس تفصیل کی وجہ پوچھی تو آپ نے بتایا کہ جب جوش مارتے وقت پرندہ گرے تو اس کی نجاست گوشت کے اندر سرایت کر جاتی ہے۔ اور جب ہنڈیا جوش نہ مار رہی ہو تو پرندہ گرے تو وہ گوشت میں اثر انداز نہیں ہوتا۔ زیادہ سے زیادہ گوشت اوپر سے میلا (گندہ) ہو گیا اسے دھو کر کھالیا جائے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت مطلق ہے اس میں یہ دونوں احتمال پائے جاسکتے ہیں جن کی تفصیل امام ابو حنفیہ رحمہ اللہ نے بیان فرمادی سبحان اللہ امام اعظم رحمہ اللہ کا کلام بھی اعظم ہے۔ روایت ابن عباس: ”روی ابن المبارک عن عثمان بن عبد اللہ الباہلی قال حدثنی عکرمہ عن ابن عباس فی طیر وقع فی قدر فمات فقال یھراق المرق ویؤکل اللحم“

حضرت عکرمہ فرماتے ہیں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا جب کوئی پرندہ ہنڈیا میں گر جائے اور مر جائے تو شور با گرا دیا جائے اور گوشت (دھو کر) کھالیا جائے۔ اس روایت میں گوشت کے جوش مارنے کی حالت میں پرندے کے گرنے کا ذکر نہیں لہذا امام صاحب رحمہ اللہ کی تفصیل بہت درست ہے۔ اعتراض: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک روایت اور ثابت ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ پرندہ ہنڈیا کے جوش مارنے کی حالت میں بھی گر کر مر جائے تو گوشت کا کھانا جائز ہے۔

”روی محمد بن ثوبان عن السائب بن خباب انہ کان لہ قدر علی النار فسقطت فیھا دجاجة فماتت ونضجت مع اللحم فسالت ابن عباس فقال اطرح المیتة واهرق المرق وکل اللحم فان کرهته فارسل الی منه عضوا او عضوین“

محمد بن ثوبان سائب بن خباب سے روایت کرتے ہیں کہ ان کی ہنڈیا آگ پر پک رہی تھی اس میں مرغی گر کر مر گئی اور گوشت کے ساتھ پک گئی تو میں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس کے

متعلق سوال کیا تو آپ نے فرمایا کہ مردار کو پھینک دو، شور با بہادو، اور گوشت کھا لو اگر تمہیں گوشت کھانے میں کراہت محسوس ہو تو گوشت کا ایک یا دو عضو میری طرف بھی بھیج دو۔

اس حدیث سے پتہ چلا کہ ہنڈیا جوش مار رہی تھی اسی وجہ سے مرغی اس میں پک گئی تو امام صاحب کی توجیہ کس طرح صحیح ہی؟

جواب: ”لا دلالة فيه على حال الغليان لانه جائز ان يكون وقعت فيه بعد سكون الغليان والمرق حار فنضجت فيه والله سبحانه اعلم“

اس روایت میں یہ کوئی دلالت نہیں پائی گئی کہ وہ مرغی ہنڈیا کے جوش مارنے کی حالت میں گری ہو سکتا ہے کہ ہنڈیا کا جوش ختم ہونے کے بعد گری ہو شور بے کے گرم ہونے کی وجہ سے پک گئی ہو۔ (اس کی نجاست گوشت کے اندر اثر انداز نہ ہوئی ہو)

خیال رہے کہ ”نضج“ کا معنی کامل طور پر پک کر تیار ہونا مراد بھی نہیں بلکہ پکنے کی حالت کو ”نصح“ کہا جاتا ہے۔

والدم: ”اور خون“ یعنی جو چیزیں تم پر اللہ تعالیٰ نے حرام کی ہیں ان میں سے خون بھی ہے جو حرام ہے۔ کون سا خون حرام ہے: خون سے مراد بہنے والا خون ہے کیونکہ دوسری آیت میں ﴿أَوْ دَمًا مَّسْفُوحًا﴾ ذکر فرمایا جس سے واضح ہوتا ہے کہ مراد ”دم مسفوح“ بہنے والا خون ہی ہے۔ البتہ جس طرح پہلے حدیث پاک بیان کر دی گئی کہ دو بہنے والے خون حلال ہیں یعنی تلی اور جگر کا خون بہنے کے باوجود حلال ہے۔ ذبح کے وقت جو خون نکلے یا زخم سے اور پھوڑے وغیرہ کے پھٹ جانے سے جو خون نکلے وہ حرام ہے۔

دم مسفوح نجاست غلیظہ ہے: بہنے والا خون اگر جسم اور کپڑے پر درہم سے کچھ زائد ہو جائے تو اس کا دھونا فرض ہے اس کے ہوتے ہوئے نماز ادا نہیں ہوگی۔ اگر درہم کی مقدار ہو جائے تو واجب ہے کہ اسے دھو دیا جائے درہم کی مقدار یہ ہے کہ ہاتھ کو سیدھا کڑا کر رکھے اور پانی ہتھیلی میں ڈالے جتنی جگہ پانی رک جائے اتنی مقدار ہے درہم کی۔

مسئلہ: جسم کے کسی حصہ سے خون کے نکلنے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ ہاں اگر خراش آئے خون

ظاہر ہوا لیکن آگے نہیں چلا تو وضو نہیں ٹوٹے گا۔ دانتوں سے خون نکلے تو تھوک کر دیکھے اگر تھوک زردی مائل ہو تو وضو نہیں ٹوٹا اگر چہ وضو بنا کر لینا بہتر ہے اور اگر تھوک سرخی مائل ہو تو وضو ٹوٹ گیا۔ جو خون وضو کو توڑ دیتا ہے وہ ناپاک ہے اور جو خون وضو کو نہیں توڑتا وہ ناپاک نہیں۔ (از شامی)

ذبح کے بعد گوشت میں رہ جانے والے خون کا حکم:

”و اما اللحم یخالطہ الدم فلا بأس به“ گوشت میں جو خون پایا جاتا ہے اس میں کوئی حرج نہیں یعنی وہ حلال اور پاک ہے۔ خون کے جو اجزاء گوشت میں رہ جاتے ہیں اور رگوں میں رہ جاتے ہیں ان کا کھانا جائز ہے اس مسئلہ میں فقہاء کرام کا کوئی اختلاف نہیں۔

”الا تری انہ مٹی صب علیہ الماء ظہرت تلک الاجزاء ولیس ہو

بمحرم اذ لیس ہو مسفوحا“

کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ جب اس پر پانی بہایا جائے تو خون کے اجزاء ظاہر ہو جاتے ہیں حالانکہ وہ حرام نہیں کیونکہ وہ بہنے والا خون نہیں۔

☆ ”روی القاسم بن محمد عن عائشة انها سئلت عن الدم یكون فی اللحم والمذبح قالت انما نهی الله عن الدم المسفوح“

قاسم بن محمد رحمہ اللہ سے مروی ہے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے سوال کیا گیا کہ جو خون گوشت میں رہ جاتا ہے اور ذبح کرنے کے بعد جانور میں خون رہ جاتا ہے اس کا حکم کیا ہے تو آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے بہنے والے خون سے منع فرمایا ہے۔ (از جصاص)

آپ کا مطلب یہ تھا کہ جو خون گوشت میں رہ جاتا ہے اس سے رب تعالیٰ نے منع نہیں فرمایا۔ جب رب تعالیٰ نے منع نہیں فرمایا تو حلال ہے۔

آپ کے ارشاد سے واضح ہو گیا کہ جس چیز سے رب قدوس نے منع نہ فرمایا ہو وہ حلال رہتی ہے کیونکہ اشیاء میں اصل اباحت ہے۔ (راقم)

☆ ”وقد روت عائشة رضی اللہ عنہا قالت کنا نطبخ البرمة علی عهد رسول اللہ ﷺ تعلوها الصفرة من الدم فناکل ولا ننکره“

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں ہنڈیا پکاتی تھیں

گوشت کے اوپر خون کی وجہ سے زردی آ جاتی تھی ہم اسے کھا لیتے تھے کبھی ہم نے اس کا انکار نہیں کیا۔

(از قرطبی)

شرعی ضابطہ: ” لان التحفظ من هذا اصر وفيه مشقة والاصر والمشقة في الدين موضوع وهذا اصل في الشرع “

شرع میں قانون اور ضابطہ یہ پایا گیا ہے کہ جس کام میں مشقت اور بوجھ پایا جائے اسے شریعت میں رب تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ اٹھا لیتے ہیں گوشت میں رہ جانے والے خون سے بچنا بھی مشکل اور مشقت کا سبب تھا اسی وجہ سے اسے حلال کر دیا گیا اس کے حرام ہونے کا حکم نہیں دیا گیا۔

اسی ضابطہ کی وجہ سے جو کام امت پر حرج کا سبب بنے ہیں عبادت میں ان کو عبادات میں سے ساقط کر دیا گیا۔ (ہٹا دیا گیا) یہی وجہ ہے کہ جو شخص مجبور ہو جائے اسے مردار کھانے کی اجازت دے دی گئی۔ (جس کا ذکر تفصیل سے انشاء اللہ اسی آیہ کریمہ کے آخر میں آ رہا ہے) اور مریض کو روزہ افطار کرنے کی اور یتیم کرنے کی اجازت دی گئی۔

(از قرطبی)

مچھلی کا خون پاک اور حلال ہے: قالیسی رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ مچھلی کا خون پاک ہے اور انہوں نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ یہ حلال ہے اور یہی قول ابن عربی رحمہ اللہ کے نزدیک معتبر ہے۔

” لانه لو كان دم السمك نجسا لشرعت ذكاته اسی لئے کہ اگر مچھلی کا خون نجس ہوتا تو مچھلی کو ذبح کرنا بھی شریعت میں لازم ہوتا۔

یہی مذہب امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا ہے مچھلی کا خون حقیقت میں خون ہی نہیں صرف اس کے ظاہری رنگ کو دیکھ کر اس پر ”دم“ (خون) کا لفظ بول لیا جاتا ہے اس لئے کہ قانون یہ ہے کہ خون دھوپ پر سیاہ ہو جاتا ہے لیکن مچھلی کا خون دھوپ پر سفید ہو جاتا ہے اس سے پتہ چلا کہ مچھلی کا خون حقیقت میں خون ہی نہیں۔

اعتراض: گوشت خون سے پیدا ہوتا ہے اللہ تعالیٰ نے مچھلی کے لئے ”لحم طریا“ (تر و تازہ گوشت) کے الفاظ کا استعمال کیا ہے تو کس طرح کہا جاتا ہے کہ مچھلی میں خون نہیں۔

جواب: ﴿لحم﴾ بھی مچھلی پر ایسے ہی بولا گیا ہے جیسے ﴿دم﴾ بولا گیا ہے اس لئے کہ ضابطہ یہ ہے

کہ خون میں حرارت (گرمی) اور پانی میں برودت (ٹھنڈک) پائی جاتی ہی اسی وجہ سے دموی (خون والے جانور) ہمیشہ پانی میں نہیں رہ سکتے۔

بطخ اور مرغابی میں خون پایا جاتا ہے اس لئے وہ ہمیشہ پانی میں نہیں رہتیں حالانکہ مچھلی کی پیدائش بھی پانی میں ہوتی ہے اور ہمیشہ ہی پانی میں رہتی ہے پانی کے بغیر زندہ رہ ہی نہیں سکتی اسی سے واضح ہو گیا کہ مچھلی میں خون نہیں۔
(ماخوذ از قرطبی ونور الانوار)

جانوروں کے حلال ہونے اور حرام ہونے پر شاندار ضابطہ:

کل حرام جانور یہ ہی نہیں بلکہ اسکے علاوہ کتا، بلی، گدھا وغیرہ سب حرام ہیں عالمگیری میں اسکی پہچان کا عجیب قاعدہ بیان کیا وہ یہ کہ جانور دو قسم کی ہیں، دریائی اور خشکی کے، دریائی سب حرام ہیں سوائے مچھلی کے۔ خشکی والے پھر دو طرح کی ہیں، پرندے اور چرندے، یعنی ہوائی اور زمینی۔ پرندے پھر دو قسم کے ہیں ایک خون والے اور بغیر خون کے۔ جن میں بہنے والا خون نہیں وہ سب حرام ہیں سوائے مکڑی کے۔ خون والے پرندے جو بچے سے پکڑ کر چیز کھائیں وہ حرام باقی حلال۔ زمینی جانور بھی دو طرح کے ہیں خون والے اور بغیر خون کے جن میں خون نہیں وہ سب حرام ہیں۔ اور خون والے جو دوسرے پر حملہ کر نیوالے درندے ہیں جیسے کتا، بلی، شیر وغیرہ یہ سب حرام ہیں باقی حلال۔ اور خون والے حشرات الارض کیڑے مکوڑے وغیرہ اور موزی جانور بچھو، سانپ، چوہا، چھپکلی وغیرہ سب حرام ہیں۔

(از نعیمی)

مسئلہ: حلال جانوروں کی یہ چیزیں حرام ہیں، خون بہنے والا، پتہ، مثانہ، زکاذکر، مادہ کی فرج

(از نعیمی)

فائدہ: تلی اور گردہ نبی کریم ﷺ کو ناپسند تھے ایسے ہی او جڑی وغیرہ۔ اور بکری کا دست (اگلے پاؤں) اور سینہ کا گوشت بھی حضور ﷺ کو پسند تھا۔

(از نعیمی)

طوطے کا حکم: "بحرم اکلها علی الاصح فی الرافعی ونقلہ فی البحر عن الضمیری

واقره وعلل ذلک بنخب لحمها"

طوطے کا کھانا حرام ہے صحیح قول یہی ہی رافعی میں یہی مذکور ہے اور البحر الرائق ضمیری سے یہی

ذکر کیا ہے پھر اس قول کو اسی طرح ثابت رکھا ہے کوئی رد نہیں کیا اور علت اس کی یہ بیان کی گئی ہے کہ اس کا گوشت خبیث (نا پاک) ہے۔ تاہم بعض حضرات نے حلال بھی کہا ہے کہ یہ پاکیزہ چیزیں کھاتا ہے اور زہریلے جانوروں سے نہیں، اور دوسرے پرندوں کا شکار نہیں کرتا اور نہ ہی اس کے قتل کا حکم دیا گیا ہے اور نہ ہی اس سے منع کیا گیا ہے یہ تمام وجوہ ہیں حلال ہونے کی۔ لیکن صحیح وہی جو جلیل القدر فقہاء کرام نے بیان کیا ہے کہ یہ حرام ہے۔ (از حیوة الحیون)

مور کا حکم: ”یحرم اکل لحم الطاؤس لخبث لحمه“ مور کا گوشت کھانا حرام ہے کیونکہ اس کا گوشت خبیث (نا پاک) ہے۔ تاہم اس میں بھی ایک قول حلال ہونے کا ملتا ہے کہ یہ گندی چیزیں نہیں کھاتا۔ لیکن جب حرام ہونا واضح طور پر ملتا ہے تو حرام ہی سمجھا جائے۔ (از حیوة الحیوان)

مور کے پر دوسرے پرندوں کے پروں کی طرح پاک ہیں خوبصورتی کی وجہ سے لوگ قرآن پاک میں رکھ لیتے ہیں یہ جائز ہے۔ شیخ سعدی رحمہ اللہ نے بھی قرآن پاک میں مور کے پروں کا خوبصورتی کی وجہ سے رکھنے کا ذکر اپنے کتاب گلستان میں کیا ہے۔ گویا کہ یہ قدیم زمانہ کا رواج ہے جب جائز ہے تو اس پر کسی قسم کی بحث کی ضرورت نہیں۔ (راقم)

خنزیر: یہ مردار کھاتا ہے۔ یہ اپنی مؤنث کی پیٹھ پر سوار ہو جاتا ہے اور وہ چرتی رہتی ہے کئی میلوں تک وہ چلتی رہتی ہے یہ اس کی پیٹھ پر سوار رہتا ہے۔ یہ جب کسی کتے کو کاٹ لے تو اس کے بال گر جاتے ہیں اسے بیشک گھریاں بھی لیں اس کی بے حیائی والی حرکات میں کوئی فرق نہیں آتا۔ سانپ کو یہ کھا لیتا ہے سانپ کا زہر اس پر اثر نہیں کرتا۔ اگر یہ تین دن بھوکا رہے پھر دو دن کھا لے تو موٹا ہو جاتا ہے اسے گدھے کے ساتھ باندھ دیں جب گدھا پیشاب کرے تو یہ مر جاتا ہے۔ اس کی ایک آنکھ نکال دیں تو یہ جلدی مر جاتا ہے۔ یہ جب مریض ہو جائے تو کیکڑا کھائے تو ٹھیک ہو جاتا ہے۔ شہوت بھی اس میں بہت ہے اور بے حیا بھی ہے۔ خنزیرینی جب پندرہ سال کی ہو جائے تو اس کی اولاد کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے خنزیر کی نسل تیزی سے پھیلتی ہے۔ (حیوة الحیوان)

کبھی پاکستانیوں نے سوچا ہے کہ آج کل خنزیریوں کی بہتات کیوں ہے؟ اسکی صرف وجہ یہ ہے کہ تیل کمپنیوں کے انگریزوں نے خنزیر کے بچوں کے جوڑے لا کر پاکستانی جنگلوں میں چھوڑ دیئے۔

انگریز کی یاری کا یہ فائدہ حاصل ہوا کہ آج کل کھیتی باڑی تباہ ہو رہی ہے خزیروں کو ختم کرنا اب ممکن نظر نہیں آتا **ولحم الخنزیر:** (اور سور کا گوشت) یعنی تم پر سور کا گوشت حرام کر دیا ہے۔ سور (نجس العین) یعنی مکمل طور پر ناپاک ہے اس کا گوشت، ہڈیاں، پٹھے اور بال وغیرہ تمام اعضاء اس کے ناپاک ہیں ان سے نفع حاصل کرنا جائز نہیں۔ خنزیر اور اس کے تمام اعضاء گوشت وغیرہ کی خرید و فروخت حرام ہے۔ (از کتب فقہ) سوال و جواب: افریقہ کے ایک دوست نے یہ مسائل پوچھے تھے کہ ہمارے علاقہ میں صابن وغیرہ ایسا ملتا ہے جس میں مردہ جانوروں کی چربی استعمال ہوتی ہے ان کا استعمال جائز ہے یا نہیں۔ اسی طرح دانتوں والے برش میں سور کے بال استعمال ہوتے ہیں ایسے برش کا استعمال شرعاً جائز ہے یا نہیں۔ اور بعض صابنوں میں سور کی چربی استعمال ہوتی ہے اس کا حکم کیا ہے؟

راقم نے جو جواب تحریر کر کے دیا تھا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر صابن مردہ جانور کی چربی کے بغیر دوسرے تیل سے بنا ہوا ملتا ہے تو مردہ جانور کی چربی والا استعمال جائز نہیں۔ اگر اور کوئی صابن نہیں ملتا تو عذر ہے اس صابن کو استعمال کیا جاسکتا ہے لیکن یہ صابن نجس (ناپاک) ہے اس لئے جس کپڑے یا جسم پر استعمال کیا جائے تو اس کے بعد تین مرتبہ پانی سے پاک کرنا ضروری ہے کیونکہ ناپاک صابن سے جسم ناپاک ہو گیا ہے۔ ایسا برش جس میں سور کے بال ہوں اور یقین ہو اس برش کا استعمال کرنا حرام ہے تاہم پاکستان میں اکثر طور پر دانتوں والے برش پلاسٹک کے بالوں سے تیار ہیں جن کا استعمال جائز ہے ممکن ہے عیسائیوں کے یا سور کے بالوں والے برش استعمال کرتے ہوں تو یہ حرام ہے۔ سور کی چربی والا صابن جب یقین ہو کہ اس میں سور کی چربی استعمال کی گئی ہے اسے استعمال کرنا حرام ہے۔

(واللہ اعلم بالصواب)

تنبیہ: کسی حرام جانور کو مسلمان اللہ تعالیٰ کا نام لے کر ذبح کر دے تو وہ حلال تو نہیں ہوتا لیکن گوشت اس کا پاک ہو جاتا ہے وہ گوشت یا گوشت میں رہ جانے والا خون انسان کے جسم یا کپڑے کو لگ جائے تو وہ جسم اور کپڑا ناپاک نہیں ہوگا۔ خنزیر کو مسلمان اللہ کا نام لے کر ذبح بھی کر دے پھر بھی وہ حرام اور نجس (ناپاک) ہی رہے گا۔ (از کتب فقہ)

مسئلہ: کسی کافر کا ذبح کیا ہو جانور حلال نہیں ہوتا البتہ اہل کتاب کا ذبح کیا ہو جانور حلال

ہو جاتا ہے کیونکہ ان کا اللہ تعالیٰ پر ایمان ہوتا ہے۔ لیکن آج کل زیادہ اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ زندیق، دہریے ہیں جن کا اللہ تعالیٰ پر اور قیامت پر ایمان نہیں ان کا ذبح کیا ہوا جانور حرام ہوتا ہے۔ زیادہ طور پر وہ بڑے جانور کو گولی مار کر ہلاک کر دیتے ہیں جو حرام ہو جاتا ہے۔

یہ بھی خیال رہے کہ بندوق کی گولی مسلمان بسم اللہ پڑھ کر جانور پر چلائے تو وہ گولی سے مر جائے تو حرام ہے کیونکہ گولی جانور کو پھاڑتی نہیں بلکہ اس کی ضرب سے جانور مر جاتا ہے۔

پکی گولی اگر چہ پھاڑتی ہے لیکن جس جانب سے وہ لگتی ہی اس جانب سے صرف سوراخ کرتی ہی دوسری جانب سے گولی کا بارود اور اس میں ملے ہوئے لوہے کی ٹکڑے پھاڑتے ہیں اس لئے وہ بھی حرام ہی ہوتا ہے۔

یہود و نصاریٰ آج کل مرغی کی گردن پکڑ کر کھینچ کر ہلاک کر دیتے ہیں اور بھیڑ بکری کے سر میں دماغ کے اندر کیل ٹھونک کر مار دیتے ہیں اس لئے یہود و نصاریٰ کے ہاتھوں مارے ہوئے جانوروں کا گوشت کھانا حرام ہے۔ (از کتب فقہ بمع وضاحت رافع)

مسئلہ : مردہ مرغی کے پیٹ سے پکا انڈا نکلے تو اس کا کھانا جائز ہے اور کچا انڈا جس پر سخت خول نہ آئے اس کا کھانا جائز نہیں۔ ذبح کی ہوئی مرغی کے پیٹ سے پکا انڈا نکلے یا کچا اس کا کھانا جائز ہے۔

(از قرطبی)

تنبیہ : انفحہ (بکری کے بچے کے معدے سے بنا ہوا پنیر) المنجد سے جو پنیر حاصل ہوتا ہے یعنی دودھ کو منجمد کرنے کے لئے، کھویا بنانے کے لئے ”انفحہ“ کا استعمال بعض حضرات نے جائز قرار دیا ہے خواہ مردار سے حاصل ہو۔ کہ نبی کریم ﷺ کے پاس پنیر عجم سے آتا تھا جو آپ نے استعمال کیا ہے حالانکہ وہ انفحہ مردہ جانوروں سے حاصل کیا جاتا تھا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ صحابہ کرام فتوحات کے بعد عجم میں پھیل گئے تھے ذبح کئے ہوئے جانوروں کے انفحہ سے حاصل ہونے والا پنیر استعمال کیا گیا۔

لیکن مردہ جانوروں کے انفحہ سے بنایا جانے والا پنیر (کھویا) حرام ہے۔ (ماخوذ از قرطبی)

☆ "عن سلمان الفارسی قال سئل رسول الله ﷺ عن السمن والجبن والفراء فقال الحلال ما أحل الله فی کتابه والحرام ما حرم الله فی کتابه وما سکت عنه فهو مما عفا عنه"

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا گیا "گھی" اور پیڑ (کھویا) اور جنگلی گدھے کے متعلق۔ تو آپ نے فرمایا حلال وہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں حلال کر دیا ہے اور حرام وہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں حرام کیا ہے۔ اور جس سے سکوت (خاموشی کو) اختیار کیا ہے وہ معاف ہے۔

اس حدیث پاک سے واضح ہوا کہ مردہ جانور سے حاصل ہونے والا افحہ حرام ہے لہذا جب اسے دودھ میں استعمال کر کے کھویا بنائے جائے تو وہ کھویا بھی حرام ہے۔ اور حلال جانور سے حاصل ہونے والا افحہ حلال ہے جب اسے دودھ میں ڈال کر کھویا بنایا جائے تو وہ حلال ہے۔ (ماخوذ از قرطبی)

تنبیہ : جس چیز کو نبی کریم ﷺ حلال کر دیں وہ حلال ہے اور جس چیز کو نبی کریم ﷺ حرام کر دیں وہ حرام ہے وہ دراصل رب تعالیٰ کے حکم سے ہوتا ہے لہذا گویا کہ وہ کتاب اللہ کا حکم ہی ہوتا ہے۔

☆ "وعن المقدم بن معد یکر ب قال قال رسول الله ﷺ الا انی اوتیت القرآن ومثله معه الا یوشک رجل شعبان علی اریکته یقول علیکم بهذا القرآن فما وجدتم فیہ حلال فاحلوه وما وجدتم فیہ من حرام فحرموه وان ما حرم رسول الله ﷺ کما حرم الله ﷻ لا یحل الحمار الاہلی ولا کل ذی ناب من السباع ولا لقطۃ معاهد الا ان یتغنی عنہا صاحبہا۔ الخ، رواہ ابو داؤد روی الدارمی نحوه وکذا ابن ماجہ الی قولہ کما حرم الله ﷻ"

(مشکوٰۃ کتاب الاعتصام بالکتاب والسنة)

مقدم بن معد یکر ب فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا خبردار بیشک مجھے قرآن پاک اور اس کی مثل (حدیث پاک) عطا کئے گئے۔ خبردار ایک وقت میں ایک شخص امیر آرام دہ کرسی پر بیٹھنے والا کہے گا۔ تم پر لازم ہے کہ صرف قرآن پر عمل کرو۔ جو قرآن میں حلال پاؤ وہی حلال ہے اور جو قرآن میں حرام پاؤ وہی حرام ہے بیشک اللہ کے رسول نے جس چیز کو حرام کیا وہ ایسے ہی حرام ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے کسی چیز کو حرام کیا۔ خبردار تمہارے لئے گھریلو گدھے حلال نہیں۔ اور درندے حلال نہیں (جیسے شیر، چیتا، بھیڑ یا وغیرہ۔ دوسری حدیث میں دوسرے پرندوں کا شکار کرنے والے پرندوں کو بھی حرام قرار دیا جیسے

چیل، باز وغیرہ) اور کسی ذمی (جس سے تمہارا معاہدہ ہو کہ تو ہمارے ملک میں رہ سکتا ہے ہم تیرے مال اور تیری جان کے محافظ ہیں باوجود اس کے کہ وہ کافر ہوتا ہے) کی گری ہوئی چیز تمہارے لئے حلال نہیں ہاں اگر اس کا مالک اس سے بے پرواہ ہو۔

اس حدیث میں ذمی کی گری ہوئی چیز کا ذکر کیا ہے حالانکہ مسلمان کی گری ہوئی چیز کا بھی یہی حکم ہے کہ وہ چیز اٹھانے والا خود استعمال نہ کرے ہاں اگر کوئی حقیر چیز ہو پتہ ہو کہ مالک اسے تلاش نہیں کر رہا ہوگا، تو وہ کسی غریب کو دے دے، یا خود محتاج ہو تو استعمال کر لے۔

ذمی کے ذکر کا مقصد یہ ہے کہ بعض اوقات انسان لا پرواہی سے کام لیتا ہے کہ چلو یہ چیز تو کافر کی ہے اسے کیا دینی ہے واضح ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کی طرف سے حلال ہونے والی چیزیں یا حرام ہونے والی چیزیں قرآن پاک کے مطابق ہی ہیں کیونکہ آپ وہی ارشاد فرماتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کا حکم ہوتا ہے۔
اعتراض: تم نے کہا ہے مردہ جانور کا انفحہ (بکری کے بچے کے معدہ کے ساتھ پایا جانا والا کوئی عضو) حرام ہے۔ حالانکہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے اسے پاک کہا ہے۔

جواب: امام مالک اور امام ابو حنیفہ رحمہما اللہ کا اس میں قول یہ ہے ”ان ذلک لا ینجس بالموت ولکن ینجس بمجاورة الوعاء النجس“ یہ جانور کے مرنے سے اگر چہ نجس نہیں ہوتا لیکن جس جگہ میں ہوتا ہے وہ جگہ اس جانور کے مرنے سے ناپاک ہو جاتی ہے اس لئے یہ بھی ناپاک ہو جاتا ہے۔

(ماخوذ از قرطبی)

وَمَا أَهْلٌ بِهِ لَغَيْرِ اللَّهِ: ”اور وہ جانور جو ذبح کئے گئے ہوں اللہ کے غیر کا نام لے کر“ یعنی جن جانوروں کو اللہ تعالیٰ کے نام کے بغیر ہی ذبح کر دیا جائے وہ حرام ہیں اس گوشت کا کھانا مسلمان کیلئے جائز نہیں۔

تنبیہ: ﴿وَمَا أَهْلٌ بِهِ لَغَيْرِ اللَّهِ﴾ کے مسئلہ میں شدید اختلاف پایا جاتا ہے وجہ اختلاف یہ ہے کہ مسئلہ کو واضح طور پر کھول کر نہیں بیان کیا جاتا جس کی وجہ سے اختلاف کا سبب بنتا ہے اگر مسئلہ کو واضح طور پر بیان کیا جائے تو کوئی اختلاف باقی نہیں رہتا۔

مقام افسوس ہے کہ اہل علم مسئلہ کی ایک ایک صورت کو بیان کر کے اختلاف کا شکار ہیں کاش کہ

مسئلہ مکمل بیان کر دیا جائے۔

اس مسئلہ میں تین وجوہ: دو صورتوں میں حرام ہے ایک صورت جائز اور حلال ہے۔
حرام ہونے کی پہلی وجہ: جس جانور کو ذبح کرتے وقت اللہ کا نام نہ لیا جائے بتوں کے نام لے کر
ذبح کیا جائے اس کا کھانا حرام ہے:

﴿وَمَا أَهْلٌ بِهِ لغيرِ اللَّهِ﴾ ای ذکر علیہ غیر اسم اللہ تعالیٰ وہی
ذبیحة المجوسی والوثنی والمعتل فالوثنی یذبح للوثن والمجوسی
للنار والمعتل لا یعتقد شیا فیذبح لنفسه

جس جانور پر اللہ تعالیٰ کے غیر کا نام لے کر ذبح کیا جائے وہ حرام ہے آگ پرست آگ کا نام
لے کر ذبح کرتا تھا اس لئے اس کا ذبح کیا ہوا جانور حرام ہے۔ اور بت پرست بتوں کے نام لے کر ذبح
کرتے تھے اس لئے ان کا ذبح کیا ہوا جانور حرام ہے۔ اور تعطیلیہ فرقہ کا کوئی شخص جانور کو ذبح کرتا تو وہ
بھی حرام ہوتا کیونکہ ان کے عقیدہ میں رب تعالیٰ نے عقل اول کو پیدا کیا پھر وہ خود معتل ہو گیا۔ اب
نظام عقول عشرہ چلا رہے ہیں۔ اس لئے یہ کافر ہیں لہذا ان کا ذبح کیا ہوا جانور بھی حرام ہوتا ہے۔ اگرچہ
ذبح کے وقت یہ کسی کا نام بھی نہیں لیتے آگ پرست اور بت پرست آگ یا بت کا نام نہ بھی لیں تو پھر
بھی ان کے ذبح کرنے سے جانور حرام ہو جاتا ہے۔ کیونکہ یہ مشرکین ہیں مشرکین کے ذبح کرنے سے
جانور حرام ہو جاتا ہے۔

”والاھلال رفع الصوت بقال اھل بکذا ای رفع صوته“

”اھلال“ کا معنی ہے آواز بلند کرنا، کہا جاتا ہے ”اھل بکذا“ اس نے اس طرح آواز کو
بلند کیا۔ ”ومنہ اھلال الصبی واستھلالہ وهو صياحه عند ولادته“ پیدائش کے وقت بچے
کے رونے کو بھی ”اھلال“ کہتے ہیں۔

(از قرطبی)

”وقد روی عطاء بن السائب عن زادن ومیسرة ان علیا علیہ السلام
قال اذ اسمعتم اليهود والنصارى یهلون لغير الله تعالیٰ فلا تأکلوا واذ
لم تسمعوهم فکلوا فان الله قد احل ذبائحهم وهو یعلم ما یقولون“

عطاء بن سائب نے زادن اور میسرہ سے روایت کیا ہے کہ بیشک حضرت علی رضی اللہ عنہ نے

فرمایا جب تم سنو کہ یہود اور نصاریٰ نے ذبح کے وقت اللہ تعالیٰ کے غیر کا نام لیا ہے تو اسے نہ کھاؤ اور اگر ان سے یہ نہ سنو تو کھا لو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کا ذبیحہ حلال کیا ہے وہ جانتا ہے کہ یہ کیا کہہ رہے ہیں۔

(العنصر وفتح البیان ج ۱ ص ۲۲۲)

(بیضاوی)

”ای رفع به الصوت عند ذبحه“

﴿وَمَا أَهْلٌ بِهِ لغيرِ اللَّهِ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ ذبح کے وقت آواز کو بلند کرنا۔

”قال الاصمعي الاهلال اصله رفع الصوت فكل رافع صوته فهو مهل

وقال ابن احمر ، يهل بالفد ركبائها ، كما يهل الراكب المعتمر هذا

معنى الاهلال فى اللغة ثم قيل للمحرم مهل لرفعه الصوت بالتلبية عند

الاحرام هذا معنى الاهلال يقال اهل فلان بحجة او عمرة اى احرم بها

وذلك لانه يرفع الصوت بالتلبية عند الاحرام والذباح مهل لان العرب

كانوا يسمون الاوثان عند الذبح ويرفعون اصواتهم بذكرها“

امام فرماتے ہیں کہ اہلال کا اصلی معنی آواز بلند کرنا ہے پس جو شخص بھی آواز بلند کرے گا اس کو

عربی میں مہل کہیں گے ابن احمر کا ایک شعر ہے:

جنگل میں اس کے سواروں نے آواز بلند کی ، جس طرح عمرہ کرنے والا آواز بلند کرتا ہے

نعت میں اہلال کے یہی معنی ہیں اسی وجہ سے محرم (احرام باندھنے والے) کو مہل کہا جاتا ہے کیونکہ وہ

احرام کی حالت میں تلبیہ پڑھتے ہوئے آواز بلند کرتا ہے۔ اسی طرح کہا جاتا ہے ”اہل فلان بحجة

او عمرة“ فلاں شخص نے حج اور عمرہ کا احرام باندھا اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ وہ تلبیہ پڑھتے وقت آواز

کو بلند کرتا ہے۔ ذبح کرنے والے کو بھی مہل کہا جاتا ہے کیونکہ عرب والے لوگ ذبح کے وقت اپنے

بتوں کا نام بلند کرتے تھے۔

يعنى وما ذبح للاصنام والطواغيت واصل الاهلال رفع الصوت

وذلك انهم كانوا يرفعون اصواتهم بذكر آلهتهم اذا ذبحوا لها

فجرى ذلك مجرى امرهم وحالهم حتى قيل لكل ذابح مهل وان لم

يجهر بالتسمية“

یعنی ذبح کے وقت جن جانوروں پر بتوں اور شیطانوں کا نام لیا گیا ہو وہ حرام ہیں۔ اصل میں

اہلال کا معنی آواز کو بلند کرنا ہے۔ اس لئے کہ وہ ذبح کے وقت اپنے باطل معبودوں کا نام لیتے تھے۔ اگرچہ اصل میں آواز بلند کرنے کو اہلال کہتے ہیں لیکن مطلقاً سب کو مسبب کی جگہ رکھ دیا اگرچہ آواز کو بلند نہ کریں بلکہ آہستہ آواز میں بھی بتوں کا نام استعمال کریں اسے بھی اہلال کہا جاتا ہے۔ (غازن)

☆ "اخرج ابن المنذر عن ابن عباس فی قوله تعالى ﴿وَمَا أَهْلٌ﴾ قال ذبح"

☆ "واخرج ابن جریر عن ابن عباس فی قوله تعالى ﴿وَمَا أَهْلٌ بِهِ لغيرِ الله﴾ یعنی ما اهل للطواغیت"

☆ "واخرج ابن ابی حاتم عن مجاهد ﴿وَمَا أَهْلٌ﴾ قال ما ذبح لغير الله"

☆ "واخرج ابن ابی حاتم عن ابی العالیہ ﴿وَمَا أَهْلٌ بِهِ لغيرِ الله﴾ يقول ما ذکر علیه اسم غیر الله"

(اللہ کے نام کے بغیر) ابن منذر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا کہ ﴿وَمَا أَهْلٌ﴾ کا مطلب ذبح کرنا ہے۔

اور ابن جریر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا کہ ﴿وَمَا أَهْلٌ بِهِ لغيرِ الله﴾ کا مطلب ہے بتوں کے نام پر ذبح کرنا۔

ابن ابی حاتم نے مجاہد سے روایت بیان کی کہ ﴿وَمَا أَهْلٌ بِهِ لغيرِ الله﴾ کا مطلب یہ ہے اللہ کے غیر کا نام لے کر ذبح کیا جائے۔ ابن ابی حاتم نے ابوالعالیہ سے روایت ذکر کی کہ ﴿وَمَا أَهْلٌ بِهِ لغيرِ الله﴾ کا مطلب ہے جس پر اللہ کے غیر کا نام لیا جائے۔ (درمنثور)

"قال الربیع بن انس یعنی ما ذکر عند ذبحہ اسم غیر الله والاهلال اصلہ رؤیۃ الهلال یقال اهل الهلال ثم لما جرت العادة برفع الصوت بالتکبیر عند رؤیۃ الهلال سمی لرفع الصوت مطلقا الاهلال وکان الکفار اذا ذبحوا لا لہتم یرفعون اصواتہم بذکرہا فجری ذلک من امرہم حتی قیل لكل ذابح وان لم یجہر مہل"

حضرت ربیع بن انس فرماتے ہیں ﴿وَمَا أَهْلٌ بِهِ لغيرِ الله﴾ سے مراد وہ ہے جس پر ذبح کے وقت اللہ کے غیر کا نام پکارا جائے "اہلال" اصل میں چاند دیکھنے کو کہا جاتا ہے جس طرح کہا جاتا

ہے ”اہل الہلال“ فلاں نے چاند دیکھا پھر چاند دیکھنے کے وقت عام عادت جاری ہوگئی کہ وہ بلند آواز سے تکبیر کہتے بلند آواز کی وجہ سے کہے گئے الفاظ کو مطلقاً اہلال کہا جانے لگا۔

کافر چونکہ ذبح کے وقت اپنے باطل معبودوں کا نام لیتے اور اپنی آوازوں کو بلند کرتے تو اس وجہ سے ذبح کرنے والے کو مہل کہا جانے لگا خواہ اس نے آواز کو بلند کیا ہو یا بلند نہ کیا ہوتا۔ (از مظہری)

”یعنی ما ذبح للاصنام والطواغیت و صبح فی ذبح“

یعنی ذبح کے وقت بتوں اور شیطانوں کے نام لئے جاتے اور ان پر آواز کو بلند کیا جاتا۔
(فتح البیان)

﴿ وَمَا أَهْلٌ بِهِ لغيرِ اللَّهِ ﴾ ای وحرم ما رفع به الصوت عند ذبحه
للصنم واصل الاہلال رفع الصوت وکانوا اذا ذبحوا الالہتم
یرفعون اصواتہم بذکرہا ویقولون باسم اللات ولاعزی فجرى
ذلک من امرہم حتی قیل لکل ذابح وان لم یجہر بالتسمیة مہل

جس جانور پر ذبح کے وقت بتوں کا نام پکارا جائے وہ حرام ہے اہلال اصل میں مطلقاً آواز بلند کرنے کو کہتے ہیں کفار جب کسی جانور کو ذبح کرتے تو بلند آواز سے باسم اللات والعزی کہتے پھر ہر ذبح کرنے والے کو ”مہل“ کہا جانا لگے خواہ وہ آواز بلند نہ کرے۔
(روح البیان)

” وَمَا أَهْلٌ بِهِ لغيرِ اللَّهِ ای رفع به الصوت عند ذبح للصنم “

﴿ وَمَا أَهْلٌ بِهِ لغيرِ اللَّهِ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ ذبح کرتے وقت جب بت کا نام لیا جائے تو وہ جانور حرام ہوگا۔ (ابوالسعود) ”ای ذبح علی اسم غیرہ“ یعنی غیر کا نام لے کر ذبح کر دیا جائے۔
(حلالیں)

﴿ وَمَا أَهْلٌ بِهِ لغيرِ اللَّهِ ﴾ ای ما ذبح للاصنام والطواغیت واصل
الاہلال رفع الصوت وکانوا اذا ذبحوا لالہتم یرفعون اصواتہم
بذکرہا فجرى ذلک من امرہم حتی قیل لکل ذابح وان لم یجہر
بالتسمیة مہل وقال الربیع بن انس وغیرہ ﴿ وَمَا أَهْلٌ بِهِ لغيرِ اللَّهِ ﴾ قال
ذکر اسم غیر اللہ ﴿

(معالم التنزیل)

اسی عبارت کا ترجمہ مظہری اور درمنثور کی عبارات کا ہے اس لئے تکرار کی ضرورت نہیں۔

مذکورہ بالا بحث سے حاصل ہوا :

ابھی تک تفاسیر کی عبارات جو نقل کی ہیں ان سے دو باتیں واضح طور پر سمجھ آئیں ایک یہ کہ تقریباً جمہور مفسرین کرام کا مذہب یہ ہے کہ ﴿ وَمَا أَهْلٌ بِهِ لغيرِ اللَّهِ ﴾ کا مطلب یہی ہے کہ ذبح کے وقت اللہ کا نام لئے بغیر ذبح کئے جانے والا جانور حرام ہے۔ اور دوسری بات یہ سمجھ آئی کہ مراد اس سے کفار ہیں جو اپنے جانوروں کو ذبح کرتے وقت اپنے بتوں کا نام لیتے تھے۔

اور یہ بھی واضح ہوا کہ ”اہلال“ کا مطلب ذبح کے وقت نام لینا خواہ آہستہ آواز میں ہی کیوں نہ ہو۔

دوسری قسم جو حرام ہے: ذبح سے مقصد غیر خدا کا تقرب حاصل ہو یعنی غیر خدا کو خدا سمجھ کر اس کے لئے ذبح کیا جائے ذبح کو عبادت سمجھا جائے اور جس کے لئے ذبح کیا ہے اسے معبود سمجھا جائے تو یہ قطعی طور پر حرام ہے اگرچہ ذبح کے وقت اس پر اللہ تعالیٰ کا نام بھی لے لیا ہو۔ یہی وہ قسم ہے جس کو فقہاء نے ”الذبح لغيرِ اللَّهِ“ غیر اللہ کے لئے ذبح کرنا بیان کیا ہے۔ یا ”ما ذبح لتقرب غیرِ اللَّهِ“ سے تعبیر کرتے ہیں یعنی جس میں غیر اللہ کا تقرب حاصل کرنا اسے معبود سمجھنا مقصود ہو یہ حرام ہے۔

تیسری قسم جو حلال ہے: وہ یہ کہ ذبح اللہ تعالیٰ کا نام لے کر کیا رب تعالیٰ کو ہی معبود سمجھا لیکن اس ذبح میں گوشت غریبوں اور مسکینوں میں تقسیم کر کے کسی بزرگ کو ثواب پہنچانا مقصود ہو تو یہ جائز ہے۔

یعنی اس قسم میں ذبح سے مقصود جانور کی جان نکالنا اور خون گرانا نہیں بلکہ مطلوب گوشت ہے وہ گوشت اس وقت حاصل ہوگا جب جانور کو ذبح کیا جائے گا گویا کہ مقصد مطلوب ہوگا اور ذبح ذریعہ اور وسیلہ ہوگا۔ جیسا کہ گوشت بیچنا اور خریدنا مباح ہے گوشت کھانا مباح ہے گوشت کھانے یا بیچنے کے لئے جانور کو ذبح کیا اللہ تعالیٰ کا نام لے کر وہ جانور حلال ہے یہاں ذبح وسیلہ ہے مباح کام کا۔

اسی طرح جانور کے ذبح کرنے میں مقصد ولیمہ کرنا ہے تو یہ ذبح ذریعہ ہے سنت کے لئے کیونکہ ولیمہ مسنون ہے۔

اسی طرح جانور ذبح کیا مہمانوں کے لئے یا اپنے اقرباء کے ایصالِ ثواب کے لئے یا بزرگوں کے ایصالِ ثواب کے لئے تو یہ جانور ذبح کرنے میں مقصدِ ثواب حاصل کرنا ہے اس لئے یہ ذبح مستحب

کو حاصل کرنے کا ذریعہ ہے یہ تمام قسم کے ذبح کئے جانے والے جانور حلال ہیں۔

لطف کی بات یہ ہے کہ اگر کوئی جانور کسی ظالم کو بطور رشوت دینے کے ذبح کیا اور ذبح مسلمان نے اللہ کا نام لے کر کیا تو وہ جانور بھی حلال ہے حالانکہ یہ کام حرام ہے جس کے لئے ذبح کیا مقصد حاصل کرنا حرام ہے لیکن جانور کا ذبح کرنا حلال ہے۔

آخری دونوں قسموں پر دلائل: سب سے پہلے یہ دیکھنا ہوگا کہ ذبح کی کون سی شرط نہیں پائی گئی جس کی وجہ سے جانور حرام ہو گیا یا تمام شرائط پائی گئی ہیں کہ وہ حلال ہو گیا۔
ذبح کرنے کی چھ شرائط ہیں:

”والشرط ذکر الذابح اسمہ تعالیٰ المجرد علی الذبیحہ عند الذبح لله تعالیٰ“

یعنی ذبح کرنے کی شرط یہ ہے ذبح کرنے والا خالص اللہ تعالیٰ کا نام ذکر کرے ذبح پر جب کہ ذبح اللہ تعالیٰ کے لئے ہو اس مختصر عبارت میں چھ شرطیں پائی گئی ہیں۔

پہلی شرط: ”انما قلنا الذابح لانه لو سمي غير لا يحل كما في المحيط“ ذبح کرنے والا خود بسم اللہ پڑھے ذبح کرنے والا اور ہو بسم اللہ پڑھنے والا اور ہو تو وہ جانور حلال نہیں محیط میں ایسا ہی ذکر ہے یہ فائدہ عبارت مذکورہ میں لفظ ”الذابح“ سے حاصل ہوا۔

دوسری شرط: ”وانما قلنا اسمہ تعالیٰ لانه لو ذکر اسم غيره تعالیٰ لم يحل“

ذبح کرنے والا اللہ کا نام لے کر ذبح کرے تو وہ جانور حلال ہوگا اللہ تعالیٰ کے غیر کا نام لے تو وہ حلال نہیں ہوگا۔ یہ فائدہ عبارت مذکورہ میں ”اسمہ تعالیٰ“ سے حاصل ہوا۔

تیسری شرط: ”وانما قلنا المجرد لانه لو قال اللهم اغفر لي لم يجز لانه دعاء كما في الهداية“

ذبح کرنے والا فقط اللہ کا نام لے دعائیہ کلمات اس کے ساتھ شامل نہ کرے اسی لئے ذبح کرنے والے نے اگر ﴿اللَّهُمَّ اغْفِرْ لِي﴾ پڑھ کر جانور ذبح کیا تو وہ حلال نہیں ہوگا کیونکہ اس میں خالص اللہ تعالیٰ کا نام نہیں لیا گیا یہ مسئلہ حاصل ہوا ”المجرد“ سے۔

چوتھی شرط: ”وانما قلنا علی الذبیحہ لانه لو سمي عند الذبح لا فتاح عمل لم يحل“

جس جانور کو ذبح کرنا ہے اسی پر بسم اللہ پڑھے تو حلال ہوگا اگر کسی اور کام کو شروع کرنے کے لئے ”بسم اللہ“ پڑھی پھر دوبارہ بسم اللہ نہ پڑھی پہلی پر اکتفا کر لیا تو جانور حلال نہیں ہوگا۔ یہ مسئلہ حاصل ہوا ”علی الذبیحة“ کے الفاظ سے۔

پانچویں شرط: ”وانما قلنا عند الذبح لانه اذا فصل بينه وبين التسمية بعمل كثير لم يحل وقال الزعفرانی لوحد الشفرة لم يحل فلو سمي علی ذبیحة وذبح غیرها لم يحل“
ذبح کرتے وقت بسم اللہ پڑھے تو جانور حلال ہوگا اگر بسم اللہ پڑھ کر کوئی اور کام شروع کر لیا کچھ دیر بعد بغیر بسم اللہ پڑھنے کے جانور ذبح کر دیا تو وہ حلال نہیں ہوگا۔ زعفرانی رحمہ اللہ نے فرمایا بسم اللہ پڑھ کر چھری کو تیز کرنا شروع کر دیا پھر دوبارہ بسم اللہ نہ پڑھی تو جانور حلال نہیں ہوگا۔ اگر ایک جانور پر بسم اللہ پڑھی ذبح دوسرا کر دیا تو وہ حلال نہیں ہوگا۔ یہ شرط حاصل ہوئی ”عند الذبح“ کے الفاظ سے۔
تنبیہ: بسم اللہ پڑھنا جان بوجھ کر چھوڑ دیا تو جانور حرام ہوگا اگر بھول کر بسم اللہ رہ جائے تو جانور حلال ہوگا۔

چھٹی شرط: ”وانما قلنا لله تعالیٰ لانه لو سمي وذبح لقدام الامیر او غیره من العظماء لا يحل لانه ذبح تعظیما له لا لله تعالیٰ“

اگر جانور کو ذبح کیا امیر کے آنے کی وجہ سے یا کسی اور بڑے شخص کے آنے کی وجہ سے اس بڑے کا تقرب حاصل کرنا مقصود ہو اس کی عظمت مقصود ہو اور اللہ تعالیٰ کی عظمت مقصود نہ ہو تو وہ جانور حلال نہیں ہوگا یہ شرط حاصل ہوئی ”لله تعالیٰ“ کے الفاظ مبارکہ سے۔

غیر اللہ کے لئے ذبح کرنے کی حلت و حرمت کی دار و مدار چھٹی شرط پر ہے:

کسی بزرگ، کسی بڑے کے لئے ذبح کرنے میں مقصد اس کی تعظیم ہو اسے مقرب سمجھا جائے اسے معبود سمجھا جائے اللہ تعالیٰ کی تعظیم مقصود نہ ہو اور اللہ تعالیٰ کو مقرب نہ سمجھا جائے اور اللہ تعالیٰ کو معبود نہ سمجھا جائے تو وہ جانور یقینی طور پر حرام ہوگا بیشک اس پر اللہ کا نام ذبح کے وقت لے لیا گیا ہو۔ جب باقی تمام شرطیں بھی پائی جائیں اور اللہ تعالیٰ کو معبود سمجھ کر اسی کی تعظیم مقصود ہو کسی بڑے کا آنا صرف ذریعہ ہو

کسی بزرگ کا ایصال ثواب صرف ذریعہ ہو تو وہ جانور حلال ہوگا۔

غیر اللہ کیلئے بنیت تقرب ذبح کرنا حرام ہے:

”قال النیشاپوری تحت قوله تعالى ﴿ وَمَا أَهْلٌ بِهِ لغيرِ الله ﴾ قال العلماء لو ان مسلماً ذبح ذبیحة وقصد بذبحها التقرب الى غير الله صار مرتداً وذبیحته ذبیحة مرتد“

علامہ نیشاپوری رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں زیر بحث آیت کریمہ کی وضاحت میں لکھا ہے کہ اگر مسلمان کسی جانور کو ذبح کرے اور اس میں غیر اللہ کے تقرب کا ارادہ کرے تو وہ شخص مرتد ہو جائے گا اور جانور مرتد کا ذبح کیا ہوگا۔ نیشاپوری کی تفسیر میں ”وقصد بها بذبحها التقرب الى غير الله“ کے الفاظ کو غور سے پڑھیں پھر یہ انصاف سے فیصلہ کریں کہ علماء اہل سنت و جماعت (بریلوی مسلک) کا کیا یہی عقیدہ نہیں؟

غیر اللہ کے لئے ذبح بغیر ارادہ تقرب کے حلال ہے:

صاحب ہدایہ نے اس مسئلہ کو واضح کیا ہے اور شیخ احمد ملا جیون رحمہ اللہ نے تفسیرات احمدیہ میں بہت ہی واضح الفاظ سے اس مسئلہ کو حل کیا ہے۔ صاحب ہدایہ اور کفایہ کی وضاحت کے ساتھ ہی درمختار اور شامی کا اتفاق ہے:

”ویکفره ان يذكر مع اسم الله تعالى شيئاً غيره وان يقول عند الذبح اللهم تقبل من فلان“

ذبح کے وقت اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ کسی اور کا نام ملانا اور یہ کہنا اے اللہ یہ فلاں کی طرف سے قبول فرمایہ مکروہ ہے۔ اس عبارت کی وضاحت فرماتے ہوئے صاحب ہدایہ تحریر فرماتے ہیں:

”وهذه ثلاث مسائل احداها ان يذكر موصولا لا معطوفا فيكفره ولا تحرم الذبيحة وهو المرد بما قال ونظيره ان يقول باسم الله محمد رسول الله لان الشراكة لم توجد فلم يكن الذبح واقعاً له الا انه يكره لوجود القرآن صورة فيتصور بصورة المحرم“ (هداية)

یہاں تین مسائل ہیں ایک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ ذبح کے وقت غیر کا نام متصل طور پر ذکر کرے درمیان میں واؤ عاطفہ ذکر نہ ہو تو وہ جانور مکروہ ہوگا حرام نہیں متن کی عبارت میں یہی مسئلہ معتبر ہے اس کی مثال یہ ہے کہ جب ذبح کرنے والا ذکر کرے ”باسم اللہ محمد رسول اللہ“ اس میں لفظ ”محمد رسول اللہ“ لفظ ”اللہ“ کے ساتھ حکم میں شریک نہیں اس لئے ذبح میں رسول اللہ ﷺ کا تقرب نہیں پایا گیا لہذا یہ جانور حرام نہیں ہوگا البتہ مکروہ اس لئے ہے کہ دونوں نام ملا کر اکٹھے ذکر کر دیئے گئے جو بظاہر حرام نظر آتا ہے حالانکہ حرام نہیں۔

یہ بھی خیال رہے کہ امام الترمذی رحمہ اللہ نے ذکر فرمایا کہ اللہ کا ذکر اور رسول اللہ ﷺ کا ذکر بغیر واؤ عاطفہ کے چند وجہ پر ہیں:

”اما ان يكون بنصب محمدا او بحفضه او برفعه وفي كلها يحل لان اسم الرسول غير مذكور على سبيل العطف فيكون مبتدئا لكن يكره لوجود الوصل صورة“
(کفایہ)

یا تو لفظ محمد پر نصب (زبر) ہوگی یا جر (زیر) ہوگی اور یا رفع (پیش) ہوگا ان تمام صورتوں میں جانور حلال ہوگا کیونکہ ”محمد رسول اللہ“ کا ما قبل سے کوئی تعلق نہیں بلکہ یہ جملہ علیحدہ ہے ہاں البتہ مکروہ ہے کیونکہ بظاہر لفظ ”اللہ“ اور لفظ محمد ملے ہوئے ہیں۔

”والثانية ان يذكر موصولا على وجه العطف والشركة بان يقول باسم الله واسم فلان او يقول باسم الله وفلان او باسم الله ومحمد رسول الله بكسر الدال فتحرم الذبيحة لانه اهل به لغير الله“ (ہدایہ)

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ ذبح کرنے والے نے ذبح کے وقت ”باسم اللہ واسم فلان“ پڑھا۔ یا بغیر لفظ اسم کے ”باسم اللہ وفلان“ پڑھا۔ یا ”بسم اللہ ومحمد رسول اللہ“ لفظ محمد کے نیچے کسرہ (زیر) سے پڑھا۔ ان صورتوں میں جانور حرام ہوگا کیونکہ اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ غیر کو عطف کے ساتھ شریک کر دیا گیا لہذا اس جانور کو اللہ کے غیر کے نام کے ساتھ ذبح کر دیا گیا۔

لیکن اسی صورت میں یعنی ”بسم اللہ ومحمد رسول اللہ“ میں لفظ محمد پر پیش پڑھا تو وہ

جانور حلال ہوگا۔ کیونکہ یہ ابتدائی کلام بن گئی اور اگر نصب (زبر) سے پڑھے تو اگرچہ اس میں اختلاف ہے (لیکن صحیح یہی ہے کہ جانور حرام نہیں ہوگا کیونکہ اس صورت میں بھی ماقبل سے رابطہ نہیں ہوگا)۔

(کفایہ)

”والثالثة ان يقول مفصولا عنه صورة ومعنى بان يقول قبل التسمية وقبل ان يذبح الذبيحة او بعده وهذا لا بأس به لما روى عن النبي ﷺ انه قال بعد الذبح اللهم تقبل هذه عن امة محمد ممن شهد لك ولي بالبلاغ“

تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ جانور کو لٹانے اور بسم اللہ پڑھنے سے پہلے یا ذبح کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ کے ذکر سے جدا طور پر اللہ کے غیر کا ذکر کرے (اے اللہ فلاں کے ایصال ثواب کے لئے قبول فرما) تو اس میں کوئی حرج نہیں یعنی یہ مکروہ نہیں۔ اس لئے کہ نبی کریم ﷺ نے جانور کو ذبح کرنے کے بعد رب تعالیٰ کے حضور عرض کیا:

”اللهم تقبل هذه عن امة محمد (ﷺ) ممن شهد لك بالوحدانية
ولي بالبلاغ“

اے اللہ یہ امت محمد (ﷺ) کی طرف سے قبول فرما یعنی ان لوگوں کی طرف سے جنہوں نے تیری وحدانیت کی شہادت دی اور میرے حق میں یہ شہادت دی کہ میں نے تیرا پیغام پہنچا دیا ہے (ہدایہ) شامی نے درمختار کے الفاظ ”لا باس“ (جیسا کہ ہدایہ میں بھی ہیں) کی وضاحت ”لا یکرہ“ سے کی ہے ہدایہ اور کفایہ سے جو بحث ذکر کی ہے وہ تمام درمختار اور شامی میں بھی دیکھی جاسکتی ہے۔

شیخ احمد ملا جیون رحمہ اللہ کی وضاحت:

ہدایہ کی بحث جو ذکر کی ہے اسی کو مختصر طور پر ملا جیون رحمہ اللہ نے ذکر کرنے کے بعد خلاصہ اور نچوڑ ایسے خوبصورت اور واضح الفاظ سے بیان کر دیا جس سے طعنہ زنوں کی اور زبان دراز لوگوں کی زبانیں گنگ ہو گئیں۔ آپ فرماتے ہیں:

ومن ههنا علم ان البقرة المنذورة للاولياء كما هو الرسم في زماننا
حلال طيب لانه لم يذكر اسم غير الله عليها وقت الذبح وان كانوا
بندور نهاله“

یہاں سے پتہ چل گیا کہ بیشک گائے (وغیرہ) جس کی اولیاء کرام کے لئے نذرمانی جائے جیسا کہ ہمارے زمانہ میں یہ رسم پائی جاتی ہے وہ حلال اور طیب (پاکیزہ) ہے کیونکہ اس پر ذبح کے وقت اللہ کے غیر کا نام نہیں لیا جاتا ہے اگرچہ اولیاء کرام کے لئے اس کی نذرمانی لی جاتی ہے۔ (تفسیرات احمدیہ)

یہ یاد رہنا چاہئے کہ یہ نذر اللہ تعالیٰ کے محبوب بندوں کے ایصالِ ثواب کے معنی میں ہے اسے نذر و نیاز کہا جاتا ہے تقرب حاصل کرنے کے لئے معبود سمجھ کر نذر صرف رب تعالیٰ کے لئے ہی ہوتی ہے۔

(راقم)

بہت خوب فیصلہ: ”ذبح لقدم الامیر ونحوہ کو احد من العظماء یحرم لانه اهل به لغيره الله ولو (وصلیة) ذکر اسم الله تعالیٰ“ (درمختار کتاب الذبح)

اگر کوئی شخص حاکم یا کسی بڑے شخص کے آنے کی وجہ سے ذبح کرے تو وہ جانور حرام ہو جائے گا کیونکہ اس پر اللہ کے غیر کا نام پیش کر دیا گیا ہے یہ جانور اگرچہ اللہ کے نام پر ہی کیوں نہ ذبح کر دیا گیا ہو۔

”ولو ذبح للضيف لا یحرم لانه سنة الخلیل واکرام الضیف اکرام الله تعالیٰ“ (درمختار)

اور اگر مہمان کے لئے ذبح کیا جائے تو وہ جانور حرام نہیں ہوگا کیونکہ وہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کی سنت ہے مہمان کا اکرام اللہ تعالیٰ کا اکرام ہے:

”قوله لا یحرم، قال ابن رازی ومن ظن انه لا یحل لانه ذبح لا کرام ابن آدم فیکون اهل به لغير الله تعالیٰ فقد خالف القرآن والحديث والعقل فانه لا ريب ان القصاب یدبح للربح ولو علم انه نجس لا یدبح فیلزم هذا الجاهل ان لا یاکل ما ذبحه القصاب وما ذبح للولائم والاعراس والعقیقة“ (شامی)

جو جانور مہمان کے لئے ذبح کیا جائے وہ حرام نہیں ہوتا اس پر علامہ شامی رحمہ اللہ علیہ نے بزاز یہ کے حوالہ سے تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر کوئی شخص یہ سمجھے کہ مہمان کی تکریم (عزت) کے لئے جو جانور ذبح کیا گیا وہ حرام ہے کیونکہ اس میں آدمی کی عزت کی گئی یہ ﴿مَا أَهْلٌ بِهِ لغيرِ اللَّهِ﴾ میں آ گیا تو وہ شخص قرآن پاک اور حدیث پاک کا مخالف ہے اور یہ عقل کے بھی خلاف ہے۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ قصاب نفع حاصل کرنے کے لئے جانور ذبح کرتا ہے اگر اسے معلوم ہو کہ یہ جانور نجس

ہے تو وہ ذبح نہیں کرتا۔

اس سے تو یہ لازم آئے گا کہ جاہل انسان وہ جانور بھی نہ کھائے جسے قصاب نے ذبح کیا ہے اور ولیمہ کے لئے اور شادی کے لئے اور عقیقہ کے لئے ذبح کئے جانور بھی نہ کھائے ان کو بھی حرام سمجھے۔

(شامی)

کیونکہ ان جانوروں کے ذبح کرنے میں بھی انسانوں کی عزت پائی گئی ہے۔ (رازم)
وجہ فرق: کسی حاکم کے آنے کی تعظیم کے لئے ذبح کیا ہوا جانور حرام ہو جائے اور مہمان کے آنے پر ذبح کیا جانے والا حلال ہو اس میں فرق کیا ہے؟

”والفارق انه قدمها لياكل منها كان الذبح لله والمنفعة للضيف او

للوليمة او للربح وان لم يقدمها لياكل منها بل يدفعها لغيره كان

لتعظيم غير الله فتحرم“

فرق یہ ہے کہ غیر اللہ کے لئے ذبح کئے ہوئے جانور سے خود بھی کھالے اپنے آپ پر حرام نہ کرے تو یہ جانور حلال ہوگا کیونکہ اس کو ذبح اللہ تعالیٰ کے لئے کیا گیا تھا البتہ نفع مہمان نے بھی حاصل کر لیا۔ اور اگر غیر اللہ کے لئے ذبح کئے ہوئے جانور سے خود نہ کھائے بلکہ غیر کو دے دے تو وہ حرام ہوگا اس لئے کہ اس میں غیر کی تعظیم پائی گئی۔

(درمختار)

شامی رحمہ اللہ کی مزید وضاحت:

”قوله والفارق (ای بین ما اهل به لغير الله بسبب تعظيم المخلوق

وبین غیرہ وعلی هذا فالذبح عند وضع الجدار او عروض مرض

او شفا منه لا شك فی حله لان القصد منه التصديق حموی ومثله

النذر بقربان معلقا بسلامته من بحر فيلزمه التصديق به علی الفقهاء

فقط كما فی فتاوی الشلبی“

اگر کوئی شخص دیوار بناتے وقت دیوار پر شہتیر رکھتے ہوئے مرض کے لاحق ہونے پر مرض سے شفا حاصل ہونے پر جانور ذبح کرے وہ حلال ہے اس میں کسی قسم کا کوئی شک نہیں اس میں اس کا ارادہ

صدقہ کرنا ہے یہ نفلی صدقہ ہے اس سے خود بھی کھا سکتا ہے بلکہ خود بھی کھالے تاکہ غیر اللہ کی تعظیم کا وہم نہ پایا جائے۔ (حموی) اگر نذر مانے کہ مجھے اس مرض سے سلامتی حاصل ہوگئی یا اس سفر سے میں سلامتی سے لوٹ آیا تو یہ نذر واجب ہے اس واجب نذر کا حکم یہ ہے کہ یہ گوشت صرف فقراء پر صدقہ کرے خود بھی نہ کھائے اور غنی لوگوں کو بھی نہ کھلائے صدقہ واجبہ کا یہی حکم ہے "البحر الرائق و جلیبی"

(ماخوذ از شامی)

وجہ فرق پر شامی رحمہ اللہ کا وضاحتی قول: اگر غیر اللہ کے لئے ذبح کئے ہوئے جانور میں غیر کی تعظیم بطور تقرب مقصود تھی تو وہ جانور حرام ہوگا اگر صرف مہمان سمجھ کر عزت کرنا مقصود تھا تو حلال ہوگا۔ ذبح کرنے والے کا اپنا کھانا اور نہ کھانا مقصود نہیں۔ صرف وہ اپنے آپ پر حرام کرتا ہے یا نہیں۔ (ماخوذ از شامی) شامی کی عبارت یہ ہے:

"(قوله) وان لم يقدمها لياكل منها (هذا مناط الفرق لا مجرد دفعها لغيره ای یغیر من ذبح لا جله او غیر الذابح فان الذابح قد یترک کھا او یاخذھا کلھا او بعضھا فافهم واعلم ان المدار علی القصد عند ابتداء الذبح فلا یلزم انه لو قدم للضيف غیرھا ان لا تحل لانه حين الذبح لم یقصد تعظیمه بل اکرامه بالا کل منها وان قدم الیه غیرھا ویظهر ذلک ایضا فیما لو ضافه امیر فذبح عند قدمه فان قصد التعظیم لا تحل وان اضافه بها وان قصد الاکرام تحل وان اطعمه غیرھا تأمل"

(شامی)

غیر اللہ کے تقرب کا مطلب: ماتن یعنی صاحب تنویر الابصار کے عبارت میں لفظ "یحرم" پر بحث کرتے ہوئے مومن کی شان کو بیان فرمایا اور اس پر شامی نے مزید وضاحت کی جس سے لفظ تقرب کا معنی بھی سمجھ آ گیا اور مسئلہ بھی نکھر کر واضح ہو گیا:

"وهل يكفر قولان بزازيه وشرح وهبانيه ، قلت وفي صيد المنية انه يكره ولا يكفر لانا لا نسئ الظن بالمسلم انه يتقرب الى الآدمي بهذا النحر ونحوه في شرح الوهبانية عن الذخيرة ونظمه فقال وفاعله جمهورهم قال كافر وفضلي اسمعيلي ليس يكفر" (درمختار)

کیا غیر اللہ کے لئے ذبح کرنے والا کافر ہوگا اس میں دو قول ہیں۔ بعض نے کہا کافر ہوگا بعض نے کہا نہیں۔ (بزازہ، شرح وہابیہ) اور صید المنیۃ میں ہے کہ بیشک فقط مکروہ ہے اور وہ شخص کافر نہیں ہوگا بیشک ہم کسی مسلمان پر بدگمانی نہیں کرتے کہ وہ اس ذبح میں کسی آدمی کا تقرب حاصل کر رہا ہے، السحر الفائق وشرح وہابیہ عن الذخیرۃ) اور نظم میں کہا گیا ہے جمہور حضرات نے کافر کہا ہے لیکن صحیح یہ ہے کہ فضلی یعنی اسماعیلی جو عظیم فقیہ ہیں انہوں نے بھی کہا ہے کافر نہیں ہوگا۔

علامہ شامی کی وضاحت: ” (هل یکفر) ای فیما بینہ و بین اللہ تعالیٰ اذلا یفتی بکفر مسلم امکن حمل کلامہ او فعلہ علی محمل حسن او کان فی کفرہ خلاف “

متن کی عبارت ﴿هل یکفر﴾ کو جو سوالیہ طور پر پیش کیا گیا ہے کہ غور یہ کرنا ہے کہ غیر اللہ کے لئے ذبح کرنے والا کیا اپنے اور اپنے اللہ کے درمیان جو رابطہ اور تعلق ہے اسے توڑ کر کافر ہو گیا ہے؟ پھر فرماتے ہیں نہیں نہیں۔ کسی مسلمان کے قول اور فعل کو جب تک اچھے معانی اور مقاصد پر استعمال کرنے کا احتمال موجود ہو تو اس کے کافر ہونے کا فتویٰ جاری نہیں کیا جاسکتا۔

اسی طرح اگر کسی کے کافر ہونے میں اہل علم کا اختلاف ہو تو اس کے کافر ہونے کا فتویٰ بھی جاری نہیں کیا جاسکتا:

” (انه يتقرب الى الآدمی) ای علی وجه العبادۃ لانه المكفر وهذا بعيد من حال المسلم فالظاهر انه قصد الدنيا او القبول عنده باظهار المحبة بذبح فداء عنه لكن لما كان فی ذلك تعظیم له لم تكن التسمية مجردة لله تعالى حکما کما لو قال بسم الله واسم فلان حرمت ولا ملازمة بین الحرمة والكفر کما قد مناه عن المقدسی فافهم “

متن کی عبارت میں جو یہ کہا گیا ہے کہ غیر اللہ کے لئے ذبح کرنا مکروہ ہے فقط کیونکہ ہم کسی مسلمان کے متعلق بدگمانی نہیں کر سکتے وہ اس میں کسی آدمی کا تقرب حاصل کر رہا ہے۔ شامی رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے کہ ” (انه يتقرب الى الآدمی) “ کا مطلب ہے یہ ہے کہ وہ کسی انسان کو معبود سمجھے اور کسی انسان کے لئے کئے ہوئے کام کو عبادت سمجھے یہ مسلمان کے حال سے دور ہے۔ ظاہر یہی ہے کہ وہ

کسی حاکم کے لئے ذبح کر رہا ہے تو اس میں اس کے دنیاوی مقاصد ہیں یا وہ یہ چاہتا کہ اس ظاہری محبت کی وجہ سے میں اس کا مقبول ہو جاؤں کہ میں اس کے لئے ذبح کر کے اس پر فدا ہوں۔ ہاں اگر ذبح کر کے اتنی تعظیم کرے کہ گوشت بچ بھی جائے پھر بھی خود نہ کھائے کہ یہ بادشاہ صاحب کے لئے ذبح کیا گیا تھا اور ان کے لئے ہی پکا یا گیا تھا مجھ پر تو یہ کھانا حرام ہے تو اس شخص کے متعلق حرمت کا قول کیا جاسکے گا کہ اس نے اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ گویا کہ غیروں کو ملا لیا ہے لیکن پھر بھی کافر نہیں کہا جاسکتا۔ (شامی) لیکن یہ بھی خیال رہے کہ حرام بمعنی مکروہ لینا صاحب درمختار کا مختار قول ہے اور یہی صید المندیہ میں مذکور ہے۔

خلاصہ کلام: اللہ تعالیٰ کا نام ذبح کے وقت نہ لیا جائے بلکہ کسی اور کا نام لیا جائے تو وہ جانور حرام ہے اور ایسا کرنے والا کافر ہے۔

اور ذبح اللہ تعالیٰ کے نام سے کیا لیکن غیر کے لئے کیا اسے معبود سمجھا تو پھر بھی یہ شخص مرتد ہے اور وہ جانور حرام ہے۔

اگر غیر کی تعظیم کا گمان ہے اور ذبح کے وقت ”بسم اللہ“ کے ساتھ ”اللہم تقبل من فلان“ ملا لیا تو یہ مکروہ ہے۔

ذبح سے پہلے ہو یا بعد میں ”اللہم تقبل من فلان“ کہے تو یہ جائز ہے نہ مکروہ نہ حرام اور نہ ہی کفر ہے یہ ہے مکمل مسئلہ۔

اور یہی تمام صورتیں بکرا پالنے میں بھی ہوں گی ویسے ہی مسلمانوں کو کافر اور مشرک بنانا سوائے جہالت اور حماقت کے اور کچھ نہیں۔

علم معانی کا ضابطہ: فعل یا شبہ فعل کی نسبت ماہولہ کی طرف ہو تو حقیقۃً عقلیہ اور اگر نسبت غیر ماہولہ کی طرف ہو تو مجاز عقلی ہے۔ کافر جب کہے ”انبت الربیع البقل“ (موسم بہار نے سبزہ اگایا) تو یہ کلام حقیقۃً عقلیہ ہے کیونکہ کافر موسم بہار کو موثر حقیقی مانتا ہے اس کا رب تعالیٰ پر ایمان نہیں اس کا یہ کلام کافرانہ ہے۔

اگر یہی کلام مومن کرے تو اس کا یہ کلام مجاز عقلی ہے اس میں کوئی کفر نہیں کیونکہ وہ موسم بہار کو

موثر حقیقی نہیں مانتا اس کے نزدیک اللہ تعالیٰ موثر حقیقی ہے موسم بہار صرف سبب ہے۔ (از مختصر المعانی)
اہل علم سے انصاف کی توقع: خدا را انصاف سے کام لیتے ہوئے یہ تو بتاؤ کہ کون سا وہ
مسلمان ہے جو کسی نبی یا ولی کو خدا مانتا ہے ان کو خالق مانتا ہے ان کو حقیقی کارساز مانتا ہے؟
جب مسلمان نبی کو اللہ کا نبی مانتے ہیں، ولی کو اللہ کا ولی مانتا ہے، تو مسلمانوں کو کافر اور مشرک
بنا کر کون سا دین کا کام کیا جا رہا ہے۔

وَمَا أَهْلٌ بِهِ لغيرِ اللَّهِ میں سب سے پہلا اختلاف: سب سے پہلے شاہ عبدالعزیز محدث
دیوبی تفسیر عزیزی میں اس مقام پر پھسلے ہیں لطف کی بات یہ ہے کہ آپ کے فتاویٰ عزیزی میں یہ مسئلہ
اس طرح لکھا گیا ہے جیسا کہ اہل سنت و جماعت کا عقیدہ ہے۔ تفسیر عزیزی میں آپ نے جمہور کی
مخالفت کی ہے آپ اس میں بالکل اکیلے ہیں آپ کے دلائل کے جوابات سید الاولیاء حضرت مہر علی شاہ
رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ”اعلاء کلمۃ اللہ فی بیان وما اهل به لغير الله“ میں کامل طور پر بیان
فرمائے ہیں۔

آپ کا انداز بیان کچھ مشکل ہوتا ہے اس لئے راقم نے اسے آسان انداز میں پیش کر دیا ہے شاہ
عبدالعزیز صاحب کے دلائل یا قبلہ سید الاولیاء حضرت پیر مہر علی شاہ گوڑوی رحمہ اللہ کے جوابات کو ذکر نہیں
کیا۔ تاہم زیادہ بحث حضرت پیر صاحب کی کتاب سے ہی لی ہے۔ البتہ اس کی ابتداء اور انتہاء میں راقم
کی اپنی طرف سے بھی بحث شامل ہے۔

مسئلہ کافی حد تک واضح کر دیا گیا ہے جو طلباء اور عوام کے لئے کافی ہے البتہ علماء کرام اپنے علمی
ذوق کو پورا کرنے کے لئے حضرت کی کتاب کا مطالعہ کریں۔ شاہ صاحب کی تفسیر عزیزی کی مکمل بحث
اور فتاویٰ عزیزیہ کا مکمل فتویٰ اور مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی رحمہ نے شاہ عبدالعزیز صاحب کا جو رد کیا ہے وہ
رسالہ بھی حضرت کی کتاب میں شامل ہے۔

نوٹ: اگرچہ بعض حضرات نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ تفسیر عزیزی میں یہ بحث شاہ صاحب کی اپنی نہیں
ورنہ آپ اپنے ہی فتویٰ کے مخالف تحریر نہ کرتے بلکہ یہ بحث کسی اور نے شامل کی ہے۔ عقل سے یہ بھی

کوئی بعید نہیں لیکن انسان سے خطا واقع ہونا کوئی امر بعید نہیں شاہ ولی اللہ صاحب کی نسخ کے متعلق بحث کی مخالفت مفتی محمد شفیع صاحب نے بھی معارف القرآن میں کی ہے راقم بھی الفوز الکبیر کا قائل نہیں۔

فَمَنْ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ :

اور جو مجبور ہو جائے تجاوز نہ کرے اور حد سے نہ بڑھے تو نہیں گناہ اس پر بیشک اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے یعنی جو شخص بھوک کی وجہ سے مجبور اور لاچار ہو جائے ہلاکت کا خطرہ ہو تو وہ یہی حرام چیزوں میں سے اپنی زندگی بچانے کے لئے کچھ کھالے تو اس کے لئے جائز ہے البتہ تجاوز نہ کرے اور حد سے نہ بڑھے بیشک اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

فَمَنْ اضْطُرَّ : اضطرار کی دو صورتیں ہیں ان دونوں صورتوں میں ان حرام اشیاء سے تھوڑی مقدار میں کھانا ناجائز ہے ”احدهما الجوع الشديد مع عدم وجدان ما كول حلال يسد رمقه“ ان میں سے ایک یہ ہے کہ بہت ہی شدید بھوک ہو ہلاکت کا خطرہ ہو کوئی حلال چیز کھانے کی ملی نہیں تو ایسی صورت میں وہ اتنی مقدار میں حرام چیز کو کھالے جس سے اپنے آپ کو بھوک کی ہلاکت سے بچالے۔
”وثانيهما الاكراه على تناوله“ اور ان میں دوسری صورت یہ ہے کہ حرام چیز کے کھانے پر کوئی شخص اس طرح مجبور کر رہا ہے کہ وہ جابر اور ظالم ہے یہ کہہ رہا ہے کہ اگر تم یہ حرام چیز نہیں کھاؤ گے تو میں تمہیں قتل کر دوں گا یا میں تمہارا کوئی عضو کاٹ دوں گا اس صورت میں بھی تھوڑی مقدار میں حرام چیز کھا کر اپنے آپ کو بچالینا ضروری ہے ہاں اگر کوئی شخص دھمکی دے کہ اگر تم حرام چیز نہیں کھاؤ گے تو میں تمہیں بہت ماروں گا۔ یا یہ کہے کہ اگر تم یہ حرام چیز نہیں کھاؤ گے تو میں تمہیں قید کر لوں گا ان صورتوں میں حرام چیز کا کھانا ناجائز نہیں۔
(از شیخ زادہ)

غَيْرَ بَاغٍ : ”تجاوز نہ کرے“ یعنی اگر کوئی دوسرا شخص بھی بھوک کی وجہ سے ہلاکت کے قریب ہو اور حرام چیز بھی بہت زیادہ نہیں تو اکیلے ہی وہ حرام چیز کھا کر دوسرے پر تجاوز نہ کرے بلکہ کچھ حصہ خود کھائے اور کچھ حصہ دوسرے کو دے تاکہ دونوں ہی ہلاکت سے بچ جائیں۔

”بَاغٍ“ اصل میں ”باغی“ ہے یا، پر ضمه ثقیل ہوئے کی وجہ سے حذف کر دیا گیا پھر یا، اور نون

توین دوساکن جمع ہو گئے یا کو بھی حذف کر (گرا) دیا گیا۔

”غیر باغ“ فی اکلہ فوق حاجتہ“ حاجت سے زائد کھانے میں حد سے تجاوز نہ کرے۔ یہ معنی قتادہ اور حسن اور ربیع اور ابن زید اور عکرمہ رحمہم اللہ نے بیان کیا ہے اور راقم نے بھی یہی ترجمہ کیا ہے۔ (از قرطبی)

﴿غَيْرَ بَاغٍ﴾ حال ای اکل غیر باغ للذة وشهوة“ اور لذت اور خواہش سے کھا کر تجاوز نہ کرے (مظہری) یہ ترجمہ سدی رحمہ اللہ نے کیا ہے (قرطبی) اور یہی ترجمہ اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ہے (اور نہ یوں کہ خواہش سے کھائے)

وَلَا عَادٍ : ”اور نہ حد سے بڑھے“ یعنی صرف بھوک کو بند کرنے کے لئے کھائے اس سے آگے نہ بڑھے ایسا نہ ہو کہ سیر ہو کر کھائے۔ ”عاد“ اصل میں ”عائد“ ہے جس کا معنی ہے لوٹنا۔ یعنی بار بار لوٹ لوٹ کر نہ کھائے مراد یہی ہے کہ سیر ہو کر نہ کھائے کیونکہ اس میں حد سے بڑھنا لازم آئے گا۔ ”عائد“ میں اس طرح قلب پایا گیا ہے جس طرح ”شاک“ میں پایا گیا ہے کیونکہ یہ بھی اصل میں ”شاک“ تھا ”شاکی السلاح“ یہی لفظ ہے۔

فَلَا اِثْمَ عَلَيْهِ : ”تو اس پر کوئی گناہ نہیں“

یعنی جتنی مقدار میں اللہ تعالیٰ نے اجازت دی ہے اتنی مقدار میں کھانے میں کوئی گناہ نہیں۔

اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ : ”بیشک اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے“ یعنی اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کی خود ہی رخصت دی ہے ان میں اس کی طرف سے کوئی پکڑ نہیں ہوئی کیونکہ وہ بخشنے والا ہے اور اس نے اپنی رحمت کی وجہ سے ہی رخصت دی ہے۔ (قرطبی)

تنبیہ : امام شافعی رحمہ اللہ نے ﴿غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ﴾ کا یہ معنی بھی کیا ہے۔ ﴿غَيْرَ بَاغٍ﴾ علی المسلمین ﴿وَلَا عَادٍ﴾ علیہم ”مسلمانوں پر تجاوز نہ کرے اور مسلمانوں پر حد سے نہ بڑھے یعنی باغی (بادشاہ حق کے خلاف ہتھیار اٹھانے والا) ڈاکو، چور اور اپنے قریبی رشتہ داروں سے قطع تعلقی کی غرض سے سفر کرنے والا۔ یہ تمام لوگ بھوک کی وجہ سے مر بھی رہیں ہوں تو یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کے مستحق نہیں۔ ان کے لئے حرام کو حلال نہیں کیا گیا خواہ وہ حالت اضطرار میں ہی کیوں نہ ہوں۔ لیکن امام شافعی رحمہ اللہ کا مذہب ہے امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک دنیا میں رب تعالیٰ کی رحمت سے

مجرم بھی فائدہ اٹھا رہے ہیں البتہ قیامت میں کافر رب تعالیٰ کی رحمت سے محروم ہوں گے اور مومن گنہگار اللہ تعالیٰ کی مشیت میں ہوں گے رب تعالیٰ چاہے تو معاف فرمادے اور چاہے تو پکڑ فرمائے۔ اس لئے امام ابوحنفیہ رحمہ اللہ کے نزدیک عاصی اور مطیع دونوں ہی اضطرار کی حالت میں حرام چیزوں کو کھا کر اپنی زندگی بچا سکتے ہیں ان کے لئے جائز ہے۔

مسئلہ : بھوک کی وجہ سے مجبور صرف اتنی مقدار میں کھا سکتا ہے جس سے اس کی جان بچ جائے اس سے زائد مقدار میں اس کے لئے جائز نہیں۔ (الجصاص)

مسئلہ : جس شخص کو قتل یا عضو کے کاٹنے کی دھمکی دی گئی وہ صرف اسی وقت حرام چیز کو استعمال کر سکتا ہے۔ جب تک وہ خطرہ موجود ہے اگر دھمکی دینے والے ظالم نے اپنی دھمکی کو چھوڑ دیا تو اس کے لئے کھانا جائز نہیں۔ (الجصاص)

یاد رکھنے کے قابل : جب کوئی شخص اضطرار کی حالت میں ہو تو اس کے لئے حرام چیز کو حلال کر دیا جاتا ہے جب وہ چیز حرام ہی نہیں تو اس کے لئے واجب ہے کہ وہ چیز کھا کر اپنی جان بچائے۔ اگر نہیں کھائے گا اور بھوک کی شدت کی وجہ سے مر گیا تو گنہگار ہوگا۔ رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی :

﴿وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ إِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ إِلَيْهِ﴾

”حرام کو ذکر کرنے کے بعد اضطرار کی حالت کو اس حکم سے علیحدہ کر دیا گیا“

”فبقی علی الاصل مباحا والمباح واجب اكله عند خوف الهلاك“

اس لئے اصل میں یہ حرام چیز ہلاکت کے خطرے کے وقت حلال ہو گئی حرام رہی ہی نہیں اس لئے ہلاکت کے خوف کے وقت حلال چیز کا استعمال کرنا واجب ہو جاتا ہے۔ (از مظہری)

تنبیہ : اگر بھوک کی شدت کی وجہ سے مجبور شخص کو مذکورہ تمام چیزیں مل جائیں تو کون سی چیز کھا کر اپنی بھوک کو زائل کرے؟ ”وہذا هو الالبق بظاہر هذه الآية“ اس آیت کریمہ کے ظاہر سے یہی قول زیادہ مناسب نظر آتا ہے تاہم بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ جہاں تک ہو سکے خنزیر کو استعمال نہ کرے بلکہ دوسرے مردار کا گوشت کھالے۔ (از کبیر)

اگرچہ علامہ رازی رحمہ اللہ نے پہلے قول کو ترجیح دی ہے تاہم راقم کو بھی یہ دوسرا قول زیادہ پسند

آیا۔ تاہم یوں کہا جاسکتا ہے تحقیق کے لحاظ سے پہلا قول زیادہ رائج ہے مومن کو خنزیر سے نفرت کے لحاظ پر دوسرا قول زیادہ پسند نظر آتا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب (راقم) حالت اضطرار میں شراب کا حکم:

جس طرح حرام ہونے کا حکم ان چار چیزوں میں بند نہیں اسی طرح مجبور ہونے کی حالت میں حلال ہونا بھی ان چار چیزوں میں بند نہیں بلکہ ہر حرام چیز ہلاکت سے بچانے کے لئے حلال ہو جائے گی۔ اس لئے جان بچانے کی حد تک شراب بھی حلال ہوگا۔ اسی طرح اگر گلے میں لقمہ پھنس جائے کوئی حلال چیز پینے والی نہیں سوائے شراب کے تو لقمہ کو گلے میں نیچے اتارنے کے لئے شراب کا اتنی مقدار میں استعمال جائز ہوگا جس سے وہ لقمہ نیچے اتر جائے تاکہ ہلاکت سے بچ سکے۔

”فان الله تعالىٰ انما اباح هذه المحرمات ابقاء للنفس ودفعاً للهلاك عنها فكذلك في هذه الصورة وهذا هو اقرب الى الظاهر“

جب اللہ تعالیٰ نے انسان کو ہلاکت سے بچانے کے لئے ان چار حرام چیزوں کو حلال قرار دے دیا تو شراب کا بھی یہی حکم ہے کہ اس کا استعمال کرنا جائز ہے بلکہ ہر حرام چیز کا یہی حکم ہے۔ امام ابوحنفیہ رحمہ اللہ اور حضرت سعید ابن جبیر رضی اللہ عنہ کا یہی مذہب جو ذکر کر دیا گیا۔

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بھوک کی شدت کی وجہ سے بھی شراب کا استعمال جائز نہیں بیشک کوئی اور حلال چیز نہ بھی ملے اس لئے کہ شراب سے بھوک اور پیاس میں زیادتی ہوتی ہے اور اس سے عقل بھی زائل ہوتی ہے۔

علامہ رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ قول زیادہ پائیدار نہیں کیونکہ بھوک کی شدت کی وجہ سے ہلاکت کا خطرہ ہو کوئی اور چیز مل نہیں رہی سوائے شراب کے تو شراب کو استعمال کر لے کچھ نہ کچھ بھوک کے زائل کرنے کا ذریعہ ضرور بنے گی۔

”وقوله يزيل العقل فكلامنا في القليل الذي لا يكون كذلك“

اور جہاں تک آپ کے قول کا تعلق عقل کے زائل ہونے سے ہے اس کا جواب یہ ہے کہ زیادہ مقدار میں شراب پینا جائز نہیں۔ بلکہ بہت معمولی مقدار میں صرف ہلاکت سے بچنے کے لئے استعمال

(از کبیر)

جائز سمجھا گیا ہے اس سے عقل کا زوال نہیں۔

شراب سے علاج کا حکم: علامہ رازی رحمہ اللہ کا اس مسئلہ میں مسلک یہ ہے کہ اگر مرض ہلاک کرنے والی ہو اور مسلمان ماہر طبیب یہ کہے کہ اس مرض کا علاج صرف شراب میں ہے تو بطور دوا استعمال جائز ہے۔ اگر مرض ہلاک کرنے والی بظاہر نظر نہیں آتی یا مسلمان ماہر طبیب یہ کہتے ہیں کہ اس کا علاج اور بھی دواؤں میں ہے صرف شراب میں نہیں تو بطور دوا شراب کا استعمال جائز نہیں۔

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بطور دوا شراب کا استعمال جائز نہیں کیونکہ حرام چیز کے استعمال کرنے سے مرض کے زائل ہونے کا جب یقین نہیں تو حرام چیز کو بطور دوا کیوں استعمال کیا جائے جب کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی بہت واضح ہے:

”ان الله تعالى لم يجعل شفاء امتي فيما حرم عليهم“

”بیشک اللہ تعالیٰ نے میری امت کی شفا حرام چیزوں میں نہیں رکھی“

اگرچہ اس کا جواب بھی دیا گیا کہ مرض ہلاک کرنے والی جب ہو اور مسلمان ماہر طبیب جب علاج بھی صرف شراب کو قرار دیں تو وہ شراب اس آدمی کے حق میں حرام ہی نہیں رہتا۔ نبی کریم ﷺ کے ارشاد کا تعلق ان اشیاء سے ہے جن کا استعمال مریض کے لئے حرام ہے۔ (از کبیر)

تاہم راقم کے نزدیک امام اعظم رحمہ اللہ کا قول ہی عظیم ہے تقویٰ بھی اسی میں ہے فتویٰ بھی اسی پر دیا جائے۔ (راقم)

مرکب ادویات: جن مرکب دواؤں میں بعض چیزیں ایسی استعمال ہوں جن کا اکیلے استعمال جائز نہ ہو لیکن جب یہ معمولی مقدار میں ہوں اور دوسری اور دوائیں ان کے ساتھ مل جائیں تو بعض حضرات نے ان دواؤں کا استعمال جائز رکھا ہے ہو میو پیتھک کی دواؤں میں بھی اگرچہ معمولی مقدار میں الکحل کا استعمال ہوتا ہے لیکن ان کا استعمال بھی جائز نظر آتا ہے۔ ”ان التریاق الذی جعل فیہ لحوم الافاعی مستطاب“ تریاق میں سانپوں کا گوشت بھی استعمال ہوتا ہے۔ حالانکہ تریاق کا استعمال کرنا جائز ہے۔

راقم کا اس میں موقف یہی ہے کہ مرکب دوا میں جب غیر طیب کی معمولی آمیزش ہو وہ جائز ہے تقویٰ کے طور پر اجتناب کیا جائے تو علیحدہ بات ہے ورنہ تریاق کا استعمال ناجائز ہوگا حالانکہ جائز ہے۔

واللہ اعلم بالصواب۔

(از کبیر)

خون دینے کا حکم: ایک انسان کا خون دوسرے کو لگایا جاتا ہے جب کہ خون حرام ہے اور نجس، تو یہ کیسے جائز ہے؟ اس کا جواب بھی یہی ہے کہ جب کسی انسان کا علاج مسلمان ماہر طبیوں نے فقط اپریشن منتخب کیا ہے یا کوئی شخص جنگ میں شدید زخمی ہو گیا یا حادثہ میں شدید زخمی ہو گیا جسے خون لگانا ضروری ہو گیا ان صورتوں میں جان بچانے کے لئے خون لگانا جائز ہے۔

عام طور پر معمولی معمولی تکالیف میں یا کمزوری کو دور کرنے کے لئے خون لگایا جاتا ہے یہ حرام ہے، ناجائز ہے اکثر طور پر ضعیف آدمی جن کی وفات یقینی طور پر نظر آتی ہے ڈاکٹر حضرات ان کا اپریشن کرنا تجویز کر دیتے ہیں صرف وہ اپنے تجربات کرنے کے لئے۔ ایسی حالت میں جب موت کا غالب گمان ہو زندگی کا کم گمان ہو اپریشن تجویز کرنا ظلم عظیم ہے خون دینا بھی منع ہوگا۔ ڈاکٹر حضرات کچھ انصاف سے کام لیا کریں۔ بے مقصد لوگوں کا خرچ کرانا اور ضعیف آدمی کو کاٹ کر موت تک پہنچانا کون سا انصاف ہے۔ (راہم)

فائدہ: "قال رسول اللہ ﷺ لطارق بن سوید وقد سأله عن الخمر فنہاہ او کرہ ان یصنعہا فقال انما اصنعہا للدواء فقال انه لیس بدواء ولكنه داء" (رواہ مسلم فی الصحیح)

رسول اللہ ﷺ نے طارق بن سوید کو فرمایا جب انہوں نے آپ سے شراب کے متعلق سوال کیا تو آپ نے ان کو منع فرمایا بلکہ آپ نے شراب بنانے کو بھی ناپسند سمجھا۔ وہ کہنے لگے میں شراب دوا کے لئے بناتا ہوں آپ نے فرمایا یہ دوا نہیں بلکہ بیماری ہے۔

"وهذا یحتمل ان یقید بحالة الاضطرار فانه یجوز التداوی بالسم ولا

یجوز شربه، واللہ اعلم"

ہو سکتا ہے کہ صرف اضطرار کی حالت میں جواز ہو کیونکہ زہر سے دوا جائز ہے زہر کا پینا جائز نہیں (قرطبی)

مسئلہ: کسی نجس چیز کو جب جلا کر راکھ بنا دیا جائے اس کی حقیقت بدل جانے کی وجہ سے وہ راکھ

(از قرطبی)

پاک ہو جاتی ہے اس راکھ کو دوا میں استعمال کرنا جائز ہوگا۔

إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنَ الْكِتَابِ وَيَشْتَرُونَ بِهِ
ثَمَنًا قَلِيلًا، أُولَٰئِكَ مَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ إِلَّا النَّارَ وَلَا
يَكْلِمُهُمُ اللَّهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ

(۱) ”وہ جو چھپاتے ہیں اللہ کی اتاری کتاب اور اس کے بدلے ذلیل قیمت لے لیتے ہیں وہ اپنے پیٹ میں آگ ہی بھرتے ہیں اور اللہ ان سے قیامت کے دن بات نہ کرے گا اور وہ انہیں ستھرا کرے گا اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔“

(۲) ”بیشک وہ لوگ جو چھپاتے ہیں وہ جو نازل کی اللہ نے کتاب اور حاصل کرتے ہیں اس کے ذریعے گھٹیا قیمت وہ لوگ نہیں کھاتے اپنے پیٹوں میں سوائے آگ کے اور نہیں کلام کرے گا ان سے اللہ دن قیامت کے اور نہ تزکیہ کرے گا ان کا اور ان کے لئے عذاب دردناک ہے۔“

شان نزول: یہود کے علماء اور رئیس لوگ اپنے سے کم درجہ کے لوگوں سے ہدیے طلب کرتے تھے اور کھانے کی چیزیں لیتے تھے اور امید یہ رکھتے تھے کہ آخری نبی ہمارے خاندان یعنی بنی اسحاق میں سے تشریف لائیں گے۔ جب نبی کریم ﷺ بنی اسمعیل میں سے تشریف لے آئے تو ان کو خوف لاحق ہوا کہ ہمارے ہدیے اور کھانے کی چیزیں ختم ہو جائیں گی:

”فعمدوا الى صفة رسول الله ﷺ فغير وهائم اخرجوها اليهم فلما نظرت

السفلة الى النعت المغير وجدوه مخالفا لصفة محمد ﷺ فلم يتبعوه“

تو انہوں نے نبی کریم ﷺ کے اوصاف کو اپنی کتب میں تبدیل کر دیا پھر وہ اپنی طرف سے من گھڑت اوصاف اپنے سے کم درجہ والوں پر پیش کئے وہ کہنے لگے یہ اوصاف تو اس شخص میں نہیں جو مدعی نبوت ہے تو انہوں نے ایمان قبول نہ کیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی مذمت میں اس آیت کریمہ کو نازل فرمایا۔

(بغوی، مظہری)

یہود کے مشہور رئیس اور عالم لوگ:

کعب بن اشرف اور کعب بن سعد اور مالک بن صیف اور حی بن اخطب اور ابویاسر بن اخطب“ (ازکبیر)

إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنزَلَ اللَّهُ مِنَ الْكِتَابِ:

”بیشک وہ لوگ چھپاتے ہیں جو نازل کی اللہ نے کتاب“

یہود کیا چھپاتے تھے؟ ”فقیل کانوا یکتُمون صفۃ محمد ﷺ ونعتہ والبشارۃ بہ“

وہ نبی کریم ﷺ کے اوصاف چھپاتے تھے اور آپ کے تشریف لانے کی بشارت جو ان کی کتاب میں دی گئی اسے چھپاتے تھے، یہ قول حضرت ابن عباس اور قتادہ اور سدی اور اصم اور ابو مسلم کا ہے یہود کی طرح نصاریٰ یہ چھپاتے تھے کہ عیسیٰ علیہ السلام نے آپ کے تشریف لانے کی بشارت دی لیکن انہوں نے اسے ظاہر نہ کیا لیکن ان کے ظاہر نہ کرنے کی وجہ سے آپ کی شان کو کم نہیں کیا جاسکتا تھا قرآن پاک میں عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت کو ذکر کر دیا جو نبی کریم ﷺ کی تشریف آوری کے متعلق تھی۔

”وقال الحسن کتموا الاحکام وهو قوله تعالى ان كثيرا من الاحبار

والرهبان لیا کلون اموال الناس بالباطل ویصدون عن سبیل اللہ“

اور حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں وہ احکام کو بھی چھپاتے تھے اللہ تعالیٰ نے ان کا ذکر کیا ”بیشک بہت سے ان کے علماء اور پادری لوگوں کا مال ناحق طور پر کھا لیتے تھے اور اللہ کی راہ سے روکتے تھے“

(از کبیر)

وہ آیات کو کیسے چھپاتے تھے؟ کبھی تو وہ آیات میں تحریف کر دیتے تھے الفاظ بدل دیتے تھے جن سے مطالب غلط بیان کرتے تھے۔ اور کبھی وہ الفاظ تو نہیں بدلتے تھے لیکن ان کی تاویلیں غلط کرتے تھے۔

”وکانوا یدکرون لها تاویلات باطلۃ ویصرفونها عن محالها الصحیۃ

الدالۃ علی نبوۃ محمد ﷺ“

ان غلط تاویلوں کے ذریعے نبی کریم ﷺ کی نبوت پر دلالت کرنے والی آیات کے صحیح مطالب کو پھیر کر باطل کر دیتے تھے ان کے آیات کو چھپانے کا یہ مطلب بھی ہے۔

(از کبیر)

یہودیوں کا کیا ہی عجیب طریقہ تھا کہ وہ اپنی ساری کوششیں اور ساری توانائیاں نبی کریم ﷺ کے اوصاف کو بدلنے میں صرف کرتے تھے ان کو یہ پسند نہیں ہوتا تھا کہ کوئی نبی کریم ﷺ کی تعریف کرے اور آپ کے کمالات بیان کرے۔ اگر یہ طریقہ کسی نام نہاد مسلمان میں بھی پایا جائے تو سمجھ لیں کہ وہ یہود کا پروردہ (پالا ہوا) ہے یا ان کے نقش قدم پر چلنے والا ہے۔

واضح ہو گیا: ﴿مَا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنَ الْكِتَابِ﴾ سے مراد توراۃ و انجیل ہیں جن کو اہل کتاب بدل دیتے تھے اور ﴿إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ﴾ سے مراد یہود و نصاریٰ ہیں۔ لیکن اگر قرآن پاک میں نبی کریم ﷺ کی شان کو واضح طور پر بیان کرنے والی آیات کو کوئی شخص صحیح نہ بیان کرے ان کی غلط تاویلیں کریں تو وہ بھی شدید مجرم ہوگا۔ (راقم)

وَيَشْتَرُونَ بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا : ”اور حاصل کرتے ہیں اس کے ذریعے حقیر قیمت“ ”بہ“ میں ضمیر کا مرجع ”کتمان“ ہے جو ﴿يَكْتُمُونَ﴾ کے ضمن میں پایا گیا ہے یعنی ان کا کتمان حق میں مقصد ہی مال حاصل کرنا ہوتا تھا وہ مال کی خاطر دین کو برباد کر دیتے۔

ثَمَنًا قَلِيلًا کہنے کی وجہ کیا ہے؟

اس میں چند وجوہ ہیں ان میں سے ایک یہ ہے ”انہ فی نفسہ قلیل“ بیشک وہ جو مال حاصل کرتے تھے وہ حقیقت میں ہوتا ہی قلیل تھا یعنی ان کو معمولی مقدار میں جو کے دانے، یا گھٹیا قسم کے کپڑوں کا جوڑا مل جاتا ہے۔

اور دوسری وجہ یہ ہے ”انہ بالاضافۃ الی ما فیہ الضرر العظیم قلیل“ کہ ان کو حق کے چھپانے میں جو گناہ حاصل ہوتا اور عذاب کے مستحق ہوتے اس میں بہت ہی زیادہ نقصان تھا اس لئے عظیم نقصان کے مقابلہ میں مال قلیل ہی تھا۔ (از کبیر)

اور تیسری وجہ یہ تھی ”وسماہ قلیلا لانقطاع مدته وسوء عاقبته“ کہ وہ جو مال حاصل کرتے تھے وہ جلدی ختم ہو جایا کرتا تھا اور ان کو جو عذاب ہونا ہے وہ نہ ختم ہونے والا ہے۔ (فرطی)

اور چوتھی وجہ یہ ہے کہ رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيلٌ﴾ اے محبوب آپ فرما دیں دنیا کا مال قلیل ہے یعنی دنیا کا مال جتنا زیادہ بھی ہو وہ اخروی نعمتوں کے مقابل قلیل ہی ہے۔ (راقم)

”وانہم باعوا آخرتہم بحظہم من المعظم الذی لا خطر لہ“

یعنی وہ کتنے ہی بیوقوف تھے جنہوں نے آخرت کی عظیم نعمتوں کو دنیا کے حقیر مال کے بدلے بیچ دیا۔ (از فرطی)

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے ”قلیل“ کا معنی ”ذلیل“ کیا ہے راقم نے بھی اسی کی نقل کی ہے اور عام فہم لفظ ”حقیر“ سے ترجمہ کر دیا ہے۔ یہ تراجم تمام مذکورہ وجوہ (جو وجہ ذکر کی گئی ہیں) کو شامل ہیں۔

أُولَٰئِكَ مَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ إِلَّا النَّارَ :

”وہ لوگ نہیں کھا رہے اپنے پیٹوں میں سوائے آگ کے۔“

﴿يَأْكُلُونَ﴾ کے بعد بطور تاکید ﴿فِي بُطُونِهِمْ﴾ ذکر کر کے اشارہ کیا گیا ہے کہ اس میں ﴿يَأْكُلُونَ﴾ کا حقیقی معنی ہے ”کھانا“۔ مجازی معنی نہیں کیونکہ کبھی کسی کی زمین کوئی شخص غصب کر لے تو اس وقت بھی کہا جاتا ہے ”اکل ارضی“ فلاں شخص میری زمین کھا گیا۔ اسی طرح کوئی شخص کسی کا مال بے مقصد ضائع کر دے تو اس وقت بھی کہا جاتا ہے ”اکل مالی“ فلاں شخص نے میرا مال کھالیا ہے لیکن یہ مجازی معانی ہیں۔

آگ کھانے کا مطلب:

چونکہ انہوں نے حق کو چھپایا۔ حق کو چھپانا حرام ہے حرام کام پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے عذاب ہوگا خصوصاً حق کو چھپانے سے رشوت لینا حرام طریقہ سے مال حاصل کرنا آگ میں جانے کا ذریعہ ہے۔

”فسمی ما اكلوه من الرشاء ناراً لانه يؤديهم الى النار“

ان کے رشوت کھانے کو آگ سے تعبیر کر دیا کیونکہ یہ انہیں آگ میں پہنچانے کا ذریعہ ہے۔ اکثر مفسرین کرام نے آگ کا یہی مطلب ذکر کیا تاہم بعض حضرات نے یہ بھی بیان کیا ہے۔

”وقيل اى انه يعاقبهم على كتمانهم باكل النار فى جهنم حقيقة“

اور بعض حضرات نے بیان کیا ہے کہ ان کو حق کے چھپانے کی وجہ سے جہنم میں حقیقتہً آگ کھلائی جائے گی۔

(قرطبی)

وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللَّهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ : ”اور نہیں کلام کرے گا ان سے اللہ قیامت کے دن“

کلام نہ کرنے کی تین وجوہ: بظاہر یہ وہم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کلام تو تمام لوگوں سے کرنا

ہے کیونکہ رب تعالیٰ نے فرمایا ہے ﴿فَوَرَبِّكَ لَنَسْأَلَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ﴾

قسم ہے تیرے رب کی ہم ضرور بر ضرور تمام سے سوال کریں گے اس سے جو وہ عمل کرتے رہے۔ اور

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿فَلَنَسْأَلَنَّ الَّذِينَ أُرْسِلَ إِلَيْهِمْ وَلَنَسْأَلَنَّ الْمُرْسَلِينَ﴾

”ہم ضرور بر ضرور سوال کریں گے ان لوگوں سے جن کی طرف رسول بھیجے گئے اور ضرور بر ضرور ہم سوال

کریں گے مرسلین سے“

ان آیات سے پتہ چلتا ہے کہ رب تعالیٰ نے کلام تو مومنوں اور کافروں سب سے ہی فرماتا ہے کلام نہ کرنے کا کیا مطلب؟ تو اس کے جواب میں یہ بتایا گیا ہے کہ کلام نہ کرنے کی تین وجوہ ہیں:

اس میں ایک وجہ یہ ہے ”کان المراد من الآیة انه تعالیٰ لا یکلمهم بتحیة و سلام“ کہ اللہ تعالیٰ ان سے رحمت کا کلام نہیں فرمائے گا ان پر سلام نہیں فرمائے گا اس آیت سے یہ مراد جن آیات میں کلام کرنے کا ذکر ہے انکا مطلب یہ ہے کہ کفار سے غیظ و غضب کا کلام کریگا جس سے انکا غم زیادہ بڑھے گا۔ حسرت زیادہ ہوگی کہ کاش ہم نے وہ کام نہ کئے ہوتے جن کی وجہ آج ہمیں ذلت کا سامنا ہے اللہ تعالیٰ فرمائے گا ﴿أَحْسِنُوا فِیْهَا وَلَا تُكَلِّمُوْنَ﴾ ”یہاں سے ہٹ جاؤ میرے ساتھ کلام نہ کرو“ تقریباً اس کا آسان لفظوں میں مطلب یہ ہے دفعہ ہو جاؤ میرے ساتھ کوئی بات نہ کرو۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ ”ولا یکلمهم“ کا مجازی معنی یہ ہے (قیامت کے دن) رب تعالیٰ ان پر ناراض ہوگا:

”لان عادة الملوک انهم عند الغضب يعرضون عن المفضوب علیه
ولا یکلمونه کما انهم عند الرضا یقبلون علیه بالوجه والحديث“

اس لئے کہ بادشاہوں کی عادت یہ ہے کہ وہ غضب کے وقت اس شخص سے منہ پھیر لیتے ہیں جس پر ان کو غصہ ہوتا ہے اور اس سے وہ کلام نہیں کرتے جس طرح وہ راضی ہونے کے وقت اس کی طرف توجہ کرتے ہیں اور کلام کرتے ہیں۔

تیسری وجہ یہ بھی ممکن ہے کہ جن آیات میں کلام کرنے کا ذکر ہے ان سے مراد اللہ تعالیٰ کا کلام کرنا فرشتوں کے واسطے سے ہو۔ اور جن میں کلام نہ کرنے کا ذکر ہے اس سے مراد یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ بالکل ہی کافروں سے کلام نہیں فرمائے گا۔

پہلی دو وجہ زیادہ قوی نظر آتی ہیں کیونکہ غیظ و غضب سے کلام کرنا کیودر حقیقت کلام کرنا نہیں کہا جاتا۔ (راقم)

وَلَا يُزَكِّیْهِمْ: ”اور تزکیہ نہیں کرے گا ان کا“ اس جملہ کا مشہور معنی تو یہ ہے ﴿وَلَا يُزَكِّیْهِمْ﴾

ای لا یطہرهم من دنس الذنوب ”اور ان کو گناہوں کی میل سے پاکیزہ نہیں کرے گا۔

یعنی جس طرح مسلمان اگر گہنہ گار ہوئے اور اللہ تعالیٰ نے چاہا تو ان کو گناہوں سے پاک کر کے ان کی بخشش فرمادے گا لیکن کفار کو گناہوں سے پاک نہیں فرمائے گا کیونکہ کفر و شرک کو اللہ تعالیٰ نے اپنے وعدہ کے مطابق معاف فرمانا ہی نہیں۔ (اخوذ از روح المعانی)۔ اس کا اور معنی یہ ہے ”لا ینسبهم الی

التزكية ولا يثنى عليهم“ کہ اللہ تعالیٰ ان کو پاکیزگی کی طرف منسوب نہیں کرے گا اور نہ ہی ان کی تعریف فرمائے گا۔

اس کا اور معنی یہ ہے ”لا یقبل اعمالہم کما یقبل اعمال الازکیاء“ کہ اللہ تعالیٰ ان کے اعمال قبول نہیں فرمائے گا جس طرح وہ پاکیزہ لوگوں کے اعمال کو قبول فرمائے گا۔ اور اس کا معنی یہ ہے ”لا ینزلہم منازل الازکیاء“ کہ اللہ تعالیٰ ان کو پاکیزہ لوگوں کے مراتب عطا نہیں فرمائے گا۔

اردو کا دائرہ تنگ ہے کوئی ایسا لفظ نہ ملا جو ان تمام معانی کو شامل ہوتا تو راقم نے ترجمہ میں بھی عربی لفظ ہی شامل کر دیا (اور ان کا ترکیب نہیں فرمائے گا)۔

وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ : ”اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے“ طلباء کرام کی توجہ کے لئے: فعلیل کبھی بمعنی فاعل ہوتا ہے جیسے ”سمیع“ بمعنی ”سامع“ اور ”علیم“ بمعنی ”عالم“ اور فعلیل کبھی بمعنی مفعول ہوتا ہے جیسے ”جریح“ بمعنی ”مجروح“ اور قتیل بمعنی ”مقتول“ اور فعلیل کبھی معنی مفعول ہوتا ہے جیسے ”بصیر“ بمعنی ”مبصر“۔ (از کبیر)

اس میں پھر دو احتمال ہیں کہ فاعل کا معنی ہے ان کے لئے عذاب ہوگا درد پہنچانے والا۔ اور ایک احتمال یہ ہی کہ مفعول کا معنی ہو ”جلا لیں میں مفعول والا معنی لیا گیا ہے“ کہ ان کو عذاب ہوگا درد پہنچایا ہوا یعنی اتنا شدید عذاب ہوگا کہ خود عذاب کو درد محسوس ہوگا۔ (راقم)

عجیب نکتہ: جب کسی کو خالص ضرر (نقصان و تکلیف) پہنچایا جائے اور اس کے ساتھ اس کی ذلت و حقارت بھی پائی جائے تو اسے عقاب کہا جاتا ہے۔ یہاں رب تعالیٰ نے پہلے ان کی ذلت و حقارت کو ﴿وَلَا يَكْلَمُهُمْ اللَّهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمْ﴾ سے بیان فرمایا کہ نبی کریم ﷺ کے اوصاف چھپانے والے اتنے حقیر اور ذلیل ہوں گے کہ رب تعالیٰ ان سے قیامت کے دن نہ ہی رحمت والا کلام فرمائے گا اور نہ ہی ان کو سلام دے گا۔ اور اپنے گناہوں کی آلودگی میں جوں کے توں ہی رہیں گے رب تعالیٰ انہیں پاک نہیں فرمائے گا۔ اس کے بعد رب تعالیٰ نے ﴿وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ﴾ سے ان کے ضرر کو بیان فرمایا (گویا یوں سمجھا جائے کہ اس مقام پر علیحدہ علیحدہ اجزا کو ذکر فرما کر کہ ان کی حقارت و ذلت بھی ہوگی اور ان کو ضرر بھی ہوگا اس کو واضح کر دیا کہ ان کو جو عذاب دیا جائے گا وہ عقاب ہی ہوگا۔

”وقدم الالهانة على المضرة تنبها على ان الالهانة اشق واصعب“

اور ان کی حقارت و ذلت کو ضرر سے پہلے ذکر فرما کر اس پر تنبیہ کی گئی ہے کہ بیشک کسی کو حقیر سمجھنا اور اسے ذلیل کرنا اسے عذاب دینے سے زیادہ اس پر شاق گزرتا ہے اور اس کی طبیعت پر اس کا زیادہ بوجھ ہوتا ہے جو اسے مشکل نظر آتا ہے۔

شدید عذاب کی عظیم وجہ: آیت کریمہ میں جب شدید عذاب کا ذکر کیا کہ وہ اپنے پیٹوں میں آگ کھائیں گے۔ ان کیلئے ذلیل و رسوا کرنے والا عذاب ہوگا۔ اتنا شدید عذاب کیوں ہوگا؟ اس کی صرف یہی وجہ ہے کہ ان کا جرم سب جرموں سے بڑا ہوگا کہ انہوں نے محبوب خدا کے اوصاف چھپائے جب کہ رب تعالیٰ نے آپ کے اوصاف و کمالات کو بیان کرنے کا حکم دیا ﴿وَأَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ﴾ اور آپ اپنے رب کی نعمت کو خوب بیان کرو۔ جب مصطفیٰ کریم ﷺ رب تعالیٰ کی نعمت عظمیٰ ہیں تو آپ کے اوصاف کو بیان کو واجب ہو گیا جنہوں نے آپ کے اوصاف کو چھپایا یقیناً وہ عظیم مجرم ہیں۔ (راقم)

مسئلہ: ”دلت الآية على تحريم الكتمان لكل عالم في باب الدين يجب اظهاره“

آیت کریمہ سے یہ واضح ہوا کہ دین میں جن چیزوں کا ظاہر کرنا ضروری ہے ان کو چھپانا کسی عالم کے لئے جائز نہیں (کبیر) بس یہی وجہ ہے کہ علماء بے دینوں کی نظر میں کھٹکتے ہیں کہ وہ حق کو ظاہر کرتے ہیں بے دین اسے پسند نہیں کرتے۔

تنبیہ: ”العبرة بعموم اللفظ لا بخصوص السبب فالآية وان نزلت في اليهود لكنها عامة في حق كل من كتم شيئا من باب الدين يجب اظهاره فتصلح لان يتمسك بها القاطعون بوعيد اصحابه الكبائر والله اعلم“

اعتبار عموم الفاظ کا ہوتا ہے خصوص سبب کا نہیں آیت اگرچہ یہود کے متعلق نازل ہوئی لیکن عام ہے ہر اس شخص کے متعلق جس نے دین سے ان مسائل کو چھپایا جن کو ظاہر کرنا ضروری ہے۔ اور یہ بھی واضح ہو گیا کہ جو کبیرہ گناہوں کے مرتکب ہوتے ہیں وہ رب تعالیٰ کی شدید وعید کے مستحق ہوتے ہیں۔ (از کبیر)

﴿أُولَئِكَ الَّذِينَ اشْتَرُوا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَى وَالْعَذَابِ

بِالْمَغْفِرَةِ فَمَا أَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ﴾

(۱) ”یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی مول لی اور بخشش کے بدلے عذاب تو کس درجہ انہیں آگ کا سہارا ہے۔“

(۲) ”یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے حاصل کیا گمراہی کو بدلے ہدایت کے اور عذاب کو حاصل کیا بدلے بخشش کے تو کتنا ہی صبر ہے ان کا آگ پر۔“

اس سے پہلی آیہ کریمہ میں علماء یہود کے کتمان حق (حق چھپانا) کا ذکر کیا اور ان پر وعید شدید (سخت عذاب) کا ذکر کیا اب اس آیہ کریمہ میں ان کے جرم پر مرتب ہونے والے آثار کا ذکر کیا جا رہا ہے کہ وہ گمراہی کو ہدایت کے بدلے حاصل کر رہے تھے اور عذاب کو مغفرت کے بدلے حاصل کر رہے تھے ان کا یہ طریقہ آگ کے عذاب تک پہنچانے کا ذریعہ ہے وہ کیسے ہی لوگ تھے جو آگ تک پہنچانے والے کاموں پر قائم تھے۔

قدرے وضاحت: ہر انسان جو کام بھی کرتا ہے اس کا تعلق یا دنیا سے ہوتا ہے اور یا آخرت سے۔ دنیا سے تعلق رکھنے والے کام دو قسم کے ہیں ایک اچھے اور دوسرے برے دنیا کے لحاظ پر اچھے کاموں میں زیادہ اچھے دو کام ہیں ہدایت پر رہنا اور علم حاصل کرنا کیونکہ تمام اچھے کاموں کی دار و مدار ان دو چیزوں پر ہی ہے۔ اور دنیا میں سب سے بری چیزیں دو ہیں گمراہی اور جہالت کیونکہ تمام برائیاں ان میں ہی پائی جاتی ہیں جب انہوں نے دنیا میں ہدایت اور علم کو چھوڑ دیا اور گمراہی اور جہالت پر راضی ہو گئے۔

”فلا شک انہم فی نہایۃ الخیانۃ فی الدنیا“

اس میں کوئی شک نہیں کہ بیشک وہ دنیا میں بہت بڑی خیانت پر ہیں یہی ان کے لئے بہت بڑے خسارے کا سبب ہے۔ آخرت میں سب سے اچھی چیز مغفرت ہے اور سب سے زیادہ خسارے والی چیز عذاب ہے جب انہوں نے مغفرت کو چھوڑ دیا اور عذاب پر راضی ہو گئے۔ تو یقیناً وہ آخرت میں بہت بڑے خسارے میں ہوں گے۔

”واذا كانت صفتهم على ما ذكرناه كانوا لا محالة اعظم الناس
خسارا في الدنيا وفي الآخرة“

جب ان لوگوں کی صفات وہ ہیں جو ہم نے ذکر کی ہیں تو وہ یقینی طور پر تمام لوگوں سے زیادہ دنیا اور آخرت میں خسارے میں ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے متعلق کہا ہے کہ ”انہوں نے مغفرت کے بدلے عذاب حاصل کیا“۔ کیونکہ جب ان کو علم تھا کہ حضور ﷺ کے اوصاف برحق ہیں اور یہ بھی انہیں علم تھا کہ ان اوصاف کا ظاہر کرنا شکوک و شبہات کو دور کرنا ہے اور اس پر عظیم ثواب حاصل ہونا ہے۔ اور ان کو چھپانے میں اور شبہات ڈالنے کی وجہ سے بہت بڑا عذاب ہونا ہے جب سب کچھ جاننے کے باوجود انہوں نے حق چھپایا ”کانوا بالعين للمغفرة بالعذاب لا محالة“ تو وہ یقیناً مغفرت کے بدلے عذاب حاصل کرنے والے ہوئے۔ (از کبیر)

تنبیہ: آیہ کریمہ میں ﴿اِشْتَرَوْا﴾ اپنے حقیقی معنی ”خریدنے“ میں استعمال نہیں بلکہ اس کا مجازی معنی ”تبدیل کرنا اور ”حاصل کرنا“ ہے کیونکہ حقیقی معنی میں مال کا تبادلہ مال سے ہوتا ہے یہاں وہ صورت نہیں پائی گئی۔ (رازم)

فَمَا أَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ: ”تو کتنا ہی صبر ہو گا ان کا آگ پر“ اس جملہ کے مطلب دو طرح بیان کئے گئے ہیں ایک یہ کہ ”ما“ استفہامیہ (برائے سوال) لیکن استفہام بمعنی توبیخ (ڈانٹ ڈپٹ) کے استعمال ہے اب معنی یہ ہوا ”ما الذی اصبرهم، وای شنی صبرهم علی النار حتی ترکوا الحق واتبعوا الباطل“ کس چیز نے انہیں آگ پر صبر دلایا یعنی انہوں نے حق کو چھوڑ کر باطل کی تابعداری شروع کر لی جو ان کو آگ تک پہنچانے کا ذریعہ ہے کتنے ہی نادان ہیں وہ لوگ جو اس پر سہارا لگا بیٹھے ہیں۔

اس معنی کے لحاظ پر ”اصبر“ صبر کے معنی میں ہو گا کثیر مقام پر ”افعل“ بمعنی ”فعل“ اور ”اکرم“ بمعنی ”کرم“ اور ”اخبر“ بمعنی ”خبر“ استعمال ہوتا۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ تعجب کا معنی لیا گیا ہو کیونکہ جو شخص کسی چیز کے اسباب پر راضی ہوتا ہے وہ اس چیز پر بھی راضی ہوتا ہے جب وہ ایسے کام کر رہے تھے جو آگ میں جانے کا ذریعہ تھے تو گویا

انہیں آگ پسند تھی اس وجہ سے کہا گیا ﴿فَمَا أَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ﴾ (تعجب ہے اس پر کہ) کتنا ہی صبر ہے ان کا آگ پر۔

اسی طرح جب وہ ایسے کام کر رہے تھے جو عذاب کا سبب تھے وہ جانتے بھی تھے کہ ہم عذاب والے کام کر رہے ہیں تو گویا کہ ”بذلک کالراضین بعذاب اللہ تعالیٰ“ وہ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ کے عذاب پر راضی تھے۔ عربی زبان کا یہ محاورہ بھی ہے کہ جب کوئی شخص بادشاہ کی مخالفت کرتا ہے اس کو غضب دلانے والے کام کرتا ہے تو کہا جاتا ہے ”ما اصبرک علی القید والسجن“ تو کتنا ہی صبر کرنے والا ہے قید اور قید خانہ پر۔

اسی سے یہ واضح ہو گیا کہ مراد اس سے دنیا میں صبر کرنا ہے کیونکہ وہ دنیا میں وہ کام کر رہے تھے جو ان کو آگ تک پہنچانے والے تھے دنیا میں ہی وہ ہدایت کے بدلے گمراہی حاصل کر رہے تھے۔ لہذا اصم کا یہ کہنا کہ اس کا تعلق آخرت سے ہے کہ رب تعالیٰ جب انہیں فرمائے گا ﴿اُخْسُوا فِيهَا وَلَا تَكْلُمُونَ﴾ دھتکارے پڑے رہو اس میں میرے ساتھ کلام نہ کرو۔

تو اس وقت وہ اپنے سروں کو جھکائے ہوں گے اور خاموش ہوں گے یہی ان کا صبر ہوگا۔ لیکن اصم کا یہ قول درست نہیں کیونکہ رب تعالیٰ نے ان کا یہ وصف فی الحال بیان کیا ہے یہ نہیں کہ آئندہ ایسا ہوگا دوسری وجہ یہ ہے کہ جہنمیوں کا خاموش رہنا بھی درست نہیں ”قَدْ يَقَعُ مِنْهُمْ الْجُزُوعُ وَالِاسْتِغَاثَةُ“ بلکہ وہ چلائیں گے اور فریاد طلب کریں گے۔

طلباء کرام کی توجہ کے لئے:

یہاں یہ ذکر کرنا ہے کہ تعجب کیا ہے اور اس کے صیغے کیا ہیں اس میں دو بحثیں ہیں۔

پہلی بحث کہ تعجب کیا ہے؟ ”وہو استعظام الشئ مع خفاء سبب حصول عظم ذلک الشئ“ تعجب یہ ہے کہ کسی چیز کو عظیم سمجھنا اور اس کی عظمت کے حاصل ہونے کے اسباب کا پتہ نہ ہو۔ حقیقی تعجب تو ان دو معنوں کے بغیر حاصل نہیں ہوتا۔ ہاں البتہ کبھی کسی چیز کے عظیم ہونے پر تعجب کر لیا جاتا ہے۔ اگرچہ اس کے اسباب پوشیدہ نہ ہوں یا عظمت کے اسباب حصول ہی نہ پائے جائیں۔

تنبیہ : علامہ مخفی رحمہ اللہ نے فرمایا ”معنی التعجب فی حق اللہ تعالیٰ مجردہ الاستعظام“

تعجب کی نسبت جب رب تعالیٰ کی طرف ہو تو اس وقت معنی صرف کسی چیز کا بڑا ہونا مراد ہوتا ہے۔

کیونکہ اللہ تعالیٰ سے کسی چیز کے اسباب کا مخفی ہونا ممکن نہیں۔ البتہ بندوں کے لئے تعجب کی وہی تعریف ہے جو ذکر کی گئی کہ چیز عظیم بھی ہو اور اس کی عظمت کے حصول کے اسباب مخفی ہوں۔

اسی طرح ”سخریۃ“ اور ”استہزاء“ اور ”مکر“ کی نسبت بندوں کی طرف کریں تو اور معانی ہیں اور رب تعالیٰ کی طرف منسوب کریں تو اور معانی ہیں۔

دوسری بحث : فعل تعجب کے دو صیغے ہیں ”ما افعله و افعل به“ فَمَا أَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ ﴿ پہلے صیغہ کے مطابق ہے اس میں نحو یوں کے تین مذہب ہیں ایک سیبویہ کا اس کے نزدیک ”ما“ نکرہ ہے لیکن ”شر اھرذ اناب“ کی طرح مبتدا ہے اور اس کے مابعد خبر ہے۔ اور اخفش کے نزدیک ”ما“ موصولہ ہے اور خبر محذوف ہے تقدیر عبارت کی یہ ہے یعنی ”ما احسنه“ کا معنی یہ ہو گیا:

”الذی احسن زیدا ای جعله ذا حسن شئی عظیم“

اور فراء کے نزدیک ”ما“ استفہامیہ ہے اور اس کے بعد خبر ہے اب تقدیر عبارت کی یہ ہوگی ”ای شئی احسن زیدا“

فراء کے مذہب کو علامہ رضی نے رائج قرار دیا بہر حال معنی تعجب کا ”زید کتنا ہی حسین ہے“ اور ﴿ فَمَا أَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ ﴾ کا معنی تعجب کے طور پر ”ان کو کتنا ہی صبر ہے آگ پر“

(از کبیر و کافہ و جامی)

﴿ ذَلِكْ بِأَنَّ اللَّهَ نَزَّلَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ وَإِنَّ الَّذِينَ اِخْتَلَفُوا فِي الْكِتَابِ لَفِي شِقَاقٍ بَعِيدٍ ﴾

(۱) ”یہ اس لئے کہ اللہ نے کتاب حق کے ساتھ اتاری اور بیشک جو لوگ کتاب میں اختلاف ڈالنے لگے وہ ضرور پرے سرے کے جھگڑالو ہیں۔“

(۲) ”یہ اس لئے کہ بیشک اللہ نے اتاری کتاب حق کے ساتھ اور بیشک وہ لوگ جنہوں نے اختلاف کیا کتاب میں وہ بھٹکے ہوئے ہیں بہت بڑے۔“

”ذلک ای مجموع ما ذکر“ اس مقام میں ”ذلک“ کا اشارہ ”مجموع ما ذکر“ (تمام چیزیں جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے) کی طرف ہے یعنی ان کا پیٹوں میں آگ کھانا۔ اور اللہ تعالیٰ کا ان سے کلام نہ کرنا اور اللہ تعالیٰ کا ان کی پاکیزگی بیان نہ کرنا اور ان کا دردناک عذاب میں مبتلا ہونا جو ان کے کتمان حق (حق چھپانے) پر مرتب ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کتاب کو حق سے اتارا لیکن انہوں نے اس میں اختلاف کیا بعض پر ایمان لائے اور بعض سے کفر کیا وہ حق راہ سے دور ہو کر گمراہی میں مبتلا ہوئے۔

بَانَ اللّٰهُ نَزَّلَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ : ”باء“ سبب کے لئے ہے ”الکتاب“ سے مراد قرآن پاک یا توراہ ہے۔ ”بالحق“ یعنی متلبسا بالحق کہ کتاب کو حق سے اتارا یعنی ان میں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اتارا گیا وہ حق ہے توراہ میں تو تحریف کر دی گئی اور وہ منسوخ بھی ہو گئی لیکن قرآن پاک کی حفاظت کا ذمہ رب تعالیٰ نے خود اٹھا لیا اس لئے اس میں نہ تحریف ہوئی ہے اور نہ ہی منسوخ۔

مقصد بیان یہ ہے کہ وہ کتاب جو حق سے نازل کی اگر مراد توراہ ہو تو مطلب یہ ہوگا کہ توراہ میں نبی کریم ﷺ کے اوصاف حق سے بیان کئے گئے ہیں لیکن یہ لوگ ان کو چھپا کر گمراہ ہو گئے۔ اور اگر مراد قرآن پاک ہو تو مطلب یہ ہوگا کہ قرآن پاک اللہ تعالیٰ نے حق سے نازل فرمایا لیکن وہ اسے چھوڑ کر گمراہی میں مبتلا ہو گئے۔

وَأَنَّ الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِي الْكِتَابِ : الكتاب، پر الف لام جنسی ہے یعنی جنس کتاب مراد اس سے یہ ہے کہ بیشک وہ لوگ جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی کتابوں میں اختلاف کیا بعض کتابوں پر ایمان لایا اور بعض پر ایمان نہیں لایا۔

یا الف لام عہد خارجی ہو اور کتاب سے مراد توراۃ ہو اب ﴿اختلفوا﴾ بمعنی ”تخلفوا“ ہوگا مطلب یہ ہوگا کہ بیشک ”توراۃ میں جو حق بیان کیا گیا ہے“ اس پر چلنے سے وہ ہٹ گئے یا معنی یہ بیان کیا جائے گا کہ بیشک توراۃ میں نبی کریم ﷺ کے جو اوصاف تھے اور جو احکام تھے ”جعلوا ما بدلوه خلفا عما فيها“ ان کو بدل کر ان کے پیچھے (ان کی جگہ) اور رکھ دیئے۔

الف لام عہد خارجی سے مراد قرآن پاک بھی ہو سکتا ہے اب ان کے اختلاف کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ بعض نے کہا قرآن سحر (جادو) ہے اور بعض نے کہا قرآن شعر ہے اور بعض نے کہا قرآن پہلے لوگوں کی کہانیاں ہیں۔

لَفِي شِقَاقٍ بَعِيدٍ : ﴿شِقَاقٍ﴾ ای خلاف ﴿بَعِيدٍ﴾ عن الحق موجب لاشد العذاب وہ اس اختلاف میں ہیں جو حق سے دور ہے جو سخت عذاب کا سبب ہے۔ (از روح المعانی)

﴿لَفِي شِقَاقٍ بَعِيدٍ﴾ کے معنی میں چند وجوہ ہیں۔

(۱) ایک ان میں سے یہ ہے کہ بیشک یہ لوگ آپ کی عداوت کی وجہ سے توراۃ اور انجیل کی تحریف کی کیفیت میں اختلاف رکھتے ہیں اسی وجہ سے ”هم فيما بينهم في شقاق بعيد ومنازعة شديدة“ وہ آپس میں بہت زیادہ اختلاف رکھتے ہیں شدید جھگڑا کرتے ہیں۔

اعلیٰ حضرت کا ترجمہ اسی قول کے مطابق ہے ”اور ضرور پر لے سرے کے جھگڑا لو ہیں۔“

(۲) دوسری وجہ یہ ہے گویا کہ رب تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو یہ فرمایا:

”هؤلاء وان اختلفوا فيما بينهم فانهم كالمتفقين على عداوتك

وغاية المشاقة لك فلهذا خصهم الله بذلك الوعيد“

یہ لوگ اگرچہ آپس میں ایک دوسرے سے اختلاف رکھتے لیکن آپ کے ساتھ عداوت رکھنے میں سب متفق ہیں جو آپ کو بہت زیادہ مشقت میں ڈالنے کا ذریعہ ہے اسی وجہ سے رب تعالیٰ نے اس

وعید میں یہود و نصاریٰ کو خاص کیا۔

اب مطلب یہ ہوگا کہ بیشک جن لوگوں نے کتاب میں اختلاف کیا وہ آپ کے ساتھ عداوت کرنے کی وجہ سے آپ کو بہت بڑی مشقت میں ڈال رہے ہیں۔
(۳) تیسرا معنی یہ ہے کہ انہوں نے اصل تحریف میں تو اتفاق کیا لیکن تحریف کی کیفیت میں اختلاف کیا ”فان کل واحد منهم یکذب صاحبه ویشاقه وینازعه“ بیشک ہر ایک ان میں سے اپنے صاحب کی تکذیب کرتا ہے اور مخالفت کرتا ہے اور جھگڑا کرتا ہے۔ (ازکبیر)

خیال رہے کہ پہلے معنی اور تیسرے معنی میں فرق یہ ہے کہ پہلے معنی میں مطلقاً ان کا اختلاف ذکر کیا کہ وہ آپس میں اختلاف رکھتے ہیں اور جھگڑا کرتے ہیں۔ اور تیسرا معنی خاص اور مقید ذکر کیا کہ وہ تحریف کی کیفیت میں ایک دوسرے کی مخالفت کرتے ہیں اور جھگڑا کرتے ہیں۔

تمام معانی کا جامع معنی: ﴿لَفِي شِقَاقٍ بَعِيدٍ﴾ لفی ضلال بعید عن الحق

بیشک جن لوگوں نے اختلاف کیا ہے کتاب میں وہ گمراہی میں ہیں جو حق سے دور ہے۔

یعنی ”شِقَاقٍ“ کا معنی ”گمراہی“ اور ”بعید“ سے مراد حق سے دور ہونا ہے۔ (از بیضاوی)

راقم کے نزدیک علامہ بیضاوی رحمہ اللہ کا بیان کیا ہوا معنی روح المعانی کے معنی کو اور کبیر کے تینوں معانی کو شامل ہے اس لئے راقم نے اسی کے مطابق ترجمہ کیا ہے ”وہ بہت بڑی گمراہی میں ہیں“ کیونکہ حق سے دور ہونا درحقیقت بڑی گمراہی میں مبتلا ہونا ہی ہے۔



﴿لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُولُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ
وَلَكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالْكِتَابِ
وَالنَّبِيِّينَ وَآتَى الْمَالَ عَلَى حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ
وَالْمَسَاكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ وَالسَّائِلِينَ وَفِي الرِّقَابِ وَأَقَامَ
الصَّلَاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ وَالْمُوفُونَ بِعَهْدِهِمْ إِذَا عَاهَدُوا
وَالصَّابِرِينَ فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَاءِ وَحِينَ الْبَأْسِ أُولَئِكَ
الَّذِينَ صَدَقُوا وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ﴾

(۱) ”کچھ اصل نیکی یہ نہیں کہ منہ مشرق یا مغرب کی طرف کروہاں اصل نیکی یہ کہ ایمان لائے اللہ اور قیامت اور فرشتوں اور کتاب اور پیغمبروں پر، اور اللہ کی محبت میں اپنا عزیز مال دے رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور راہ گیر اور سائلوں کو گردنیں چھڑانے میں اور نماز قائم رکھے اور زکوٰۃ دے اور اپنا قول پورا کرنے والے جب عہد کریں اور صبر والے مصیبت اور سختی میں اور جہاد کے وقت یہی ہیں جنہوں نے اپنی بات سچی کی اور یہی پرہیزگار ہیں“

(۲) ”نہیں ہے کامل نیکی کہ تم پھیرو اپنے چہروں کو طرف مشرق اور مغرب کے اور لیکن کامل نیکی یہ ہے کہ جو شخص ایمان لائے اللہ پر اور دن آخرت پر اور کتاب پر اور نبیوں پر اور دے مال محبت سے قریبی لوگوں کو اور یتیموں کو اور مسکینوں کو اور مسافروں کو اور سوال کرنے والوں کو اور گردنیں چھڑانے میں اور قائم رکھے نماز اور دے زکوٰۃ اور پورا کرنے والے ہیں اپنے وعدوں کو جب وہ وعدہ کرتے ہیں اور صبر کرنے والے ہیں مصیبت اور سختی میں اور بوقت جہاد یہی لوگ ہیں وہ جنہوں نے سچ کہا اور یہی لوگ تقویٰ رکھنے والے ہیں۔“

شان نزول: اس آیت کریمہ کے شان نزول میں چند احتمال ہیں:

(۱) یہ آیت کریمہ اہل کتاب کے حق میں نازل ہوئی جب انہوں نے بیت المقدس کی طرف توجہ کرنے میں شدت اختیار کی اور مؤمنین کو بھی طعنے دینے لگے کہ تم نے بیت المقدس کو چھوڑ کر کعبہ کو قبلہ بنالیا رب تعالیٰ نے ان کا رد فرمایا کہ مشرق اور مغرب کی طرف منہ کرنا ہی نیکی نہیں بلکہ کامل نیکی اس وقت حاصل ہوگی جب ایمان کامل ہوگا اور نیک اعمال پائے جائیں گے (تفصیلی ذکر انشاء اللہ آگے آ رہا ہے)

(۲) یہ آیت کریمہ مؤمنین کے حق میں نازل ہوئی جب قبلہ تبدیل کر دیا گیا تو بعض مومن حضرات نے کعبہ کے قبلہ بن جانے کو ہی مقصود اعظم سمجھا اسی پر سہارا لگا بیٹھے تو رب تعالیٰ نے اس آیت کریمہ کو نازل فرمایا کہ کامل نیکی صرف مشرق و مغرب کی طرف منہ کرنے سے حاصل نہیں بلکہ جن پر ایمان لانا ضروری ہے ان پر ایمان لائے اور عبادات پر عمل کرے تو پھر کامل نیکی حاصل ہوگی۔

(۳) شان نزول میں تیسرا قول یہ ہے کہ یہ آیت کریمہ مؤمنین اور یہود کے متعلق نازل ہوئی یعنی اس کا حکم عام ہے کیونکہ قبلہ کی تبدیلی پر مؤمنین نے خوشی کا اظہار کیا اور یہود نے تشدد شروع کیا یعنی وہ مسلمانوں کو طعنے دینے لگے کہ تم نے قبلہ تبدیل کر دیا ہے۔ جس سے رب تعالیٰ تم پر ناراض ہے وہ یہ نہ سمجھ سکے کہ مسلمانوں کا قبلہ تبدیل کرنا اپنے رائے سے نہ تھا بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے تھا۔

”حتی ظنوا انه الغرض الاکبر فی الدین فبعثهم الله تعالیٰ بهذا

الخطاب علی استیفاء جمیع العبادات والطاعات“

یہاں تک کہ ہر فریق نے یہی سمجھا تھا کہ کامیابی کی دار و مدار صرف قبلہ پر ہے اور یہی بہت بڑا مقصد ہے تو رب تعالیٰ نے ان کو اس خطاب سے بتایا کہ اصل میں تمام عبادات اور تمام طاعات کو مکمل کرنے میں کامیابی ہے۔

علامہ رازی رحمہ اللہ اس تیسری وجہ کو ترجیح دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

”وهذا شبه بالظاهر اذ لا تخصیص فیہ فکانہ تعالیٰ قال لیس البر

المطلوب هو امر القبلة بل البر المطلوب هذه الخصال التي عدھا“

کہ یہ قول زیادہ بہتر ہے کیونکہ آیت کریمہ میں ظاہر طور پر کوئی تخصیص نہیں پائی گئی کہ یہ کسی ایک

فریق سے خاص ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ نے عام ارشاد فرمایا کہ مطلوب صرف قبلہ نہیں بلکہ تمام نیکیوں پر عمل کرنا ہی بڑا مقصد ہے۔
(ماخوذ از کبیر)

(۴) سب سے پہلے حکم صرف ایمان لانے کا تھا احکام فرض نہیں تھے فرائض سے پہلے جس نے کلمہ شہادت صدق دل سے پڑھ لیا ﴿اشہد ان لا اله الا الله واشہد ان محمد عبده ورسوله﴾ وہ جنت کا مستحق ہو گیا حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ سب سے پہلے اسی آیہ کے ذریعے احکام فرض ہوئے۔
(فرطی)

راقم کے نزدیک بھی تیسرا قول ہی رائج ہے جس کو علامہ رازی رحمہ اللہ نے ترجیح دی ہے۔ طلباء کرام توجہ فرمائیں: ﴿لَيْسَ الْبِرُّ اَنْ تُوَلُّوا﴾ اس مقام میں ”البر“ کو بعض قراءتوں میں مرفوع پڑھا گیا ہے اور بعض میں منصوب۔ دونوں قراءتیں اولیٰ (بہتر) ہیں ہر ایک میں وجہ ترجیح موجود ہے۔

حمزہ اور حفص کی قراءت جو عاصم سے منقول ہے اس پر نصب (زبر) ہے ان کی دلیل اپنے قول کے رائج ہونے پر یہ ہے کہ ”البر“ معرفہ ہے اور ﴿اَنْ تُوَلُّوا وَجُوهَكُمْ﴾ بھی مصدر کی تاویل میں معرفہ ہے۔ ”ان المصدر المؤول اعرف من المحلی بالالف واللام“ بیشک فعل جب ان مصدریہ کی وجہ سے تاویل مصدر میں ہو وہ زیادہ معرفہ ہوتا ہے نسبت الف لام کے ذریعے معرفہ سے۔ اس لئے جو زیادہ معرفہ ہو اسے اسم بنانا چاہئے لہذا ”البر“ خبر مقدم ہے اور ﴿اَنْ تُوَلُّوا وَجُوهَكُمْ﴾ اسم مؤخر۔

اور فع والی قراءت کا قول کرنے والے حضرات کی دلیل یہ ہے کہ ”لیس“ کا اسم فاعل کے مشابہ ہے اور خبر مشابہ ہے مفعول کے، فاعل کے لئے اصل یہ ہے کہ وہ فعل کے ساتھ متصل ہو یعنی بغیر کسی وجہ کے فاعل کو مؤخر کرنا اور مفعول کو مقدم ذکر کرنا بہتر نہیں اسی طرح ”لیس“ کا اسم بھی مؤخر کرنا بہتر نہیں۔

دونوں قراءتیں صحیح ہیں دونوں کے دلائل قوی ہیں تاہم ہمارے نزدیک حفص کی قراءت بہتر

(از شیخ زادہ و کبیر)

ہے لہذا ”البر“ پر نصب کے بہتر ہونے کا قول کیا گیا ہے۔

یہود و نصاریٰ کے ایمان اور عبادات میں خلل واقع ہونا:

یہود اور نصاریٰ کا قبلہ میں بھی اتفاق نہ تھا بیت المقدس کی مغربی جانب کا استقبال کرتے تھے اور نصاریٰ مشرق جانب کا۔ پھر بھی وہ سمجھتے یہی تھے کہ صرف بیت المقدس کو قبلہ مان لینے سے تمام مقصد حاصل ہو جاتا ہے۔ رب تعالیٰ نے فرمایا صرف بیت المقدس کو قبلہ تسلیم کر لینے میں کامیابی نہیں بلکہ ایمان لانے اور عبادات کرنے میں کامیابی ہے۔ لیکن ان میں بھی تم خلل ڈالتے ہو۔ اہل کتاب کے ایمان میں خلل:

یہود اللہ تعالیٰ کے جسم کے قائل تھے کہ وہ جسم ہے اسی وجہ سے رب تعالیٰ نے ان کے قول کی حکایت بیان ”وَقَالَتِ الْيَهُودُ عِزْرُونَ ابْنُ اللَّهِ“ اور یہود نے کہا عزیر اللہ کے بیٹے ہیں۔ اور یہود نے اللہ تعالیٰ کو معاذ اللہ بخیل (کنجوس) کہا ”قَالُوا إِنَّ اللَّهَ فَقِيرٌ وَنَحْنُ أَغْنَاءُ“ یہود نے کہا اللہ فقیر ہے اور ہم غنی ہیں۔

”وَقَالَتِ الْيَهُودُ يَدُ اللَّهِ مَغْلُولَةٌ“ اور یہود نے کہا اللہ کا ہاتھ ٹنگ ہے۔

نصاریٰ نے بھی اللہ تعالیٰ کو جسم سمجھا اسی لئے وہ عیسیٰ علیہ السلام کا بیٹا تسلیم کرتے تھے ﴿وَقَالَتِ النَّصَارَى الْمَسِيحُ ابْنُ اللَّهِ﴾ ”اور نصاریٰ نے کہا مسیح (عیسیٰ) اللہ کا بیٹا ہے۔ واضح ہوا کہ یہود و نصاریٰ کا اللہ تعالیٰ پر وہ ایمان نہ تھا جو اس کی شان کے لائق تھا بلکہ ان کا ایمان حقیقت میں کفر تھا۔

آخرت پر ایمان لانے میں خلل: ”وَقَالُوا لَنْ يَدْخُلَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَنْ كَانَ هُودًا أَوْ نَصَارَى“ اور انہوں نے کہا ہرگز جنت میں کوئی بھی داخل نہیں ہوگا سوائے اس کے جو یہودی ہو یا نصرانی۔ یعنی یہود کا دعویٰ یہ تھا کہ جنت میں صرف یہودی جائیں گے اور نصرانیوں کا دعویٰ یہ تھا کہ جنت میں صرف نصرانی جائیں گے ان دونوں فریقوں کا یہ دعویٰ من گھڑت تھا لہذا آخرت پر ایمان لانے میں انہوں نے خلل پیدا کیا۔

﴿وَقَالُوا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّا أَيَّامًا مَّعْدُودَةً﴾

”اور انہوں نے کہا ہرگز آگ ہمیں مس نہیں کرے گی سوائے چند دنوں کے“

یعنی انہوں نے کہا کہ ہمارے آباء و اجداد نے چالیس دن تک بچھڑے کی پوجا کی تھی ہمیں صرف اتنے دن ہی عذاب ہوگا یہ من گھڑت قول بھی انکے آخرت پر ایمان لانے میں خلل اندازی کا سبب تھا۔

”وَالنَّصَارَى انْكُرُوا الْمَعَادَ الْجَسْمَانِي“ نصاریٰ نے جسم کے پھر زندہ ہونے کا انکار کیا

”وَكُلْ ذَلِكَ تَكْذِيبٌ بِالْيَوْمِ الْآخِرِ“ یہ تمام اقوال درحقیقت قیامت کے دن کے انکار کا سبب ہیں۔

ملائکہ پر ایمان لانے میں خلل: یہود نے اس میں خلل پیدا کیا جب انہوں نے جبریل سے اپنی

عداوت کا اظہار کیا رب تعالیٰ نے فرمایا جبریل کی عداوت باعث کفر ہے۔ یعنی جبریل کی عداوت

درحقیقت رب تعالیٰ سے عداوت اور تمام فرشتوں سے عداوت ہے ان تمام سے عداوت رکھنے والے

یقیناً کافر ہیں۔

اللہ کی کتابوں پر ایمان لانے میں خلل: یہود و نصاریٰ نے اس میں بھی خلل ڈالا جب وہ

جانتے تھے قرآن پاک اللہ کی کتاب ہے پھر بھی انہوں نے اس کا رد کیا اور اسے قبول نہ کیا۔ اور اپنی

کتب کے بھی بعض احکام پر ایمان لایا اور بعض سے کفر کیا رب تعالیٰ نے ان کی مذمت میں فرمایا:

﴿وَإِنْ يَأْتُوكُمْ أُسَارَىٰ تُفَادُوهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ إِخْرَاجُهُمْ أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ

وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ﴾

”اور اگر آئیں تمہارے پاس قیدی تو ان کا تم فدیہ دیتے ہو حالانکہ ان کا نکالنا ہی تم پر حرام تھا کیا تم بعض

کتاب پر ایمان رکھتے ہو اور بعض سے کفر کرتے ہو“۔

ان کا یہ طریقہ اللہ تعالیٰ کی کتابوں پر ایمان لانے میں خلل اندازی کا سبب تھا۔

انبیاء کرام پر ایمان لانے میں خلل: یہود نے انبیاء کرام پر ایمان لانے کی بجائے ان کو شہید کر

دیا رب تعالیٰ نے ان کی مذمت میں بیان فرمایا:

﴿وَيَقْتُلُونَ النَّبِيِّنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ﴾ ”اور وہ شہید کرتے ہیں انبیاء کو ناحق“

”وحيث طعنوا في نبوة محمد ﷺ“ اور انہوں نے نبی کریم ﷺ کی نبوت میں بھی

طعنہ زنی کی اور آپ کی نبوت کو تسلیم نہ کیا اور نہ ہی آپ پر ایمان لایا۔

مال کے خرچ کرنے میں خلل: اللہ تعالیٰ نے جس طرح مال کے خرچ کرنے کا حکم دیا انہوں نے اس کے خلاف دوسرے لوگوں کو شبہات میں ڈال کر ان سے گھٹیا مال حاصل کیا۔ گویا کہ ان کو ثواب سے محروم کر کے حرام طریقہ پر مال خرچ کرنے کا حکم دیا رب تعالیٰ نے ان کی مذمت میں بیان فرمایا:

﴿واشترُوا به ثَمَنًا قَلِيلًا﴾ ”اور حاصل کیا انہوں نے اس کے ذریعے گھٹیا مال“

نماز اور زکوٰۃ میں خلل:

یہود و نصاریٰ نے نبی کریم ﷺ پر ایمان ہی نہ لایا کہ وہ آپ کی شریعت کے مطابق نماز قائم کرتے اور زکوٰۃ ادا کرتے بلکہ ”وَالْيَهُودُ كَانُوا يُمْنَعُونَ النَّاسَ بِهَا“ وہ دوسرے لوگوں کو بھی نماز اور زکوٰۃ ادا کرنے سے منع کرتے تھے۔

ایفاء عہد میں خلل: وہ اللہ تعالیٰ سے کئے ہوئے وعدے پورے نہیں کر رہے تھے اسی لئے رب تعالیٰ نے ان کو ”أَوْفُوا بِعَهْدِي“ کا حکم دیا کہ تم میرے ساتھ کئے ہوئے وعدے پورے کرو۔ (ازکبر) اعتراض: اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿لَيْسَ الْبِرُّ أَنْ تُولُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ﴾

”نیکی نہیں کہ تم اپنے چہروں کو پھیرو مشرق کی طرف اور مغرب کی طرف“

پھر حکم دیا ﴿وَأَقَامَ الصَّلَاةَ﴾ نماز کے قائم کرنے کا ”نماز میں قبلہ کی طرف منہ کرنا شرط ہے اور نیکی کا کام ہے تو قبلہ کی طرف منہ کرنے کی نفی کرنا کیسے صحیح ہے؟

پہلا جواب: ”﴿لَيْسَ الْبِرُّ﴾ نفی لکمال البر وليس نفيا لأصله“

کہ یہاں یہ مطلب نہیں کہ قبلہ کی طرف منہ کرنا بالکل نیکی نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ کامل نیکی نہیں گویا کہ یہ کہا گیا ہے نیکی صرف یہ نہیں بلکہ نیکی تمام اچھی عادات کو حاصل کرنے کا نام ہے۔ ”وَاسْتِقْبَالَ الْقِبْلَةِ وَاحِدٌ مِنْهَا فَلَا يَكُونُ ذَلِكَ تَمَامَ الْبِرِّ“ اور قبلہ کا استقبال بھی خصال حمیدہ (اچھی عادات یعنی عبادات) میں سے ایک ہے صرف استقبال قبلہ کامل نیکی نہیں۔

دوسرا جواب: جب یہود مسلمانوں کو قبلہ کی تبدیلی پر طعن دے رہے تھے کہ تم نے بیت المقدس سے

کعبہ کی طرف منہ پھیر کر اپنی نیکیوں کو برباد کر لیا ہے جب تک بیت المقدس کی طرف منہ نہیں کرو گے تمہیں کوئی نیکی حاصل نہیں ہوگی۔

اللہ تعالیٰ نے ان کے رد میں یہ آیہ کریمہ نازل فرمائی کہ جب قبلہ کی تبدیلی میرے حکم سے ہوئی میں نے خود بیت المقدس کے قبلہ ہونے کو منسوخ کر دیا ہے اور کعبہ کو قبلہ بنا لیا ہے لہذا اب بیت المقدس کی طرف منہ کرنا کوئی نیکی نہیں:

”بل کان ذلک اثماً وفجوراً لانه عمل بمنسوخ قد نهى الله عنه وما يكون كذلك فانه لا يعد في البر“

بلکہ گناہ اور فسق و فجور ہے اس لئے کہ منسوخ پر عمل کرنا منع ہے جس کام سے رب تعالیٰ منع فرما دے اس پر عمل کرنا کوئی نیکی نہیں اس جواب کے مطابق مطلقاً نیکی کی نفی کی گئی۔
تیسرا جواب: ”ان استقبال القبلة لا يكون برا اذا لم يقارنه معرفة الله“

پیشک قبلہ کا استقبال اس وقت تک نیکی نہیں جب تک اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی معرفت نہ پائی جائے اللہ تعالیٰ کی معرفت اس وقت حاصل ہوگی جب ایمان حاصل ہو اور عبادات پر عمل کیا جیسا کہ سجدہ اس وقت تک عبادت نہیں جب تک اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان نہ ہو۔

﴿وَلَكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّينَ﴾
”اور لیکن نیکی وہ ہے جو (نیکی) ایمان لایا اللہ تعالیٰ پر اور آخرت پر اور فرشتوں پر اور نبیوں پر“

”البر“ اسم جامع للطاعات، جو تمام طاعات کا جامع ہو اسے ”البر“ کہا جاتا ہے۔

اور اعمال خیر جو اللہ تعالیٰ کا مقرب بنائیں وہ ”البر“ ہیں اسی معنی کے لحاظ سے ماں، باپ کی فرمانبرداری کو ”بر الوالدین“ کہا جاتا ہے۔ اور اسی معنی کا لحاظ کیا گیا ہے ان الفاظ مبارکہ میں ﴿إِنَّ الْأَبْرَارَ لَفِي نَعِيمٍ﴾ ”پیشک نیک لوگ نعمتوں میں ہوں گے (مراد جنت کی نعمتیں)۔ اسی طرح ”البر“ مطلقاً ضد ہے ”اثم“ (گناہ) کی۔ اور ضد ہے ”الفجور“ (بڑے گناہ) کی۔ یہاں حذف مضاف ہے اصل عبارت یوں ہوگی ﴿وَلَكِنَّ الْبِرَّ بِرٌّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ﴾ اور لیکن نیکی

ہے اس شخص کی جس نے اللہ پر ایمان لایا۔

نیکی کا اعتبار چند امور پر: اللہ تعالیٰ نے نیکی کی ماہیت کے پائے جانے کو چند چیزوں پر موقوف کیا ہے ان میں سے پہلی چیز ہے ”ایمان لانا پانچ چیزوں پر یعنی اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن اور فرشتوں اور آسمانی کتابوں اور انبیاء کرام پر ایمان لانا۔

رب تعالیٰ پر ایمان میں وہم اور اس کا ازالہ: بظاہر تو یہ پتہ چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا ممکن نہیں کیونکہ ایمان لانے کے لئے اس کی ذات کا علم ہونا ضروری ہے اور رب تعالیٰ کی ذات کا علم حاصل ہونا محال ہے؟ تو اس کا جواب یہ دیا جائے گا کہ اللہ تعالیٰ کا علم دلائل اور اصول سے ممکن ہے۔ اگرچہ اس کی ذات تک رسائی ممکن نہیں۔ جب دلائل سے واضح ہے کہ مخلوق کا علم اور عالم اور تمام جہان حادث ہیں یعنی ان کو کسی ذات نے موجود کیا ہے تمام کائنات اپنے وجود میں کسی ذات کی محتاج ہے وہ ذات اللہ تعالیٰ کی ہے ایمان لانے کے لئے اتنا علم کافی ہے۔

اسی طرح جب یہ معلوم ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ واجب الوجود ہے قدیم ہے ہمیشہ کے لئے بقاء اسے حاصل ہے تو اسی سے یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ تمام معلومات اس کے علم میں ہیں وہ تمام ممکنات پر قادر ہے وہ ہمیشہ کے لئے زندہ ہے وہ ارادہ کا مالک، وہ سننے کی قوت کا مالک ہے، وہ دیکھنے کی قوت کا مالک ہے وہ کلام فرمانے پر قادر ہے یعنی حی، مرید، سمیع، بصیر اور متکلم ہے۔

ان تمام صفات کے علم سے پتہ چل گیا کہ تمام مخلوق حادث ہے رب تعالیٰ نے ہی تمام کو موجود کیا اور اللہ تعالیٰ کی صفات سلبیہ کے علم سے بھی کائنات کا محتاج ہونا اور مخلوق ہونا پتہ چل جاتا ہے کیونکہ یہ صفات مخلوق کے کسی فرد میں نہیں کہ وہ محل اور چیز (مکان) اور عرض ہونے سے پاک ہو یہ صرف اللہ تعالیٰ کو ہی صفات حاصل ہیں۔ (ماخوذ از کبیر)

رب تعالیٰ پر ایمان کیسے؟ اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے کہ وہ اپنی ذات میں واحد ہے اور اپنی صفت میں یکتا ہے اور واجب الوجود ہے اور اس کا کرم اور جوہر ثابت ہے اور تمام صفات کمال اسے حاصل ہیں جن میں بعض صفات جمالیہ اور بعض صفات جلالیہ ہیں وہ ہر عیب سے پاک ہے وہ ہر صفت حدوث سے

پاک ہے وہی واجب الوجود ہے۔
یوم آخرت پر ایمان لانا: یعنی قیامت کے دن پر ایمان لانا کہ قیامت یقینی طور پر آتی ہے اور اس میں جسموں کو اٹھایا جانا ہے اور حساب ہونا ہے اس کے بعد جنت کے مستحقین کو جنت میں بھیجا جانا ہے اور جہنم والوں کو جہنم میں بھیج دیا جائے گا۔ قیامت کے دن کو ”الیوم الآخر“ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ دنیا کا آخری دن ہوگا۔

فرشتوں پر ایمان لانا:

ہم اس پر ایمان رکھیں کہ اللہ تعالیٰ کے فرشتے موجود ہیں جن میں سے چار مقربین کے نام بھی معلوم ہیں جبریل، میکائیل، اسرافیل اور عزرائیل۔ اور باقی فرشتوں پر اجمالی ایمان لانا ہوگا:
﴿إِنَّهُمْ عِبَادٌ مَّكْرُمُونَ يُسَبِّحُونَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُونَ وَلَا يَعْصُونَ اللَّهَ مَا أَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ﴾

کہ بیشک وہ اللہ تعالیٰ کے مکرم عبادت گزار ہیں رات اور دن کو تسبیحات پڑھتے ہیں تھکتے نہیں اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہیں کرتے جو اس نے ان کو حکم دیا اور وہ وہی کرتے ہیں جو ان کو حکم دیا جاتا ہے۔
اور فرشتوں پر یہ ایمان بھی رکھے کہ ان میں کرانا کا تین (لوگوں کے اعمال لکھنے والے) بھی ہیں۔ اور حاملین عرش مقربین بھی ہیں (رب تعالیٰ کے قریبی عرش کو اٹھانے والے جس کی کیفیت رب تعالیٰ ہی جانتا ہے)۔ اور ان کے پر بھی ہیں کسی کے دو، کسی کے تین اور کسی کے چار اور وہ مذکر ہونے اور مؤنث ہونے سے پاک ہیں۔

فرشتے جو اہر علویہ نورانیہ ہیں جسمانی کدورت سے پاک ہیں اور یہ اللہ تعالیٰ اور اس کے انبیاء کرام کے درمیان واسطہ ہیں اور اللہ تعالیٰ کے خاص اصفیاء کو فرشتوں کی تائید حاصل ہوتی ہے۔
الہامی کتابوں پر ایمان لانا: اللہ تعالیٰ نے جو کتابیں انبیاء کرام پر نازل فرمائیں ان کے حق ہونے پر ہمارا اعتقاد ہونا چاہئے کہ توراۃ موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی، زبور حضرت داؤد علیہ السلام پر نازل ہوئی۔ اور انجیل حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی۔ اور قرآن پاک ہمارے نبی کریم محمد مصطفیٰ ﷺ پر نازل ہوا۔ اور ہمارا یہ ایمان ہو کہ:

”انہا مسفوح بالقرآن وانہ لا يجوز عليه نسخ ولا تحريف الى قيام الساعة لقوله تعالى ﴿ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ ﴾

تمام کتابیں قرآن پاک کے نازل ہونے پر منسوخ ہو گئیں اور قرآن پاک کا مکمل طور پر منسوخ ہونا ابتداء سے ہی منع تھا۔ البتہ نبی کریم ﷺ کے وصال کے بعد قرآن پاک کا کوئی حصہ بھی منسوخ نہیں ہو سکتا۔ اور قیامت تک قرآن پاک میں کوئی شخص تحریف (تبدیلی) نہیں کر سکے گا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت کو اپنے ذمہ لگایا ہے۔

انبیاء کرام پر ایمان لانا: یہ ایمان رکھنا کہ اللہ تعالیٰ نے جو احکام انبیاء کرام پر نازل فرمائے وہ انہوں نے لوگوں تک پہنچا دیئے۔ اور یہ عقیدہ رکھنا کہ انبیاء کرام معصوم ہیں یعنی گناہوں سے پاک ہیں صغائر اور کبائر گناہوں سے انبیاء کرام پاک ہیں۔ جن انبیاء کرام کا ذکر قرآن شریف اور حدیث پاک میں آچکا ہے ان پر تفصیلی طور پر ایمان لانا اور جن کا ذکر نہیں ہوا ان پر اجمالی طور پر ایمان لانا۔ اور انبیاء کرام کی تعداد معین نہ کرنا بلکہ یہ عقیدہ رکھنا کہ اللہ تعالیٰ کے جتنے انبیاء کرام ہیں میرا ان پر ایمان ہے۔

(ماخوذ از مرقاة ج ۱ ص ۵۵ تا ص ۵۷)

اور یہ عقیدہ رکھے ”وانہم اشرف الناس حسبا ونسبا وان لیس فیہم وصمة ولا عیب منفر“ کہ انبیاء کرام حسب و نسب کے لحاظ سے لوگوں سے اشرف (زیادہ بزرگی رکھنے والے) ہوتے ہیں اور بیشک ان میں کوئی عیب اور عار نہیں پائی جاتی اور ان میں کوئی ایسا عیب نہیں پایا جاتا جس سے لوگ نفرت کریں (لیکن اہل علم حضرات عیب اور بیماری میں فرق ضرور ذہن میں رکھیں عیب اور چیز ہے مرض اور) (راقم)

ويعتقد ان سيدهم وخاتمهم محمد ﷺ وشريعته ناسخة لجميع الشرائع والتمسك بها لازم لجميع المكلفين الى يوم القيامة“

اور یہ عقیدہ رکھے کہ تمام انبیاء کے سردار اور تمام انبیاء کے بعد آ کر سلسلہ نبوت کو ختم کرنے والے حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں اور آپ کی شریعت تمام شریعتوں کو منسوخ کرنے والی ہے قیامت تک تمام مکلفین کو اسی پر عمل کرنا لازم ہوگا۔

(روح المعانی)

وَآتَى الْمَالَ عَلَىٰ حُبِّهِ : ”اور دے مال محبت پر“

یعنی کامل نیکی کے کاموں میں سے اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کرنا ہے پھر اس میں زیادہ کمال اس وقت آئے جب مال محبت پر خرچ کرے کیونکہ مطلقاً مال خرچ کرنا ثواب کا کام ہے اور جتنا خلوص اس میں زیادہ پایا جائے گا اتنا ہی زیادہ اس میں ثواب ہوگا۔

﴿وَأَتَى الْمَالَ﴾ میں ”واؤ“ حال کے لئے ﴿عَلَى حُبِّهِ﴾ کی ضمیر مجرور کا مرجع کیا ہے؟ اس میں کئی احتمال ہیں ایک احتمال یہ ہے کہ ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹے اب معنی یہ ہوگا اور دے مال اللہ تعالیٰ کی محبت کی وجہ سے اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ ضمیر لوٹے ﴿وَأَتَى﴾ کے مصدر کی طرف۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ وہ دے مال جب کہ مال دینے میں اس کی محبت پائی جائے۔

اور تیسرا احتمال یہ ہے کہ ضمیر لوٹے مال کی طرف اس صورت میں مفہوم یہ ہوگا کہ وہ مال دے جب اسے مال سے محبت ہو۔ (راقم نے اپنے ترجمہ میں اسی لئے ضمیر کے مرجع کا معنی ذکر نہیں کیا تا کہ طلباء ہر احتمال کے مطابق ترجمہ کر سکیں)۔

☆ ”عن ابی ہریرۃ قال جاء رجل الی النبی ﷺ فقال یا رسول اللہ الی الصدقۃ اعظم اجرا قال ان تصدق وانت صحیح شحیح تخشی الفقر وتامل الغنی ولا تمهل حتی اذا بلغت الحلقوم قلت لفلان کذا ولفلان کذا وقد کان لفلان“

(اخرجه احمد والبخاری ومسلم وابو داؤد والنسائی وابن حبان بحوالہ درمنثور)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا۔ اس نے عرض کیا یا رسول اللہ کون سا صدقہ میں زیادہ اجر ہے؟ آپ نے فرمایا تم صدقہ کرو جب کہ تم تندرست ہو اور مال پر حریص ہو اور تمہیں احتیاجی کا ڈر ہو۔ اور تم غنی ہونے کی امید رکھتے ہو ہاں اتنی دیر نہ کرنا کہ روح تمہارے گلے تک پہنچ جائے (یعنی موت قریب آجائے) تو پھر کہو اتنا مال فلاں کو دے دینا اور اتنا مال فلاں کو دے دینا حالانکہ وہ مال فلاں کو تو خود بخود مل جاتا ہے۔ (یعنی وارثوں کو تمہارے کہنے کے بغیر ہی مال مل جاتا ہے)

(از روح المعانی)

☆ ”واخرج البیهقی فی شعب الایمان عن المطلب انه قيل یا رسول اللہ ما آتی المال علی حبہ فکلنا نحبه قال رسول اللہ ﷺ توتیہ حین توتیہ ونفسک حین تحدثک بطول العمر والفقر“

(درمنثور)

مطلب کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں عرض کیا گیا یا رسول اللہ ﷺ آئی المال علی حُجَبہ ﴿ کا کیا مطلب ہے؟ ہم تمام ہی محبت سے مال دیتے ہیں آپ نے فرمایا تم مال اللہ کی راہ میں خرچ کرو اس وقت جب تمہارا نفس لمبی عمر اور فقیر ہو جانے کی تمہارے ساتھ باتیں کر رہا ہو۔

☆ ”واخرج احمد وابو داؤد والترمذی وصححه والنسائی والحاکم وصححه والبیہقی عن ابی الدرداء قال سمعت رسول اللہ ﷺ يقول مثل الذي ينفق او يتصدق عند الموت مثل الذي يهدي اذا شبع“

حضرت ابو الدرداء فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ جو شخص موت کے وقت خرچ کرتا ہے یا صدقہ کرتا ہے وہ ایسے ہی ہے جیسے خود کوئی سیر ہو کر کھالے پھر کسی کو ہدیہ دے دے۔

نتیجہ واضح ہوا: ”ان الصدقة حال الصحة افضل منها عند القرب من الموت“

بیشک صدقہ تندرستی کے وقت افضل ہے بنسبت موت کے وقت کے قریب صدقہ دینے سے۔ احادیث مبارکہ کو ذکر کر دیا گیا ہے اور عقلی دلائل سے بھی یہ مسئلہ واضح ہے:

(۱) تندرستی کے وقت انسان کو مال کی حاجت کا گمان حاصل ہوتا ہے اور موت کے وقت کے قریب استغناء کا گمان حاصل ہوتا ہے۔ عقل کا تقاضا ہے کہ محتاجی کے وقت نیکی کے کاموں میں مال خرچ کرنا بہت بہتر ہے بنسبت مستغنی ہونے کی صورت میں ”رب تعالیٰ نے فرمایا“:

﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّى تُنْفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ﴾

”ہرگز نیکی کو تم نہیں پاسکتے یہاں تک کہ خرچ کرو جو تمہیں پسند ہے“

(۲) جو شخص تندرستی کے وقت مال خرچ کرتا ہے اس کو رب تعالیٰ کے وعدہ اور وعید پر یقین ہوتا ہے لیکن موت کے وقت مال کے خرچ کرنے میں یہ صورت نہیں پائی جاتی۔

(۳) صحت کے حال میں مال خرچ کرنے پر زیادہ ثواب حاصل ہوتا ہے کیونکہ اس وقت انسان کو مال کی شدید ضرورت ہوتی ہے اور ایسے حال میں مال خرچ کرنے سے بظاہر فقر بھی آتا ہے۔ اسی وجہ سے اس میں زیادہ ثواب حاصل ہوتا ہے کیونکہ موت کے وقت انسان مال کا محتاج نہیں ہوتا۔

اسی سے واضح ہو گیا کہ فقیر محتاج کا خرچ کرنا بہتر ہے غنی اور غیر محتاج کے خرچ کرنے سے۔

(۳) جب کسی انسان کو مال کے ضائع ہونے کا خطرہ ہو اس وقت کسی کو ہبہ کرنا اس خیال سے کہ اگر میں نے یہ مال نہ دیا تو ضائع تو ہو ہی جانا ہے اس میں وہ کمال نہیں جو اس وقت کسی کو دے جب یہ خطرہ نہ ہو اس وقت مال خرچ کرنے میں خوشی اور رغبت ہوتی ہے لیکن موت کے وقت جب مال کے ضائع ہونے کی فکر ہو اس وقت صدقہ کرنا مجبوری نظر آتا ہے۔

(ماخوذ از کبیر)

وَأَتَى الْمَالَ سَے مراد صدقہ یا زکوٰۃ: ایک قول یہ ہے کہ ﴿وَأَتَى الْمَالَ عَلَى حُبِّهِ﴾ سے مراد اور ﴿وَأَتَى الزَّكَاةَ﴾ سے مراد زکوٰۃ ہی ہے۔ البتہ پہلے الفاظ مبارکہ سے مصارف کا ذکر کیا کہ زکوٰۃ کن لوگوں کو دی جائے اور دوسرے الفاظ مبارکہ سے مراد زکوٰۃ کا ادا کرنا اور اس پر برا بیچتہ کرنا ہے لیکن مراد اول سے نفلی صدقات کا قول زیادہ بہتر ہے کیونکہ معطوف علیہ اور معطوف میں مغایرت ہوتی ہے۔ اسی طرح ﴿وَأَتَى الْمَالَ عَلَى حُبِّهِ﴾ حقوق واجبہ کو بھی شامل ہے۔

حدیث شریف میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قول ”نسخت الزکوٰۃ کل صدقۃ“ (زکوٰۃ نے تمام صدقات کو منسوخ کر دیا) کا مطلب بھی یہی ہے کہ زکوٰۃ فرض ہے اس کے بغیر صدقہ کوئی فرض نہیں بلکہ واجب یا نفل ہے۔ کسی عذر کی وجہ سے فرض ہو جانا اس سے مستثنیٰ رہے گا۔ رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی:

﴿وَفِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ﴾

”اور ان کے مالوں میں سائلین اور محرومین کا حق ہے“

بھی اسی پر دلالت کر رہا ہے کہ نفلی صدقات اور وجوبی صدقات ان مذکور لوگوں کے لئے ہیں اور نبی کریم ﷺ کا ارشاد ”فی المال حقوق سوى الزکوٰۃ“ مال میں حقوق ہیں سوائے زکوٰۃ کے اور ارشاد نبوی ہے ”لا يؤمن بالله واليوم الآخر من بات شبعانا وجاره طاو الى جنبه“ وہ شخص اللہ تعالیٰ پر اور آخرت کے دن پر کامل ایمان رکھنے والا نہیں جو رات سیر ہو کر گزارے اور اس کا پڑوسی (بھوک کی وجہ سے) کروٹیں بدلتا رہے۔

”روی ان الشعبی سنل عن له فادی زکوٰۃ فهل عليه سواء قال نعم“

یصل القرابة ویعطى السائل ثم تلا هذه الآية

حضرت شععی سے پوچھا گیا کہ ایک شخص زکوٰۃ ادا کرتا ہے کیا اسے کوئی اور مال بھی خرچ کا حکم دیا جائے گا؟ انہوں نے فرمایا ہاں اقرباء سے صلہ رحمی کی وجہ سے ان پر مال خرچ کرنا۔ اور سائل کو مال دینا پھر اپنے قول پر بطور دلیل انہوں نے یہی آیہ تلاوت کی۔
(از بیضاوی و شیخ زادہ بتغیر)

ذوی القربی : (قربیوں کو) یعنی نیکی کے کاموں میں سے یہ ہے کہ مال عطاء کرے قریبی رشتہ داروں کو یہاں ذوی القربی سے مراد کون سے لوگ ہیں ”الذین یقربون منه بولادة الابوين او بولادة الجدین“ وہ لوگ مراد ہیں جو اس کے ماں باپ کی اولاد ہو یا اس کے دادا، دادی اور نانا، نانی کی اولاد ہو یہاں صرف ذی رحم مراد نہیں کیونکہ محرمیہ (یعنی کسی سے نکاح کرنا حرام ہونا) حکم شرعی ہے۔ اور ”قرابة“ لغوی لفظ ہے جو نہی قرابت پر استعمال ہوتا ہے اس میں وہ تمام لوگ آئیں گے جن کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ ہاں البتہ رشتہ جتنا زیادہ قریبی ہوگا اتنا ہی زیادہ وہ حقدار ہوگا اور ان کو مال دینے میں اتنا ہی زیادہ ثواب ہوگا۔
(از کبیر)

رشتہ دار کو صدقہ دینا زیادہ ثواب ہے:

”اخرج الطبرانی والحاکم وصححه والبیہقی فی سننه عن ام کلثوم بنت عقبہ بن ابی معیط سمعت رسول اللہ ﷺ یقول افضل الصدقة علی ذی الرحم الکاشح“

ام کلثوم بنت عقبہ بن ابی معیط کہتی ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا عداوت رکھنے والے ذی رحم (قریبی رشتہ) پر صدقہ کرنا افضل ہے۔
(درمنثور)

یہی روایت ہدایہ اخیرین ص ۶۵۸ میں حضرت ابوالیوب انصاری سے بحوالہ مسند امام احمد مذکور ہے کفایہ میں حدیث پاک کی وضاحت میں کہا گیا ہے:

”وانما جعل هذه التصدق افضل لان التصدق علی المحب الصديق یعمل الیه النفس لمحبتہ و صداقته و فی القریب الکاشح المنظور الیه هو معنی القرابة لا غیر مع مخالفة نفسه لان نفسه لا تدعوا الی التصدق“

عداوت رکھنے والے رشتہ دار کو صدقہ دینا افضل اس لئے قرار دیا ہے کہ محبت اور صدیق کی طرف تو اس کی محبت اور صداقت کے پیش نظر انسان کا نفس خود ہی مائل ہوتا ہے کہ اس کو صدقہ دیا جائے لیکن عداوت رکھنے والے رشتہ دار کی طرف انسان کا نفس تو میلان نہیں کرتا اور صدقہ بھی نہیں دینا چاہتا لیکن وہ رشتہ داری کی وجہ سے جب صدقہ دے گا تو یہ اس کے لئے افضل ہوگا (کفایہ)

☆ ”واخرج ابن ابی شیبۃ واحمد والترمذی وحسنہ والنسائی وابن ماجہ والحاکم والبیہقی فی سننہ عن سلمان بن عامر الضبی قال قال رسول اللہ ﷺ الصدقة علی المسکین صدقة وعلی ذی الرحم اثنتان صدقة وصلة“

سلمان بن عامر رضی کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مسکین کو صدقہ دینا ایک صدقہ ہے اور ذی رحم کو صدقہ دینے سے دو چیزیں حاصل ہوتی ہیں ایک صدقہ (کا ثواب) اور دوسری صلہ رحمی۔

(درمنثور، مشکوٰۃ)

یعنی عام فقراء اور غرباء کو صدقہ دینے میں ایک ثواب اور رشتہ داروں کو صدقہ دینے میں دو ثواب حاصل ہوتے ہیں۔

☆ ”واخرج احمد وابو داؤد وابن حبان والحاکم وصححه عن میمونۃ ام المؤمنین قالت اعتقت جاریۃ لی فقال النبی ﷺ اما انک لو اعطيتها بعض اخواتک کان اعظم لاجرک“

ام المؤمنین حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں میں نے اپنی لونڈی کو آزاد کر دیا نبی کریم ﷺ نے فرمایا یہی غلامہ اگر تم اپنی بہنوں میں سے کسی کو دے دیتی تو تمہیں عظیم اجر حاصل ہوتا۔ (درمنثور)

☆ ”واخرج ابن المنذر عن فاطمة بنت قیس انها قالت یا رسول اللہ ان لی مثقالا من ذهب قال اجعلیہا فی قرابتک“

فاطمہ بنت قیس کہتی ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں عرض کیا یا رسول اللہ بیشک میرے پاس ایک مثقال (ساڑھے چار ماشے) سونا ہے آپ نے فرمایا اپنے رشتہ داروں کو دے دو۔

(درمنثور)

☆ ”واخرج احمد والبخاری ومسلم والنسائی وابن ماجہ عن زینب امرأة عبد اللہ بن مسعود قالت سألت رسول اللہ ﷺ اتجزئی عنی من الصدقة النفقة علی زوجی وایتام فی حجری قال لک اجران اجر الصدقة واجر القرابة“

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی زوجہ زینب کہتی ہیں میں نے سوال کیا رسول اللہ ﷺ سے کہ میں صدقہ کا مال اپنے خاوند اور اپنی زیر پرورش یتیموں کو دے سکتی ہوں؟ تو آپ نے فرمایا ہاں تمہیں دو ثواب حاصل ہوں گے ایک صدقہ کا اور دوسرا قرابت کا (یعنی صلہ رحمی کا)۔ (درمنثور)

نقلی اور وجوبی صدقہ کے مصرف میں فرق:

”ولا يجوز ان يدفع الزكاة الى ذمی لقوله عليه السلام لمعاذ رضی اللہ عنہ خذها من اغنياءهم وردھا في فقراءهم ويدفع اليه ما سوى ذلك من الصدقة لقوله عليه السلام تصدقوا على اهل الاديان كلها ولو لا حديث معاذ لقلنا بالجواز في الزكاة“ (از ہدایہ اولین ۱۸۵)

زکوٰۃ ذمی کو دینا جائز نہیں اس لئے کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو (جب عامل بنایا تو) فرمایا کہ مسلمانوں کے اغنیاء سے زکوٰۃ کا مال وصول کرو اور مسلمانوں کے فقراء پر تقسیم کرو۔ زکوٰۃ اور صدقہ فطر اور نذر اور کفارات کے سواء تمام صدقات ذمی (مسلمانوں کے ملک میں حاکم کی اجازت سے شہریت رکھنے والا) کو دیئے جاسکتے ہیں۔ اس لئے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ”تمام دینوں والوں کو صدقہ دو“ اگر حضرت معاذ رضی اللہ عنہ والی حدیث اس کے معارض نہ ہوتی تو اس حدیث کی وجہ سے ہم ذمی کو زکوٰۃ دینے کا حکم بھی ثابت کر سکتے تھے لیکن حدیث معاذ کے معارض ہونے کی وجہ سے صدقات واجبہ کا حکم علیحدہ ہو گیا۔ یہاں سے بہت ہی واضح ہو گیا کہ صدقات واجبہ اور صدقات نقلیہ کا حکم علیحدہ علیحدہ ہو گیا۔ صدقات واجبہ غنی کو دینا نفع ہے۔ لیکن صدقات نقلیہ جائز ہیں۔

”قد يقصد بالصدقة على الغنى الثواب وقد حصل“

(ہدایہ اخیرین ص ۲۹۳ فصل فی الصدقة)

کبھی غنی کو صدقہ ادا کرنے میں ثواب کا ارادہ کیا جاتا ہے وہ حاصل بھی ہو جاتا ہے۔

”فان من له نصاب وله عيال كثيرة فالناس يتصدقون عليه على

قصد الثواب“ (حاشیہ ہدایہ)

بے شک وہ شخص جو صاحب نصاب (غنی) ہوتا ہے لیکن اس کے اہل و عیال کثیر ہوتے ہیں اس

لئے لوگ اس پر ثواب کی غرض سے صدقہ کرتے ہیں۔ اسی سے ایک اور مسئلہ بھی حل ہو گیا کہ ایصالِ ثواب وغیرہ کی محافل میں غرباء اور فقراء کے لئے کھانا پکایا جائے اور اغنیا بھی شریک ہوں تو کوئی حرج نہیں کیونکہ نفلی صدقہ ان کو دینا جائز ہے۔ (راقم)

”ولا تدفع الی بنی ہاشم“ بنی ہاشم کو زکوٰۃ نہیں دی جاسکتی۔ (حدیث اولین ص ۱۸۶)

”عن عبد المطلب بن ربیعہ قال قال رسول اللہ ﷺ ان هذه

الصدقات انما هی اوساخ الناس وانہا لا تحل لمحمد ولا لآل محمد

رواہ مسلم“ (مشکوٰۃ باب من لا تحل له الصدقة)

حضرت عبد المطلب بن ربیعہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک یہ صدقات لوگوں (کے مالوں) کی میل کچیل ہیں فرمایا بیشک یہ محمد (ﷺ) اور آل محمد کے لئے حلال نہیں۔ اسی حدیث کی شرح میں علامہ ملا علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”قال ابن الملک الصدقة لا تحل للنبی ﷺ فرضا كانت او نفلا

وکذا المفروضة لا له الی اقربائه واما التطوع فباح لهم“

(مرقاۃ ج ۳ ص ۱۱۱)

ابن ملک رحمہ اللہ فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ کے لئے فرضی اور نفلی صدقہ تو حلال نہیں تھا لیکن آپ کی آل کے لئے اور آپ کے اقرباء کے لئے فرضی صدقہ تو حلال نہیں لیکن نفلی صدقہ حلال ہے۔

”واما الصدقة النافلة فقال فی النہایة ویجوز النفل بالاجماع وكذا

یجوز النفل للغنی“ (مرقاۃ ج ۳ ص ۱۱۱)

نفلی صدقہ کا حکم بیان کرتے ہوئے صاحب نہایہ نے بیان فرمایا کہ بنو ہاشم کے لئے نفلی صدقہ بالاجماع جائز ہے اور اسی طرح غنی کے لئے بھی نفلی صدقہ جائز ہے۔

”لان المال ههنا كالماء يتدنس باسقاط الفرض اما التطوع بمنزلة

التبرد بالماء“ (ہدایہ اولین ص ۱۸۶)

اس لئے کہ مال پانی کی طرح ہے فرض کے ساقط کرنے سے میلا ہو جاتا ہے اور نفل کا ادا کرنا پانی سے ٹھنڈک حاصل کرنے کی طرح ہے۔

البتہ یہ خیال رہے کہ غنی کو نفلی صدقہ، صدقہ کی نیت سے دینا مطلق جائز ہے۔ اس میں کسی قسم کا خلاف ادب لازم نہیں آتا لیکن بنو ہاشم کے ادب کا تقاضا کچھ اور ہے۔ علامہ ملا علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”فلا تدفع اليهم النافلة الا على وجه الهبة مع الادب“ (مرقاۃ ج ۲ ص ۱۱۱)

کہ بنو ہاشم کو نفلی صدقہ بھی ”ہبہ“ کی نیت سے دیا جائے اس میں صدقہ کی نیت نہ کی جائے تاکہ ان کے ادب و احترام کا لحاظ پایا جائے۔

”ولا الى امرأته للاشتراك في النفع عادة ولا تدفع المرأة الى

زوجها عند ابى حنيفة لما ذكرنا وقالوا تدفع اليه لقوله عليه السلام

لك اجر ان اجر الصدقة واجر الصلة قاله لأمرأة ابن مسعود وقد

سالته عن التصديق عليه قلنا هو محمول على النافلة“ (ہدایہ اولین ۱۲۶)

خاوند اپنی زوجہ کو زکوٰۃ نہیں دے سکتا کیونکہ زوجین کے منافع مشترک ہیں زوجہ اپنے خاوند کو بھی زکوٰۃ نہیں دے سکتی وجہ اس کی بھی یہی ہے کہ منافع دونوں کے مشترک ہیں یہ امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک ہے۔ البتہ صاحبین (حضرت امام ابو یوسف اور حضرت امام محمد) کے نزدیک زوجہ اپنے خاوند کو زکوٰۃ دے سکتی ہے۔ کیونکہ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی زوجہ نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ میں اپنے خاوند کو صدقہ دے سکتی ہوں؟ تو آپ نے فرمایا ہاں تمہیں دو اجر حاصل ہوں گے ایک صدقہ کا اور دوسرا صلہ رحمی کا۔

امام اعظم رحمہ اللہ اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ اس صدقہ سے مراد نفلی صدقہ ہے اس بحث سے یہ واضح ہو گیا کہ نفلی صدقہ عورت اپنے خاوند کو بالاتفاق دے سکتی البتہ وجوبی صدقہ امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک نہیں دے سکتی۔ اسی قول پر فتویٰ ہے۔ ابھی تک جو بحث ذکر کی ہے اس سے مسئلہ بہت واضح ہو گیا کہ وجوبی صدقہ اور نفلی صدقہ علیحدہ علیحدہ احکام رکھتے ہیں۔

وَالْيَتَامَىٰ : (اور یتیموں کو) یعنی نیکی کے کاموں میں یہ ہے کہ وہ محبت پر مال یتیموں کو دے۔ یتیم نابالغ بچے اور بچی کو کہا جاتا ہے جس کا باپ فوت ہو چکا ہے بالغ ہونے کے بعد اس پر یتیم

کا حکم باقی نہیں رہتا۔ زکوٰۃ کا مال تو یتیم کو اس وقت دیا جائے گا جب وہ غریب بھی ہو۔ اگر محتاج نہیں تو اس کو زکوٰۃ اور دوسرے صدقات واجبہ کا مال نہیں دیا جائے گا۔ لیکن نفلی صدقہ یتیم کو شفقت کے لئے دیا جائے گا جیسا کہ مندرجہ بالا بحث میں بیان کیا جا چکا ہے۔

وَالْمَسَاكِينُ : ”اور مساکین کو“ یعنی نیکی کے کاموں میں محبت پر مال مسکینوں کو دینا۔ ﴿مَسَاكِينٌ﴾ جمع ہے ”مسکین“ کی جس کا معنی ہے الدائم السکون ”(ہمیشہ سکونت اختیار کرنے والا) چونکہ مسکین کو بھی حاجت ایک جگہ ٹھہرا لیتی ہے اس میں حرکت نہیں پائی جاتی۔ اس لئے اسے مسکین کہا جاتا ہے۔ اور یا معنی ہے ”دائم السکون“ ہمیشہ سکون میں رہنا کہ وہ غریب و مسکین ہونے کے باوجود یعنی کسی مال کا مالک نہ ہونے کے باوجود وہ لوگوں کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلاتا سوال نہیں کرتا۔ بڑے اطمینان سے پرسکون زندگی بسر کرتا ہے جس حال پر رب تعالیٰ نے اسے رکھا ہوا ہے وہ اسی پر صابر و شاکر رہتا ہے۔

وَابْنُ السَّبِيلِ : ”اور مسافر کو“ یعنی نیکی کے کاموں میں اور یہ ہے کہ محبت پر مال مسافر کو دے مسافر کو ﴿وَابْنُ السَّبِيلِ﴾ اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ راستہ کو لازم پکڑتا ہے اسی طرح ”قاطع الطريق“ (ڈاکو) کو بھی ”ابن الطريق“ کہہ لیا جاتا ہے۔

یا اس لئے مسافر کو ﴿ابن السبیل﴾ کہا جاتا ہے کہ راستہ اسے ظاہر کرتا ہے گویا کہ اس کی ماں نے اسے جنا ہے اور وہ مقام ظہور میں آ گیا۔ مسافر جب دوران سفر محتاج ہو جائے اور بے خرچ ہو جائے تو اسے صدقات واجبہ اور صدقات نفلیہ اور زکوٰۃ کا مال دینا جائز ہے اگرچہ گھر اس کا مال بھی ہو ﴿وَابْنُ السَّبِيلِ﴾ کو مفرد ذکر کرنے میں عجیب حکمت پائی جاتی ہے:

”وكان افرادہ الى افرادہ عن احبابہ ووطنہ واصحابہ فهو ابدًا يتوق الى الجمع“

گویا کہ مفرد ذکر کر کے اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ مسافر اپنے احباب اور اپنے وطن اور اپنے ساتھیوں سے علیحدہ ہونے کی وجہ سے اکیلا ہوتا ہے یعنی وہ مفرد ہوتا ہے اور جمع کا مشتاق ہوتا ہے۔ یعنی اس کے دل میں تمنا پائی جاتی ہے کہ میں اپنے احباب سے مل کر جمع بن جاؤں۔

وَالسَّائِلِينَ : ”اور سوال کرنے والوں کو“ محبت پر مال دے سوال کرنے والوں کو۔ یعنی جو لوگ حاجت مند ہیں اور اسی احتیاجی کی وجہ سے وہ سوال کر رہے ہیں تو ان کو مال دیا جائے بیشک وہ غنی بھی کیوں نہ ہوں۔ (ہاں البتہ پیشہ ور بھکاریوں کو مال نہ دے کر ان کی حوصلہ شکنی ضروری ہے) :

”عن الحسين بن علي رضي الله عنهما قال قال رسول الله ﷺ
للسائل حق وان جاء على فرس“

سائل کا (تمہارے مالوں میں) حق ہے اگرچہ وہ گھوڑے پر سوار ہو کر آئے۔

گویا کہ مسکین اور سائل میں یہ فرق ہے کہ مسکین سوال نہیں کرتا اگرچہ حاجت مند ہوتا ہے ان کا حال ان کی حاجت مندی کی وجہ سے معلوم ہوتا ہے۔ اور سوال کرنے والا بعض اوقات غنی بھی ہوتا ہے لیکن اسے مال دینا جائز ہے ہاں اگر دینے والے کے پاس مال نہیں یا سائل کو زیادہ مستحق نہ سمجھ کر مال نہ دے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

(ماخوذ از بیضاوی و روح المعانی بتغیر)

☆ ”عن ام بجید انها قالت يا رسول الله ان المسكين ليقوم على بابي فما جلد شيا اعطيه اياه فقال لها ان لم تجدی الا ظلفا محرقا فادفعیه الیه اخرجه ابن سعد والترمذی“

ام بجید کہتی ہیں میں نے عرض کیا یا رسول اللہ میرے دروازے پر مسکین آتے ہیں لیکن میرے پاس کوئی چیز نہیں ہوتی کہ میں اسے دوں تو آپ نے فرمایا اور تمہیں کچھ نہ ملے سوائے جانور کے پاؤں کی ہڈی کے جلے ہوئے حصہ کے تو وہی دے دو۔

(درمنشور)

مطلب یہ ہے کہ جتنی معمولی چیز بھی ہو سکے وہی دے دے۔

☆ ”واخرج ابو نعیم والثعلبی والدیلمی والخطیب فی رواة مالک بسند رواہ عن ابن عمر مرفوعا هدية الله للمؤمن السائل علی بابہ“

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مرفوع حدیث مروی ہے (اگرچہ سند ضعیف ہے) اللہ تعالیٰ کی طرف سے مومن کے لئے ہدیہ (تحفہ) ہے کہ سائل اس کے دروازے پر آئے۔ (درمنشور)

☆ ”واخرج ابن شاهين وابن النجار فی تاریخہ عن ابی بن کعب قال قال رسول الله ﷺ الا ادلكم علی هدايا الله عز وجل الی خلقه قلنا بلی قال الفقير هو هدية الله قبل ذلک او ترک“

ابی بن کعب کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا میں تمہیں اللہ تعالیٰ کے ہدایا (تحفوں) کی خبر نہ دوں؟ صحابہ کرام نے عرض کیا ہاں یا رسول اللہ آپ بتائیں تو آپ نے فرمایا فقیر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدیہ ہے انسان اسے قبول کرتا ہے یا چھوڑتا ہے۔ (درمنشور)

یقینی بات ہے کہ رب تعالیٰ کے ہدیہ کو چھوڑنا درست نہیں البتہ کوئی عذر ہو تو کوئی حرج بھی نہیں۔
وَفِي الرِّقَابِ : ”اور گردنوں کے چھڑانے میں“ یعنی نیکی کے کاموں میں سے ”محبت پر مال خرچ کرنا گردنوں کے چھڑانے میں“ بھی ہے۔ گردنوں کے چھڑانے کے تین مطلب ہیں۔
ایک یہ کہ مکاتب غلام کو مال دے تاکہ وہ مولیٰ کو مال دے کر اپنے آپ کو آزاد کرالے۔
دوسرا مطلب یہ کہ غلام خرید کر آزاد کر دے۔

اور تیسرا مطلب یہ ہے کہ مال خرچ کر کے کافروں کے ہاتھوں سے قیدی چھڑالے۔ (از بیضاوی)
پیشہ ور مجرمین کو مال دے کر چھڑانا اس وقت تک ثواب نہیں جب تک وہ توبہ نہ کر لیں کیونکہ مجرمین کی معاونت درحقیقت جرموں کو بڑھانا ہے۔ (راقم)

وَأَقَامَ الصَّلَاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ : ”اور نماز قائم کرے اور زکوٰۃ دے“
یعنی نیکی کے کاموں میں سے فرض نماز قائم کرنا اور زکوٰۃ ادا کرنا بھی ہے:

”اخرج ابن حاتم عن سعيد بن جبیر فی قوله واقام الصلوة یعنی واتم

الصلوة المكتوبة وآتى الزكاة یعنی الزكاة المفروضة“

حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔

رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿وَأَقَامَ الصَّلَاةَ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ فرض نماز کو مکمل کرنا ہے۔
اور ﴿وَآتَى الزَّكَاةَ﴾ کا مطلب ہے فرض زکوٰۃ ادا کرنا۔ (درمنشور)

وَالْمُوفُونَ بِعَهْدِهِمْ إِذَا عَاهَدُوا :

”اور پورا کرنے والے ہیں اپنے وعدوں کو جب وہ وعدہ کرتے ہیں“

کون سا وعدہ مراد ہے؟ وعدہ سے مراد مختلف وعدے ہیں جو تمام ہی مراد ہیں۔

اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول سے وعدہ:

”اخرج ابن جریر وابن ابی حاتم عن ابی العالیۃ فی قوله ﴿وَالْمُؤْفُونَ بِعَهْدِهِمْ﴾ والموفون بعہدہم اذا عاہدوا ﴿قال فمن اعطی عہد اللہ ثم نقضہ فاللہ ینقم منه ومن اعطی ذمۃ النبی ﷺ ثم عذربہا فالنبی ﷺ خصمہ یوم القیامۃ“

ابوالعالیہ کہتے ہیں رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿وَالْمُؤْفُونَ بِعَهْدِهِمْ﴾ سے مراد اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ سے وعدہ کرنا ہے جس نے اللہ تعالیٰ سے وعدہ کر کے اسے توڑ دیا اللہ تعالیٰ اس سے انتقام لے گا اور جس نے اپنے آپ کو رسول اللہ ﷺ کے ذمہ کر کے (ذمی ہونے کو قبول کر کے) بے وفائی کی قیامت کے دن اسے رسول اللہ ﷺ کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ (درمنثور)

لوگوں سے وعدہ کرنا:

”واخرج ابن ابی حاتم عن سعید بن جبیر فی قوله ﴿وَالْمُؤْفُونَ بِعَهْدِهِمْ﴾ اذا عاہدوا یعنی فیما بینہم و بین الناس“

سعید بن جبیر فرماتے ہیں اس آیت میں وعدہ کرنے سے مراد لوگوں کا آپس میں وعدہ کرنا مراد ہے کہ مومن کئے ہوئے وعدہ کو پورا کرتے ہیں۔ (درمنثور)

ایفاء عہد میں وسعت: کہ وہ اللہ تعالیٰ سے وعدہ کرتے ہیں (یعنی جو وعدہ اللہ تعالیٰ نے ان سے لیا) کہ وہ حدود قائم کریں گے اور طاعت کا عمل کریں گے۔ اور اسی طرح وعدہ سے مراد ابتدائی طور پر بندوں کی جانب سے رب تعالیٰ سے وعدہ کرنا ہے کہ وہ نذر مان کر اسے پورا کرتے ہیں۔ بندوں سے وعدہ کرنے سے مراد وعدوں کی وفا اور امانتوں کو ادا کرنا ہے۔

”یعنی اذا وعدوا انجزوا واذا نذروا اوفوا واذا حلفوا بروا فی ایمانہم واذا قالوا صدقوا فی اقوالہم واذا ائتمنوا ادوا“

یعنی جب وہ وعدہ کرتے ہیں پورا کرتے ہیں اور جب نذر مانتے ہیں تو اسے پورا کرتے ہیں اور جب قسم اٹھاتے ہیں اس پر قائم رہتے ہیں اور جب بات کرتے ہیں تو سچی بات کرتے ہیں اور ان کے پاس جب امانت رکھی جائے تو وہ (بغیر خیانت کے) ادا کر دیتے ہیں۔ (ازخازن)

وَالصَّابِرِينَ فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَاءِ وَحِينَ الْبَأْسِ :

”اور صبر کرنے والے ہیں مصیبت اور سختی میں اور جہاد کے وقت میں“ ﴿فِي الْبَأْسَاءِ﴾ ای فی الشدة والفقر والفاقة ﴿بَأْسًا﴾ سے مراد شدت اور فقر (غربت) اور فاقہ۔ ﴿وَالضَّرَاءِ﴾ یعنی المرض والزمانة ”ضراء سے مراد مریض ہو جانا اور چلنے پھرنے سے عاجز ہونا ہے۔ ﴿وَحِينَ الْبَأْسِ﴾ سے مراد اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنے کی وجہ سے شدت کا حاصل ہونا ہے۔

☆ ”عن البراء قال كنا والله اذا احمر البأس نتقى به وان الشجاع منا الذي يحاذي به
يعنى النبى ﷺ“
(بخاری و مسلم)

حضرت براء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں قسم ہے اللہ تعالیٰ کی جب شدید لڑائی جاری ہوتی تو ہم اپنا بچاؤ کرتے لیکن ہم میں سب سے زیادہ بہادر یعنی نبی کریم ﷺ میدان جنگ میں دشمن کے مقابل آگے بڑھتے چلے جاتے۔
(از خازن)

طلباء کرام کی توجہ کے لئے: ﴿وَالصَّابِرِينَ﴾ کی نصی حالت ہے مدح کی وجہ سے۔
تقدیر عبارت اخص یا المدح ہے ماقبل سے انداز بیان کو تبدیل کیا ہے کہ صبر کی فضیلت واضح ہو جائے اور باقی تمام اعمال پر فوقیت حاصل ہو جائے گویا کہ یہ جنس ہی علیحدہ ہے۔ اگر عطف ﴿وَالْمُؤْفُونَ﴾ پر ہوتا تو ”والصابرون“ پڑھا جاتا۔
(از روح المعانی)

نصب کی ایک اور وجہ یہ بھی ہے کہ عطف تو ”من آمن“ پر ہے اس لحاظ پر رفع آنا چاہئے تھا لیکن ”ونصبها على تطاول الكلام“ نصب کلام لمبا ہونے کی وجہ سے ہے اس لئے کہ جب بات لمبی ہو رہی ہو تو عرب حضرات حرکات ماقبل سے تبدیل کر لیتے ہیں تاکہ توجہ کی جائے بے توجہی سے بات کو نہ سنا جائے۔ سورۃ مائدہ میں ﴿وَالصَّابِرُونَ﴾ کی رفی حالت بھی ماقبل سے مختلف ہونے کی وجہ ہے اور سورۃ نساء میں ﴿وَالْمُقِيمِينَ الصَّلَاةَ﴾ میں نصب کی بھی یہی وجہ ہے۔ (منظری)
أُولَئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا : ”یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے سچ کہا“ ﴿أُولَئِكَ﴾ کا اشارہ ہے ما قبل تمام مذکورہ چیزوں کی طرف یعنی جن لوگوں میں یہ تمام اوصاف پائے گئے وہ ایمان اور نیکی میں سچے ہیں۔
وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ : ”اور یہی لوگ تقویٰ والے ہیں“

یعنی کفر اور گناہوں والے رذیل کاموں سے بچنے والے ہیں۔

یہ آیت کریمہ اصل الاحکام ہے: اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا یعنی اس کی ذات اور صفات اور اسماء پر ایمان لانا۔ آخرت کے دن پر ایمان لانا، اس میں ”نشر اور حشر، میزان اور صراط (پل صراط) اور حوض (کوثر) اور شفاعت اور جنت اور دوزخ“ تمام چیزوں پر ایمان لانا آ گیا۔ ملائکہ پر ایمان لانا اور آسمانی کتابوں پر ایمان لانا کہ یہ حق ہیں، اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئی ہیں۔ انبیاء کرام پر ایمان لانا، اور مال خرچ کرنا بطور وجوب یا بطور استحباب۔ اور قریبی رشتہ داروں کو مال دینا، اسی سے صلہ رحمی کی فضیلت اور قطع رحمی سے دور رہنے کا پتہ چل گیا۔ اور یتیموں پر مہربانی کرنا اور ان کی کفالت کرنا، اور مساکین کی معاونت کرنا، اور مسافروں کی امداد کرنا۔

﴿وَابْنِ السَّبِيلِ﴾ میں ہی مہمان بھی داخل ہیں، یعنی مہمانوں کی مہمان نوازی کرنا، اور سوال کرنے والے کو مال دینا، اور مکاتب کو آزاد کرنا، اور غلام خرید کر آزاد کرنا، اور کافروں کے ہاتھوں قیدیوں کو چھڑانا، اور نماز اور زکوٰۃ کے ادا کرنے کی پابندی کرنا، اور وعدہ پورا کرنا، اور مصیبتوں میں صبر کرنا، اور غربت و فقر میں صبر کرنا، اور فاقہ میں صبر کرنا، اور مرض میں صبر کرنا، اور اعضاء کے کمزور ہو جانے اور چلنے پھرنے سے عاجز آنے میں صبر کرنا، اور جہاد میں صبر کرنا۔ ان تمام چیزوں کا تذکرہ جب اس آیت کریمہ میں موجود ہے تو یقیناً یہ آیت عظیمہ کثیر احکام پر مشتمل ہے۔ (قرطبی)

اور اس آیت کے آخر میں: نیک بندوں کا وصف سچائی اور تقویٰ اور وعدہ کی وفاء کا ذکر فرمایا جس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ امور دین میں عمدہ ہیں اس طرح یہ اوصاف رکھنے والوں کی کامل تعریف پائی گئی ہے صدق بمقابلہ کذب استعمال ہوتا ہے کہا جاتا ہے ”صدقوہم القتال“ انہوں نے جنگ کو سچ کر دکھایا۔ ”الصدیق“ جو سچائی کو لازم پکڑے حدیث شریف میں ہے۔

☆ ”علیکم بالصدق فان الصدق یهدی الی البر وان البر یهدی الی الجنة وما یزال الرجل بصدق ویتحرى الصدق حتی یکتب عند اللہ صدیقاً“

تم پر لازم ہے کہ سچ بولو بیشک سچائی انسان کو نیکی کی ہدایت دیتی ہے اور بیشک نیکی جنت کی ہدایت دیتی ہے جب انسان ہمیشہ سچ بولتا رہے اور سچ بولنے میں تحری (کوشش) کرتا رہے تو وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں صدیق لکھ دیا جاتا ہے۔ (از قرطبی)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلِ
الْحُرِّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْأُنْثَى بِالْأُنْثَى فَمَنْ عُفِيَ لَهُ
مِنْ أَخِيهِ شَيْءٌ فَاتَّبَاعْ بِالْمَعْرُوفِ وَأَدَاءٌ إِلَيْهِ بِإِحْسَانٍ
ذَلِكَ تَخْفِيفٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ فَمَنِ اعْتَدَىٰ بَعْدَ ذَلِكَ
فَلَهُ عَذَابٌ أَلِيمٌ

(۱) ”اے ایمان والو تم پر فرض ہے کہ جو ناحق مارے جائیں ان کے خون کا بدلہ لو آزاد کے بدلے آزاد اور غلام کے بدلے غلام اور عورت کے بدلے عورت تو جس کے لئے اس کے بھائی کی طرف سے کچھ معافی ہوئی تو بھلائی سے تقاضا ہو اور اچھی طرح ادا۔ یہ تمہارے رب کی طرف سے تمہارا بوجھ ہلکا کرنا ہے اور تم پر رحمت تو اس کے بعد جو زیادتی کرے اس کے لئے دردناک عذاب ہے۔“

(۲) ”اے لوگو جو ایمان لائے ہو ثابت کر دیا گیا ہے تم پر قصاص (بدلہ لینا خون کا) ان کا جو ناحق قتل کر دیئے گئے، آزاد بدلے آزاد کے، اور غلام بدلے غلام کے، اور عورت بدلے عورت کے، تو وہ شخص معاف کر دیا گیا جسے اس کے بھائی کی طرف سے کچھ، تو پیچھا کیا جائے بھلائی سے، اور ادا کرے اسے اچھے طریقہ سے، یہ تخفیف ہے تمہارے رب کی طرف سے اور رحمت، تو جو شخص تجاوز کرے اس کے بعد تو اس کے لئے عذاب ہے دردناک۔“

شان نزول:

(۱) بغوی، شعبی، کلبی اور قتادہ رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ عرب میں دو قبیلے تھے جو زمانہ جاہلیت میں ایک دوسرے سے معمولی معمولی بات پر لڑائی شروع کرتے جو ایک دوسرے کو قتل کرنے اور زخمی کرنے پر ختم ہوتی۔ ایک قبیلہ کو دوسرے پر طاقت اور دنیاوی شرافت حاصل ہوتی تھی وہ دوسرے قبیلہ کی عورتوں سے

بغیر مہر کے نکاح کر لیتے تھے وہ قسم اٹھاتے تھے کہ ہم ضرور بر ضرور اپنے غلام کے بدلے تمہارے آزاد آدمی کو قتل کریں گے اور ہم اپنی عورتوں کے بدلے تمہارے مردوں کو قتل کریں گے تم نے ہمارا ایک آدمی قتل کیا تو ہم تمہارے دو آدمی قتل کریں گے۔

تم جتنے زخم ہمیں پہنچاؤ گے ہم ان سے دو گنا تمہیں زخم پہنچائیں گے یہ زمانہ جاہلیت میں ان کا طریقہ تھا لیکن اب دونوں قبیلے مسلمان ہو چکے تھے یہ دو قبیلے اوس اور خزرج تھے یہی قول سعید ابن جبیر کا ہے اور یہی صحیح ہے کیونکہ رب تعالیٰ نے ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا﴾ سے خطاب فرمایا اگرچہ مقاتل بن حبان کا قول یہ ہے کہ یہ دو قبیلے بنی نضیر اور قرظہ تھے لیکن یہ قول درست نہیں کیونکہ انہوں نے ایمان قبول نہیں کیا اوس اور خزرج کی زمانہ جاہلیت میں جنگ کے دوران جو لوگ قتل ہو گئے تھے یا زخمی ہو گئے تھے ابھی تک انہوں نے ایک دوسرے سے بدلہ نہیں لیا تھا اب وہ مسلمان ہو چکے تھے لہذا دونوں یعنی اوس اور خزرج نے اپنا معاملہ اور اپنی قسموں کو نبی کریم ﷺ کے سامنے پیش کیا تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی جس میں مساوات کا حکم دیا گیا۔ دونوں قبیلوں نے اسے تسلیم کیا اور فیصلہ پر راضی ہو گئے اسلام کی برکت سے ان کی لڑائیاں بھی ختم ہو گئیں۔

(مظہری)

(۲) شان نزول کی دوسری وجہ یہ ہے کہ یہود پر قتل میں صرف قصاص فرض تھا اور نصاریٰ پر مطلقاً معاف کرنا فرض تھا ”و خیر هذه الامة بينهما وبين الدية تيسيرا عليهم وتقديرا للحكم على حسب مراتبهم“ اس امت کو اختیار دے دیا گیا کہ مقتول کے ورثا چاہیں تو قصاص لیں چاہیں تو معاف کر دیں اور چاہیں تو دیت (فدیہ) لے لیں۔

یہ حکم اس امت کی آسانی کے لئے دیا گیا رب تعالیٰ کے احکام ان کے مراتب کے مطابق دیئے گئے۔ چونکہ نبی کریم ﷺ کی امت تمام امتوں سے افضل ہے اس لئے ان کو ان کی شان کے مطابق ہی احکام دیئے گئے اور اسی طرح ان کے درجات بھی بلند کئے گئے۔ (ماخوذ از بیضاوی و شیخ زادہ)

(۳) علامہ رازی رحمہ اللہ نے یہ دو وجہ بھی ذکر کی ہیں اور تیسری وجہ بھی ذکر کی ہے کہ یہ آیت کریمہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد نازل ہوئی۔ تاہم پہلے دو قول زیادہ قوی ہیں اور دونوں مجتمع ہیں۔ بلکہ علامہ بیضاوی نے پہلی وجہ شان نزول کی بیان کی اور دوسری وجہ ﴿ذَلِكَ تَخْفِيفٌ مِّنْ

رَبِّكُمْ کی تفسیر میں ذکر کی ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلِ :

”اے لوگو جو ایمان لائے ہو ثابت کر دیا گیا ہے تم پر قصاص (بدلہ خون کا) ان کا جو ناحق قتل کر دئے گئے“
الْقِصَاصُ : ”تتبع الدم بالقد“ خون کا بدلہ خون سے یعنی کسی کو ناحق قتل کرنے سے جب
مقتول (جسے قتل کیا گیا) کے ورثاء مطالبہ کریں کہ ہمارے مقتول کے بدلے قاتل کو قتل کیا جائے تو اسے
قصاص کہا جاتا ہے۔ (مفردات راغب)

فِي الْقَتْلِ : فعلی کا وزن جمع ہے فعیل کی جب اس کا معنی مفعول کا ہو اس لئے قتل جمع ہے قتل بمعنی
مقتول کی اور ”فی“ اس مقام میں سیئت کے لئے استعمال ہے اب معنی یہ ہوگا ”بسبب قتل القتل“
قصاص ثابت کیا گیا ہے بوجہ مقتولوں کے قتل کے۔

حدیث شریف میں بھی ”فی“ سبب کے معنی میں استعمال ہے نبی کریم ﷺ نے فرمایا ”ان
امراة دخلت النار فی هرة“ بیشک ایک عورت بلی کی وجہ سے جہنم میں داخل ہو گئی۔

وجہ اس کی یہ تھی کہ اس نے بلی کو باندھ دیا تھا کوئی چیز کھانے اور پینے کی نہ دی اور نہ ہی کھولا کہ وہ
کوئی چیز کھاپی لے تو وہ بلی بھوک اور پیاس کی وجہ سے تڑپ تڑپ کر مر گئی۔ تو اس عظیم ظلم کی وجہ سے وہ
عورت جہنم میں داخل ہونے کی مستحق ہو گئی۔

﴿القتل﴾ اصل القتل ازالة الروح عن الجسد كالموت

قتل اور موت کا حقیقت میں ایک ہی معنی ہے یعنی روح کا جسم سے زائل کرنا لیکن استعمال کے
لحاظ پر فرق ہے جب روح کے زوال کی نسبت کسی انسان کی طرف ظاہر کو دیکھ کر کی جائے تو اسے قتل کہا
جائے اگر اس میں ظاہری طور پر کسی انسان کا دخل نہیں تو وہ موت ہے۔ (از مفردات راغب بعمیر)

اعتراض : ”کتب“ اصل معنی کتابت کا لکھنا ہے کبھی لکھنے کو فرضیت لازم ہو جاتی ہے اسی ضابطہ کی
وجہ سے (یعنی تسمیۃ الملزوم باسم اللازم کے ضابطہ کی وجہ سے) ”کتب“ کا معنی کیا جاتا ہے ”فرض
کیا گیا“ جب ناحق قتل میں مقتول کے ورثاء کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ قصاص لیں یا معاف کر دیں یا فدیہ
لے لیں تو ”کتب“ (فرض کیا گیا) کا کیا مطلب ہے۔

پہلا جواب: ”کتب معناه فرض واثبت“ یعنی ”کتب“ کا معنی فرض کیا گیا بھی ہے اور ثابت کیا گیا بھی آتا ہے اس لئے معنی اگر ”ثابت کیا گیا“ کر لیا جائے تو کوئی اعتراض وارد نہیں ہوگا۔

دوسرا جواب: ”ان ﴿كُتِبَ﴾ هنا اخبار عما كتب في اللوح المحفوظ وسبق به القضاء“

بیشک یہاں ”کتب“ سے یہ خبر دی گئی ہے کہ قصاص کا حکم لوح محفوظ پر لکھ دیا گیا ہے اور قتل میں تقدیر سبقت لے گئی یعنی اگر ”کتب“ کا معنی کیا جائے ”لکھ دیا گیا ہے“ تو پھر بھی اعتراض نہیں ہوگا۔

(از قرطبی بتغیر)

تیسرا جواب: ”﴿كُتِبَ عَلَيْكُم﴾ ای فرض والنزم عند المطالبة صاحب الحق فلا يضر

فيه قدرة الولي على العفو فان الوجوب انما اعتبر بالنسبة الى الحكام او القاتلين“

(کتب) کا معنی تو یہی ہے کہ فرض کیا گیا ہے یا تو خطاب حکام کو ہے کہ جب صاحب حق مطالبہ کرے کہ میں نے تو قصاص ہی لینا ہے تو اس وقت احکام تم پر فرض ہو جائے گا کہ تم قصاص دلاؤ۔ ولی اگر معاف کرنے کی طاقت رکھتا ہے اسے اختیار بھی ہے لیکن وہ معاف نہیں کر رہا تو قصاص فرض ہو گیا۔ اسی طرح یہ خطاب قاتلین کو ہو تقدیر عبارت کی یہ ہو ”یا ایہا القاتلون کتب علیکم تسلیم النفس عند مطالبة الولي القصاص“ اے قاتلو جب مقتول کا ولی قصاص کا مطالبہ کرے تو تم پر فرض ہے کہ تم اپنے آپ کو قصاص کے لئے پیش کر دو۔

اس صورت میں قاتل کے لئے جائز نہیں کہ اپنے آپ کو نہ پیش کرے اور یہ بھی جائز نہیں کہ وہ

قصاص سے انکار کرے۔ (یہ درحقیقت چوتھا جواب ہے) (ماخوذ از روح المعانی و کبیر)

کون سے قتل میں قصاص ہے؟ قتل کی پانچ قسمیں ہیں باقی کی تفصیل انشاء اللہ پانچویں پارہ میں

آئے گی۔ البتہ یہ یاد رکھا جائے کہ قصاص قتل عمد میں لازم آتا ہے۔

قتل عمد یہ ہے کہ جان بوجھ کر ارادہ سے کسی کو ہتھیار سے قتل کرنا یا جو ہتھیار کے قائم مقام ہوں جیسے نوک دار لکڑی اور بانس کا چھلکا اور پتھر نوک دار اور آگ سے کسی کو اپنے ارادہ سے قتل کرنا قتل عمد ہے آسان لفظوں میں یہ سمجھا جائے کہ کسی کو ایسے آلہ سے جان بوجھ کر قتل کیا جائے جس سے زخم ہوں خون

چلے وہ قتل عمد ہے۔

قتل عمد پر مرتب ہونے والے احکام: قاتل گھنہگار ہوگا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَمَنْ يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُتَعَمِّدًا فَجَزَاؤُهُ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيهَا﴾

”جو شخص کسی مومن کو جان بوجھ کر اپنے ارادہ سے قتل کرے اس کی جزاء جہنم ہے جس میں وہ بہت دیر رہے گا“

(ہدایہ باب القصاص)

قتل سے گناہ پر احادیث مبارکہ:

”عن عبد الله بن مسعود قال قال رسول الله ﷺ لا يحل دم امری

مسلم يشهد ان لا اله الا الله واني رسول الله الا باحدى ثلاث النفس

بالنفس والشيب الزانی والمارق لدينه التارك للجماعة“

(بخاری و مسلم مشکوٰۃ کتاب القصاص)

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کسی شخص کے لئے حلال نہیں کہ وہ کسی مسلمان کا خون بہائے جس نے گواہی دی کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور گواہی دی بیشک میں اللہ کا رسول ہوں۔ سوائے تین شخصوں کے (ان کو قتل کیا جائے گا) جو شخص کسی کو ناحق عمداً قتل کر دے اس قاتل کو قصاص کے طور پر قتل کر دیا جائے اور زانی مھسن کو سنگسار کر کے قتل کر دیا جائے۔ اور دین کو چھوڑ کر جماعت کے عقائد کو چھوڑ کر جو مرتد ہو جائے اسے قتل کر دیا جائے۔

☆ ”عن ابن عمر قال قال رسول الله ﷺ لن يزال المؤمن في فسحة من دينه ما لم

(رواہ البخاری)

يصب دما حراما“

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مومن کو ہمیشہ اپنے دین میں

(مشکوٰۃ کتاب القصاص)

کسادگی حاصل رہتی ہے جب تک حرام خون کو نہ پالے۔

یعنی مومن کو اللہ تعالیٰ کی طرف رحمت کی امید کرنے میں وسعت حاصل رہتی ہے جب وہ کسی کو

ناحق قتل کر ڈالے تو اس پر دین میں چلنا تنگ کر دیا جاتا ہے اور رب تعالیٰ کی رحمت کی امید بھی اس پر

(لغات)

تنگ کر دی جاتی ہے۔

☆ ”عن المقداد بن الاسود انه قال يا رسول الله ارأيت ان لقيت رجلا من الكفار

فاقتلنا فضرب احدى يدي بالسيف فقطعها ثم لا ذمى بشجرة فقال اسلمت لله وفي رواية فلما اهويت لا قتله قال لا اله الا الله اقبله بعد ان قالها قال لا تقتله فقال يا رسول الله انه قطع احدى يدي فقال رسول الله ﷺ لا تقتله فان قتله فانه بمنزلك قيل ان تقتله وانك بمنزله قبل ان يقول كلمته قال“ (بخاری و مسلم)

مقداد بن اسود کہتے ہیں کہ انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ آپ اس کے متعلق کیا ارشاد فرماتے ہیں کہ میں اگر کسی کافر سے مقابلہ کروں ہمارے درمیان لڑائی واقع ہو اس کافر نے میرا ایک ہاتھ تلوار سے کاٹ دیا ہو پھر وہ ایک درخت کے ساتھ سہارا لگاتے ہوئے مجھ سے پناہ حاصل کرے یہ کہتے ہوئے کہ میں اللہ کے لئے اسلام لے آیا۔ ایک روایت میں ہے میں اس کو قتل کرنے کا ارادہ کرتا ہوں تو وہ کہتا ہے ”لا اله الا الله“ کیا اس شخص کو میں قتل کروں؟ آپ نے فرمایا تم اسے قتل نہ کرو انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ (میں اسے کیوں نہ قتل کروں) اس نے تو میرا ہاتھ کاٹ دیا ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم اسے قتل نہ کرو۔ اگر تم نے اسے قتل کر دیا تو قتل کرنے سے پہلے جو تمہارا مقام تھا وہ اس پر آ جائے گا اور اس کے کلمہ (لا اله الا الله) پڑھنے سے پہلے جو اس کا مقام تھا تم اس پر چلے جاؤ گے۔

وضاحت حدیث: نبی کریم ﷺ نے ﴿ لا تقتله ﴾ ارشاد فرما کر واضح کر دیا کہ کسی مسلمان کو ناحق قتل کرنا جائز نہیں اسی لئے آپ نے منع فرمایا۔ اور مسئلہ یہ واضح ہوا کہ اگر کافر حربی کسی مسلمان پر کوئی جنایت کرے پھر وہ اسلام قبول کر لے تو اس سے بدلہ نہیں لیا جائے گا کیونکہ جب کافر نے مسلمان کا ہاتھ حالت کفر میں کاٹا ہو پھر مسلمان ہو جائے تو اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ اس لئے کہ نبی کریم ﷺ نے یہ نہیں فرمایا کہ اسے قتل نہ کرو البتہ اپنے ہاتھ کے بدلے ہاتھ کاٹ لو۔ اور فائدہ یہ حاصل ہوا کہ مسلمان کا خون بہانا (قتل کرنا) جائز نہیں اور کافر کو قتل کرنا جائز ہے اب حدیث پاک کے آخری الفاظ کا مطلب واضح ہو جائے گا۔ اگر تم نے اسے قتل کیا تو تم سمجھ لو کہ جب وہ کافر تھا اسے قتل کرنا جائز تھا اب وہ مسلمان ہو چکا ہے اس کے قتل کے بدلے تمہیں قتل کر دیا جائے گا یعنی جس طرح اسلام سے پہلے اس کو قتل کرنا جائز تھا اب تمہیں قتل کرنا جائز ہو جائے گا۔ اگرچہ وجوہ قتل مختلف ہوں گے۔ اس کے قتل کئے جانے کا سبب کفر تھا تمہارے قتل کئے جانے کا سبب قصاص ہوگا۔

اس کو قتل کرنے سے پہلے تمہارا مقام یہ تھا کہ تمہیں بحیثیت مسلمان قتل کرنا منع تھا اور تمہارے قتل کئے جانے سے قصاص لیا جانا تھا اور تم اللہ تعالیٰ کے مقرب تھے قتل کے بعد رب تعالیٰ تم سے ناراض ہو جائے گا۔ اگر تم نے اسے قتل کر دیا تو یہ تمہارا مقام اسے حاصل ہو جانا ہے۔ (ازمراقہ)

☆ "عن السامة بن زيد قال بعثنا رسول الله ﷺ الى اناس من جهينة فاتيتم على رجل منهم فذهبت اطعنه فقال لا اله الا الله فطعنته فقتلته فجننت الى النبي ﷺ فاخبرته فقال اقتلته وقد شهد ان لا اله الا الله قلت يا رسول الله انما فعل ذلك تعوذا قال فهلا شققت عن قلبه" (بخاری و مسلم) "وفى رواية جندب بن عبد الله البجلي ان رسول الله ﷺ قال كيف تصنع بلا اله الا الله اذا جاءت يوم القيامة قال مرارا رواه مسلم"

(مشکوٰۃ کتاب القصاص)

حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے ہمیں جہینہ قبیلہ کے لوگوں کی طرف بھیجا (اور لوگ بھاگ گئے) ایک آدمی ان میں سے ثابت رہا میں نے اسے نیزہ مارنا چاہا تو اس نے کہا "لا اله الا الله" میں نے نیزہ مار کر اسے قتل کر دیا تو میں نبی کریم ﷺ کے پاس (جب) آیا تو میں نے آپ کو اس کی خبر دی تو آپ نے فرمایا تم نے اس شخص کو قتل کر دیا جس نے اس کی شہادت دی کہ "لا اله الا الله" میں نے عرض کیا یا رسول اللہ اس نے اپنے بچاؤ کے لئے ایسے کیا آپ نے فرمایا تم نے اس کے دل کو کیوں نہیں پھاڑا۔ جندب بن عبد اللہ بجلي کی روایت میں یہ ہے کہ بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب قیامت کے دن لا اله الا الله آگیا تو تم کیا کرو گے۔ یہ الفاظ نبی کریم ﷺ نے کئی مرتبہ ارشاد فرمائے۔

وضاحت: حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ نے یا تو اس گمان پر اسے قتل کیا تھا کہ اس نے سچے دل سے ایمان قبول نہیں کیا اور یا آپ نے اجتہاد کیا کہ ایسے حال میں جب مسلمان کافر کو قتل کرنے لگے وہ اسلام لے آئے تو وہ اسلام اس کا قبول نہیں۔ لیکن حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کا گمان اور اجتہاد دونوں ہی درست نہیں تھے اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "هلا شققت قلبه" یہاں "شق قلب" کا مجازی معنی ہے "غور و فکر" کرنا دیر کرنا کہ پہلے اس سے پوچھا جائے پھر اور ذرائع سے معلوم کیا جائے ہو سکتا ہے وہ سچا ہی ہو۔ اب مطلب یہ ہو گیا:

”لم لا شقت قلبه لتعلم وتطلع على ما في قلبه وتبين لك“

تم نے اس کے دل کے حال پر توجہ کیوں نہیں کی غور و فکر نہیں کیا کہ تمہیں معلوم ہوتا اور تم اس کے دل پر مطلع ہوتے اور تم پر واضح ہوتا کہ اس نے صرف بچاؤ کے لئے کلمہ پڑھا تھا یا خلوص دل سے۔

(ازمرقاۃ)

دوسری روایت کے الفاظ ”کیف تصنع بلا اله الا الله اذا جاء ت يوم القيامة“ کا مطلب یہ ہے کہ اگر قیامت کے دن اللہ تعالیٰ نے ”لا اله الا الله“ کو انسانی شکل دے دی اس نے تمہارے ساتھ مخالفت شروع کر دی کہ اس نے میرا لحاظ نہیں کیا تو تم کیا کرو گے۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ اگر کلمہ شریف کی طرف سے فرشتہ نے آ کر مخالفت کی کہ اس نے کلمہ کا پاس نہیں کیا تو اس حال میں تم کیا کرو گے۔ تیسرا مطلب یہ ہے کہ اگر اس شخص نے تمہارے ساتھ مخالفت کی جس نے کلمہ شریف پڑھ لیا تھا پھر تم نے اسے قتل کر دیا تو تم کیا کرو گے۔ (ازلمعات) نبی کریم ﷺ نے یہ الفاظ کئی مرتبہ اسی لئے ارشاد فرمائے کہ آپ کو دکھ ہوا کہ ایک مسلمان کو قتل کر دیا گیا۔ واضح ہوا کہ شک کی وجہ سے کہ ہو سکتا ہے یہ کافر ہو کسی کو قتل کرنا ہرگز ہرگز جائز نہیں۔ (راقم)

☆ ”وعن عبد الله ابن عمرو قال قال رسول الله ﷺ من قتل معاهدا لم يرح رائحة الجنة وان ريحها توجد من مسيرة اربعين خريفا“ رواه البخاری (مشکوۃ کتاب القصاص)

عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے کسی ذمی کو قتل کیا وہ جنت کی خوشبو نہیں پائے گا۔ حالانکہ جنت کی خوشبو چالیس سال کی مسافت سے پائی جائے گی۔

وضاحت: ذمی (معاهد) اس شخص کو کہا جاتا ہے جو کافر ہو مسلمانوں کے ملک میں رہے مسلمان حاکم نے اس کے مال اور اس کی جان کی حفاظت کی ذمہ داری اٹھائی ہو۔ ”خریف“ اگرچہ موسم خریف کو کہا جاتا ہے لیکن یہاں مراد سال ہے کیونکہ خریف بھی سال میں ایک دفعہ آتا ہے۔ (ازلمعات و مرقاۃ)

خودکشی کا جرم:

”عن ابی ہریرۃ قال قال رسول الله ﷺ من تردى من جبل فقتل

نفسه فهو في نار جهنم يتردى فيها خالدا مخلدا فيها ابدا ومن تحسى

سما فقتل نفسه فسمه في يده يتحساه في نار جهنم خالدا مخلدا فيها
ابدا ومن قتل نفسه بحديدة فحديدته في يده يتوجا بها في بطنه في
نار جهنم خالدا مخلدا فيها ابدا..... بخاری و مسلم

(مشکوٰۃ کتاب القصاص)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص پہاڑ سے اپنے آپ کو
گرا کر قتل کر دے تو اسے جہنم کی آگ میں ہمیشہ اوپر سے نیچے گرایا جاتا رہے گا۔ اور جس شخص نے زہر
پی کر اپنے آپ کو قتل کر دیا تو اس کے ہاتھ میں زہر دیا جائے گا جو جہنم کی آگ ہمیشہ وہ پیتا رہے گا اور
جس شخص نے اپنے آپ کو کسی تیز دھار آلہ سے قتل کر دیا تو اس کے ہاتھ میں تیز دھار آلہ دیا جائے گا وہ
جہنم کی آگ میں اپنے آپ کو ہمیشہ اس سے قتل کرتا رہے گا۔

وضاحت: یعنی خودکشی کرنے والا جس طرح دنیا میں اپنے آپ کو قتل کرے گا قیامت کے دن
اسے ایسا ہی عذاب ہوگا۔ اور اسی طرح وہ اپنے آپ کو قتل کرے گا پھر زندہ کر دیا جائے گا پھر وہ اپنے
آپ کو قتل کرے گا۔ یہ سلسلہ لگاتار جاری رہے گا۔ جیسا کہ رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿كُلَّمَا نَضَجَتْ جُلُودُهُمْ بَدَّلْنَاهُمْ جُلُودًا غَيْرَهَا﴾

”جب بھی ان کے چمڑے جل جائیں گے ان کے بدلے ہم ان کو اور چمڑے دے دیں گے“

(رالم)

☆ ”عن ابی سعید و ابی ہریرۃ عن رسول اللہ ﷺ قال لو ان اهل السماء والارض
اشترکوا فی دم مؤمن لا کبھم اللہ فی النار رواہ الترمذی وقال هذا حدیث غریب“

(مشکوٰۃ کتاب القصاص)

حضرت ابو سعید اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر بیشک تمام
آسمان والے اور زمین والے کسی مومن کے خون (قتل میں شریک ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ ان کو آگ میں
اوندھا کر ادے گا۔

قتل عمد کا اور حکم: ابھی تک قتل عمد کا ایک حکم بیان ہوا کہ قاتل گھنکار ہوگا۔ اب دوسرا حکم بیان کیا جا رہا
ہے وہ ہے قصاص جیسا کہ اسی آیہ مبارکہ میں جو زیر بحث ہے مذکور ہے ﴿کتب علیکم القصاص
فی القتل﴾ ہاں البتہ جان بوجھ کر قتل کرنے سے قصاص کو حدیث پاک کے ذریعے مقید کیا گیا ہے۔

نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے ”العمد قود“، ای موجبہ ”جان بوجھ کر قتل کرنا قصاص کا سبب ہے۔

(من حدیث ابن عباس رواہ ابن ابی شیبہ)

عقل کا بھی یہی تقاضا ہے کہ عداً قتل کرنے سے جنایت کامل پائی جاتی ہے اس لئے اس پر زجر بھی کامل ہونی ضروری ہے سزا اس پر قصاص سے بڑھ کر اور کوئی نہیں اسی لئے قصاص مقرر کیا۔

(از ہدایہ اخیرین کتاب الجنایات)

قتل عمد کا اور حکم: ابھی تک دو حکم بیان کئے گئے ہیں کہ عداً قتل کرنے والا گہنگار ہوگا اور اس پر قصاص لازم ہوگا۔ تیسرا حکم یہ ہے کہ مقتول کے ورثاء اگر اسے معاف کر دیں تو جائز ہے اور اگر وہ کچھ مال لے کر معاف کر دیں تو ان کی مرضی رب تعالیٰ نے یہ حق ان کو دیا ہے۔ یہ دونوں حکم اسی زیر بحث آیہ کریمہ میں آگے (انشاء اللہ) آرہے ہیں جن پر مناسب بحث کر دی جائے گی۔

قتل عمد کا ایک اور حکم: ابھی تک قتل عمد کے تین حکم بیان کئے جا چکے ہیں چوتھا حکم یہ ہے:

”عن ابی ہریرۃ عن النبی ﷺ قال القاتل لا یرث“، اخرجہ الترمذی

فی الفرائض

کہ قاتل اگر اس شخص کو قتل کر دے جس کی وراثت اسے ملنی تھی تو یہ شخص وراثت سے محروم ہو جائے گا۔ کیونکہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قاتل وارث نہیں ہوتا۔

(ماخوذ از ہدایہ بمع حاشیہ کتاب الجنایات)

الْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْأُنْثَى بِالْأُنْثَى:

آزاد بدلے آزاد کے اور غلام بدلے غلام کے اور عورت بدلے عورت کے۔

جیسا کہ شان نزول سے بیان ہو چکا ہے کہ اوس اور خزرج کے حق میں یہ آیہ نازل ہوئی جب کہ ان میں سے ایک قبیلہ نے قسم اٹھائی ہوئی تھی کہ تم ہمارے غلام کو قتل کرو گے تو ہم تمہارے آزاد آدمی کو قتل کریں گے تم ہماری عورت کو قتل کروں گے تو ہم تمہارے مرد کو قتل کریں گے۔

اسلام لانے کے بعد جب انہوں نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا تو ان کو اس غلط طریقہ سے روک دیا گیا۔ کہ اگر غلام غلام کو قتل کرے تو غلام کو ہی قتل کیا جائے۔ اگر آزاد شخص آزاد کو قتل کرے تو آزاد قاتل کو ہی قتل کیا جائے۔ اگر مؤنث قتل کرے مؤنث کو تو مؤنث کو ہی قتل کیا جائے۔

آیہ کریمہ کا یہی مطلب جو شان نزول سے واضح ہوا:

﴿وَلَا يَدُلُّ عَلَىٰ أَنْ لَا يَقْتُلَ الْحُرَّ بِالْعَبْدِ وَالذَّكَرَ بِالْأُنْثَىٰ كَمَا لَا يَدُلُّ عَلَىٰ عَكْسِهِ﴾

آیہ کریمہ اس پر دلالت ہی نہیں کر رہی کہ غلام کا قاتل آزاد ہو تو آزاد کو قتل نہ کیا جائے یا مذکر قتل کر دے مؤنث کو تو مذکر کو قتل نہ کیا جائے۔ اسی طرح آیہ کریمہ سے اس کا عکس (الٹ) بھی ثابت نہیں کہ اگر غلام قتل کر دے آزاد کو تو غلام کو قتل نہ کیا جائے اور اگر مؤنث مذکر کو قتل کر دے تو مؤنث کو قتل نہ کیا جائے۔

(از بیضاوی مع زیادتی وضاحت)

مسئلہ: ہر وہ شخص جس کے خون کی حفاظت کا حکم شریعت نے دیا ہے یعنی مسلمان اور ذمی ان کو ناحق جان بوجھ کر کوئی شخص بھی قتل کر دے اس سے قصاص لیا جائے گا۔ قصاص میں مساوات خون کی حفاظت میں ہے نہ کی حریت اور عبدیت میں اور نہ ہی تذکیر و تانیث میں کیونکہ رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی مطلق ہے ﴿إِنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ﴾ بیشک نفس، نفس کے بدلے یعنی ایک جان کے بدلے جان کو ہی قتل کر کے قصاص لیا جائے۔

خیال رہے یہ آیہ مومنوں کے حق میں وہی حکم ثابت کر رہی ہے جو بنی اسرائیل کے لئے حکم تھا یہ آیہ منسوخ نہیں اور بنی اسرائیل سے خاص نہیں اور بنی اسرائیل کے عذاب کا اس میں ذکر نہیں۔ اور نبی کریم ﷺ کا ارشاد بھی مطلق ہے ”العمد القود“ جان بوجھ کر قتل کرنے میں قصاص ہے۔

(از ہدایہ مع حاشیہ)

مسئلہ: اگر مسلمان نے کسی ذمی کو قتل کر دیا تو مسلمان کو قصاص کے طور پر قتل کر دیا جائے گا ”عن

(دارقطنی)

ابن عمر ان رسول الله ﷺ قتل مسلما بمعاہد“

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے ذمی کے بدلے مسلمان کو قتل کرنے کا حکم دیا۔

(از ہدایہ مع حاشیہ)

مسئلہ: حربی کافر کو کسی مسلمان نے یا کسی ذمی نے دارالحرب میں قتل کر دیا ہو تو یہ قتل کرنا جائز

ہے لہذا اس کافر مقتول کے بدلے مسلمان یا ذمی کو قتل نہیں کیا جائے گا۔ رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿قَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ﴾

”ان لوگوں سے قتال کرو جو اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان نہیں رکھتے“

اور نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ” لا یقتل مؤمن بکافر “ (اخرجہ ابوداؤد عن علی)

مومن کو کافر کے بدلے قتل نہ کیا جائے۔
(از ہدایہ مع حاشیہ)

مسئلہ: اگر کوئی کافر دارحرب سے مسلمانوں کے ملک میں حاکم کی اجازت سے آتا ہے اسے کوئی مسلمان یا ذمی قتل کر دیتا ہے تو اس قتل کے بدلے مسلمان یا ذمی کو قتل نہیں کیا جائے گا اس لئے کہ یہ کافر ہمیشہ کے لئے محفوظ الدم نہیں اس نے لوٹ کر بھی جانا تھا اور مسلمانوں سے لڑائی بھی کرنی تھی۔

(از ہدایہ)

لیکن یہ کبھی نہ بھولیں کہ مسلمان اپنے حاکم کے وعدہ کے خلاف کام کرنے کی وجہ سے شدید گنہگار ہو گا خصوصاً آج کل کے بین الاقوامی قوانین کے مطابق دوسرے ممالک میں رہنے والے مسلمانوں کے لئے اس قسم کے عمل سے مشکلات پیدا ہوتی ہیں۔

اسی طرح ذمی اگر حربی کافر مستامن (جو اجازت لے کر آیا ہے) کو قتل کر دے تو وہ بھی مسلمانوں کے حاکم اور دوسرے مسلمانوں کیلئے مشکلات پیدا کرنے کا سبب بن رہا ہے۔ مسلمان حاکم کو اختیار ہے کہ امن لے کر آئیوالے کے قاتل کو تعزیری سزا دے ”قید یا کوڑوں سے“ قتل نہیں کر سکتا۔ (راقم)

مسئلہ: عورت کو مرد قتل کر دے تو عورت کے بدلے مرد کو قتل کر دیا جائے گا۔ اور اگر عورت نے مرد کو قتل کر دیا تو عورت کو مرد کے بدلے قتل کر دیا جائے گا۔ بڑے نے چھوٹے کو قتل کر دیا تو بڑے کو چھوٹے کے بدلے قتل کر دیا جائے گا۔ اور صحیح شخص نے نابینا کو یا چلنے پھرنے سے معذور شخص کو قتل کر دیا تو صحیح کو قصاص کے طور پر قتل کر دیا جائے گا۔ اور صحیح شخص نے اس شخص کو قتل کر دیا جس کا عضو کاٹا ہوا تھا۔ یا کوئی عضو شل تھا تو صحیح کو اس کے بدلے قتل کر دیا جائے گا۔ اسی طرح صحیح شخص نے پاگل کو قتل کر دیا تو اس کے بدلے صحیح کو قتل کر دیا جائے گا۔ وجہ سب میں ﴿إِنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ﴾ ”بیشک جان کے بدلے جان ہے۔“
(ماخوذ از ہدایہ)

مسئلہ: کسی شخص نے اپنے بیٹے کو قتل کر دیا تو گنہگار ہو گا، وراثت سے محروم ہو گا لیکن اسکے باپ ہونے کی تحریم کو دیکھتے ہوئے قصاص کے طور پر اسے قتل نہیں کیا جائیگا۔ ”لقوله عليه السلام لا یقاد

الوالد بولده“

(اخرجہ الترمذی وابن ماجہ فی الدیات عن عمر ابن الخطاب)

(حدیث مع النقایہ)

نبی کریم ﷺ نے فرمایا باپ سے بیٹے کا قصاص نہ لیا جائے۔

مسئلہ: اگر کوئی شخص آزاد کسی کے غلام کو قتل کر دے تو آزاد کو اس کے بدلے قتل کر دیا جائے گا۔

لیکن اگر کسی نے اپنے غلام کو قتل کر دیا تو اسے اس کے بدلے قتل نہیں کیا جائے۔ (ازہادیہ)

اعتراض: حدیث شریف میں ہے ”من قتل عبده قتلناه“ جس شخص نے اپنے غلام کو قتل کیا ہم اسے قتل کر دیں گے۔

جواب: ”ہو حدیث ضعیف“ یہ حدیث ضعیف ہے۔ (قرطبی)

نوٹ: بین الاقوامی قوانین کے مطابق آج کل کوئی غلام نہیں پائے جاتے گھریلو ملازم کو غلام سمجھنا نادانی ہے۔ (راقم)

مسئلہ: جب چند آدمی مل کر ایک مسلمان کو ناحق قتل کر دیں یا ذمی کو ناحق قتل کر دیں تو اس ایک مقتول کے بدلے تمام قاتلین کو قتل کر دیا جائے گا:

”عن سعید بن مسیب ان عمر بن الخطاب قتل نفرا خمسة او سبعة

برجل واحد قتلوه قتل غيلة وقال عمر لو تملا عليه اهل صنعاء

لقتلتهم جميعا“ (رواه مالک وروی البخاری عن ابن عمر نحوه ، مشکوٰۃ باب الدیات)

حضرت سعید بن مسیب فرماتے ہیں کہ بیشک حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے پانچ یا سات آدمیوں کو قتل کرنے کا حکم دیا جنہوں نے مل کر ایک شخص کو دھوکے سے چھپ کر قتل کر دیا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا اگر صنعاء کے تمام لوگ جمع ہو کر ایک شخص کے قتل میں ایک دوسرے کی امداد کرتے تو میں تمام کو قتل کرنے کا حکم نافذ کرتا۔

مسئلہ: اگر کوئی شخص مسلمانوں پر تلوار تان لیتا ہے یعنی ان کو قتل کرنے کی دھمکی دیتا ہے خواہ وہ شہر میں ہے یا باہر کہیں ہے دن ہو یا رات تو مسلمانوں کو حق پہنچتا ہے اسے قتل کر دیں اس شخص کے قتل میں نہ گناہ ہے اور نہ ہی قصاص ہے۔

ابونعیم نے بیان کیا ہے کہ تاریخ اصہبان میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: ”من شہر علی المسلمین سیفا فقد اطل دمه“ جس شخص نے مسلمانوں پر تلوار تان لی تحقیق اس نے

اپنا خون ضائع کر دیا۔

نسائی میں حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ سے مرفوع حدیث مروی ہے: ”من شہر سيفه ثم وضعه فلمه هدر“ جس شخص نے تلوار تان لی پھر رکھ دی تو اس کا خون معاف ہے۔ (ازہدلیۃ مع حاشیۃ)

مسئلہ: ایک شخص نے مسلمان یا ذمی کو زخمی کر دیا وہ ان زخموں سے ہی فوت ہو گیا تو یہ زخمی کرنے والا اب قاتل ہے اس کو اس شخص کے بدلے قتل کر دیا جائے گا۔ (ازہدلیۃ)

مسئلہ: جس شخص پر قصاص لازم تھا وہ فوت ہو جائے تو قصاص ساقط ہو جائے گا اب اس کے ورثاء پر کسی قسم کی کوئی ضمان لازم نہیں۔ (ازہدلیۃ)

قصاص صرف تیز دھار آلہ سے لیا جائے:

جب کسی شخص کو قصاص کے طور پر قتل کرنا ہے تو صرف تلوار یا کسی ایسے آلہ سے قتل کیا جائے جس سے اسے زیادہ تکلیف نہ ہو۔

”عن ابی بکر عن النبی ﷺ لا قود الا بالسيف“ (ابن ماجہ)

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ نے فرمایا قصاص نہیں سوائے تلوار کے۔ ”والمراد به السلاح“ نبی کریم ﷺ کے ارشاد گرامی میں تلوار سے مراد ہتھیار ہے۔ (ازہدلیۃ مع نقایۃ)

مفتی شجاعت علی قادری رحمہ اللہ کا فتویٰ راقم کی نظر سے گزرا جس میں آپ نے موجودہ طریقہ پھانسی دینے کو بھی جائز قرار دیا کہ اس میں ایسی تکلیف نہیں ہوتی جیسی ہڈی وغیرہ کے توڑنے سے ہوتی ہے ایک ہی جھٹکے سے انسان مر جاتا ہے۔

اعتراض: ایک حدیث شریف سے تو یہ سمجھ آتا ہے کہ جس طرح کوئی شخص دوسرے کو قتل کرے اسی طرح اس سے قصاص لیا جائے دونوں حدیثوں میں تطبیق کیسے ہوگی وہ حدیث شریف یہ ہے:

”عن انس ان يهود يارض رأس جارية بين حجرين فقبل له من فعل

بك هذا افلان افلان حتى سمي اليهودي فاومت برأسها فجنى

باليهودي فاعترف وامر به رسول الله ﷺ فرض رأسه بالحجارة“

(بخاری و مسلم، مشکوٰۃ کتاب القصاص)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک ایک یہودی نے ایک لڑکی کا سر دو پتھروں کے درمیان رکھ کر کوٹ دیا۔ (اس میں ابھی جان باقی تھی) اس سے پوچھا گیا تمہارے ساتھ یہ معاملہ کس نے کیا (کئی نام لئے گئے) کیا فلاں نے کیا؟ کیا فلاں نے کیا؟ یہاں تک کہ جب یہودی کا نام لیا گیا تو اس نے سر کے اشارے سے بتا دیا کہ ہاں اسی نے میرا سر کوٹ دیا ہے۔ یہودی کو لایا گیا اس نے اعتراف کر لیا رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا اس کا سر بھی پتھر سے کوٹ دیا گیا۔

اس حدیث پاک سے واضح ہوا جس طرح کوئی قتل کرے اسی طرح اس کو قصاص میں قتل کیا جائے۔ پہلا جواب: نبی کریم ﷺ نے یہودی کا سر پتھر سے پھوڑنے کا جب حکم دیا اس وقت کفار سے سخت طریقہ سے نمٹنے کا حکم تھا ”وقد کان ذلک جائزا علی وجہ المثلۃ کما سمل العربین ثم نسخ“ اس وقت مثلہ بنانا بھی جائز تھا کیونکہ عربینہ قبیلہ کے لوگوں کی آنکھیں نکالنے کا حکم بھی دیا گیا پھر مثلہ بنانا منسوخ کر دیا گیا۔

دوسرا جواب: حضرت انس رضی اللہ عنہ کی ایک روایت میں یہ ہے:

”فامر به النبی ﷺ ان یرجم حتی قتل ، فذكر فی هذا الحدیث
الرجم ولیس ذلک بقصاص عند الجميع“

کہ نبی کریم ﷺ نے حکم فرمایا کہ اس یہودی کو سنگسار کر دیا جائے یہاں تک کہ یہ قتل ہو جائے جب اس حدیث میں سنگسار کرنے کا حکم دیا گیا تو یہ بالاتفاق قصاص نہیں (اسی وجہ سے شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمہ اللہ نے لمعات میں ذکر فرمایا کہ یہ قتل قصاصاً نہیں تھا بلکہ سیاست تھا۔ تیسرا جواب: جب یہودی کو پتہ چلا کہ اب مجھے قتل کی وجہ سے قصاصاً قتل کر دیا جائے گا کیونکہ یہ معاہدہ (ذی) تھا۔ یہ مدینہ طیبہ بھاگ کر قریب ہی یہودیوں کے محلہ میں چلا گیا جو اس وقت دارحرب کے حکم میں تھا ”فاخذ بعد ذلک فقتله علی انه حربی ناقض للعہد“ بعد میں اسے پکڑ لیا گیا اور اسے پتھروں سے قتل کر دیا گیا اب قتل کرنے کی وجہ یہ تھی کہ یہ معاہدہ کو توڑ کر حربی بن چکا تھا۔

(از احکام القرآن للخصاص)

فَمَنْ عُفِيَ لَهُ مِنْ أَخِيهِ شَيْءٌ فَاتَّبَاعُ بِالْمَعْرُوفِ وَأَدَاءٌ إِلَيْهِ بِإِحْسَانٍ
تو وہ شخص معاف کر دیا گیا جسے اس کے بھائی کی طرف سے کچھ، تو پیچھا کیا جائے بھلائی سے، اور ادا

کرے اسے اچھے طریقہ سے۔

﴿فَمَنْ عُفِيَ لَهُ مِنْ أَخِيهِ شَيْءٌ﴾

ان الفاظ مبارکہ کی زیادہ مفسرین کرام کے نزدیک تفسیر یہ ہے کہ

العفو الصفح وترك عقوبة المستحق عفى عنه ذنبه وعفى له ذنبه " (قاموس)
"عفو" کا معنی ہے درگزر کرنا اور جس سزا کا وہ مستحق ہے اسے چھوڑ دینا یعنی وہ سزا نہ دینا۔ "عفو"
ذنب کی طرف بلا واسطہ متعدی ہے اور گناہ کرنے والے کی طرف "عن" سے متعدی ہونے کی
صورت میں پڑھا جاتا ہے "عفی عنه ذنبه" اور "لام" کے واسطہ سے متعدی ہونے کی صورت
میں پڑھا جاتا ہے "عفی له ذنبه" معنی دونوں صورتوں میں ایک ہی ہوتا ہے اس کے گناہ معاف کر
دیئے گئے۔

"من" مبتداء ہے، یا شرطیہ ہے، یا موصولہ، مراد اس سے "قاتل" ہے اور ﴿مِنْ أَخِيهِ﴾
میں "من" ابتدائیہ ہے اور ظرف لغو ہے متعلق ہے "عفی" کے اور "اخیه" میں "اخ" سے
مراد مقتول کا ولی ہے اور "ضمیر" لوٹ رہی ہے "من" کی طرف اور "شئی" کی تنکیر تبعیض پر دلالت
کر رہی ہے۔ اب مطلب یہ ہوگا کہ قاتل کو اس کے بھائی کی طرف سے کچھ معاف کر دیا گیا۔ مقتول
کے جو وارث ہیں وہی قصاص کا مطالبہ کرنے کے حقدار ہیں تمام قصاص کا مطالبہ کریں تو قاتل کو قصاص
کے طور پر قتل کر دیا جائے گا۔

لیکن یہ خیال کریں کہ قصاص کا فیصلہ صرف حکام یعنی قاضی کو کرنا ہوگا ان کے حکم سے قصاص لیا
جائے گا۔ مقتول کے ورثاء مطالبہ کریں گے اور قاضی فیصلہ کرے گا پھر قصاص جاری ہوگا مقتول کے
ورثاء قاضی کے فیصلہ کے بغیر اگر قاتل کو قتل کریں گے تو گنہگار ہوں گے۔ مقتول کے تمام ورثاء قاتل کو
معاف کر دیں یا کچھ لوگ معاف کر دیں تو قاتل سے قصاص نہیں لیا جائے گا۔

تنبیہ: ﴿فَمَنْ عُفِيَ لَهُ مِنْ أَخِيهِ شَيْءٌ﴾ سے معاف کرنے کی دو صورتیں بیان کی گئیں ہیں
ایک تو یہ ہے مقتول کے تمام ورثاء قصاص معاف کر دیں اور مال بھی نہ لیں۔

دوسری صورت یہ ہے کہ اگرچہ وہ قصاص تو معاف کر رہے ہیں لیکن مال لے کر صلح کرنا چاہتے

ہیں تو اس صورت میں یہ ہے:

”وَإِذَا اصْطَلَحَ الْقَاتِلُ وَأَوْلِيَاءُ الْقَتِيلِ عَلَى مَالٍ سَقَطَ الْقِصَاصُ وَرَجَبُ

الْمَالِ قَلِيلًا كَانَ أَوْ كَثِيرًا“

کہ جب قاتل اور مقتول کے ورثاء مال پر صلح کر لیں تو قصاص ساقط ہو جائے گا مال کی کوئی حد نہیں دونوں فریق جس پر رضاء مند ہو جائیں خواہ قلیل مال ہو یا کثیر ﴿فَمَنْ عُفِيَ﴾ سے مطلقاً معاف کرنا ثابت ہے یعنی بغیر مال لینے کے معاف کرنے کا بھی مقتول کے ولیوں کو حق حاصل ہے۔

﴿فَاتَّبَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ وَأَدَاءٌ إِلَيْهِ بِإِحْسَانٍ﴾

سے ثابت ہو رہا ہے کہ قصاص معاف کرنے کی دوسری صورت یہ ہے کہ مال پر فریقین کی صلح ہو جائے۔

”إِذَا فَلَهِ اتِّبَاعُ أَيْ فَلَوْلَى الْقَتِيلِ اتِّبَاعُ الْمَصَالِحِ بِالْمَعْرُوفِ أَيْ مَطَالِبَةُ

بِدَلِ الصَّلَاحِ عَلَى حَسَنِ مَعَامَلَتِهِ“

یعنی معروف طریقہ سے اتباع کا مطلب یہ ہے کہ مقتول کے ولی کے لئے یہ ہے کہ جب ان کی قاتل سے مال پر صلح ہو جائے تو اس سے مطالبہ کرنے میں اس کا پیچھا کرنے میں اچھے طریقہ سے درپیش آئے۔ یعنی سختی سے مطالبہ نہ کرے بلکہ نرمی سے مطالبہ کرے:

”﴿وَأَدَاءٌ إِلَيْهِ بِإِحْسَانٍ﴾ اِی وَعَلَى الْمَصَالِحِ اِدَاءُ اِلَى وَلِی الْقَتِيلِ

بِاحْسَانٍ فِی الْاِدَاءِ“

یعنی جب مال پر صلح ہو جائے تو قاتل کو بھی چاہئے کہ مقتول کے اولیاء (ورثاء) کو مال اچھی طرح ادا کر دے نہ اس میں کمی کرے اور نہ ہی تاخیر کرے کہ انہیں بار بار مطالبہ کرنا پڑے۔ (حدیث مع کفایہ) مقام توجہ: جب بعض ورثاء معاف کریں اور بعض معاف نہ کریں تو قصاص ساقط ہو جائے گا لیکن دیت مقرر ہوگی جن لوگوں نے معاف نہیں کیا ان کی کل دیت سے وراثت کے حساب سے جتنا مال ملنا ہوگا وہ دے دیا جائے گا۔ اور جنہوں نے معاف کر دیا ان کا جو حصہ ہوگا اس کا فائدہ قاتل کو ہوگا۔

(از ہدایہ)

مقرر دیت کیا ہے؟ ایک سواونٹ، یا ایک ہزار دینار، یا دس ہزار درہم، ان میں سے جو چاہے دے۔ ایک ہزار دینار کا وزن: دینار سونے کا سکہ ہے ایک ہزار دینار کا وزن 375 تو لے سونا ہے

دس ہزار درہم: درہم چاندی کا سکہ ہے دس درہم کا وزن 2625 تو لے چاندی ہے۔

﴿مِنْ أَخِيهِ﴾ سے ایک لطیف اشارہ: جو تفسیر بیان کی جا رہی ہے اس کے مطابق مطلب یہ ہے کہ قاتل کو اس کے بھائی کی طرف سے معاف کر دیا جائے۔ بھائی کہہ کر مقتول کے ورثاء کو معاف کرنے کی ترغیب دی گئی کہ اگرچہ قاتل نے تمہارے رشتہ دار کو قتل کر کے سنگین جرم کا ارتکاب کیا ہے۔ جس کی وجہ سے انتقام کی آگ کا دلوں میں بھڑکنا قدرتی بات ہے لیکن یہ نفس کا تقاضا ہے کہ اسے قتل کر دیا جائے۔

اگر تم غور کرو تو یہ بات تمہیں سمجھ آ جائے گی کہ وہ گھنہگار تو ہے لیکن اس کا ایمان تو ضائع نہیں ہوا لہذا وہ ایمان کی وجہ سے دین کی وجہ سے تمہارا بھائی ہے بھائی کے لئے یہی بہتر ہے کہ اپنے بھائی کو معاف کر دے زیادہ بھلائی تو اس میں ہے کہ بغیر مال لینے کے معاف کر دو ہاں اگر یہ نہیں کر سکتے تو مال لے کر معاف کر دو یہ بھی تمہاری طرف سے قاتل پر احسان ہوگا۔ اگر تم یہ بھی نہیں کر سکتے تمہارے انتقام کی آگ بغیر بدلہ لینے کے ٹھنڈی نہیں ہوتی تو قاضی کے پاس مقدمہ لے جاؤ تا کہ وہ قصاص کا فیصلہ کر دے۔ قصاص کا حق دے کر تجاوز سے منع کر دیا گیا کہ کہیں ایک کے بدلے کئی کو قتل نہ کر دو قاتل غلام ہو تو آزاد کو قتل نہ کر دینا، اور اسی طرح قتل کرنے والی عورت ہو تم مذکر کو نہ قتل کر دینا اگر رب تعالیٰ کے حکم کو ٹھکراؤ گے اور حد سے تجاوز کرو گے تو دردناک عذاب میں مبتلا ہو جاؤ گے۔

﴿فَمَنْ عُفِيَ﴾ میں دوسرا احتمال: ”من“ سے مراد قاتل ہو ”عفی“ متضمن ہو ”عافی“ معاف کرنے والے کو وہ ہے مقتول کا ولی اور ”اخ“ سے مراد مقتول اور ”ششی“ سے مراد خون۔ اب معنی یہ ہوگا ”ان القاتل اذا عفا عنه ولی المقتول عن دم مقتوله“ بیشک قاتل کو جب مقتول کا ولی اپنے مقتول بھائی کا خون معاف کر دے تو قصاص ساقط ہو جائے گا بغیر مال کے معاف کرے یا مال سے معاف کرے۔

ذَلِكَ تَخْفِيفٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ: یہ تخفیف ہے تمہارے رب کی طرف سے اور رحمت یعنی اہل توراۃ کے لئے قتل کے بعد صرف قتل تھا اور اہل انجیل کے لئے صرف معاف کرنا تھا لیکن نبی کریم ﷺ کی امت کے لئے تخفیف کر دی گئی اور رحمت کرتے ہوئے ان کے لئے حکم آسان کر دیا گیا

”فمن شاء قتل ومن شاء اخذ الدية ومن شاء عفا“ جو شخص چاہے قصاص لے جو چاہے معاف کر دے جو چاہے مال لے لے۔

فَمَنْ اعْتَدَىٰ بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهُ عَذَابٌ اَلِيْمٌ :

جو شخص تجاوز کرے گا اس کے بعد تو اس کے لئے عذاب ہوگا دردناک۔

زمانہ جاہلیت میں پہلے دیت طے کر کے صلح کر لیتے جب قاتل مطمئن ہو جاتا کہ اب مجھے قتل نہیں کیا جائے گا پھر موقع پا کر اسے قتل کر دیا جاتا۔ اس بری رسم کو ختم کرنے کے لئے رب تعالیٰ نے حکم فرمایا کہ جو شخص دیت طے کر کے پھر اللہ تعالیٰ کے حکم سے تجاوز کرتے ہوئے قتل بھی کرے گا اس کے لئے دردناک عذاب ہوگا۔ (از قرطبی)

ضیاء القرآن کی ضیاء پاشیاں: اسلام سے پہلے عرب میں دستور تھا کہ اگر طاقتور قبیلے کا کوئی شخص قتل کر دیا جاتا تو وہ صرف قاتل کے قتل پر اکتفاء نہ کرتے بلکہ قاتل کے قبیلہ کے دس دس بیس بیس آدمی قتل کرنا اپنا حق سمجھتے اگر کسی آزاد کو غلام قتل کر دیتا تو غلام کے بدلے غیر قاتل آزاد کا سر قلم کیا جاتا اور اگر عورت قتل کرتی تو مرد قتل کیا جاتا اسی ظالمانہ اور غیر اسلام دستور پر صدیوں عمل ہوتا رہا اور عرب اپنی نسلی نخوت اور قبائلی برتری کی تسکین بے گناہوں کا خون بہا بہا کر کرتے رہے قرآن کریم نے اس دستور کو ایک قلم منسوخ کر دیا اور حکم دیا کہ مقتول کا قاتل ہی قصاص میں قتل کیا جائے گا خواہ وہ مرد ہو یا عورت آزاد ہو یا غلام۔

یہ رواج صرف عرب ہی میں نہ تھا بلکہ دوسری قوموں میں بھی تھا بلکہ آج تک یورپ کی حکمران قومیں بھی اس پر عمل پیرا رہی ہیں جنوبی افریقہ کے حبشی آسٹریلیا کے اصلی باشندے اور امریکہ کے ریڈ انڈین آج بھی اس پر شاہد ہیں یہ فخر اسلام کو ہی حاصل ہے کہ اس نے جھوٹے امتیازات کے بت مدت ہوئی پاش پاش کر دیئے اور انسانی مساوت کا صرف قانون ہی پیش نہیں کیا بلکہ عمل کر کے دکھا دیا۔

(ضیاء القرآن)

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يَّأُولٰٓئِی الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ

- (۱) ”اور خون کا بدلہ لینے میں تمہاری زندگی ہے اے عقل مندو کہ تم کہیں بچو۔“
(۲) اور تمہارے لئے قصاص میں عظیم زندگی ہے اے عقل والو تا کہ تم بچ جاؤ۔“

جب پہلی آیہ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے قاتل کیلئے جو حکم بیان کیا ہے اسے اپنی رحمت قرار دیا ہے تو بظاہر اس میں وہم ہوتا ہے کہ عبد ضعیف کو قصاص کا حکم دینے میں رحمت باری تعالیٰ کیسے؟ جب کہ بظاہر تو اس میں شدت پائی جاتی ہے۔ اس آیہ کریمہ میں قصاص کی حکمت بیان کی جا رہی ہے جب انسان کو قصاص کی حکمت کا پتہ چل جائے گا تو خود بخود سمجھ آ جائیگا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی عظیم رحمت ہے۔ (از کبیر)

قصاص میں حکمت: جب قاتل کو یہ پتہ چل جائے کہ اگر میں نے قتل کیا تو مجھے اس کے بدلے میں قتل کیا جائے تو وہ یقیناً قتل کرنے سے رک جائے گا اس طرح دو جانوں کی حفاظت ہوگئی۔ جسے قتل کرنے کا ارادہ تھا جب قتل نہ کیا تو اسے حیات حاصل ہوگئی قاتل جب قتل سے رک گیا تو قصاص سے بچ گیا اسے زندگی حاصل ہوگی۔

﴿حَیۡوَة﴾ سے حیات عظیمہ کا ذکر: ﴿حَیۡوَة﴾ کو نکرہ ذکر کیا جس کی تنوین تعظیم پر دلالت کرتی ہے جس کا مطلب ہے اور تمہارے لئے قصاص میں عظیم زندگی ہے۔

حیات عظیمہ کیسے؟ اس لئے کہ زمانہ جاہلیت میں دستور یہ تھا کہ اگر ایک شخص قتل ہو جاتا تو دونوں فریقوں میں قتل عام شروع ہو جاتا جب قصاص مقرر کیا گیا تو یہ بری رسم یک لخت ختم ہوگئی کیونکہ اب ہر شخص کو معلوم ہو رہا تھا کہ جو قتل کرے گا اگر مقتول کے ورثاء نے مطالبہ کیا تو اسے اس کے بدلہ میں قتل کر دیا جائے گا۔ اس طرح قصاص کے قانون سے کئی لوگوں کی جانیں بچ گئیں یہی تو حیات عظیمہ ہے۔

آج کل اپنے معاشرہ کو دیکھیں اسلام قوانین پر فیصلے نہ ہونے کی وجہ سے اور حکام کے لئے علیحدہ قوانین پیسے والوں کے لئے علیحدہ قوانین، غنڈوں کے لئے علیحدہ قوانین نے ہی تو قتل و غارت اور لوٹ مار کا بازار گرم کر رکھا ہے قانون کے شکنجے میں صرف غریب اور شریف آتا ہے۔

کاش کی کہ عدل و انصاف پر فیصلے ہوتے غریب اور امیر رعایا اور حکام کے لئے ایک جیسے قوانین

ہوتے اسلام کا نظام عدل قائم ہوتا اور قصاص کا قانون انصاف کے تقاضوں کے مطابق ہوتا تو قتل و غارت کا سلسلہ بند ہو جاتا۔

نظام قصاص سے لڑائے جھگڑے کی روک تھام:

قصاص کا لغوی معنی صرف بدلہ لینا ہے اور سورۃ مائدہ میں قصاص کے قانون کو عام کر کے جان کے بدلے جان اور آنکھ کے بدلے آنکھ اور ناک کے بدلے ناک اور کان کے بدلے کان اور دانت کے بدلے دانت اور زخمی کرنے پر بھی قصاص کو نافذ کر کے مطلقاً لڑائی جھگڑے کا دروازہ بند کر دیا۔ انگریز کے پجاری شرعی قوانین پر عمل کر کے تو دیکھیں پھر ان کی برکات اور ان پر مرتب ہونے والے کمالات کو دیکھیں۔

(ماخوذ از کبیر)

قصاص میں زندگی کی ایک اور وجہ:

”اتفق ائمة الفتوى على انه لا يجوز لاحد ان يقتص من احد حقه دون السلطان“

اس پر فتویٰ دینے والے ائمہ کرام کا اتفاق ہے کہ کسی شخص کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ خود ہی قصاص لے بلکہ قصاص صرف بادشاہ اور اس کی طرف سے مقرر کیا ہوا قاضی (جج) دلا سکتا ہے۔ اس قانون سے بھی لوگوں کا قتل کے معاملہ میں حد سے تجاوز کرنا ختم ہوا جس نے قتل عام سے لوگوں کو بچا لیا جو حیات عظیمہ کا سبب بنا۔

(ماخوذ از قرطبی)

نبی کریم ﷺ کا اپنے آپ کو قصاص کے لئے پیش کرنا:

”عن ابی سعید الخدری قال بینا رسول اللہ ﷺ یقسم شیئا اذا کب علیہ

رجل فطعنہ رسول اللہ ﷺ بعرجون کان معہ فصاح الرجل فقال له رسول اللہ

(تعال) فاستقد، قال بل عفوت یا رسول اللہ“ (رواہ النسائی)

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ ہمارے درمیان کچھ چیز تقسیم فرماتے ایک شخص آپ پر اوٹھا گرا آپ کے پاس کھجور کی چھڑی تھی جس سے آپ نے اسے ضرب لگائی وہ شخص چلایا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا (آؤ) بدلہ لے لو اس نے عرض کیا یا رسول اللہ میں آپ کو معاف کر رہا ہوں۔ اس شخص نے بدلہ پیش نہیں لیا لیکن نبی کریم ﷺ کا اپنے آپ کو بدلہ کے

لئے پیش کرنا درحقیقت قانون کی حکمرانی کو ثابت کرنا تھا۔

”عن ابی فراس قال خطب عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ فقال الا
من ظلمہ امیرہ فلیرفع ذلک الی اقیده منہ فقام عمرو بن العاص فقال
یا امیر المؤمنین لئن ادب رجل منا رجلا من اهل رعیته لتقصنه منہ
قال کیف لا اقصنه منہ وقد رأیت رسول اللہ ﷺ یقص من نفسه“

(رواہ ابو داؤد الطیالسی)

حضرت ابو فراس کہتے ہیں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے خطبہ دیا تو آپ نے فرمایا
خبردار جس شخص پر اس کے امیر (گورنر) نے ظلم کیا وہ معاملہ میرے پاس لایا گیا تو میں اس سے قصاص
(بدلہ) لوں گا حضرت عمرو بن عاص کھڑے ہوئے عرض کرنے لگے اے امیر المؤمنین اگر کسی امیر نے
کسی شخص کو ادب سکھانے کے لئے مار دیا تو پھر بھی آپ قصاص لیں گے؟ آپ نے فرمایا کیوں میں
قصاص نہ لوں جب میں نے نبی کریم ﷺ کو دیکھا کہ آپ نے اپنے آپ کو قصاص کے لئے پیش کیا۔

(ماہود از قرطی)

يَأُولَى الْأَلْبَابِ : ”اے عقل والو“ اولوالالباب سے مراد کامل عقل والے، کامل عقل والوں کو
خطاب اس لئے کیا گیا کہ وہ عقل سے سوچیں اور سمجھیں کہ قصاص میں حیات عظیمہ ہے۔ (از بیضاوی)
لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ : ”تا کہ تم بچ جاؤ“ یعنی قصاص پر عمل کر کے قتل سے بچ جاؤ اور اللہ تعالیٰ کے حکم پر
عمل کر کے گناہوں سے بچ جاؤ۔ یہی اسباب ہیں تقویٰ کے۔

(از بیضاوی)

مقام توجہ: اگرچہ قصاص کے ساتھ ساتھ معاف کرنے اور خون بہا لینے کا بھی اختیار دیا گیا لیکن انسانی
فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ انتقام لے کر ہی اپنے غصہ کو ٹھنڈا کرتا ہے اسی لئے ذکر فرمایا ﴿وَلَكُمْ فِي
الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ﴾ اور تمہارے لئے قصاص میں عظیم زندگی ہے۔

علامہ رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ﴿يَأُولَى الْأَلْبَابِ﴾ سے مراد وہ عقلاء ہیں جو عواقب کو
پہچانتے ہیں اور وجوہ خوف کو جانتے ہیں جب وہ کسی دشمن کو قتل کرنے کا ارادہ کریں گے تو انہیں معلوم
ہو جائیگا کہ ہم سے قصاص لیا جائیگا کوئی عقل مند انسان اپنی جان کو ہلاکت میں ڈال کر غیر کو قتل نہیں کرتا۔
جب اسے خوف دامن گیر ہوگا تو وہ یقیناً قتل سے رک جائیگا جو دونوں کیلئے زندگی کا سبب بنے گا اسی لئے
رب تعالیٰ نے عقل والوں کو خطاب کیا۔ بے وقوف جبلاء کو یہ نقطہ کیسے سمجھ آ سکتا ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

قرآن پاک کی فصاحت: رب تعالیٰ نے جس مضمون کو ﴿فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ﴾ کو پیش کیا اسی مضمون کو عرب حضرات ان جملوں سے ادا کرتے ”قتل البعض احياء للجميع“ بعض کا قتل تمام کی زندگی ہے، اور کبھی کہتے ”اکثروا القتل ليقل القتل“ زیادہ قتل کرو تا کہ قتل میں کمی واقع ہو جائے۔ ان کے نزدیک زیادہ فصیح کلمہ یہ تھا ”القتل انفى القتل“ قتل نفی کرتا ہے قتل کی۔ لیکن غور کیا جائے تو رب تعالیٰ کے ارشاد ﴿فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ﴾ کے مقابل القتل انفى للقتل کو فصاحت میں ہونی حیثیت ہی حاصل نہیں آئے ان دونوں میں چند وجہ سے فرق دیکھئے:

(۱) ﴿فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ﴾ میں الفاظ کم ہیں مقاصد زیادہ کیونکہ یہ دس حروف ہیں اس لئے کہ تنوین مستقل حرف نہیں بلکہ دوسرے حرف کے تابع ہے۔ اور ”القتل انفى للقتل“ میں چودہ حروف ہیں اور وہ مقاصد بھی حاصل نہیں جو ﴿فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ﴾ سے حاصل ہیں۔

(۲) ان دونوں جملوں میں اور فرق یہ ہے کہ ﴿فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ﴾ میں اطراد پایا گیا ہے یعنی یہ ضابطہ لگا تار جاری ہے کیونکہ ہر قصاص میں عظیم زندگی حاصل ہے لیکن ”القتل انفى للقتل“ میں اطراد نہیں کیونکہ ”فان القتل ظلما ادعى للقتل“ ظلماً قتل زیادہ قتل کا سبب بنتا ہے قتل کو روکتا نہیں۔

(۳) ﴿فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ﴾ میں تنوین عظمت پر دلالت کر رہی ہے کہ قصاص میں عظیم زندگی ہے لیکن یہ کمال ”القتل انفى للقتل“ میں نہیں کیونکہ اس میں مطلقاً ذکر ہے کہ قتل روکتا ہے قتل کو۔

(۴) ﴿فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ﴾ میں صنعت طباق پائی گئی ہے کہ ضد سے ایک عظیم حکم ثابت کیا گیا ہے کیونکہ بظاہر قصاص زوال حیات پر دلالت کرتا ہے لیکن حقیقت میں حصول حیات عظیمہ کا ذریعہ ہے۔ اس صورت کا تصور تک ”القتل انفى للقتل“ میں نہیں پایا گیا۔

(۵) ﴿وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ﴾ میں واضح طور پر بیان کیا گیا ہے کہ قصاص سے بالذات حیات حاصل ہوتی ہے یعنی قصاص بالذات حیات پر دلالت کر رہا ہے اور ”القتل انفى للقتل“ سے اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے واسطوں کی ضرورت ہے۔

(۶) ﴿وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ﴾ میں ایک عجیب و غریب حکمت پہلے بیان ہوئی کہ اس میں ایک ضد سے دوسری ضد کا ثبوت پایا گیا۔ اور کمال یہ ہے کہ قانون یہ ہے کہ ظرف جب اپنے مظروف پر مشتمل

ہو تو مظروف کے اجزاء کو بکھرنے سے بچا لیتی ہے ”فکان القصاص فیما نحن فیہ یحمی الحیاة من الآفات“ اس قانون کو مد نظر رکھتے ہوئے زیر بحث الفاظ گرامی کا کمال خود بخود واضح ہو جاتا ہے کہ قصاص حیات کو آفات سے بچاتا ہے قصاص یادیت وغیرہ لینے کے بعد رب تعالیٰ نے تجاوز سے منع فرما دیا اور تجاوز کرنے پر دردناک عذاب کا ذکر فرمایا۔ لیکن یہ ”القتل انفی للقتل“ کو حاصل نہیں۔

(۷) وہ جملہ جو تکرار سے خالی ہو اس میں مطالب کو سمجھنا قریب ہوتا ہے اور عربی کی روانگی میں خصوصی ذوق پایا جاتا ہے یہ کمال ﴿وَلَكُمْ فِی الْقِصَاصِ حَیْوةٌ﴾ کو حاصل ہے۔ لیکن ”القتل انفی للقتل“ میں تکرار ہے آخری کلمہ پہلے کلمہ پر مرتب ہے تکرار کی وجہ سے اس میں نہ ذوق ہے اور نہ ہی مطالب کو سمجھنا قریب ہے۔

(۸) ”القصاص“ میں الف لام جنسی ہے جو قتل اور مارنے اور زخمی کرنے کو شامل ہے یعنی قتل اور مار اور زخمی کرنے اور اعضاء کے کاٹنے میں بدلہ لینا عظیم زندگی کا سبب ہے جس میں جرائم کی روک تھام پائی جاتی ہے۔ اور ”القتل انفی للقتل“ میں صرف قتل کو ختم کرنا بھی لازم نہیں آتا مار یا زخمی کرنا یا اعضاء کو کاٹنے کی روک تھام اس جملہ سے سمجھ نہیں آئی۔

(۹) ”القتل انفی للقتل“ میں ”انفی“ فعل کا وزن ہے جس سے زیادتی کی نفی تو سمجھ آتی ہے لیکن اصل فعل کی نفی سمجھ نہیں آتی یعنی یہ سمجھ آتا ہے کہ قتل زیادہ قتل کو روکتا ہے لیکن یہ سمجھ نہیں آتا کہ قتل مطلقاً قتل کو روکتا ہے۔ یہ کمال صرف ﴿فِی الْقِصَاصِ حَیْوةٌ﴾ کو حاصل ہے۔

(۱۰) ﴿فِی الْقِصَاصِ حَیْوةٌ﴾ سے پتہ چلتا ہے کہ قصاص سے دنیاوی زندگی حاصل ہوتی ہے کیونکہ قتل اور عظیم فتنہ و فساد کی روک تھام حاصل ہوتی ہے۔ اور اخروی زندگی بھی حاصل ہوتی ہے کیونکہ جب مومن سے قصاص لیا جائے گا تو یقیناً وہ توبہ بھی کر لے گا جو اس کی نجات اور اخروی زندگی کے حصول کا سبب بنے گا۔ لیکن یہ مقاصد ”القتل انفی للقتل“ سے حاصل نہیں ہوتے سب سے بڑی بات یہ ہے کہ انسانوں کے کلام کو رب تعالیٰ کے کلام سے نسبت ہی کیا ہے۔

(ماخوذ از روح المعانی و کبیر)

﴿كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدُكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا الْوَصِيَّةَ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ﴾

- (۱) ”تم پر فرض ہوا کہ جب تم میں کسی کو موت آئے اگر کچھ مال چھوڑے تو وصیت کر جائے اپنے ماں باپ اور قریب کے رشتہ داروں کے لئے موافق دستور یہ واجب ہے پرہیز گاروں پر۔“
- (۲) ”فرض کیا گیا تم پر جب حاضر ہو تم میں سے کسی ایک پر موت اگر چھوڑے کچھ مال تو وصیت کرے والدین اور قریبی رشتہ داروں کے لئے اچھی طرح ثابت ہے پرہیز گاروں پر۔“

شان نزول: آیۃ میراث جو سورۃ نساء میں ہے اس کے نازل ہونے سے پہلے جو شخص فوت ہونے کے قریب ہوتا اس پر لازم تھا کہ وہ اپنے والدین اور قریبی رشتہ داروں کیلئے عدل و انصاف سے وصیت کر جائے تاکہ ان کو مال ان کے رشتوں کے لحاظ سے مناسب مقدار میں مل جائے۔ پھر رب تعالیٰ نے وراثت کے حصہ داروں کا خود ہی حصہ مقرر فرما دیا جس کی وجہ سے وصیت کرنے کی فرضیت منسوخ ہو گئی خصوصاً ورثاء کے لئے وصیت کرنا منع قرار دے دیا گیا۔

حدیث پاک سے اس آیۃ کی منسوخیت: رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

”ان الله قد اعطى كل ذي حق حقه ولا وصية لوارث“

”بیشک اللہ تعالیٰ نے ہر صاحب حق کو (وراثت سے) حق دے دیا، وارث کے لئے کوئی وصیت نہیں۔“

اعتراض: یہ حدیث خبر واحد ہے خبر واحد سے قرآن پاک کی آیۃ کو منسوخ کرنا درست نہیں اس حدیث کے متعلق صرف یہ کہا جاسکتا ہے کہ اسے امت نے قبول کیا ہے ”والحدیث من الاحاد تلقی الامۃ له بالقبول لا يلحقه بالمتواتر“ خبر واحد کو اگر امت قبول کر لے تو وہ خبر متواتر نہیں بن جاتی۔

نیز اس حدیث کو بخاری اور مسلم نے ذکر نہیں کیا ان کا نہ ذکر کرنا دلیل ہے اس پر کہ یہ حدیث قابل حجت نہیں اور آیۃ میراث میں صراحۃ منسوخیت کا ذکر ہی نہیں تو منسوخ کرنا کیسے صحیح ہے۔

(از بیضاوی)

پہلا جواب: آیہ میراث میں ورثاء کے حصے مقرر کر دیئے گئے اس سے اتنا پتہ چل گیا کہ اب مرنے والے کو حصے مقرر نہیں کرنے۔ حدیث پاک سے آیہ میراث کو تائید مل گئی اور حدیث پاک ناخ بن گئی جہاں تک یہ اعتراض ہے کہ حدیث خبر واحد ہے ناخ نہیں بن سکتی اس کا جواب یہ ہے کہ یہ حدیث خبر واحد نہیں بلکہ مشہور ہے اگرچہ صحابہ کرام کے دور میں درجہ احاد میں ہے لیکن تابعین اور تبع تابعین کے دور میں اس کے راوی کثیر ہو گئے۔

”وان الاحناف يجوزون النسخ بالحديث المشهور احد قسمی

المتواتر عند ابی یوسف رحمه الله فيجوز نسخ الكتاب به“

یہ حدیث مشہور ہے اور مشہور حدیث قرآن پاک کے لئے ناخ ہے کیونکہ امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے نزدیک متواتر کی دو قسمیں ہیں یا اس کا تواتر صحابہ کرام کے زمانہ سے ثابت ہوگا یا تابعین اور تبع تابعین کے زمانہ میں تواتر ثابت ہوگا۔ یہی دوسری قسم متواتر کی وہ قسم ہے جس سے نسخ قرآن جائز ہے۔

(از شیخ راہ)

دوسرا جواب: ہم کہتے ہیں کہ آیہ میراث سے اتنا پتہ چل گیا کہ ورثاء کے حقوق رب تعالیٰ نے خود مقرر فرمادیئے ہیں قریب المرگ شخص کو ان کے لئے وصیت نہیں کرنا۔

حدیث پاک سے یہ ثابت ہو گیا کہ وارث کے لئے وصیت جائز نہیں۔ حدیث پاک سے ثابت ہونے پر اجماع امت ہو گیا کہ وارث کے لئے وصیت جائز نہیں۔ اجماع امت ناخ ہے جیسا کہ مؤلفہ قلوب کا حق زکوٰۃ میں اجماع امت سے منسوخ ہے۔

جہاں تک یہ کہنا ہے کہ بخاری اور مسلم نے اس حدیث کو نہیں ذکر کیا لہذا یہ حدیث قابل حجت نہیں۔ یہ قول معتبر ہی نہیں۔ حدیث کی سند کو دیکھنا مقصود ہوتا ہے یہ مقصود ہی نہیں کہ فلاں کتب میں آنا ضروری ہے آئیے اس حدیث کی اسناد اور کتب احادیث کو دیکھیں کہ یہ حدیث کس درجہ کی ہے۔

”ونور دھہنا احادیث یصلح ان یکون سندا للاجماع منها حدیث

ابی امامۃ الباہلی قال سمعت رسول الله ﷺ یقول فی خطبة حجة

الوداع ان الله قد اعطی کل ذی حق حقه فلا وصیة لوارث“

(رواہ ابو داؤد والترمذی والنسائی وابن ماحہ وقال الحافظ حسن الاسناد)

ہم چند احادیث ذکر کرتے ہیں جو اجماع امت کے لئے سند ہیں ان احادیث میں ایک حدیث ابو امامہ باہلی نے روایت کی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو حجۃ الوداع میں ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ بیشک اللہ تعالیٰ نے ہر صاحب حق کو (وراثت میں) حق دے دیا ہے تو وارث کے لئے کوئی وصیت نہیں۔ اس حدیث کو ابو داؤد اور ترمذی اور نسائی اور ابن ماجہ نے بیان کیا ہے یہ حدیث سند کے لحاظ پر حسن ہے:

”و کذا رواہ احمد والترمذی والنسائی وابن ماجہ من حدیث عمرو بن خارجہ“

اسی طرح یہ حدیث احمد اور ترمذی اور نسائی اور ابن ماجہ نے عمرو بن خارجہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے ”ورواہ ابن ماجہ من حدیث سعید بن سعید عن انس“ اور یہی حدیث ابن ماجہ نے سعید بن سعید کی روایت حضرت انس رضی اللہ عنہ سے بھی ذکر فرمائی ہے:

”والبیہقی من طریق الشافعی عن ابن عیینہ عن سلیمان الا حول عن مجاہد ان رسول اللہ ﷺ قال لا وصیۃ لوارث“

بیہقی نے امام شافعی رحمہ اللہ سے انہوں نے ابن عیینہ سے انہوں نے سلیمان احوال سے انہوں نے مجاہد سے روایت ذکر کی ہے بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”وارث کیلئے وصیت نہیں“۔

(ماخوذ از مظہری)

یہاں تک جو بحث ذکر کی ہے اس سے پتہ چل گیا کہ والدین کے لئے اور قریبی رشتہ داروں کے لئے وصیت کرنا فرض تھا جو منسوخ ہو گیا۔

اب اعلیٰ حضرت کا ترجمہ بلا غبار سمجھ آئے گا کیونکہ آپ نے ”خیسرا“ کا ترجمہ کیا ہے ”کچھ مال“ اور ”حقاً“ کا ترجمہ کیا ہے ”واجب“ اس لئے کہ جب وصیت فرض تھی اس وقت جتنا مال بھی ہوتا اس میں وصیت فرض تھی اس میں قلیل و کثیر کی کوئی حد نہیں تھی۔

کُتِبَ عَلَیْکُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدُکُمُ الْمَوْتُ :

﴿اِذَا حَضَرَ﴾ سے مراد موت کے آثار جب ظاہر ہوں۔

اِنْ تَرَکَ خَیْرًا الْوَصِیَّةُ : ﴿خَیْرًا﴾ سے مراد مال ہے جیسا کہ ﴿قُلْ مَا اَنْفَقْتُمْ مِنْ خَیْرٍ﴾ سے مراد مال ہے ﴿وَ اِنَّهُ لِحُبِّ الْخَیْرِ لَشَدِیْدٌ﴾ میں بھی خیر سے مراد مال ہے۔

لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ : ﴿أَقْرَبِينَ﴾ سے مراد قریبی رشتہ دار ہیں بالمعروف سے مراد عدل و انصاف سے اسی لئے اعلیٰ حضرت نے ترجمہ کیا ہے موافق دستور۔

راقم نے ظاہری معنی کر دیا ہے اچھے طریقہ سے یعنی شرعاً جو اچھا طریقہ ہوگا اس میں یقیناً عدل و انصاف ہوتا ہی ہے۔ مفہوم کافی حد تک واضح ہو گیا کہ تم پر وصیت کرنا فرض قرار دے دیا گیا ہے جب تم پر آثار موت ظاہر ہوں وہ وصیت اس وقت فرض ہوگی جب تمہارا مال پیچھے رہ رہا ہوگا۔ اور وہ وصیت والدین اور قریبی رشتہ داروں کے لئے ہے۔

حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ : اعلیٰ حضرت نے ﴿حَقًّا﴾ کا معنی ”واجب“ کیا ہے اور راقم نے لغوی معنی کیا ہے ”ثابت“ بظاہر وہم ہوتا ہے کہ یہ حکم عام ہے صرف متقین کے ساتھ خاص نہیں تو متقین کا ذکر کیسے صحیح ہے؟ تو اس کا ایک جواب یہ دیا گیا ہے ﴿وَالْمُرَادُ بِالْمُتَّقِينَ الْمُؤْمِنُونَ﴾ متقین سے مراد مومنین ہیں۔ یعنی ذکر خاص اور مراد عام ہے البتہ متقین ذکر کر کے اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ ہر مومن کو چاہئے کہ وہ تقویٰ اختیار کرے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ اگرچہ حکم عام ہے لیکن متقین کا ذکر کر کے یہ بتایا گیا ہے:

”ان المحافظة على الوصية والقيام بها من شعائر المتقين الخائفين من الله تعالى“

کہ وصیت پر عمل کرنا اور اس کے حقوق کی حفاظت کرنا متقین کی علامت ہے یہ کام وہی کرتے ہیں جن کے دل میں اللہ تعالیٰ کا خوف ہو اور تقویٰ حاصل ہو۔ (ماخوذ از روح المعانی)

وہ وصیت جو منسوخ نہیں: مطلقاً وصیت کرنا منسوخ نہیں بلکہ مستحب ہے البتہ اس کیلئے تین شرطیں ہیں:

(۱) وہ وصیت ورثا کے لئے نہ ہو۔ (۲) مال کثیر ہو۔ (۳) تیسرے حصہ مال سے

زیادہ کی وصیت نہ ہو۔ ورثاء کے لئے وصیت کی ممانعت پہلے احادیث مبارکہ سے ثابت کی جا چکی ہے۔

کثیر مال میں وصیت کرے:

”عن عروة ان علياً كرم الله تعالى وجهه دخل على مولى له في الموت وله سبعمائة درهم او ستمائة درهم فقال الا اوصي؟ قال لا انما قال الله تعالى (ان ترك خيراً) وليس لك كثير مال فدع مالك لورثتك“ (رواه البيهقي)

حضرت عروہ سے مروی ہے کہ بیشک حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے آزاد کردہ غلام کے پاس (عیادت) کے لئے تشریف لے گئے جب اس پر آثار موت واقع ہو رہے تھے اس کے پاس سات سو یا چھ سو درہم تھے اس نے پوچھا کیا میں وصیت نہ کر جاؤں؟ آپ نے فرمایا نہیں اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿إِنْ تَرَكَ خَيْرًا﴾ جب کثیر مال ہو تو اسے ”خیر“ کہا جاتا ہے اور تمہارے پاس کثیر مال نہیں اس لئے تم وہ مال اپنے ورثاء کے لئے چھوڑ جاؤ۔

”عن عائشة رضی اللہ عنہا ان رجلا قال لها اريد ان اوصي قالت كم مالک؟ قال ثلاثة آلاف قالت كم عیالک؟ قال اربعة قالت قال اللہ تعالیٰ (ان ترک خیرا) وهذا الشئ یسیر فاتر کہ لعیالک فهو افضل“

(رواہ ابن ابی شیبہ)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ بیشک ایک شخص نے آپ کی خدمت میں عرض کیا میں وصیت کرنا چاہتا ہوں آپ نے پوچھا تمہارا مال کتنا ہے؟ تو اس نے کہا تین ہزار درہم پھر آپ نے پوچھا تمہارے عیال کتنے ہیں؟ اس نے کہا چار افراد ہیں آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے ﴿إِنْ تَرَكَ خَيْرًا﴾ ”وہ تو کثیر مال مراد ہے“ اور تمہارا یہ مال تھوڑا ہے بہتر یہی ہے کہ تم اپنے عیال کیلئے چھوڑ دو۔

فائدہ: ”والظاهر من هذا ان الکثرة غیر مقدرة بمقدار بل تختلف باختلاف حال الرجل فانه بمقدار من المال یوصف رجل بالغنی ولا یوصف به غیره لکثرة العیال“

کتنا مال ہو جسے کثیر کہا جائے جس میں وصیت کرنا درست ہو؟ ظاہر یہ ہے کہ کثرت کے لئے مال کی کوئی حد مقرر نہیں بلکہ مال کو دیکھا جائے اور عیال کو دیکھا جائے اندازہ کر لیا جائے کہ اس مال سے فقراء وغیرہ کے لئے وصیت کرنے میں عیال جلدی ہی محتاج نہیں ہوں گے لوگوں سے ہاتھ نہیں پھیلائیں گے وہ مال کثیر ہے۔ ایک شخص کے عیال کم ہوں تو اس کے لئے جو مال کثیر ہوگا وہی دوسرے شخص کیلئے قلیل ہوگا جس کے عیال زیادہ ہوں گے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے نزدیک کثرت کی حد:

عبد بن حمید نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی تقدیر کو بیان کیا ہے کہ وہ اس حد کے قائل تھے ”من لم یترک ستین دینار رالم یترک خیرا“ جس شخص نے ساٹھ دینار نہیں چھوڑے

(ماخوذ از روح المعانی)

اس نے ”خیر“ ”مال کثیر“ نہیں چھوڑا۔

راقم کے نزدیک ممکن ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول بھی کسی شخص کے حال کو دیکھ کر

(واللہ اعلم بالصواب)

ہو اس طرح حد مقرر نہ ہونے کا قول اتفاقی ہو۔

تنبیہ: اگر آیہ کریمہ میں صرف وصیت کی فرضیت اور ورثاء کے لئے وصیت کرنے کو منسوخ مانا جائے

تو حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہما کے اقوال بغیر کسی تاویل کے صحیح رہیں گے کہ

(واللہ اعلم بالصواب) (راقم)

وصیت کرنا مستحب ہے وہ جب کہ کثیر مال ہو۔

وصیت تہائی مال سے زیادہ نہ کرے:

”عن عامر بن سعد عن ابیہ قال عادنی رسول اللہ ﷺ فی حجة الوداع من

وجع اشفیت منه علی الموت قلت یا رسول اللہ بلغ بی ما تری من الوجع وانا

ذو مال ولا یرثنی الا ابنة لی واحدة افا تصدق بثلثی مالی قال لا قلت

اذا تصدق بشطرہ قال لا الثلث والثلث کثیر انک ان تذر ورثک اغنیاء

خیر من ان تذرہم عالة یتکفون الناس ولست تنفق نفقة تبتغی بها وجه اللہ الا

اجرت بها حتی اللقمة تجعلها فی فی امرأتک قال قلت یا رسول اللہ اخلف بعد

اصحابی قال انک لن تخلف فتعمل عملا تبتغی به وجه اللہ الا ازددت به

درجة ورفعة ولعلک تخلف حتی ینفع بک اقوام ویضربک آخرون اللهم

امض لا صحابی ہجرتہم ولا ترد علی اعقابہم لکن البانس سعد بن خولة

قال رثنی لہ رسول اللہ ﷺ من ان توفي بمكة“ (مسلم ج ۲ کتاب الوصیة)

حضرت عامر بن سعد نے اپنے باپ سے روایت کی وہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے حجۃ

الوداع میں میری عیادت کی جب کہ میں درد کی وجہ سے موت کے کنارے پر پہنچا ہوا تھا۔ میں نے عرض

کیا یا رسول اللہ مجھے جو درد تکلیف لاحق ہے وہ آپ دیکھ ہی رہے ہیں اور میں مالدار شخص ہوں اور میری

بٹی کے سوا میرا اور کوئی وارث نہیں کیا میں اپنے مال کے دو تہائی حصے صدقہ کر دوں؟ آپ فرمایا نہیں میں

نے عرض کیا کیا میں نصف مال صدقہ کر دوں؟ آپ نے فرمایا نہیں (پھر آپ نے فرمایا) تہائی مال

صدقہ کر دو، تہائی بہت ہے بیشک تمہارا اور ثا کو غنی چھوڑ کر جانا اس سے بہتر ہے کہ تم ان کو حاجت مند چھوڑ

جاؤ وہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے رہیں۔ تم کوئی مال اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لئے خرچ نہیں کرو گے سوائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں اجر عطا فرمائے گا یہاں تک کہ تم اپنی زوجہ کے منہ میں جو لقمہ ڈالو گے (اس کا اجر و ثواب بھی تمہیں حاصل ہوگا) میں نے کہا یا رسول اللہ کیا میں اپنے دوستوں کے پیچھے یہاں ہی رہ جاؤں گا؟ آپ نے فرمایا بیشک تم ہرگز پیچھے نہیں رہو گے بلکہ تم اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر عمل کرو گے جس سے تمہارے درجات بلند ہوں گے اور تمہیں رفعت حاصل ہوگی (تم ابھی پیچھے رہو گے یعنی تم نے ابھی زندہ رہنا ہے) یہاں تک کہ تمہارے ذریعے بعض قوموں کو فائدہ ہوگا اور بعض دوسرے لوگوں کو تمہاری وجہ سے نقصان ہوگا۔ (پھر حضور ﷺ نے دعا فرمائی) اے اللہ میرے اصحابہ کو ہجرت پر جاری رکھ (یعنی انہوں نے جہاں سے ہجرت کی وہاں ان کو موت نہ آئے) کہ وہ اپنے ایزدوں پر نہ لوٹیں۔ لیکن افسوس تو سعد بن خولہ پر ہے رسول اللہ ﷺ نے ان پر اظہار تعزیت کیا کہ ان کی وفات مکہ میں ہوگئی۔

وضاحت حدیث: اس حدیث پاک سے ایک مسئلہ یہ ثابت ہوا کہ مریض کی عیادت مستحب ہے۔ اور یہ ثابت ہوا کہ حاکم (امام) کے لئے بھی مریض کی عیادت کرنا ایسے ہی مستحب ہے جیسے کہ عام افراد کے لئے مستحب ہے۔ ”اشفیت منه علی الموت“ یہ ماخوذ ہے ”شفا“ (بفتح الشین) سے جس کا معنی ہے کنارہ۔ معنی یہ ہے کہ میں اس تکلیف کی وجہ سے موت کے کنارے پر تھا یعنی موت کے قریب تھا۔ ابن قتیبہ کا قول یہ ہے کہ ”اشفی“ کسی تکلیف وغیرہ پریشان کن چیز کے کنارے پر ہونے کو کہا جاتا ہے۔ کسی اچھی چیز کے لئے استعمال نہیں ہوتا۔ اس لئے ”اشفی علی الجنة“ (میں جنت کے کنارے پر ہوں) نہیں کہا جائے گا ”الوجع“ کا اگرچہ معنی ”درد“ ہے لیکن ابراہیم حربی کہتے ہیں ”الوجع اسم لكل مرض“ کہ ہر قسم کی بیماری کو ”وجع“ کہا جاتا ہے۔ اور مسئلہ یہ سمجھ آیا کہ جائز ہے مریض اپنی مرض کا ذکر کرے مقاصد اس کے صحیح ہوں دوا حاصل کرنے کے لئے ذکر کرے یا کسی نیک آدمی سے دعا کرنا مقصود ہو یا وصیت کرنا مقصود ہو یا اپنے حال کے متعلق فتویٰ طلب کرنا مقصود ہو اس طرح کے اور نیک جائز مقاصد کے لئے مرض کا ذکر کرنا درست ہے۔

”وانما یکرہ من ذلک ما کان علی سبیل التسخیط ونحوہ فانہ قاذح فی اجر مرضہ“

مکروہ اس وقت ہے کہ مرض کو اچھا نہ سمجھے ناراضگی کے طور پر دل تنگی کے طور پر ذکر کرے یہ عیب ہے مرض کے اجر و ثواب میں کمی کا باعث ہے ”وانا ذو مال“ اگرچہ اس کا ظاہری معنی صرف صاحب مال ہوتا ہے لیکن عرف میں زیادہ مال کا مالک ہونا معتبر ہے اور ان الفاظ سے ہی یہ سمجھ آیا کہ ”ہذا دلیل علی اباحۃ جمع المال“ یہ دلیل اس پر ہے کہ جائز طریقہ سے مال جمع کرنا جائز ہے۔ ”لا یرثنی الا ابنۃ لی“ سوائے میری بیٹی کے میرا کوئی وارث نہیں۔

اعتراض: حضرت سعد کے ورثاء تو اور بھی تھے بلکہ حدیث کا روای ہی آپ کا بیٹا ہے تو یہ کہنا کیسے درست ہے کہ ان کا سوائے بیٹی کے کوئی اور وارث نہیں تھا؟

جواب: ”وقیل معناه لا یرثنی من اصحاب الفروض“ بعض حضرات نے اس سوال کا جواب دیتے ہوئے یہ فرمایا کہ ان کا کہنا ”میرا کوئی وارث نہیں سوائے بیٹی کے اس کا مطلب یہ ہوا کہ اصحاب فروض سے میرا کوئی وارث نہیں سوائے بیٹی کے۔

”والثلث کثیر“ نبی کریم ﷺ نے تہائی مال کی وصیت کی اجازت فرمائی۔ اور تہائی مال کو کثیر کہا۔ ”وفی هذا الحدیث مراعاة العدل بین الورثة والوصیۃ“ اس حدیث پاک سے ورثاء اور وصیت کے درمیان عدل کرنے کا حکم دیا گیا۔ علماء نے بیان کیا ہے کہ ورثاء اگر غنی ہوں تو تہائی حصہ مال کی وصیت کرنا چاہتا ہے تو کر دے لیکن جب اس کے ورثاء فقیر، حاجت مند ہوں تو تہائی حصہ سے کم کی وصیت کرے۔ ہاں اگر تمام ورثاء متفق ہو کر اسے کل مال کی وصیت کرنے کی اجازت دے دیں تو اس کے لئے جائز ہے کل مال کی وصیت کر جائے۔ اور نبی کریم ﷺ کا یہ فرمانا کہ تمہارا ورثاء کو غنی چھوڑ کر جانا بہتر ہے فقیر چھوڑ کر جانے سے کہ وہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے رہیں اسی سے واضح ہوا:

”وفی هذا الحدیث علی صلوۃ الارحام والاحسان الی الاقارب والشفقة علی

الورثة وان صلوۃ القرب الاقرب والاحسان الیہ افضل من الابد“

اس حدیث میں صلہ رحمی کرنے اور قریبی رشتہ داروں پر احسان کرنے اور ورثاء پر شفقت کرنے پر براہِ نیختہ کیا گیا ہے۔ اسی حدیث پاک سے یہ واضح ہوا کہ جتنا زیادہ رشتہ دار قریبی ہوگا اس کے ساتھ صلہ رحمی کرنا اور اس پر احسان کرنا دور والے رشتہ دار پر احسان کرنے سے افضل ہے۔

”واستدل به بعضهم على ترجيح الغنى على الفقير“

بعض حضرات نے اسی حدیث پاک سے یہ ثابت کیا ہے کہ رشتہ دار غنی کو (نفل) صدقہ دینا زیادہ بہتر ہے نسبت اجنبی فقیر کے۔

طلباء کرام توجہ فرمائیں: ”فی فی امرأتک“ میں پہلا ”فی“ حرف جار ہے اور دوسرا ”فی“ اسماء ستہ مکبرہ سے ہے جس کی رفعی حالت میں ”فو“ اور نصبی حالت میں ”فا“ اور جری حالت میں ”فی“ پڑھا جاتا ہے جس کا معنی ہے ”منہ“ نبی کریم ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے جو مال تم خرچ کرو گے اس میں تمہیں اجر حاصل ہوگا یہاں تک کہ تم اپنی زوجہ کے منہ میں لقمہ ڈالو (تو اس کا اجر بھی تمہیں ملے گا) اسی سے یہ سمجھ آ گیا کہ نیکی کی راہ کوئی بھی ہو اس میں مال خرچ کرنا باعث اجر و ثواب ہوگا دار و مدار نیت پر ہے:

”وفیه ان الاتفاق علی العیال یشاب علیہ اذا قصد به وجه الله تعالیٰ“

اور اسی حدیث سے یہ بھی سمجھ آ گیا کہ عیال پر مال خرچ کرنا اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے باعث ثواب ہے۔

فائدہ عظیمہ: ”ان المباح اذا قصد به وجه الله تعالیٰ صار طاعة ویشاب علیہ“

بیشک مباح کام جب اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے کیا جائے تو وہ طاعت بن جاتا ہے اور اس پر ثواب حاصل ہوتا ہے۔

اس لئے کہ نبی کریم ﷺ نے زوجہ کے منہ میں اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے لقمہ ڈالنا باعث ثواب قرار دیا حالانکہ انسان کو زوجہ سے دنیاوی تعلقات حاصل ہوتے ہیں اس سے خواہشات حاصل کرتا ہے اور زوجہ سے کھیل وغیرہ میں لذت حاصل ہوتی ہے یہ مباح کام ہیں۔ جب کہ زوجہ کے منہ میں لقمہ ڈالنے کی اصل وجہ یہی ہیں لیکن نبی کریم ﷺ نے رب تعالیٰ کی رضا کے لئے زوجہ کے منہ میں لقمہ ڈالنا باعث اجر و ثواب قرار دیا۔

”وینتضمن ذلک ان الانسان اذا فعل شیاء اصله علی الاباحه وقصد

به وجه الله تعالیٰ یشاب علیہ“

یہ حدیث اس کو متضمن ہے (یہ مسئلہ اپنے اندر لئے ہوئے ہے) کہ بیشک انسان جب مباح کام کرے اور اس میں ارادہ اللہ تعالیٰ کی رضا کا کرے تو اسے ثواب حاصل ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کی طاعت کے لئے اور تقویٰ حاصل کرنے کے لئے کھانا بھی باعث ثواب ہے اس غرض سے سونا کہ نیند کا غلبہ اور سستی ختم ہو جائے اور میں جاگ کرتا رہ دوں ہو کر عبادت چستی سے کر سکوں تو سونا بھی باعث ثواب ہے زوجہ سے اس لئے نفع حاصل کرنا کہ حرام کاری سے بچ جائے تو زوجہ سے منافع حاصل کرنا بھی اجر و ثواب کا باعث ہیں۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے ”وفی بضع احدکم صدقة“ تمہاری زوجہ کی بضع میں تمہارے لئے ثواب ہے۔ اس کا بھی یہی مطلب ہے جو ترجمہ سے واضح ہے۔

”اخلف بعد اصحابی قال انک لن تخلف فتعمل عملا تبغی به وجه

اللہ تعالیٰ الا زددت به درجة ورفعة“

حضرت سعد کا یہ کہنا کیا میں اپنے ساتھیوں کے پیچھے رہ جاؤں گا اس سے مراہ ان کا مکہ میں رہ جانے پر ڈرتھا اس کی چند وجوہ تھیں ایک وجہ یہ تھی وہ ڈر رہے تھے کہ میری موت مکہ کرمہ میں آگئی تو کہیں میری ہجرت کے ثواب میں کمی نہ آجائے کیونکہ دوسری روایت اس کی تائید بھی کرتی ہے اخلف عن ہجرتی کیا میں اپنی ہجرت سے پیچھے رہ جاؤں گا۔

دوسری وجہ یہ تھی کہ ڈر اس بات کا تھا کہ میں بیمار ہوں میں یہاں مکہ مکرمہ میں رہ جاؤں گا اور نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام تشریف لے جائیں گے یعنی اصل ان کے مکہ مکرمہ میں رہ جانے کے ڈر کی وجہ یہ تھی کہ میں آپ کے فراق کو کیسے برداشت کروں گا۔ ”ولعلک تخلف حتی ینفع بک اقوام“ نبی کریم ﷺ نے فرمایا تم تو ابھی باقی رہو گے تم سے کئی قومیں نفع حاصل کریں گی۔ یہ آپ کا معجزہ ہے کیونکہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ فتح عراق تک زندہ رہے آپ کے ذریعے کئی قوموں نے دین اور دنیا میں نفع حاصل کیا۔

اسی حدیث سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ نیک اعمال کے لئے زیادہ عمر حاصل ہونا افضل ہے اسی طرح جس عمر میں اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر کام کئے جائیں وہ عمر بھی افضل ہے۔ اور نبی کریم ﷺ کا حضرت سعد کو یہ فرمانا کہ کئی لوگوں کو تم سے نقصان ہوگا آپ کا یہ ارشاد بھی واقع ہو کر رہا کیونکہ کئی کافران

کے ہاتھوں قید ہوئے کئی قتل ہوئے، اسی طرح کافروں کی عورتوں کو انہوں نے قید کر لیا۔ اور یہ بھی خیال رہے کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو عراق کا والی بنایا۔ اسی دوران آپ کے ہاتھ پر کئی لوگ بیعت کر کے مسلمان ہوئے اور کافروں کو آپ کے ہاتھوں نقصان ہوا۔ (ماخوذ از نووی)

وصیت کی اہمیت: وصیت کرنا اگرچہ مستحب ہے عمل کرے تو ثواب ہے عمل نہ کرے تو گناہ نہیں تاہم نبی کریم ﷺ نے وصیت کو اہم قرار دیا:

”عن سالم عن ابیہ انہ سمع رسول اللہ ﷺ قال ما حق امرئ مسلم له شئ یوصی فیہ یبیت ثلاث لیل الا ووصیتہ عنده مکتوبہ قال عبد اللہ بن عمر ما مررت علی لیلۃ منذ سمعت رسول اللہ ﷺ قال ذلک الا وعندی وصیتی“ (مسلم ج ۲ کتاب الوصیۃ)

حضرت سالم اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ کسی مسلمان کو حق نہیں پہنچتا کہ جس مال میں اس نے وصیت کرنی ہے تو تین راتیں اسی طرح گزار دے مگر یہ کہ اس کے وصیت لکھی ہوئی ہونی چاہئے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں جب سے میں نے نبی کریم ﷺ کا ایہ ارشاد سنا تو مجھ پر کوئی رات نہیں گزری مگر یہ کہ میرے پاس وصیت لکھی ہوئی موجود رہی۔

مستحب یہ ہے کہ وصیت جلدی لکھ دے اور اپنی صحت میں وصیت کر دے اور اس پر گواہ بنالے۔ ہر دن کے چھوٹے چھوٹے معاملات اور جزی جزی امور کے مطابق وصیت لکھنے کا حکم دینا وسعت سے زائد امر ہے ”تکلیف ما لا یطاق“ (یعنی جن کاموں کی طاقت نہ ہو ان کی تکلیف دینا) منع ہے۔ (از نووی)

وصیت کے متعلق کچھ مسائل: وصیت تہائی حصہ مال سے زائد جائز نہیں لیکن اگر تمام ورثا بالغ ہوں اور تمام ہی اجازت دے دیں تو تیسرے حصہ سے زائد وصیت بھی جائز ہے۔ تیسرے حصہ سے زائد کی وصیت کی ممانعت ورثا کو نقصان پہنچانے کی وجہ سے ہے۔

”عن ابن عباس عن النبی ﷺ قال الاضرار فی الوصیۃ من الکبائر“

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا وصیت میں (ورثاء) کو

(دارقطنی)

نقصان پہنچانا کبیرہ گناہ ہے۔

”وقد جاء فی الحدیث الحیف فی الوصیة من اکبر الكبائر“ (ابن مردويه)

حدیث پاک میں ہے وصیت میں ظلم کرنا بہت بڑا گناہ ہے (وصیت میں ظلم کرنے کا یہی مطلب ہے کہ تیسرے حصہ سے زائد وصیت کرنا ورثاء پر ظلم ہے)۔

مسئلہ واضح ہو گیا کہ وصیت تیسرے حصہ زائد مال سے منع اس لئے ہے کہ ورثاء کا نقصان نہ ہو جب تمام ورثاء اجازت دے رہے ہوں اور بالغ ہوں تو یقیناً تہائی سے زائد کی وصیت جائز ہے کیونکہ اصحاب حقوق نے اپنے حق میں کمی کی اجازت دے دی۔ بلکہ ورثاء کی اجازت سے کل مال کی وصیت کرنا بھی جائز ہے کیونکہ اپنا حق مکمل ختم کرنے کا بھی اختیار ہے۔

تنبیہ: ورثاء کی اجازت اس شخص کی موت کے بعد قابل قبول ہے اس لئے کہ ان کو وراثت میں جب حق مل جائے گا تو وہ اپنے حق میں تصرف کر سکیں گے۔ لیکن اس شخص کی موت سے پہلے ان کو حق وراثت ہی نہیں ملا تو ان کی اجازت کا کوئی اعتبار نہیں۔ موت کے بعد وصیت کی اجازت دینے کا کیا مطلب؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی شخص نے کل مال کی وصیت کر دی تھی یا تہائی حصہ سے زائد کی پھر وہ فوت ہو گیا اس کی وفات کے بعد تمام ورثاء نے اجازت دے دی کہ وہ جو وصیت کر گیا ہے ہمیں اس پر کوئی اعتراض نہیں تو وہ وصیت جاری ہو جائے گی اگر ورثاء نے اجازت نہ دی تو وہ وصیت رد ہو جائے گی۔

(ماخوذ از ہدایۃ مع عنایۃ)

مسئلہ: وارث کیلئے وصیت کرنا جائز نہیں لیکن اگر کوئی شخص کسی وارث کیلئے وصیت کر کے فوت ہو گیا اس کی وفات کے بعد اس کے ورثاء اجازت دے دیں تو وصیت جائز ہوگی اس وارث کو وصیت کے مطابق مال حاصل ہو جائے گا لیکن اگر ورثاء نے اجازت نہ دی تو وہ وصیت رد ہو جائے گی۔ (ماخوذ از ہدایۃ)

مسئلہ: مسلمان ذمی کے لئے وصیت کرے یا ذمی مسلمان کے لئے وصیت کرے جائز ہے جس طرح زندگی میں نفلی صدقات دینا جائز ہے اسی طرح موت کے بعد جاری کرنا بھی جائز ہے۔ لیکن جواز اور اولویت (بہتری) میں فرق ذہن میں رہے اگرچہ جائز ہے لیکن ثواب حاصل نہیں ہونا ثواب اسی وقت حاصل ہوگا جب مسلمان کے لئے وصیت کرے یا کسی اور کا خیر کے لئے وصیت کرے۔ اسی سے

یہ بھی واضح ہو گیا کہ وصیت اور وراثت کے احکام میں فرق ہے۔ وصیت ذمی کفار کے لئے جائز ہے وراثت جائز نہیں کیونکہ کافر مسلمان کا یا مسلمان کافر کا وارث نہیں بن سکتا۔ (ماخوذ از حدیث مع عنایت)

مسئلہ: تہائی حصہ تک وصیت جائز ہے لیکن تہائی حصہ سے کم وصیت کرنا بہتر ہے:

”روی عن ابی بکر وعمر انهما قالان یوصی بالخمس احب الینا من یوصی بالربع ولان یوصی بالربع احب الینا من ان یوصی بالثلث“

حضرت ابو بکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ مال کے پانچویں حصہ کی وصیت کرنا ہمارے نزدیک محبوب ہے نسبت چوتھے حصہ مال کی وصیت کرنے سے اور تہائی حصہ کی وصیت کرنے سے ہمیں زیادہ پسند یہ ہے کہ چوتھے حصہ کی وصیت کرے۔ (کفایہ باب الایصاء)

مسئلہ: اگر کوئی شخص کسی کو جان بوجھ کر یا خطا کے طور پر زخمی کر دے وہ زخمی ہونے والا اسی شخص کے حق میں مال کی وصیت کر دے جس نے اسے زخمی کیا پھر ان زخموں سے ہی وہ مر جائے تو یہ وصیت جائز نہیں بلکہ رد ہو جائے گی ”عن علی ابن ابی طالب قال قال رسول اللہ ﷺ لیس لقاتل وصیة“ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قاتل کے لئے وصیت نہیں۔ (ازہادیہ مع حاشیہ)

مسئلہ: جس شخص کے حق میں وصیت کی گئی وصیت کرنیوالے کی وفات کے بعد اسے قبول کرنے اور رد کرنے کا حق حاصل ہوتا ہے جب تک قبول نہ کرے وہ مالک نہیں بنے گا ہاں ایک صورت میں اسے ملکیت حاصل ہوگی وہ یہ ہے کہ وصیت کرنیوالا فوت ہو جائے اور جس کے حق میں وصیت کی گئی وہ بھی اسکے پیچھے وصیت رد کرنے سے پہلے فوت ہو جائے تو وہ وصیت والے مال کا مالک ہو کر فوت ہوا۔ (ازہادیہ)

مسئلہ: کسی آدمی نے اپنے مال کی وصیت کر دی لیکن اس پر قرض اتنا ہے کہ تمام مال قرض کی ادائیگی میں خرچ ہو جاتا ہے تو اس صورت میں اس کا وصیت کرنا باطل ہو جاتا ہے۔ (ازہادیہ)

مسئلہ: نابالغ بچے کا اپنے مال کی وصیت کرنا جائز نہیں۔ (حدیث)

مسئلہ: مرنے والے شخص کے مال سے پہلے اس کی تجہیز و تکفین پر مال خرچ ہوگا پھر اس کا قرض اتارا جائے۔ پھر جو مال بچ جائے اس کے تہائی حصہ سے اس کی وصیت پر عمل کرے پھر باقی مال ورثہ پر تقسیم کر دیا جائے۔ (سراجی)

﴿فَمَنْ بَدَّلَهُ بَعْدَ مَا سَمِعَهُ فَإِنَّمَا إِثْمُهُ عَلَى الَّذِينَ يُبَدِّلُونَهُ إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ﴾

(۱) ”تو جو وصیت کو سن سنا کر بدل دے اس کا گناہ انہیں بدلنے والوں پر ہے بیشک اللہ سنتا جانتا ہے۔“

(۲) ”تو جس شخص نے بدل دیا اسے بعد اس کے کہ اس نے سن لیا بیشک اس کا گناہ ان لوگوں پر ہے

جنہوں نے اسے بدل دیا بیشک اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔“

جن لوگوں کو کہا گیا تھا کہ تم وصیت جاری کرو وہ لوگ ہی وصیت کو بدل دیں یا گواہ وصیت کو بدل دیں تو اس کا گناہ وصیت کے بدلنے والوں پر ہوگا۔ خواہ انہوں نے وصیت کرنے والے سے خود سنا تھا یا اس کا پیغام کسی نے بمع گواہوں کے پہنچایا۔ اس کے بعد وصیت کو بدلنا حق کو بدلنا ہے جو گناہوں کا سبب ہے بیشک اللہ تعالیٰ سننے والا جاننے والا ہے اس لئے اس کے عذاب سے کوئی بچ نہیں سکے گا۔

﴿فَمَنْ بَدَّلَهُ بَعْدَ مَا سَمِعَهُ﴾ : ضمیر منصوب بدلہ کی اور سمعہ کی وصیت کی طرف لوٹ رہی ہے وصیت کو ایصاء کے معنی میں لے کر یا اس سے مراد حکم لے کر ضمیر لوثائی تاکہ یہ وہم نہ ہو کہ ضمیر مذکر کی وصیۃ مؤنث کی طرف کیسے لوثائی گئی ہے۔ تبدیل کرنے والا کون ہے؟ یا تو وہ شخص جس کو وصیت جاری کرنے کا حکم دیا گیا ہے وہ مراد ہے کہ وہ لکھنے میں یا حقوق کے تقسیم کرنے میں تبدیلی کر دے۔ یا مراد گواہ ہیں کہ وہ گواہی جو دینی تھی اسے تبدیل کر کے گواہی دے دیں یا وہ گواہی چھپا کر تبدیل کر دیں یا اس سے مراد عام لوگ ہیں کہ وہ حقدار تک وصیت نہ پہنچنے دیں اس طرح وہ وصیت کو تبدیل کر دیں ﴿بَعْدَ مَا سَمِعَهُ﴾ سے مراد عام ہے کہ براہ راست سنیں یا بالواسطہ سنیں۔

﴿فَإِنَّمَا إِثْمُهُ عَلَى الَّذِينَ يُبَدِّلُونَهُ﴾ گناہ صرف ان لوگوں کو ہی ہوگا جو اس وصیت کو تبدیل کریں گے گواہوں وغیرہ میں سے جو لوگ تبدیل کرنے سے باز رہے وہ اس وعید سے بھی پاک ہیں۔

﴿إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ﴾ : بیشک اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔

یعنی تبدیل کرنے والوں اور وصیت کرنیوالوں کے اقوال کو سنتا ہے اور ان کی نیت کو جانتا ہے۔ یہ الفاظ مبارکہ وصیت کرنے والوں اور وصیت کو جاری کرنے والوں اور گواہوں کے لئے وعید

بھی ہیں اور وعد بھی ہیں اگر ان میں ہر شخص نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق عمل کیا تو ان کیلئے اجر و ثواب ہے یہ وعد ہے اور ان میں سے اگر کسی شخص نے رب تعالیٰ کے حکم سے عدولی کی تو وہ رب تعالیٰ کی گرفت میں آئے گا یہ وعید ہے۔ (راقم)

وصیت کرنے والوں کو حق میں وعد ہے کہ جب وہ صحیح وصیت کر کے فوت ہوں تو پھر وصیت جاری کرنے والے اور گواہ اس وصیت کو تبدیل کر دیں تو ان کے حق میں وعید ہے۔

فائدہ: اس آیت میں جب یہ ذکر ہوا کہ گناہ صرف تبدیل کرنے والے کو ہوگا جس کی وصیت کو تبدیل کیا گیا اسے کسی قسم کا کوئی مؤاخذہ نہیں ہوگا۔ اسی سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ بچے کو اس کے ماں باپ کے کفر کی وجہ سے عذاب نہیں ہوگا۔ کافروں کے بچے مقام اعراف میں ہوں گے یا جنت میں ہوں گے اس میں اہل علم کے مختلف اقوال ہیں تاہم اتنی بات واضح اور رائج ہے کہ ان کو جہنم میں عذاب نہیں دیا جائیگا۔

اور یہ فائدہ حاصل ہوا کہ کسی شخص نے اپنے ورثا کو بتا دیا کہ مجھ پر اتنا قرض ہے وہ ادا کر دینا پھر اس کے مال سے ورثا نے قرض ادا نہ کیا تو کوتاہی کی وجہ سے گناہ ان کے ذمہ ہوگا مرنے والے پر کوئی گناہ نہیں کیونکہ وہ اتنا مال چھوڑ کر گیا کہ اس کا قرض ادا ہو سکتا تھا اور وصیت بھی اس نے کر دی تھی کہ میرا قرض ادا کر دینا۔

اور یہ فائدہ حاصل ہوا کہ کسی کے رونے پٹنے سے میت کو عذاب نہیں ہوگا عقل کا بھی یہی تقاضا ہے کہ روئے پٹے کوئی اور عذاب کسی اور کو ہوایسا نہیں ہوگا۔ (ازکیر)

اعتراض: علامہ رازی رحمہ اللہ نے کیسے بیان کیا ہے ”ان المیت لا یعذب بکاء غیرہ علیہ“ کہ بیشک میت کو دوسرے لوگوں کے رونے (چلانے، پٹنے) سے عذاب نہیں ہوگا۔ حالانکہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے ”ان المیت یعذب بکاء اہلہ علیہ“ بیشک میت کو اسکے اہل کے رونے سے عذاب دیا جاتا ہے۔

جواب: زمانہ جاہلیت میں رواج تھا مرنے والا وصیت کر جاتا تھا کہ میرے مرنے کے بعد نوحہ کرنے والی عورتوں کو بلانا جو مجھ پر بین کر کے روئیں اس رونے سے میت کو عذاب دیا جائے گا۔ اور عذاب سے مراد مطلقاً تکلیف بھی ہو سکتی ہے کہ میت درحقیقت پھر سے زندگی سے متصف ہو جاتا ہے جیسا زندہ شخص کو رونے چلانے سے تکلیف ہوتی ہے ایسے ہی میت کو بھی تکلیف ہوتی ہے اس سے مراد حقیقی عذاب نہ ہو واضح ہوا کہ حدیث پاک اور علامہ رازی رحمہ اللہ کے قول میں کوئی تعارض نہیں۔ (ماخوذ از مرقاۃ نووی)

﴿فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوَصٍّ جَنَفًا أَوْ إِثْمًا فَأَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَا
إِثْمَ عَلَيْهِ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ﴾

- (۱) ”پھر جیسے اندیشہ ہوا کہ وصیت کرنے والے نے کچھ بے انصافی یا گناہ کیا تو اس نے اس میں صلح کرادی اس پر کچھ گناہ نہیں بیشک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔“
- (۲) ”پھر جو شخص خوف رکھے وصیت کرنے والے سے بے انصافی یا گناہ کی تو اس نے صلح کرادی تو اس پر کوئی گناہ نہیں بیشک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔“

اس سے پہلی آیت کریمہ میں وصیت بدلنے والے کے لئے رب تعالیٰ کی طرف سے وعید پائی گئی ہے لیکن وہ تبدیلی حق سے باطل کی طرف تھی اب اس آیت کریمہ میں وصیت کو باطل سے حق کی طرف بدلنے کی اجازت دی گئی ہے کیونکہ اصلاح کی غرض سے بدلنا مستحسن (اچھا) ہے۔ اصلاح خود ہی تبدیلی اور تغیر کا تقاضا کرتی ہے اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس تبدیلی (یعنی جو اصلاح کی غرض سے ہو) اور پہلی تبدیلی (جو باطل طریقہ سے ہو) میں فرق بیان فرمایا کہ کوئی شخص جہالت کی وجہ سے دونوں کا حکم ایک نہ سمجھ لے بلکہ حق سے باطل کی طرف تبدیلی باعث گناہ ہے اور باطل سے حق کی طرف تبدیلی میں کوئی گناہ نہیں بلکہ ثواب ہے۔

(از کبیر)

”قال مجاهد معناه ان الرجل اذا حضر مريضاً وهو يوصي فراه يميل

عن الحق فامر به بمعروف ونهاه عن منكر“

حضرت مجاہد کہتے ہیں آیت کریمہ کا مطلب یہ ہے کہ جب کوئی شخص کسی مریض کے پاس حاضر ہو وہ مریض وصیت کر رہا ہو یہ شخص دیکھے کہ مریض وصیت کرنے میں حق راہ سے اعراض کر رہا ہے تو یہ اس کو اچھے کاموں کا حکم دے اور برے کاموں سے روکے۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ نے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو تہائی حصہ مال سے زائد کی وصیت سے منع فرمایا اسی طرح حضرت عائشہ صدیقہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہما نے مال کے کم ہونے کی وجہ سے مطلقاً وصیت کرنے سے ہی منع فرمایا۔

(از مظہری)

ایک اور روایت ملاحظہ فرمائیں:

”عن النعمان بن بشیر ان اباہ اتی بہ الی رسول اللہ ﷺ فقال انی نحلّت

ابنی هذا غلاما فقال اکل ولدک نحلّت مثله قال لا قال فارجمہ“

نعمان بن بشیر فرماتے ہیں بیشک ان کے باپ ان کو رسول اللہ ﷺ کے پاس لائے تو کہا کہ بیشک میں نے اپنے اس بیٹے کو غلام بطور عطیہ دے دیا۔ تو آپ نے فرمایا کیا آپ نے اپنی تمام اولاد کو اسی طرح عطیہ دیا ہے؟ صحابی نے عرض کیا نہیں یا رسول اللہ تو آپ نے فرمایا کہ یہ عطیہ لوٹا لو۔ ایک روایت میں ہے کہ نعمان کی والدہ نے کہا تھا کہ میرے اس بیٹے کو خصوصی طور پر عطیہ دو اس عطیہ پر رسول اللہ ﷺ کو گواہ بنا لو جب وہ اپنے بیٹے کو نبی کریم ﷺ کی خدمت میں لائے تاکہ اس پر آپ کو گواہ بنائیں تو آپ نے فرمایا ”لا اشہد علی جور“ میں ظلم پر گواہ نہیں بنتا۔ (از منظر ہی و مسلم ج ۲ کتاب الوصیہ)

فَمَنْ خَافَ مِنْ مَوْصٍ جَنَفًا أَوْ إِثْمًا :

”پھر جو شخص خوف رکھے وصیت کرنے والے سے بے انصافی یا گناہ کی“

الجنف : ”المیل فی الامور“ امور میں میلان کرنے کو ”جنف“ کہا جاتا ہے ”واصلہ العدول عن الاستواء“ اصل میں برابری سے عدول کرنا ہے اسی معنی کے لحاظ سے اعلیٰ حضرت نے ترجمہ کیا ہے ”بے انصافی“ راقم نے بھی وہی نقل کیا ہے۔ ”جنف یجنف“ باب علم یعلم کے وزن پر ہے ”تنجائف“ بھی میلان کرنے کو کہا جاتا ہے رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِإِثْمٍ﴾ سوائے گناہوں کی طرف میلان کرنے کے۔

جنفاً اور اثمًا میں فرق: ”ان الجنف هو الخطأ من حیث لا یعلم بہ والاثم هو العمد“ اگر بے علمی سے بے انصافی ہو جائے خطا کے طور پر حق سے میلان ہو جائے تو اسے ”جنف“ کہا جاتا ہے اور ارادہ سے گناہ کرنے کو اثم کہا جاتا ہے۔

فَمَنْ خَافَ : کے معنی میں دو قول ہیں ایک یہ ہے کہ اس کا معنی ہے ”فمن علم“ جو شخص جان لے (یعنی اس کے علم میں آجائے) خوف اور خشیت دونوں علم کے معنی میں استعمال ہوتے ہیں یعنی خوف سے مراد خاص حالت ہے جو خاص گمان سے حاصل ہوتی ہے یعنی آنے والے حضرات سے خوف زدہ

ہونے کا گمان ہی خوف کہلاتا ہے۔ پھر گمان بمعنی علم اور علم بمعنی ظن کے استعمال ہوتا رہتا ہے کیونکہ ظن اور علم کئی امور میں ایک دوسرے کے مشابہ ہیں اب معنی یہ ہوگا کہ جب کسی کو معلوم ہو کہ وصیت نے وصیت میں خطا کی ہے یا جان بوجھ کر ظلم کیا ہے تو کوئی حرج نہیں کہ اسے بدل دے اور اس کی موت کے بعد اس میں اصلاح کر دے۔ یہ قول حضرت ابن عباس اور قتادہ اور ربیع کا ہے۔ دوسرا قول اس میں یہ ہے کہ ”خاف“ خوف اور خشیت کے معنی میں استعمال ہے (یہی قول زیادہ مشہور ہے)

اعتراض: ”خوف“ کا استعمال تو امر منتظر (آنے والے خطرات) میں ہوتا ہے وصیت کرنے والے نے جب خطا یا عدا بے انصافی کر دی تو اب خوف کا کیا مطلب؟

پہلا جواب: مراد یہ ہے کہ اصلاح کرنے والا شخص جب دیکھے وصیت کرنے والا وصیت کر رہا ہے لیکن اس کی جہالت کی وجہ سے اس سے بے انصافی کے علامات نظر آرہی ہیں، یا کسی تاویل وغیرہ کی وجہ سے اس سے بے انصافی کی علامات ظاہر ہو رہی ہیں، یا دیکھے کہ وہ جان بوجھ کر غیر مستحق کو زیادہ دے رہا ہے، یا مستحق کا حق کم کر رہا ہے، یا مستحق کو حق دے ہی نہیں رہا تو ان علامات کے ظاہر ہونے پر وصیت کے مکمل ہونے سے پہلے وہ اصلاح کرے۔

”لان اصلاح الامر عند ظهور امارات فسادہ وقبل تقرر فسادہ یكون اسهل“

کیونکہ معاملات کے فاسد ہونے سے پہلے صرف علامت فساد کے ظاہر ہوتے وقت ان کی اصلاح آسان ہے بنسبت اس کے کہ ان میں فساد پیدا ہو جائے تو پھر ان کی اصلاح مشکل ہوگی۔ اسی وجہ سے ”خاف“ ذکر فرمایا ”علم“ ذکر نہیں فرمایا کیونکہ ان حالات میں انسان کو گمان تو ہوتا ہے کہ وصیت کرنے والا غلطی کر رہا ہے اسے یقین نہیں۔

دوسرا جواب: جن وجوہ کا ذکر کیا ہے ہو سکتا ہے وصیت کرنے والا ان کو ختم کر کے نئی وصیت جاری کر دے اس لئے اس کی بے انصافی کا خوف ہے لیکن یقین نہیں اسی وجہ سے ﴿خَاف﴾ ذکر کیا ”علم“ نہیں۔ تیسرا جواب: ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص اس کی بے انصافی کو تو دیکھ رہا ہے لیکن ابھی تک اس پر یقین نہیں کہ اس کی موت بے انصافی پر ہوگی ہو سکتا ہے کہ وصیت کرنے والے اور حقداروں کے درمیان صلح ہو جائے۔ لہذا گمان تو بے انصافی کا ہو سکتا ہے یقین نہیں اسی وجہ سے ﴿خَاف﴾ کہا ہے ”علم“ نہیں کہا۔

(ماہود از کبیر)

قابل توجہ مسئلہ: ابھی پہلے ذکر کیا گیا ہے کہ ”جف“ بغیر ارادہ کے حق سے پھرنے کو کہا جاتا ہے اور ”اثم“ ارادہ سے غلطی کے ارتکاب کرنے کو کہا جاتا ہے۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے ”رفع عن امتی الخطأ والنسيان“ میری امت سے خطا اور بھول کو اٹھالیا گیا ہے۔ یعنی ان کی کوئی پکڑ نہیں ہوگی ان پر کوئی گناہ مرتب نہیں ہوگا۔ لیکن یہ اس وقت ہے جب انسان سے خطا اپنے حق میں ہو جب وہ خطا دوسروں کے حق میں ہو تو اس کا حکم یہ ہے:

”ومعلوم ان الخطأ في حق الغير في انه يجب ابطاله بمنزلة العمد فلا فصل بين الخطأ والعمد في ذلك فمن هذا الوجه سوى عز وجل بين الأمرين“

معلوم یہ ہوا کہ غیر کے حق میں خطا کو باطل کرنا ضروری ہے جیسے جان بوجھ کر کی ہوئی غلطی کو ختم کرنا ضرور ہے غیر کے حق میں جان بوجھ کر بے انصافی کی جائے یا کہ خطا سے ایک ہی حکم ہے دونوں کا اسی لئے رب تعالیٰ نے دونوں کو ایک جگہ جمع کیا ہے۔

فَأَصْلَحَ بَيْنَهُمْ : ”تو ان کے درمیان صلح کرادے (تو نہیں ہے کوئی گناہ اس پر)

یہ صلح کرانے والا کون ہوگا؟ ظاہر ہے کہ یہ وہ شخص ہوگا جس کو وصیت کرنے والا مقرر کرے گا کہ میری وصیت کو جاری کر دینا۔ اور اس حکم میں گواہ بھی داخل ہے کہ وہ بھی جب بے انصافی کو دیکھے تو اصلاح کرادے اور یہ حکم عام مسلمانوں کو بھی ہے کہ جو کوئی بھی وصیت کرنے والے میں بے انصافی کو دیکھے وہ اصلاح کر دے۔ (ازکیر)

فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ : ”تو نہیں ہے گناہ اس پر“ بظاہر وہم ہوا ہے کہ اصلاح کرنے والا عظیم نیکی کا کام کرتا ہے صرف گناہ کی نفی کا کیا مطلب؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ گناہ کی نفی کرنے میں چند حکمتیں ہیں:

(۱) جب رب تعالیٰ نے پہلی آیت میں وصیت کو بدلنے پر گناہ کا ذکر فرمایا اور یہاں بھی وصیت کی تبدیلی کا ذکر ہے لیکن یہ تبدیلی پہلی سے مختلف ہے اس لئے گناہ کی نفی کی تاکہ یہ وہم نہ ہو کہ شاید اس تبدیلی میں بھی گناہ ہوگا۔

(۲) جب مصلح وصیت میں کمی کرے گا تو یقیناً جن لوگوں کے حق میں حق سے زائد وصیت کی گئی تھی

بظاہر ان پر مشکل ہوگی وہ یہ سمجھیں گے کہ یہ شخص گنہگار ہو رہا ہے اس لئے ضروری ہوا کہ گناہ کی نفی کر کے ان کے وہم کا ازالہ کیا جائے۔

(۳) وصیت اور گواہی یقینی امور نہیں ان پر عمل کرنے سے پہلے حق کی طرف تبدیلی ممکن ہے اسی لئے ناحق وصیت کرنے والا وصیت کرنے کے ساتھ ہی گنہگار نہیں ہوتا بلکہ اس وقت گنہگار ہوتا ہے جب اسی ناحق وصیت پر قائم رہتے ہوئے فوت ہو جائے اور اس میں اصلاح بھی نہ کی جائے۔ جب اس میں اصلاح کی جائے گی تو وصیت کرنے والے کے ذہن میں بظاہر اصلاح میں قباحت آئے گی اس لئے گناہ کی نفی کرنا ہی زیادہ مقید ہے تاکہ اس وہم کا ازالہ ہو جائے۔

(۴) اصلاح کرنے والے کو زیادہ باتیں کرنی پڑتی ہیں ہو سکتا ہے اس کے کسی قول یا فعل پر کوئی ناراض ہو جائے تو اس کے قول اور فعل کو گناہ سمجھ بیٹھے تو رب تعالیٰ نے گناہ کی نفی کی کہ جو شخص صرف اللہ تعالیٰ کی رضامندی کے لئے صلح کر رہا ہے تو وہ گنہگار نہیں۔ (ازکیر)

فائدہ: اس آیت کریمہ سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ جب دو شخصوں میں جھگڑا ہوا اور خطرہ ہو کہ یہ نزاع ان کو شریعت کے خلاف کی طرف لے جائے گا تو ان کے درمیان صلح کرادی جائے تاکہ وہ دونوں شریعت کے پابند رہیں۔ صلح کرانے والے کو ثواب حاصل ہوگا۔ (ازکیر)

إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ : ”بیشک اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔“

اگر اس سے مراد وصیت کرنے والے کی بے انصافی اور گناہ کی مغفرت ہو تو واضح ہے کہ جب اس کی وصیت میں اصلاح کردی جائے گی تو اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت فرمائے گا اور رحم فرمائے گا۔ اور اگر اصلاح کرنے والے کی مغفرت مراد ہو تو بظاہر وہم ہوگا کہ اس نے تو عظیم نیکی کا کام کیا ہے اس کے تو ثواب کا ذکر کیا جانا تھا صرف مغفرت کے ذکر کا کیا مقصد؟

تو اس کا جواب یہ دیا گیا کہ یہاں ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف ترقی پائی گئی پہلے مغفرت کا ذکر فرما کر پھر رحمت کا ذکر فرما کر گویا کہ رب تعالیٰ نے یہ فرمایا:

﴿إِنَّ الَّذِي اغْفَرَ الذُّنُوبَ ثُمَّ أَرْحَمَ الْمَذْنِبَ﴾

”بیشک میں پہلے گناہوں کی مغفرت کرتا ہوں پھر گنہگار پر رحم کرتا ہوں“

گویا کہ رب تعالیٰ نے اپنے بندوں کو یوں کہا:

”اوصل رحمתי وثوابی الیک مع انک تحملت المحن الکثیرة فی
اصلاح هذا لمهم کان اولی“

میری رحمت اور ثواب تمہیں ملے گا جب کہ پہلے تم اصلاح میں کثیر محنتیں برداشت کرو گے
بلکہ یوں کہا جائے کہ تمام عبادات میں یہی کیفیت ہے کہ انسان جتنی زیادہ مشقت برداشت کرے
گا اتنا ہی زیادہ ثواب پائے گا۔

بلکہ نظام دنیا کو بھی ہم دیکھتے ہیں تو مقام مقبولیت اسے ہی حاصل ہوتا ہے جو اس حد تک
محنت کرتا ہے کہ وہ اساتذہ کو بھی بھونکنے سے باز نہیں آتا اسی کو دیکھ کر راقم نے اپنے مکتب پر لکھ کر
رکھا ہوا ہے۔

”اللهم انا نعوذ بک من کلاب السادات لان النباح واطهارا لاسنان لها العادات“
زندگی و صحت میں صدقہ افضل ہے:

اس مسئلہ میں اتفاق ہے کہ زندگی اور صحت میں صدقہ افضل ہے نسبت اس صدقہ کے جو موت
کے بعد کیا جائے:

”لقوله عليه السلام وقد سئل ای الصدقة افضل ؟ فقال ان تصدق
وانت صحيح صحيح“

نبی کریم ﷺ سے سوال کیا گیا کون سا صدقہ افضل ہے تو آپ نے فرمایا کہ تم صدقہ کرو ایسے
حال میں جب تم صحیح ہو اور مال پر حریص ہو۔

”وروی الدارقطنی عن ابی سعید الخدری ان رسول الله ﷺ قال لان
یتصدق المرء فی حیاته بدرهم خیر له من ان یتصدق عند موته بمائة“

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ انسان کا اپنی
زندگی میں ایک درہم صدقہ کرنا موت کے وقت ایک سو درہم صدقہ کرنے سے بہتر ہے۔

”وروی النسائی عن ابی الدرداء عن النبی ﷺ قال مثل الذی ینفق

او يتصدق عند موته مثل الذي يهدى بعد ما يشبع

حضرت ابوالدرداء فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ نے فرمایا جو شخص موت کے وقت مال خرچ کرتا ہے اور صدقہ کرتا ہے وہ ایسے ہی ہے جیسے سیر ہونے کے بعد کسی کو ہدیہ دیا جائے۔ (از قرطبی)

فائدہ عظیمہ: نقلی عبادت سنن مؤکدہ میں کچھ کمی واقع ہونے کا کفارہ بنتی ہے اور سنن مؤکدہ ادا کرنے سے واجبات میں کچھ خطا وغیرہ ہوگئی تو کفارہ بنیں گی اور واجبات فرائض میں کوتاہیوں کا کفارہ بنتے ہیں اسی طرح زکوٰۃ میں کوئی کمی ہوگئی کمی ہو جانے کا مطلب یہ ہے کہ ہو سکتا ہے حساب لگانے میں بھول واقع ہوئی ہو کوئی خطا ہو مستحق کے سمجھنے میں خطا واقع ہوئی ہو تو اس صورت میں وصیت اس کا کفارہ ہوگی:

”روى الدار قطنى عن معاوية بن قررة عن ابيه قال قال رسول الله ﷺ
من حضرته الوفاة فاوصى فكانت وصيته على كتاب الله كانت كفارة
لما ترك من زكوة“

معاویہ بن قرۃ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص کو وفات حاضر ہو اس نے کتاب اللہ کے مطابق وصیت کی تو یہ زکوٰۃ میں واقع ہونے والی کوتاہی کا کفارہ بنے گی۔ (از قرطبی زیادۃ)

وصیت میں ورثاء کو ضرر پہنچانے پر وعید:

”عن ابن عباس عن رسول الله ﷺ قال الاضرار فى الوصية من
الكبائر رواه الدار قطنى“

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا وصیت میں کسی کو نقصان پہنچانا کبیرہ گناہوں میں سے ہے۔

”وروى ابو داود عن ابي هريرة رضى الله عنه رسول الله ﷺ قال ان
الرجل او المرأة ليعمل بطاعة الله ستين سنة ثم يحضرهما الموت
فيضاران فى الوصية فتجب لهما النار“

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مرد یا عورت اللہ تعالیٰ

کی طاعت میں ساٹھ سال عمل کرتے رہیں پھر ان پر موت آتی ہے تو وہ وصیت کرنے میں (اپنے ورثا کو) نقصان پہنچاتے ہیں تو وہ دونوں جہنم کے مستحق ہیں۔

”عن عمر ان بن حصین رضی اللہ عنہ ان رجلا اعتق ستة مملو کین له عند موته ولم یکن له مال غیرهم فبلغ ذلک النبی ﷺ فغصب من ذلک وقال لقد هممت الا اصلی علیہ“ (رواہ النسائی)

عمر ان بن حصین رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ایک شخص نے اپنی موت کے وقت چھ غلام آزاد کر دیئے ان کے بغیر اس کا اور کوئی مال نہیں تھا نبی کریم ﷺ کو جب یہ خبر ملی تو آپ غصہ میں ہوئے فرمایا میرا ارادہ بنتا ہے کہ میں اس کی نماز جنازہ نہ پڑھاؤں۔

فائدہ: ”وفی صحیح البخاری ان ابن عباس قال لو ان الناس غصوا من الثلث الی الربع فان رسول اللہ ﷺ قال الثلث والثلث کثیر“

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اگر لوگ تیسرے حصہ سے کم وصیت کریں تو ان کے لئے بہتر ہے اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ نے تہائی حصہ کو اجازت دی اور تہائی کو کثیر قرار دیا۔ (پتہ چلا کہ تہائی حصہ سے کم کی وصیت کرنا بہتر ہے)۔

(از خازن وصابونی)



يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى
الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ☆ أَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ فَمَنْ
كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيضًا أَوْ عَلَى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ وَعَلَى
الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينَ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ
خَيْرٌ لَهُ، وَأَنْ تَصُومُوا خَيْرٌ لَّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ

(۱) ”اے ایمان والو تم پر روزے فرض کئے گئے جیسے اگلوں پر روزے فرض ہوئے تھے کہ کہیں تمہیں
پرہیزگاری ملے گنتی کے دن ہیں تو تم میں جو کوئی بیمار یا سفر میں ہو تو اتنے روزے اور دنوں میں
اور جنہیں اسکی طاقت نہ ہو وہ بدلہ دیں ایک مسکین کا کھانا پھر جو اپنی طرف سے نیکی زیادہ
کرے تو وہ اس کیلئے بہتر ہے اور روزہ رکھنا تمہارے لئے زیادہ بھلا ہے اگر تم جانو۔“

(۲) ”اے ایمان والو فرض کئے گئے تم پر روزے جیسے فرض کئے گئے ان لوگوں پر جو تم سے پہلے
تھے تا کہ تم پرہیزگار بنو گنتی کے دن ہیں تو جو شخص تم میں سے ہو مریض، یا سفر میں ہو تو اتنے اور
دنوں میں اور ان لوگوں پر جو طاقت نہیں رکھتے فدیہ ہے طعام ایک مسکین کا پھر جو شخص زیادہ
نیکی کرے تو وہ بہتر ہے اس کے لئے اور تمہارا روزہ رکھنا بہتر ہے تمہارے لئے اگر تم جانتے ہو۔“

جب اس سے پہلے قصاص اور وصیت کی فرضیت کا ذکر کیا تو اس آیت کریمہ میں روزہ کی فرضیت
کا ذکر کیا اور روزہ چونکہ اسلام کے پانچ ارکان میں سے ایک رکن ہے اس لئے اس کا ذکر کرنا اہم تھا۔
ارکان اسلام:

”قال رسول الله ﷺ بني الاسلام على خمس شهادة ان لا اله الا الله
وان محمدا رسول الله واقام الصلوة وايتاء الزكوة وصوم رمضان
والحج“
(واہ ابن عمر، متفق علیہ)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے گواہی دینا کہ اللہ کے بغیر کوئی معبود نہیں اور بیشک محمد اللہ کے رسول ہیں اور نماز قائم کرنا اور زکوٰۃ ادا کرنا اور رمضان کا روزہ رکھنا اور حج کرنا۔ (ماخوذ از قرطبی)

مختصر مطلب : ان دونوں آیتوں کا مختصر مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا اے ایمان والو تم پر روزے فرض کئے گئے ایسے ہی جیسے تم سے پہلے آدم علیہ السلام سے لے کر نبی کریم ﷺ تک تمام انبیاء کرام اور ان کی امتوں پر روزے فرض کئے گئے روزے اس لئے تم پر فرض کئے گئے ہیں کہ تم متقی بن جاؤ۔ وہ روزے بھی چند دن ہیں جو شخص تم میں سے مریض ہو جائے یا مسافر ہو تو وہ اس وقت روزہ افطار کر لے تو اس کے لئے جائز ہے بعد میں جتنے روزے افطار کئے اتنی تعداد میں قضاء کر لے۔

جو شخص شیخ فانی ہو روزہ نہ رکھ سکے وہ ایک روزہ کے بدلہ ایک مسکین کو طعام دو وقت کھلا کر فدیہ ادا کر دے اگر فدیہ کی اس مقدار سے جو زیادہ دے اس کے لئے بہتر ہے روزہ رکھنا تمہارے لئے بہتر ہے اگر تمہیں معلوم ہو جائے کہ روزہ میں کیا خیر و برکات ہیں۔

قدرے تفصیل:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ : ”اے ایمان والو فرض کئے تم پر روزے“

روزہ کی فرضیت کیسے ہوئی؟ نبی کریم ﷺ کی امت پر پہلے یوم عاشورا کا روزہ فرض ہوا پھر اسے منسوخ کر دیا گیا اور ہر ماہ کے ایام بیض (چاند کی تیرہ، چودہ، پندرہ تاریخوں) کو روزے فرض کئے گئے پھر یہ حکم منسوخ کر کے رمضان کے مہینے کے روزے فرض کئے گئے۔ اس میں اختیار تھا جو چاہیں روزہ رکھیں اور جو چاہیں روزہ نہ رکھیں بلکہ فدیہ دے دیں۔ پھر اختیار کو منسوخ کر دیا گیا تمام لوگ جو روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہوں ان پر روزہ رکھنا فرض کر دیا گیا صرف چند عذروں کی وجہ سے روزہ افطار کرنے کی اجازت دی گئی (جس کی تفصیل ان شاء اللہ آگے آرہی ہے)۔

(ماخوذ از روح المعانی ونور الانوار)

كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا مِنْ قَبْلِكُمْ : ”جیسا کہ فرض کئے گئے تم سے پہلے لوگوں پر“

یعنی یہ عبادت (روزہ رکھنے کا حکم) فرض تھی تمام انبیاء کرام اور تمام امتوں پر آدم علیہ السلام سے لے کر تمہارے عہد تک یہ سلسلہ اسی طرح چلا آ رہا ہے۔ کوئی امت بھی نہیں گزری جن پر روزہ فرض نہ کیا گیا ہو بلکہ ہر امت پر روزے فرض تھے۔

قرآن پاک کا بیان ذیشان: سب سے پہلے تو کہا ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا﴾ ”اے ایمان والو یعنی مجھ پر ایمان لانے والو میری محبت کا دم بھرنے والو، میرے پیار و محبت و پیار کا تقاضا یہی ہے کہ میرا حکم بھی مانو میرا حکم یہ ہے کہ تم روزے رکھو کیونکہ تم پر روزے فرض کر دیئے گئے۔ اور آسان یوں کیا کہ روزے ہر نبی اور ہر امت پر فرض کئے گئے ”لا يفرضها عليكم وحدكم“ تم پر ہی تو فرض نہیں کئے گئے۔ جب تم تمام امتوں سے بہتر ہو تو اپنے منصب میں خلل نہ آنے دینا بلکہ روزے رکھ کر میرے حکم کو تسلیم کر کے اپنی برتری کو برقرار رکھنا۔

پھر اس حکم پر عمل کرنے کے لئے اور آسانی پیدا کی گئی کہ روزہ رکھنے میں تمہارا ہی فائدہ ہے کیونکہ تقوی تمہیں ہی حاصل ہونا ہے اس لئے تقوی حاصل کرنے کیلئے بڑھ چڑھ کر عمل کرو۔ اس کے بعد اس حکم کو تسلیم کرنے کے لئے ﴿إِيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ﴾ ”چند دن“ کہا کہ یہ روزے زیادہ نہیں بلکہ حساب کریں تو ہر ماہ کے تین روزے بھی مکمل نہیں ہوتے۔ جب چند دن تم پر روزے فرض کئے گئے ہیں تو تمہارا حق ہے کہ ان پر عمل کرنے میں کوئی کوتاہی نہ کرنا پھر حکم کو اور آسان کیا گیا کہ مرض اور سفر کی حالت میں روزہ افطار کر کے تمہیں قضاء کرنے کی اجازت ہے۔ پھر اور آسانی پیدا کرنے کے لئے شیخ فانی کو روزہ کے بدلے فدیہ دینے کی اجازت دی گئی۔ تو روزہ رکھنے کی طرف مزید رغبت دلانے کے لئے ﴿وَأَنْ تَصُومُوا خَيْرٌ لَّكُمْ﴾ ”اور تمہارا روزہ رکھنا تمہارے لئے بہتر ہے“ کہا کہ جب روزہ خیر و برکت کا ذریعہ تو روزہ رکھ کر خیر و برکت کو حاصل کرو۔ پھر ﴿إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ﴾ کہہ کر روزہ رکھنے کا مزید احساس دلایا گیا کہ اگر تمہیں روزہ کی خیر و برکت کا علم حاصل ہو جائے تو یقیناً تم روزہ رکھو گے۔ (راقم)

پہلے لوگوں کے روزوں سے مشابہت کی وجہ: مسلمانوں کے روزے پہلی قوموں کے روزوں

سے اصل وجوب میں مشابہ ہیں کہ ان پر بھی روزے فرض تھے اور مسلمانوں پر بھی فرض ہیں لیکن مسلمانوں کے روزوں کے پہلی قوموں کے روزوں کے ساتھ وقت اور کیفیت میں مشابہت نہیں تھی۔ البتہ نصاریٰ کے روزوں سے دو وجہ سے مشابہت تھی ایک تو یہ کہ ان پر کھانا، پینا اور جماع کرنا دن کو منع تھا افطار کے وقت جائز تھا لیکن جب ایک مرتبہ کوئی سو جاتا پھر اس پر یہ چیزیں حرام ہو جاتیں خواہ رات کو ہی وہ کیوں نہ جاگ جائے۔

ابتداء اسلام میں مسلمانوں کو بھی یہی حکم تھا لیکن بعد میں صرف صبح صادق سے غروب آفتاب تک روزہ رکھنا لازم قرار دیا گیا رات سے روزے کا حکم منسوخ کر دیا گیا۔ اور ان سے دوسری مشابہت کی وجہ یہ ہے کہ نصاریٰ کو بھی حکم رمضان کا مہینہ روزہ رکھنے کا تھا لیکن انہوں نے جب یہ سوچا کہ روزے کبھی سردیوں میں آتے ہیں اور کبھی گرمیوں میں۔ گرمیوں میں روزے رکھنا بڑا مشکل کام ہے تو انہوں نے اپنے علماء کے ذریعے یہ حکم بدل دیا کہ روزے رمضان کے بدلے موسم بہار میں رکھا کریں گے جب ان میں بیماری پھیل گئی تو انہوں نے ڈر کر بیس روزے اور بڑھادیئے یعنی اب وہ پچاس روزے رکھتے ہیں ان کی عید الفطر ہمیشہ اپریل میں ہوتی ہے تفسیر بیضاوی نے یہی بیان کیا ہے البتہ روح المعانی اور قرطبی نے کچھ مختلف بیان کیا ہے۔

(از قرطبی)

لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ :

”تا کہ تم پر ہیزگار ہو جاؤ“ یعنی تم تمام گناہوں سے بچ جاؤ۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ”الصيام جنة ووجاء“ روزہ ڈھال ہے اور شہوت کو کم کرتا ہے یقیناً شہوت کی کمی گناہوں سے روکتی ہے۔

أَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ :

”چند دن ہیں“ یعنی روزے چند دن فرض ہیں وہ سال بھر میں صرف رمضان کا مہینہ ہے۔ (از قرطبی)

صوم کا لغوی معنی: ”هو لغة الامساك مطلقا“ لغت میں مطلقاً امساك کو صوم کہتے ہیں اسی لغوی معنوی کے لحاظ سے مطلقاً کلام سے رکنے کو بھی رب تعالیٰ نے ”صوم“ فرمایا رب تعالیٰ نے حضرت مریم کو کہا تم کہو:

﴿إِنِّي نَذَرْتُ لِلرَّحْمَنِ صَوْمًا فَلَنْ أُكَلِّمَ الْيَوْمَ إِنْسِيًّا﴾ (مریم ۳۶)

”میں نے آج رخصت کا روزہ مانا ہے تو آج ہرگز کسی آدمی سے بات نہیں کروں گی۔“

صوم کا اصطلاحی معنی: یعنی اصطلاح شرع میں ”صوم“ (روزہ) کا مطلب یہ ہے کہ روزے کی نیت سے صبح صادق سے لے کر غروب آفتاب تک جماع سے رکنا اور پیٹ میں کسی چیز کو داخل کرنے سے رکنا اور ہر وہ مقام جس کو باطن کا حکم دیا جائے اس میں کسی چیز کو داخل کرنے سے روکنا یعنی ایسی رگیں وغیرہ جن کا تعلق براہ راست دماغ یا معدہ سے ہے ان میں دواء وغیرہ ڈالنے سے رکنا۔ (اس کی تفصیل ان شاء اللہ آئے گی)۔

روزہ کے فوائد:

(۱) چونکہ نفس امارہ کی خواہشات کی وجہ سے باقی اعضا یعنی آنکھوں، کانوں اور زبان اور ہاتھ، پاؤں وغیرہ میں بھی خواہشات پائی جاتی ہیں جن سے انسان مختلف گناہوں میں مبتلا ہو جاتا ہے روزہ کی وجہ سے نفس امارہ کی خواہشات ماند پڑ جاتی ہیں جن کی وجہ سے دوسرے اعضاء کو بھی قرار آ جاتا ہے اور انسان گناہوں سے باز آ جاتا ہے۔ اسی وجہ سے کہا جاتا ہے ”اذا جاعت النفس شبت جميع الاعضاء واذا شبت جاعت کلھا“ کہ جب نفس بھوکا ہوتا ہے تو تمام اعضاء سیر ہوتے ہیں اور جب نفس سیر ہوتا ہے تو تمام اعضا بھوکے ہوتے ہیں۔

(۲) روزہ کی وجہ سے دل کدورت سے پاک و صاف ہوتا ہے کیونکہ دل میں کدورت کے اسباب سے زبان سے لغویات کا سرزد ہونا اور آنکھوں کا ناجائز طرف اٹھنا۔ اسی طرح باقی اعضاء سے گناہوں کا سرزد ہونا جب روزہ کی وجہ سے ان اعضاء میں نیکیاں آ جائیں گی تو ان کے درجات بلند ہوں گے اور ان کی وجہ سے دل کی کدورت بھی جاتی رہے گی۔ دل میں جلا (صفائی) آئے گی۔

(۳) روزہ کی وجہ سے انسان کو غرباء و فقراء پر رحم کرنے اور مہربانی کرنے کا دل میں خیال آتا ہے اس لئے کہ جب روزہ کی حالت میں انسان کو خود بھوک کی وجہ سے تکلیف محسوس ہوگی تو غریب اور فقیر لوگوں کی بھوک کا بھی اسے احساس ہوگا اسی طرح یہ ان پر رحمت اور مہربانی کرے گا غربا پر مہربانی کرنا درحقیقت اس پر رب تعالیٰ کی مہربانی ہوگی نیکی کی توفیق حاصل ہونا اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے ہی ہوگا۔

(۴) روزہ سے فقراء کی موافقت حاصل ہوگی جس طرح وہ کبھی کبھی بھوک میں اپنے اوقات گزار دیتے ہیں روزہ دار بھی بھوک برداشت کر کے ان کی موافقت کر رہا ہے ”وفی ذلک دفع حالہ عند اللہ“ روزہ کی حالت میں اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کا مقام بلند ہوگا۔

حضرت بشر حافی کسی نیک شخص کے پاس جاتے ہیں دیکھتے کہ وہ سخت سردی میں کپڑا اوڑھے بغیر بیٹھے ہوئے سردی کی وجہ سے کانپ رہا ہے حالانکہ اس کے قریب ہی کپڑا لٹکا ہوا ہے۔ بشر حافی نے اس بزرگ کو کہا یہ وقت ہے کپڑا اتار کر لپیٹنے کا تاکہ تم سردی سے بچ سکو۔

”فقال یا اختی الفقراء کثیر و لیس لی طاقة مواساتهم بالشیاب
فاواسیهم بتحمل البرد کما یتحملون“

تو وہ کہنے لگے اے میرے بھائی فقراء بہت ہیں ان کے پاس کپڑے نہیں اور مجھے طاقت حاصل نہیں کہ میں تمام کو کپڑے دے کر ان پر ایثار کر سکوں اس لئے جس طرح وہ سردی برداشت کر رہے ہیں میں بھی سردی برداشت کر کے جس حد تک ممکن ہے ان سے غمخواری کر رہا ہوں۔

اسی وجہ سے اولیاء عارفین میں سے ایک بزرگ کھانا کھاتے وقت یہ دعا کرتے تھے ”اللهم لا تؤاخذنی بحق الجانعین“ اے اللہ بھوکے لوگوں کے حق کی وجہ سے میری گرفت (پکڑ) نہ کرنا۔
حضرت یوسف علیہ السلام قحط کے سال میں سیر ہو کر کھانا نہیں کھاتے تھے تاکہ بھوک اور فاقہ میں مبتلا لوگوں کو نہ بھول سکیں اور خود ان جیسی بھوک برداشت کریں۔ (ازمرقاۃ کتاب الصوم ج ۲ ص ۲۲۹)

رمضان کے روزے کب فرض ہوئے؟

”کانت فرضیتہ صوم رمضان بعد ما صرفت القبلة الی الکعبة بشہر

فی شعبان علی رأس ثمانیۃ عشر شہرا من الهجرة“

قبلہ کی تبدیلی کے ایک ماہ بعد ہجرت کے اٹھارہ ماہ بعد شعبان کے مہینہ میں رمضان شریف کے روزے فرض کر دیئے گئے یعنی ہجرت کے دوسرے سال روزے فرض ہوئے۔ (مرقاۃ حوالہ مذکور)
روزہ ایمان کا چوتھا حصہ ہے: نبی کریم ﷺ نے فرمایا ”الصوم نصف الصبر“ روزہ نصف

صبر ہے اور نبی کریم ﷺ کا ارشاد یہ ہے ”الصبر نصف الايمان“ صبر نصف ایمان ہے دونوں حدیثوں کو ملا کر پڑھنے سے نتیجہ واضح ہے کہ روزہ ایمان کا چوتھا حصہ ہے۔ (ازاحیاء العلوم ج اول ص ۱۴۴)
روزے کے تین درجے: عوام کا روزہ، خواص کا روزہ، اخص الخواص حضرات کا روزہ۔
عوام کا روزہ:

صبح صادق سے لے کر غروب آفتاب تک نیت روزہ سے جماع اور کھانے پینے سے رک جانا۔
خواص کا روزہ: کانوں اور آنکھوں اور زبان اور ہاتھ اور پاؤں اور تمام اعضاء کو بھی گناہوں سے بچانا یعنی خواص کا روزہ عوام کے روزہ پر بھی مشتمل ہوگا اور اس سے زائد بھی۔
اخص الخواص حضرات کا روزہ: عوام کے روزہ کے ساتھ خواص کا روزہ بھی پایا جائے گا اس سے زائد یہ کہ اس کا دل دنیا کی گھٹیا چیزوں سے دور ہوگا دنیاوی افکار اس میں نہیں پائی جائیں گی بلکہ خالص اللہ تعالیٰ کی طرف اس کی توجہ پائی جائے گی۔
(ازاحیاء العلوم ج اول ص ۱۴۶)

روزے میں کمال چھ چیزوں سے آئے گا:

نظر کو پست کرنا: غیر محرم عورتوں سے نظر نیچے رکھے ہر قسم کی برائی کی طرف نظر اٹھانے سے نظر کو بچا کر رکھے اس طرح نظر نہ اٹھے جو اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ سے ہی پھیر دے۔

”قال ﷺ النظره سهم مسموم من سهام ابليس لعنه الله فمن تركها خوفا من الله اتاه الله عز وجل ايمانا يجد حلاوته“

نبی کریم ﷺ نے فرمایا ابلیس ملعون کے تیروں میں سے زہر آلود تیر نظر ہے جو اللہ تعالیٰ کے خوف سے نظر بد کو چھوڑ دے اللہ تعالیٰ اس کو کامل ایمان پر قائم رکھے گا اور اسے ایمان کی حلاوت (مٹھاس) حاصل ہوگی۔

”وروی جابر عن انس عن رسول الله ﷺ انه قال خمس يظفرن الصائم الكذب والغيبة والنميمة واليمين الكاذبة والنظر بشهوة“

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا پانچ چیزوں سے روزے دار کا روزہ افطار ہو جاتا ہے جھوٹ اور غیبت اور چغل خوری اور جھوٹی قسم اور شہوت سے نظر (غیر محرمہ کی طرف) کرنا۔

زبان کی حفاظت کرنا: روزے کا کمال اس میں ہے کہ زبان کو بیہودہ باتوں سے اور جھوٹ سے اور غیبت سے اور چغل خوری سے اور فحش کلام سے اور ظالمانہ کلام سے اور جھگڑے سے محفوظ رکھے اور خاموشی کو لازم پکڑے اور اللہ تعالیٰ کے ذکر میں مشغول رہے اور تلاوت قرآن پاک میں مشغول رہے یہ زبان کا روزہ ہے۔

”وقد قال سفیان الغیبة تفسد الصوم رواہ بشر بن الحارث عنہ“

بشر بن حارث نے سفیان رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ غیبت روزہ کو فاسد کر دیتی ہے۔ لیث نے مجاہد سے روایت کیا ”خصلتان یفسدان الصیام الغیبة والكذب“ دو چیزیں روزہ کو فاسد کر دیتی ہیں یعنی غیبت اور جھوٹ روزے کا فاسد کرنے کا مطلب یہ ہے کہ روزہ کا کمال فاسد ہو جاتا ہے۔

”قال ﷺ انما الصوم جنة فاذا كان احدكم صائما فلا يرفث ولا

يجهل وان امرا قاتله او شاتمه فليقل اني صائم“

اور نبی کریم ﷺ نے فرمایا بیشک روزہ ڈھال ہے جب تم میں سے کوئی ایک روزہ دار ہو تو کسی کو گالی وغیرہ نہ دے اور نہ ہی کسی سے جاہلانہ کلام کرے اگر روزہ دار سے کوئی شخص جھگڑا کرے اور گالی دے تو یہ کہے کہ بیشک میں روزہ دار ہوں (میں تمہیں گالیوں کا جواب نہیں دیتا)۔

خبر میں آیا ہوا ہے کہ دو عورتیں نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں روزہ دار تھیں شام کے قریب پچھلے پہر ان کا بھوک اور پیاس سے ان کا برا حال ہو گیا ہلاک ہونے کے قریب پہنچ گئیں انہوں نے نبی کریم ﷺ کے پاس پیغام بھیج کر روزہ توڑ دینے کی اجازت طلب کی آپ نے ان کی طرف ایک پیالہ بھیجا کہ اس میں دونوں قے کر دو (یعنی زبردستی منہ میں انگلی وغیرہ ڈال کر قے کرو) ان میں سے ایک نے قے کی جس میں خون اور گوشت کے ٹوٹھڑے تھے دوسری نے قے کی اس کا بھی یہی حال تھا لوگوں نے اس پر تعجب کیا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”هاتان صامتات احل الله لهما وافطرتا على ما حرم الله تعالى عليهما فعدت

احداهما الى الاخرى فجعلتا يغتابان الناس فهذا ما اكلتا من لحومهم“

ان دونوں نے روزہ رکھا ہوا تھا ان چیزوں سے جو اللہ تعالیٰ نے حلال فرمائی ہیں اور افطار کر رہی

تھیں اس چیز سے جو اللہ تعالیٰ کی حرام کی ہوئی ہیں یعنی ایک دوسری کے پاس بیٹھ کر لوگوں کی غیبت کر رہی تھیں ان کے قے میں وہی گوشت کے ٹکڑے ہیں جو انہوں نے اپنے بہن بھائیوں کی غیبت کی وجہ سے ان کا گوشت کھایا تھا۔ خیال رہے کہ حدیث کی صحت اور عدم صحت کی دار و مدار علامہ غزالی رحمہ اللہ پر ہے۔ کانوں کو بچانا: مکروہ قسم کے کلام کے سننے سے اپنے کانوں کو بچانا بھی روزہ کے کمال کا ذریعہ ہے ”کل ما حرم قوله حرم الاصفاء الیہ“ ہر وہ کلام جس کا کرنا حرام ہے اس کا سننا بھی حرام ہے۔ رب تعالیٰ نے جھوٹ اور حرام کھانے کو ایک ساتھ ذکر کر کے دونوں کی حرمت اور قباحیت کو ذکر فرمادیا ہے۔ ”سماعون للكذب اکالون للسحت“ وہ جھوٹ سنتے ہیں اور حرام کھاتے ہیں۔

مسئلہ: غیبت پر خاموش ہونا منع ہے بلکہ غیبت کرنے والے کو غیبت سے منع کرنا ضروری ہے نبی کریم ﷺ نے فرمایا ”المغتتاب والمستمع شریکان فی الاثم“ غیبت کرنے والا اور اس کے کلام کو سننے والا دونوں ہی گناہ میں شریک ہیں۔

باقی اعضاء کو گناہوں سے روکنا: یعنی روزہ کامل اس وقت ہوگا جب باقی اعضاء کو بھی گناہوں سے روکے ہاتھ اور پاؤں کو غیر شرعی افعال سے روک کر رکھے۔ اور پیٹ کو شبہات والی چیزوں سے منع کرے کیونکہ حلال چیزوں کے کھانے سے اس لئے رک جانا کہ میں روزہ دار ہوں لیکن حرام چیزوں کے حاصل کرنے میں کوئی پرواہ نہ کرے اس کی مثال یہ ہے ”من یبني قصرًا ویهدم مصرًا“ کہ گھر بنا کر شہر برباد کر دیا جائے نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ”کم من صائم لیس له من صومه الا الجوع“ کتنے ہی روزے دار ہیں جن کا روزہ سوائے بھوک کے نہیں۔

افطار کے وقت زیادہ طعام نہ کھائے: روزہ کے کامل ہونے کے لئے اور یہ ضروری ہے کہ افطار کے وقت زیادہ مقدار میں کھانا تناول نہ کرے کیونکہ روزہ کا مقصد یہ ہے کہ نفس پر قہر کیا جائے کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کا دشمن ہے اور مقصد یہ ہے کہ نفس کی شہوت کو توڑا جائے۔ روزہ دار جب افطار کے وقت اتنا کھا لے کہ دن کے نہ کھانے کی کمی کو بھی پورا کر دے بلکہ عام عادت سے ہٹ کر طرح طرح کے کھانے کھائے تو مقصد فوت ہو گیا بلکہ نفس کو زیادہ قوت دے دی۔

افطار کے بعد خوف ورجاء میں ہو: یعنی روزہ کے کامل ہونے کا اور ذریعہ یہ ہے کہ اپنی طرف

سے مکمل کوشش کر کے روزہ میں جماع، کھانے پینے وغیرہ سے اجتناب کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے اعضاء کو گناہوں سے بچانے کے بعد جب روزہ افطار کرے تو اس کا دل خوف اور امید کے درمیان مضطرب رہے:

”اذ لیس بدری اقبل صومه فهو من المقربين او یرد علیه فهو من
الممقوتین“

کیونکہ اسے معلوم نہیں کہ اس کا روزہ مقبول ہوا ہے کہ وہ مقربین کے درجہ میں پہنچ گیا یا اس کا روزہ مردود ہو گیا یہ ان لوگوں میں سے ہو گیا جن پر اللہ تعالیٰ کی ناراضگی ہوتی ہے۔ حضرت حسن بن ابی الحسن بصری رحمہ اللہ کا ایک قوم سے گزر رہا وہ ہنس رہے تھے (یہ ماہ رمضان تھا) آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے ماہ رمضان کو گھوڑوں کی دوڑ کے میدان کی طرح بنا دیا ہے کہ لوگ اس میں طاعت کا مقابلہ کریں ”فسبق قوم ففازوا وتخلف اقوام فخابوا“ جو قوم طاعت میں سبقت لے گئی وہ کامیاب ہو گئی اور جو قوم پیچھے رہ گئیں وہ رسوا ہو گئیں پھر آپ نے فرمایا بہت بڑا تعجب ہے ایسے لوگوں پر جو ایسے دن میں ہنس رہے ہیں اور کھیل رہے ہیں جس دن میں طاعت میں جلدی کرنے والے کامیاب ہو رہے ہیں اور باطل راہ پر چلنے والے رسوا ہو رہے ہیں:

”اما والله لو كشف الغطاء لاشتغل المحسن باحسانه والمسی باساءته
ای کان سرور المقبول يشغله عن اللعب وحسرة المردود وتسده عليه باب
الضحك“

خبردار قسم ہے اللہ تعالیٰ کی اگر پردے ہٹ جائیں یہ منظر سامنے آ جائے کہ احسان کرنے والا اپنے احسان میں مشغول ہے اور برائیاں کرنے والا اپنی برائیوں میں مشغول تو مقبول شخص کے سردار کو دیکھ کر ہنسنے اور کھیلنے والا شخص اپنی ہنسی اور کھیل سے اعراض کر لے اور اسے اپنے اوقات کے ضائع ہونے پر حسرت ہو اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنے آپ پر ہنسی کا دروازہ بند کر لے۔

ذرا مقام غور: ایک مرتبہ اس جملہ کو ”فسبق قوم ففازوا وتخلف اقوام فخابوا“ غور سے سمجھنے کی کوشش کی جائے کہ طاعت کرنے والوں کا جب ذکر کیا تو ”قوم“ واحد ذکر کیا۔ اور جب نافرمانوں کا ذکر کیا تو ”اقوام“ جمع ذکر کیا جس سے واضح ہو رہا ہے کہ ہر دور میں طاعت کرنے والے

تھوڑی تعداد میں رہے اور نافرمان زیادہ تعداد میں رہے۔ (راقم)

خلاصہ کلام: روزہ کی مقبولیت اور عدم مقبولیت علماء آخرت (صوفیاء کرام اولیاء عظام) کے نزدیک ہے یعنی انسان کو جب اللہ تعالیٰ کی صفت صمدیت (بے نیازی) کا عکس حاصل ہو جائے تو اس کا روزہ مقبول ہوگا کیونکہ شہوات کو ترک کرنے سے انسان مقام حیوانیت سے نکل کر مقام ملائکہ میں آ جاتا ہے صرف رب تعالیٰ کی طرف توجہ ہوتی ہے اور دوسری چیزوں سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔

(تمام بحث ماخوذ از احیاء العلوم کتاب الصوم)

روزہ اور رمضان کے فضائل:

”عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ ﷺ اذا دخل رمضان فتحت

ابواب السماء وفي رواية فتحت ابواب الجنة ☆ وغلقت ابواب

جہنم وسلسلت الشياطين وفي رواية فتحت ابواب الرحمة“

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب رمضان داخل ہوتا ہے تو آسمانوں کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں ایک روایت میں ہے جنت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور جہنم کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں اور شیطانوں کو زنجیروں سے جکڑ دیا جاتا ہے اور ایک روایت میں ہے رحمت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں۔ (بخاری، مسلم مشکوٰۃ کتاب الصوم)

ایک روایت میں ”صفت الشياطين“ ہے قاضی عیاض رحمہ اللہ نے بیان فرمایا کہ یہ الفاظ اپنے ظاہری حقیقی معانی میں استعمال ہیں کہ حقیقت میں جنت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور جہنم کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں اور شیطانوں کو قید کر لیا جاتا ہے اس کی وجہ ”علامة لدخول الشهر وتعظيم لحرمة ويكون التصفيد ليمتنعوا من ايداء المؤمنين والنهويش عليهم“ ماہ رمضان کے داخل ہونے کی علامت ہے اور اس ماہ کی حرمت کی عظمت کا لحاظ ہے اور شیطانوں کو قید اس لئے کیا جاتا ہے کہ وہ مومنوں کو ایذا نہ پہنچا سکیں اور ان کو نیک عمل کرنے میں پریشان نہ کر سکیں۔ اور یہ احتمال بھی ہے کہ مجازی معنی مراد ہو یعنی رحمت اور آسمانوں اور جنت کے دروازے کھولنے کا مطلب یہ ہو کہ کثیر ثواب عطا کیا جاتا ہے اور کثرت سے معاف کیا جاتا ہے اور

شیطان مومنوں کو کم بھٹکاتے ہیں اور ان کو کم ایذا پہنچاتے ہیں اس لئے گویا کہ وہ قید ہوتے ہیں:

”و یكون تصفیدهم عن اشیاء دون اشیاء ولناس دون ناس“

اور ان کو بعض چیزوں سے روکا جاتا ہے اور بعض سے نہیں اور بعض لوگوں سے روکا جاتا ہے بعض سے نہیں دوسری حدیث میں ہے ”صفدت مردۃ الشیاطین“ سرکش شیطانوں کو قید کر لیا جاتا ہے۔

اب مسئلہ واضح ہوا کہ رمضان شریف میں بڑے بڑے سرکش شیطان قید ہوتے ہیں شطونگڑے کھلے ہوتے ہیں جن کی وجہ سے بعض لوگ بعض جرائم میں مبتلاء ہوتے ہیں اسی طرح نفس امارہ بھی جرائم کا ذریعہ ہوتا ہے۔ ایک اور احتمال یہ ہے کہ جنت کے دروازے کھولنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مومنوں کو توفیق عطا فرماتا ہے کہ وہ عبادات زیادہ کرتے ہیں روزے رکھتے ہیں رات کو تراویح کے لئے قیام کرتے ہیں اور ہر قسم کی نیکی کے کام زیادہ کرتے ہیں یہ جنت میں داخل ہونے کے ذرائع ہیں اور یہی جنت کے دروازے ہیں۔ اور جہنم کے دروازے بند کئے جانے اور شیطانوں کو قید کرنے کا مطلب یہ ہے کہ رب تعالیٰ کی مہربانی سے رمضان میں مؤمنین کافی حد تک گناہوں سے باز رہتے ہیں۔

(ماخوذ از نواری مسلم ج اول ص ۳۶۶)

☆ ”عن سهل بن سعد قال قال رسول اللہ ﷺ فی الجنة ثمانية ابواب منها باب یسمى الریان لا یدخله الا الصائمون“

سہل بن سعد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جنت میں آٹھ دروازے ہیں ان میں سے ایک دروازے کا نام ”ریان“ ہے اس میں صرف روزے وارد داخل ہوں گے۔

(بخاری مسلم مشکوٰۃ کتاب الصوم)

اور ایک روایت میں یہ الفاظ زائد ہیں:

”لا یدخل معهم احد غیرهم یقال این الصائمون فیدخلون منه فاذا دخل آخرهم اغلق فلم یدخل منه احد“ (مسلم)

اسی دروازہ میں روزے داروں کے ساتھ کوئی اور داخل نہیں ہوگا کہا جائے گا روزے دار کہاں ہیں جب روزے دار اس دروازے سے داخل ہوں گے جب آخری روزہ دار اس دروازے سے داخل ہو جائے گا تو دروازہ بند کر دیا جائے گا کوئی اور اس سے داخل نہیں ہو سکے گا۔ اس دروازہ کو ”ریان“ کہتے

کی وجہ یہ ہے کہ اس میں کثیر نہریں جاری ہوں گی تو تازہ پھل اور پھول اس میں ہوں گے اور وجہ یہ ہے کہ اس دروزہ سے داخل ہونے والے کو سیراب کر دیا جائے گا اسے کوئی پیاس محسوس نہیں ہوگی۔

(مرقاۃ)

☆ ”عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ ﷺ من صام رمضان ایمانا واحتسابا غفر له ما تقدم من ذنب ومن قام رمضان ایمانا واحتسابا غفر له ما تقدم من ذنبه ومن قام ليلة القدر ایمانا واحتسابا غفر له ما تقدم من ذنبه“

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے رمضان کے روزے رکھے ایمان و خلوص سے اس کے پہلے گناہ معاف کر دیئے گئے اور جس شخص نے رمضان میں ایمان و خلوص سے قیام کیا (نماز تراویح ادا کی) تو اس کے پہلے گناہ معاف کر دیئے گئے اور جس شخص نے لیلة القدر میں ایمان و خلوص سے قیام کیا تو اس کے پہلے گناہ معاف کر دیئے گئے۔

وضاحت حدیث: ایمانا : سے مراد یہ ہے کہ وہ ایمان کی وجہ سے روزہ رکھتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے روزہ کی فرضیت کا جو حکم فرمایا اس کی وہ تصدیق کرتا ہے اور اس کے ثواب کی وہ تصدیق کرتا ہے۔ احتسابا : کا مطلب یہ ہے کہ وہ طلب ثواب کے لئے روزہ رکھتا ہے اور اس میں خلوص پایا جاتا ہے لوگوں کے خوف اور لوگوں سے حیا اور چرچا کرنا اور لوگوں کو دکھانا اس کے روزہ رکھنے کے اسباب نہیں۔ ”احتسابا“ کا اور مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جن کاموں کا حکم دیا ہے ان پر صابر رہے جھوٹ اور غیبت وغیرہ سے باز رہے نیکی کے کام خوشی سے کرے جبر سے نہیں روزے کو بوجھ نہ سمجھے اور روزے کے دنوں کو لمبا سمجھ کر روزہ ترک نہ کرے۔

غُفِرَ لَهُ، مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ :

”اس کے پہلے گناہ معاف کر دیئے گئے“ اس کے متعلق علامہ نووی رحمہ اللہ نے فرمایا:

”ان المكفرات ان صادفت السيأت تمحوها اذا كانت صغائر وتخففها

اذا كانت كبائر والا تكون موجبة لرفع الدرجات في الجنات“

کہ جتنی عبادات بھی گناہوں کو مٹاتی ہیں ان کا مطلب یہ ہے کہ صغائر گناہوں کو مٹاتی ہیں اور کبیرہ گناہوں میں تخفیف پیدا کرتی ہیں اگر عبادت کرنے والا گناہوں سے محفوظ ہو تو اس کے درجات کو

بلند کرتی ہیں علامہ طیبی رحمہ اللہ بیان فرماتے ہیں کہ ان تین صورتوں کو ایک ہی صورت میں یوں پیش کیا جاسکتا ہے کہ عبادت کے ذریعے مومن کو وہ مغفرت کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے:

”الغفران نتیجة الفتوحات الالهية ومستتبع للعواطف الربانية قال تعالى انا فتحنا لك فتحا مبينا ليغفر لك الله“

کہ اس پر فتوحات الہیہ اور رب تعالیٰ کی مہربانیاں مرتب ہوتی ہیں رب تعالیٰ نے فرمایا: بیشک ہم نے آپ کو فتح مبین (واضح فتح) عطا کی تاکہ تمہاری وجہ سے اللہ تعالیٰ اگلے اور پچھلوں کے گناہ معاف کر دے۔

من قام رمضان : سے مراد رمضان کی راتوں کو کھڑے ہو کر نماز ادا کرنا رمضان کی راتوں کو معظم سمجھتے ہوئے تراویح ادا کرے قرآن پاک کی تلاوت کرے اور اللہ تعالیٰ کا ذکر کرے اور اگر مکہ مکرمہ میں ہو تو کعبہ شریف کا طواف کرے۔

”ومن قام ليلة القدر“ سے مراد یہ ہے کہ اسے علم حاصل ہو یا نہ ہو رمضان کی ہر رات کو لیلة القدر سمجھتے ہوئے یا آخری دس راتوں کو لیلة القدر سمجھتے ہوئے یا آخری دس راتوں میں سے طاق راتوں کو ”لیلة القدر“ سمجھتے ہوئے یا ستائیسویں رات کو لیلة القدر سمجھتے ہوئے قیام کرے اور لیلة القدر کے وجود پر ایمان ہو اور یہ بھی ایمان ہو کہ اس میں عبادت کرنے سے اللہ تعالیٰ عظیم ثواب عطا فرماتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے پہلے گناہ اپنی مہربانی سے معاف فرماتا ہے۔

☆ ”وعن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ ﷺ کل عمل ابن آدم یضعف الحسنۃ بعشر امثالہا الی سبع مائۃ ضعف قال اللہ تعالیٰ الا الصوم فانہ لی وانا اجزی بہ یدع شہوتہ وطعامہ من اجلی للصائم فرحتان فرحۃ عند فطرہ وفرحۃ عند لقاء ربہ ولخلاف فم الصائم اطیب عند اللہ من ریح المسک والصیام جنة واذا کان یوم صوم احد کم فلا یرفت ولا یصخب فان سابہ احد او قاتلہ فلیقل انی امرؤ صائم“

(بخاری، مسلم، مشکوٰۃ کتاب الصوم)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا انسان کو ہر نیک عمل پر اس کی دس مثل سے لے کر سات سو مثل تک ثواب عطا کیا جاتا ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے سوائے روزے کے

بیشک وہ میرے لئے ہوتا ہے میں خود ہی اس کی جزاء عطا کروں گا وہ اپنی خواہشات اور کھانے کو میرے لئے چھوڑتا ہے روزے دار کے لئے دو خوشیاں ہیں ایک خوشی اس کو افطار کے وقت ہوتی ہے اور ایک خوشی اس کو رب تعالیٰ کی ملاقات کے وقت حاصل ہوگی۔ روزے دار کے منہ کی بواللہ تعالیٰ کے ہاں افضل ہے کستوری کی خوشبو سے اور روزے ڈھال ہیں اور تم میں سے جب کوئی شخص کسی دن روزہ رکھے ہوئے ہو تو وہ گالی نہ دے اور چلائے نہیں اگر کوئی شخص اسے گالی دے یا اس سے لڑائی کرے تو یہ کہے میں روزہ دار ہوں۔

وضاحت حدیث:

کل عمل ابن آدم : سے مراد ہے ”کل عمل صالح لابن آدم“ انسان کا ہر نیک عمل۔
یضعاف الحسنۃ : سے مراد یہ ہے کہ انسان جو بھی نیکی کا کام کرے تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے اسے زیادہ ثواب عطا فرماتا ہے۔

بعشر امثالها : وہ زیادتی دس مثل ہوتی ہے جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ عَشْرُ امْتَالِهَا﴾ جو ایک نیکی کا کام کرے تو اس کے لئے اس کی دس مثل ہیں۔
الی سبعمائة ضعف : یعنی دس مثل ایک نیکی پر ثواب عطا کرنا کم از کم درجہ ہے ورنہ کبھی ایک نیکی پر سات سو مثل ثواب عطا کیا جاتا ہے ”بل الی اضعاف کثیرۃ“ بلکہ بہت ہی زیادہ ثواب عطا کیا جاتا ہے جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿مَنْ ذَا الَّذِي يُقْرِضُ اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضَاعِفَهُ لَهُ أَضْعَافًا كَثِيرَةً﴾

”جو شخص اللہ تعالیٰ کی راہ میں خلوص سے مال خرچ کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے کئی گنا ثواب زیادہ عطا فرماتا ہے“
قال اللہ تعالیٰ الا الصوم : ”رب تعالیٰ نے فرمایا سوائے روزے کے“ اس کلام کے دو مقصد ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ نبی کریم ﷺ نے مطلق ارشاد فرمایا کہ ہر عبادت کا ثواب دس مثل سے لے کر سات سو مثل تک بلکہ اس سے بھی زیادہ رب تعالیٰ عطا فرماتا ہے دوران گفتگو ہی رب تعالیٰ کا ارشاد آ گیا ہو کہ روزے کو مستثنیٰ (علیحدہ) فرمادیں اسی وجہ سے آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿الا الصوم﴾ سوائے روزے کے۔

دوسرا مقصد یہ ہو سکتا ہے کہ اگرچہ اس سے پہلے مستثنیٰ منہ صراحۃً ذکر نہیں لیکن پہلی عبارت سے سمجھ آ رہا ہے کہ مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ مومن کو ہر عبادت پر دس مثل سے سات سو مثل تک بلکہ اس سے بھی زائد ثواب عطا کیا جائے گا سوائے روزہ کے۔

روزہ کا حکم علیحدہ کرنے کی وجہ: ”فان ثوابه لا يقادر قدره ولا يحصى حصره الا الله تعالى“ روزے کا ثواب اللہ تعالیٰ کے بغیر کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا اور نہ ہی اس کے بغیر کوئی شمار کر سکتا ہے روزہ کو وہ خصوصیات حاصل ہیں جو اور کسی عبادت کو حاصل نہیں اسی وجہ سے اس کی جزاء رب تعالیٰ نے اپنے ذمہ کی ہے فرشتوں کے سپرد نہیں کی۔

روزہ کی فضیلت کی دو وجہ: ایک وجہ ان میں سے یہ ہے ”انہ سر لا يطلع عليه العباد بخلاف سائر العبادات“ کہ یہ راز ہے کہ اس پر بندے مطلع نہیں ہو سکتے لیکن دوسری تمام عبادات پر بندے مطلع ہوتے ہیں نماز ادا کرے یا حج یا زکوٰۃ ان تمام پر کوئی نہ کوئی ضرور مطلع ہوتا ہے روزہ میں کوئی ریاء کاری کا شبہ نہیں پایا جاتا اس میں صرف رب تعالیٰ کی رضا پائی جاتی ہے اسی وجہ سے رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿فَإِنَّهُ لَيَبْشِكُ﴾ بیشک روزہ میرے لئے رکھا جاتا ہے یعنی اس کی ظاہری طور پر کوئی علامات نہیں ہیں باقی تمام عبادات پر کوئی نہ کوئی علامت پائی جاتی ہے جسے دیکھ کر یہ کہا جاتا ہے کہ یہ شخص فلاں عبادت کر رہا ہے۔

وانا اجزى به : ”ای وانا العالم بجزائه والی امرہ ولا اوكله الی غیری“

میں خود ہی اسے جزاء دیتا ہوں کیونکہ اس کی جزاء اور اس کے امور کو میں خود ہی جانتا ہوں اسی لئے اس کی جزاء میں کسی اور کے سپرد نہیں کرتا۔ دوسری وجہ روزہ کی فضیلت کی یہ ہے کہ روزہ سے نفس کی شہوات کو توڑا جاتا ہے اور کھانا پینا بند کر کے بظاہر بدن کو نقصان پہنچایا جاتا ہے باقی عبادات میں یہ کیفیت نہیں ہوتی اسی وجہ سے رب تعالیٰ نے روزہ دار کی تعریف فرمائی کہ ”يدع شهوته وطعامه من اجلى“ وہ خواہشات کو اور کھانے پینے کی اشیاء کو میری وجہ سے چھوڑتا ہے۔ ”من اجلى“ کا مطلب یہ ہے کہ وہ میرے حکم اور میری رضا کو حاصل کرنے کے ارادہ سے اور مجھ سے اجر حاصل کرنے کے لئے وہ روزہ رکھتا ہے۔ روزہ میں نیت اور خلوص پایا جاتا ہے اور اسی خلوص اعتقاد کی وجہ سے یہ واضح

ہو جاتا ہے کہ ”لا رياء فی الصوم اصلا“ روزے میں بالکل ریا کاری نہیں پائی جاتی۔

ہاں البتہ زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ وہ خبر دے کہ میں ”روزہ دار“ ہوں لیکن اس خبر سے اصل روزہ میں ریا نہیں پائی گئی۔

للصائم فرحتان : روزہ دار کو دو عظیم خوشیاں حاصل ہوتی ہیں ایک دنیا میں اور ایک آخرت میں۔
فرحة عند فطره : فطر کے وقت خوشی کی ایک وجہ یہ ہوتی ہے کہ انسان سمجھتا ہے کہ رب تعالیٰ کی مہربانی سے میں نے فرض ادا کر دیا ہے میں نے ذمہ داری پوری کر دی۔ اور دوسری وجہ یہ ہوتی ہے کہ انسان کو بھوک اور پیاس کے بعد جب کھانے پینے کی اجازت حاصل ہوتی ہے تو انسان کو طبعی طور پر سرور حاصل ہوتا ہے۔ اور تیسری وجہ یہ ہے کہ افطار کے وقت اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے کامل اجر حاصل ہونے کی امید پر خوشی ہوتی ہے کیونکہ حدیث شریف میں ہے ”ان للصائم عند افطاره دعوة مستجابة“ بیشک روزہ دار کی دعا افطار کے وقت قبول ہوتی ہے۔

وفرحة عند لقاء ربه : اور خوشی اسے حاصل ہوگی اپنے رب تعالیٰ کی ملاقات کے وقت۔ اس لئے کہ رب تعالیٰ کی طرف سے روزہ دار کو خصوصی جزاء حاصل ہوگی اور رب تعالیٰ اپنے اس بندے کی خصوصی تعریف فرمائے گا اور سب سے بڑی وجہ یہ ہے ”بئیل الفوز باللقاء“ کہ رب تعالیٰ سے ملاقات حاصل ہونے پر کامیابی حاصل کر کے خوشی ہوگی۔ اسی وجہ سے بعض شارحین نے ﴿وانا اجزی بئہ﴾ میں ”اجزی“ کو مضارع مجہول واحد متکلم کا صیغہ بھی پڑھا ہے کہ رب تعالیٰ فرماتا ہے کہ روزہ دار کی میں خود جزاء بن جاؤں گا کہ اسے اپنے خصوصی دیدار سے مشرف کروں گا۔

ولخلوف الصائم اطيب عند الله من ریح المسک :

روزے دار کے منہ کی بو اللہ تعالیٰ کو کستوری کی خوشبو سے زیادہ پسند ہے۔ ”خلوف“ کی خاء پر ضمہ ہے اگرچہ بعض حضرات نے فتح بھی پڑھا ہے لیکن یہ درست نہیں ”خلوف من خلف فمه اذا تغیر رائحة فمه“ روزہ کی وجہ سے جب منہ کی بو میں تبدیلی آجائے اسے خلوف کہا جاتا ہے۔ لیکن یہ خیال رہے کہ اس بو کی وجہ روزہ یعنی معدہ کا خالی ہونا ہے یہ بو مسواک سے زائل نہیں ہوتی۔

اسی لئے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک روزہ کے حال میں جس وقت چاہے مسواک کرے

جائز ہے البتہ امام شافعی رحمہ اللہ پچھلے پہر روزہ دار کے لئے مسواک کرنے کو منع قرار دیتے ہیں۔
 ”اطیب“ کا معنی افضل، ارضی، کا معنی احب ہے سب کا مطلب تقریباً ایک ہی ہے افضل،
 پسندیدہ اور محبوب ہونا۔ روزہ چونکہ عبادت ہے رب تعالیٰ کو عبادت پسند ہے جب کہ روزہ دار کے منہ کی
 بوروزہ کا اثر ہے تو رب تعالیٰ کو اثر عبادت بھی پسند ہے۔

والصیام جنة: اور روزے ڈھال ہیں ”جنة بضم الجیم وقایة“ جنة کی جیم پر پیش ہے
 اس کا معنی ہے بچانے کا آلہ روزے بھی انسان کو دنیا میں گناہوں سے بچاتے ہیں اور آخرت میں آگ
 سے بچائیں گے۔

فلا یرفث: فاء پر ضمہ ہے اور کسرہ بھی آتا ہے

ولا یصخب: خاء پر فتح ہے ”لا یرفع صوته بالہذیان“ مطلب واضح ہے کہ روزے کی حالت
 میں گالی گلوچ نہ نکالے بیہودہ قہقہے نہ لگائے زور زور سے نہ چیخے چلائے بیہودہ شور و غل نہ کرے بلکہ دوسرا
 کوئی اسے گالی دے یا لڑائی کرے تو پھر بھی جواب نہ دے بلکہ یہ کہہ کر خاموش ہو جائے کہ میں تو روزہ دار
 ہوں۔ جب تک دوسرا اس پر زیادتی کر رہا ہے یہ خاموش ہے اور صبر سے کام لے رہا ہے تو یہ اللہ تعالیٰ کی
 ذمہ داری میں ہے اور جب یہ خود اس کا جواب دے تو اس سے اللہ تعالیٰ کی ذمہ داری اٹھ جاتی ہے۔

☆ ”عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ ﷺ اذا کان اول لیلة من شهر رمضان
 صفت الشیاطین ومردة الجن وغلقت ابواب النار فلم یفتح منها باب وفتحت ابواب
 الجنة فلم یغلق منها باب وینادی منادی باغی الخیر اقبل ویا باغی الشر اقصر و لله عتقاء
 من النار وذلك کل لیلة“ (روہ الترمذی وابن ماجہ ورواہ احمد عن رجل وقال الترمذی هذا حدیث غریب“
 حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب ماہ رمضان کی پہلی رات آتی ہے تو
 شیطانوں اور سرکش جنوں کو قید کر لیا جاتا ہے اور جہنم کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں کوئی دروازہ ان
 کیلئے کھلا نہیں ہوتا اور جنت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں کوئی دروازہ ان سے بند نہیں کیا جاتا۔
 اور نداء دینے والا ندا دیتا ہے اے نیکوں کو حاصل کرنیوالے متوجہ ہو اے گناہوں کو حاصل کرنیوالے
 پیچھے ہٹ جا اور اللہ کیلئے ہی آگ سے آزاد ہو نیوالے ہیں یہ آواز تمام رات دی جاتی ہے۔

وضاحت حدیث: حدیث کے پہلے حصہ کی وضاحت تو پہلے ایک حدیث میں گزر چکی ہے۔

وینادی مناد : اور ندادینے والا ندادے گا یہ آواز زبان حال سے اللہ تعالیٰ کی طرف براہ راست آئے گی یا زبان مقال سے فرشتہ کے واسطہ سے یہ آواز دی جائے گی۔

یا باغی الخیر اقبل : اے عمل کو طلب کرنے والے نیکوں کو حاصل کرنے والے اللہ تعالیٰ کی طرف اور اس کی اطاعت کی طرف متوجہ ہو جا اس کی عبادت میں زیادہ سے زیادہ کوشش کر کیونکہ یہی وقت ہے رب تعالیٰ کی خصوصی رحمت کا کہ تھوڑے عمل پر تجھے خیر کثیر عطا کیا جائے گا۔ گویا کہ رب تعالیٰ کی طرف سے اپنے بندوں کو کہا جاتا ہے کہ تم عبادت کے ذریعے میری طرف توجہ کرو میں اپنی مہربانیوں کے ذریعے تمہاری طرف اپنی رحمت کو متوجہ کروں گا کیونکہ ”فان الخیر کله تحت قدرتنا وادتنا“ تمام خیر ہماری قدرت اور ہمارے اختیار میں ہے۔

ویا باغی الشر اقصر : اے گناہوں کی طرف قصد کرنے والے شخص گناہوں سے رک جا۔ اور اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ کر اپنے گناہوں سے مغفرت طلب کر یہ دعا کی قبولیت اور مغفرت کا وقت ہے رمضان شریف میں اللہ تعالیٰ کی وسیع رحمت کے پیش نظر ہی لوگ زیادہ عبادت کرتے ہیں زیادہ رب تعالیٰ کی طرف رجوع کرتے ہیں اکثر لوگ روزے رکھتے ہیں یہاں تک کہ چھوٹے بچے بھی روزے رکھتے ہیں کئی گنہگار بھی روزے رکھتے ہیں نماز نہ پڑھنے والے بھی نماز پڑھتے ہیں حالانکہ روزے کی وجہ سے سستی اور نیند کا غلبہ بھی حاصل ہوتا ہے۔

”ومع ذلک ترى المساجد معمورة وباحیاء الیالی مغمورة والحمد

لله ولا حول ولا قوة الا بالله“

باوجود اس کے تم مساجد کو نمازیوں سے آباد دیکھو گے رات کو مساجد بھری ہوئی نظر آئیں گی الحمد للہ یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہی ہے جس کی وجہ سے انسان گناہوں سے بچ جاتے ہیں اور نیکی کی ان کو توفیق حاصل رہتی ہے۔

ولله عتقاء من النار : کثیر لوگ اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے اس کی طرف رجوع کر کے آگ سے چھٹکارا حاصل کر لیتے ہیں۔

وذلك كل ليلة : اللہ تعالیٰ کی رحمت کا اعلان تمام رات ہی ہوتا رہتا ہے۔ (ازمراقۃ)

فائدہ: ﴿ولله عتقاء﴾ ای کثیروں ﴿من النار﴾ فلعلک تکنون منهم "اللہ تعالیٰ نے جب اپنی رحمت سے رمضان میں خیر حاصل کرنے والوں اور شر سے اجتناب کرنے والوں کو آگ سے آزاد کرنا ہے تو اے انسان ہو سکتا ہے تو بھی ان میں سے ہی ہو اس لئے وقت کو ہاتھ سے نہ جانے دو (ازمراقۃ)

☆ "عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ ﷺ اتاکم رمضان شہر مبارک فرض اللہ علیکم صیامہ تفتح فیہ ابواب السماء وتغلق فیہ ابواب الجحیم وتغل فیہ مردۃ الشیاطین للہ فیہ خیر من الف شہر من حرم خیرھا فقد حرم" (رواہ احمد والنسائی)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تمہارے پاس رمضان آ گیا جو برکت والا مہینہ ہے اللہ تعالیٰ نے تم پر روزے فرض کئے ہیں اس میں آسمانوں کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور جہنم کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں اور سرکش شیاطین زنجیروں سے جکڑ دیئے جاتے ہیں اللہ تعالیٰ کے لئے اس میں ایک رات وہ ہوتی ہے جو ہزار مہینوں سے بہتر ہے جو اس کی بھلائی سے محروم کر دیا گیا وہ مکمل طور پر محروم کر دیا گیا۔ (مشکوۃ کتاب الصوم)

وضاحت حدیث:

اتاکم رمضان : تمہارے پاس رمضان کا وقت اور رمضان کے دن آ گئے۔

شہر مبارک : زیادہ ظاہر مطلب تو یہ ہے کہ یہ "رمضان" سے بدل ہے یا عطف بیان ہے یعنی خبر دی گئی ہے "ہو شہر مبارک" وہ برکت والا مہینہ ہے یعنی اس میں بہت مقدار میں حسی اور معنوی بھلائیاں پائی گئی ہیں جیسا کہ عام طور پر یہ بات مشاہدہ میں آتی ہے۔ اس میں ایک احتمال یہ بھی ہے کہ یہ دعائیہ کلمہ ہو معنی یہ ہو "جعلہ اللہ مبارکاً علینا وعلیکم" اللہ تعالیٰ اس مہینہ کو ہمارے اور تمہارے لئے برکت والا بنادے۔

"وهو اصل فی التهنئة المتعارفة فی اول الشہور بالمبارکۃ"

یہ اصل میں رمضان کی ابتداء میں اس کی برکت کی تہنیت (مبارک باد) دی گئی ہے۔

نبی کریم ﷺ رجب میں یہ دعا فرماتے تھے ”اللهم بارک لنا فی رجب و شعبان و بلغنا رمضان“ اے اللہ رجب اور شعبان میں ہمیں برکت عطا فرما اور ہمیں رمضان تک پہنچا۔ اس دعا میں اگرچہ اس طرف اشارہ ہے کہ رمضان خود ہی ذاتی طور پر برکت والا ہے اس کی برکت کی دعا کرنے کی ضرورت نہیں ”ولکن لا مانع من قبول زیادة البركة“ لیکن زیادہ برکت کے لئے دعا کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ بلکہ راقم کے نزدیک تو یہ صورت ہے کہ رمضان ذاتی طور پر برکت والا ہے لیکن اس کی برکت سے فائدہ حاصل کرنا قسمت والوں کو ہی نصیب ہوتا ہے۔ لہذا یہ دعا کرنا کہ اے اللہ تعالیٰ اسے ہمارے لئے برکت والا بنا۔ کہ ہمیں اس سے برکت حاصل کرنا نصیب ہو جائے یہ زیادہ ہی مفید اور باعث سعادت ہے۔

لله فيه ليلة خير من الف شهر :

”یعنی رمضان کی راتوں میں ایک رات وہ ہے جو لیلة القدر کے نام سے مشہور ہے اس ایک رات کی عبادت ان ہزار مہینوں کی عبادت سے بہتر ہے جن میں لیلة القدر نہ ہو۔
ومن حرم خیرھا : (حرم مجہول اور خیرھا منصوب ہے) یعنی جس شخص کو یہ توفیق حاصل نہ ہوئی کہ وہ لیلة القدر کو جاگ کر عبادت کر سکے یا کسی طرح بھی لیلة القدر کی برکات کو حاصل نہ کر سکے۔

”فقد حرم ای منع الخیر کله“ وہ مکمل طور پر بھلائی سے محروم ہو گیا لیکن مراد ثواب کامل سے محرومیت ہے اور اس مغفرت سے محرومیت ہے جو لیلة القدر سے حاصل ہونی تھی جس پر بہت بڑی کامیابی کی دار و مدار ہے۔

فائدہ جلیلہ : ”من صلی العشاء و الصبح بجماعة فقد ادرك حظه من لیلة القدر واما ما وقع فی شرح المسلم من انه لا ینال فضلها الا من اطلعه الله علیها فالمراد منه فضلها الكامل“

جس شخص نے عشاء کی نماز جماعت سے ادا کی اور صبح کی بھی جماعت سے ادا کی تحقیق اس نے لیلة القدر کا حصہ پالیا البتہ مسلم شریف کی شرح نووی میں جو یہ ذکر ہے کہ جو شخص لیلة القدر پر مطلع ہوا صرف اسی نے لیلة القدر کی فضیلت کو حاصل کیا اس سے مراد یہ ہے کہ کامل فضیلت اور کامل درجہ اسے

ہی حاصل ہوا جس کو رب تعالیٰ نے کشف وغیرہ کے ذریعے مطلع کر دیا اور اس نے وہ رات عبادت میں اور بیداری میں گزار دی۔
(ازمرقاۃ)

یقیناً ہمارے جیسے انسانوں کے لئے یہی نفع مند ہے اور اسی سے دل کو تسلی ہوگی کہ ہر رات کو لیلۃ القدر سمجھتے ہوئے عشاء کی نماز جماعت سے ادا کرے اور صبح کی نماز بھی جماعت سے ادا کرے اور رمضان شریف میں خصوصی طور پر اس کا اور ہی زیادہ اہتمام کرے۔
(راقم)

☆ ”وعن عبد الله بن عمرو ان رسول الله ﷺ قال الصيام والقرآن يشفعان للعبد يقول الصيام اى انى منعته الطعام والشهوات بالنهار وشفعنى فيه ويقول القرآن منعته النوم بالليل فشفعنى فيه فيشفعان ، رواه البيهقى فى شعب الايمان“

عبد اللہ بن عمرو (بن العاص) رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا روزے اور قرآن بندے کی شفاعت کریں گے روزے کہیں گے بیشک ہم نے اس کو دن میں کھانے اور خواہشات سے منع کیا تھا اس لئے اے اللہ اس شخص کے لئے ہماری شفاعت قبول فرما اور قرآن کہے گا میں نے اس کو رات کو سونے سے منع کیا تھا اس کے حق میں میری شفاعت قبول فرما تو ان دونوں کی شفاعت قبول کی جائے گی۔

وضاحت حدیث: کافی حد تک ترجمہ سے مطلب واضح ہے تاہم مختصر یہ سمجھا جائے کہ ”الصيام“ سے مراد رمضان کے روزے ہیں اگرچہ یہ جمع ہیں آگے صیغہ واحد کے ہیں یعنی ہر روزہ کہے گا میں نے اسے کھانے پینے اور خواہشات سے منع کیا تھا راقم نے آسانی کے لئے جمع کا ترجمہ کر دیا۔ قرآن پاک تراویح میں پڑھنا اور سننا اور تہجد میں پڑھنا مراد ہے کیونکہ رات کو سونے سے منع کرنے کا یہی مطلب ہو سکتا ہے۔
(ازمرقاۃ)

☆ عن سلمان الفارسی قال خطبنا رسول الله ﷺ فى آخر يوم من شعبان فقال يا ايها الناس قد اظلمكم شهر عظيم شهر مبارك شهر فيه ليلة خير من الف شهر جعل الله صيامه فريضة وقيام ليله تطوعا من تقرب فيه بخصلة من الخير كان كم ادى فريضة فيما سواه ومن ادى فريضة فيه كان كمن ادى سبعين فريضة فيما سواه وهو شهر الصبر والصبر ثوابه الجنة وشهر المواساة وشهر يزاد فيه رزق المؤمن من فطر فيه صائما كان له

مغفرة لذنوبه وعتق رقبتہ من النار وکان له مثل اجرہ من غیر ان ینتقص من اجرہ شئی قلنا یا رسول اللہ لیس کلنا نجد ما نفطر به الصائم فقال رسول اللہ ﷺ یعطی اللہ هذا الثواب من فطر صائماً علی مذقة لبن او تمرة او شربة من ماء ومن اشبع صائماً سقاه اللہ من حوضی شربة لا یظماً حتی یدخل الجنة وهو شهر اولہ رحمة و اوسطہ مغفرة و آخرہ عتق من النار ومن خفف عن مملو کہ فیہ غفر اللہ له واعتقه من النار

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ہمیں رسول اللہ ﷺ نے خطبہ دیا شعبان کے آخری دن میں تو فرمایا اے لوگو ایک عظیم مہینہ تمہارے قریب آ رہا ہے وہ برکت والا مہینہ ہے اس مہینہ میں ایک رات ہے جو ہزار مہینہ سے بہتر ہے اللہ تعالیٰ نے اس مہینہ میں روزے فرض کئے ہیں اور اس کی رات کو قیام فرض سے زائد عبادت بنائی ہے۔ جو شخص اس میں بھلائی کی کسی ایک عادت سے بھی قرب حاصل کرے وہ ایسا ہی ہے جیسا اس نے اس کے ماسواء میں فرض ادا کیا جس نے اس میں فرض ادا کیا وہ ایسے ہے جیسے اس کے ماسواء میں ستر فرض ادا کئے یہ ماہ صبر ہے اور صبر کا ثواب جنت ہے اور یہ ماہ مواسات ہے اور اس مہینہ میں مومن کا رزق زیادہ کیا جاتا ہے جس شخص نے روزہ دار کا روزہ افطار کرایا اس کے گناہ بخش دیئے جائیں گے اور اسے آگ سے آزاد کر دیا جائے گا روزہ دار کو روزہ افطار کرانے کا ثواب روزہ دار جیسا ہوگا اس کے ثواب میں کوئی کمی نہیں کی جائے گی۔ ہم نے کہا یا رسول اللہ ہم تمام روزہ دار کو روزہ افطار کرانے کی طاقت نہیں رکھتے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ یہ ثواب اس شخص کو بھی عطا فرمائے گا جس نے روزہ دار کا روزہ ایک گھونٹ دودھ سے یا ایک کھجور سے یا ایک گھونٹ پانی سے افطار کر دیا جس شخص نے روزہ دار کو سیر کر کے کھلایا اللہ تعالیٰ اس کو میرے حوض سے پلائے گا وہ پیاسا نہیں ہوگا یہاں تک کہ جنت میں داخل ہوگا۔ یہ وہ مہینہ ہے جس کا اول حصہ رحمت ہے اور درمیانہ حصہ مغفرت ہے اور آخر حصہ آگ سے آزاد ہونا ہے جس شخص نے اپنے غلام پر تخفیف کی اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت فرمائے گا اور اس کو آگ سے آزاد کرے گا۔

وضاحت حدیث:

قال خطبنا رسول اللہ ﷺ : اس خطبہ سے مراد جمعہ کا خطبہ ہوا آپ نے وعظ و نصیحت

کے طور پر کسی وقت خطبہ دیا ہو۔

فقال يا ايها الناس : ” بعد ان حمد الله واثى عليه “ یعنی نبی کریم ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء کے بعد لوگوں کو خطاب کیا چونکہ آپ کا ہر خطبہ رب تعالیٰ کی حمد و ثناء کے بعد ہی ہوا کرتا تھا۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے خطبہ میں حمد و ثناء کا ذکر نہیں کیا اختصار سے کام لیا کیونکہ جو چیز مشہور ہو اسے ذکر نہ کرنے کے باوجود ہی اس کا علم حاصل ہو جاتا ہے۔

اس کے بعد علامہ ملا علی قاری رحمہ اللہ نے ذکر فرمایا کہ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے اختصار سے کام نہیں لیا کہ حمد و ثناء کو حذف کیا ہو بلکہ اقتصار سے کام لیا الفاظ تھوڑے ہیں مطلب مکمل ہے کیونکہ آپ نے ذکر فرمایا ” خطبنا “ فان الخطبة هي الحمد والثناء كما هو المشهور عند العلماء والفقهاء ” خطبہ علماء و فقہاء کے نزدیک ہے ہی وہ جس میں حمد و ثناء پائی جائے۔

قد اظلمكم شهر عظيم : ای اقبل علیکم و دنا منکم کأنه القی علیکم ظله ” اے لوگو تمہاری طرف عظیم مہینہ متوجہ ہو رہا ہے جو تمہارے قریب آ چکا ہے گویا کہ وہ تم پر اپنا سایہ کرنے والا ہے۔ جعل الله صيامه فريضة : اللہ تعالیٰ نے اس مہینہ کے دنوں میں روزہ رکھنا فرض قطعی کر دیا۔ و قیام ليله تطوعا : قیام لیلہ سے مراد تراویح کی نماز کے لئے بیدار ہونا ہے اور ” تطوعا “ سے مراد سنت مؤکدہ ہے کیونکہ تراویح کی نماز ادا کرنا سنت مؤکدہ ہے۔

” فمن فعله فاز بعظيم ثوابه ومن تركه حرم الخير وعوقب بعتابه “

جس شخص نے تراویح کو ادا کیا وہ بہت بڑے ثواب سے عظیم کامیاب ہو گیا جس نے تراویح کو ادا نہ کیا وہ بھلائی سے یعنی رب تعالیٰ کی رحمت سے محروم ہو گیا اور رب تعالیٰ کی سرزنش کی سزا کا مستحق ہو گیا۔ رمضان شریف میں کسی قسم کا نقلی عبادت کا کام کرنا ثواب کے لحاظ سے ان فرضوں کے برابر ہوگا جو رمضان کے علاوہ ادا کئے جاتے ہیں اور رمضان شریف میں فرض ادا کرنے کا وہ ثواب حاصل ہوگا جو رمضان کے علاوہ ستر فرض ادا کرنے کا ثواب حاصل ہوتا ہے یعنی رمضان شریف میں عبادت کا ثواب ستر گنا ہو جاتا ہے۔

وهو شهر الصبر : رمضان کے مہینے میں انسان کھانے اور پینے اور خواہشات سے رکا رہتا ہے اور رات کو زیادہ دیر تک بیدار رہتا ہے پھر سحری کے وقت اٹھتا ہے یہ تمام کام صبر کے ہیں اس لئے اسے

ماہ صبر کہا گیا ہے گویا کہ ﴿وَاسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ﴾ کا ایک مطلب یہ ہو گیا کہ روزے اور نماز سے امداد طلب کرو ”وفیہ اشارہ لطیفہ بان باقی الاشهر شهور الشکر“ رمضان کو ماہ صبر کہنے سے ایک اور لطیف اشارہ ملتا ہے کہ باقی مہینے شکر والے ہیں کہ ان میں ہر وقت نعمتوں کا استعمال کر کے رب تعالیٰ کا شکر ادا کرے۔ اور رمضان ماہ صبر ہے ”وكمال الصبر متضمن للشکر“ اور کامل صبر بغیر شکر کے حاصل نہیں کیونکہ روزہ کے افطار کے وقت تکمیل عبادت کا شکر اور نعمتوں کے استعمال پر شکر لازم ہے۔ اس طرح رمضان شکر و صبر کا مہینہ ہے جو تمام مہینوں کے کمال پر مشتمل ہے۔

وشهر المواساة: ”بھائی چارگی کا مہینہ“ مواساة، اصل میں ہمزہ سے جس کو واو سے تبدیل کیا گیا ہے اس کا معنی ہے ”المساهمة والمشاركة في المعاش والرزق“ ایک دوسرے کے ساتھ حصہ ڈالنا اور رزق اور معیشت میں ایک دوسرے کے ساتھ شریک ہونا۔ علامہ طیبی رحمہ اللہ نے ذکر فرمایا کہ رمضان کا نام مواساة رکھنے میں اس پر تنبیہ ہے کہ رمضان میں انسانوں کے تمام افراد پر احسان کیا جائے خصوصاً فقراء و غرباء پر زیادہ رحم کیا جائے۔

وشهر يزاد فيه رزق المومن: یہ وہ مہینہ ہے جس میں رب تعالیٰ رزق کی کثرت کر دیتا ہے خواہ غنی ہو یا فقیر ”وهذا امر مشاهد فيه“ اس معاملہ کا مشاہدہ پایا گیا ہے۔

”ويحتمل تعميم الرزق بالحسنى والمعنوى وفى الحديث تشجيع

على الكرم“

اور یہ احتمال بھی ہے کہ رزق حسی اور معنوی کو عام کر دیا جاتا ہو کیونکہ حدیث شریف میں ہے کرم پر شجاعت عطا کر دی جاتی ہے۔

من فطر بتشيد الطاء: یہاں سے روزہ افطار کرانے والے کے اجر و ثواب کو ذکر فرمایا لیکن اس کے ساتھ شرط یہ ہے ”اطعمه او سقاه عند افطاره من كسب حلال“ روزہ دار کو افطار کے وقت کھلانا اور پلانا اس وقت ثواب کا کام ہے جب وہ رزق حلال ہو دوسری روایت میں واضح طور پر رزق حلال کا ذکر ہے روزہ افطار کرانے کی فضیلت کو سن کر صحابہ کرام نے یہ سمجھا کہ شاید سیر ہو کر کھلانا مقصود ہے اسی لئے صحابہ کرام نے عرض کیا یا رسول اللہ ہم تمام تو روزہ افطار کرانے کی طاقت نہیں رکھتے۔

رسول اللہ ﷺ نے اس کی وضاحت فرمائی کہ دار و مدار تو خلوص نیت پر ہے صرف دودھ کے ایک گھونٹ یا ایک کھجور یا ایک گھونٹ پانی سے افطار کرانے سے بھی اجر و ثواب حاصل ہوتا ہے وہ اجر ثواب حصول مغفرت اور آگ سے آزاد ہونے کا ذریعہ ہے۔ اور روزہ افطار کرانے والے کو روزہ دار جیسا ثواب حاصل ہوتا ہے جب کہ روزہ دار کے ثواب میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔

بیہودہ سوچ: بعض لوگ روزہ نہ رکھنے والے سمجھتے ہیں کہ روزہ افطار کرانے سے ہمیں بھی روزہ دار کی طرح ثواب حاصل ہو جائے گا یہ سوچ ان کی بیہودہ ہے رب تعالیٰ کے احکام کو توڑنے کی جسارت کر کے کوئی یہ سمجھے کہ وہ رزق حرام یا رزق حلال سے روزہ دار کو پکڑے کھلا کر روزہ کو حاصل کر رہا ہے یہ غلط ہے بلکہ گناہ پر گناہ ہے۔ (راقم)

جس شخص نے رب تعالیٰ کے احکام کے مطابق خود بھی عمل کیا اور رزق حلال سے روزہ دار کو سیر ہو کر کھانا کھلایا اسے رب تعالیٰ حضور ﷺ کے حوض کوثر سے پلائے گا جنت میں داخل ہونے تک وہ پیاسا نہیں ہوگا۔

وہو شہر اولہ رحمة: رمضان کا وہ مہینہ ہے جس کا اول حصہ رحمت ہے یعنی پہلے دس دن رحمت کے ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے خصوصی رحمت کا نزول ہوتا ہے اسی وجہ سے مومنین روزہ رکھتے ہیں اور تراویح ادا کرتے ہیں ورنہ انسان طبعی طور پر ایسے مشکل کام کیسے کر سکتا ہے۔ ”لو لا اللہ ما اتدینا ولا تصدقنا ولا صلینا“ اگر اللہ تعالیٰ کی رحمت نہ ہوتی تو نہ ہم ہدایت پر ہوتے اور نہ ہم صدقہ عطا کرتے اور نہ ہم نماز ادا کرتے الحمد للہ الذی ہدانا لهذا وما كنا لنهتدی لولا ان ہدانا اللہ

واوسطہ مغفرة: اور اس کا درمیانہ حصہ مغفرت ہے یعنی دوسرے دس دنوں میں رب تعالیٰ کی طرف سے مومنین کو مغفرت حاصل ہوتی ہے جس طرح کام کرانے والا مالک مزدوروں کو کبھی وقت سے پہلے مزدوری دے دیتا ہے ایسے ہی اللہ تعالیٰ رمضان کو ختم ہونے سے پہلے ہی (اپنے لامحدود علم کی وجہ سے کہ یہ مخلصین مومنین ہیں انہوں نے رمضان کی آخر تک قدر کرنی ہے) مغفرت فرما دیتا ہے۔
وآخرہ عتق من النار: رمضان کے آخری دس دن آگ سے آزادی کے ہیں کیونکہ آخر میں

کامل اجر عطا کیا جاتا ہے:

”والکل بفضل الجبار وتوفیق الغفار للمؤمنین الابرار للاعمال

الموجبة للرحمة والمغفرة والعق من النار“

یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہے کہ وہ مومنوں کو ایسے نیک اعمال کی توفیق عطا فرماتا ہے جو ان کے لئے رحمت اور مغفرت اور آگ سے آزاد ہونے کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔

ومن خفف : جس شخص نے اپنے مملوک غلام پر رحم کرتے ہوئے رمضان میں اس سے خدمت لینے میں تخفیف کی اور اس پر روزوں کی آسانی پیدا کرنے کے لئے اس سے تعاون کیا تو اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت فرمائے گا اور اسے آگ سے آزاد کر دے گا۔

”وفی رواية لابی الشيخ قال رسول الله ﷺ من فطر صائما فی شهر

رمضان من کسب حلال صلت علیه الملائكة لیالی رمضان کلها

وصافحه جبریل لیلۃ القدر ومن صافحه جبریل علیه السلام یرق قلبه

وتکثر دموعه قال فقلت یا رسول الله من لم یکن عنده قال فقبضته من

طعام قلت افرأیت ان لم یکن عنده لقمة خبز قال فمذقة لبن قلت

افرأیت ان لم یکن عنده قال فشربه من ماء“

نبی کریم ﷺ نے فرمایا جو شخص رزق حلال سے رمضان میں کسی کا روزہ افطار کرادے تو فرشتے اس پر رمضان کی تمام راتوں میں رحمت بھیجتے ہیں اور لیلۃ القدر میں جبریل اس سے مصافحہ کرتا ہے۔ اور جس سے جبریل مصافحہ کرے اس کا دل نرم ہو جاتا ہے اور اس کے آنسو زیادہ جاری ہوتے ہیں۔ راوی کہتے ہیں میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ہم میں سے ہر شخص اس کی طاقت نہیں رکھتا آپ نے فرمایا طعام مٹھی بھر سے روزہ افطار کرادے میں نے کہا اگر اس کی بھی کوئی شخص طاقت نہ رکھے تو پھر آپ کی کیا رائے ہے آپ نے فرمایا ایک گھونٹ دودھ دے دے میں نے کہا اگر اس کی بھی کسی کو طاقت نہ ہو؟ تو آپ نے فرمایا کہ ایک گھونٹ پانی ہی دے دے۔

(ازمرقاۃ)

☆ ”عن ابن عباس قال کان رسول الله ﷺ اذا دخل شهر رمضان اطلق کل اسیر

واعطی کل سائل“

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ رمضان شریف کے آتے ہی ہر قیدی کو چھوڑ دیتے تھے اور ہر سائل کو عطا فرماتے تھے۔
(مشکوٰۃ باب الصوم)

وضاحت حدیث: اسیر، سے مراد ہر محبوس شخص خواہ وہ اللہ تعالیٰ کے حقوق کی وجہ سے قید کیا جاتا یا کسی بندے کے حقوق کی وجہ سے قید کیا جاتا۔

”بتخلیصہ منہ تخلصا باخلاق اللہ تعالیٰ فان الاطلاق فی معنی الاعتاق“

اللہ تعالیٰ رمضان شریف میں بندوں کو آزاد کرتا ہے چونکہ نبی کریم ﷺ اللہ تعالیٰ کی صفات سے متصف ہیں اس لئے آپ قیدیوں کو آزاد کرتے تھے۔

واعطی کل سائل : اور آپ ہر سائل کو عطا فرماتے تھے اس سے مراد عادت سے زائد آپ رمضان شریف میں عطا فرماتے تھے ورنہ آپ نے کبھی سائل کو یہ نہیں کہا میں نہیں دیتا

”انه ما سئل شيئا الا اعطاه فجاءه رجل فاعطاه غنما بين جبلين

فرجع الى قومه فقال يا قوم اسلموا فان محمدا يعطي عطاء من

لا يخشى الفقر“ (رواہ مسلم)

نبی کریم ﷺ سے جب بھی سوال کیا گیا آپ نے ضرور عطا فرمایا ایک شخص آپ کے پاس حاضر ہوا آپ نے اسے دو پہاڑوں کے درمیان چرنے والی بھیڑ بکریاں (تمام یا کثیر) عطا فرمادیں۔ وہ شخص جب اپنی قوم کی طرف لوٹا تو اپنی قوم کو کہنے لگا اے میری قوم اسلام لے آؤ۔ بیشک محمد (ﷺ) تو اتنا دیتے ہیں کہ غربت کا خوف باقی نہیں رہتا۔

”وروی البخاری من حدیث جابر ما سئل رسول اللہ ﷺ عن شئی

قط فقال لا“

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ایسا نہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے کسی چیز کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا ہو ”لا“ میں نہیں دیتا۔

”وکذا غیر مسلم ای ما طلب منہ شئی من امر الدنیا فممنعہ“

مسلم شریف میں ہے نبی کریم ﷺ سے دنیا کے متعلق کوئی چیز بھی طلب کی گئی تو آپ نے اس سے منع نہیں فرمایا۔

فرزوق نے کہا:

ما قال لا قط الا في تشهده لو لا اتشهد كانت لاؤه نعم

نبی کریم ﷺ نے سوائے تشہد کے ”لا“ (نہیں دیتا) نہیں فرمایا اگر تشہد نہ ہوتا تو آپ کا ”لا“ (نہیں) بھی ”نعم“ (ہاں) ہوتا۔

تنبیہ: شیخ عزالدین بن عبدالسلام رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے ”لا“ نہ کہنے کا مطلب یہ ہے:

”لم يقل لا منعا للعطاء ولا يلزم من ذلك ان لا يقولها اعتذارا“

کہ آپ نے کسی سائل کو منع کرنے کی غرض سے اور نہ دینے کے ارادہ سے ”لا“ ارشاد نہیں فرمایا البتہ عذر کے طور پر آپ نے ”لا“ ارشاد فرمایا۔ نبی کریم ﷺ کے پاس جنگ کے موقع پر صحابی حاضر ہوئے کہ ہمارے پاس سواریاں نہیں آپ ہمیں سواریاں عطا فرمائیں۔ تو آپ کے جواب کو رب تعالیٰ نے ذکر فرمایا ”قلت لا اجد ما احمکم علیہ“ آپ نے فرمایا میں نہیں پاتا کہ تمہیں اس پر سواری کروں۔

”ولا يخفى الفرق بين قول لا اجد ما احمکم وبين لا احمکم“

نبی کریم ﷺ نے فرمایا ”لا اجد ما احمکم علیہ“ میرے پاس کوئی سواری نہیں کہ میں تمہیں سواری پر سوار کروں۔ آپ نے یہ ارشاد نہیں فرمایا ”لا احمکم“ میں تمہیں سواری عطا نہیں کرتا۔ دونوں کلاموں میں بہت بڑا فرق ہے:

”وفي حديث ابن عباس عند الشيخين قال كان النبي ﷺ اجود

الناس واجود ما يكون في رمضان حين يلقاه جبريل فيدارسه القرآن

فلرسول الله ﷺ حين يلقاه جبريل اجود بالخير من الريح المرسلة“

بخاری و مسلم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے حدیث کو روایت کیا رسول اللہ ﷺ سب لوگوں سے زیادہ سخی تھے۔ اور رمضان شریف میں جب آپ سے جبریل ملتے اور قرآن پاک کا دور کرتے تو آپ اور ہی زیادہ سخاوت فرماتے۔ رسول اللہ ﷺ جبریل کی ملاقات کے وقت تیز چلنے والی ہوا سے بھی زیادہ سخاوت فرماتے۔

(ازمراقاة)

☆ ”عن ابن عمر ان النبي ﷺ قال ان الجنة تزخرف لرمضان من رأس الحول الى

حول قابل قال فاذا كان اول يوم من رمضان هبت ریح تحت العرش من ورق الجنة على حور العين فيقلن يا رب اجعل لنا من عبادك ازواجا تقربهم اعيننا وتقرأ عينهم بنا“

(رواه البيهقي الاحاديث الثلاثة في شعب الايمان)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں بیشک نبی کریم ﷺ نے فرمایا بیشک جنت کو ایک سال کے رمضان سے دوسرے سال کے رمضان تک آراستہ کیا جاتا ہے عرش کے نیچے سے جنت کے پتوں سے ہوا بڑی آنکھوں والی حوروں پر چلتی ہے وہ حوریں کہتی ہیں اے ہمارے رب اپنے بندوں سے ہمارے زوج بنا جن سے ہماری آنکھیں ٹھنڈی ہوں اور ہماری وجہ سے ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں۔

(مشکوٰۃ کتاب الصوم)

وضاحت حدیث:

تزخرف: سونے وغیرہ سے مزین کرنا۔ لرمضان: رمضان کے آنے کے لئے۔
من رأس الحول الى حول قابل: اس میں دو احتمال ہیں ایک یہ ہے کہ محرم سے آنے والے محرم تک جنت کو سجایا جاتا ہے اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ رمضان سے رمضان تک جنت کو سجایا جاتا ہے ہر صورت میں مطلب یہ ہے:

”وحاصله ان الجنة في جميع السنة من اولها الى آخرها مزينة لاجل

رمضان وما يترتب عليه من كثرة الغفران ورفع درجات الجنان ما

قبله وما بعده من الزمان“

کہ جنت کو تمام سال اول سے آخر تک سجائے رکھا جاتا ہے یعنی رمضان کے آنے اور اس پر کثیر مغفرت کے واقع ہونے اور جنتوں کا مقام بلند ہونے کی وجہ سے ان کو سجایا جاتا ہے۔ ”ویناسبہ کونہ یوم عید و سرور“ رمضان کی آمد جنت والوں کے لئے عید کا دن ہوتا ہے۔

فائدہ: جب رمضان کی آمد کے لئے جنت کو سجایا جاتا ہے اور رمضان کا آنا جنت والوں کے لئے عید کا دن ہوتا ہے تو اسی سے واضح ہو گیا کہ جس ذات کے طفیل رمضان ملا وہ ذات نبی کریم ﷺ کی ہے اس ذات کے آنے پر گھروں، گلیوں اور محلوں کو سجانا اور اس دن کو عید ماننا فرشتوں کی سنت ہے۔ (راقم)

جب رمضان کا پہلا دن ہوتا ہے تو عرش کے نیچے سے معطر (خوشبودار) ہوا چلتی ہے جو جنت

کے درختوں سے ہوتی ہوئی جنتی حوروں کے سروں تک پہنچتی ہے باوجود اس کے کہ وہ ہوا خوشبودار ہوگی لیکن روزہ دار کے منہ کی بو اس سے بھی زیادہ اللہ تعالیٰ کو پسند ہے اسی لئے حوریں بھی اللہ تعالیٰ کے نیک روزے دار بندوں کی زوجیت میں آنے کو پسند کریں گی۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ”لو يعلم العباد ما رمضان لتمنت امتی ان تكون السنة كلها رمضان“ اگر بندوں کو پتہ چل جائے کہ رمضان (کی فضیلت) کیا ہے تو امت یہ تمنا کرتی کہ تمام سال رمضان ہوتا۔ (ازمرقاۃ)

☆ ”عن ابی ہریرۃ عن النبی ﷺ انه قال يغفر لامته فی آخر لیلة فی رمضان قیل یا رسول اللہ اھی لیلة القدر قال لا ولكن العامل انما یوفی فی اجرہ اذا قضی عملہ“ (رواہ احمد)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ آپ کی امت (کے روزہ داروں) کی رمضان کی آخری رات کو مغفرت کر دی جاتی ہے صحابہ کرام نے پوچھا یا رسول اللہ کیا وہ لیلة القدر ہوگی؟ آپ نے فرمایا نہیں لیکن عمل کرنے والا جب اپنا عمل مکمل کر لیتا ہے تو رب تعالیٰ کی طرف سے اسے مکمل اجر عطا کیا جاتا ہے۔ (مشکوۃ کتاب الصوم)

وضاحت: صحابہ کرام نے سمجھا شاید مغفرت کی وجہ آخری رات کا لیلة القدر ہونا ہے لیکن حضور ﷺ نے فرمایا کہ مغفرت کی وجہ روزے داروں کے عمل کی تکمیل ہوگی۔ لیلة القدر چونکہ معین بھی نہیں پھر آخری رات کا اتیس کی طاق رات ہونا بھی ضروری نہیں وہ تمیں بھی ہو سکتی ہے پھر لیلة القدر ذاتی طور پر تو بخشش کا ذریعہ نہیں۔ بلکہ اس میں عبادت کی جائے تب وہ بخشش کا ذریعہ ہے۔ (ازمرقاۃ)

☆ ”عن عبد اللہ بن مسعود قال خرجنا مع رسول اللہ ﷺ ونحن شباب لا نقدر علی شئی وقال یا معشر الشباب علیکم بالباء فانہ اغض للبصر واحصن للفرج فمن لم یستطع منکم الباء فعلیہ بالصوم فان الصوم له وجاء هذا حدیث حسن صحیح“ (ترمذی ابواب النکاح)

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ہم ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ کے ساتھ نکلے اور ہم جوان تھے ہم کسی چیز پر قادر نہیں تھے آپ نے فرمایا اے جوانوں کے قبیلہ تم پر لازم ہے کہ شادی کر لو بیشک یہ نظر کو پست کرنے والی ہے اور فرج کی حفاظت کرنے والی ہے جو شخص تم میں سے شادی کی طاقت

نہیں رکھتا اس پر لازم ہے کہ وہ روزے رکھے بیشک روزہ اس کی شہوت کو کم کرنے کا ذریعہ ہے۔

یعنی حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور آپ کے ساتھ کچھ اور جوان بھی تھے یہ حضرات غربت کی وجہ سے شادی کرنے کی طاقت نہیں رکھتے تھے کہ مہر وغیرہ ادا کریں نبی کریم ﷺ کے ساتھ یہ لوگ چل رہے تھے تو آپ نے ان کو مشورہ دیا کہ شادی کر لو مطلب یہی تھا کہ تم محنت مزدوری کرو اور والدین کو بھی کہو کہ وہ بھی محنت مزدوری کر کے تمہاری شادی کا انتظام کر لیں۔ جب تک شادی کا انتظام نہیں ہو سکتا روزے رکھا کرو کیونکہ ان سے شہوت کم ہوتی ہے۔

”وجاء“ اگرچہ معنی خصی بننا ہے تاہم یہاں مراد شہوت کا کم ہونا ہے۔ اور یہ بھی خیال رہے کہ نبی کریم ﷺ کا نو جوان صحابہ کرام کو روزہ رکھنے کا مشورہ دینا عام نفلی روزے رکھنے کے متعلق تھا کیونکہ رمضان کا روزہ تو ہر بالغ شخص پر فرض ہے۔

فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيضًا أَوْ عَلَى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ :

”جو شخص تم میں سے ہو مریض یا سفر میں ہو تو اتنے اور دنوں میں“ یعنی جو شخص مریض ہو یا سفر میں ہو روزہ نہ رکھ سکے تو جتنے روزے نہیں رکھ سکا اتنے دن روزہ قضا کر لے۔

مریض کب روزہ افطار کر سکتا ہے؟ جب اتنی شدید مرض ہو کہ روزہ سے ہلاک ہونے کا خطرہ ہو تو روزہ افطار کرنے کی شرعاً اجازت ہے۔ اگر مسلمان ماہر طبیب یہ کہے کہ روزہ رکھنے سے یہ مرض بڑھ جائے گی تو پھر بھی روزہ افطار کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح اگر مسلمان ماہر طبیب یہ بتائے کہ روزہ رکھنے سے یہ مرض لمبی ہو جائے گی دیر سے ٹھیک ہوگی تو اس صورت میں بھی روزہ افطار کیا جاسکتا ہے۔

اسی طرح تندرست شخص کو مسلمان ماہر طبیب یہ بتائے کہ روزہ رکھنے سے تم فلاں مرض میں مبتلا ہو جاؤ گے تو روزہ افطار کرنے کی اجازت ہے۔ (ازہین الحقائق للوطیعی رحمہ اللہ)

مسافر کب روزہ افطار کر سکتا ہے؟ جب سفر کا ارادہ پایا جائے اور سفر کی وہ مقدار جو شرعاً انسان کو مسافر بناتی ہے اتنی مقدار سفر کرنے کا ارادہ ہو۔ حکومت آج امریکی حکم پر تقیل کرنے کی غرض سے دینی مدارس کے خلاف جو غیر اسلامی پروپیگنڈہ میں مشغول ہے بے دینوں کو دین دار بنانے کی فکر نہیں لیکن دین داروں کو بے دین بنانے کی فکر بہت شدت سے لاحق ہے۔ ہوٹلوں میں برتن دھونے والے بچوں کو

پڑھانے کی فکر نہیں، چھوٹے چھوٹے بچے کوڑے سے کاغذاٹھا کر بیچ کر محنت مزدوری کر رہے ہیں ان کو تعلیم دینے کی فکر نہیں، جوتے پالش کرنے والے بچوں کو اور ادھر سے ادھر اٹھا کر سامان لے جانے والے بچوں کو پڑھانے کی فکر نہیں لیکن بے دینوں کو فکر ہے تو اس کی کہ قرآن پاک، حدیث پاک، فقہ، اصول فقہ، علم کلام، علم معانی، علم بیان، علم بدیع، علم صرف، علم نحو، علم منطق، فلسفہ، ادب، مناظرہ، نظم، عروض وغیرہ پڑھنے والوں کو انگلش پڑھا کر بکاؤ مال کیسے بنایا جائے امریکہ کا ہمنوا کیسے بنایا جائے لیکن انشاء اللہ علماء کرام علوم عصریہ کو پڑھ کر زیادہ ان کا وبال جان بنیں گے۔

راقم نے 1994ء میں لکھا: سراجی کے اردو حاشیہ کے آخر میں ”خیالات محشی“ کے عنوان سے ایک مضمون لکھا اس کا مختصر اقتباس دیکھیں ساتھ ساتھ ہی انشاء اللہ مقدار سفر بھی معلوم ہوگی اور علماء کے نظریات کا بھی پتہ چل جائے گا۔

سلف صالحین علوم شرعیہ نقلیہ میں جہاں بلند و بالا مقام رکھتے تھے وہاں علوم عقلیہ میں بھی ان کو مہارت تامہ حاصل تھی۔ منطق فلسفہ ہیئت ریاضی وغیرہ علوم میں ان کی تصنیفات کو دیکھنے سے ان کے جواہر علمی کا پتہ چلتا ہے لیکن یہ خیال رکھنا بھی ضروری ہے کہ فلسفہ میں علمی ابحاث کی ضرورت کیوں درپیش آئی؟ اس لئے کہ جب فلاسفہ بخت و اتفاق کے قائل ہوئے دہریے ہوئے مالک الملک کا تصور چھوڑ بیٹھے تو سلف صالحین، علماء ربانین نے ان کا رد بلیغ فرمایا۔ حضرت علامہ مولانا فضل حق خیر آبادی رحمہ اللہ کا ”ہد یہ سعید یہ“ اس پر شاہد ہے غرضیکہ فلسفی بحثوں میں عرق ریزی صرف وقتی تقاضا کے پیش نظر تھی سلف صالحین کی طرح ہر زمانہ میں علماء کرام وقتی تقاضا کو پیش نظر رکھیں پیاناہ بدلنے سے ذہن کا بدلنا ضروری ہے۔

فقہاء کرام نے مقدار سفر اڑتالیس میل بیان کی ہے لیکن اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ نے ساڑھے ستاون میل بیان کی ہے وجہ کیا ہے؟ وجہ صرف یہ ہے کہ آپ کو علمی کمالات کے ساتھ ذہنی فراست بھی حاصل تھی حقیقت یہ ہے کہ ایک حصہ علم کے ساتھ نوحہ عقل کی بھی ضرورت ہے۔ فقہاء کرام کے بیان کردہ میل اور ہمارے مروج میل کی مقدار میں فرق ہے اس فرق کو سمجھا

جائے تو کوئی صاحب عقل اب بھی اڑتالیس میل کا فتویٰ نہ دے لیکن کچھ لکیر کے فقیر اب بھی اڑتالیس میل کا راگ لاپتے رہتے ہیں وہ فرق میں انشاء اللہ آگے واضح کر رہا ہوں۔ درحقیقت ذہنوں میں جمود طاری رہنا دائیں بائیں نہ دیکھنا، دائیں بائیں دیکھنے کو شجرہ ممنوعہ سمجھنا ہی اس قسم کی غلطیوں کا سبب ہے اس لئے میرے خیال میں موجودہ دور کے تقاضا کے مطابق علماء کرام کا مقصد عظیم مطمح نظر علوم دینیہ کو ہی سمجھیں لیکن جدید علوم، انگلش، سائنس ریاضی اور اکناکس جیسے مضامین بھی پڑھیں۔

یہ حقائق روز روشن کی طرح واضح ہیں کہ انگریز کی سازش سے علوم دینیہ کو ”العوام کا لانعام“ کی نظر میں حقیر کر کے دکھایا گیا۔ آج کل بھی کئی لوگوں کو کہتے سنا گیا کہ یہ لوگ مدارس میں ایک دو کتابیں پڑھاتے ہیں احمقوں کی جنت میں بسنے والے ان لوگوں کو معلوم نہیں کہ دینی مدارس میں بیس بائیس علوم پڑھائے جاتے ہیں یہ فقط دینی مدارس کا خاصہ ہے کہ ان کے مدرسین صرف اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر بغیر کسی وقفہ کے پانچ چھ گھنٹے لگا تار پڑھاتے ہیں ہڑتالیں اور سہولیات کے مطالبات کا یہاں نام و نشان نہیں۔ سال کی دو ماہ کی چھٹیاں اور ہر جمعہ کی چھٹی نکال کر آپ حساب کریں تو یقیناً آپ کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ سال میں تقریباً 240 دن تک پڑھائی کا جاری رہنا صرف دینی مدارس کا خاصہ ہے ورنہ دنیاوی مدارس سال میں 150 دن پڑھائی بھی مکمل نہیں کر پاتے۔ جن حضرات نے دینی تعلیم حاصل کی پھر دنیاوی تعلیم حاصل کر کے سکولوں کالجوں سے منسلک ہو گئے وہ بفضلہ تعالیٰ اسے تسلیم کرتے ہیں کہ حقیقت میں پڑھائی دینی مدارس میں ہے جہاں علوم کو علوم کر کے پڑھایا جاتا ہے خلاصے یاد کر کے امتحان پاس کرانا ان کا شیوہ نہیں اب صرف اس پر کف دست (ہتھیلیاں) ملنا اور اظہار تأسف (افسوس) کرتے رہنا کہ ”انگریز نے علوم دینیہ کی وقعت کو کم کر دیا“ کافی نہیں بلکہ اس کا مقابلہ کرنا ضروری ہے۔

اس لئے عزیز طلباء کرام جو رجحان کی آندھیوں کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے مستقبل کو درخشاں کرنے کے لئے علوم دینیہ میں مہارت تامہ حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ علوم جدیدہ کو حاصل کرنے کے لئے قدم بڑھاؤ۔ بڑھتے چلے جاؤ انشاء اللہ برتری علوم دینیہ کو ہی حاصل رہے گی۔ تاکہ علوم جدیدہ کی وجہ سے کوئی کند ذہن دین کا باغی تمہیں جاہل کہنے کی جرات نہ کر سکے۔ بڑے بڑے ڈاکٹر بھی اپنی ڈاکٹریٹ کی ڈگری کو انشاء اللہ تمہارے علوم کے سامنے کم ترین سمجھیں گے۔

مقدار سفر کی تحقیق: ”المیل وهو اربعة آلاف ذراع وهو اربع وعشرون اصبعاً وهي

ست شعيرات ظهر لبطن وهو ست شعرات بغل“ (شامی)

میل چار ہزار ذراع کا ہے ایک ذراع چوبیس انگلیوں کا ہے ایک انگلی چھ جو کی ہے جن دعرضا رکھا جائے اور ایک جو خنجر کے چھ بالوں کے برابر ہے۔ عام مشہور یہ ہے کہ ذراع ہاتھ کی انگلیوں سے لے کر کہنیوں تک ہے جو نصف گز ہے (ڈیڑھ فٹ ہے) اس لحاظ پر فقہی میل اور ہمارے مشہور میل میں فرق واضح ہو گیا اس فرق کو نکالنے سے واضح ہو جائے گا کہ مقدار سفر کیا ہے؟ وہ فرق یہ ہے فقہی میل $238 \times 2000 = 476000$ (رواجی میل) $= 80$ گز $= 2$ فرلانگ $= 52$ میل۔

راقم نے ۲۳ انگلیوں کی پیمائش کی ہے جو انیس انچ سے کچھ زائد بنتی ہیں اسی وجہ سے جلیل القدر ہستیوں کے حساب میں تھوڑا فرق پایا گیا ہے مفکر اسلام مفسر قرآن حضرت پیر محمد کرم شاہ الازہری نے ضیاء القرآن میں مقدار سفر چون 54 میل لکھی ہے اور حضرت علامہ محمود احمد رضوی رحمہ اللہ نے فیوض الباری میں ستاون میل اور اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے فتاویٰ رضویہ میں ساڑھے ستاون میل ذکر فرمائی ہے راقم کو احتیاط ساڑھے ستاون میل میں ہی نظر آتی ہے اس مقدار کے مطابق آج کل پیمائش کے نئے انداز کے مطابق مقدار سفر = بانوے کلو میٹر پانچ سو سینتیس میٹر ہے۔

مسافر روزہ رکھ سکے تو روزہ رکھنا بہتر ہے: مسافر نے صبح صادق سے پہلے سفر شروع کر لیا تو روزہ افطار کر سکتا ہے۔ اگر صبح صادق کے بعد سفر شروع کیا تو روزہ افطار کرنا درست نہیں تاہم اگر روزہ افطار کر لے تو اس پر کفارہ لازم نہیں آئے گا۔ مسافر کو اگر روزہ رکھنے سے ہلاکت کا خطرہ ہو تو اس پر واجب ہے کہ روزہ افطار کرے اگر ہلاکت کا خطرہ نہیں دوران سفر روزہ رکھ سکتا ہے تو روزہ رکھنا بہتر ہے کیونکہ جب تمام لوگ روزہ دار ہوں تو ان کے ساتھ روزہ رکھنا آسان ہوتا ہے اکیلے روزہ رکھنا مشکل ہے۔ لیکن اگر سفر کی مقدار مکمل ہے سفر بڑی آسانی کا ہو خواہ ہوائی جہاز پر سفر کر رہا ہو تو یہ روزہ افطار کرنا چاہے تو روزہ افطار کر سکتا ہے بعد میں قضاء کر لے۔

(از نور الایضاح و طحاوی)

مرض اور سفر کے حکم میں فرق: سفر سے روزہ افطار کرنا مباح نہیں ہوتا اگر سفر کرنے کا ارادہ ہے تو

روزہ شروع میں رکھے ہی نہیں روزہ رکھ کر صبح صادق کے بعد سفر کرنے پر افطار کرنا جائز نہیں لیکن مریض ہو تو روزہ شروع میں نہ رکھے پھر بھی جائز ہے اور دن کے کسی وقت بھی مریض ہو جائے روزہ مکمل کرنا دشوار ہو تو روزہ افطار کر سکتا ہے۔
(ازطحاوی)

قضاء کا حکم: مریض حالت مرض میں اور مسافر حالت سفر میں اگر فوت ہو جائیں تو ان پر قضاء کرنا لازم نہیں اور نہ ہی فدیہ دینے کی وصیت کرنا لازم ہے کیونکہ اس نے قضاء کرنے کے دن پائے ہی نہیں۔ مریض درست ہو گیا، مسافر مقیم ہو گیا تو جتنا جلدی ہو سکے روزے قضا کر لے کیونکہ زندگی کا پتہ نہیں اپنے ذمہ سے فرض کو اتارنا ضروری ہے تاہم اگر وقفے وقفے سے روزے قضاء کرے تو جائز ہے لگاتار قضا کرنا لازم نہیں اگر قضاء میں اتنی دیر کر دے کہ دوسرا رمضان آجائے تو پہلے وقتی رمضان کے روزے ادا کرے پھر رمضان کے بعد جن روزوں کی قضاء لازم تھی ان کو قضاء کرے۔ (ازطحاوی)

مسافر کے روزہ کے متعلق احادیث:

”عن عائشة قالت ان حمزة بن عمرو الاسلمي قال للنبي ﷺ اصوم في السفر وكان كثير الصيام فقال ان شئت فصم وان شئت فافطر“

(بخاری، مسلم، مشکوٰۃ باب صوم المسافر)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ بیشک حمزہ بن عمرو اسلمی نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ میں سفر میں روزہ رکھتا ہوں یہ بہت روزے رکھتے تھے نبی کریم ﷺ نے فرمایا اگر تم چاہو تو روزہ رکھ لو اور اگر تم چاہو تو افطار کر لو۔

وضاحت حدیث: صحابی کے سوال کا مطلب یہ تھا کہ میں سفر میں روزہ رکھتا ہوں اس کا حکم کیا ہے کیا میں گنہگار تو نہیں ہو رہا نبی کریم ﷺ نے فرمایا چاہو تو روزہ رکھ لو چاہو تو افطار کر لو یعنی تمہیں اختیار ہے:

”فقال بعضهم الصوم الفضل وهو قول مالك والثوري والشافعي واصحاب ابي حنيفة“

بعض حضرات کا قول ہے کہ مسافر کے لئے روزہ رکھنا افضل ہے یہی قول امام مالک، سفیان

ثوری، امام شافعی اور احناف رحمہم اللہ کا ہے۔

اعتراض: نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے ”لیس من البر الصیام فی السفر“ سفر میں روزہ

رکھنا نیکی کا کام نہیں اس سے تو پتہ چلتا ہے کہ روزہ رکھنا گناہ ہے۔

جواب: نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد ایک خاص موقع پر ہے:

”حین رأی زحما ورجلا قد ظلل علیہ فقال ما هذا قالوا صائم فقال

لیس من البر الصیام فی السفر“

جب کہ آپ نے دیکھا کہ لوگ ہجوم کئے ہوئے ہیں آپ نے دیکھا کہ ایک شخص پر لوگ سایہ

کئے ہوئے ہیں (شدید گرمی روزہ کی وجہ سے ایک شخص بیہوش ہو گئے تھے اس حالت کو دیکھ کر) آپ نے

فرمایا سفر کی حالت میں روزے رکھنا نیکی کا کام نہیں۔ آپ کا یہ ارشاد ہمارے موقف کے خلاف نہیں

کیونکہ ہمارا موقف یہ ہے ”واما الذی یجہدہ الصوم فی السفر ولا یطیقہ فافطارہ اولی“

کہ جو شخص سفر میں روزہ رکھنے کی طاقت نہ رکھتا ہو بلکہ روزہ اسے مشقت میں ڈالے تو اس کے لئے روزہ

(ازمرقاۃ)

افطار کرنا بہتر ہے۔

☆ ”وعن ابی سعید الخدری قال غزونا مع رسول اللہ ﷺ لست عشرة مضت من شهر

رمضان فمنا من صام ومنا من افطر فلم یعب الصائم علی المفطر ولا المفطر علی الصائم“

(رواہ مسلم)

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ہم نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مل کر غزوہ

(جہاد) کیا جب کہ رمضان کے سولہ دن گزر گئے تھے بعض ہم میں سے روزہ دار تھے اور بعض ہم میں

سے افطار کر رہے تھے روزہ دار افطار کرنے والے کا کوئی عیب نہیں بیان کر رہا تھا اور افطار کرنے والا

(مشکوۃ باب صوم المسافر)

روزہ دار کا کوئی عیب نہیں کر رہا تھا۔

وضاحت حدیث: اس حدیث پاک سے عظیم فائدہ یہ حاصل ہوا کہ جب کسی کام کے

کرنے یا نہ کرنے کی شریعت نے اجازت دی ہو تو کوئی عمل کرے تو اس سے نہ پوچھا جائے کہ تم نے

اس پر عمل کیوں کیا ہے؟ اور اگر کوئی عمل نہ کرے تو اس سے نہ پوچھا جائے کہ تو نے یہ عمل کیوں نہیں کیا

کاش کہ اس حدیث پاک کو لوگ سمجھیں مستحبات اور مباحات میں جھگڑے پیدا کر کے اپنی بے وقوفی کا

اظہار نہ کریں اور لوگوں کو دین سے برگشتہ نہ کریں۔

☆ عن انس قال كنا مع النبي ﷺ في السفر فمنا الصائم ومنا المفطر فنزلنا منزلا في يوم حار فسقط الصوامون وقام المفطرون فضربوا الابنية وسقوا الركاب فقال رسول الله ﷺ ذهب المفطرون اليوم بالاجر“ (بخاری و مسلم)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ہم نبی کریم ﷺ کے ساتھ سفر میں تھے بعض ہم میں سے روزہ دار تھے اور بعض افطار کرنے والے تھے ہم ایک جگہ اترے سخت گرم دن تھا روزے دار گر گئے اور افطار کرنے والے قائم رہے انہوں نے ہی خیمے لگائے اور سوار یوں کو پانی پلایا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا آج افطار کرنے والوں نے زیادہ اجر حاصل کر لیا۔ (مشکوٰۃ باب صوم المسافر)

وضاحت حدیث: سقط الصوامون، کا ظاہری معنی ہی مراد لے لیا جائے تو پھر بھی درست ہے کہ روزے دار ٹنڈا حال ہو کر گر گئے لیٹ گئے اور مجازی معنی زیادہ مناسب ہے کہ وہ حرکت کرنے یعنی چلنے پھرنے سے عاجز آ گئے یہاں تک کہ وہ اپنا کام خیمے لگانے اور اپنی سوار یوں کو پانی پلانے کا بھی سرانجام نہ دے سکے۔ افطار کرنے والوں نے اپنا کام بھی کیا اور روزے داروں کا کام بھی کیا۔ اسی وجہ سے نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ وہ روزے داروں سے زیادہ اجر حاصل کر گئے۔

اس حدیث پاک سے یہ واضح ہوا کہ اگر سفر میں روزہ سفر کرنے سے رکاوٹ بنے یا مشقت کا سبب بنے تو ایسے حال میں روزہ افطار کرنا زیادہ بہتر ہے۔ (ازمراقۃ)

☆ عن ابن عباس قال خرج رسول الله ﷺ من المدينة الى مكة فصام حتى بلغ عسفان ثم دعا سماء فرفعه الي يده ليراه الناس فافطر حتى قدم مكة وذلك في رمضان فكان ابن عباس يقول قد صام رسول الله ﷺ وافطر فمن شاء صام ومن شاء افطر“

(بخاری و مسلم، وفي رواية عن جابر انه شرب بعد العصر)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ مدینہ طیبہ سے مکہ مکرمہ کی طرف نکلے یہاں تک کہ آپ عسفان میں پہنچے تو آپ نے پانی طلب کیا جو اپنے ہاتھ میں لیا پھر ہاتھوں کو بلند کیا تاکہ لوگ دیکھ لیں تو آپ نے روزہ افطار کر دیا یہاں تک کہ مکہ مکرمہ میں آ گئے یہ رمضان میں افطار کیا گیا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے تھے رسول اللہ ﷺ نے روزہ بھی رکھا اور افطار بھی کیا اس

لئے سفر کے حال میں جو چاہے روزہ رکھے اور جو چاہے افطار کر دے۔ (مشکوٰۃ باب صوم المسافر)

وضاحت حدیث: عسفان (بضم العین وسکون السین) مکہ شریف سے دو مرحلے دور ایک جگہ کا نام ہے ”ثم دعا بماء“ (پھر پانی طلب کیا) ”فرغه الی یدہ“ کا معنی یہ بیان کیا گیا ”فرغه رفعا بلیغ منتھیا الی رفع یدہ“ کہ پھر آپ نے وہ پانی اپنے ہاتھوں کو جہاں تک بلند کر سکتے تھے بلند کیا۔

لیراہ الناس فافطر: ليعلموا جوازہ او ليختاروا متابعتہ “پانی کو بلند کر کے روزہ افطار کرنے کی وجہ یہ تھی کہ لوگ دیکھ لیں کہ روزہ افطار کرنا جائز ہو چکا ہے تاکہ وہ بھی نبی کریم ﷺ کی متابعت کر سکیں۔

اعتراض: پہلے تو بیان کیا گیا ہے کہ مسافر کے لئے روزہ رکھ کر صبح صادق کے بعد سفر کرنے پر افطار کرنا جائز نہیں۔ تو وہ کس طرح درست ہے جب نبی کریم ﷺ نے سفر میں عصر کے وقت روزہ افطار فرما دیا۔

جواب: ”وهو لحصول العذر الحادث وهو التهيؤ للقتال ان احتيج اليه في الاستقبال“

نبی کریم ﷺ کا روزہ افطار کرنا عذر کی وجہ سے تھا ایک تو یہ کہ لمبا سفر طے کیا جا چکا تھا پھر آنے والے وقت کو مد نظر رکھتے ہوئے کہ قتال کی تیاری کے لئے روزہ افطار کرنا بہتر ہے کیونکہ یہ فتح مکہ کے دوران واقعہ درپیش آیا۔ ”وهو اما لبيان الجواز“ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بیان جواز مقصود ہو کیونکہ جیسا پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ اگرچہ افطار درست تو نہیں لیکن اگر افطار کر دے تو کفارہ لازم نہیں جس سے یہ سمجھ آتا ہے کہ افطار نہ کرنا بہتر ہے اگر افطار کر لیا تو کسی حد تک جائز ہے نبی کریم ﷺ پر لازم تھا کہ آپ ہر اس فعل پر ایک مرتبہ عمل کریں جو جائز ہے۔ (ازمراقۃ)

تنبیہ: امت کے حق میں جو کام خلاف اولیٰ ہے لیکن جائز ہے وہ کام کرنا نبی کریم ﷺ پر بیان جواز کے لئے واجب ہوتا تھا۔ جب آپ پر واجب ہوتا تھا تو آپ کے حق میں وہ خلاف اولیٰ نہیں ہوتا تھا۔ جاہل عشاق یہ فرق نہیں سمجھتے اگر کوئی یہ کہہ دے نبی کریم ﷺ نے بظاہر خلاف اولیٰ کام کیا۔ تو اس

پروہ اودھم مچا دیتے ہیں ”بظاہر“ کے باریک فرق کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔

☆ ”عن انس بن مالک الکعبی قال قال رسول اللہ ﷺ ان اللہ وضع عن المسافر شطر الصلوة والصوم عن المسافر وعن المرضع والحلی رواہ ابو داؤد والترمذی والنسائی وابن ماجہ“

حضرت انس بن مالک کعبی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ نے مسافر سے نصف نماز کی تخفیف فرمائی۔ اور مسافر اور دودھ پلانے والی عورت اور حاملہ عورت سے روزوں میں تخفیف فرمائی۔ (مشکوٰۃ باب صوم المسافر)

وضاحت حدیث: سب سے پہلے تو راوی حضرت انس رضی اللہ عنہ کے متعلق یہ سمجھا جائے کہ یہ ابو امامہ انس بن مالک کعبی قشیری، عقیلی، عامری ہیں ان سے صرف یہ ایک حدیث مروی ہے۔ دوسرے انس، ابو حمزہ انس بن مالک انصاری، تجاری، خزرجی ہیں جو نبی کریم ﷺ کے مدینہ طیبہ میں رہنے کی تمام مدت خدمت گزاری میں رہے ان سے کثیر روایات مروی ہیں۔

”شطر الصلوة“ سے مراد چار رکعت والی نمازوں میں نصف نماز یعنی دو رکعتیں معاف فرما دیں جن کی قضا نہیں۔ ”والصوم عن المسافر والمرضع والحلی“ سے ایک اور مسئلہ کی طرف لطیف اشارہ ہے کہ دودھ پلانے والی عورت یا حاملہ عورت پر نماز دو گنا نہیں۔ بلکہ صرف روزہ کا حکم ان پر، مسافر کی طرح ہے کہ اگر وہ روزہ نہ رکھ سکیں کہ ان کے روزہ سے ان کے مریض ہونے کا خطرہ ہے یا بچے کو اور کوئی چیز نہیں کھلائی اور پلائی جاسکتی تو وہ وقتی طور پر روزہ افطار کر لیں اور بعد میں قضا کر لیں ان کو فدیہ دینا جائز نہیں کہ روزے کے بدلے فدیہ پر اکتفا کر لیں بلکہ قضا لازم ہے۔

اعتراض: تم نے پہلے ثابت کیا ہے کہ مسافر خواہ جہاز پر بھی سفر کر رہا ہو تو وہ روزہ افطار کر سکتا۔ حالانکہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد اس کے خلاف نظر آتا ہے وہ یہ ہے:

”عن سلمة بن المحبق قال قال رسول اللہ ﷺ من كان له حمولة

تاوی الى شعب فليصم رمضان حيث ادر کہ رواہ ابو داؤد“

سلمہ بن محبق فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص کے پاس سواری رکے سیر

ہونے کی حالت میں (یعنی اس کے پاس زادہ راہ موجود ہو جہاں قیام کرے اسے کوئی مشکل درپیش نہ آئے) تو جہاں روزے کا وقت ہو جائے وہ روزہ رکھے۔
(مشکوٰۃ باب صوم المسافر)

اس حدیث سے تو یہ سمجھ آ رہا ہے کہ سواری میسر ہونے کی صورت میں اور کھانا حاصل ہونے کی صورت میں سفر میں روزہ رکھا جائے۔ سفر میں آسانی حاصل ہونے کے باوجود مسافر کو روزہ افطار کرنے کے جواز کا قول کیسے صحیح ہے؟

جواب: یہ حدیث پاک ہمارے موقف کے مخالف نہیں حدیث پاک کی وضاحت میں یہ بیان کیا گیا ہے:
”قال الطیبی الامر فیہ محمول علی النذب بالحث علی الاولى
والافضل للنصوص الدالة علی جواز الافطار فی السفر مطلقا“

علامہ طیبی رحمہ اللہ نے فرمایا نبی کریم ﷺ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ مستحب ہے کہ جس شخص کے پاس سواری بھی اور زادہ راہ (خرچ) بھی ہو اس کے لئے چونکہ مشکل نہیں لہذا روزہ رکھنا اس کے لئے اولیٰ اور افضل ہے البتہ افطار کرنا چاہے تو افطار کر لے افطار والی روایات مطلق ہیں بس یہی ہمارا موقف ہے کہ روزہ رکھ سکے تو سفر میں روزہ رکھنا افضل ہے۔
(ازمرقاۃ)

☆ ”عن جابر ان رسول اللہ ﷺ خرج عام الفتح الی مکة فی رمضان فصام حتی بلغ کراع الغمیم فصام الناس ثم دعا بقدر من ماء فرفعه حتی نظر الناس الیہ ثم شرب فقیل لہ بعد ذلک ان بعض الناس قد صام فقال اولئک العصاة اولئک العصاة“ (رواہ مسلم)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ فتح مکہ کے سال (مدینہ طیبہ سے) نکلے رمضان کا مہینہ تھا آپ نے روزہ رکھا ہوا تھا یہاں تک کہ کراع غمیم میں آپ پہنچے لوگوں نے بھی روزہ رکھا ہوا تھا پھر آپ نے پانی کا پیالہ منگوایا اس پیالے کو بلند کیا یہاں تک لوگوں نے جب دیکھ لیا تو آپ نے پانی پی لیا (روزہ غروب آفتاب سے پہلے عصر کے وقت افطار کر دیا) پھر آپ کو بتایا گیا کہ بیشک بعض لوگوں نے روزہ رکھا ہوا ہے آپ نے فرمایا وہ لوگ نافرمان ہیں وہ لوگ نافرمان ہیں۔

وضاحت حدیث: کراع غمیم (بضم الکاف) کا ایک حصہ عسفان سے ملتا ہے اس لئے پہلے جو حدیث مذکور ہوئی اس میں عسفان کا ذکر ہے اور اس حدیث میں کراع غمیم کا ذکر ہے

واقعہ ایک ہے وجہ وہی ہے کہ سفر کی مشکل اور مستقبل میں قتال کی تیاری کے لئے آپ نے روزہ افطار فرمایا ”اولئک العصاة“ کے الفاظ کو نبی کریم ﷺ نے تاکید اور مرتبہ ذکر فرمایا جس کا معنی ہے ”اولئک الکاملون فی العصیان“ وہ لوگ کامل طور پر نافرمان ہیں۔ روزہ رکھنے والوں کو آپ نے کامل نافرمان کیوں فرمایا؟ اس کی دو وجہ ہیں ایک یہ ہے کہ:

”حيث عملوا بالظن مع القدرة على اليقين بالسؤال منه عليه الصلوة والسلام“

انہوں نے اپنے گمان پر عمل کیا کہ روزہ رکھنا جائز ہے حالانکہ ان میں نبی کریم ﷺ تشریف فرما تھے آپ سے پوچھ کر وہ یقین پر عمل کر سکتے تھے۔

دوسری وجہ ان کی طرف نافرمانی منسوب کرنے کی یہ ہے:

”فان النبی ﷺ انما رفع قدح الماء لیراه الناس فیتبعوه فی قبول رخصة الله تعالى فمن صام فقد بالغ فی عصيانه“

کہ نبی کریم ﷺ نے پانی کا پیالہ بلند کیا تاکہ لوگ اسے دیکھ لیں اور آپ کی تابعداری کریں کہ اللہ تعالیٰ نے روزہ افطار کرنے کی رخصت دی ہے پھر جن لوگوں نے روزہ رکھا انہوں نے گویا کہ بہت نافرمانی کی۔

تنبیہ: یہ محبت کی وجہ سے زجر ہے (ڈانٹ ڈپٹ ہے) کیونکہ محبت کا تقاضا یہ تھا کہ محبوب کی ادا کو اپنایا جاتا۔ جو حضرات ایسا نہ کر سکے ان پر مصطفیٰ کریم ﷺ کا دل رنجیدہ ہوا گویا یوں کہا جائے کہ مصطفیٰ کریم ﷺ نے یہ فرمایا کہ اے میرے پیارو تم سے تو یہ توقع نہیں تھی کہ میرے عمل کے مطابق تم عمل نہیں کرو گے۔ ورنہ حقیقت میں صحابہ کرام کی کوئی غلطی نہ تھی:

”لان الظاهر ان هذا وقع منهم بناء على خطأ اجتهدهم اذ لم يقع امر صريح بافطارهم“

کیونکہ یہ ان سے اجتہادی خطا واقع ہوئی اجتہادی خطا گناہ نہیں اور نہ ہی کوئی ایسا جرم ہے کہ اس کے متعلق پوچھا جائے اس لئے کہ ان کو واضح طور پر روزہ رکھنے سے منع نہیں کیا گیا تھا۔ (از مرقاة)

سفر میں شدید تکلیف اٹھا کر روزہ رکھنا منع ہے:

”عن عبد الرحمن بن عوف قال قال رسول الله ﷺ صائم رمضان في السفر كما لم يطر في الحضر رواه ابن ماجه“

حضرت عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا رمضان میں سفر کے دوران روزہ رکھنا ایسے ہی ہے جس طرح مقیم شخص (بغیر کسی عذر کے) روزہ افطار کر لے۔

وضاحت حدیث: ”صائم رمضان في السفر ای مع احتمال المشقة المضرة“

رمضان میں سفر کے دوران جو شخص نقصان دہ مشقت اٹھا کر روزہ رکھے یعنی روزہ ہلاک کرنے والا ہو بیمار کرنے والا ہو، بیہوشی تک پہنچانے والا ہو ایسی صورت میں روزہ رکھنا اسی طرح گناہ ہوگا جیسا کہ مقیم شخص کو بلا عذر روزہ افطار کرنا گناہ ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے انسان کو جب آسانی عطا فرمائی ہے تو انسان اپنے آپ کو مشقت میں نہ ڈالے۔

ایک حدیث میں کیا خوب بیان:

”عن حمزة بن عمرو الاسلمي انه قال يا رسول الله اني اجد بي قوة على الصيام في السفر فهل علي جناح قال هي رخصة من الله عز وجل فمن اخذ بها فحسن ومن احب ان يصوم فلا جناح عليه“ (رواه مسلم)

حمزہ بن عمرو اسلمی نے عرض کیا یا رسول اللہ میں سفر میں روزہ رکھنے کی طاقت رکھتا ہوں کیا مجھ پر (روزہ رکھنا) گناہ ہے؟ آپ نے فرمایا یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے رخصت ہے جو شخص اس پر عمل کرے (رخصت سے فائدہ اٹھائے) تو اچھا ہے اور جس شخص کو روزہ محبوب ہو تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔

(مشکوٰۃ باب صوم المسافرين)

وضاحت: جب کسی کام پر عمل کرنا اصل ہو تو اس کیلئے لفظ عزیمت بولا جاتا ہے اکثر طور پر عمل عزیمت پر بہتر ہوتا ہے لیکن جس کام کو آسان کرنے کیلئے اس میں ڈھیل دی جائے اس کو نرم کیا جائے اس کو رخصت کہا جاتا ہے۔ اس پر عمل کرنا جائز ہوتا ہے لیکن اسکے مقابل صورت پر عمل کرنا اکثر اوقات بہتر ہوتا ہے۔ اس تمہید کے بعد نبی کریم ﷺ کے ارشاد کو دیکھئے آپ نے کیا خوب فرمایا ”قال ہی رخصة من الله عز وجل“ کہ سفر کے دوران روزہ نہ رکھنا رخصت ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے۔ اسی ارشاد سے ضمایہ بات بھی سمجھ میں آگئی ”فان الصوم عزیمت منه تعالیٰ لقوله فمن شهد منكم الشهر فليصمه“ کہ بیشک روزہ رکھنا اللہ تعالیٰ کی طرف سے عزیمت ہے۔ کیونکہ رب تعالیٰ نے رمضان کو پا لینے والے پر روزہ فرض کیا ہے۔ چونکہ سائل کے سوال کی دار و مدار ”انی اجد قوة علی الصيام فی السفر“ (بیشک میں سفر میں روزہ رکھنے کی طاقت رکھتا ہوں) پر ہے لہذا اسی سے واضح ہو گیا:

”الافطار فی السفر رخصة ای تسهیل من الله عز وجل لعباده دفعا

للمشقة علیهم (ما جعل علیکم فی الدین من حرج)“

کہ سفر کے دوران افطار کی رخصت اس لئے دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں سے مشقت کو اٹھا کر آسانی پیدا فرمائی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے دین میں مشکل نہیں پیدا فرمائی۔ ”فمن اخذ بها فحسن“ (جس نے رخصت پر عمل کیا تو اچھا ہے) اس کا مطلب یہ ہے:

”فعله حسن مرضی لاجناح علیه للحديث الآخر ان الله يحب ان یؤتی رخصة کما يحب ان یؤتی عزائمہ“

کہ رخصت پر عمل کرنا بھی اچھا اور پسندیدہ ہے یعنی کبھی کبھی رخصت پر عمل بھی کیا جائے تاکہ رخصت کا مقصد فوت نہ ہو جائے۔ کیونکہ ایک اور حدیث میں ہے بیشک اللہ تعالیٰ کو پسند ہے کہ رخصت پر بھی ایسے ہی عمل کیا جائے جیسے عزیمت پر عمل کیا جاتا ہے۔ ”ومن احب ان یصوم فلا جناح علیه“ اور جسے روزہ رکھنے سے محبت ہو اس پر کوئی گناہ نہیں کہ روزہ رکھے:

”وفی مغایرة العبارة بین الشرطین اشارة لطيفة الی افضلیة الصوم“

دونوں شرطوں کی علیحدہ علیحدہ عبارتوں سے لطیف اشارہ اس طرف کر دیا گیا ہے کہ روزہ رکھنا افضل

ہے۔ وہ کیسے؟ وہ اس طرح کہ رخصت کا ذکر نبی کریم ﷺ نے ان الفاظ مبارکہ سے کیا ”فمن اخذ بها فحسن“ جس نے رخصت پر عمل کیا تو اچھا ہے لیکن جب عزیمت کا ذکر فرمایا تو ارشاد فرمایا ”ومن احب ان يصوم فلا جناح عليه“ جس شخص کو روزہ رکھنا محبوب ہو وہ روزہ رکھے اس پر کوئی گناہ نہیں۔

”فمن اخذ بها“ (جو اس پر عمل کرے) ومن احب (اور جسے محبت ہو) کے الفاظ کو ذرا غور سے دیکھیں خود بخود سمجھ آ جائے گا کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد کس لطافت اور فصاحت پر مبنی ہے۔

اعتراض: حدیث پاک میں تو رخصت پر عمل کرنے کو ”حسن“ کہا گیا ہے اور روزے رکھنے کی صورت میں ”فلا جناح عليه“ کہہ کر صرف گناہ کی نفی کی گئی ہے اس میں روزہ کی افضلیت کیسے ثابت ہے؟

جواب: ایک وجہ تو پہلے ثابت کی جا چکی ہے کہ ”ومن احب“ کے الفاظ سے روزہ کی افضلیت روز روشن کی طرح ثابت ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ جب رخصت کے لئے ”حسن“ کا لفظ استعمال کیا تو اسی سے اشارہ فرما دیا کہ جب کوئی شخص عزیمت پر عمل کرے گا اور روزہ اسے محبوب ہوگا تو یقیناً روزہ رکھنا احسن ہوگا۔ ابھی راقم نے جو مفہوم پیش کیا ہے اسے ملا علی قاری رحمہ اللہ کے ان الفاظ میں دیکھا جائے ”لان الرخصة اذا كانت حسنا فالعزيمة اولی بذلك“ اس لئے کہ رخصت پر عمل کرنا جب حسن ہوگا تو عزیمت پر عمل کرنا اس سے بھی زیادہ بہتر ہوگا اور سب سے عظیم وجہ یہ ہے:

”ولعله عليه السلام علم بنور النبوة ان مراد السائل بقوله فهل على

جناح اى فى الصوم ويدل عليه المقدمة المتقدمة من قوله انى اجدى

قوة على الصيام“

کہ اگرچہ سائل نے ”فہو علی جناح“ میں وضاحت نہیں کی کہ وہ کس چیز کے متعلق سوال کر رہا ہے کہ مجھ پر کس چیز کا گناہ نہیں لیکن نبی کریم ﷺ سے نور نبوت سے یہ معلوم کر لیا تھا کہ سائل کا مقصد یہ ہے کہ دوران سفر کیا روزہ رکھنے کا مجھ پر گناہ تو نہیں۔ نیز اس کے پہلے الفاظ بھی اس پر دلالت کر رہے ہیں کہ اس نے یہ کہا کہ میں دوران سفر روزہ رکھنے کی طاقت پاتا ہوں۔

روزے کی قضاء کے متعلق احادیث مبارکہ:

”عن عائشة قالت كان يكون على الصوم من رمضان فما استطاع ان

افضى الا فى شعبان قال يحيى بن سعيد تعنى الشغل من النبى او
بالنبى ﷺ بخارى ومسلم
(مشكوة باب القضاء)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ مجھ پر رمضان کے روزے ہوتے جو میں قضا کی طاقت نہیں رکھتی تھی یہاں تک کہ شعبان آ جاتا تو میں روزے قضا کرتی۔ یحییٰ بن سعید (روای حدیث) کہتے ہیں کہ اس کی وجہ کہ نبی کریم ﷺ کے ساتھ مشغولیت تھی۔

وضاحت حدیث: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر رمضان کے روزے لازم ہونے کی وجہ وہی تھی جو ہر عورت کو لاحق ہوتی ہے یعنی حیض کے دنوں میں چونکہ روزے رکھنے منع ہیں ان کو قضاء کرنا پڑتا ہے۔ نبی کریم ﷺ کے ساتھ مشغولیت کا کیا مطلب؟ اس کا مطلب یہ ہے:

”انها كانت مهينة نفسها لرسول الله ﷺ لا ستمتاعه فى جميع اوقاتها ان اراده بذلك ذكره الطيبى“

علامہ طیبی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے مد نظر نبی کریم ﷺ کا ادب و احترام تھا کہ آپ کہیں نفع حاصل کرنے کا مطالبہ کریں تو میں روزہ کا عذر نہ پیش کروں بلکہ ہمہ وقت نبی کریم ﷺ کی خواہشات کا خیال ان کے دل میں رہتا تھا۔

شعبان میں آپ روزے قضا کرتی تھیں اس کی وجہ تو یہ تھی کہ آپ کے دل میں خیال ہوتا تھا کہ آنے والے رمضان سے پہلے وہ روزے قضا کر لئے جائیں جو کہ سابق رمضان کے آپ کے ذمہ ہیں کیونکہ آنے والے رمضان میں وہی عذر پھر اور روزے میرے ذمہ لازم کرنے کا سبب بنے گا اس طرح بوجھ بڑھتا چلا جائے گا۔ لیکن شعبان میں روزے قضا کرنے کی عظیم وجہ یہ تھی:

”ان النبى ﷺ كان يصوم اكثر شعبان على ما روى انه كان يصوم شعبان اقليلًا، ولا يحتاج اليها فيه“

کہ شعبان کے مہینے میں نبی کریم ﷺ بہت روزے رکھتے تھے جیسا کہ روایت میں آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ شعبان میں کم ہی افطار کرتے تھے زیادہ روزے رکھتے تھے۔ اس وجہ سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو بھی روزے قضا کرنے کا وقت آسانی سے مل جاتا ہے۔

☆ ”وعن ابى هريرة قال قال رسول الله ﷺ لا يحل للمرأة ان تصوم وزوجها شاهد

(رواہ مسلم)

”الا باذنه ولا تأذن فی بیتہ الا باذنه“

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کسی عورت کے لئے جائز نہیں کہ وہ روزہ رکھے جب اس کا خاوند موجود ہو تو اس سے پہلے اجازت طلب کرے اور زوج کے گھر میں زوج کے بغیر کسی اور سے اجازت طلب نہ کرے۔
(مشکوٰۃ باب القضاء)

وضاحت حدیث: حدیث پاک میں جو روزے نہ رکھنے کا ذکر ہے اس سے مراد یہ ہے:

”لا ینبغی ان تصوم قضاء رمضان او قضاء صوم النفل اذا کان الوقت متسعا“

مناسب نہیں کہ عورت خاوند کی اجازت کے بغیر رمضان کے روزے قضاء کرے۔ یا نفلی روزہ کہیں رکھ کر توڑ دیا تھا تو اس کی قضاء کرے البتہ شرط یہ ہے کہ وقت میں وسعت ہو۔ اور یہ بھی قانون شریعت واضح ہے کہ خاوند کو چاہئے کہ وہ زوجہ کو فرائض اور واجبات سے منع نہ کرے۔ اس لئے کسی دن تو منع کر سکتا ہے ہر دن ہی منع کرنا اس کے لئے جائز نہیں ہوگا۔ ضمنی طور پر اس سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ عورت نفلی روزے خاوند کی اجازت کے بغیر نہ رکھے:

”ولا تأذن فی بیتہ الا باذنه“ یعنی ولا یحل لہا ان تأذن احدا من

الاجانب او الاقارب حتی النساء

یعنی عورت کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ خاوند کے بغیر دوسرے اجنبی یا قریبی لوگوں سے اجازت طلب کرے بلکہ اس کے لئے یہ بھی جائز نہیں کہ وہ عورتوں سے اجازت طلب کرے یہ اجازت صرف خاوند سے طلب کرے ”الا باذنه وفي معناه العلم برضاه“ خاوند سے اجازت صراحتہ طلب کرنا ضروری نہیں بلکہ جب یہ علم حاصل ہو کہ خاوند روزوں کی قضاء یا نفلی روزے رکھنے پر راضی ہے تو یہ اجازت ہی ہوگی۔
(ازمرقاۃ)

حیض کی حالت میں چھوٹ جانے والی نمازوں اور روزوں کا حکم:

”وعن معاذۃ العدویۃ انها قالت لعائشۃ ما بال الحائض تقضى الصوم

ولا تقضى الصلوة قالت کان یصیبننا ذلک فتؤمر بقضاء الصوم ولا

(رواہ مسلم)

تؤمر بقضاء الصلوة“

حضرت معاذہ عدویہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے سوال کیا کہ حیض والی عورتوں کا کیا حال

ہے کہ وہ روزہ قضاء کرتی ہیں اور نمازیں قضاء نہیں کرتیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا ہمیں یہ (حیض) پہنچتا تو ہمیں حکم دیا جاتا کہ ہم روزے قضا کریں اور ہمیں نمازیں قضا کرنے کا حکم نہیں دیا جاتا تھا۔

(مشکوٰۃ باب القضاء)

وضاحت حدیث: ایک تو یہ خیال کیا جائے کہ حیض اور نفاس کے احکام نماز اور روزے کے ایک ہیں۔ اس لئے سوال کا تعلق گویا کہ دونوں سے رہے گا۔ حضرت معاذہ عدویہ کا سوال تعجب کی وجہ سے تھا کہ نماز بھی فرض ہے اور روزہ بھی فرض ہے نماز اور روزہ کے چھوٹ جانے کی وجہ ایک ہے پھر کتنا ہی مقام تعجب ہے کہ نمازوں کو قضاء نہیں کیا جاتا اور روزوں کو قضاء کیا جاتا ہے۔

اگرچہ اس کا عقلی جواب بھی اہل علم نے دیا ہے کہ نمازیں زیادہ رہ جاتی ہیں ان کے قضاء کرنے میں حرج لازم آتی ہے اس لئے حرج کو اٹھایا گیا ہے لیکن روزے سال میں ایک دفعہ آتے ہیں تھوڑی مقدار میں روزوں کا رہ جانا پھر ان کی سال میں قضاء کوئی مشکل نہیں۔ لیکن حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا جواب بہت ہی خوب حکمت بھرا جواب ہے کہ شریعت تو رب تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے حکم کا نام ہے جب ہمیں حکم ہی یہ دیا گیا ہے کہ ہم روزے قضا کریں اور نمازیں قضا نہ کریں تو ہم نے وہی کام کرنا ہے جس کا ہمیں حکم دیا گیا۔

سبحان اللہ کیا خوب علم تھا صحابیات کا سوال بھی حکمت بھرا جو باعث تعجب تھا۔ جواب بھی بہت خوب حکمت و فصاحت پر مبنی دراصل سوال کرنے والی صحابیہ کا مقصد ہی یہ تھا کہ اس کے متعلق کیا تم نے نبی کریم ﷺ سے کچھ سنا ہے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے جواب کا مطلب یہ ہے کہ ہاں جو سنا ہے اسی پر عمل کر رہے ہیں۔

(ازمرقاۃ)

وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ :

”اور جنہیں اس کی طاقت نہ ہو وہ بدلہ دیں ایک مسکین کا کھانا“ ان الفاظ مبارکہ میں ﴿وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ﴾ کا ترجمہ اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے فرمایا ”اور جنہیں اس کی طاقت نہ ہو۔ اور راقم نے بھی یہی ترجمہ نقل کیا ہے۔ راقم نے تراجم کا تقابلی جائز اپنی کتاب ”تسکین البھان فی محاسن کنز الایمان“ میں پیش کیا ہے اسی کو یہاں نقل کر رہا ہوں کافی حد تک مفہوم بھی سمجھ آ جائے گا اور دوسرے حضرات کا ترجمہ مثبت ہے ”جو طاقت رکھتے ہیں“ تراجم میں فرق بھی سمجھ آ جائے گا۔

مختلف تراجم:

- ☆ اور جن کو طاقت ہے روزہ کی ان کے ذمہ بدلا ہے ایک فقیر کا کھانا۔ (محمود الحسن صاحب)
 - ☆ جو لوگ روزہ رکھنے کی قدرت رکھتے ہوں (پھر نہ رکھیں) تو وہ فدیہ دیں۔ (موردی صاحب)
 - ☆ اور جو لوگ اسے مشکل سے برداشت کر سکیں ان کے ذمہ فدیہ ہے کہ (وہ) ایک مسکین کا کھانا ہے۔ (عبد الماجد صاحب)
 - ☆ اور جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھیں (لیکن رکھیں نہیں) وہ روزے کے بدلے محتاج کو کھانا کھلائیں۔ (فتح محمد صاحب)
 - ☆ اور اوپر ان لوگوں کے کہ طاقت رکھتے ہیں اس کا بدلہ ہے کھانا ایک فقیر کا۔ (شاہ رفیع الدین صاحب)
 - ☆ اور جنہیں اس کی طاقت نہ ہو وہ بدلہ دے ایک فقیر کا کھانا۔ (اعلیٰ حضرت)
- یہاں روزے کا فدیہ دینے کا ذکر ہے آیا فدیہ وہ شخص دے جو روزہ رکھ سکتا ہے پھر یہ حکم منسوخ ہو گیا یا یہ کہ حکم ابھی باقی ہے فدیہ دینے کا حکم اس شخص کو جو روزہ رکھنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ اس مقام پر اعلیٰ حضرت کا دوسرا قول ہے یہ ہی زیادہ معتبر ہے۔ اگرچہ پہلے قول کو بھی ذکر کیا گیا ہے:
- ﴿وَعَلَى الَّذِينَ لَا يُطِيقُونَهُ﴾ لکبر او مرض لا یرجى برؤہ“ (جلالین)
- فدیہ ان لوگوں پر ہے جو روزہ رکھنے کی طاقت نہیں رکھتے بڑھاپے کی وجہ سے یا مرض دائمی کی وجہ سے حاشیہ جلالین میں اس طرح مذکور ہے:

”قوله ﴿وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ﴾ ای لا یطیقونه واعلم ان عند اکثر المفسرین فیہ قولان احدهما ان المراد بالذین یطیقونه الاصحاء المقیمون خیرهم فی ابتداء الاسلام بین الامرین بین ان یصوموا و بین ان یفدوا ویفدوا لئلا یشق علیهم لانهم کانوا لم یتعودوا ثم نسخ التخییر ونزلت العزیمۃ بقوله فمن شهد منکم الشهر فلیصمه وثانیہما ان یکون لا محذوفاً وهو واقع فی کثیر من استعمال الفصحاء کما فی قوله تعالیٰ ﴿يَبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ اَنْ تَصِلُوا﴾ وکان المعنی وعلى الذین لا یطیقونه فدیۃ طعام مسکین“

بے شک اکثر مفسرین کے اس میں دو قول ہیں ایک یہ ہے کہ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو طاقت رکھتے ہیں صحیح ہوں مقیم ہوں ان کو ابتداء اسلام میں دوامروں میں اختیار دیا گیا تھا کہ وہ روزہ رکھیں یا افطار کریں اور فدیہ دے دیں تاکہ ان پر شاق نہ ہو کیونکہ ان کو روزہ رکھنے کی پہلے عادت نہ تھی پھر اس اختیار کو منسوخ کر دیا گیا ﴿فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ﴾ سے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ یہاں ”لا“ محذوف ہے فصحاء کے استعمال میں ایسا کثیر الوقوع ہے جیسے اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿يُيَسِّرُ اللَّهُ لَكُمْ أَنْ تَصَلُّوا﴾ میں بھی ”لا“ محذوف ہے اور معنی ﴿ان لا تصلوا﴾ ہے (بیان کرتا اللہ تعالیٰ کا تمہارے لئے تاکہ تم گمراہ نہ ہو)۔ زیر بحث آیت کریمہ میں۔ ”وعلی الذین یطیقونہ فدیۃ“ اس معنی میں ہے۔ ”وعلی الذین لا یطیقونہ فدیۃ“ اور جنہیں اس کی طاقت نہ ہو وہ فدیہ دیں۔ اس نفی والے قول پر ایک اور صورت پیش کی گئی، قوله یطیقونہ قال فی تفسیر الشیخ یطیق من اطاق فلان اذا زالت طاقته والهمزة للسلب ای لا یقدرون علی الصوم یطیقونہ“ کہ ﴿يُطِيقُونَهُ﴾ باب افعال سے ہے جس کا ہمزہ کبھی سلب کے لئے آتا ہے اس صورت میں بھی معنی یہ ہوگا جو روزہ رکھنے کی طاقت نہیں رکھتے ان پر فدیہ ہے۔ زیادہ پسندیدہ قول یہی ہے کہ یہ حکم منسوخ نہیں بلکہ شیخ فانی کے حق میں موجود ہے۔ (تسکین البیان ص ۶۱، ۶۲)

فدیہ کب لازم آئے گا: ایک وجہ تو مندرجہ بالا سے سمجھ آئی کہ جو شخص شیخ فانی ہو (یعنی ایسی عمر میں کہ روزہ نہ رکھ سکے اور نہ ہی آئندہ روزہ رکھنے کی کوئی امید ہو) وہ روزہ کی جگہ فدیہ دے دے۔ جو شخص مریض تھا یا مسافر تھا روزے نہیں رکھ سکا۔ پھر صحیح ہو گیا یا مقیم ہو گیا روزے قضاء کرنے کا وقت مل گیا لیکن قضاء نہ کر سکا تو اس پر لازم ہے کہ وصیت کر جائے کہ اس کے روزوں کا فدیہ ادا کر دیا جائے اگر اس نے وصیت کر دی تو اس کے تہائی مال سے اس کے روزوں کا فدیہ ادا کرنا واجب ہو جائے گا۔ تہائی حصہ سے زائد مال بطور فدیہ تمام ورثاء اتفاق سے اور خوشی سے ادا کر دیں تو جائز ہے۔ اگر اس شخص نے وصیت تو نہیں کی لیکن ورثاء کو معلوم تھا کہ اس کے ذمے اتنے روزے تھے وہ اپنی مرضی سے اس کا فدیہ ادا کر دیں تو اللہ تعالیٰ سے قوی امید رکھی جائے کہ وہ اس فدیہ کو قبول فرمائے گا۔ (ارشاد)

فدیہ کی مقدار کیا ہے؟ یا تو ایک روزے کے بدلے ایک مسکین کو دو وقت کا کھانا کھلا دے یا ہر روزہ

کے بدلے ایک صاع جو یا ایک صاع کھجور دے یا نصف صاع گندم، یا نصف صاع شیش ادا کرے یا ان میں سے کسی ایک چیز کی قیمت حساب کر کے ادا کرے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ فدیہ کی مقدار وہی ہے جو صدقۃ الفطر کی ہے صدقۃ الفطر کی مقدار وہی ہے جو بیان کردی گئی ہے۔

صاع کیا ہے؟ صاع ایک پیمانہ ہے۔ جس کے متعلق سید الاولیاء حضرت قبلہ عالم پیر سید مہر علی شاہ رحمہ اللہ گواہی فرماتے ہیں جس کی مقدار فقہاء کرام نے یہ بیان کی ہے ”وہو ای صاع المعتبر ما یسع الف واربعمین درهما من ماش او عدس“ (در مختار) صاع وہ ہے جس میں ایک ہزار چالیس درہم کے وزن کے برابر ماش یا مسورہ سائیں۔ ایک ہزار چالیس درہم کے تین ہزار چھ سو چالیس ماشے ہوتے ہیں جس کے تین سو تین تولہ چار ماشے بنتے ہیں اور اس کے کلدار روپے تین سو سولہ روپے چھ آنے ہوتے ہیں پس بحساب فی سیر اسی روپیہ کلدار ایک صاع کا وزن تین سیر تین پاؤ سوا تین چھٹانک ہوتا ہے علماء کرام نے صاع کا وزن احتیاطاً پورے چار سیر رکھا ہے۔ (فتاویٰ مہریہ)

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے صاع کی مقدار چار سیر سات چھٹانک بیان کی ہے یہ اختلاف دراصل صاع کی مقدار میں فقہاء کرام کے مختلف اقوال ہیں بلکہ شامی کے ایک قول کے مطابق صاع میں آٹھ رطل ہوتے ہیں ہر رطل ایک سو چالیس درہم کا وزن ہوتا ہے اس قول کے مطابق صاع چار سیر سات چھٹانک ہے بعض حضرات نے اس قول کو بھی پیش کیا ہے۔ کسی قول کو رد کرنا تو ممکن نہیں صرف یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ وزن جو سب سے زیادہ بیان کیا گیا ہے اس میں احتیاط ہے لیکن آج کل وزن کلو اور گرام سے ہو رہا ہے سیر اور چھٹانک سے نہیں ہو رہا۔

کلو، سیر سے تقریباً ڈیڑھ چھٹانک بڑا ہے اس لئے آج کل کے حساب سے اعلیٰ حضرت کے قول کے مطابق بھی نصف صاع کا وزن دو کلو بیان کیا جائے تو کافی ہے اس کے اوپر دس بارہ گرام بنتے ہیں ان کی قیمت لوگ پانچ روپے بنا دیتے ہیں حالانکہ آج کل دس روپے فی کلو کے حساب سے دس گرام کی قیمت دس پیسے بنتی ہے۔

تنبیہ: یہ ضروری نہیں کہ فدیہ صرف گندم کا حساب کر کے ہی دیا جائے۔ چار کلو جو کی قیمت دے دیں بلکہ اغنیاء چار کلو کھجور یا دو کلو کشمش کی قیمت دے دیں تو اور ہی زیادہ بہتر ہے۔ یہ بھی خیال رہے کہ

فدیہ صدقہ فطر کی طرح ہی ہے مقدار وغیرہ میں البتہ صدقہ فطر کے مکمل احکام کو بھی کسی مناسب جگہ انشاء اللہ ذکر کر دیا جائے گا۔

مسئلہ: ایک روزہ کا فدیہ ایک ہی مسکین کو دے تو جائز ہوگا۔ اگر وہ مختلف مساکین پر تقسیم کر دے ایک روپیہ ایک کو دیا اور دوسرا دوسرے کو دیا تو یہ جائز نہیں۔

مسئلہ: ہر روزہ کا فدیہ ہر دن ایک فقیر کو دے خواہ وہی فقیر ہو جسے کل دیا تھا یہ بھی جائز ہے اگر تمام روزوں کا فدیہ ایک ہی دن ایک ہی مسکین کو دے دے تو یہ بھی جائز ہے۔ ان دونوں مسئلوں کا بیان علامہ شامی رحمہ اللہ کی اس عبارت میں دیکھیں:

”قال القهستانی واطلاق کاملہ يدل على انه لو دفع الى فقير جملة جاز ولم يشترط العدد ولا المقدار لكن لو دفع اليه قال من نصف صاع لم يعتد به وبه يفتى“ (شامی ج ۲ ص ۱۲۸)

فدیہ کی جگہ دوسرا شخص روزہ نہیں رکھ سکتا: جس شخص پر فدیہ لازم ہو تو اس کا وارث ولی فدیہ نہ ادا کرے بلکہ اس کے ذمہ جتنے روزے تھے وہ روزے رکھ دے تو یہ جائز نہیں اس پر حدیث پاک کو دیکھیں:

”عن مالک بلغه ان ابن عمر كان يسأل هل يصوم احد عن احد او يصلي احد عن احد فيقول لا يصوم احد عن احد ولا يصلي احد عن احد“

(رواہ فی الموطا)

حضرت امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں مجھے یہ روایت ملی کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے سوال کیا جاتا تھا کہ کوئی دوسرا شخص کسی کی طرف سے روزے رکھ دے یا کسی کی طرف سے نماز ادا کر دے تو اس کا حکم کیا ہے؟ تو آپ اس کا جواب دیتے کہ کوئی شخص دوسرے کے روزے کے بدلے روزے نہیں رکھ سکتا اور نہ ہی دوسرے کے بدلے نماز ادا کر سکتا ہے۔ (مشکوٰۃ باب القضاء)

بلکہ فدیہ کا حکم ہی صراحۃً قرآن پاک میں زیر بحث آیہ مقدسہ میں ذکر کیا گیا ہے اور حدیث شریف میں بھی فدیہ کا حکم دیا گیا ہے:

”عن نافع عن ابن عمر النبی ﷺ قال من مات وعليه صيام شهر رمضان فليطعم عنه مكان كل يوم مسكين رواه الترمذی وقال

والصحيح انه موقوف على ابن عمر

حضرت نافع ابن عمر (رضی اللہ عنہم) سے روایت کرتے ہیں نبی کریم ﷺ نے فرمایا جو شخص فوت ہو گیا اور اس پر رمضان کے روزے تھے تو اس کی طرف سے ہر روزہ ایک مسکین کو (دو وقت) کھانا کھلایا جائے۔ (مشکوٰۃ باب القضاء) یہ حدیث اس سند سے مرفوع ہے ترمذی نے اسے موقوف کہا ہے تاہم حدیث قابل حجت ہے خواہ مرفوع ہو یا موقوف۔

اعتراض: ایک اور حدیث شریف میں تو اجازت دی گئی ہے کہ ولی اپنے شخص کی جانب سے روزہ رکھ سکتا ہے اور نماز ادا کر سکتا ہے بخاری و مسلم میں حدیث حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

”جاء رجل الى النبي ﷺ فقال ان امي ماتت وعليها صوم شهر

افاقضيه عنها فقال لو كان علي امك دين اكنت قاضيه عنها قال نعم

قال فدين الله احق

ایک شخص نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا عرض کیا کہ بیشک میری والدہ فوت ہو گئی اس کے ذمہ ایک ماہ کے روزے تھے کیا میں اس کی طرف سے روزے قضاء کر دوں؟ تو آپ نے فرمایا کیا تمہاری ماں پر قرض ہوتا تو تم ادا کرتے؟ وہ شخص عرض کرنے لگا ہاں (ادا کرتا) آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کے قرض کو ادا کرنا زیادہ حق ہے۔

اس حدیث سے تو پتہ چلتا ہے کہ جس کے ذمہ روزے یا نمازیں ہوں اس کا رشتہ دار اس کی طرف سے ادا کر سکتا ہے۔

جواب: یہ حدیث قابل حجت نہیں کیونکہ اس میں نماز کا ذکر نہیں لہذا اس سے یہ ثابت کرنا ممکن نہیں کہ کوئی شخص کسی دوسرے کی جانب سے نماز ادا کر سکتا ہے۔ پھر قانون یہ ہے کہ راوی جب اپنے ہی روایت کے خلاف فتویٰ دے تو وہ روایت یقیناً راوی کے نزدیک منسوخ ہوگی ورنہ اس کا فتویٰ اس کے خلاف نہ ہوتا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ہی نسائی نے سنن کبریٰ میں یہ روایت نقل کی ہے:

”لا يصلي احد عن احد ولا يصوم احد عن احد“

کوئی ایک کسی دوسرے کی طرف سے نماز نہ ادا کرے اور نہ ہی کوئی شخص دوسرے کی طرف سے

روزہ رکھے۔ پھر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت سنن کبریٰ میں درحقیقت آپ کا ایک فتویٰ ہے اسی لئے ملا علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”وفتویٰ الراوی علی خلاف مرویة بمنزلة روايته للناسخ ونسخ
الحکم يدل علی اخراج المناط عن الاعتبار“

راوی کا فتویٰ جب اس کی روایت کے خلاف ہو تو اس کی وہ پہلی روایت منسوخ ہو جاتی ہے جب کسی حکم کو منسوخ کر دیا جائے تو اس کا اعتبار ختم ہو جاتا ہے۔ اور اس مسئلہ پر اجماع امت ہے کیونکہ امام مالک رحمہ اللہ نے اپنے موطا میں ذکر فرمایا ہے:

”ولم اسمع عن احد من الصحابة ولا من التابعين بالمدينة، ان احدا
منهم امر احد يصوم عن احد ولا يصلي احد عن احد“

کہ میں نے نہیں سنا کہ مدینہ طیبہ میں کسی صحابی یا کسی تابعی نے یہ کہا ہو کہ کوئی شخص دوسرے کی طرف سے روزہ رکھ سکتا ہے اور نہ ہی میں نے یہ سنا کہ کوئی شخص دوسرے کی طرف سے نماز ادا کر لے۔ اور جو روایت نبی کریم ﷺ سے ثابت ہے:

”ان من البر بعد البر بالوالدين ان تصلي لهما مع صلاتك وتصوم
لهما مع صومك“

والدین سے بھلائی اور فرمانبرداری یہ ہے کہ تم ان کے لئے نماز پڑھو اور ان کے لئے روزہ رکھو۔ اس سے مراد یہ ہے کہ ”انہ يدعولهما“ بیٹا اپنے والدین کو نفلی نمازوں اور نفلی روزوں کا ثواب پہنچائے اور ان کے لئے دعا کرے۔ بلکہ محبت طبری جو متاخرین شوافع سے ہیں انہوں نے عبادات واجبہ اور نفلہ کا ثواب میت کو پہنچانے کا ذکر فرمایا ہے:

”ويصل للميت ثواب كل عبادة فعلت عنه واجبة او مندوبة“

تمہاری ہر عبادت کا ثواب میت کو پہنچتا ہے خواہ وہ عبادت واجب ہو یا مستحب۔ اور ہمارے اصحاب احناف ارشاد فرماتے ہیں ”ان للانسان ان يجعل ثواب عمله لغيره صلوة او غيرها“ کہ بیشک انسان کے لائق یہ ہے کہ انسان اپنے اعمال کا ثواب دوسرے کو پہنچائے خواہ اس کے اعمال نمازیں ہوں یا اور عبادات اس قسم کی کثیر عبارات احناف کے علماء و فقہاء کی موجود ہیں بلکہ ”هذا

مذہب اہل السنۃ والجماعۃ “ یہی مذہب اہل سنت و جماعت کا ہے۔

اور بخاری و مسلم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ” من مات و علیہ صوم صام عنہ ولیہ “ جو شخص فوت ہو جائے اس کے ذمہ روزہ ہو تو اس کا ولی اس کی طرف سے روزہ رکھے اس حدیث پاک کی وضاحت علامہ طیبی رحمہ اللہ ان الفاظ سے فرماتے ہیں ” انہ یتدارک ذلک ولیہ بالا طعام فکأنه صام “ اس شخص کا رشتہ دار اس کی طرف سے طعام بطور فدیہ دے کر اس کا تدارک (اس کے چھوٹ جانے والے روزہ کا بدل دے کر اس کی کمی کو پورا کر دینا تدارک کہلاتا ہے) کرے تو گویا کہ اس نے اس میت کی جانب سے روزہ رکھ دیا۔

(از مرقاۃ ج ۲ ص ۲۸۲، ۲۸۳)

حاصل کلام یہ ہے: کہ عبادت کا ثواب میت کو پہنچانا جائز ہے لیکن کسی کی نماز کے بدلے کوئی دوسرا نماز ادا نہیں کر سکتا۔ اور نہ ہی کوئی دوسرا کسی کے بدلے روزہ رکھ سکتا ہے روزے کا فدیہ دینا ہی ضروری ہوگا۔ **فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَهُ**: ”پھر جو اپنی طرف سے زیادہ نیکی کرے وہ اسکے لئے بہتر ہے۔ یعنی جو شخص مقرر مقدار سے زیادہ فدیہ دے تو اس کے لئے بہتر ہے۔

فائدہ: اسی سے یہ فائدہ واضح طور پر حاصل ہوا کہ نیکی کا کام جتنا زیادہ کرے گا اسے اتنا ہی زیادہ ثواب حاصل ہوگا۔ نوافل، مستحبات کی کوئی حد مقرر نہیں ہاں البتہ جن اوقات میں نوافل ادا کرنا منع کیا گیا ہے ان اوقات میں وہ منع رہیں گے اسی طرح فرائض میں زیادتی حرام ہوگی کہ کوئی شخص کہے صبح کے دو فرض کی جگہ تین یا چار پڑھ لئے جائیں اس طرح کی زیادتی عبادات میں ناجائز ہے۔

وَأَنْ تَصُومُوا خَيْرٌ لَّكُمْ: ”اور تمہارا روزہ رکھنا تمہارے لئے بہتر ہے“ ”وَأَنْ تَصُومُوا فِي السَّفَرِ وَالْمَرَضِ غَيْرُ الشَّاقِّ“ یعنی سفر اور مرض کی حالت میں جب زیادہ مشقت نہ ہو روزہ تکلیف کا سبب نہ بنے تو تمہارا روزہ رکھنا تمہارے لئے بہتر ہے۔ (قرطبی)

إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ: ”اگر تم جانتے ہو“ یعنی اگر تمہیں علم ہو کہ روزہ کب رکھنا بہتر ہے تو اس وقت روزہ رکھو (مظہری) ضمناً یہ سمجھ آ گیا کہ جب تمہیں معلوم ہو کہ اب روزہ رکھنا منع ہے تو اس وقت اپنے آپ کو ہلاکت سے بچانے کے لئے روزہ نہ رکھنا بہتر ہے۔ (راقم)

﴿ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِّلنَّاسِ
وَبَيِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدَى وَالْفُرْقَانِ فَمَن شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ
فَلْيَصُمْهُ وَمَن كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ
يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ
وَلِتُكَبِّرُوا اللَّهَ عَلَى مَا هَدَاكُم وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴾

- (۱) ”رمضان کا مہینہ جس میں قرآن اترالوگوں کے لئے ہدایت اور راہنمائی اور فیصلہ کی روشن باتیں تو تم میں جو کوئی یہ مہینہ پائے ضرور اس کے روزے رکھے اور جو بیمار یا سفر میں ہو تو اتنے روزے اور دنوں میں اللہ تم پر آسانی چاہتا ہے اور تم پر دشواری نہیں چاہتا۔ اور اس لئے کہ تم گنتی پوری کرو اور اللہ کی بڑائی بولو اس پر کہ اس نے تمہیں ہدایت کی اور کہیں تم حق گزار ہو۔“
- (۲) ماہ رمضان وہ ہے کہ نازل کیا گیا اس میں قرآن جو ہدایت ہے لوگوں کے لئے اور وہ واضح دلیلیں ہیں ہدایت کی اور فرق کرنے والا ہے (حق و باطل میں) تو جو شخص حاضر ہو تم میں سے اس مہینہ میں تو وہ روزے رکھے اس کے اور جو شخص مریض ہو یا سفر میں ہو تو وہ اتنے ہی اور دنوں میں (روزے رکھے) ارادہ کرتا ہے اللہ تم پر آسانی کا اور نہیں ارادہ کرتا تم پر مشکل کا اور مکمل کرو تم گنتی اور تم بڑائی بیان کرو اللہ کی اس پر جو ہدایت دی اس نے تمہیں اور تاکہ تم شکر کرو۔“

شَهْرُ رَمَضَانَ : ”ماہ رمضان“ اہل تاریخ نے بیان کیا ہے کہ سب سے پہلے رمضان کے روزے نوح علیہ السلام نے رکھے جب آپ کشتی سے باہر تشریف لائے۔ راقم کے نزدیک ”لما خرج من السفينة“ کے الفاظ اس پر دلالت کر رہے ہیں کہ آپ نے وہ روزے کشتی کے صحیح و سلامت کنارے پر لگنے پر بطور شکر رکھے ہیں اس سے یہ پتہ چلا کہ کسی نعمت کے حاصل ہونے پر رب تعالیٰ کی عبادت کرنا بطور شکر سنت انبیاء کرام ہے۔ اور حضرت مجاہد رحمہ اللہ کا قول یہ ہے کہ ”کتب اللہ رمضان علی“

کل امة " اللہ تعالیٰ نے ہر امت پر رمضان کے روزے فرض کئے۔ چونکہ نوح علیہ السلام سے پہلے بھی امتیں تھیں اس لئے واضح ہوا کہ رمضان کے روزے حضرت آدم علیہ السلام کے زمانہ سے آرہے ہاں البتہ روزوں کی تعداد میں کمی و بیشی ہو سکتی ہے۔
(ماخوذ از قرطبی)

شہر کی وجہ تسمیہ: شہر کا لفظ ہے شہرة سے، جب کوئی چیز ظاہر ہو مشہور ہو تو کہا جاتا ہے "شہر الشئی یشہر شہرة وشہرا" اسی طرح کہا جاتا ہے "شہرت السیف" میں نے تلوار کو سونت کر بلند کیا۔ مطلب اس کا بھی ظاہر کرنا ہے۔

رمضان کو یاد دوسرے مہینوں کو "شہر" کہا جاتا ہے کیونکہ ہر مہینہ لوگوں پر ظاہر ہوتا ہے مخفی نہیں رہتا لوگ یاد رکھتے ہیں کیونکہ لوگوں کی مہینے کی پہچان سے اغراض اور حاجات وابستہ ہوتی ہیں۔ دفتری حاجات، روزے، حج، عیدین وغیرہ مختلف محافل و مجالس کا تعلق مہینوں سے ہی ہوتا ہے اس لئے لوگوں پر ہر مہینہ ظاہر ہوتا ہے تو مہینہ کو "شہر" کہہ لیا جاتا ہے۔ (از قرطبی کبیر) کہا جاتا ہے "اشہر" ایک مہینہ گزرا "اشہرنا فی هذا المكان" اس مکان میں ہم نے مہینہ گزارا "اشہرت المرأة" عورت کا ولادت کے مہینہ میں داخل ہونا، شاہرہ مشاہرة مہینہ کے لئے نوکر رکھنا۔ (المنجد)

رمضان کی وجہ تسمیہ:

(۱) اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ رمضان کا لفظ مشتق ہے "رمضاء" بسکون المیم سے۔ "رمضاء" گرمی کے آخر اور خریف کی ابتداء میں برسنے والی بارش کو کہتے ہیں اس بارش سے زمین کا گرد و غبار صاف ہو جاتا، زمین دھل جاتی ہے۔

"فکذلک شہر رمضان یغسل ابدان هذه الامة من الذنوب و یطہر قلوبہم"

اس معنی کی مناسبت سے رمضان کا نام رمضان رکھنے کی یہ وجہ ہے کہ یہ نبی کریم ﷺ کی امت سے روزے رکھنے والے خوش بخت مسلمانوں کے بدنوں کو گناہوں سے دھو دیتا ہے۔ جس کی وجہ سے ان کے جسم پاک و صاف ہو جاتے ہیں اور ان کے دل پاک ہو جاتے ہیں۔

(۲) اور وجہ یہ ہے کہ "رمضان" ماخوذ ہے "رمض" سے جس کا معنی ہے سورج کی گرمی سے

پتھروں کا گرم ہو جانا اس سے اسم آتا ہے ”رمضاء“ جس کا معنی ہے گرمی کی تیزی دھوپ کی تیزی کی وجہ سے گرم زمین۔

☆ اس معنی کی مناسبت سے ”رمضان“ کا مطلب ہوگا بھوک کی حرارت کی وجہ سے انسان کے دل میں حرارت کا پیدا ہونا۔

☆ اسی معنی کی مناسبت سے یہ بھی کہا گیا ہے کہ مہینوں کے نام جس وقت میں وہ آئے اس کی مناسبت سے نام رکھ لئے گئے۔ ”فوافق هذا الشهر ايام رمض الحر“ چونکہ سب سے پہلے دنیا میں جب رمضان واقع ہوا وہ سخت گرمی کے دن تھے اس مناسبت سے اس کا نام ”رمضان“ رکھ دیا گیا۔

☆ اسی معنی کی مناسبت سے اور وجہ یہ بیان کی گئی کہ ”رمضان“ بندوں کے گناہوں کو جلا دیتا ہے اس لئے اسے رمضان کہا جاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے ”انما سمي رمضان لانه يرمض ذنوب عباد الله“ کہ رمضان کا نام اس لئے رمضان رکھا گیا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے بندوں کے گناہوں کو جلا کر رکھ دیتا ہے۔

(۳) رمضان کے نام رکھنے کی اور وجہ یہ ہے کہ یہ لفظ ماخوذ ہے ”رمضت النصل“ میں نے تلوار کے پھل کو کوٹنا۔ چونکہ وہ لوگ رمضان میں اپنی تلواروں کے پھل (لوہے کا پترا) کو کوٹ کے باریک کر لیتے تھے۔ اس وجہ سے اس مہینے کا نام ہی رمضان رکھ لیا گیا۔

(۴) اگر یہ قول صحیح ثابت ہو جائے کہ ”رمضان“ اللہ تعالیٰ کا اسم گرامی ہے تو اس معنی کے لحاظ سے مطلب یہ ہوگا کہ رمضان کے مہینے کا نام اللہ کے نام پر رکھ لیا گیا:

”فالمعنى ان الذنوب تتلاشى في جنب رحمة الله حتى كأنها احترقت

وهذا الشهر ايضا رمضان بمعنى ان الذنوب تحترق في جنب بركته“

اب اس کا معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کی وجہ سے گناہ جل کر نیست و نابود ہو جاتے ہیں یہ مہینہ بھی رب تعالیٰ کے نام سے شریک ہونے کی برکت سے گناہوں کو جلا دیتا ہے۔ (کبیر)

تنبیہ: علامہ رازی رحمہ اللہ نے چوتھی وجہ رمضان نام رکھنے کی بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

”الرابع ، لوصح قولهم ان رمضان اسم الله تعالى“

چونکہ وجہ رمضان نام رکھنے کی اگر اہل علم حضرات کا یہ قول صحیح ثابت ہو جائے کہ ”رمضان“ اللہ تعالیٰ کا اسم گرامی ہے اگر صحیح ثابت ہو جائے، سے اس طرف اشارہ کر دیا کہ جس حدیث سے یہ ثابت کیا جاتا ہے کہ ”رمضان“ اللہ تعالیٰ کا اسم گرامی ہے وہ ضعیف ہے۔ ملا علی قاری رحمہ اللہ واضح طور پر بیان کرتے ہیں وہ حدیث پاک جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے:

”عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ ﷺ من صام رمضان ايماناً واحتساباً غفر له ما تقدم من ذنبه“

اس کی وضاحت میں فرماتے ہیں:

”وفيه انه لا يكره ان يقال رمضان بدون شهر و كرهه بعض العلماء لخبر انه من اسماء الله تعالى وهو شاذ لان الخبر الضعيف لا يثبت اسم الله“

(مرقاۃ ج ۳ ص ۲۳۱ کتاب الصوم)

اس حدیث پاک سے ثابت ہوا کہ یہ کہنا رمضان آگیا میں نے رمضان کے روزے رکھے جائز ہے بیشک اس کے ساتھ مہینہ کا لفظ نہیں ذکر کیا البتہ بعض علماء نے کہا ہے کہ یہ نہ کہا جائے کہ رمضان آگیا بلکہ یہ کہا جائے ماہ رمضان آگیا کیونکہ حدیث پاک سے یہی ثابت ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا نام ہے۔ لیکن ملا علی قاری رحمہ اللہ نے فرمایا یہ قول شاذ ہے جس حدیث کا ذکر کیا جاتا ہے وہ ضعیف ہے ضعیف حدیث سے اللہ تعالیٰ کا اسم گرامی ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ (مرقاۃ) علامہ آلوسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”ومنع بعضهم ان يقال رمضان بدون شهر لما اخرجہ ابن ابی حاتم وابو الشيخ وابن عدی والبيهقي والديلمی عن ابی ہریرۃ مرفوعاً وموقوفاً ﴿ لا تقولوا ﴾ رمضان فان رمضان اسم من اسماء الله تعالى ولكن قولوا شهر رمضان ، والی ذلك ذهب مجاهد والصحيح الجواز فقد روى ذلك في الصحيح والاحتياط لا يخفى“

بعض حضرات نے صرف رمضان کہنا بغیر مہینہ یا ماہ کے ملانے کے منع قرار دیا ہے کہ ابن ابی حاتم اور ابوالشیخ اور ابن عدی اور بیہقی اور دیلمی نے حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے جو بطریق مرفوع اور موقوف بیان ہے کہ تم نہ کہو رمضان بیشک رمضان اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ایک اسم ہے لیکن تم کہو ماہ رمضان، یہی قول مجاہد رحمہ اللہ کا بھی ہے۔

علامہ آلوسی رحمہ اللہ اپنا مختار بیان کرتے ہیں کہ صحیح یہ ہے کہ صرف ”رمضان“ کہنا صحیح ہے اس لئے کہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں فقط رمضان بغیر شہر کے آیا ہوا ہے البتہ احتیاط مخفی نہیں یعنی اگر احتیاط کے طور پر ماہ رمضان کہے صرف رمضان نہ کہے تو بہتر ہے۔ کیا خوب علم تھا محققین کا کہ حدیث پاک کے ضعف کو بیان کر دیا لیکن احتیاطی طور پر عمل کرنے کا حکم بھی دے دیا۔ آج کل کے جاہل مصنفین اور مقررین جب احادیث پر بحث کرنے کی بجائے کتب احادیث کو ہی ضعیف کہہ دیتے ہیں تو ان کی جہالت روز روشن کی طرح آشکارا ہوتی ہے۔

الَّذِي أَنْزَلَ فِيهِ الْقُرْآنُ :

”وہ کہ نازل کیا گیا اس میں قرآن“ یعنی رمضان وہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا۔

مقام توجہ:

”نزل صحف ابراہیم فی اول لیلۃ من رمضان وانزلت التوراة لست

مضین والانجیل لثلاث عشرة والقرآن لاربعة وعشرين“

ابراہیم علیہ السلام پر صحیفے رمضان کی پہلی رات کو نازل ہوئے۔ اور توراة نازل ہوئی جب رمضان کے چھ دن گزر چکے تھے۔ اور انجیل نازل ہوئی تیرہ رمضان کو اور قرآن نازل ہوا چوبیس رمضان کو۔ (کبیر) اور یہ بھی مشہور ہے کہ قرآن پاک کا نزول ایک مرتبہ نہیں ہوا بلکہ ”وانما نزل علیہ فی مدۃ ثلاث وعشرين سنة منجما مبعضا“ بلکہ آہستہ آہستہ تھوڑی تھوڑی مقدار میں تیس سال نازل ہوتا رہا۔ اور یہ بھی مشہور ہے کہ نبی کریم ﷺ پر قرآن پاک بیس سال نازل ہوتا رہا۔ اور حدیث پاک سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ قرآن پاک چوبیس رمضان کو نازل ہوا۔ اور قرآن پاک میں یہ بھی ہے:

﴿إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ﴾ ”بیشک ہم نے نازل کیا اسے قدر والی رات میں“

اس سے مراد مشہور لیلۃ القدر ہے ان تمام میں تطبیق کیسے ہے۔

جواب: قرطبی، روح المعانی، کبیر وغیرہ تفاسیر اور شروح احادیث کو دیکھنے سے مختلف جگہ سے عبارات لے کر جمع کرنے سے نتیجہ یہ نکلتا ہے۔ قرآن پاک کی سورۃ اقراء کی ابتدائی آیات مبارکہ پہلے

نازل ہوئیں پھر تین سال کے بعد سورۃ مدثر کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں پھر نزول کا سلسلہ جاری رہا تیس سال ابتداء وحی سے انتہاء وحی تک ہیں اور بیس سال مسلسل وحی کا نزول ہے یہ سوال کی ایک شق کا جواب آ گیا۔ پھر بعض مفسرین کرام نے ”انا انزلناہ فی لیلة مبارکۃ“ سے اور انا انزلناہ فی لیلة القدر“ سے مراد ایک ہی رات لی ہے جسے لیلة القدر کہا جاتا ہے۔

بعض مفسرین کرام نے دونوں راتوں کو علیحدہ علیحدہ کہا ہے اگر علیحدہ علیحدہ راتیں مراد ہوں (جیسا راقم کا بھی موقف ہے) تو صورت مسئلہ یہ ہوگی کہ قرآن پاک ”لوح محفوظ“ سے نازل ہو کر صحف ملائکہ میں پندرہویں شعبان کی رات میں منتقل ہو گیا پھر لیلة القدر جو رمضان میں ہوتی ہے (زیادہ حضرات کا یہی قول ہے) رمضان کی لیلة القدر میں صحف ملائکہ سے نازل ہو کر آسمان دنیا میں بیت العزۃ میں منتقل ہو گیا پھر وہاں سے ابتدا وحی یا تین سال کے بعد مسلسل وحی کا جاری رہنا والا سلسلہ چوبیس رمضان کو شروع ہوا ہو۔ بلکہ بعض حضرات نے اس حدیث سے چوبیس رمضان کی رات کو لیلة القدر کہا ہے تاہم راقم کے نزدیک لیلة القدر کا جس طرح واضح طور پر تعین نہیں فرمایا گیا اسی طرح مبہم رکھنا ہی بہتر ہے۔ مذکورہ بالا بحث سے واضح ہو گیا کہ قرآن پاک میں تعارض نہیں بلکہ سمجھنے کی حد تک کمی ہے جس سے تعارض سمجھ آتا ہے۔

فائدہ: اسی مذکورہ بحث سے واضح ہو گیا کہ قرآن پاک ایک مرتبہ ہی لوح محفوظ سے صحف ملائکہ میں اور ایک مرتبہ ہی صحف ملائکہ سے آسمان دنیا میں منتقل ہوا اسی وجہ سے قرآن پاک کے نزول کے لئے ”انزلناہ“ ذکر کیا کیونکہ انزال کا مطلب ہوتا ہے ایک مرتبہ نازل کرنا۔ لیکن قرآن پاک نبی کریم ﷺ پر آہستہ آہستہ بھی نازل ہوتا رہا اسی وجہ سے فرمایا ﴿نزل علی محمد﴾ اس لئے کہ تنزیل کا مطلب ہوتا ہے آہستہ آہستہ اتارنا۔

قرآن کی وجہ تسمیہ: اس میں دو مذہب ہیں ایک یہ ہے قرآن بروزن فعال ہے اس میں ہمزہ نہیں اور دوسرا مذہب یہ ہے کہ قرآن کا وزن فعلان ہے اس میں ہمزہ پایا گیا ہے پہلے مذہب والے جن کے نزدیک ہمزہ نہیں وہ کہتے ہیں یہ مشتق ہے ”قرن“ سے کہا جاتا ہے ”قرنت الشنی بالشنی“ میں نے ایک چیز کو دوسری چیز سے ملایا۔ قرآن پاک میں سورتیں سورتوں سے اور آیات، آیات سے

اور حروف، حروف سے ملے ہوئے ہیں اس لئے اس کا نام قرآن رکھا گیا۔

اور وجہ یہ ہے کہ اس میں احکام و شرائع بعض بعض کے ساتھ ملے ہوئے ہیں اس لئے اس کا نام قرآن رکھا گیا اور وجہ یہ ہے کہ اس میں وہ دلائل جو اس پر دلالت کر رہے ہیں کہ یہ کلام اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے وہ دلائل آپس میں ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں۔ وہ دلائل یہ ہیں: کہ قرآن پاک فصاحت کی تمام وجوہ پر مشتمل ہے بلکہ قرآن پاک کو دیکھ کر ہی تو علم بیان اور علم معانی معرض وجود میں آئے پھر قرآن پاک عجیب و غریب اسلوب پر مشتمل ہے پھر قرآن پاک میں غیبی خبریں موجود ہیں پھر قرآن پاک کثیر علوم پر مشتمل ہے۔

ابھی تک جو وجہ ذکر کی گئی ہیں ان سے واضح ہوا کہ قرآن میں ہمزہ نہیں یہ ”قرن“ سے بنایا گیا ہے اور اگر اس میں ہمزہ ہو اور نام قرآن ہو تو فراء کے نزدیک اس کا معنی ”قرائن“ سے لیا ہوا ہے یہ معنی قرآن پاک پر اس طرح سچا آتا ہے کہ بعض آیات دوسری بعض آیات کی تصدیق کرتی ہیں اس مقام پر ”قرائن“ کا یہی مطلب ہے۔ رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی بھی اس پر دلالت کر رہا ہے:

﴿وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللَّهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا﴾

”اور اگر یہ اللہ تعالیٰ کے بغیر کسی اور طرف سے ہوتا تو اس میں کثیر اختلاف پاتے“

ہمزہ کی صورت میں یہ مشتق ہوگا ”قراءة“ سے جس کا معنی ہے پڑھنا۔ یہ مصدر مفعول کے معنی میں استعمال ہے قرآن مصدر ہے جیسے رجحان، نقصان، خسران اور غفران مصاد ہیں۔ اسی معنی میں یہ آیت استعمال ہے ﴿إِنَّ قُرْآنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُودًا﴾ بیشک صبح کے قرآن پڑھنے میں فرشتے حاضر ہوتے ہیں۔ اور ہمزہ کی صورت میں اور احتمال یہ ہے کہ یہ مشتق ہو ”قراء“ سے جس کا معنی ہے جمع کرنا۔ قرآن پاک میں اولین و آخرین کے علوم مجتمع ہیں اس لئے اسے قرآن کہا گیا اور یہ کہ تمام مسلمان خواہ وہ مشرق میں ہوں یا مغرب میں شمال میں ہوں یا جنوب میں ان تمام کو قرآن پاک ایمان و اسلام کی ایک سلک (لڑی) میں پرو کر جمع کر دیتا ہے۔

(ازکبر)

قرآن پاک کے فضائل مقدمہ میں اور ﴿وَإِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ﴾ آیت میں بیان ہو چکے ہیں۔
هُدًى لِلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدَىٰ وَالْفُرْقَانِ : ”جو ہدایت ہے لوگوں کے لئے اور وہ

واضح دلیلیں ہیں ہدایت کی اور فرق کرنے والا (حق و باطل میں)۔ راقم نے ترجمہ علامہ رازی رحمہ اللہ کی اس عبارت سے لیا ہے:

”ای انزل وهو هداية للناس الى الحق وهو آيات واضحات
مكشوفات بما يهدي الى الحق ويفرق بين الحق والباطل“

وہ قرآن ہدایت ہے لوگوں کے لئے اور وہ قرآن واضح کھلی دلیلیں ہیں حق کی اور وہ قرآن حق و باطل میں فرق کرنے والا ہے۔

اعتراض: ﴿هُدًى لِّلنَّاسِ﴾ کہنے کے بعد ﴿وَبَيِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدَىٰ﴾ کہنے کا کیا مطلب ہے پہلا جواب: پہلے ذکر فرمایا کہ قرآن پاک لوگوں کے لئے ہدایت ہے اور اس کے بعد اس طرف اشارہ فرمادیا کہ ہدایت کی دو قسمیں ہیں کبھی وہ ہدایت واضح اور جلی ہوتی ہے لوگوں کے لئے۔ اور کبھی ہدایت تو ہوتی ہے لیکن واضح نہیں بلکہ مخفی اور یہ یقینی بات ہے کہ وہ ہدایت افضل ہے جو واضح ہوگی۔ گویا کہ یہ کہا گیا ہے ”هو هدى لانه هو البين من الهدى“ وہ قرآن لوگوں کے لئے ہدایت ہے کیونکہ وہ واضح ہدایت ہے ”والفرقان“ وہ قرآن حق و باطل میں فرق کرنے والا ہے۔

حاصل کلام یہ ہوا کہ پہلے جنس ہدایت کو ذکر کیا گیا پھر اس پر اس کی انواع میں سے ایک نوع کا عطف کیا گیا ہے وہ ہے واضح ہدایت اس کے بعد ﴿وَالْفُرْقَانِ﴾ کو بطور عطف ذکر کیا ایک اور نوع کو ذکر کیا کہ وہ قرآن ایسی ہدایت دیتا ہے کہ حق و باطل میں فرق کر دیتا ہے۔ پھر ﴿بَيِّنَاتٍ﴾ جمع ذکر کر کے یہ مسئلہ سمجھا دیا گیا کہ قرآن پاک کی ہر آیت روشن دلیل ہے یعنی قرآن پاک میں جتنی آیات ہیں وہ تمام ہی واضح دلیلیں ہیں۔

خیال رہے کہ متشابہات بھی واضح دلیلیں ہیں کیونکہ ان پر سقوط اختیار کرنا اپنے علمی گھوڑے نہ دوڑانا بھی ان کے روشن دلیل ہونے کی علامت ہے۔

دوسرا جواب: جس طرح نبی کریم ﷺ کو تمام انبیاء کرام کے اوصاف و کمالات حاصل ہیں اسی طرح قرآن پاک کو تمام آسمانی کتابوں کے کمالات حاصل ہیں۔ یعنی مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے گویا کہ یہ بیان فرمایا:

”ان القرآن مع كونه هدى في نفسه ففيه ايضا هدى من الكتب“

کہ قرآن پاک خود بذاتہ بھی منبع ہدایت ہے اور اس میں پہلی کتابوں کی ہدایت بھی موجود ہے کیونکہ پہلی کتابیں بھی ہدایت اور فرقان ہیں۔ اس لئے کہ توراۃ و انجیل کے متعلق رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَأَنْزَلَ التَّوْرَةَ وَالْإِنْجِيلَ مِنْ قَبْلُ هُدًى لِلنَّاسِ وَالْفُرْقَانَ﴾

”اور رب تعالیٰ نے نازل فرمایا توراۃ و انجیل کو اس سے پہلے (قرآن سے پہلے) جو ہدایت ہیں لوگوں کے لئے اور فرق کرنے والی ہیں حق و باطل میں“

تیسرا جواب: ”ان يحمل الاول على اصول الدين والهدى الثانى على فروع الدين“

رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿هُدًى لِلنَّاسِ﴾ سے یہ واضح فرمایا کہ قرآن پاک میں اصول دین کا ذکر فرمایا جن اصولوں پر چل کر ہی انسان کے اعتقادات درست ہو سکتے ہیں یعنی قرآن پاک میں اعتقادات کا ذکر ہے اور ﴿وَبَيَّنَاتٍ مِّنَ الْهُدَى وَالْفُرْقَانِ﴾ سے یہ ثابت فرمایا کہ قرآن پاک میں فروع دین کا ذکر بھی ہے یعنی احکام جن کا تعلق عملیات سے ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

سبحان اللہ قرآن پاک کی عظمت پر قربان ایک ہی جملہ سے کتنے کتنے عظیم معانی بیان کر دئے گئے۔
فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ : ”تو جو شخص حاضر ہو تم میں سے اس مہینہ میں تو روزے رکھے اس کے“ ”شہد، حضر، او الشہود ای الحضور“ شہود کا معنی ہے حضور اور شہد کا معنی حاضر ہوا۔

راقم کے نزدیک مطلب یہ ہے کہ جو شخص حاضر ہو تم میں اس مہینہ میں اہلیت کے ساتھ تو وہ اس مہینہ کے روزے رکھے مسافر کو روزہ رکھنے کی اہلیت حاصل ہے تو وہ روزہ رکھے اگر روزہ رکھنے کی اہلیت نہیں تو وہ روزہ نہ رکھے جب مقیم ہو جائے تو روزے قضا کر لے۔

مریض کو روزہ رکھنے کی اہلیت حاصل ہو یعنی مرض کے بڑھنے، مرض کے زیادہ ہونے اور مرض سے ہلاک ہونے کا کوئی خطرہ نہ ہو تو وہ روزہ رکھے اگر روزہ رکھنے کی اہلیت نہیں تو روزہ نہ رکھے بعد میں صحت یاب ہو تو روزے قضا کر لے۔ بچے اور مجنوں (پاگل) میں روزہ رکھنے کی اہلیت ہی نہیں پائی

جاتی اس لئے ان پر روزے فرض نہیں۔ علامہ رازی رحمہ فرماتے ہیں۔ ”فمن شهد منكم البلد او بیتہ بمعنی لم یکن مسافرا“ کہ آیہ کریمہ ﴿فَمَنْ شَهِدَ﴾ کا ایک مطلب یہ ہے کہ جو شخص تم میں سے اس مہینہ میں اپنے گھریا اپنے شہر میں حاضر ہو مسافر نہ ہو وہ اس مہینہ کے مکمل روزے رکھے۔ اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ ”من شاهد الشہر بعقلہ و معرفتہ فلیصمہ“ جو شخص اس مہینہ میں اپنی عقل اور معرفت سے حاضر ہو وہ پورا مہینہ روزے رکھیں بچہ اور مجنون کامل عقل و معرفت نہیں رکھتے اس لئے ان پر روزے فرض نہیں۔ (بکیر)

جواب: کبھی جزاء شرط کے مجموعہ پر مرتب ہوتی ہے اور کبھی شرط کے اجزاء پر مرتب ہوتی ہے، اس مقام میں اجزاء پر حکم مرتب ہے، مطلب یہ ہے ”من شهد جزاً من اجزاء الشہر فلیصم“ کہ جو شخص رمضان کا جو دن پالے اس دن روزہ رکھے اگر کل دن رمضان کے پالے تو تمام مہینہ روزے رکھے۔

(ماہود از کبیر)

طلباء کرام توجہ فرمائیں: ”من“ شرطیہ ہے اور ”فلیصمہ“ جزاء ہے قانون یہ ہے کہ شرط کے پائے جانے پر جزا مرتب ہوتی ہے جب ”شہر“ سے مراد ﴿شَہْرُ رَمَضانَ﴾ ”ماہ رمضان“ ہے تو یہاں شرط کے پائے جانے پر جزاء کا مرتب ہونا کیسے صحیح ہوا؟ کیونکہ مطلب تو یہ بنے گا کہ جب رمضان کا مہینہ گزر جائے تو روزے رکھو، یہ کیسے صحیح ہے؟

جواب: کبھی جزاء شرط کے مجموعہ پر مرتب ہوتی ہے اور کبھی شرط کچھ اجزاء پر مرتب ہوتی ہے، اس مقام میں اجزاء پر حکم مرتب ہے، مطلب یہ ہے ”من شهد جزاً من اجزاء الشہر فلیصم“ کہ جو شخص رمضان کا جو دن پالے اس دن روزہ رکھے اگر کل دن رمضان کے پالے تو تمام مہینہ روزے رکھے۔

(ماہود از کبیر)

ماہ رمضان کو پالینے کا کیا مطلب ہے؟ رمضان شریف کو پالینے کا مطلب یہ ہے کہ یا خود چاند دیکھ لے یا چاند کی شہادت اسے مل جائے تو اس نے رمضان کو پالیا ہے وہ ماہ رمضان کے روزے رکھے۔ رمضان کی چاند کی شہادت: اگر شعبان کے تیس دن مکمل ہو جائیں تو مطلع صاف ہو یا بادل چھائے ہوئے ہوں ہر حال میں بغیر کسی شہادت یا خبر کے روزہ رکھنا فرض ہوگا اس لئے کہ پہلا مہینہ تیس

دن کے مکمل ہونے پر مکمل ہو چکا ہے۔ اگر ایک شخص نے اکیلے رمضان کا چاند دیکھا حاکم وقت نے اس کی شہادت کو قبول نہیں کیا تو وہ شخص جس نے چاند دیکھا وہ روزہ رکھے کیونکہ اسے اس دن رمضان ہونے میں کوئی شک نہیں۔ لیکن اگر اس نے روزہ رکھ کر توڑ دیا تو اس پر کفارہ لازم نہیں کیونکہ حاکم نے جب اس کی شہادت کو رد کر دیا تو اس کے حق میں بھی حکم قطعی نہ رہا۔ اگر ایک مسلمان شخص رمضان کے چاند دیکھنے کی خبر دے جب کہ آسمان ابر آلود ہو دھند ہو، گرد و غبار چھایا ہوا ہو تو اس ایک مسلمان کی خبر کو قبول کر لیا جائے روزہ رکھنے کا حکم دیا جائے خواہ وہ خبر دینے والا نیک ہو یا گنہگار ہو۔

”قال ابن عباس جاء اعرابي الى النبی ﷺ فقال انی رأیت الهلال
یعنی هلال رمضان فقال اتشهد ان لا اله الا الله قال نعم قال اتشهد ان
محمد رسول الله قال نعم قال يا بلال اذن فی الناس فلیصوموا غدا“

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں ایک اعرابی نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے کہا بیشک میں نے رمضان کا چاند دیکھا ہے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا تم شہادت دیتے ہو کہ اللہ کے بغیر کوئی معبود نہیں؟ انہوں نے کہا ہاں آپ نے فرمایا کیا تم شہادت دیتے ہو محمد اللہ کے رسول ہیں انہوں نے کہا ہاں۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت بلال کو کہا لوگوں میں اعلان کر دو کہ کل روزہ رکھیں۔

اس حدیث پاک سے یہ مسئلہ ثابت ہو گیا کہ ایک مسلمان کی خبر رمضان کے چاند کے متعلق قبول ہے جب کہ آسمان ابر آلود ہو۔ ہاں البتہ یہ بات یاد رہے کہ وہ شخص جو دیہات سے آئے تھے وہ اس وقت آئے تھے جب کہ روزے کی نیت کا وقت ختم ہو چکا تھا۔ یعنی ظہر کا وقت ہو چکا تھا۔

اگر آسمان صاف ہے ابر آلود نہیں تو رمضان کے چاند دیکھنے کی شہادت اتنے لوگ دیں جن پر اعتبار آ جائے کہ یہ سچے ہوں گے جھوٹ نہیں بول رہے تو ان کی شہادت قبول ہوگی۔
عید الفطر کے چاند کی شہادت: اگر رمضان کے تیس دن مکمل ہو جائیں تو آسمان صاف ہو یا ابر آلود ہو چاند دیکھنے کی کوئی خبر دے یا نہ دے عید الفطر ثابت ہو جائے گی۔
اگر ایک شخص کہے کہ میں نے چاند دیکھا ہے تو اس کی شہادت قبول نہیں کی جائے گی خواہ آسمان

صاف ہو یا ابرا لود ہو بلکہ وہ شخص جو کہہ رہا ہے کہ میں نے چاند دیکھا ہے اسے بھی روزہ رکھنا پڑے گا کیونکہ اسے کے چاند دیکھنے کی شہادت جب رد ہوگئی تو اس کے چاند دیکھنے میں اشتباہ پڑ گیا۔ اگر آسمان ابرا لود ہو تو عید الفطر کے چاند دیکھنے کی شہادت دو مسلمان آزاد مردوں کی قبول ہوگی یا ایک مسلمان آزاد مرد اور دو مسلمان آزاد عورتوں کی گواہی قبول ہوگی۔ اگر آسمان صاف ہو تو عید الفطر کے چاند دیکھنے کی اتنے آدمیوں کی شہادت قبول ہوگی جن پر اعتبار آ جائے کہ یہ سچے ہیں اتنے لوگ جھوٹ پر متفق نہیں ہو سکتے۔

فائدہ: عید الاضحیٰ کا چاند دیکھنے کا حکم وہی ہے جو عید الفطر کا ہے بلکہ رمضان کے علاوہ تمام مہینوں کا حکم یہی ہے۔
(نور الایضاح مع ذریعۃ النجاح)

رویۃ ہلال: ”چاند دیکھنا“ چاند دیکھنے کے متعلق احادیث اور فقہی کتب سے چند مسائل ذکر کئے جاتے ہیں۔

☆ ”عن ابن عمر قال قال رسول الله ﷺ لا تصوموا حتی تروا الهلال ولا تفطروا حتی تروه فان غم علیکم فاقد رواله وفی روایة قال الشهر تسع وعشرون لیلة فلا تصوموا حتی تروه فان غم علیکم فاکملوا العدة ثلاثین“ (بخاری و مسلم)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا روزہ نہ رکھو یہاں تک کہ چاند دیکھ لو اور فطر نہ کرو (یعنی عید الفطر نہ کرو) یہاں تک کہ چاند دیکھ لو۔ اگر مطلع ابرا لود ہو تو اس کی قدر مکمل کرو۔ ایک روایت میں (وضاحت سے بیان کیا گیا) مہینہ انتیس راتوں کا ہے روزہ نہ رکھو یہاں تک کہ چاند دیکھ لو اگر آسمان ابرا لود ہو جائے تو تیس دن مکمل کرو۔ (مشکوٰۃ باب روایۃ الهلال)

وضاحت حدیث: ”لا تصوموا حتی تروا الهلال“ روزہ نہ رکھو یہاں تک کہ چاند دیکھ لو، حدیث پاک کے ان الفاظ کا یہ مطلب نہیں کہ ہر شخص چاند دیکھ لے جو دیکھے وہ روزے رکھے اور جو نہ دیکھے وہ روزے نہ رکھے بلکہ مطلب یہ ہے ”حتی یثبت عندکم روایۃ ہلال رمضان“ یہاں تک کہ تمہارے نزدیک رمضان کا چاند دیکھنا ثابت ہو جائے خواہ خود دیکھ لو یا شہادت مل جائے کہ چاند نظر آ گیا تو چاند کا دیکھنا ثابت ہو گیا۔

ولا تفطروه حتی تروه : اور فطر نہ کرو (عید الفطر نہ کرو) یہاں تک کہ چاند دیکھ لو، حدیث پاک کے ان الفاظ مبارکہ کا بھی یہی مطلب ہے جو ابھی رمضان کے چاند کے متعلق بیان کر دیا گیا کہ چاند کا ثبوت مل جائے خواہ خود دیکھنے سے یا چاند کی خبر ملنے سے۔

فان غم علیکم فاقدر والہ : ”غم“ کا معنی ہے ”عطی الہلال بالغیم“ بادلوں کی وجہ سے چاند چھپ جائے دکھائی نہ دے ”فاقدر والہ“ وال کے نیچے کسرہ ہے ضمہ کا قول مغرب (کتاب کا نام) میں رد کیا گیا ہے معنی اندازہ لگاؤ ”فان غم علیکم فاقدر والہ“ اور دوسری روایت میں الفاظ مبارکہ ”فان غم علیکم الہلال فاکملوا العدة ثلاثین“ کا مطلب ایک ہی ہے کہ اگر آسمان پر بادل وغیرہ چھائے ہوئے ہوں چاند تم سے پوشیدہ ہو جائے دکھائی نہ دے یعنی چاند کے ثبوت کی کوئی شہادت بھی نہ ملے تو تیس دن مکمل کرو۔ یعنی اگر شعبان کا مہینہ ہے تو تیس دن مکمل کر کے روزے رکھو اور اگر رمضان کا مہینہ ہے تو تیس دن مکمل کر کے عید الفطر کرو۔

تنبیہ : عام طور پر ہم اپنے محاورات اور کلام کرنے کے انداز کو دیکھیں تو بات واضح ہو جائے کہ ایک ہی مطلب کو بیان کرنے کے لئے ہم مختلف الفاظ استعمال کرتے ہیں آج کوئی اور لفظ بول دیے کل کوئی اور لیکن مقصد کلام کا آج بھی وہی ہے جو کل تھا اگرچہ الفاظ وہ نہیں جو کل تھے۔ ہر زبان کا یہی طریقہ تھا اسی طرف تکلم (کلام کے انداز) پر ایک حدیث شریف ”فاقدر والہ“ اور دوسری حدیث شریف میں ”فاکملوا العدة“ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں معنی دونوں کا ایک ہے۔ آئیے دیکھئے محققین اہل علم نے ”فاقدر والہ“ کے معانی کیا بیان کئے ہیں۔

ایک معنی یہ بیان کیا گیا ”اجعلوا الشهر ثلاثین یوما“ اگر چاند بادل میں چھپ جائے دکھائی نہ دے تو مہینہ تیس دنوں کا بناؤ۔ دوسرا معنی یہ بیان کیا گیا ہے:

”قال الزرکشی یعنی حققوا مقادیر ایام شعبان حتی تکملوه ثلاثین یوما“

علامہ زرکشی رحمہ اللہ نے فرمایا اس کا معنی یہ ہے کہ شعبان کے دنوں کی مقدار کو ثابت کرو یہاں تک کہ تیس دن مکمل کرو۔ ”وفی شرح السنة معناه التقدير باكمال العدد“ تیسرا معنی شرح السنة میں بیان کیا گیا ہے کہ ”فاقدر والہ“ کا معنی یہ ہے کہ مہینہ کے (تیس دن) دنوں کی تعداد مکمل کرنے کا تحقیقی

اندازہ کرو۔ جتنے معانی بیان کئے گئے ہیں ان میں اگرچہ الفاظ مختلف ہیں لیکن مقصد سب نے ایک ہی بیان کیا ہے۔

غلط فہمی: جب محققین اہل علم نے جو معانی ذکر فرمائے ان کو دیکھا جائے تو بعض حضرات جو ”فاقدروالہ“ کے الفاظ سے غلط فہمی کا شکار ہوئے ہیں ان کی غلط فہمی آشکارا ہو جائے گی ان کی غلطی کی وجہ سے دوسرے بھی غلطی کا شکار نہ ہو جائیں۔ ہر زمانہ میں جن لوگوں کے ذہنوں پر فلسفہ اور سائنس سوار ہے وہ راہ راست سے بھٹکتے رہے فلسفہ نے بعض ان لوگوں کو بھی راہ راست سے بھٹکا دیا جو دین کا علم رکھتے تھے جو دینی علوم سے بھی خالی ہیں ان کو فلسفہ اگر بھٹکا کر دین سے برگشتہ کر دے تو کوئی مقام تعجب نہیں۔

آئیے فلسفہ کی زد میں آنے والوں نے ”فاقدروالہ“ کا کیا معنی کیا ہے ذرا دیکھئے:

”ذهب بعض الی ان المراد به التقدير بحساب القمر فی المنازل ای

اقدروا منازل القمر فانه يدلکم علی ان الشهر تسع وعشرون او ثلاثون“

بعض حضرات نے کہانی کریم ﷺ کے ارشاد ”فاقدروالہ“ کا مطلب یہ ہے کہ چاند کے حساب سے اندازہ کرو یعنی چاند کی منزلوں سے حساب کرو تو تمہیں پتہ چل جائے گا کہ مہینہ انتیس دن کا ہے یا تیس دن کا۔

غلط فہمی کا ازالہ: کسی مہینہ کی ابتدائی تاریخ یا انتہائی تاریخ کو ستاروں کا حساب لگانے والے علم ہیئت والوں کا اعتبار نہیں کیا جائے گا ”والاجماع علی عدم الاعتداد بقول المنجمین ولو اتفقوا علی انه یری“ کیونکہ اس مسئلہ پر محققین اہل علم کا اجماع ہے کہ صرف چاند کی منازل اور ستاروں کی منازل کا حساب کرنے والوں پر اعتبار نہیں کیا جائے گا اگرچہ وہ سب اس پر اتفاق بھی کر لیں کہ آج چاند دکھائی دینے کی تاریخ ہے۔ اس لئے کہ رب تعالیٰ نے صرف حساب دانوں کو ”خیرامۃ“ سے خطاب نہیں کیا۔ بلکہ نبی کریم ﷺ کی تمام امت کو فرمایا ﴿كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ﴾ تم بہتر امت ہو ان تم امتوں میں سے جو لوگوں میں ظاہر ہوئیں۔ پھر تمام امت کو ہی یہ حکم فرمایا:

﴿فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ﴾

”جو شخص حاضر ہو تم میں سے اس مہینہ میں تو وہ روزے رکھے“

یعنی جو شخص تم میں سے اس مہینہ کو چاند دیکھنے سے پالے یا شہادت سے پالے تو وہ روزے رکھے۔ اس آیت کریمہ میں صرف حساب لگانے والوں کو حکم نہیں دیا۔ پھر رسول اللہ ﷺ کے ارشادات گرامی بھی تمام امت کو ہیں یہی حدیث پاک جسے ذکر کیا جا رہا ہے اس میں بھی حکم عام ہے اور احادیث کو بھی دیکھئے جن میں حکم عام ہے:

☆ "عن ابی ہریرۃ قال رسول اللہ ﷺ صوموا لرؤیتہ وافطروا لرؤیتہ فان غم علیکم فاکملوا عدۃ شعبان ثلاثین بخاری ومسلم" (مشکوٰۃ باب رزیۃ الہلال)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا روزہ رکھو چاند دیکھ کر اور افطار کرو چاند دیکھ کر پھر اگر بادل میں چاند آ کر تم سے چھپ جائے تو تیس دنوں شعبان کی گنتی مکمل کرو (پھر رمضان کا روزہ رکھو) حدیث شریف میں حکم عام ہے صرف حساب لگانے والوں کو نہیں پھر آپ نے واضح طور پر دیکھنے کا حکم فرمایا حساب لگانے کا نہیں:

"قال ابن الہمام وعند ابی داؤد والترمذی حسنہ ، فان حال بینکم وبینہ سبحان فاکملوا العدۃ ثلاثین ولا تستقبلوا الشہرا استقبالا"

ابن ہمام فرماتے ہیں ابو داؤد اور ترمذی نے حدیث ذکر فرمائی اور ترمذی نے اسے حسن کہا ہے وہ حدیث یہ ہے اگر تمہارے اور چاند کے درمیان بادل حائل ہو جائے تو تیس دنوں کی تعداد مکمل کرو اور مہینے کا استقبال نہ کرو۔ یعنی جلدی جلدی بغیر چاند دیکھنے بغیر شہادت کے اتیس دنوں پر پہلے مہینہ کو ختم کر کے نئے کا استقبال نہ کرو۔

احادیث کے مختلف الفاظ کا مطلب ایک ہے: ابھی جو حدیث بیان کی یا جو پہلے بیان کی گئیں ہیں سب کا مطلب یہی ہے کہ چاند نہ دکھائی دینے پر اور شہادت نہ ملنے پر تیس دن مکمل کرو:

☆ ایک روایت میں ہے: "فان حال بینکم وبینہ سبحان فاکملوا العدۃ ثلاثین"

☆ ایک اور روایت میں ہے: "فان اغمی علیکم فاکملوا عدۃ شعبان ثلاثین یوما ثم صوموا"

☆ ایک اور روایت میں ہے: "فان اغمی علیکم الشہر فعدوا ثلاثین ثم صوموا"

☆ ایک اور روایت میں ہے: "کان ﷺ یتحفظ من شعبان مالا یتحفظ من غیرہ ثم

بصوم لرؤية رمضان فان غم عليه عد ثلاثين يوما ثم صام

ان تمام روایات کے متعلق ملا علی قاری رحمہ اللہ بیان فرماتے ہیں ”وہذہ روایات صحیحہ لا تقبل التاویل“ یہ سب روایات صحیح ہیں ان میں تاویل کی کوئی گنجائش نہیں۔ سب کا مطلب یہی ہے کہ چاند دیکھ کر روزہ رکھو، چاند دیکھ کر فطر (عید الفطر) کرو۔ اگر چاند بادل میں آجائے دکھائی نہ دے تو تیس دن مکمل کرو جلد بازی سے نئے مہینہ کو نہ شروع کرلو۔

مندرجہ بالا بحث سے ایک اور قول رد ہو گیا: فلسفہ کی زد میں آنے والے اہل علم نے ایک اور ٹھوکر کھائی تھی اس کی حیثیت بھی پانی کے ایک بلبہ سے زائد نہ رہی وہ قول یہ ہے:

”قال ابن سريج فاقدروا خطاب عنه خصه الله بهذا العلم وقوله

فاكملوا العدة خطاب للعامة“

ابن سرج نے کہانی کریم ﷺ کا ارشاد ”فاقدروا“ علم ہیئت والوں کو خطاب ہے کہ وہ حساب لگائیں اور ”فاكملوا العدة“ کا خطاب عوام کو ہے کہ وہ تیس دن مکمل کریں۔ یہ قول سرے سے باطل ہے کیونکہ شرع میں احکام سب کے لئے برابر ہیں عوام و خواص کا کوئی فرق نہیں۔ بلکہ راقم کے نزدیک تو خواص ہی وہ ہیں جو مصطفیٰ کریم ﷺ کے ارشاد پر سر جھکا دیں وہ خواص کیسے جو ارشادات نبوی کی غلط تاویلیں کر کے عقلی گھوڑے دوڑائیں۔ ایک اور حدیث پاک دیکھئے جس میں میں بہت واضح کر دیا گیا کہ مہینہ انتیس دن کا یا تیس دن کا ہوتا ہے۔

☆ ”وعن ابن عمر قال قال رسول الله ﷺ انا امة امية لا نكتب ولا نحسب الشهر

هكذا وهكذا وهكذا وعقد الا بهام في الثالثة ثم قال الشهر هكذا وهكذا وهكذا

يعني تمام الثلاثين يعني مرة تسعا وعشرين ومرة ثلاثين“ (بخاری و مسلم)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہم امی لوگ ہیں حساب و کتاب نہیں جانتے (تین دفعہ دونوں ہاتھوں کو اٹھا کر انگلیاں کھول کر فرمایا) مہینہ اس طرح ہے اور اس طرح ہے پھر آپ نے تیسری مرتبہ ایک ہاتھ کے انگوٹھے کو بند کر کے فرمایا مہینہ اس طرح ہے اور اس طرح اور اس طرح اس کے بعد راوی نے وضاحت کر دی یعنی پہلی مرتبہ جو ارشاد فرمایا اس سے تیس دن مکمل مراد لئے۔

راوی نے پھر مزید وضاحت کر دی کہ نبی کریم ﷺ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ مہینہ یا تو انتیس دنوں کا ہوگا کیونکہ دوسری مرتبہ ایک انگھوٹھے کو بند کرنے کا یہ مطلب ہی تھا اور آپ نے فرمایا کہ مہینہ کبھی تیس دنوں کا ہوگا کیونکہ پہلی مرتبہ تینوں دفعہ دونوں ہاتھ کھلے رکھ کر یہی مسئلہ سمجھایا۔

(مشکوٰۃ باب رؤیۃ الهلال)

حدیث پاک سے مسئلہ روز روشن کی طرح واضح ہو گیا کہ آپ نے قیامت تک آنے والی اپنی امت کے متعلق فرمادیا کہ میری امت میں کئی لوگ وہ ہوں گے جو حساب و کتاب ہی نہیں جانتے ہوں گے۔ ان کو چاند کی منازل کے حساب کے بھنور میں نہیں پھنسا یا جاسکتا۔ وہ چاند دیکھ کر یا شہادت ملنے پر چاند کی تاریخوں کا تعین کر لیا کریں انتیس کو چاند نظر آ جائے تو ٹھیک ہے اگر مطلع صاف ہونے پر یا ابر آلود ہونے پر انتیس کو چاند نظر نہ آئے تو تیس دن مکمل کر لیں۔

”فالمعنی ان العمل علی ما یعتادہ المنجمون لیس من ہدینا وسنتنا بل

علمنا یتعلق برؤیۃ الهلال فاننا نراہ مرة تسعا وعشرین ومرة ثلاثین“

حدیث پاک کا مطلب یہ ہے کہ چاند کی منازل کے حساب سے چاند کی تاریخ متعین کرنے کی نہ ہی ہم نے ہدایت دی اور نہ ہی یہ ہماری سنت اور ہمارا طریقہ ہے بلکہ ہم تو یہ بتا رہے ہیں کہ چاند دیکھ کر تاریخ متعین کرنا۔ مہینہ کبھی انتیس دنوں کا ہوگا اور کبھی تیس دنوں کا۔

قال اکثر ائمتنا لا یعمل بحساب المنجم وهو من یری ان اول الشهر

طلوع النجم الفلانی“

اس کا کبھی اعتبار نہیں کیا جائے گا کہ چاند اور ستاروں کی منازل کا حساب کرنے والوں کی بات کو مان لیا جائے کہ فلاں دن چاند نظر آنے کی تاریخ ہے اس حساب کا کوئی اعتبار نہیں اعتبار ہے تو رسول اللہ ﷺ کے ارشاد کا ہے۔

انتیس کا چاند نظر آنے پر ثواب میں کوئی کمی نہیں:

”عن ابی بکرۃ قال قال رسول اللہ ﷺ شہرا عید لا ینقصان رمضان

وذو الحجۃ“ (بخاری ومسلم مشکوٰۃ باب رؤیۃ الهلال)

حضرت ابو بکرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا عید کے دنوں مہینے رمضان اور ذوالحجہ میں کوئی کمی نہیں کرتے ” لا ینقصان ثوابا ولا نقصا عددا “ یعنی رمضان کے انیس دن مکمل ہونے پر اگر عید الفطر کا چاند نظر آ جائے تو باوجود دنوں کی تعداد کی کمی کے رمضان کے ثواب میں کمی نہیں آئے گی کیونکہ یہ رعایت خود رب تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے حاصل ہے۔

اسی طرح ذی الحج کی انیس تاریخ کو چاند نظر آ جائے تو ذی الحج کے ثواب اور خیر و برکت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوگی۔ خیال رہے کہ حدیث شریف میں ذوالحج کو عید کا مہینہ کہنا تو واضح ہے کہ اس میں عید الاضحیٰ ہوتی ہے لیکن رمضان کو عید کا مہینہ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ عید اس کے مجاور (متصل) ہوتی ہے تو مجازاً عید کا مہینہ کہہ لیا گیا۔

(مرقاۃ ج ۲ ص ۲۲۵)

تنبیہ: یہ تصور باطل ہے کہ رمضان ہر سال ضرور ہی تیس دنوں کا ہو بات چاند دیکھنے کی ہے۔

”فصح عن جماعة من الصحابة صمنا مع رسول الله ﷺ تسعا

وعشرين اكثر مما صمنا معه ثلاثين“

صحابہ کرام کی ایک جماعت سے ثابت ہے کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ کی معیت میں انیس روزے زیادہ رکھے نسبت تیس کے۔

”ومن صام قال بعض الحفاظ صام رسول الله ﷺ تسع رمضان

منها رمضان فقط ثلاثون كذا في شرح ابن حجر“

اسی وجہ سے بعض حفاظ حدیث نے کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نور رمضانوں کے روزے رکھے جن میں صرف دو رمضان تیس دنوں کے آئے۔

شک کے دن روزہ رکھنے کی ممانعت:

”عن ابی ہریرۃ قال قال رسول الله ﷺ لا يتقدم من احدكم رمضان بصوم

يوم او يومين الا ان يكون رجل كان يصوم يوما فليصم ذلك اليوم“

(متفق علیہ، مشکوٰۃ باب رؤیۃ الهلال)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سے کوئی ایک بھی

رمضان سے ایک دن یا دو دن پہلے روزہ نہ رکھے ہاں مگر وہ شخص جو پہلے اس دن رکھتا تھا تو رمضان سے پہلے ایک دن وہی دن تھا تو روزہ رکھ لے۔

☆ "عن عمار بن یاسر قال من صام اليوم الذي يشك فيه فقد عصى ابا القاسم عليه السلام"

(ابو داؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، دارمی)

حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں جس نے شک کے دن روزہ رکھا اس نے رسول اللہ ﷺ کی نافرمانی کی۔

ہاں البتہ یہ ذہن میں رہے کہ چاند نظر آنے اور چاند کی شہادت کے بغیر رمضان کی نیت کرنا یا یہ نیت کرنا کہ اگر رمضان کا روزہ ہوا تو میرا روزہ رمضان کا ہوگا اور اگر رمضان نہ ہوا تو میرا روزہ کوئی اور ہوگا یہ منع ہے۔ ہاں اگر کسی نے بغیر شک کے خالص نفلی روزہ کی نیت کر لی تو یہ جائز ہے اس میں کسی قسم کی کوئی وعید نہیں۔ اسی طرح اگر اس دن قضاء یا نذر کا روزہ رکھے تو جائز ہے۔

چاند کے بڑا ہونے یا چھوٹا ہونے کو دیکھ کر شک نہ کرے:

"عن ابی البختری قال خرجنا للعمرة فلما نزلنا ببطن نخلة تراءى لنا الهلال فقال بعض القوم هو ابن ثلاث وقال بعض القوم هو ابن ليلتين فلقينا ابن عباس فقلنا انا رأينا الهلال فقال بعض القوم هو ابن ثلاث وقال بعض القوم هو ابن ليلتين فقال اى ليلة رأيتموه قلنا ليلة كذا وكذا فقال ان رسول الله ﷺ مدة للرؤية فهو ليلة رأيتموه وفى رواية عنه قال اهللنا رمضان ونحن بذات عرق فارسلنا رجلا الى ابن عباس يسأله فقال ابن عباس قال رسول الله ﷺ ان الله تعالى قد امدده لرؤيته فان اغمى عليكم فأكملوا العدة"

(رواه مسلم، مشکوة باب رؤية الهلال)

ابو البختری کہتے ہیں ہم عمرہ کیلئے نکلے جب ہم بطن نخلہ میں پہنچے تو ہم نے چاند دیکھا بعض لوگ کہنے لگے کہ چاند تین راتوں کا ہے بعض کہنے لگے دو راتوں کا ہے تو ہم حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کو ملے ہم نے کہا بیشک ہم نے چاند دیکھا ہے تو ہم میں سے بعض نے کہا ہے کہ چاند تین راتوں کا ہے اور بعض نے کہا دو راتوں کا ہے تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے پوچھا تم نے کس رات کو چاند دیکھا؟ ہم

نے کہا ہم نے فلاں رات کو چاند دیکھا تو آپ نے فرمایا وہی رات ہے چاند دیکھنے کی کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے چاند دیکھنے کی رات کو ہی دیکھنے کی مدت قرار دیا۔

اور ایک روایت ابوالبختری سے ہی مروی ہے کہ ہم نے ذات عرق میں رمضان کا چاند دیکھا تو ہم نے ایک شخص کو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس بھیجا کہ ان سے چاند کے متعلق سوال کرو۔ تو انہوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے چاند کی مدت کو تمہارے دیکھنے کی مدت تک بڑھا دیا ہے اگر مطلع ابراؤد ہو تو گنتی (تیس دن) مکمل کرو۔

واضح ہوا کہ چاند اسی تاریخ کو دیکھ لیا یا شہادت مل گئی تو روزہ رکھ لیا جائے اور عید کر لی جائے اگر ابراؤد ہو چاند کے دیکھنے کی کوئی شہادت نہ ملے تو تیس دن مکمل کئے جائیں بعد میں چاند دیکھ کر شک میں پڑنا منع ہے کہ یہ کہے کہ یہ چاند تو بڑا ہے پچھلی تاریخ کا ہونا چاہیے یہ کہنا منع کیوں ہے؟ اس لئے کہ جب نبی کریم ﷺ نے چاند کا اعتبار دیکھنے سے کر دیا ہے تو جب دیکھے گا وہی تاریخ معتبر ہوگی۔

مقام توجہ: ایک روایت میں ذات عرق کا ذکر ہے اور ایک روایت میں بطن نخلہ کا ذکر ہے کیا ایک ہی واقعہ ہے یا دو واقعات ہیں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ایک ہی واقعہ ہے کہ چاند انہوں نے مقام ذات عرق میں دیکھا اور ان کا نزاع ہوا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس آدمی بھیجا اور ان کا جواب دینا بطن نخلہ میں واقع ہوا۔

مسئلہ: حدیث شریف میں ”لیلۃ رأیتموہ“ مذکور ہے (جس رات کو تم چاند دیکھو وہی مدت دیکھنے کی ہوگی) اس سے واضح ہوا کہ دن کو چاند دیکھنے کا کوئی اعتبار نہیں۔ اگر کسی شخص نے تیس شعبان کو دن کو چاند دیکھا خواہ زوال سے پہلے یا بعد تو بقیہ دن کھانے پینے سے رکنے کی ضرورت نہیں یعنی وہ دن رمضان کا نہیں۔ اور اگر تیس رمضان کو دن کو چاند دیکھ لیا تو اسی وقت افطار کرنا جائز نہیں بلکہ غروب آفتاب تک روزہ مکمل کرنا ضروری ہوگا۔ (مرقاۃ ج ۴ ص ۲۵۰)

اختلاف مطالع کا مسئلہ: ایک جگہ چاند نظر آئے تو کیا دوسری جگہ روزہ رکھنا لازم ہے یا نہیں؟ اسی طرح ایک جگہ چاند نظر آئے تو دوسری جگہ عید ہو سکتی ہے یا نہیں۔ اس مسئلہ میں فقہاء کرام کی مختلف عبارات ہیں جن کی وجہ سے عام لوگ غلطی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ مسئلہ میں

اختلاف نہیں صرف سمجھنے کی ضرورت ہے۔

فقہاء کرام کی ایک عبارت یہ ہے ”ولا عبرة باختلاف المطالع“ اختلاف مطالع کا کوئی اعتبار نہیں اس سے پتہ چلتا ہے کہ دنیا کے کسی ایک شہر میں چاند نظر آ جائے تو تمام دنیا کے شہروں میں روزہ رکھنا ضروری ہوگا۔

اور ایک عبارت فقہاء کرام کی یہ ہے ”وقیل يعتبر“ بعض حضرات نے کہا اختلاف مطالع کا اعتبار ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ ہر شہر میں چاند دیکھنا ضروری ہے ایک شہر میں چاند دیکھنے سے دوسرے شہر میں روزہ رکھنا یا عید کرنا درست نہیں۔ لیکن حقیقت میں اختلاف نہیں بلکہ دونوں قولوں میں تطبیق یہ ہے ”وان كان بينهما تقارب بحيث لا تختلف المطالع يجب وان كان بحيث تختلف لا يجب“ اگر ایک شہر اور دوسرے شہر میں زیادہ دوری نہ ہو بلکہ وقت کا معمولی فرق ہو تو ایک شہر میں چاند نظر آ جائے تو دوسرے میں اس کا حکم ثابت ہو جائے گا۔

یہ بات نہ بھولیں کہ انتیس کا چاند صرف چپاس منٹ نظر آ سکتا ہے وہ بھی ابتدائی پانچ منٹ نظر آنا مشکل ہوتا ہے۔ اس لئے جن دو شہروں میں پینتالیس منٹ یا اس سے کم وقت کی تقدیم و تاخیر ہو تو وہ معتبر ہوگا کہ ایک شہر میں چاند نظر آئے تو دوسرے شہر میں اس کا اعتبار کر لیا جائے۔ لیکن اگر اس سے زائد وقت کا فرق ہو تو ایک شہر میں چاند دیکھنے سے دوسرے شہر میں روزہ رکھنا لازم نہیں ہوگا اور نہ ہی عید کرنا جائز ہوگی۔ یعنی جب دونوں شہروں کے وقت میں پینتالیس منٹ سے زیادہ تقدیم و تاخیر ہو تو اس کا حکم یہ ہے:

”والاشبه ان يعتبر لان كل قوم مخاطبون بما عندهم وانفصال الهلال عن شعاع الشمس يختلف باختلاف الاقطار كما ان دخول الوقت وخروجه يختلف باختلاف الاقطار حتى اذا زالت الشمس في المشرق لا يلزم منه ان نزول في المغرب وكذا طلوع الفجر وغروب الشمس بل كلما تحركت الشمس درجة فتلک طلوع الفجر لقوم وطلوع الشمس لآخرين وغروب لبعض ونصف ليل لغيرهم“

کہ زیادہ تر یہی ہے کہ ہر قوم کو خطاب ان کے مطابق ہوگا کیونکہ چاند کا سورج کی شعاعوں سے جدا ہونا مختلف قطروں (مراد علاقہ اور جگہ ہے) کے لحاظ پر مختلف ہوتا ہے جس طرح وقت کا نکلنا اور داخل ہونا مختلف ہوتا ہے یہاں تک کہ مشرق میں جب سورج ڈھل جائے تو لازم نہیں کہ مغرب میں بھی ڈھل جائے۔ اسی طرح سورج کے طلوع ہونے اور غروب ہونے کا بھی یہی حکم ہے ایک جگہ سورج نکل کر ایک درجہ بلند ہو کر حرکت کر رہا ہوتا ہے اور اسی وقت دوسری جگہ فجر طلوع ہو رہی ہوتی ہے اور اسی وقت دوسری جگہ سورج نکل رہا ہوتا ہے اور دوسری جگہ غروب ہو رہا ہوتا اور کہیں آدھی رات ہو جاتی ہے۔

واضح ہوا کہ ایک علاقہ میں جس وقت صبح کی نماز ہو رہی ہو تو لازم نہیں کہ دوسرے علاقہ میں بھی صبح کی نماز ہو رہی ہو اسی طرح یہ ضروری نہیں کہ ایک جگہ مغرب ہو تو دوسری جگہ بھی مغرب ہو۔

”وروی ان اباموسی الضریر الفقیہ صاحب المختصر قدم
الاسکندریۃ فسنل عن صعد علی منارة الاسکندریۃ فیری الشمس
بزمان طویل بعد ما غربت عندهم فی البلد ایحل له ان یفطر فقال لا
ویحل لاهل البلد لان کلام مخاطب بما عنده“

اور روایت کیا گیا ہے کہ بیشک ابو موسیٰ ضریر فقیہ اسکندریہ میں آئے تو ان سے پوچھا گیا کہ ایک شخص اسکندریہ کے مینار پر چڑھے تو وہ سورج کو دیکھ رہا ہو لیکن شہر والوں کے نزدیک سورج غروب ہو چکا ہو تو وہ مینار والا شخص کیا اس وقت روزہ افطار کر سکتا ہے؟ تو انہوں نے کہا نہیں وہ تو افطار نہیں کر سکتا البتہ شہر والے افطار کر سکتے ہیں کیونکہ ہر ایک کا اپنا اپنا حکم ہے۔ جن کے نزدیک سورج غروب ہو گیا ان کے لئے افطار کرنا جائز ہے اور جن کے نزدیک غروب نہیں ہوا ان کے لئے جائز نہیں۔ مطالع کے اعتبار پر اور دلیل یہ ہے:

”عن کریب ان ام الفضل بعثتہ الی معاویۃ بالشام فقال فقدمت الشام
وقضیت حاجتها واستهل علی شہر رمضان وانا بالشام فرایت الهلال
لیلة الجمعة ثم قدمت المدینۃ فی آخر الشہر فسألنی عبد اللہ بن عباس
ثم ذکر الهلال فقال متی رایتہم الهلال فقلت رایتہ لیلة الجمعة فقال انت
رایتہ فقلت نعم وراءہ الناس وصاموا وصام معاویۃ فقال لکنا رأیناہ لیلة

السبت فلا نزال نصوم حتى نكمل ثلاثين او نراه فقلت اولا تكتفى برؤية معاوية وصيامه فقال لا هكذا امرنا رسول الله ﷺ

(قال في المنقذ رواه الجماعة الا البخاري وابن ماجه)

حضرت کرب کہتے ہیں کہ بیشک ام الفضل رضی اللہ عنہا نے مجھے شام میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس بھیجا میں شام کو آ گیا ان کے کام سے فارغ ہوا رمضان کا چاند میں نے وہاں ہی پایا جب کہ میں شام میں ہی تھا۔ میں نے چاند جمعہ کی رات کو دیکھا پھر میں مدینہ طیبہ میں مہینہ کے آخر میں آ گیا تو مجھ سے حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے سوال کیا (یعنی تم کہاں گئے تھے، کیوں گئے تھے وغیرہ) پھر چاند کا ذکر آ گیا تو آپ نے فرمایا تم نے کب چاند دیکھا تھا؟ تو میں نے کہا ہم نے جمعہ کی رات کو چاند دیکھا تھا تو آپ نے کہا کیا تم نے بھی دیکھا تھا تو میں نے کہا ہاں (یعنی میں نے دیکھا) اور لوگوں نے بھی دیکھا اور انہوں نے روزہ رکھا اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے بھی روزہ رکھا۔ تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا لیکن ہم نے تو ہفتہ کی رات کو دیکھا ہم روزے رکھیں گے چاند نظر آ گیا (انتیس کو) تو بہتر ورنہ ہم تیس دن مکمل کریں گے۔ تو میں نے کہا کیا آپ کو حضرت معاویہ کا چاند دیکھنا اور روزہ رکھنا کافی نہیں؟ (کہ آپ اس کا اعتبار کر کے ایک دن روزہ قضاء کرنے کا حکم دیں) آپ نے کہا نہیں یعنی وہ رویت کافی نہیں اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ (از تبیین الحقائق للریلی)

تنبیہ: آج کل شام کا علاقہ محدود ہے جب کہ پہلے وسیع تھا شام میں ہی فلسطین، بعلبک، حلب، طرابلس، انطاکیہ، ریش اور طربوس تھے۔ اور یہ بھی خیال رہے کہ زمین گول ہے اس کا چوتھائی حصہ آبادی ہے مغرب اور مشرق کے درمیان خط استواء کے ساتھ اقلیم اول ہے اسی میں مکہ مکرمہ ہے اور اس کے ساتھ شمالی جانب اقلیم دوم ہے اسی کے وسط میں مدینہ طیبہ ہے اس دوسری اقلیم کا سب سے بڑا دن پونے چودہ گھنٹے کا ہے۔ اور پہلے جو علاقہ شام کا تھا اس کے بعض شہر تیسری اقلیم میں آتے ہیں جو دوسری اقلیم کے شمال میں واقع ہے اس میں واقع شہروں کا سب سے بڑا دن ساڑھے چودہ گھنٹہ کا ہے۔ اور پہلے جو علاقہ شام کا تھا اس کے بعض علاقے چوتھی اقلیم میں آتے ہیں جو تیسری اقلیم کے شمال میں واقع ہے ان علاقوں میں سب سے بڑا دن پونے پندرہ گھنٹے کا ہے۔

(از غیاث اللغات)

اسی سے واضح ہوا کہ شام کا وسیع علاقہ جو پہلے تھا اس کے بعض شہروں اور مدینہ طیبہ میں پینتالیس منٹ کا فرق تھا اور بعض میں ایک گھنٹہ کا اسی وجہ سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے شام کے علاقہ میں دیکھے جانے والے چاند کا مدینہ طیبہ میں اعتبار نہیں کیا وجہ اس کی وہی ہے جو ذکر کر دی گئی کہ ہر علاقہ کا مطلع (مقام طلوع چاند علیحدہ علیحدہ ہے اگر وقت کا اتنا فرق ہو کہ ایک جگہ دکھائے دینے والا چاند اسی وقت دوسری جگہ نہیں دکھائی دے سکتا تو یقیناً ایک جگہ چاند دیکھنے سے دوسری جگہ اس کا حکم جاری نہیں ہوگا۔

امید ہے کہ اس بحث کے بعد انصاف کی نظر سے دیکھنے والے یہ رٹ لگانا چھوڑ دیں گے کہ سعودیہ میں جس دن روزہ ہو اسی دن پاکستان میں بھی روزہ ہو اور جس دن سعودیہ میں عید ہو اسی دن پاکستان میں بھی عید ہو۔ جب سعودیہ اور پاکستان کے اوقات میں دو گھنٹہ کا فرق ہے نمازوں کے اوقات مختلف ہیں تو روزہ اور عید ان کے ساتھ رکھنے کا کیا مطلب ہو سکتا ہے؟

وَمَنْ كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ :

”اور جو شخص مریض ہو یا سفر میں ہو تو وہ اتنے ہی اور دنوں میں (روزہ رکھے) اس سے پہلی آیت میں مریض اور مسافر کا ذکر تفصیلی طور پر بیان کیا جا چکا ہے البتہ اللہ تعالیٰ نے دوبارہ ان الفاظ مبارکہ کا ذکر کیا ہے اس کی دو وجہ ہیں۔ ایک وجہ یہ ہے کہ پہلے ذکر فرمایا ﴿فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ﴾ تو جو شخص حاضر ہو تم میں سے اس مہینہ میں تو اس کے روزے رکھے۔ چونکہ مسافر اور مریض بھی رمضان کے مہینہ کو پا لیتے ہیں اس لئے بظاہر یہ سمجھ آ رہا ہے کہ شاید ان پر بھی روزے فرض ہوں گے تو ان الفاظ مبارکہ سے مریض اور مسافر کو خاص کیا کہ ان کے لئے روزہ افطار کرنا جائز ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ پہلے ذکر ہوا ﴿وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ﴾ جب ان الفاظ مبارکہ کا یہ مفہوم ہو کہ جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہوں وہ فدیہ دے دیں۔ یعنی ایک قول کے مطابق ابتداء اسلام میں روزہ رکھنے کی طاقت کے باوجود فدیہ دینا جائز تھا لیکن بعد میں اسے منسوخ کر دیا گیا۔ اس لحاظ پر مسافر اور مریض کا حکم دوبارہ ذکر کر کے واضح کر دیا کہ ان کے حق میں جو حکم ثابت ہے وہ محکم ہے اسے منسوخ نہیں کیا گیا ہے۔

یہاں سے تین چیزیں ثابت ہو گئیں ایک یہ کہ جو شخص حالت اسلام اور بلوغ میں رمضان کو پا

لے اس پر روزے فرض ہیں۔ دوسرا یہ ثابت ہوا کہ مسافر اور مریض کے لئے رخصت ہے کہ وہ روزے نہ رکھیں تاہم یہ حکم ان کے لئے واجب نہیں۔ تیسری چیز یہ ثابت ہوئی کہ مریض کے صحت یاب ہونے پر اور مسافر کے مقیم ہونے پر ان پر روزے کی قضاء کرنا لازم ہے۔ (بیضاوی، خفاجی، شیخ زادہ)

يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ :

”ارادہ کرتا ہے اللہ تعالیٰ تم پر آسانی کا اور نہیں ارادہ کرتا تم پر مشکل کا“ لغایۃ رافثہ وسعة رحمته یعنی اللہ تعالیٰ اپنی بہت بڑی مہربانی اور وسعت رحمت کی وجہ سے تم پر آسانی کا ارادہ کرتا ہے اور تم پر مشکل کا ارادہ نہیں فرماتا۔ (ابو اسعود) اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے مریض اور مسافر کو افطار کی اجازت دی کہ وہ حالت مرض اور سفر میں روزہ نہ رکھیں بلکہ صحت اور اقامت میں قضاء کر لیں۔ (بیضاوی)

☆ ”اخرج احمد عن الاعرج انه سمع النبي ﷺ يقول ان خير دينكم ايسره ان خير دينكم ايسره“ (درمنشور)

حضرت اعرج فرماتے ہیں کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا بیشک تمہارے دین میں بہتر وہ ہے جو آسان ہے یہ الفاظ آپ نے دو مرتبہ دہرائے۔ کیونکہ خود نبی کریم ﷺ جو کام دین کے مطابق ہوتا مخالف نہ ہوتا لیکن آسان ہوتا اسی کو اختیار فرماتے ہاں اگر آسانی شریعت کے خلاف کام میں ہوتی تو آپ اس سے دور بھاگتے۔

☆ ”واخرج البزار عن انس ان رسول الله ﷺ قال يسروا ولا تعسروا وسكنوا ولا تنفروا“ (درمنشور)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا آسانی پیدا کرو مشکل نہ پیدا کرو اور تسلی دو اور نفرت نہ پیدا کرو۔

☆ ”واخرج احمد عن انس قال قال رسول الله ﷺ ان هذا الدين متين فاوغلوا فيه برفق“ (درمنشور)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک یہ دین پختہ دین ہے اس میں نرمی سے جدوجہد کرو۔

☆ ”واخرج الطبرانی والبيهقي عن سهل بن ابی امامة بن سهل بن حنيف عن ابیه عن جده ان رسول الله ﷺ قال لا تشددوا علی انفسکم فانما هلك من کان قبلکم

بتشديدهم على انفسهم وستجدون بقاياهم في الصوامع والديارات“ (درمنشور)

سہل بن ابی امامۃ اپنے باپ، دادا سے روایت کرتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم اپنے نفسوں پر سختی نہ کرو بیشک تم سے پہلے لوگ اپنے نفسوں پر سختی کی وجہ سے ہی ہلاک ہو چکے ہیں اور عنقریب تم ان کے بقایا (آثار و نشانات) کو گرجا اور دیر کے مقامات پر پاؤ گے۔

☆ ”واخرج البهيقي عن ابن عمر ان رسول الله ﷺ قال ان الله يحب ان تؤتى رخصته كما يحب ان تؤتى عزائمه“ (درمنشور)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے کہ رخصت پر عمل کیا جائے جس طرح پسند کرتا ہے کہ عزیمت پر عمل کیا جائے۔

☆ ”واخرج احمد والبخاري وابن خزيمة وابن حبان والطبراني في الاوسط والبيهقي عن ابن عمر قال قال رسول الله ﷺ ان الله يحب ان تؤتى رخصة كما لا يحب ان تؤتى معصية“ (درمنشور)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے کہ اس کی طرف دی گئی رخصت پر عمل کیا جائے یہ نہیں پسند فرماتا کہ معصیت پر عمل کیا جائے۔

☆ ”واخرج الطبراني عن عبد الله بن يزيد بن اديم قال حدثني ابو الدرداء وواثلة بن الاسقع وابو امامة وانس بن مالك ان رسول الله ﷺ قال ان الله يحب ان تقبل رخصة كما يحب العبد مغفرة ربه“ (درمنشور)

بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے کہ رخصت کو قبول کیا جائے جس طرح بندہ پسند کرتا ہے کہ رب تعالیٰ اس کی مغفرت کر دے۔

☆ ”واخرج الحكيم الترمذي في نوادر الاصول عن الحسن قال ان دين الله وضع دون الغلو وفوق التقصير“ (درمنشور)

حضرت حسن (بصری) فرماتے ہیں بیشک اللہ تعالیٰ کے دین میں میانہ روی ہے نہ ہی اس میں غلو ہے اور نہ ہی اس میں کوتاہی ہے کمی سے اوپر اور غلو سے نیچے وسط درجہ میں ہے۔

وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ : ”اور مکمل کرو تم گنتی“

گنتی کے مکمل کرنے کے دو مطلب ہیں ایک یہ کہ سفر کے دوران یا مرض کی حالت میں جو روزے تمہارے رہ گئے ہیں ان کو قضاء کرتے وقت ان کی گنتی مکمل کرو ان میں کمی نہ ہو۔

اور دوسرا مطلب ہے کہ چاند دیکھو اگر انتیس کا چاند نظر آجائے تو بہتر ورنہ تیس دن مکمل کرو۔ (قرطبی)

علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے دوسرے قول کو ہی ترجیح دی ہے اسی کے مطابق درمنشور میں احادیث نقل کی ہیں۔

☆ ”اخرج ابن ابی حاتم عن الربیع فی قوله ﴿وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ﴾ قال عدة رمضان“

(درمنشور)

ربیع کہتے ہیں رب تعالیٰ کے ارشاد ﴿وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ رمضان کی گنتی مکمل کرو

☆ واخرج ابو داؤد والنسائی وابن المنذر والدارقطنی فی سنہ عن حذیفہ قال قال

رسول اللہ ﷺ لا تقدموا الشهر حتى تروا الهلال او تكملوا العدة ثلاثين ثم

صوموا حتى تروا الهلال او تكملوا العدة ثلاثين“ (درمنشور)

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مہینہ کو مقدم نہ کرو یہاں تک کہ

چاند دیکھ لو یا تیس دن مکمل کر لو۔ پھر روزہ رکھو یہاں تک کہ چاند دیکھ لو یا تیس دن مکمل کر لو۔

☆ ”واخرج ابو داؤد والترمذی والنسائی عن ابن عباس قال قال رسول اللہ ﷺ

لا تقدموا الشهر بصيام يوم ولا يومين الا ان يكون شئ يصومه احدكم ولا تصوموا حتى

تروه ثم صوموا حتى تروه فان حال دونہ غمام فاتموا العدة ثلاثين ثم افطروا“ (درمنشور)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا (رمضان کے) مہینہ کو ایک یا دو

دن پہلے روزہ رکھ کر مقدم نہ کرو ہاں مگر یہ کہ کوئی شخص اس دن روزہ رکھتا ہو روزہ نہ رکھو یہاں تک کہ چاند

دیکھ لو پھر روزہ رکھو یہاں تک کہ چاند دیکھ لو اگر موسم ابراؤد ہو جائے تو تیس دن مکمل کرو پھر افطار کرو۔

☆ ”واخرج الدارقطنی عن رافع بن خدیج قال قال رسول اللہ ﷺ احصوا عدة

شعبان لرمضان ولا تقدموا الشهر بصوم فاذا رأيتموه فصوموا واذا رأيتموه فافطروا فان

غم عليكم فاكملوا العدة ثلاثين يوما ثم افطروا فان الشهر هكذا وهكذا وهكذا وهكذا

وهكذا وهكذا وحسب ابهامه فی الثالثة“ (درمنشور)

رافع بن خدیج کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا شعبان کے دن رمضان کے لئے شمار کرو

(رمضان کے) مہینہ کو روزہ رکھ کر مقدم نہ کرو جب تم دیکھو تو روزہ رکھو اور جب تم دیکھو تو افطار کرو اگر تم پر بادل چھا جائیں تو تیس دن مکمل کرو پھر افطار کرو بیشک مہینہ اس طرح اور اس طرح اور اس طرح ہے (آپ نے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں سے اشارہ کر کے بتایا تین مرتبہ دس دس انگلیوں سے اشارہ کر کے بتایا کہ مہینہ تیس دنوں کا ہے) اور یا مہینہ اس طرح ہے اور اس طرح ہے اور اس طرح ہے تیسری مرتبہ آپ نے ایک انگوٹھے کو بند کر لیا (یعنی دو مرتبہ دس دس انگلیوں سے اشارہ کیا اور تیسری مرتبہ نو انگلیوں سے اشارہ کیا بتایا کہ یا مہینہ اسی دنوں کا ہوتا ہے)۔

☆ ”واخرج الدار قطنی عن عبد الرحمن بن زید بن الخطاب قال انا صحبنا اصحاب النبی ﷺ وانهم حدثونا ان النبی ﷺ قال صوموا لرؤیتہ وافطروا لرؤیتہ فان اغمی علیکم فعدوا ثلاثین فان شهد ذو عدل فصوموا وافطروا ونسکوا“ (درمنشور)

عبدالرحمن بن زید بن خطاب کہتے ہیں کہ ہم نبی کریم ﷺ کے صحابہ کی مصاحبت میں تھے انہوں نے ہمیں بتایا کہ بیشک نبی کریم ﷺ نے فرمایا چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور دیکھ کر افطار کرو اگر تم پر بادل چھا جائیں تو تیس دن مکمل کرو اگر عادل شخص گواہی دے دیں تو روزہ رکھو اور افطار کرو اور قربانی کرو (شہادت کا ذکر پہلے تفصیلی طور پر بیان ہو چکا ہے)۔

☆ ”واخرج الدار قطنی عن ابی مسعود الانصاری ان النبی ﷺ اصبح صائما لتمام الثلاثین من رمضان فجاء اعرابیان فشهد ان لا اله الا الله وانهما اهلا بالامس فامرهم فافطروا“ (درمنشور)

حضرت ابو مسعود انصاری فرماتے ہیں بیشک نبی کریم ﷺ نے رمضان کے تیس دن مکمل کرنے کی غرض سے صبح روزہ رکھا تھا دو اعرابی آئے انہوں نے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کی شہادت دی پھر بتایا کہ ہم نے کل چاند دیکھا تھا تو آپ نے لوگوں کو حکم دیا کہ روزہ افطار کر لو۔

☆ ”واخرج ابن جریر عن الضحاک فی قوله ولتکملوا العدة قال عدة ما فطر المريض والمسافر“ (درمنشور)

ضحاک کہتے ہیں اللہ تعالیٰ کے ارشاد ﴿وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ مریض اور مسافر ہونے کی حالت میں جو روزے تم افطار کرو وہ مکمل کرو۔

وَلِتُكَبِّرُوا اللَّهَ عَلَىٰ مَا هَذَاكُمْ : ”اور تم بڑائی بیان کرو اللہ کی اس پر جو ہدایت دی اس نے تمہیں“
وَلِتُكَبِّرُوا اللَّهَ سے مراد تکبیر: یعنی ایک قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ فطر
کی رات تکبیر پڑھو۔

☆ ”قال ابن عباس حق على المسلمين اذا راوا هلال شوال ان يكبروا“

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں مسلمانوں پر یہ حق ہے کہ وہ جب شوال کا چاند
دیکھیں تو تکبیر پڑھیں۔ (کیر)

☆ ”اخرج ابن المنذر وابن ابی حاتم والمروزی فی کتاب العیدین عن زید بن اسلم
فی قوله ﴿وَلِتُكَبِّرُوا اللَّهَ عَلَىٰ مَا هَذَاكُمْ﴾ قال لتكبروا يوم الفطر“ (درمنشور)

حضرت زید بن اسلم فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿وَلِتُكَبِّرُوا اللَّهَ عَلَىٰ مَا
هَذَاكُمْ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ فطر کے دن تکبیر پڑھو۔

☆ ”واخرج الطبرانی فی المعجم الصغير عن انس قال قال رسول الله ﷺ زينوا
اعیادکم بالتکبیر“ (درمنشور)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم اپنی عیدوں کو تکبیر کے
ذریعے مزین کرو۔

☆ ”واخرج المروزی والدارقطنی والبيهقی فی السنن عن ابی عبد الرحمن
السلمی قال كانوا فی الفطر اشد منهم فی الاضحی یعنی فی التکبیر“ (درمنشور)

ابو عبد الرحمن سلمی فرماتے ہیں صحابہ کرام بنسبت اضحیٰ کے فطر میں زیادہ تکبیر کا اہتمام کرتے تھے
یعنی تکبیر کہنے میں۔

کون سی تکبیر پڑھی جائے؟ زیادہ طور پر تو یہی قول ہے اہل علم کا کہ جو عید الاضحیٰ اور ایام تشریق میں
تکبیر پڑھی جاتی ہے وہی تکبیر پڑھی جائے تاہم کچھ مختلف الفاظ بھی ملتے ہیں۔

☆ ”واخرج سعيد بن منصور وابن ابی شیبہ والمروزی عن ابن مسعود انه كان
يكبر الله اكبر الله اكبر لا اله الا الله والله اكبر والله الحمد“ (درمنشور)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ یہ تکبیر پڑھتے تھے ”الله اكبر الله اكبر لا اله الا الله والله

اکبر ولله الحمد

☆ واخرج ابن ابی شیبہ والمروزی والبیہقی فی سننہ عن ابن عباس انہ کان یکبر
الله اکبر کبیرا الله اکبر کبیرا الله اکبر ولله الحمد واجل الله اکبر علی ما ہدانا
(درمنثور)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ یہ تکبیر پڑھتے تھے الله اکبر کبیرا الله اکبر کبیرا الله
اکبر ولله الحمد واجل الله اکبر علی ما ہدانا

☆ ”واخرج البیهقی عن ابی عثمان النہدی قال کان عثمان یعلمنا التکبیر الله اکبر
الله اکبر الله اکبر کبیرا اللهم انت اعلی واجل من ان یکون لک صاحبة او یکون لک
ولد او یکون لک شریک فی الملک او یکون لک ولی من الذل وکبرہ تکبیرا اللهم
اغفر لنا اللهم ارحمنا“

ابو عثمان نہدی کہتے ہیں حضرت عثمان (ذوالنورین) رضی اللہ عنہ ہمیں یہ تکبیر سکھاتے تھے۔
”الله اکبر الله اکبر کبیرا الله اکبر کبیرا اللهم انت اعلی واجل من ان یکون لک صاحبة او
یکون لک ولدا او یکون لک شریک فی الملک او یکون لک ولی من الذل وکبرہ
تکبیرا اللهم اغفر لنا اللهم ارحمنا“
کیسے تکبیر کہے؟ امام شافعی رحمہ اللہ اور صاحبین (امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہما اللہ) کے نزدیک
بلند آواز سے تکبیر کہنا مستحب ہے اور امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک آہستہ آواز سے تکبیر کہنا
مستحب ہے۔

تکبیر کب کہے: شوال کا چاند جب نظر آ جائے تو رات کو تکبیر پڑھے اور صبح بھی تکبیر پڑھے۔

(از کتب فقہ)

تکبیر کیوں کہے؟ اس لئے کہ پہلے ذکر فرمایا کہ جو شخص رمضان کے مہینہ میں حاضر ہو یعنی مسلمان
اور بالغ ہونے کی حالت میں رمضان کو پالے وہ روزے رکھے پھر مسافر اور مریض کو افطار کرنے کی
رخصت دی پھر ان کو قضاء کرنے کا حکم دیا پھر ارشاد فرمایا ﴿وَلْتَكْمِلُوا الْعِدَّةَ﴾ علة الامر
بمراعاة العدة ”گنتی پوری کرو اس میں تعداد کی رعایت کا حکم دیا گیا ہے۔ پھر تعداد کی رعایت میں
وہی دو صورتیں ہیں جن کا پہلے ذکر کر دیا گیا ہے یعنی رمضان کی گنتی مکمل کرو یا جو روزے سفر اور مرض کی

حالت میں تم سے قضاء ہو گئے تھے ان کی گنتی پوری کرو۔ پھر فرمایا:

﴿وَلِتَكْبِرُوا لِلَّهِ﴾ علة ما علم من كيفية القضاء والخروج عن عهدة الفطر

یعنی جب تمہیں قضاء کی کیفیت اور فطر کی ذمہ داری سے نکلنے کا علم عطا کیا گیا ہے تو تمہیں چاہئے کہ جس ذات نے تمہیں علم عطا کیا ہے اس کی بڑائی بیان کرو۔ (از مدارک، وکیر)

﴿وَلِتَكْبِرُوا لِلَّهِ﴾ بمشاهدته بعد استكما لها ليلة العيد وفجوها شكرا

اللہ تعالیٰ نے جب تمہیں روزے مکمل کرنے کی توفیق عطا فرمائی ہے تو تم چاند دیکھ کر رات کو اور فجر کو بھی اللہ تعالیٰ کی بڑائی بیان کرو تا کہ تم اپنی وسعت کے مطابق کچھ نہ کچھ شکر ادا کر سکو اگرچہ حقیقی طور پر شکر ادا کرنے سے انسان قاصر ہے۔ (از تبہیر الرحمن)

وَلِتَكْبِرُوا لِلَّهِ بِمَعْنَى تَعْظِيمِ بَارِي تَعَالَى:

”ان المراد منه التعظيم لله شكرا على وفق هذه الطاعة“

اللہ کی بڑائی بیان کرو یعنی اللہ تعالیٰ کی عظمت بیان کرو اس کی تعظیم بجالاؤ، کیونکہ جب اس منعم ذات نے تمہیں اس طاعت کی توفیق عطا فرمائی ہے تو تم پر بھی اس کا شکر کرنا ضروری ہے۔ (از وکیر)

خیال رہے کہ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ ایسا خوب ہے کہ علامہ رازی رحمہ اللہ کے دونوں معانی کو حاوی ہے (اور اللہ کی بڑائی بولو) اس کا مطلب خواہ یہ لیں کہ اللہ کی تکبیر کہو یا یہ مطلب لیں کہ اللہ کی تعظیم بجالاؤ دونوں معانی ہی درست ہیں۔ راقم نے بھی اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کو ہی معمولی تبدیلی سے نقل کیا ہے (اور تم بڑائی بیان کرو اللہ کی)۔

اللہ کی بڑائی میں تین چیزیں پائی جائیں:

”واعلم ان تمام هذا التكبير انما يكون بالقول والاعتقاد والعمل“

یہ جاننا ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بڑائی اس وقت مکمل ہوگی اور صحیح معتبر ہوگی جب زبان سے بھی اس کی بڑائی بیان کی جائے اور عقیدہ بھی اس کی بڑائی کا ہو اور عمل بھی اس کے مطابق ہو۔

قول سے بڑائی بیان کرنا:

”اما القول فالأقرار بصفاته العلی واسمائه الحسنی وتنزیهه عما

لا یلیق به من ند وصاحبه وولد وشبه بالخلق“

زبان سے اللہ تعالیٰ کی بڑائی بیان کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کی بلند صفات کا اقرار کرے اور اس کے اسماء حسنی (اچھے ناموں) کا ذکر کرے اور اللہ تعالیٰ کی شریکوں سے اور زوجہ سے اور اولاد اور مخلوق کی مشابہت سے پاکیزگی بیان کرے۔

بڑائی کا اعتقاد رکھنا: ”وکل ذلک لا یصح الا بعد صحة الاعتقاد بالقلب“

جن چیزوں کا قول میں ذکر کیا ہے ان تمام کا عقیدہ رکھنا کیونکہ جب دل سے اعتقاد صحیح ہوگا تب ہی ان کا اقرار بھی کیا جائے گا۔

عمل سے بڑائی بیان کرنا: ”واما العمل فالتعبد بالطاعات من الصلوة والصیام والحج“

لیکن عمل سے رب تعالیٰ کی بڑائی بیان کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرے اس کی فرمانبرداری کرے یعنی نماز ادا کرے اور روزے رکھے اور حج ادا کرے اور زکوٰۃ ادا کرے۔ غرضیکہ تمام عبادات کو بجالانا اور تمام ممنوعات سے بچ جانا اور زبان سے رب تعالیٰ کی عظمت بیان کرنا اور رب تعالیٰ کی عظمت کا اعتقاد رکھنا اور تکبیرات کا پڑھنا یہ تمام چیزیں ﴿ولتکبروا للہ﴾ میں آ جاتی ہیں۔

عَلٰی مَا هَدٰکُمْ : لفظ ”ما“ میں دو احتمال ہیں ایک یہ کہ ”ما“ موصولہ ہو اس صورت میں مطلب یہ ہوگا:

”علی الذی ارشدکم الیہ مما تکسبوا به مرضات ربکم وفراغ

ذمتکم وجزیل المشیوۃ“

(اور تم بڑائی بیان کرو اللہ کی) اس پر جو ہدایت دی اس نے تمہیں جس کے ذریعے تم رب تعالیٰ کی رضا مندی حاصل کرتے ہو اور اپنی ذمہ داریوں سے فراغت حاصل کرتے ہو اور زیادہ ثواب حاصل کرتے ہو۔ اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ ”ما“ مصدر یہ ہو اس صورت میں معنی یہ ہوگا ”علی ارشادکم“ اور تم بڑائی بیان کرو اس کی راہنمائی پر۔

(از مظہری)

خیال رہے کہ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ ”ما“ موصولہ کے مطابق ہے راقم نے بھی اسی کو آسان سمجھ کر نقل کر دیا ہے تاہم طلباء کرام ”ما“ مصدریہ کے مطابق بھی ترجمہ ذہن نشین کر لیں۔

ہدایت دینے کا مطلب کیا؟ اگر معنی یہ کیا جائے کہ اس نے ”طاعت کی تخلیق کر کے تمہیں ہدایت دی“ تو یہ معنی وسیع تر ہوگا جو تمام معانی کو شامل ہوگا تاہم اسے یوں بیان کرنا بھی مناسب ہوگا کہ اس نے تمہیں دنیا میں عظیم انعامات عطا کر کے اور دلائل عطا کر کے اور چیزوں کی پہچان کرا کے اور تمہیں نیکیوں کی توفیق عطا کر کے اور گناہوں سے بچا کر ہدایت عطا کی۔

(ازکبیر بصری)

وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ : ”اور تا کہ تم شکر کرو“

ان الفاظ مبارکہ کا اس مقام پر ذکر کرنے کا یہ فائدہ ہے کہ انسان کو جب رب تعالیٰ نے یہ حکم دیا کہ ”تم اللہ کی بڑائی بیان کرو“ تو یہ اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا جب تک بندہ اللہ تعالیٰ کے جلال اور اس کی کبریائی اور اس کی عزت اور اس کی عظمت کو نہ جان لے اور بندے کو یہ علم حاصل ہو:

”ان الله اكبر من ان تصل اليه عقول العقلاء واوصاف

الواصفين وذكر الذاكرين“

کہ بیشک اللہ تعالیٰ بہت بڑا ہے اس تک بڑے بڑے عقلمندوں کی عقلوں کی رسائی نہیں اور اس کے اوصاف بیان کرنے والے اس سے قاصر ہیں کہ اس کے اوصاف کا حقہ بیان کر سکیں اور اس کا ذکر کرنے والے اس کے ذکر سے قاصر ہیں:

”ثم يعلم انه سبحانه مع جلاله وعزته واستغناؤه عن جميع المخلوقات

فضلا عن هذا المسكين خصه الله بهذه الهداية العظيمة“

پھر بندے کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ اپنے جلال اور عظمت کی وجہ سے تمام مخلوق سے مستغنی ہے چہ جائیکہ اس مسکین کو اللہ تعالیٰ نے جو اس ہدایت عظیمہ سے خاص کیا ہے اس سے مستغنی نہ ہو ایسا ممکن نہیں جب انسان کو یہ علم حاصل ہوگا تو وہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے میں مشغول ہوگا اور اپنی طاقت اور وسعت کے مطابق رب تعالیٰ کا شکر کرے گا۔ اسی وجہ سے رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ﴾ ”اور تا کہ تم شکر کرو“ (ازکبیر) اور مطلب یہ ہے:

”ولكى تشكروا على وجوب الصوم فانه وسيلة لنيل الدرجات وعلى

اباحة الفطر للمريض والمسافر فان فيه تخفيفا ورخصة (مظہری)

اور تا کہ تم روزے کے وجوب پر شکر ادا کرو کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر روزے فرض کئے ہیں کیونکہ روزہ رکھنا درجات کی بلندی کے حاصل کرنے کا ذریعہ ہے اور تم مریض اور مسافر کی تخفیف اور رخصت کی وجہ سے روزہ کے افطار کرنے کی اجازت کا شکر یہ ادا کرو کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے آسانی پیدا کر دی۔ شکر کرنے کا اور فائدہ یہ ہوگا:

﴿لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ﴾ هذا التخفيف فيجبر الشكر ما نقصر من تلك

الايام بالاجر

کہ تم اللہ تعالیٰ کی طرف سے حاصل ہونے والی تخفیف کا شکر ادا کرو تا کہ شکر کی وجہ سے بظاہر رمضان کی فضیلت جو حاصل نہ ہو سکی وہ کمی پوری ہو جائے اور اجر کی تکمیل ہو جائے۔ (تبہیر الرحمن)

نفلی روزہ کے متعلق احادیث مبارکہ:

”عن عائشة قالت كان رسول الله ﷺ يصوم حتى نقول لا يفطر ويفطر حتى نقول لا يصوم وما رأيت رسول الله ﷺ استكمل صيام شهر قط الا رمضان وما رأيت في شهر اكثر منه صياما في شعبان وفي رواية قالت كان يصوم شعبان كله وكان يصوم شعبان الا قليلا“ (بخاری و مسلم، مشکوٰۃ باب صيام التطوع)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ روزے رکھتے تھے تو ہم کہتے آپ افطار نہیں کریں گے۔ اور آپ افطار کرتے تو ہم کہتے آپ روزہ نہیں رکھیں گے اور میں نے رسول اللہ ﷺ کو نہیں دیکھا کہ آپ نے کسی مہینے کے مکمل روزے رکھے ہوں سوائے رمضان کے اور میں نے آپ کو نہیں دیکھا کہ آپ نے شعبان کے مہینے سے زیادہ کسی اور مہینے میں روزے رکھے ہوں۔ اور ایک روایت میں ہے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں حضور ﷺ شعبان کا کل مہینہ روزہ رکھتے تھے اور شعبان کے روزے رکھتے تھے سوائے تھوڑوں کے۔

وضاحت حدیث: نبی کریم ﷺ رمضان کے روزے مکمل رکھتے تھے لیکن نفلی روزے کبھی چاہا تو کسی دن لگا تا رکھ لئے اور کبھی چاہا تو کئی دن افطار کر لئے۔ جب آپ کئی دن لگا تا روزہ رکھتے تو

سمجھ یہ آتا کہ آپ افطار نہیں کریں گے اور جب کئی دن روزہ نہ رکھتے تو سمجھ یہ آتا کہ آپ روزہ نہیں رکھیں گے۔ رمضان کے بغیر کسی اور مہینہ میں اگر آپ زیادہ روزے رکھتے تھے تو وہ شعبان کا مہینہ ہوتا۔

ہاں البتہ بظاہر اس پر اعتراض وارد ہوتا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت کے مطابق تو یہ سمجھ آتا ہے کہ آپ شعبان کا مہینہ مکمل ہی روزہ رکھتے۔ اور دوسری روایت سے پتہ چلتا ہے کہ آپ شعبان کے مہینہ کے اکثر دن روزہ رکھتے ان دونوں میں تعارض نظر آتا ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے:

”وقبل المراد انه يصومه كله في سنة واكثره في سنة اخرى فالمعنى

على العطف وهو اقرب لظاهر اللفظ“

کہ آپ ایک سال شعبان کا مکمل مہینہ روزہ رکھتے اور دوسرے سال شعبان کے اکثر دن روزہ رکھتے یہ معنی بظاہر الفاظ کے مطابق ہے جس میں عطف کا لحاظ کیا گیا ہے۔ البتہ اس توجیہ کے مطابق حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے اس ارشاد ”کہ آپ نے مکمل مہینہ صرف رمضان کے روزے رکھے“ کا مطلب یہ ہوگا کہ ہمیشہ ہر سال مکمل مہینے کے روزے صرف رمضان کے رکھے البتہ شعبان کے کبھی مکمل مہینہ روزے رکھے اور کبھی شعبان کے زیادہ دنوں کے روزے رکھے۔ (ازمرقاۃ)

☆ ”عن عبد الله بن شقيق قال قلت لعائشة اكان النبي ﷺ يصوم شهرا كان قالت ما علمته صام شهرا كله الا رمضان ولا افطره كله حتى يصوم منه حتى مضى لسبيله“

(رواه مسلم، مشکوٰۃ باب صيام التطوع)

عبد اللہ بن شقیق کہتے ہیں میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے سوال کیا۔ کیا نبی کریم ﷺ تمام مہینہ روزہ رکھتے تھے تو انہوں نے جواب دیا کہ مجھے علم نہیں کہ حضور ﷺ نے تمام مہینہ روزے رکھے ہوں سوائے رمضان کے اور نہ ہی آپ نے تمام مہینہ افطار کیا یہاں تک کہ آپ روزہ رکھتے آپ کا یہی عمل رہا یہاں تک کہ آپ دنیا سے تشریف لے گئے۔

وضاحت حدیث: اس حدیث پاک کا یہی مطلب ہے کہ باقاعدگی سے ہمیشہ تو آپ نے صرف رمضان کے روزے ہی رکھے البتہ شعبان کے کبھی مکمل مہینہ کے روزے رکھے اور کبھی شعبان کے زیادہ دن روزے رکھے۔ یہ مطلب پچھلی حدیث سے ثابت ہوا۔ اور آپ نے کسی مہینہ کے مکمل دن افطار بھی نہیں کیا بلکہ ہر مہینہ کے ایام بیض یعنی ہر چاند کی تیرہ چودہ اور پندرہ تاریخ کو آپ نے روزے رکھے۔ (ازمرقاۃ)

☆ ”وعن ابن عباس قال حين صام رسول الله ﷺ يوم عاشوراء وامر بصيامه قالوا يا رسول الله ﷺ انه يوم يعظمه اليهود والنصارى فقال رسول الله ﷺ لئن بقيت الى قابل لاصوم من التاسع“
(رواه مسلم مشكوة باب صيام التطوع)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں جب رسول اللہ ﷺ نے عاشورہ (دس محرم) کے دن روزہ رکھا اور اس دن روزہ رکھنے کا حکم دیا صحابہ کرام نے عرض کیا یا رسول اللہ اس دن کی یہود اور نصاریٰ تعظیم کرتے ہیں۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر میں آنے والے سال تک باقی رہا تو نو محرم کو بھی روزہ رکھوں گا۔

وضاحت حدیث: نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام جب مکہ مکرمہ سے مدینہ طیبہ میں تشریف لائے تو دیکھا کہ یہود عاشورہ کے دن روزہ رکھتے ہیں آپ نے ان سے پوچھا کہ تم اس دن کیوں روزہ رکھتے ہو؟ تو انہوں نے کہا:

”هذا يوم نعظمه اظفر الله فيه موسى عليه الصلوة والسلام وبني اسرائيل على فرعون“

ہم اس دن کی تعظیم اس لئے کرتے ہیں کہ اس دن موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ نے فرعون پر کامیاب کیا یعنی ان کو فرعون اور قبطیوں سے نجات دی۔ ”فقال النبی ﷺ نحن اولی بموسیٰ“ تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ ہم زیادہ حق رکھتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام کی موافقت کریں آپ نے خود بھی روزہ رکھا اور صحابہ کرام کو بھی روزہ رکھنے کا حکم دیا۔ شروع شروع میں عاشوراء کا روزہ فرض رہا پھر اس کی فرضیت کو منسوخ کر دیا اور استحباب باقی رہا۔

یہ سلسلہ دس ہجری تک چلتا رہا۔ ہجرت کے دسویں سال صحابہ کرام نے عرض کیا ”اذ تجب مخالفتهم فكيف نوافقهم على تعظيمه“ کہ جب یہود و نصاریٰ کی مخالفت کا حکم ہے تو ہم عاشوراء کے دن کی تعظیم کر کے ان کی موافقت کیوں کر رہے ہیں۔ صحابہ کرام نے ظاہر کا خیال کیا کہ ہمیں یہود کی مخالفت کرنی چاہئے لیکن نبی کریم ﷺ حقیقت کا اعتبار کر رہے تھے کہ اس میں یہود کی موافقت کا لحاظ نہیں بلکہ یہ سمجھا جائے کہ عاشورہ کے دن ہمارا روزہ رکھنا تو صرف موسیٰ علیہ السلام اور ان

کے ساتھ ان کی قوم کو فرعون اور فرعونوں سے نجات دینے کی وجہ سے ہے لیکن پھر صحابہ کرام کی تسلی کے لئے آپ نے فرمایا کہ اگر میں آئندہ سال رہا تو نوتا ریخ کا بھی ہم روزہ رکھیں گے۔ آپ نے دس تاریخ کے روزہ کو ختم نہیں کیا بلکہ نوتا ریخ کے روزہ کو ساتھ ملانے کا حکم دیا:

”قال الطیبی لم یعش رسول اللہ ﷺ الی القابل بل توفي فی الثانی عشر من ربيع الاول فصار اليوم التاسع من المحرم سنة وان لم یصمه لانه عزم علی صومه“

علامہ طیبی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ نبی کریم ﷺ آنے والے محرم تک ظاہری حیات میں نہ رہے بلکہ ربیع الاول میں ہی آپ کا وصال ہو گیا لیکن پھر بھی نو محرم کا روزہ رکھنا سنت ہے اگر آپ نے نو محرم کا روزہ رکھا تو نہیں لیکن آپ نے روزہ رکھنے کا پختہ ارادہ فرمایا تھا لہذا اس تاریخ کو روزہ رکھنا مسنون ہو گیا۔ مسئلہ واضح ہے کہ صرف عاشورہ کے دن کا روزہ رکھنا مکروہ ہے بلکہ نو محرم کا روزہ ساتھ رکھنا مسنون ہے تاہم کراہیت سے بچنے کے لئے اگر نوتا ریخ کو روزہ نہ رکھے بلکہ گیارہ تاریخ کو دس کے ساتھ روزہ رکھ لے تو کافی ہے۔

یوم عرفہ کے روزہ کا حکم:

”عن ام الفضل بنت الحارث ان ناسا تماروا عندها یوم عرفة فی صیام رسول اللہ ﷺ فقال بعضهم هو صائم وقال بعضهم لیس بصائم فارسلت الیه بقدر لبن وهو واقد علی بیعه فشر به“

(بخاری ومسلم، مشکوٰۃ باب صیام التطوع)

ام الفضل بنت حارث فرماتی ہیں کہ میرے قریب کچھ لوگ عرفہ کے دن (نوذی الحج) بحث کر رہے تھے نبی کریم ﷺ کے روزہ کے متعلق۔ کچھ حضرات کہہ رہے تھے آپ نے روزہ رکھا ہوا ہے کچھ حضرات کہہ رہے تھے آپ کا روزہ نہیں میں نے ایک پیالہ دودھ کا نبی کریم ﷺ کے پاس بھیجا آپ اپنے اونٹ پر سوار تھے تو آپ نے وہ دودھ پی لیا۔

وضاحت:

یوم عرفہ کے روزہ رکھنے میں اگرچہ کئی اقوال ہیں صحیح قول وہ ہے جو حضرت ابن ہمام رحمہ اللہ کا ہے:

”صوم یوم عرفة لغير الحاج مستحب وللحاج ان كان يضعفه عن الوقوف والدعوات فالمستحب تركه“

یوم عرفہ کو روزہ رکھنا اس شخص کے لئے مستحب ہے جو حاجی نہیں اور حاجی کو روزہ اگر کمزور کر دے جس کی وجہ سے اسے مقام عرفات میں ٹھہرنا اور دعائیں کرنا مشکل ہو اور باعث ضعف ہو تو روزہ کو ترک کرنا اس کے لئے مستحب ہے۔

تاہم علامہ نووی رحمہ اللہ نے حاجی کے لئے مطلقاً روزہ رکھنا مکروہ قرار دیا ہے کیونکہ اس دن میں روزہ رکھنے سے نبی آئی ہوئی ہے فقہاء کرام نے زیادہ اسی قول کو پسند کیا ہے۔ (ازمراقۃ)

پیر کے دن روزہ رکھنا مسنون ہے:

”وعن ابی قتادہ قال سئل رسول اللہ ﷺ عن صوم الاثنين فقال فيه ولدت فيه انزل علی“ (رواہ مسلم، مشکوٰۃ باب صیام التطوع)

حضرت ابوقنادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ سے پیر کے دن روزہ رکھنے کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا اسی دن میری ولادت ہوئی اور اس دن مجھ پر وحی نازل کی گئی۔

وضاحت: سوال کرنے والے نے اس لئے سوال کیا تھا کہ حضور ﷺ اس دن اکثر طور پر روزہ رکھتے تھے تو آپ سے اس دن کی فضیلت کی وجہ پوچھی گئی تو آپ نے فرمایا کہ یہ دن تمہارے نبی کے دنیا میں موجود ہونے کا دن ہے اور تمہاری کتاب کے نزول کا پہلا دن ہے یعنی حسن ظاہری اور حسن باطنی کے آفتاب کے طلوع ہونے کا دن ہے۔

اسی سے واضح ہوا کہ نعمت کے حصول پر خوشی کا اظہار کرنا مسنون ہے۔ خود نبی کریم ﷺ نے اپنا یوم ولادت روزہ رکھ کر منایا۔

شوال کے چھ روزے:

”وعن ابی ایوب الانصاری انه حدثه ان رسول اللہ ﷺ قال من صام رمضان ثم اتبعه ستامن شوال كان كصيام الدهر“

(رواہ مسلم، مشکوٰۃ باب صیام التطوع)

حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے رمضان کے روزے رکھے پھر ان کے پیچھے چھ روزے شوال کے رکھے تو اسے زمانہ بھر کے روزوں کا ثواب مل گیا۔

وضاحت: مراد یہ ہے کہ جس شخص نے ہر سال یہ عمل کیا تو اسے زندگی بھر کے روزوں کا ثواب مل جائے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ عَشْرُ امْتَالِهَا﴾ جس شخص نے ایک نیکی کی اسے دس دنوں کا ثواب حاصل ہوگا۔ اس رمضان کے تیس روزوں کا ثواب تین سو دنوں کا ہو گیا اور شوال کے چھ روزوں کا ثواب ساٹھ دنوں کے روزوں کا ثواب حاصل ہو جائے گا۔ اس طرح ایک سال کے روزوں کا ثواب مل گیا۔ اسی طرح ہر سال اگر کوئی شخص اس پر عمل کرے گا تو زندگی بھر کے روزوں کا ثواب حاصل ہو جائے گا۔

فائدہ: ابن ماجہ وغیرہ نے حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے مرفوع حدیث بیان کی ہے: ”من صام ستة ايام بعد الفطر كأنه صام السنة ثم قال وان فرقها جاز“ جس شخص نے عید الفطر کے بعد شوال کے چھ روزے رکھے گویا کہ اس نے سال کے روزے رکھے پھر انہوں نے فرمایا اگر متفرق طور پر روزے رکھے تو جائز ہے۔ خیال رہے بعض حضرات نے عید الفطر کے بعد چھ دن مسلسل روزے رکھنے مستحب بیان کئے ہیں لیکن وہ صرف اسلئے کہ زندگی کا پتہ نہیں نیکی کا کام جتنا جلدی ہو سکے بہتر ہے۔ لیکن اگر شوال کے مہینہ میں چھ روزے مکمل کر لے بیشک علیحدہ علیحدہ روزے رکھے مسلسل نہ رکھے تو ثواب وہی حاصل ہوگا کیونکہ حدیث شریف میں عید الفطر کے متصل اور مسلسل رکھنے کا کوئی حکم نہیں پایا گیا (از مرقاۃ)

پیر اور جمعرات کو روزہ رکھنا:

”عن عائشة قال كان رسول الله ﷺ يصوم الاثنين والخميس“

(رواه الترمذی والنسائی)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ پیر اور جمعرات کو روزہ رکھتے تھے۔

”وعن ابی ہریرۃ قال قال رسول الله ﷺ تعرض الاعمال يوم الاثنين

والخميس فاحب ان يعرض عملي وانا صائم“ (رواه الترمذی)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اعمال پیر اور جمعرات کو پیش کئے جاتے ہیں تو میں پسند کرتا ہوں میرے عمل پیش کئے جائیں تو میں روزہ دار ہوں۔

(مشکوٰۃ باب صیام التطوع)

وضاحت: پیر کو روزہ رکھنے کی ایک وجہ پہلے گزر گئی کہ نبی کریم ﷺ کی پیدائش کا دن ہے اور نزول وحی کی ابتداء کا دن ہے اور دوسری وجہ اس حدیث میں ذکر ہو گئی کہ جمعرات اور پیر کو (تعرض الاعمال) ای علی الملک المتعال " لوگوں کے اعمال اللہ تعالیٰ کے حضور پیش کئے جاتے ہیں اس لئے آپ روزہ رکھتے تھے تا کہ جب میرے اعمال اللہ تعالیٰ کے حضور پیش ہوں تو میں روزہ دار ہوں۔ اس کی وجہ یہ تھی " طلبا لزیادة رفعة الدرجة " کہ حضور ﷺ درجات کی بلندی کے لئے نفلی نیک اعمال زیادہ سے زیادہ فرماتے تھے اور مقصود تعلیم امت بھی ہوا کرتا کہ امت کے لوگ بھی نفلی عبادات پر عمل کریں تا کہ ان کے مدارج بھی بلند ہوں۔

ایام بیض کے روزے: ایام بیض چاند کی تیرہ، چودہ اور پندرہ تاریخ کے دنوں کو کہا جاتا ہے

☆ "وعن ابی ذر قال قال رسول اللہ ﷺ یا اباذر اذا صمت من الشهر ثلاثة ایام فصم ثلاث عشرة واربع عشرة وخمس عشرة"

(رواہ الترمذی والسنائی، مشکوٰۃ باب صیام التطوع)

حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے ابو ذر جب تم مہینہ میں تین دن روزے رکھو تو تیرہ اور چودہ اور پندرہ تاریخوں کو رکھو۔

جمعہ کے دن روزہ رکھنا: "عن عبد اللہ بن مسعود قال کان رسول اللہ ﷺ یصوم من غرة کل شهر ثلاثة ایام وقلما کان یفطر یوم الجمعة"

(رواہ الترمذی والسنائی، مشکوٰۃ باب صیام التطوع)

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ ہر مہینہ کی روشن تین راتوں کے دنوں میں روزہ رکھتے تھے اور جمعہ کے دن آپ کم ہی افطار کرتے تھے۔

وضاحت: غرة، کا معنی ہے روشن اور چمکدار اور "بیض" جمع ہے ابیض اور بیضاء کی جس کا معنی ہے سفید چونکہ تیرہ اور چودہ اور پندرہ تاریخوں کی راتوں میں چاند روشن ہوتا ہے تو اصل میں وہ

راتیں سفید اور چمکدار ہوتی ہیں تو اسی مناسبت سے دنوں کو بھی ”ایام بیض اور ایام غرة“ کہہ لیا گیا نبی کریم ﷺ جمعہ کے دن اکثر روزہ رکھتے تھے کبھی کبھی جمعہ کے دن روزہ کو ترک بھی فرما لیتے تھے۔
اعتراض : جمعہ کے دن روزہ رکھنے سے تو نبی کریم ﷺ نے منع فرمایا ہے جب تک جمعہ سے پہلے دن یا دوسرے دن روزہ نہ رکھے تو خود نبی کریم ﷺ جمعہ کو روزہ کیوں رکھتے تھے؟ ممانعت کی حدیث یہ ہے۔

”عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ ﷺ لا یصوم احدکم یوم الجمعة

الا ان یصوم قبلہ او یصوم بعدہ“ (بخاری ومسلم مشکوٰۃ باب صیام التطوع)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سے کوئی ایک جمعہ کے دن روزہ نہ رکھے مگر یہ کہ اس سے پہلے دن روزہ رکھے یا اس کے بعد والے دن روزہ رکھے۔

جواب : ”قال ابن ہمام ولا بأس بصوم یوم الجمعة منفردا عند ابی حنیفۃ ومحمد رحمہما اللہ تعالیٰ“

حضرت ابن ہمام رحمہ اللہ نے بیان فرمایا کہ صرف جمعہ کے دن کا روزہ رکھنا منع نہیں اور نہ ہی اس میں کوئی حرج ہے یہی مذہب امام ابو حنیفہ و امام محمد رحمہما اللہ کا ہے۔ صرف جمعہ کے دن روزہ رکھنا اس وقت مکروہ ہے جب صرف جمعہ کی تعظیم کے لئے روزہ رکھے اور جمعہ کو خاص کر لے عبادت کے لئے دوسرے کسی دن عبادت کو جائز نہ سمجھے جیسا کہ یہود ہفتہ کے دن کی تعظیم کرتے تھے اور نصاریٰ صرف اتوار کی تعظیم کرتے تھے۔ اگر یہ عقیدہ نہ ہو بلکہ صرف یہ عقیدہ ہو کہ جمعہ کا دن افضل ہے اس میں روزہ رکھ لیا جائے یا اور نفلی عبادت کر لی جائے تو ثواب ہوگا اگرچہ اور دنوں میں بھی نفلی روزہ اور نماز کا ثواب حاصل ہوتا ہے تو یہ جائز ہے کوئی مکروہ نہیں۔ اسی پر نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد گرامی دلالت کر رہا ہے:

”عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ ﷺ لا تختصوا لیلۃ الجمعة بقیام

من بین الیالی ولا تختصوا یوم الجمعة بصیام من بین الایام الا ان

یکون فی صومہ یصومہ احدکم“ (رواہ مسلم، مشکوٰۃ باب صیام التطوع)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا راتوں میں سے صرف جمعہ کی رات کو قیام کے لئے (نوافل ادا کرنے کے لئے) خاص نہ کرو اور دنوں میں سے صرف جمعہ کے دن کو روزہ کے لئے خاص نہ ہو ہاں مگر کوئی شخص اس تاریخ کو روزہ رکھتا ہو۔

اس سے واضح ہوا کہ باقی راتوں کو چھوڑ کر صرف جمعہ کی رات کو عبادت کے لئے خاص کرنے کا اعتقاد ہوا اور باقی دنوں کو چھوڑ کر صرف جمعہ کے دن روزہ رکھنے سے خاص کرنا اچھا نہیں۔ یہ عقیدہ نہ ہو صرف جمعہ کی رات اور جمعہ کے دن کو افضل سمجھ کر عبادت کرنے میں کوئی ممانعت نہیں البتہ بہتر یہی ہے کہ اور دنوں میں بھی کبھی عبادت کر لی جائے تاکہ بظاہر عمل سے تخصیص کے عقیدہ کا وہم نہ ہو۔

دوسرا جواب: نبی کریم ﷺ کا جمعہ کے دن روزہ رکھنا جو ثابت ہے اس میں یہ ذکر نہیں کہ آپ جمعہ کے دن سے پہلے یا بعد میں روزہ رکھ لیتے ہوں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ آپ کی اس میں تخصیص ہو کہ آپ روزہ صرف جمعہ کو رکھ لیتے ہوں یہ وجہ بھی واضح ہے کہ آپ جمعہ کو روزہ رکھ کر جمعہ کو تعظیم میں خاص نہیں کرتے تھے بلکہ نبی کریم ﷺ کا تمام دنوں میں روزہ رکھنا اس حدیث سے ثابت ہے:

”عن عائشة قالت كان رسول الله ﷺ يصوم من الشهر السبت والاحد والاثنين ومن الشهر الآخر الثلاثاء والاربعاء والخميس“

(رواہ الترمذی، مشکوٰۃ باب صیام التطوع)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ کسی مہینہ میں ہفتہ اور اتوار اور پیر کو روزہ رکھ لیتے تھے اور کسی مہینہ میں منگل اور بدھ اور جمعرات کو روزہ رکھ لیتے تھے۔

تین روزے بغیر معین تاریخوں کے:

”عن معاذة العدوية انها سألت عائشة اكان رسول الله ﷺ يصوم من كل شهر ثلاثة ايام قالت نعم فقلت لها من اي ايام الشهر كان يصوم قالت لم يكن بيالي من اي ايام الشهر يصوم“ (رواہ مسلم، مشکوٰۃ باب صیام التطوع)

حضرت معاذہ عدویہ کہتی ہیں کہ میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کیا رسول اللہ ﷺ ہر مہینہ میں تین دن روزے رکھتے تھے؟ تو انہوں نے فرمایا ہاں۔ تو میں نے کہا مہینہ کے کون سے دنوں میں روزہ رکھتے تھے؟ تو انہوں نے فرمایا کہ آپ یہ پرواہ نہیں فرماتے تھے کہ آپ کس دن روزہ رکھ رہے ہیں۔

وضاحت: نبی کریم ﷺ نے ایام بیض کو روزے رکھے اور پسند فرمایا کہ آپ کی امت کے

لوگ بھی ایام بیض کو روزے رکھیں تاہم کبھی آپ نے مہینہ میں تین روزے رکھے لیکن وہ تاریخیں معین نہیں فرمائیں بلکہ بغیر معین کرنے کے تین دن روزے رکھے وجہ وہی ہو سکتی ہے کہ صرف ایام بیض کی تعظیم کا اعتقاد کر کے دوسرے دنوں میں عبادت کو کوئی نہ چھوڑے۔

واؤد علیہ السلام کے روزوں کو نبی کریم ﷺ نے پسند فرمایا:

”وعن عبد الله بن عمرو بن العاص قال قال لي رسول الله ﷺ يا عبد الله الم اخبر انك تصوم النهار وتقوم الليل فقلت بلى يا رسول الله قال فلا تفعل صم وافطر وقم ونم فان لجسدك عليك حقا وان لعينك عليك حقا وان لزوجك عليك حقا وان لزورك عليك حقا لا صام من صام الدهر صوم ثلاثة ايام من كل شهر صوم الدهر كله صم كل شهر ثلاثة ايام واقرا القرآن في كل شهر فقلت ان اطيع اكثر من ذلك قال صم افضل الصوم صوم داود صيام يوم وافطار يوم واقرا كل سبع ليال مرة ولا تزد على ذلك“

(بخاری و مسلم ، مشکوٰۃ باب صیام التطوع)

حضرت عبد اللہ بن عمرو بن عاص کہتے ہیں مجھے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے عبد اللہ کیا مجھے یہ خبر نہیں ملی کہ بیشک تم دن کو روزہ رکھتے ہو اور رات کو قیام کرتے ہو (نوافل ادا کرتے ہو) تو میں نے کہا ہاں ایسا ہی ہے یا رسول اللہ آپ نے فرمایا ایسا نہ کرو (بلکہ) روزہ رکھو اور افطار کرو اور قیام کرو اور سو جایا کرو بیشک تمہارے جسم کا تم پر حق ہے اور بیشک تمہاری آنکھ کا تم پر حق ہے اور بیشک تمہاری زوجہ کا تم پر حق ہے اور بیشک تمہاری زیارت کرنے والوں کا تم پر حق ہے اس شخص کا روزہ نہیں جس نے ہمیشہ روزہ رکھا ہر مہینہ کے تین دن روزے رکھنا ہمیشہ روزے رکھنا ہے اور ہر مہینہ میں (ایک مرتبہ) قرآن پڑھو تو میں نے کہا میں اس سے زیادہ کی طاقت رکھتا ہوں آپ نے فرمایا (اچھا پھر) تم افضل روزے رکھو جو حضرت واؤد علیہ السلام رکھتے تھے ایک دن روزہ رکھتے تھے اور ایک دن افطار کرتے تھے اور قرآن سات راتوں میں ایک مرتبہ پڑھو اور اس سے زیادہ نہ کرو۔

وضاحت حدیث: نبی کریم ﷺ کا ارشاد ”الم اخبر انك تصوم النهار وتقوم

اللیل ” کیا مجھے خبر نہیں دی گئی کہ تم دن کو روزہ رکھتے ہو یعنی تم ہر دن روزہ رکھتے ہو کسی دن افطار نہیں کرتے۔ اور رات کو قیام کرتے ہو یعنی تمام رات نوافل ادا کرتے رہتے ہو کبھی سوتے نہیں۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص نے جب عرض کیا ہاں ایسا ہی ہے یا رسول اللہ تو حضور ﷺ نے فرمایا: **فلا تفعل** : ”ایسا نہ کرو“ کیونکہ اس میں تمہارے لئے ضرر ہے یعنی ہمیشہ دن کا روزہ اور ہر رات کا قیام تمہارے بدن کو ضعیف کر دیں گے جس کی وجہ سے تم سے عبادات ضرور یہ بھی چھوٹ جائیں گی۔

صم و افطر : یعنی روزہ رکھو جب تمہیں چستی حاصل ہو اور بعض دنوں میں روزہ رکھو اور جب نفس کی شہوت کا غلبہ ہو تو روزہ رکھو تا کہ شہوت کا دبدبہ ختم ہو جائے۔ اور سستی کے وقت افطار کرو اور جب ملاں حاصل ہو اور نفس کی شہوت کی آگ بجھ جائے اور شہوت ماند پڑ جائے تو افطار کرو۔ اور یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ جن دنوں کی فضیلت حاصل ہے ان میں روزہ رکھ لیا کرو تا کہ ثواب بھی زیادہ حاصل ہو جائے اور دوسرے دنوں میں افطار کر لیا کرو تا کہ بدن کو تقویت حاصل ہو جائے اس طرح کبھی روزہ اور کبھی افطار سے اخلاق حسینہ حاصل ہوں گے اور عادات اچھی ہوں گی۔

وقم ونم : یعنی تم رات کے اول حصہ اور آخر حصہ میں قیام کر لیا کرو اور درمیان میں سو جایا کرو:

”واسمع نصيحة الطبيب الحبيب من غير معرفة العلة فكيف وقد

بينها بقوله ” فان لجسدك عليك حقا “

طبيب حبیب کی نصیحت کو سن کر قبول کرنا چاہئے اگر وہ بیماری کا ذکر نہ بھی کرے لیکن نبی کریم ﷺ نے تو علتوں (اسباب) کا ذکر بھی فرما دیا ہے کہ تمہارے جسم کا تم پر حق ہے اس لئے تم کھاؤ اور پیو اور قیام کرو اور سو جایا کرو تا کہ تمہیں روزے رکھنے اور قیام کرنے کی ہمیشہ کے لئے مناسب طاقت رہے کیونکہ بہت زیادہ اپنے آپ پر بوجھ ڈال کر عبادات فریضہ سے بھی اپنے آپ کو عاجز نہ کر لو ”والحاصل اعتدل فی الامور کلھا“ حاصل یہ ہے کہ تمام امور میں اعتدال سے کام لو۔

او ان لعینک علیک حقا : اور بیشک تمہاری آنکھ کا تم پر حق ہے۔ اس میں تاکید پائی گئی ہے اس لئے کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ آنکھ کا حق یہ ہے کہ دیکھنے کی ضرورت پر دیکھے یہ اسی وقت ہوگا جب انسان بیدار ہو اور آنکھ کھلی ہو لیکن آرام کے لئے آنکھ کا بند کرنا بھی اس کا حق ہے مطلب یہ ہے کہ

کبھی سو جایا کو اور کبھی جاگ کر عبادت کر لیا کرو۔

وان لزوجک علیک حقاً: ”اور بیشک تمہاری زوجہ کا تم پر حق ہے۔“ یعنی تمہاری زوجہ نے تم سے منافع حاصل کرنے ہیں اسلئے تم ہمیشہ تمام رات قیام نہ کرو اور نہ ہی ہر دن روزہ رکھو بلکہ کبھی لیٹ جاؤ تا کہ وہ تم سے نفع حاصل کر سکے اسی طرح ہر دن روزہ رکھ کر اپنی قوت شہوانیہ کو ضائع نہ کرو۔

وان لزورک علیک حقاً، بفتح الزاء وسکون الواو ای

لاصحابک الزائرین واحبابک القادمین“

اور بیشک تم پر تمہاری زیارت کرنیوالے احباب کا بھی حق ہے اور تمہارے پاس آنیوالے دوستوں کا بھی حق ہے۔ مطلب واضح ہے کہ ہمیشہ تمام رات قیام کرنے اور ہر دن روزہ رکھنے سے تھکاوٹ حاصل ہوگی اور ضعف بدن حاصل ہوگا جس کی وجہ سے انسان کے دنیاوی مشاغل معطل ہو جائیں گے لوگوں سے ملنے کی وجہ سے کچھ ان سے علمی نفع حاصل کرنا اور کچھ انہیں علمی نفع پہنچانا اور نیک لوگوں کی زیارت کرنا اور نیک شخص کا دوسروں کو زیارت شرف بخشنا یہ سب کام رہ جائیں گے۔ اسلئے مناسب مقدار میں قیام ہو اور روزے مناسب مقدار میں رکھے جائیں تا کہ یہ تمام کام معطل نہ ہوں۔

لا صام من صام الدھر: ”اس شخص کا روزہ نہیں جس نے ہمیشہ ہر دن روزہ رکھا۔“

مطلب اس کا یہ ہے کہ اگر اپنے آپ کو مشقت میں ڈال کر ہمیشہ روزہ رکھے جو دوسری ضروری عبادت کے کاموں میں خلل ڈالیں تو روزے میں وہ کامل ثواب حاصل نہ ہوا جو دینی علوم کی تعلیم دینے یا دینی علوم کے حاصل کرنے سے ثواب حاصل ہوتا تھا۔ پھر رب تعالیٰ نے جب انسان کو آسانی عطا فرمائی ہے تو انسان اپنے لئے مشکلات کیوں پیدا کرے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر﴾

”اللہ تعالیٰ تم پر آسانی کا ارادہ فرماتا اور تم پر تنگی کا ارادہ نہیں فرماتا“

اور نبی کریم ﷺ کا بھی ارشاد ہے ”ولا تشددوا فیشدد اللہ علیکم“ اور تم اپنے آپ پر سختی نہ کرو (ورنہ) اللہ تعالیٰ تم پر سختی فرمائے گا۔ ہاں یہ خیال رہے کہ ہمیشہ روزہ رکھنے کی ممانعت کی وجہ نبی کریم ﷺ نے جب بیان فرمادی ہیں تو اتنا واضح ہوا کہ ہمیشہ روزہ رکھنے میں کمال نہیں تاہم زوال بھی

نہیں یعنی مطلقاً منع بھی نہیں نفی کمال ثواب کی ہے مطلق ثواب کی نفی نہیں۔

صوم ثلاثة ايام من كل شهر صوم الدهر كله صم كل شهر ثلاثة ايام :
 ”ہر مہینہ کے تین دن روزہ رکھنا ہر دن روزہ رکھنے کے برابر ہے تم ہر مہینے کے تین دن روزہ رکھ لیا کرو۔“
 یعنی ایک نیکی دس نیکیوں کے برابر ہے تو ہر مہینہ میں تین دن روزہ رکھنا ثواب کے لحاظ پر اور حکماً تیس روزوں کے برابر ہوگا۔ لہذا تم ہر مہینہ کے تین روزے رکھ لیا کرو تمہیں تمام مہینہ کا ثواب حاصل ہو جائے گا۔ یہی عمل تم زندگی بھر جاری رکھو گے ”صائم الدهر“ (زمانہ بھر روزہ رکھنے والا) ہونے کا شرف حاصل ہو جائے گا۔ اور قرآن پاک مہینہ میں ایک مرتبہ پڑھ لیا کرو۔

جب حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے کہا میں اس سے زیادہ کی طاقت رکھتا ہوں تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ تم حضرت داؤد علیہ السلام کی طرح روزے رکھ لیا کرو یعنی ایک دن روزہ رکھ لیا کرو اور ایک دن افطار کر لیا کرو کیونکہ حضرت داؤد علیہ السلام اسی طرح روزے رکھتے تھے یہی افضل ہیں کہ ان میں طاقت رہتی ہے۔ اور قرآن پاک سات راتوں میں ایک مرتبہ پڑھ لیا کرو۔ یہ بھی ہمیشہ ہر رات کو ختم کرنے کی ممانعت ہے کہ اس سے ضعف بدن نہ حاصل ہو جائے اور فرائض نہ چھوٹ جائیں۔

ولا تزدد علی ذلک : کے کئی مطالب ہیں ایک احتمال یہ ہے ”ولا تزدد علی المذکور من الصوم والختم“ کہ جو مقدار روزوں اور ختم کی بیان کی گئی ہے اس سے زیادہ نہ کرو۔
 دوسرا احتمال یہ ہے ”ولا تزدد علی ذلک من السئوال“ جو تمہیں بتا دیا ہے اسی پر عمل کرو اور زیادہ سوال نہ کرو تیسرا احتمال یہ ہے ”ولا تزدد علی ذلک دعوی زیادة الطاقة“ اور اس سے زیادہ اپنی طاقت کے زائد ہونے کا دعوی نہ کرو۔

جن دونوں میں روزہ رکھنا منع ہے: عید الفطر اور عید الاضحیٰ اور عید الاضحیٰ کے تین دن بعد جن کو ایام تشریق کہا جاتا ہے ان پانچ دنوں میں روزہ رکھنا منع ہے۔

☆ ”عن ابی سعید الخدری قال قال رسول اللہ ﷺ لا صوم فی یومین الفطر والاضحیٰ“

(بخاری و مسلم، مشکوٰۃ باب صیام التطوع)

حضرت ابوسعید الخدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دو دنوں میں روزہ نہیں

یعنی عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے دن (روزہ نہ رکھا جائے)۔

☆ "وعن نبیثة (مصغر) الهذلی قال قال رسول الله ﷺ ایام التشریق ایام اکل وشرب وذكر الله" (رواه مسلم مشکوة باب صیام التطوع)

نبیثہ ہذلی کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ایام تشریق کھانے اور پینے اور اللہ کے ذکر کے دن ہیں۔ وضاحت حدیث: ایام تشریق عید الاضحیٰ کے بعد تین دن یعنی گیارہ اور بارہ اور تیرہ ذی الحج ہیں۔ ان دنوں کو ایام تشریق اس لئے کہتے ہیں کہ ان دنوں میں گوشت کو دھوپ پر رکھ کر خشک کیا جاتا تھا یہ بھی خیال رہے کہ عید کے دن بھی روزہ رکھنا منع ہے بلکہ وہ ممانعت میں اصل ہے اور ایام تشریق اس کے تابع ہیں۔ لیکن یوم النحر کا دوسری حدیث میں ذکر موجود ہے اس لئے اس کی ممانعت ثابت ہے۔

"قال ابن المک اتفقوا علی حرمة صومها وانما حرم صوم يوم العيد وایام التشریق لان الناس اضياف الله فيها"

ابن الملک رحمہ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اس مسئلہ میں اتفاق ہے کہ عید کے دن اور ایام تشریق میں روزہ رکھنا حرام ہے کیونکہ لوگ ان دنوں میں اللہ تعالیٰ کے مہمان ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ کے مہمانی سے اعراض کرنا مومن کی شان نہیں۔

تنبیہ: نوروز اور مہرجان کو روزہ رکھنا مکروہ ہے کیونکہ ان دنوں کو کفار معظم سمجھتے تھے لیکن یہ اسی وقت مکروہ ہے جب مسلمان بھی کفار کی طرح ان دنوں کو معظم سمجھیں۔ اگر ایک شخص چاند کی کسی تاریخ میں روزہ رکھتا ہے وہ تاریخ نوروز یا مہرجان کو آئے تو اس شخص کے لئے روزہ رکھنا جائز ہے نوروز چیت کی نو تاریخ اور مہرجان اسوج کی نو تاریخ کو کہا جاتا ہے۔

مسئلہ: "ولو وقع الاحتلام فی حال الصیام لا یضر مع ان الانبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام سالمون من الاحتلام لانه علامۃ تأتي الشیطان فی حال المنام" (مرقاۃ ج ص ۲۶۱) اگر روزے کی حالت میں احتلام ہو جائے تو روزے میں کوئی نقصان نہیں ہوتا۔ ہاں یہ خیال رہے کہ انبیاء کرام احتلام سے محفوظ ہوتے ہیں کیونکہ خواب کی صورت میں مجامعت اور انزال شیطان کی جانب سے پایا جاتا ہے اور انبیاء کرام شیطان کی دخل اندازی سے محفوظ ہوتے ہیں۔

البتہ یہ بھی خیال رہے کہ انبیاء کرام کو سوتے ہوئے انزال ہو جائے خواب میں کوئی مجامعت نہ پائی جائے تو یہ جائز ہے اور ممکن ہے۔ کیونکہ یہ بدن کے سیر ہونے کی وجہ سے ہوتا ہے یہ پیدائشی اور عادی امور کی وجہ سے ہوتا ہے اس میں شیطان کی دخل اندازی نہیں ہوتی اسی وجہ سے انبیاء کرام کے لئے یہ پایا جانا ممکن ہے۔ لیکن علامہ علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ بھی احتمال ہے کہ ایسا پایا جاسکتا ہے اس کے پائے جانے کا کوئی یقین نہیں۔ ”وفیہ ان الاحتمال غیر مفید فی موضع الاستدلال“ جب کسی چیز میں فقط احتمال پایا جائے تو وہ استدلال کے لئے مفید نہیں۔ (حوالہ مذکور)

مسئلہ: روزہ کی حالت میں زوجہ کا بوسہ لینا جائز ہے جب کہ انزال نہ ہو اور فتنہ سے خالی ہو لیکن اجتناب بہتر ہے۔

☆ ”وعن عائشة قالت کان رسول اللہ ﷺ یقبل ویبشر وهو صائم وکان املکم لأربه“ (بخاری ومسلم مشکوٰۃ باب)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ روزہ کی حالت میں بوسہ لے لیتے تھے اور (اپنی ازواج کے ساتھ لیٹ جاتے تھے جس کی وجہ سے) آپ کا جسم آپ کی ازواج کے جسم سے مس کرتا تھا اور آپ تم سے زیادہ اپنی حاجت پر مالک ہوتے تھے۔ وضاحت حدیث: روزہ کی حالت میں بوسہ لینے کے متعلق حکم یہ ہے:

”کرہ القبلة واللمس والمباشرة فی ظاہر الروایة ان خاف علی نفسه الجماع او الانزال“

روزہ کی حالت میں اپنی زوجہ کا بوسہ لینا اور ہاتھ وغیرہ سے چھونا اور (نگے) جسم کا جسم سے ٹکرانا جائز تو ہے لیکن جب اپنے نفس پر خوف ہو کہ ان حالات میں جماع پر عمل ہو جائے گا یا انزال (شہوت سے منی کا خروج) ہو جائے گا تو ایسی صورت میں مکروہ ہے ”وقال محمد تکرہ القبلة مطلقا لانها لا تخلو عن الفتنة“ حضرت امام محمد رحمہ اللہ نے احتیاطی طور پر اپنے اس قول سے فتویٰ دیا کہ روزہ کی حالت میں بوسہ مطلقاً مکروہ ہے کیونکہ یہ فتنہ سے خالی نہیں ہو سکتا ہے معاملہ جماع اور انزال سے پہلے نہ رکے۔

”وقال ابن عباس يكره للشباب ويرخص للشيب“ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بھی اس مسئلہ میں احتیاط سے کام لیتے ہوئے یہ ارشاد فرماتے تھے کہ جوانوں کے لئے روزہ کی حالت میں اپنی زوجہ کا بوسہ لینا یا چھونا یا بغل وغیرہ میں لینا مکروہ ہے کیونکہ یہ صورتیں فتنہ سے خالی نہیں لیکن بوڑھوں کے لئے جائز ہے اس لئے کہ ان کی شہوت زائل ہو چکی ہوتی ہے۔

”فلا ينبغي ان يقاس به عليه الصلوة والسلام في ذلك لقولها رضي الله عنها (وكان املككم لأربه) من ملك اذا قدر على شئ او صار حاكما عليه“

نبی کریم ﷺ کے بوس و کنار پر اپنے آپ کو قیاس نہ کیا جائے کیونکہ آپ کا وصف حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے یوں بیان فرمایا کہ آپ ان حالات میں تم سے زیادہ اپنی حاجت پر مالک ہوتے تھے یعنی جماع پر قادر ہونے کے باوجود جماع سے دور رہنا آپ کا وصف خاص تھا اس لئے کہ آپ اپنی حاجات کے حاکم تھے آپ کی حاجات آپ کے تابع تھیں جب کہ دوسرے لوگ حاجات کے تابع ہوتے ہیں اور خواہشات سے مغلوب ہوتے ہیں لیکن آپ اپنی شہوات پر غالب رہتے تھے۔

(از مرقا ج ۴ ص ۲۶۰)

مسئلہ: کوئی شخص جنبی ہو اس نے روزہ رکھا ہے تو بہتر یہ ہے کہ پہلے غسل کر لے پھر کھانا کھائے اور روزہ رکھے۔ لیکن اگر وقت کم ہو تو وضوء کر کے کھانا کھائے، روزہ رکھ لے اور بعد میں غسل کر لے بلکہ صرف ہاتھ دھو کر کلی کر کے کھانا کھالے تو پھر بھی جائز ہے۔

☆ ”وعن عائشة قالت كان رسول الله ﷺ يدركه الفجر في رمضان وهو جنب من غير حلم فيغتسل ويصوم“ (بخاری ومسلم مشکوۃ کتاب الصوم)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ رمضان میں حالت جنابت میں بغیر احتلام کے ہوتے تو فجر کو پا لیتے تو آپ غسل فرماتے اور روزہ رکھ لیتے۔

وضاحت حدیث: ایک مسئلہ تو اس حدیث کی شرح سے پہلے بیان کر دیا گیا ہے کہ انبیاء کرام احتلام سے محفوظ تھے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ارشاد میں اسکی وضاحت کر دی گئی ہے ”وہو جنب من غیر حلم“ کہ آپ حالت جنابت میں ہوتے (جماع وغیرہ سے) لیکن احتلام کی حالت نہیں ہوتی تھی۔

دوسرا مسئلہ یہ واضح ہو گیا کہ آپ بعض اوقات حالت جنابت میں ہوتے صبح کو پا لیتے اس حدیث کے ظاہری الفاظ مبارکہ سے تو یہ سمجھ آ رہا ہے کہ اسی حالت میں صبح ہو جاتی اور آپ غسل بعد میں فرما لیتے اور روزہ رکھ لیتے اس میں دو احتمال ہیں کہ بغیر کھانے اور پینے کے صرف نیت سے ہی روزہ رکھ لیتے یا یہ مطلب ہے کہ آپ حالت جنابت میں وضو کر کے کھا لیتے اور روزہ رکھ لیتے پھر غسل فرما لیتے تھے۔

فیغتسل ویصوم: ”ظاہر الحدیث قول عامة العلماء من اصبحت جنبا اغتسل واتم صومه“ اکثر اہل علم حضرات کا قول یہ ہے کہ ظاہر حدیث پاک سے یہی مطلب حاصل ہو رہا ہے کہ جو شخص جنابت کی حالت میں صبح کو پا لے وہ غسل کر لے اور روزہ کو مکمل کر لے اس میں دو احتمال وہی ہیں جن کا ذکر ابھی نبی کریم ﷺ کے فعل کے ضمن میں کر دیا گیا ہے:

”وقال البيضاوي في قوله تعالى ﴿فَلَا تَبْشُرُوهُنَّ﴾ في تجويز
المباشرة الى الصبح الدلالة على جواز تأخير الغسل اليه وصحة
صوم المصبح جنبا“

قاضی بیضاوی رحمہ اللہ نے آیہ کریمہ ﴿فَلَا تَبْشُرُوهُنَّ﴾ کی تفسیر میں بیان فرمایا ہے کہ جب رات کو مجامعت کا جواز صبح صادق تک ہے یعنی ایک لمحہ پہلے تک تو اس سے واضح ہو گیا کہ غسل میں تاخیر جائز ہے اور جنابت کی حالت میں صبح کرنے والے کا روزہ صحیح ہے۔

لیکن یہ خیال رہے کہ جب جماع صبح سے ایک لمحہ پہلے تک کرے گا تو اس صورت میں یا جماع سے پہلے کھا اور پی لے یا پھر بغیر کھانے اور پینے کے صرف نیت سے روزہ رکھ لے کیونکہ اس صورت میں جماع کے بعد وضو کر کے کھانے اور پینے کا تو وقت ہی نہیں۔

اعتراض: بخاری رحمہ اللہ نے تو یہ بیان فرمایا ہے ”من اصبحت جنبا فلا صوم له“ جس شخص نے جنابت کی حالت میں صبح کو پایا اس کا روزہ نہیں۔ ان دونوں احادیث میں بظاہر تعارض پایا جاتا ہے تو کس طرح دوسری حدیث پر اہل علم نے فتویٰ دیا ہے؟

جواب اول: ”واجابوا عنه بانه منسوخ واستحسنه ابن المنذر“

اہل علم حضرات نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ جو حدیث بخاری نے بیان کی ہے کہ ”جس شخص

نے حالت جنابت میں صبح کی اس کا روزہ نہیں“ وہ بخاری اور مسلم کی زیر بحث حدیث سے منسوخ ہے جس میں نبی کریم ﷺ کا حالت جنابت میں صبح کو پالینا اور غسل کرنا اور روزہ کو مکمل کرنے کا ذکر ہے یہی جواب ابن منذر رحمہ اللہ نے بھی مستحسن سمجھا ہے۔

جواب دوم: ”او محمول علی من اصبح مجامعا واستدام الجماع“

بعض حضرات نے بخاری کی حدیث ”من اصبح جنبا فلا صوم له“ کی تاویل یہ کی ہے کہ اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جس شخص نے جماع ایسے وقت میں کیا کہ حالت جماع میں ہی صبح صادق ہوگئی تو اس کا روزہ نہیں۔ یہ بہت واضح ہے کہ کھانے، پینے اور جماع کرنے کی حد صبح صادق سے لمحہ بھر پہلے ختم کرنا ضروری ہے۔ (ازمرقاۃ ج ۳ ص ۲۶۱)

بھول کر کھانے اور پینے اور جماع سے روزہ نہیں ٹوٹتا:

☆ ”عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ ﷺ من نسی وهو صائم فاکل او شرب فلیتم صومه فانما اطعمہ اللہ وسقاه“ (بخاری، مسلم مشکوٰۃ کتاب الصوم)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص بھول گیا اور اس نے روزہ کی حالت میں کھا اور پی لیا تو وہ روزہ کو مکمل کرے بیشک اسے اللہ تعالیٰ نے کھلایا اور پلایا ہے۔

اسی حکم کو دوسری حدیث پاک سے بھی تائید حاصل ہے ”رفع عن امتی الخطاء والنسیان وما استکروا علیہ“ میری امت سے خطا اور نسیان اور جبر اٹھالیا گیا ہے۔

یعنی ان حالتوں میں کوئی مواخذہ نہیں لیکن یہ خیال رہے کہ خطا کی حالت میں روزہ ٹوٹ جائے گا البتہ کفارہ لازم نہیں آئے گا۔ خطا یہ ہے کہ روزہ یاد ہو لیکن بے احتیاطی ہو جائے جیسا کہ کلی کرتے ہوئے بے اختیار پانی حلق میں چلا جائے اسی طرح کسی نے جبراً کھلا اور پلا دیا تو روزہ ٹوٹ جائے گا لیکن کفارہ لازم نہیں آئے گا۔ (ازمرقاۃ زیادة)

فائدہ: اگر کسی شخص نے بھول کر کھانا اور پینا شروع کر دیا اور وہ شخص روزہ رکھنے کی طاقت رکھتا ہے تو دوسرا شخص اسے یاد کرادے کہ تمہارا روزہ ہے لیکن اگر وہ روزہ مشکل سے رکھے ہوئے تھا اور بھول گیا تو

ایسی حالت میں دوسرا شخص اسے یاد نہ دلائے کیونکہ اسے اللہ تعالیٰ کھلا اور پلا رہا ہے تو اسے کھانے پینے دیا جائے کہ اس کا روزہ بھی مکمل ہو جائے اور مشکل سے بھی بچ جائے۔ (ازطحاوی)

عمداً (جان بوجھ کر) روزہ توڑنے سے قضاء اور کفارہ لازم آئے گا:

”عن ابی ہریرۃ قال بینما نحن جلوس عند النبی ﷺ اذ جاءہ رجل فقال یا رسول اللہ ہلکت قال مالک قال وقعت علی امرأتی وانا صائم قال رسول اللہ ﷺ هل تجد رقبة تعتقها قال لا قال فهل تستطيع ان تصوم شهرین متتابعین قال لا قال هل تجد اطعام ستین مسکینا قال لا قال اجلس ومکث النبی ﷺ فیما نحن علی ذلک اتی النبی ﷺ بعرق فیہ تمر والعرق المکتل الضخم قال ابن السائل قال انا قال خذ هذا فتصدق به فقال الرجل اعلی افقر منی یا رسول اللہ فواللہ ما بین لا بתיہا یرید الحر تین اهل بیت افقر من اهل بیتی فضحک النبی ﷺ حتی بدت انیابہ ثم قال اطعمہ اهلك“

(بخاری و مسلم، مشکوٰۃ کتاب الصوم)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ہم ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں بیٹھے ہوئے تھے ایک شخص آگے تو کہنے لگے یا رسول اللہ میں ہلاک ہو گیا حضور ﷺ نے پوچھا تمہیں کیا ہو گیا؟ وہ عرض کرنے لگے میں نے روزے کی حالت میں اپنی عورت سے جماع کر لیا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا تم کوئی غلام پاتے ہو کہ وہ آزاد کر دو وہ عرض کرنے لگے نہیں (میں کسی غلام اور غلامہ کا مالک تو نہیں) آپ نے فرمایا کیا تم دو ماہ لگا تا روزے رکھ سکتے ہو؟ وہ کہنے لگے نہیں۔ آپ نے فرمایا کیا تم ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلا سکتے ہو؟ وہ کہنے لگے نہیں آپ نے فرمایا بیٹھ جاؤ اور کچھ دیر نبی کریم ﷺ ٹھہرے اور ہم بھی ایسی حالت میں رہے نبی کریم ﷺ کے پاس کھجوروں کا ایک بڑا ٹوکرا لایا گیا آپ نے فرمایا وہ مسئلہ پوچھنے والا شخص کہاں ہے وہ کہنے لگے میں ہوں آپ نے فرمایا یہ (کھجوروں کا ٹوکرا) لے لو اور اسے صدقہ کر دو۔ وہ شخص عرض کرنے لگے کیا میں اپنے سے زیادہ محتاج پر (صدقہ کروں) قسم ہے اللہ تعالیٰ کی مدینہ طیبہ کے اطراف میں کسی گھر والے بھی میرے گھر والوں سے زیادہ محتاج نہیں تو نبی کریم ﷺ

سکرائے یہاں تک کہ آپ کی داڑھیں ظاہر ہو گئیں پھر آپ نے فرمایا اپنے اہل و عیال کو کھلا دو۔
وضاحت حدیث: واضح ہو گیا کہ جان بوجھ کر روزہ توڑنے پر قضاء اور کفارہ لازم ہے یہ بھی پتہ چل گیا کہ کفارہ کیا ہے۔

بخاری اور مسلم کی ایک حدیث میں ہے:

”عن ابی ہریرۃ انہ علیہ الصلوۃ والسلام امر رجلا افطر فی رمضان

ان یعتق رقبة او یصوم شہرین متتابعین او یطعم ستین مسکینا“

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو حکم دیا جس نے رمضان میں روزہ توڑ دیا تھا کہ وہ غلام آزاد کرے یا دو ماہ لگا تار روزے رکھے یا ساٹھ مسکینوں کو طعام کھلائے:

”وروی الدارقطنی عن ابی ہریرۃ ان رجلا اکل فی رمضان فامرہ النبی

ﷺ ان یعتق رقبة او یصوم شہرین متتابعین او یطعم ستین مسکینا“

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک ایک شخص نے رمضان میں کھالیا تو نبی کریم ﷺ نے اسے غلام آزاد کرنے یا دو ماہ لگا تار روزے رکھنے یا ساٹھ مسکینوں کو طعام کھلانے کا حکم فرمایا ”المکتل (بکسر المیم) الضخم، بڑا تھیلایا کھجور کے پتوں کا بنا ہوا بڑا ٹوکرا۔

ما بین لا بیتھا: کا مطلب ”الحرثین“ لیا گیا ہے مراد چھوٹے چھوٹے سیاہ پتھروں والے دو مقام شرقی اور غربی یعنی مدینہ طیبہ کے اطراف۔

نبی کریم ﷺ کا اختیار واضح طور پر ثابت ہوا کہ آپ نے خود ہی کھجوریں دیں وہ بھی تھوڑی مقدار میں تیس صاع بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ وہ پندرہ صاع تھیں پھر وہ بھی اس شخص کو اپنے گھر والوں کو کھلانے کی جازت دی۔

(ازرقاة)

راقم نے کئی احادیث کو دیکھ کر ایک اندازہ لگایا ہے کہ صحابہ کرام نے نبی کریم ﷺ کی رحمت کو دیکھ کر زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کی جیسا کہ اس حدیث میں مسئلہ پوچھنے والے شخص نے فائدہ اٹھایا۔

روزہ کی حالت میں قے کا حکم:

(۱) قے خود بخود آئے خواہ تھوڑی مقدار میں آئے یا زیادہ اس سے روزہ نہ ہی ٹوٹتا ہے اور نہ ہی

مکروہ ہوتا ہے البتہ شرط یہ ہے کہ قے کو اس نے واپس نہ لوٹایا ہو یا پھر نگل نہ لیا ہو۔

(۲) اگر خود بخود واپس لوٹ جائے اس شخص نے قے کو خود نہیں لوٹایا تو پھر بھی روزہ نہیں ٹوٹتا خواہ وہ قے منہ بھر کر ہی کیوں نہ ہو۔

(۳) اگر قے کو خود جان بوجھ کر واپس لوٹایا تو روزہ بالاتفاق ٹوٹ جائے گا خواہ وہ قے تھوڑی تھی یا زیادہ یعنی ایک چنے کی مقدار کو بھی واپس لوٹانا روزہ کو توڑ دیتا ہے اگرچہ امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے فرمایا کہ جان بوجھ کر قے کو لوٹانا اس وقت روزہ کو توڑے گا جب قے منہ بھر کر آئے پھر خواہ تھوڑی مقدار میں لوٹائے یا زیادہ مقدار میں لوٹائے۔ فتویٰ کے لحاظ پر مختار اس قول کو سمجھا گیا ہے اور تقویٰ کے لحاظ پر یہ قول مختار ہے کہ قے تھوڑی مقدار میں آئے یا زیادہ قے کو لوٹانے سے روزہ ٹوٹ جائے گا خواہ تھوڑی مقدار میں لوٹائے یا زیادہ مقدار میں۔

(۴) اگر کوئی شخص جان بوجھ کر زبردستی منہ میں انگلی وغیرہ ڈال کر قے کو لائے اور روزہ بھی یاد ہو تو منہ بھر کر قے کو لانے سے روزہ ٹوٹ جائے گا اور کم مقدار سے روزہ ٹوٹے گا تو نہیں البتہ اس میں کراہیت پائی جائے گا۔

☆ ”عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ ﷺ من ذرعه القی وهو صائم فلیس علیہ قضاء ومن استقاء عمدا فلیقض“ (رواہ الترمذی و ابوداؤد و اس ماجہ و الدارمی ، مشکوٰۃ کتاب الصوم)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص کو روزے کی حالت میں خود بخود قے آجائے اس پر روزہ کی قضا لازم نہیں اور جان بوجھ کر جس نے قے کو لایا وہ روزہ کی قضا کرے۔ وجہ اصل میں یہ ہے کہ خود بخود قے کا آنا غیر اختیاری ہے انسان کے فعل کا اس میں دخل نہیں اور انسان نے اس میں کوئی کوتاہی نہیں کی اسلئے روزہ نہ ٹوٹا اور جان بوجھ کر قے کو لانے میں کوتاہی اس کی جانب سے پائی گئی اس نے اپنے اختیار سے قے کو لوٹایا ہے اسلئے اس کا روزہ ٹوٹ گیا۔ ہاں البتہ یہ خیال رہے مندرجہ بالا صورتوں میں جن میں روزہ کے ٹوٹنے کا ذکر ہے ان میں صرف قضا لازم ہے کفارہ لازم نہیں۔

روزہ کی حالت میں خون نکلوانے کا حکم:

خون نکلوانے سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔ ہاں البتہ بغیر کسی عذر شدید کے اتنی مقدار میں خون نکلوانا

مکروہ ہے جس سے کمزوری ہو جائے اور روزہ رکھنا دشوار ہو جائے۔

☆ "وعن ابن عباس قال ان النبی ﷺ احتجم وهو محرم واحتجم وهو صائم"

(بخاری ومسلم، مشکوٰۃ کتاب الصوم)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں بیشک نبی کریم ﷺ نے حالت احرام میں خون نکلوایا اور روزہ کی حالت میں خون نکلوایا۔

وضاحت حدیث: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث میں بھی ایک ہی واقعہ کا ذکر ہے کیونکہ حدیث ابی داؤد میں ہے "احتجم صائما محرما" اور ترمذی میں ہے "احتجم وهو محرم صائم" سب روایات کا ایک ہی مطلب ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حالت احرام میں روزہ رکھا ہوا تھا اسی احرام اور روزہ کی حالت میں آپ نے خون نکلوایا۔

(ازمرقاۃ ج ۲ ص ۲۶۱)

☆ "عن شداد بن اوس ان رسول اللہ ﷺ اتی رجلا بالقیح وهو یحتجم وهو آخذ

بیدی لثمانی عشرة خلعت من رمضان فقال افطر الحاجم والمجم"

(رواہ ابو داؤد وابن ماجہ والدارمی مشکوٰۃ کتاب الصوم)

شداد بن اوس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رمضان کے اٹھارہ دن گزر چکے تھے (یعنی انیسویں روزہ کو) آپ نے میرے ہاتھ کو پکڑا ہوا تھا اسی حال میں آپ بقیع (مدینہ طیبہ کا قبرستان) میں تشریف لائے وہاں ایک شخص خون نکلوا رہا تھا تو آپ نے فرمایا خون نکالنے والے اور نکلوانے والے کا روزہ فاسد ہونے کے قریب ہو جاتا ہے۔

وضاحت حدیث: راقم نے جو ترجمہ کیا ہے اسے غور سے پڑھنے سے ہی واضح ہو جاتا ہے کہ یہ مراد نہیں کہ خون نکالنے والے اور نکلوانے والے کا روزہ ٹوٹ جاتا ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ روزہ ٹوٹنے کے قریب ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے "ہلک فلان" تو مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ وہ ہلاکت کے قریب ہو گیا اس نے اپنے آپ کو ہلاکت پر پیش کر دیا اس حدیث کی وضاحت صاحب مصابیح محی النہ رحمہ اللہ نے ان الفاظ سے بیان فرمادی:

"تأولہ بعض من رخص فی الحجامة ای تعرضا للافطار المحجوم

للضعف والحاجم لأنه لا یأمن من ان یصل شئی الی جوفه الملازم"

کہ جن حضرات کا مسلک یہ ہے کہ روزہ کی حالت میں خون نکلوانے کی رخصت پائی گئی ہے (صحیح یہی ہے) ان حضرات نے فرمایا کہ حدیث پاک کا مطلب یہ ہے کہ خون نکلوانے والے کا روزہ اس لئے افطار کے قریب ہو جاتا ہے کہ اسے کمزوری لاحق ہو جائے گی وہ روزہ نہیں رکھ سکے گا تو گویا کہ اس نے خود اپنے آپ کو روزہ کے افطار کے قریب پہنچا دیا ہے اور خون نکالنے والے (چونکہ دوسرے کے جسم میں آلہ چھو کر خون چوس کر نکالتے تھے) کا روزہ اس لئے ٹوٹنے کے قریب ہو جاتا ہے کہ اس کے آلہ سے اس کے خون کا پیٹ میں پہنچنے کا گمان ہوتا ہے:

”الملازم وهو بفتح الميم جمع الملزمة بكسر الميم قاروة الحجام

التي يجمع فيها الدم وسميت لانها تلزم على المحل“

ملازم جمع ہے ملزمة کی جمع کی صورت میں میم پر فتح (زبر) ہے اور اس کے واحد میں میم کے نیچے کسرہ (زیر) ہے۔ اس سے مراد خون نکالنے والا آلہ ہے جس میں خون جمع ہو جاتا ہے (اور وہ آلہ محل کے ساتھ چمٹا رہنے کی وجہ سے ملازمہ کہلاتا ہے)

مختصر مسئلہ یہ ہے کہ روزہ کی حالت میں اتنی مقدار میں خون نکلوانا جس سے کمزوری نہ ہو جائے لیکن زیادہ مقدار میں خون نکلوانا جس سے کمزوری ہو جائے مکروہ ہے۔

روزہ کی حالت میں ٹیکہ کا حکم:

بازو کے گوشت میں ٹیکہ لگوانا جائز ہے اس سے روزہ نہ ٹوٹے گا نہ ہی مکروہ ہوگا ہر وہ رگ جس کا تعلق معدہ یا دماغ سے ہو اس رگ میں ٹیکہ لگوانے سے روزہ ٹوٹ جائے گا۔ اگر کسی رگ کا تعلق براہ راست معدہ یا دماغ سے نہیں تو پھر بھی رگ میں ٹیکہ لگوانے سے اجتناب بہتر ہے۔ کسی ماہر سرجن سے پوچھ لیا جائے کہ کون سی رگ کا تعلق معدہ یا دماغ سے ہے ایسی رگوں میں روزہ کی حالت میں ٹیکہ لگوانا جائز نہیں ہوگا۔ فقہاء کرام نے ایک رگ ”جائفہ“ کا ذکر کیا ہے جس کا تعلق معدہ سے ہے اور ایک رگ ”آمتہ“ کا ذکر کیا ہے جس کا تعلق دماغ سے ان میں دوا ڈالنے سے روزہ کے ٹوٹ جانے کا حکم دیا ہے۔ فتاویٰ نوریہ میں اسی مسئلہ کو ایک استفتاء کے جواب میں شیخ کامل فقیہ العصر حضرت علامہ مولانا نور اللہ بصیر پوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

الاستفتاء : کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ روزہ دار شخص ٹیکہ چپک یا بخاری یا ہیضہ وغیرہ کا بحالت روزہ کرا سکتا ہے یا نہیں؟ ٹیکہ کرانے سے روزہ فاسد ہوگا یا نہیں؟ اگر ہوگا تو صرف قضاء لازم ہوگی یا قضاء و کفارہ ہر دو براہین قاطعہ و دلائل ساطعہ سے مسئلہ کو واضح فرمایا جائے "بینوا و جروا"۔

الجواب اللہم اجعل لی النور والصواب :

(۱) اگر مریض ہے اور غروب شمس کا انتظار کرے تو ہلاک جان یا فساد عضو یا زیادتی مرض یا درازی مرض کی علامت صادقہ یا تجربہ صحیحہ یا طبیب و ڈاکٹر مسلمان غیر ظاہر الفسق کی خبر سے گمان غالب ہو جائے۔ تو ٹیکہ کرا سکتا ہے کہ یہ عذر افطار ہیں اور ایسے ہی اگر تندرست کو ظن غالب ہو جائے کہ فوری ٹیکہ نہ کرائے تو بیمار ہو جائے گا فتاویٰ عالمگیری وغیرہ اسفار مذہب مہذب میں مصرح ہے:

"والنظم من الهندیة ج ۱ ص ۱۰۶ المریض اذا خاف علی نفسه

التلف او ذهاب عضو یفطر بالاجماع وان خاف زیادة العلة

فلکذلک عندنا وعلیه القضا اذا افطر کذا فی المحيط"

اگر کوئی خطرہ نہ ہو اور عدم افطار بھی ثابت ہو جائے تو روا اور نہ نہیں۔ (یعنی مریض کو جب اپنی جان کی ہلاکت کا خطرہ ہو یا کسی عضو کے ضائع ہونے کا خطرہ ہو تو بالاتفاق اس کے لئے روزہ افطار کرنا جائز ہے اور اگر بیماری کے زیادہ ہونے کا خطرہ ہو تو پھر بھی یہی حکم ہے ہمارے نزدیک اور اس پر قضاء لازم ہوگی جب افطار کرے)۔

(۲) اگر بدن کے کسی منفذ و مسلک سے بذریعہ ٹیکہ جوف (پیٹ) یا دماغ میں دوائی پہنچ جاتی ہے تو روزہ فاسد ہو جاتا ہے اور اگر مسامات سے سرایت کرتی ہے تو نہیں اگرچہ ذائقہ یا اندورن جوف و دماغ میں اثر پایا جائے۔ البحر الرائق ج ۲ ص ۲۷۳ والہندیہ ج ۱ ص ۱۰۴ و مراقی الفلاح شرح نور الایضاح وحاشیۃ الطحطاوی علی المراقی ص ۳۹۸ اور شامی ، حاشیہ طحطاوی کے انہی صفحات میں ہے:

"والنظم للطحطاوی والداخل من المسام لاینافیہ ای الصوم بحر شامی میں ہے والنظم منها

لو افطر شیاً من الدواء فی عینه لا یفسد صومه عندنا وان وجد طعمه فی حلقه واذا بزق
فرأى اثر الکحل ولونه فی بزاقه عامة المشائخ علی انه لا یفسد صومه کذا فی الذخيرة
وهو الاصح هکذا فی التبيين اور چونکہ وصول من المنفذ او المسام

(براہ راست پیٹ یا دماغ تک پہنچنے یا مساموں کے ذریعے پہنچنے) کا مسئلہ تشریح البدن (سرجنی) اور
طب کا ہے۔ لہذا اس کا حل ماہرین اطباء اور ڈاکٹروں کے حوالہ کیا جاتا ہے۔ اور مبنی اختلاف علماء یہ
ہے (علماء کے اختلاف کی وجہ اصل میں یہ ہے) کہ جس صاحب نے ”وصول من المنفذ“ (براہ
راست دوا کے پیٹ اور دماغ تک پہنچنے کو) سمجھا مفسد فرمایا (کہ روزہ ٹوٹ جاتا ہے) اور جس نے
”وصول من المسام“ (مساموں کے ذریعے دوا کے پہنچنے کا) خیال کیا مفسد قرار نہ دیا (کہ اس کا
روزہ نہیں ٹوٹا) (اس لئے اس مسئلہ کو ماہر سرجن کے حوالہ کر دیا جائے تفصیل شروع میں ذکر کر دی گئی)

اس کی نظیر فقہی ہمارے ائمہ کرام کا اختلاف ”واصل الی المثانة“ (مثانہ تک دوا کا پہنچنا)
کے مفسد اور غیر مفسد ہونے میں ہے عند امامنا الاعظم (ہمارے امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک) مفسد
نہیں کہ جوف (پیٹ) اور مسامہ کے درمیان مسام ہیں اور منفذ نہیں اور امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے
نزدیک مفسد ہے کہ منفذ ہے۔ وقول محمد مضطرب علیہم الرحمة (اور امام محمد رحمہ اللہ کا
قول اس مسئلہ میں مضطرب ہے) فتح القدیر ج ۲ ص ۲۶۷ بحر الرائق ج ۲ ص ۳۷۹ مراقی الفلاح
ص ۳۹۹، شامی ج ۲ ص ۱۳۷ میں ہے والنظم للشامی والاختلاف مبنی علی انه هل بین المثانة والجوف
منفذ اولاً (یہ اختلاف اصل میں اسی وجہ سے ہے کہ مثانہ اور پیٹ کے درمیان براہ راست تعلق ہے یا
نہیں۔ لیکن آج کل انسان کو چیر پھاڑ کر سرجن حضرات کو ایک ایک رگ وغیرہ کے متعلق معلوم ہوتا ہے
کہ براہ راست تعلق ہے یا مساموں کے ذریعے)

کفایہ ج ۲ ص ۲۶۷، بحر الرائق ج ۳ ص ۲۷۹ میں ہے والنظم من البحر
قال فی الهدایة وهذا لیس من باب الفقه لانه متعلق بالطب حاشیہ طحاوی میں ہے
قوله کذا تقوله الاطباء انما اسنده الیہم لان هذا المقام یرجع الیہم فیہ لکونه من
التشريع (یہ مسئلہ فقہ کا نہیں بلکہ علم طب کا ہے طبیب حضرات جو فیصلہ کریں ان کی طرف رجوع کیا
جائے کیونکہ حقیقت میں اس مسئلہ کا تعلق اپریشن کے علم سے ہے لہذا اسے سرجن حضرات ہی جانتے

ہیں۔ اگر (سرجن حضرات کے کہنے پر) مفسد ہونا ثابت ہو جائے تو صرف قضاء لازم ہوگی۔

(فتاویٰ نوریہ ج ۲ ص ۸۷، ۸۸)

اس کے بعد فتاویٰ نوریہ میں تفصیلی طور پر اس مسئلہ پر بحث کی گئی ہے تاہم خلاصہ اس کا وہی ہے جو ذکر کر دیا گیا ہے۔ البتہ اس بحث سے اتنے الفاظ ذہن میں رہیں بعض حضرات کہتے ہیں کہ ٹیکہ سے دواء گوشت میں پہنچ کر خون سے مل کر جسم کے تمام حصوں میں پہنچ جاتی ہے تو لامحالہ معدہ میں بھی پہنچ جاتی ہے اور جس طرح معدہ کی ظاہری سطح پر رگیں ہوتی ہیں یونہی باطن میں بھی رگیں ہوتی ہیں تو ان رگوں کے ذریعے باطن میں بھی دواء پہنچ جاتی ہے اور وریدی (رگ کا) ٹیکہ میں تو یہ بات اور واضح ہے لہذا روزہ ٹوٹ جاتا ہے تو یہ کہنا بھی صحیح نہیں کیونکہ جب خون خود ہی معدہ کے اندر نہیں پہنچتا تو اس کے اندر ملی ہوئی دوا کیسے پہنچے گی؟ اور یہ کہنا کہ باطن میں رگیں ہیں مفید نہیں کیونکہ یہ رگیں معدہ میں نہیں بلکہ معدہ کی اندورنی سطح میں ہوتی ہیں اور معدہ میں کھلتی بھی نہیں کہ خون براہ راست معدہ میں گرے جیسے حوض میں نالی کے ذریعے پانی گرتا ہے بلکہ دواء کا اثر صرف مسامات کے ذریعے پہنچ سکتا ہے حالانکہ مسامات سے پہنچی ہوئی چیز کا مفسد نہ ہونا آفتاب و ماہتاب کی طرح واضح ہے۔ (فتاویٰ نوریہ ج ۲ ص ۱۰۱)

روزہ کی حالت میں آنکھ میں سرمہ لگانا یا دوا ڈالنے کا حکم:

روزہ کی حالت میں سرمہ لگانا جائز ہے اور سرمہ کی طرح خشک دوا لگانا جائز ہے لیکن تر دوا (ڈراپ وغیرہ) کا استعمال جائز نہیں۔

☆ "عن انس قال جاء رجل الى النبي ﷺ قال اشتكيت عيني انا اکتحل وانا صائم قال نعم" (رواہ الترمذی مشکوٰۃ کتاب الصوم)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ایک شخص نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کرنے لگے کہ میری آنکھوں میں درد ہے کیا میں روزے کی حالت میں سرمہ لگایا کروں؟ آپ نے فرمایا ہاں (لگایا کرو) "قال المظهر الاکتحال ليس بمكروه للصائم" مظهر رحمہ اللہ نے بیان فرمایا سرمہ لگانا روزہ دار کے لئے مکروہ نہیں۔

تنبیہ: آنکھ کا تعلق براہ راست معدہ یا دماغ سے ہے یا نہیں اگرچہ فقہاء کرام نے بیان کیا ہے:

"قال ابن الهمام ولو اکتحل لم يفطر سواء وجد طعمه في حلقه او لا لان

الموجود فی حلقه اثره داخلا من المسام والمفطر الداخل من المنافذ
كالمدخل والمخرج لامن المسام الذی هو جمیع البدن للاتفاق“

(مرقاۃ ج ۳ ص ۲۶۹)

ابن ہمام رحمہ اللہ نے بیان فرمایا ہے کہ اگر کوئی روزہ دار سرمہ لگائے تو اس کا روزہ نہیں ٹوٹتا خواہ حلق میں ذائقہ پائے یا نہ پائے کیونکہ حلق میں جو اثر پایا گیا ہے وہ مساموں کے ذریعے داخل ہوا ہے براہ راست نہیں روزہ اس چیز سے ٹوٹتا ہے جو براہ راست پیٹ یا دماغ تک پہنچے مساموں کا تعلق کل بدن سے ہے براہ راست پیٹ اور دماغ سے نہیں اس لئے مساموں کے ذریعے سرمہ کا اثر حلق میں آجائے تو روزہ نہیں ٹوٹتا۔

لیکن آج کل ڈاکٹر سرجن حضرات کی تحقیق یہ ہے کہ آنکھ کا تعلق براہ راست حلق سے ہے اور حلق کا تعلق براہ راست معدہ سے ہے اس لئے اب دوسرے مسئلہ کو مد نظر رکھنا پڑے گا وہ یہ ہے کہ جائفہ پیٹ تک پہنچنے والے زخم یارگ اور آمہ دماغ تک پہنچنے والے زخم یارگ میں خشک دوا ڈالنے سے روزہ نہیں ٹوٹتا کیونکہ وہ منجمد ہو جاتی ہے صرف اسکے اثر یا ذائقہ سے روزہ نہیں ٹوٹتا لیکن تر دوا سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے کیونکہ وہ براہ راست پیٹ یا دماغ تک پہنچ جاتی ہے اسی مسئلہ سے آنکھ کا مسئلہ سرجن حضرات کی تحقیق کے مطابق یوں بیان کیا جائے کہ سرمہ لگانا جائز ہے کیونکہ یہ خشک دوا ہے اور خصوصاً نبی کریم ﷺ کا روزہ کی حالت میں سرمہ لگانا اور سرمہ لگانے کی اجازت دینا واضح کر رہا ہے کہ سرمہ لگانا جائز ہے لیکن تر دوا براہ راست حلق میں آ جاتی ہے اس لئے اگر کوئی شخص بہت احتیاط سے کام لے کہ بار بار دوا کے اثر کو تھوکتا رہے معدہ میں نہ جانے دے تو روزہ ٹوٹے گا نہیں البتہ مکروہ ہوگا کیونکہ کسی چیز کا روزہ دار کو بغیر عذر کے چکھنا مکروہ ہے لیکن اگر احتیاط سے کام نہ لے آنکھ میں ڈالی ہوئی دوا براہ راست حلق میں آگئی اور معدہ میں پہنچ گئی تو روزہ ٹوٹ جائے گا۔

اعتراض: جس حدیث سے سرمہ لگانا جائز ثابت کیا گیا ہے اس کے متعلق تو ترمذی نے یہ تحریر کیا ہے ”لیس اسنادہ بالقوی وابو عاتکہ الراوی یضعف“ اس حدیث کے روایوں میں ابو عاتکہ راوی پائے گئے جن کو ضعیف قرار دیا گیا ہے لہذا اس حدیث کی سند قوی نہ رہی۔ جب حدیث کا

ضعیف ہونا ثابت ہو گیا تو اس سے حکم جواز کیسے ثابت ہے جب کہ اصول حدیث میں واضح طور پر قانون موجود ہے کہ ضعیف احادیث سے احکام ثابت نہیں ہو سکتے۔

جواب: ضعیف حدیث جب متعدد طرف سے ثابت ہو جائے تو وہ حسن لغیرہ بن جاتی ہے اس سے احکام ثابت ہو سکتے ہیں۔ ”واخرج الترمذی عن عائشة قالت اکتحل النبی ﷺ وهو صائم“ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں نبی کریم ﷺ نے روزہ کی حالت میں سرمہ لگایا ہے۔ ”واخرجہ البیہقی مرفوعا بسند ضعیف“ بیہقی نے سند ضعیف سے یہی حدیث جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کی گئی ہے مرفوع طور پر ذکر کی ہے ”واخرجہ ابو داؤد موقوفا علی انس“ اور ابو داؤد نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے موقوف حدیث بیان کی ہے: ”فهذه عدة طرق وان لم يحتج بواحد منها فالمجموع يحتج به لتعدد الطرق“

یہ حدیث (سرمہ لگانے والی) متعدد طرق سے ثابت ہے اگرچہ ایک ایک حدیث سے علیحدہ علیحدہ طور پر حجت نہیں پکڑی جاسکتی لیکن متعدد طرق کے مجموعہ کو دلیل بنایا جاسکتا ہے۔

اعتراض:

ابو داؤد کی ایک حدیث میں تو روزہ دار کے لئے سرمہ لگانے کی ممانعت ہے تو جواز کس طرح ثابت ہوگا: ”ما فی ابی داؤد انه علیہ الصلوۃ والسلام امر بالاثمد عند النوم وقال لیتقه الصائم“

بیشک نبی کریم ﷺ نے سوتے وقت سرمہ لگانے کا حکم دیا اور فرمایا کہ روزہ دار سرمہ لگانے سے بچ جائے۔ جواب: یہ حدیث ضعیف ہے اس کو دوسری ضعیف احادیث کی تائید بھی خاص نہیں کہ حسن لغیرہ بن جائے۔ لیکن سرمہ لگانے والی احادیث ضعیف ہونے کے باوجود متعدد طرق سے ثابت ہیں وہ اس درجہ میں ہیں کہ حسن لغیرہ ان کو کہا جاسکتا ہے اور ان سے احکام ثابت کرنے کے لئے استدلال درست ہے۔ ”انه علیہ الصلوۃ والسلام کان یکتحل بالاثمد وهو صائم“ (بیہقی، حاکم)

بیشک نبی کریم ﷺ روزہ کی حالت میں سرمہ لگاتے تھے:

”وعن ابن عمر رضی اللہ عنہما قال خرج علينا رسول الله ﷺ

وعیناه مملؤتان من الکحل وذلك فی رمضان

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ رمضان شریف میں ایک مرتبہ تشریف لائے تو آپ کی آنکھیں سرمہ سے پر تھیں۔ یہ دونوں حدیثیں بھی ضعیف الاسناد ہونے کے باوجود سرمہ لگانے والی دوسری احادیث کی تائید کرتی ہیں۔
(ازمرقاۃ)

کان اور ناک میں روزہ دار کا دوا ڈالنا:

ناک کا تعلق براہ راست دماغ اور معدہ سے ہے اس لئے ناک میں دوا ڈالنا منع ہے کیونکہ اگر دوا دماغ یا پیٹ تک پہنچ گئی تو روزہ ٹوٹ جائے گا۔ اگرچہ کان میں پردہ ہے براہ راست دماغ اور پیٹ سے تعلق تو نہیں لیکن فقہاء کرام نے کان میں دوا ڈالنے سے منع کیا ہے لہذا کان میں دوا ڈالنے سے اجتناب کیا جائے۔

گرمی اور پیاس کی وجہ سے روزہ دار کا سر پر پانی ڈالنا:

”وعن بعض اصحابہ النبی ﷺ قال قد رأیت النبی ﷺ بالعرج یصب علی رأسه الماء وهو صائم من العطش او من الحر“

(رواہ مالک و ابو داؤد، مشکوٰۃ کتاب الصوم)

نبی کریم ﷺ کے ایک صحابی فرماتے ہیں کہ تحقیق میں نے دیکھا نبی کریم ﷺ کو مقام عرج میں پیاس یا گرمی کی وجہ سے روزہ دار ہونے کے باوجود اپنے سر پر آپ پانی ڈال رہے ہیں۔

وضاحت حدیث: اگرچہ حدیث پاک کی سند میں راوی صحابی کا نام نہیں ذکر کیا لیکن ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ مواہب اللدنیہ میں فرماتے ہیں ”الجهالة بالصحابی لا تضری لان الصحابة کلهم عدول“ صحابی کا نام نہیں ذکر کیا اور صرف یہ کہہ دینا کہ یہ حدیث ایک صحابی سے مروی ہے کافی ہے کیونکہ صحابی کے مجہول ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑھتا اس لئے کہ تمام صحابہ کرام عادل ہیں ان کی روایات معتبر ہیں۔

حدیث پاک سے یہ واضح ہوا کہ گرمی کی شدت سے بچنے کے لئے غسل کرنا سر پر پانی ڈالنا اور کپڑا تر کر کے سر پر رکھنا جائز ہے۔

اعتراض: نبی کریم ﷺ نے جب روزہ کی حالت میں گرمی اور پیاس سے بچنے کے لئے اپنے سر پر پانی ڈالا تو امام اعظم رحمہ اللہ اسے مکروہ کیوں کہتے ہیں؟

جواب: ”وہو علیہ الصلوۃ والسلام فعل ذلک لبيان الجواز من اظهار العجز للرحمة علی ضعف الامة“

نبی کریم ﷺ نے یہ فعل جواز ثابت کرنے کے لئے کیا ہے کہ جب میری امت کے لوگ روزہ کی تکمیل سے عاجز ہو جائیں تو اس پر عمل کر لیں آپ کا یہ فعل درحقیقت امت پر رحمت کے لئے تھا۔ یہ بھی خیال رہے کہ بعض کام خلاف اولیٰ ہوتے ہیں یعنی ان پر عمل کرنا بہتر نہیں ہوتا لیکن ان کا جواز ثابت کرنے کے لئے نبی کریم ﷺ پر واجب ہوتا ہے کہ آپ اس پر عمل کریں۔ آپ جب اس پر عمل کریں گے اس کا ثواب وجوب والا حاصل ہوگا اور وہی کام امت کے لئے جائز ہونے کے باوجود بہتر نہیں ہوگا اسی وجہ سے امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے فرمایا کہ روزہ کی حالت میں عبادت سے ضجر اور تنگی محسوس کرتے ہوئے سر پر پانی بہانا اور تر کپڑا پینٹنا خلاف اولیٰ ہے لیکن انسان جب اپنے آپ کو عاجز سمجھتے ہوئے یہی کام کرے تو امام اعظم رحمہ اللہ بھی اسے خلاف اولیٰ نہیں کہتے۔ (ازمراقۃ ج ۲ ص ۲۶۹)

فوائد: ”عن ام ہانی قالت لما کان یوم الفتح فتح مکة جاء ت فاطمة فجلست علی یسار رسول اللہ ﷺ وام ہانی عن یمینہ فجاءت الولیدۃ باناء فیہ شراب فناولتہ فشرب منہ ثم ناولہ ام ہانی فشربت منہ فقالت یا رسول اللہ لقد افطرت وکنت صائمة فقال لہا اکنت تقضین شینا قالت لا قال فلا یضرک ان کان تطوعا رواہ ابو داؤد والترمذی والدارمی وفی روایۃ لاحمد والترمذی نحوه وفیہ فقالت یا رسول اللہ اما ان کنت صائمة فقال الصائم المتطوع امیر نفسه ان شاء صام وان شاء افطر“ (مشکوۃ کتاب الصوم)

حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں فتح مکہ کے دن میں نبی کریم ﷺ کی دائیں جانب بیٹھی ہوئی تھی اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا آئیں اور آپ کی دوسری جانب بیٹھ گئیں اتنے میں ایک لڑکی پانی کا پیالہ لائی تو نبی کریم ﷺ نے اس سے کچھ پیا پھر ام ہانی رضی اللہ عنہا کو دیا انہوں نے اس سے پیا پھر عرض کیا یا رسول اللہ میں نے افطار کر لیا حالانکہ میں روزہ دار تھی تو آپ نے فرمایا کیا تم کوئی چیز قضاء کر رہی تھی انہوں نے کہا نہیں آپ نے فرمایا اگر یہ روزہ نقلی تھا تو تمہارا اس میں کوئی نقصان نہیں ہوا۔ ترمذی

کی روایت میں یہ بھی ہے کہ انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ میں تو روزہ دار تھی تو آپ نے فرمایا نقلی روزہ رکھنے والا اپنے نفس کا امیر ہوتا ہے چاہے تو روزہ رکھے اور چاہے تو افطار کر لے۔

وضاحت حدیث: حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہا ابوطالب کی بیٹی ہیں اور رسول اللہ ﷺ کی چچا زاد بہن اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بہن ہیں۔

حضرت فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا نے نبی کریم ﷺ کی بائیں جانب بیٹھنا کیوں پسند کیا؟ اسکی کئی وجوہ ہیں:

(۱) نبی کریم ﷺ نے خود ارشاد فرمایا ہو کہ ادھر بیٹھ جاؤ۔

(۲) انہوں نے خود خیال کیا ہو کہ نبی کریم ﷺ کا دل تو بائیں جانب ہے لہذا اسی جانب بیٹھنے کو ترجیح دی کہ دل کی توجہ ادھر ہی زیادہ ہوگی۔

(۳) ممکن ہے کہ آپ بائیں طور بطور عجز بیٹھ گئی ہو کہ ام ہانی میرے خاوند کی بہن ہیں اور میرے بچوں کی پھوپھی ہیں اور میرے والد محترم کے چچا کی بیٹی ہیں اور یہ بھی ممکن کہ وہ آپ سے بڑی ہوں تو ان کے بڑے ہونے کا بھی لحاظ کیا ہو۔

(۴) اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حضور ﷺ کی دائیں جانب جگہ نہ ہو تو بائیں جانب بیٹھ گئی ہوں۔ ”فجاءت الوليدة باناء فیہ شراب“ اس مقام میں ”شراب“ کا معنی ”پانی“ لیا گیا ہے کیونکہ مطلق ”شراب“ جب عربی زبان میں استعمال ہو تو اس سے مراد پانی ہوتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے پہلے مشروب حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہا کو دیا کیونکہ وہ دائیں جانب تھیں نبی کریم ﷺ دائیں جانب سے ہی ابتداء کو پسند فرماتے تھے۔ حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہا نے پانی پینے کے بعد نبی کریم ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ میں روزہ دار تھی میں نے روزہ افطار کر لیا پہلے کیوں نہیں بتایا۔ اس کی دو وجہ ہیں۔

(۱) ”قال ابن حجر وانما لم تذكر هذا قبل تناولها ايثارا لما اثرها به من التقديم على بنته سيدة النساء وذلك عندها اشرف واعلى من الصوم“

ابن حجر رحمہ اللہ نے فرمایا کہ حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہا نے پانی پینے سے پہلے نہیں بتایا کیونکہ جب رسول اللہ ﷺ نے اپنی بیٹی سیدۃ النساء حضرت فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا سے پہلے ان کو مشروب دیا تو انہوں نے رودہ سے اعلیٰ اور اشرف پانی سمجھا اسی لئے پہلے جلدی سے پی لیا پھر بتایا۔

(۲) ”او قصدها فانها لم تذكر خوفا عن فوت سورة عليه الصلوة والسلام“

یا انہوں نے ارادہ تو کیا ہو کہ پہلے بتادیں لیکن پھر اس ڈر سے نہ بتایا ہو کہ نبی کریم ﷺ کے بقیہ پانی (جو ٹھے) سے کہیں محروم نہ ہو جاؤں ”اکنست تقضین شیاً“ کا مطلب یہ ہے کہ کیا تمہارے ذمہ کوئی روزے واجب تھے کہ ان کی قضاء کا یہ روزہ رکھ رہی تھی؟ انہوں نے کہا نہیں یہ روزہ قضاء کا تو نہیں تھا۔ تو حضور ﷺ نے فرمایا اگر نفلی روزہ تھا تو تمہیں کوئی ضرر لاحق نہیں ہوا یعنی کوئی گناہ نہیں ہوا۔ نفلی روزہ بغیر عذر کے نہیں توڑنا چاہئے اور عذر کی وجہ سے توڑا جاسکتا ہے۔ اگر عذر یا بغیر عذر کے نفلی روزہ توڑ دے تو اس کی قضاء لازم ہوگی کفارہ لازم نہیں آئے گا۔ (ازرقاۃ)

☆ ”وعن الزهري عن عروة عن عائشة قالت كنت انا وحفصة صائمتين فعرض لنا طعام اشتھیناه فاكلنا منه فقالت حفصة يا رسول الله انا كنا صائمتين فعرض لنا طعام اشتھیناه فاكلنا منه قال اقضيا يوما آخر مكانه“ (رواه الترمذی، مشکوة کتاب الصوم)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں اور حفصہ روزہ دار تھیں ہمیں طعام دیا گیا (ہمیں سخت بھوک کی وجہ سے) خواہش غالب ہوئی تو ہم نے طعام کھالیا۔ تو حضرت حفصہ نے عرض کیا یا رسول اللہ ہم دونوں روزہ دار تھیں۔ ہمیں طعام دیا گیا ہم پر (بھوک کی وجہ سے) خواہش غالب ہوئی تو ہم نے اس طعام سے کھالیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا اس کی جگہ ایک دن روزہ قضاء کر لینا۔

اس حدیث سے بھی واضح ہوا کہ عذر کی وجہ سے نفلی روزہ توڑا جاسکتا ہے لیکن قضاء کرنا لازم ہے۔

روزہ دار کا افطار والوں کے پاس صابر رہنا باعث اجر و ثواب ہے:

☆ ”وعن ام عمارۃ بنت كعب ان النبي ﷺ دخل عليها فدعت له بطعام فقال لها كلى فقالت انى صائمة فقال النبي ﷺ ان لصائم اذا اكل عنده صلت عليه الملائكة حتى يفرغوا“ (رواه احمد والترمذی وابن ماجہ والدارمی مشکوة کتاب الصوم)

ام عمارہ بنت کعب کہتی ہیں بیشک نبی کریم ﷺ ہمارے گھر تشریف لائے تو انہوں نے آپ کیلئے طعام طلب کیا تو آپ نے ان کو کہا تم بھی کھاؤ تو انہوں نے کہا میں روزہ دار ہوں تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا بیشک روزہ دار کے پاس جب کھایا جائے تو اس کے لئے فرشتے رحمت بھیجتے ہیں یہاں تک کہ وہ (کھانے والے کھانے سے) فارغ ہو جائیں۔

حدیث شریف کا مطلب واضح ہے کہ باقی لوگ روزہ افطار کرنے والے ہوں ان کے کھانے کے دوران روزہ دار صبر سے بیٹھا رہے تو فرشتے اس کے لئے رحمت کی دعا کرتے رہتے ہیں یہاں تک کہ کھانے والے لوگ کھانے سے فارغ ہو جائیں۔

☆ ”عن بريدة قال دخل بلال على رسول الله ﷺ وهو يتغدى فقال رسول الله ﷺ الغداء يا بلال قال انى صائم يا رسول الله فقال رسول الله ﷺ ناكل رزقنا وفضل رزق بلال في الجنة اشعرت يا بلال ان الصائم يسبح عظامه ويستغفر له الملائكة ما اكل عنده“
(رواه البيهقي في شعب الايمان ، مشكاة كتاب الصوم)

حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں حضرت بلال رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے رسول اللہ ﷺ صبح کا کھانا کھا رہے تھے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے بلال صبح کا کھانا حاضر ہے حضرت بلال نے کہا یا رسول اللہ میں روزہ دار ہوں، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہم اپنا رزق کھا رہے ہیں اور بلال کا جنت میں فاضل رزق ہے اے بلال کیا تمہیں معلوم ہے بیشک روزہ دار کی ہڈیاں تسبیح پڑھتی ہیں اور فرشتے اس کے لئے استغفار کرتے ہیں جب تک اس کے پاس کھانا نہ جائے۔

وضاحت حدیث: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”ناکل رزقنا“ ہم اپنا رزق کھاتے ہیں ”ای رزق اللہ تعالیٰ الذی اعطانا الان“ یعنی اللہ تعالیٰ نے ہمیں جو رزق اب عطا کیا ہے وہ ہم کھا رہے ہیں ”وفضل رزق بلال“ یعنی بلال کو ہمارے کھانے سے اعلیٰ اور فضیلت والا کھانا جنت میں حاصل ہوگا اسے روزے کی جزاء حاصل ہوگی کیونکہ روزے نے ابھی اسکو کھانے سے روک رکھا ہے:
”ما اكل عنده“ ای ما دام يؤكل عند الصائم جزاء على صبره حال جوعه“

یعنی جب تک روزہ دار کے پاس دوسرے لوگ کھانا کھاتے رہیں وہ بھوک پر صابر رہے تو اسے یہ جزاء حاصل ہوتی ہے کہ اس کی ہڈیاں اللہ تعالیٰ کی تسبیح پڑھتی ہیں جس کا ثواب اس شخص کو حاصل ہوتا ہے اور فرشتے اس کے لئے استغفار کرتے ہیں۔
(ازمرقة)

سبحان اللہ روزہ دار کا کیا عظیم مقام ہے کہ وہ ہستیاں اس کے لئے بخشش طلب کرتی ہیں جن کی دعا کی قبولیت یقینی ہوتی ہے۔

وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ
إِذَا دَعَانِ فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَلْيُؤْمِنُوا بِي لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ

(۱) ”اور اے محبوب جب تم سے میرے بندے مجھے پوچھیں تو میں نزدیک ہوں دعا قبول کرتا ہوں پکارنے والے کی جب مجھے پکارے تو انہیں چاہئے میرا حکم مانیں اور مجھ پر ایمان لائیں کہ کہیں راہ پائیں“

(۲) ”اور جب سوال کریں آپ سے (اے میرے حبیب) میرے بندے میرے متعلق تو بیشک میں قریب ہوں قبول کرتا ہوں دعا، دعا کرنے والے کی جب دعا مانگے مجھ سے تو چاہئے کہ وہ مجھ سے قبولیت طلب کریں اور مجھ پر ایمان لائیں تاکہ وہ ہدایت پا جائیں۔“

شان نزول: چند واقعات کے درپیش آنے کے بعد اس آیہ کریمہ کا نزول ہوا گویا کہ تمام وجوہ اجتماعی طور پر وجہ نزول ہیں۔

☆ ”اخرج ابن جریر والبیہقی فی معجمہ وابن ابی حاتم وابو الشیخ وابن مردویہ من طریق الصلت بن حکیم عن رجل من الانصار عن ابیه عن جدہ قال جاء رجل الی رسول اللہ ﷺ فقال یا رسول اللہ اقرب ربنا فنادیہ ام بعید فنادیہ فسکت النبی ﷺ فانزل اللہ ﴿وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ..... الخ﴾ (درمنشور)

ایک شخص نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے عرض کرنے لگے یا رسول اللہ کیا ہمارا رب مقرب ہے کہ ہم اس سے آہستہ دعا کریں یا دور ہے کہ ہم پکار پکار کر دعا کریں؟ تو نبی کریم ﷺ (وحی کی انتظار میں) خاموش رہے تو اللہ تعالیٰ نے اس آیہ کریمہ کو نازل فرمایا:

☆ ”واخرج عبد الرزاق وابن جریر عن الحسن قال سأل اصحابہ النبی ﷺ ابن ربنا فانزل اللہ ﴿وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ الایة﴾ (درمنشور)

حضرت حسن بصری فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ کے صحابہ کرام نے پوچھا ہمارا رب کہاں ہے تو اللہ تعالیٰ نے اس آیہ کریمہ کو نازل فرمایا۔

☆ ”وردی الکلمی عن ابی صالح عن ابن عباس قال قالت اليهود کیف یسمع ربنا دعاءنا وانت تزعم ان بیننا و بین السماء خمس مائة عام فغلظ کل سماء مثل ذلک فنزلت هذه الایة“ (فرطبی)

یہود نے کہا ہمارا رب کس طرح ہماری دعاؤں کو سنتا ہے جو تم یہ گمان کرتے ہو کہ ایک آسمان اور دوسرے آسمان کے درمیان پانچ سو سال کی راہ ہے اور ہر آسمان کی موٹائی پانچ سو سال کی راہ ہے تو یہ آیہ کریمہ نازل ہوئی۔

☆ ”اخرج عبد بن حمید وابن المنذر عن عبد اللہ بن عبید قال لما نزلت هذه الایة ﴿ اَدْعُونِیْ اَسْتَجِبْ لَکُمْ ﴾ قالوا کیف لنا به ان نلقاه حتی ندعوه فانزل اللہ ﴿ وَاِذَا سَأَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ﴾ الایة ، فقالوا صدق ربنا وهو بکل مکان “ (درمنشور)

عبد اللہ بن عبید کہتے ہیں جب یہ آیہ کریمہ نازل ہوئی ﴿ اَدْعُونِیْ اَسْتَجِبْ لَکُمْ ﴾ مجھ سے دعا کرو میں تمہاری دعا کو قبول کروں گا۔ تو صحابہ کرام نے عرض کیا ہم کس طرح اللہ تعالیٰ کی ملاقات کر سکتے ہیں کہ ہم اس سے دعا کریں تو اللہ تعالیٰ نے اس آیہ کریمہ کو نازل کیا، تو صحابہ کرام نے کہا ہمارے رب تعالیٰ نے سچ فرمایا ہے کہ وہ ہر جگہ پر موجود ہے۔

☆ ”واخرج وکیع وعبد بن حمید وابن جریر وابن المنذر وابن حاتم عن عطاء بن ابی رباح انه بلغه لما انزلت ﴿ وَقَالَ رَبُّکُمْ اَدْعُونِیْ اَسْتَجِبْ لَکُمْ ﴾ قالوا لو نعلم ای ساعة ندعو فنزلت ﴿ وَاِذَا سَأَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ﴾ الی قوله ﴿ یُرْشِدُوْنَ ﴾“

عطاء بن ابی رباح کہتے ہیں کہ انہیں یہ خبر ملی ہے کہ جب رب تعالیٰ نے اس آیہ کریمہ کو نازل فرمایا ﴿ وَقَالَ رَبُّکُمْ اَدْعُونِیْ اَسْتَجِبْ لَکُمْ ﴾ (اور تمہارے رب نے کہا مجھ سے دعا کرو میں تمہاری دعا کو قبول کروں گا) تو صحابہ کرام نے عرض کیا کاش کہ ہمیں یہ معلوم ہو جائے کہ ہم کس گھڑی میں دعا کریں تو یہ آیہ کریمہ نازل ہوئی۔

وَإِذَا سَأَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ : اور جب سوال کریں آپ سے (اے میرے حبیب) میرے بندے میرے متعلق، ضمیر منصوب متصل (ک) نبی کریم ﷺ کی طرف رائج ہے اسی لئے اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے ترجمہ میں ”اے محبوب“ ذکر فرمایا اور حضرت پیر محمد کرم شاہ رحمہ اللہ نے ذکر فرمایا ”اے

میرے حبیب“ راقم نے بھی ترجمہ ضیاء القرآن سے لیا ہے اس لئے ”اے میرے حبیب“ ہی ذکر کیا ہے۔
ما قبل سے ربط:

اللہ تعالیٰ نے پہلے روزے کی فرضیت کا ذکر فرمایا اور روزے کے احکام ذکر فرمائے پھر ارشاد فرمایا:

﴿وَلِتُكَبِّرُوا اللَّهَ عَلَىٰ مَا هَدَاكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ﴾

”اور اللہ تعالیٰ کے بڑائی بیان کرو جو اس نے تمہیں ہدایت دی ہے اور تاکہ تم شکر گزار بن جاؤ۔“

جب بندے کو بڑائی بیان کرنے اور شکر کرنے کا حکم دیا ہے تو اس آیت کریمہ میں گویا کہ:

”بین انه سبحانه بلطفه ورحمته قريب من العبد مطلع على ذكره

وشكوه فيسمع نداءه ويجيب دعاءه ولا نجيب رجاءه“

بیان فرمایا کہ بیشک اللہ تعالیٰ اپنے لطف اور اپنی رحمت کے لحاظ پر بندے کے قریب ہے اور جو

اسے یاد کرے اور جو اس کا شکریہ ادا کرے وہ اس پر مطلع ہوتا ہے بندے کی نداء کو سنتا ہے اور اس کی دعا

کو قبول فرماتا ہے اور اس کی امید سے اسے رسوا نہیں کرتا۔ اور وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے تکبیر کا حکم دیا

پھر دعا میں رغبت دلائی ”تنبيهها على ان الدعاء لا بدوان يكون مسبوقا بالثناء الجميل“ اس

پر متنبہ کرتے ہوئے کہ بیشک دعا کے لئے ضروری ہے کہ پہلے اللہ تعالیٰ کی تعریف کرے پھر دعا کرے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پہلے اللہ تعالیٰ کی ثناء کی پھر دعا کی، ثناء ان الفاظ مبارکہ سے کی:

﴿الَّذِي خَلَقَنِي فَهُوَ يَهْدِينِ ☆ وَالَّذِي هُوَ يُطْعِمُنِي وَيَسْقِينِ ☆ وَإِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِينِ

☆ وَالَّذِي يُمَيِّتُنِي ثُمَّ يُحْيِينِ ☆ وَالَّذِي أَطْمَعُ أَنْ يَغْفِرَ لِي خَطِيئَتِي يَوْمَ الدِّينِ﴾

وہ جس نے مجھے پیدا کیا تو وہ مجھے راہ دے گا اور وہ جو مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے اور جب میں

بیمار ہوں تو وہی مجھے شفا دیتا ہے اور وہی مجھے وفات دے گا پھر مجھے زندہ کرے گا اور وہ جس کی مجھے آس

لگی ہے کہ میری خطائیں قیامت کے دن بخشے گا۔ اللہ تعالیٰ کی اتنے الفاظ مبارکہ سے ثناء کرنے کے بعد

ان الفاظ مبارکہ سے دعا کی:

﴿رَبِّ هَبْ لِي حُكْمًا وَالْحَقْنِي بِالصَّالِحِينَ ☆ وَاجْعَلْ لِي لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْآخِرِينَ ☆

وَاجْعَلْنِي مِنْ وَرَثَةِ جَنَّةِ النَّعِيمِ﴾

”اے میرے رب مجھے حکم عطا کر اور مجھے ان سے ملا دے جو تیرے قرب خاص کے سزاوار ہیں اور میری سچی نامور رکھ پچھلوں میں اور مجھے ان میں سے کر جو چین کے باغوں کے وارث ہیں۔“

(الشعراء ۷۸ تا ۸۵)

فَإِنِّي قَرِيبٌ: ”تو بیشک میں قریب ہوں“ یعنی اے میرے حبیب جب آپ سے میرے بندے میرے متعلق سوال کریں تو آپ ان کو بتادیں کہ بیشک میں قریب ہوں۔

تنبیہ: شان نزول میں جب مختلف وجوہ ذکر کر دی گئیں تو ان سے ہی واضح ہو گیا کہ رب تعالیٰ کے متعلق سوال کرنے والوں کے مختلف انداز تھے۔ بعض نے سوال کیا اللہ تعالیٰ کی ذات کے متعلق کہ وہ کیسی ذات ہے، کیا اسے کسی چیز سے تشبیہ دی جاسکتی ہے یا نہیں کیا وہ کسی مکان کے لحاظ پر قریب ہے یا بعید ہے کیا اس کی ذات قریب ہے یا بعید۔ بعض کا سوال اس کی صفات کے متعلق تھا کہ کیا اللہ تعالیٰ ہماری دعا کو سنتا ہے؟ ہم دعا کریں تو کیا واقعی یہ سمجھ لیں کہ اس رب تعالیٰ سے دعا کر رہے جو سمیع ہے؟ اسی طرح صفات کے متعلق سوال کرنے والوں کا یہ مطلب بھی تھا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے دعاء کرنے کی کس طرح اجازت ہے کیا اس کی طرف سے دعا کرنے کی اجازت بھی ہے یا نہیں۔ کیا ہم اس کے تمام اسماء سے اسے پکار کر دعا کر سکتے ہیں یا بعض معین اسماء کو ہی دعا میں شامل کر سکتے ہیں۔ کیا ہم اللہ تعالیٰ سے ہر قسم کی دعا کر سکتے ہیں یا خاص قسم کی دعا کر سکتے ہیں۔

تو رب تعالیٰ نے اس آیت کریمہ کو نازل فرما کر اور نبی کریم ﷺ نے وضاحت فرما کر تمام سوالوں کا جواب دے دیا۔ اللہ تعالیٰ جسم سے پاک ہے اپنی رحمت کے لحاظ پر قریب اس کے تمام نام ہی پاکیزہ ہیں جس نام سے چاہو اسے پکار لو۔ جب چاہو اس سے دعا کرو کوئی وقت معین نہیں۔ جو چاہو اس سے مانگو البتہ حرام چیزیں اس سے نہ مانگو۔ اجمالی طور پر جن چیزوں کو ابھی ذکر کیا ہے ان کو تفصیلی طور پر انشاء اللہ ساتھ ہی ذکر کیا جا رہا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے قریب ہونے کا کیا مطلب؟

”فہنا قرب معنوی لا حسی فلیس اللہ مادۃ ولا جسمًا ولا عرضا“

وانما هو مقدس عن المادۃ بتعالی عن النور“ (جو اہر طنطاوی)

یہاں قرب سے مراد قرب معنوی ہے، حسی نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نہ مادہ ہے اور نہ ہی جسم ہے اور نہ

ہی عرض ہے وہ مادہ سے مقدس ہے وہ نور سے بلند ذات ہے لہذا یہ بیان کرنا ممکن ہی نہیں کہ یہ کہا جائے کہ وہ ذات فلاں مادہ سے بنی ہوئی ہے:

”اعلم انه ليس المراد من هذا القرب بالجهة والمكان بل المراد منه القرب بالعلم والحفظ“

اس مقام میں قرب سے مراد یہ نہیں کہ اس کی جہت کا ذکر ہو یا اس کے مکان کا ذکر ہو کہ وہ فلاں جہت یا فلاں مکان میں قریب ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ وہ علم اور حفاظت اور رحمت اور دعا کی قبولیت کے لحاظ پر قریب ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کا قرب مکانی ثابت کیا جائے تو اسکی طرف اشارہ کرنا بھی ممکن ہوگا اور جس چیز کی طرف اشارہ ہو سکے وہ منقسم بھی ہو سکتا ہے یہ تمام چیزیں حدوث پر دلالت کرتی ہیں جب کہ اللہ تعالیٰ حدوث سے پاک ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ کا قرب اس طرح ثابت کیا جائے جو اس کی شان کے لائق ہے یعنی جب وہ سوال کریں ”ایں ربنا“ ہمارا رب کہاں ہے تو ان کو جواب دو ”فانی قریب“ بیشک میں مکان اور جسم سے پاک ہوں ہر جگہ پر موجود ہونے کے لحاظ پر قریب ہوں اگر وہ سوال کریں ”هل يسمع ربنا دعاءنا“ کیا ہمارا رب ہماری دعا سنتا ہے؟ تو ان کو جواب دیا جائے:

﴿فَإِنِّي قَرِيبٌ﴾ فان القريب من المتكلم يسمع كلامه

کہ بیشک میں قریب ہوں جو متکلم کے قریب ہوتا ہے وہ اس کے کلام کو بھی سنتا ہے اور اگر وہ سوال کریں کہ ہم دعا بلند آواز سے کریں یا آہستہ ”صح ان يجيب بقوله ﴿فَإِنِّي قَرِيبٌ﴾ تو صحیح یہ ہے کہ ان کو میرے قول سے ہی جواب دیا جائے ﴿فَإِنِّي قَرِيبٌ﴾ بیشک میں قریب ہوں۔

”وان سألوه انه هل يعطينا مطلوبنا بالدعاء؟ صلح هذا الجواب“

اگر وہ سوال کریں کہ کیا اللہ تعالیٰ دعا سے ہمیں مطلوب عطا کرے گا یا نہیں تو یہی جواب دو کہ میں قریب ہوں دعا کرنے والے کی دعا کو قبول کرتا ہوں۔ اگر وہ سوال کریں کہ اگر ہم گناہ کر کے توبہ کر لیں تو کیا وہ ہماری توبہ قبول فرماتا ہے تو اس کا جواب بھی یہی دیا جائے:

”فانی قریب ای فانا القريب بالنظر لهم والتجاوز عنهم وقبول التوبة منهم“

بیشک میں قریب ہوں یعنی میں لمن کی طرف نظر رحمت فرمانے کے لحاظ پر اور ان سے تجاوز کرنے پر اور ان کی توبہ قبول کرنے کے لحاظ پر قریب ہوں۔ (ازکیر)

أَجِيبْ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ : دعا کرنے والا جب مجھ سے دعا کرتا ہے تو میں اس کی دعا قبول کرتا ہوں۔ ”الداع“ ناقص واوی ہے واویاء سے بدل جاتی ہے ”الداعی“ بن جاتا ہے اور ”دعان“ بھی اصل میں ”دعانی“ ہے یا متکلم ضمیر متصل مفعول ہے:

”قرأ ابو عمرو وقالون عن نافع ﴿الداعی اذا دعانی﴾ باثبات الیاء فیہما فی الوصل والباقون بحذفہا فالاولی علی الوصل والثانیۃ علی التخفیف“

ابو عمرو اور قالون نے نافع کی قراءت کے مطابق دونوں مقاموں میں یا کو ثابت رکھ کر پڑھا ہے ﴿الداعی اذا دعانی﴾ اور باقی حضرات نے یا کو حذف کیا ہے، یا کو باقی رکھ کر پڑھنا بہتر ہے اگرچہ حذف میں تخفیف ہے۔

اعتراض: آیہ کریمہ سے یہ ثابت ہو رہا ہے کہ ہر شخص کی دعا قبول ہوتی ہے حالانکہ کتنے لوگ دعا کرتے ہیں ان کی دعا قبول نہیں ہوتی تو اس آیہ کریمہ کا کیا مطلب ہے؟

پہلا جواب: دعاء کی قبولیت کے تین طریقے ہیں ان میں سے کسی ایک طریقہ پر دعا قبول ہو جاتی ہے بندہ سمجھتا ہے شاید دعاء قبول نہیں ہوئی حالانکہ دعا قبول ہو چکی ہوتی ہے وہ تین طریقے یہ ہیں یا تو دعا دنیا میں ہی قبول ہو جائے یعنی جس چیز کا مطالبہ کر رہا ہے وہ چیز حاصل ہو جائے یا وہ دعا اس کی خطاؤں اور لغزشوں کا کفارہ بن جائے یا اس دعا کو آخرت کے لئے ذخیرہ بنا دیا جائے کہ اسے آخرت میں اس دعا کا نفع حاصل ہو جائے۔

اسی قول پر حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی ایک روایت شاہد ہے وہ فرماتے ہیں:

”قال رسول اللہ ﷺ ما من مسلم يدعو بدعوة ليس فيها اثم ولا قطيعة

رحم الا اعطاه الله بها احدى ثلاث اما ان يعجل له دعوته واما ان يدخر له

واما ان يكف عنه من السوء بمثلها قالوا اذن نكثر قال الله اكثر“

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کوئی مسلمان ایسا نہیں جو دعا کرے اس کی دعا گناہ پر مبنی نہ ہو اور اس کی دعا میں قطع رحم کا مطالبہ نہ ہو تو سوائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ اسے اس دعا کے ذریعے تین چیزوں میں ایک چیز عطا کرتا ہے۔ یا اس کی دعا کو جلدی قبول کر لیتا ہے یا اس کی دعا کو ذخیرہ بنا لیا جاتا ہے یا اس کی دعا کی مثل اسے گناہوں سے روک دیا جاتا ہے۔ صحابہ کرام ے کہا (یا رسول اللہ) اب تو ہم زیادہ دعا کریں

گے آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ بھی تمہیں زیادہ عطا کرے گا۔

☆ یہ حدیث ابو عمر بن عبد البر نے تخریج کی اور اسے ابو محمد عبد الحق نے صحیح کہا ہے اور یہ مؤطا میں بھی منقطع السند (سند کے انقطاع سے) موجود ہے اور ابو عمر نے کہا ہے یہ حدیث اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿أَدْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ﴾ کی تفسیر میں مسند طور پر بھی مذکور۔ اس حدیث سے یہ واضح ہو گیا کہ ہر دعا قبول ہوتی ہے:

☆ "وقال ابن عباس كل عبد دعا استجيب له فان كان الذي يدعو به رزقا له في الدنيا اعطيه وان لم يكن رزقا له في الدنيا ذخره له"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں ہر شخص کی دعا قبول کی جاتی ہے اگر وہ شخص جو دعا کر رہا ہے اس کا حصہ دنیا میں ہے تو دنیا میں ہی وہ چیز اسے عطا کر دی جاتی ہے اور اگر اس کا حصہ دنیا میں نہیں تو وہ اس کے لئے (آخرت میں) ذخیرہ بنا دی جاتی ہے۔

☆ "عن ابن عمر النبی ﷺ من فتح له في الدعاء فتحت له ابواب الجنة"

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ نے فرمایا جس شخص کے لئے دعا کا دروازہ کھول دیا گیا اس کے لئے جنت کے دروازے کھول دیئے گئے۔

☆ "واوحى الله تعالى الى داود ان قل للظلمة من عبادى لا يدعونى فاني اوجب على نفسي ان اجيب من دعائى واني اذا اجبت الظلمة لعنتهم"

اور اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کی طرف وحی کی کہ میرے ظالم بندوں کو کہو کہ مجھ سے دعا نہ کریں کیونکہ میں نے اپنے کرم سے اپنے نفس پر واجب کر دیا ہے کہ میں دعاؤں کو قبول کروں گا بیشک جب ظالموں کی دعا میں قبول کروں گا تو ان پر لعنت کروں گا۔

یہاں یہ بھی خیال رہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ظالم اپنے ظلم پر رجتے ہوئے مجھ سے کسی چیز کا مطالبہ نہ کریں ورنہ ان کی دعا کو ضرور قبول کیا جائے گا لیکن ان پر اس کے بدلے لعنت بھیجی جائے گی۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ظالم ظلم کو چھوڑ کر مجھ سے گناہوں کی معافی طلب نہ کریں اللہ تعالیٰ خوش ہوتا ہے کہ اس سے گناہوں کی معافی طلب کی جائے۔

دوسرا جواب: اللہ تعالیٰ دعا کو قبول کرتا ہے لیکن شرط یہ ہے کہ اس میں کوئی مانع موجود نہ ہو اگر کوئی مانع موجود ہو تو پھر دعا کی قبولیت اللہ تعالیٰ کی مشیت پر موقوف ہے رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُونَ إِلَيْهِ إِنْ شَاءَ﴾

”اگر اللہ چاہے تو تمہاری دعا کو قبول کر کے تمہارے ضرر دور کر دے“

☆ ”عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ ﷺ لا یزال یتستجاب للعبد ما لم یدع باثم او قطیعة مالم یتعجل قبل یا رسول اللہ ما الاستعجال قال یقول قد دعوت وقد دعوت فلم ار یتستجب لی فیستحسر عند ذلک یدع الدعاء“ (رواہ مسلم)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بندے کی دعا ہمیشہ قبول کی جاتی ہے جب تک وہ گناہ کی حصول کی دعا نہ کرے اور قطع رحم کی دعا نہ کرے اور جلدی نہ کرے صحابہ کرام نے عرض کیا یا رسول اللہ جلدی کرنے کا کیا مطلب ہے؟ آپ نے فرمایا ایک شخص دعا کرے تو یہ کہے کہ میری دعا تو قبول نہیں ہو رہی وہ اس دعا سے ملال میں پڑ جائے، تھک جائے اور دعا کرنی ہی چھوڑ دے اسی طرح ایک روایت بخاری، مسلم اور ابوداؤد نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بیان کی:

”ان رسول اللہ ﷺ قال یتستجاب لاحدکم ما لم یعجل بقول دعوت فلم یتستجب لی“

بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سے ہر ایک کی دعا کو قبول کیا جاتا ہے جب تک کہ وہ جلدی نہ کرے یعنی یہ کہے کہ میں نے دعا کی وہ قبول نہیں کی گئی (اس کا یہ کہنا دعا کی قبولیت سے مانع ہے) واضح ہوا کہ گناہوں کے حصول کی دعا اور قطع رحم کی دعا اور دعا سے ملال میں پڑ کر دعا کو چھوڑ دینا یہ سب ذرائع ہیں دعا کے قبول نہ ہونے کے۔ اور دعا کے نہ قبول ہونے کا سبب حرام مال کا کھانا بھی ہے رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی اس کی وضاحت کر رہا ہے:

”قال ﷺ الرجل یطیل السفر اشعث اغبر یمد یدہ الی السماء یا رب یا رب ومطعمہ حرام ومشربہ حرام وملسہ حرام وغذی بالحرام فانی یتستجاب لذلک“

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ایک شخص لمبا سفر کرتا ہے بال اسے کے بکھرے ہوئے اور غبار آلود

ہوتے ہیں وہ اپنے ہاتھوں کو آسمان کی طرف پھیلاتا ہے اور کہتا ہے اے میرے رب اے میرے رب اس کی دعا کب قبول ہوگی جب کہ اس کا کھانا حرام ہے اور پینا حرام ہے اور اس کا لباس حرام ہے اور اسے حرام غذا حاصل ہو رہی ہے۔

☆ ”وقیل لا براہیم بن ادہم ما بالنا ندعو فلا یتجاب لنا؟ قال لانکم عرفتم للہ فلم تطیعوہ وعرفتم الرسول فلم تتبعوا سنتہ وعرفتم القرآن فلم تعملوا بہ واکلتم نعم اللہ فلم تؤدوا شکرہا وعرفتم الجنة فلم تطلبوها وعرفتم النار فلم تهربوا منها وعرفتم الشیطان فلم تحاربوہ ووافقتموہ وعرفتم الموت فلم تستعدوا لہ ودفنتم الاموات فلم تعتبروا وترکتہم عیوبکم واشتغلتم بعیوب الناس“

حضرت ابراہیم بن ادہم رحمہ اللہ سے پوچھا گیا ہمارا کیا حال ہے ہم دعا کرتے ہیں ہماری دعا قبول نہیں کی جاتی؟ آپ نے فرمایا وجہ یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کو پہچانتے ہو لیکن اس کی اطاعت نہیں کرتے اور تم رسول اللہ ﷺ کو پہچانتے ہو لیکن تم ان کی سنت کی تابعداری نہیں کرتے اور تم قرآن کو پہچانتے ہو لیکن اس پر عمل نہیں کرتے ہو اور تم اللہ تعالیٰ کی نعمتیں کھاتے ہو لیکن تم ان نعمتوں کا شکر ادا نہیں کرتے اور تم جنت کو پہچانتے ہو لیکن اسے طلب نہیں کرتے (یعنی ایسے عمل نہیں کرتے جس سے جنت حاصل ہو جائے) اور تم آگ کو پہچانتے ہو لیکن اس سے بھاگتے نہیں (یعنی ان اعمال سے بچنے کی کوشش نہیں کرتے تو جہنم سے بچانے والے ہیں) اور تم شیطان کو پہچانتے ہو لیکن اس سے لڑائی نہیں کرتے (یعنی اس کی مخالفت نہیں کرتے) بلکہ اس کی موافقت کرتے ہو (اس کے کہنے پر چلتے ہو) اور تم موت کو پہچانتے ہو لیکن اس کے لئے تیاری نہیں کرتے اور تم فوت شدہ حضرات کو دفن تو کرتے ہو لیکن خود ان سے تم عبرت حاصل نہیں کرتے اور تم اپنے عیوب کی پرواہ نہیں کرتے ہو لیکن لوگوں کے عیوب کو تلاش کرنے میں مشغول رہتے ہو۔ (از قرطبی تبصر)

دعا کرنے والے کے لئے شرائط: دعا کرنے والے کے لئے یہ علم حاصل ہونا ضروری ہے ”لا قادر علی حاجتہ الا اللہ“ کہ اس کی حاجت کو حقیقی طور پر پورا کرنے والا صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے اور اس کے علم میں ہونا یہ بھی ضروری ہے ”وان الوسائط فی قبضتہ ومسخرۃ بتسخیرہ“ کہ تمام اسباب اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہیں اور اللہ تعالیٰ جن کو چاہے وہ اسباب ان کے تابع کر دے

یعنی مجازی طور پر بعض اسباب سے جن چیزوں کو حصول ہوتا ہے ان کے متعلق بھی معلوم ہونا چاہئے کہ یہ سب اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہیں۔ اور یہ ہے کہ دعا کرنے والا سچی نیت اور حضور قلب سے دعا کرے کیونکہ ”فان الله لا يستجيب دعاء من قلب غافل لاه“ بیشک اللہ تعالیٰ اس شخص کی دعا قبول نہیں فرماتا جو غافل دل اور لہو لعب میں مشغول دل سے دعا کرے۔ اور دعا کرنے والے کیلئے ضروری ہے کہ ”وان يكون مجتنباً لاكل الحرام“ حرام چیزوں کے استعمال سے اجتناب کرے یہاں یہ بھی خیال رہے کہ ”اكل الحرام“ کا بامحاورہ ترجمہ حرام اشیاء کا استعمال ہے۔ اور دعا کرنیوالے کیلئے یہ ضروری ہے ”وان لا يمل من الدعاء“ کہ دعا کرنے سے ملال میں نہ پڑے ایسا نہ ہو کہ یہ کہے میری دعا تو قبول نہیں ہوتی لہذا میں دعا کو ہی چھوڑ دیتا ہوں۔ (از قرطبی)

مطلوب چیز کے لئے شرط: جس چیز کو دعا میں طلب کر رہا ہے وہ شرعاً جائز ہو اس پر عمل کرنا جائز ہو کیونکہ نبی کریم ﷺ نے دعا کی قبولیت کو اس سے مشروط کیا ہے ”ما لم يدع باثم او قطيعة رحم“ کہ ہر دعا کرنے والے کی دعا قبول ہوتی ہے جب کہ وہ دعا گناہ کی اور قطع رحم کی نہ کرے ”فیدخل فی الاثم کل ما ياثم به من الذنوب“ نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی مطلق ہے اس لئے ہر قسم کے گناہوں کی دعا کرنا منع ہے کسی انسان کو ناحق نقصان پہنچانے کی دعا، چوری، ڈاکہ، غضب، جیب تراشی، قتل و غارت، حصول رشوت اور حصول مظالم وغیرہا کی دعا حرام ہے۔

”ویدخل فی الرحم جميع حقوق المسلمين ومظالمهم“ نبی کریم ﷺ نے جو ارشاد فرمایا کہ قطع رحم کی دعا نہ کی جائے اس میں مسلمانوں کے تمام حقوق داخل ہیں کہ مسلمانوں کے حقوق کو پائمال کرنے کی دعا نہ کرے اور اس میں تمام مظالم داخل ہیں کہ لوگوں پر ظلم کرنے کی دسترس کی دعا نہ کرے۔ (از قرطبی)

شروط دعائیات ہیں:

(۱) عاجزی سے دعا کرے۔ (۲) دعا کرنے والے کے دل میں خوف ہو۔

(۳) دعا کرنے والا دعا کی قبولیت کی امید کرے۔

(۴) دعا ہمیشہ کرتا ہی رہے، دعا سے دل ہٹائے نہیں۔

(۵) دعا کرنے والا خشوع سے دعا کرے۔

(۶) دعا کرنے والا عام لوگوں کے لئے دعا کرے صرف اپنے لئے دعا نہ کرے جب دعا میں عموم پایا جائے گا تو اور لوگوں کے لئے بھی اس میں بھلائی ہوگی اور ممکن ہے کہ کسی اور کے حق میں دعا کی قبولیت اس کے حق میں بھی قبولیت کا سبب بن جائے۔

(۷) اور دعا کرنے والا حلال چیزوں کا استعمال کرے۔ (از قریبی)

دعاء کے آداب: دعا کے بہت سے آداب ہیں جن میں سے ہم کچھ عرض کرتے ہیں:

(۱) دعا کے وقت چاہئے کہ ہتھیلیاں آسمان کی طرف پھیلی ہوں دونوں ہاتھوں میں کچھ فاصلہ ہونہ بہت نیچے ہوں اور نہ بہت اونچے بلکہ کندھے کے مقابل رہیں اور دعا کے بعد ان کو منہ پر پھیر لیا جائے۔ (مشکوٰۃ)

(۲) ضروری ہے کہ دعا کرنے والے کا رزق حلال ہو صوفیاء کرام فرماتے ہیں کہ دعا آسمان کے دروازہ کی کنجی ہے اور غذا حلال اس کنجی کے دانے۔ (روح البیان)

(۳) دعا کے وقت دل حاضر ہو۔

(۴) دعا کے وقت قبول کی قوی امید ہونا تا امیدوں کی دعا قبول نہیں ہوتی۔

(۵) طریقہ دعا یہ ہے کہ اولاً حمد الہی کرے پھر حضور ﷺ پر درود بھیجے پھر اپنے گناہوں کو یاد کر کے توبہ کرے اور پھر عرض حاجات کرے پھر درود شریف پر ختم کرے دعا کے وقت اپنے مقصد کو دھیان میں رکھے کیونکہ خیال کا بڑا اثر پڑتا ہے۔ (روح البیان)

(۶) بہتر ہے کہ صرف اپنے لئے دعا نہ کرے بلکہ اور مسلمانوں کے لئے بھی دعا کرے مگر ابتدا اپنے سے کرے۔ (نبی)

فائدہ: حضرت ابن عطار رحمہ اللہ فرماتے ہیں بیشک دعا کے لئے کچھ ارکان ہیں اور کچھ پر

ہیں اور کچھ اسباب ہیں اور کچھ اوقات ہیں:

”فان وافق ارکانہ قوی وان وافق اجنتہ طار فی السماء وان وافق

مواقبتہ فازوان وافق اسبابہ انجح“

جب دعا کے ارکان پائے جائیں گے تو دعا کو قوت حاصل ہوگی اور اگر دعا کے پر پائے گئے تو دعا کو آسمانوں تک اڑان حاصل ہوگی اور اگر دعا اوقات قبولیت میں پائی گئی تو کامیابی حاصل ہوگی اور اگر دعا میں اسباب پائے گئے تو دعا کی قبولیت میں کامیابی حاصل ہوگی۔

”فاركانه حضور القلب والرأفة والاستكانة والخشوع، واجنحته الصدق ومواقبته الاسحار واسبابه الصلوة علی محمد“

دعا کے ارکان یہ ہیں کہ دعا حضور قلب (حاضر دل) سے کرے دعا کرتے وقت نرمی، عجز اور خشوع پایا جائے اور دعا کا پر صدق ہے سچے دل سے دعا کرے اور صداقت سے کام لے اور کذب سے بچ جائے اور اس کے قبولیت کے اوقات میں سے سحری کا وقت خصوصی اہمیت رکھتا ہے اور دعا کی قبولیت کا سبب دعا سے پہلے اور دعا کے بعد درود شریف پڑھنا ہے:

”وقيل شرائطه اربع اولها حفظ القلب عند الوحدة وحفظ اللسان مع الخلق وحفظ العين عن النظر الى ما لا يحل وحفظ البطن من الحرام“

بعض حضرات نے بیان فرمایا ہے کہ دعا کی قبولیت کی شرائط چار ہیں ان میں سے پہلی یہ ہے کہ انسان جب اکیلا ہو تو اپنے دل کی حفاظت کرے کہ دل کو غفلت سے بچائے۔ اور جب مخلوق کے ساتھ اس کا معاملہ ہو تو زبان کو بچائے یعنی گالی گلوچ سے، غیبت سے، پھلخوری سے اور جھوٹ سے زبان کو محفوظ رکھے اور آنکھ کو ان چیزوں سے محفوظ رکھے جن کی طرف دیکھنا حلال نہیں۔ اور اپنے پیٹ کو حرام چیزوں سے بچا کر رکھے۔

”وقد قيل ان من شرط الدعاء ان يكون سليما من اللحن“

دعا کی قبولیت کی اور شرط یہ ہے کہ دعا میں لحن نہ پایا جائے کیونکہ سریلی آواز سے، ترنم سے دعا کرنے میں توجہ آواز کی طرف مبذول ہوتی ہے اس میں خشوع نہیں پایا جاتا۔ دعا کرنے والا یہ دعا نہ کرے: ”اللهم اعطني ان شئت اللهم اغفر لي ان شئت اللهم ارحمني ان شئت“ اے اللہ اگر تو چاہتا ہے تو مجھے عطا کر اگر تو چاہتا ہے تو میری مغفرت فرما اگر تو چاہتا ہے تو مجھ پر رحم فرما۔

(از لوطی)

خیال رہے کہ جو شرائط اور آداب ذکر کئے گئے ہیں وہ مجموعی طور پر دعا میں پائے جائیں تو دعا

میں مقبولیت پائی جاتی ہے۔

اوقات دعاء: بعض اوقات وہ ہیں جن میں غالباً دعا قبول ہوتی ہے وہ اوقات یہ ہیں۔ سحری کا وقت، افطار کا وقت، اذان اور اقامت کے درمیان، بدھ کے دن ظہر اور عصر کے درمیان، پریشانی کے وقت، دوران سفر، مرض کی حالت میں، بارش کے نازل ہونے کے وقت اور جہاد کی صف میں۔ (قرطبی)

تنبیہ: بعض حضرات دعا نہ کرنے کے قائل ہیں انہوں نے اپنے دلائل قائم کئے ہیں ان کے دلائل بمع جوابات کے ذکر کئے جا رہے ہیں تاکہ اصل مسئلہ نکھر کر سامنے آئے۔

ان حضرات کی پہلی دلیل یہ ہے کہ اگر کام نے عند اللہ ہونا ہے تو ضروری ہے کہ وہ کام ہو جائے گا اور اگر کام نے نہیں ہونا تو یقیناً نہیں ہوگا دعا کرنے کا مقصد کیا ہے۔ ان حضرات کی دوسری دلیل یہ ہے کہ حوادث بغیر مؤثر کے تو پائے نہیں جاسکتے اور حوادث مؤثر قدیم سے پائے جاسکتے ہیں جن کی انتہاء آخرت میں ہوگی تو اس سے بھی پتہ چلا کہ حوادث نے واقع ہونا ہی ہے۔ پھر دعا کرنے کا مقصد کیا ہے اور خصوصاً تقادیر تو لوح محفوظ میں لکھ دی گئی ہیں جب ان میں کمی اور زیادتی نہیں تو دعا کرنے کا کوئی فائدہ نہیں اور نبی کریم ﷺ کا ارشاد یہ ہے:

”قد رآ اللہ المقادیر قبل ان یخلق الخلق بكذا وكذا عاما“

اللہ تعالیٰ نے مخلوق کی تخلیق سے پہلے کئی سال تقادیر کو مقدر کر دیا ہے۔ اور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ”جف القلم بما هو کائن“ جس کام نے ہونا ہے قلم (اسے لکھ کر) خشک ہو چکی ہے ان حضرات کی اور دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ علام الغیوب ہے ”یعلم خائنة الاعین وما تخفی الصدور“ وہ آنکھ کی خیانت اور سینوں کی چھپی چیزوں کو جانتا ہے۔ پھر دعا کرنے کی کیا ضرورت جب کہ وہ ہمارے حالات سے باخبر ہے۔ اور ان کی دلیل یہ ہے کہ مطلوب دعا میں اگر بندوں کی مصلحت ہے تو پھر بھی دعا کا فائدہ نہیں اللہ تعالیٰ جواد ہے وہ اپنے بندوں کی مصلحتوں کو کیسے چھوڑے گا وہ تو اپنی صفت کریمی کی وجہ سے خود ہی اپنے بندوں پر رحم فرمائے گا۔ اور ان حضرات کی دلیل یہ ہے کہ عقل اس بات پر شاہد ہے اور احادیث صحیحہ سے یہ بات ثابت ہے کہ صدیقین کا اعلیٰ مقام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر پر راضی ہونا اور دعا اس کے منافی ہے۔ ان حضرات کی اور دلیل یہ ہے کہ امر اور نہی کے صیغے دعا

میں استعمال ہوتے ہیں تو بندہ مولیٰ کے حضور امر یا نہی کے صیغے استعمال کرے تو اس میں بے ادبی ہے۔
ان حضرات کی اور دلیل یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿من شغله ذكرى عن مسألتي اعطيته افضل ما اعطى السائلين﴾

”جو شخص مجھ سے سوال کرنے کے بجائے میری ذکر میں مشغول رہے تو میں اسے سوال کرنے والوں سے زیادہ عطا کرتا ہوں۔“

ان دلائل کے جوابات یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے علم کی کیفیت اور اس کی قضاء و قدر کی کیفیت عقول سے غائب ہے۔

”والحكمة الالهية تقتضى ان يكون العبد معلقا بين الرجاء والخوف

اللذين بهما تتم العبودية“

اور اللہ تعالیٰ کی حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ بندہ امید اور خوف کے درمیان معلق ہو کیونکہ امید اور خوف سے ہی عبودیت مکمل ہوتی ہے۔ اسی مسئلہ پر تکالیف کی دار و مدار ہے باوجود اس کے کہ اللہ تعالیٰ کا علم تمام چیزوں کا احاطہ کیا ہوا اور تمام چیزیں اللہ تعالیٰ کی قضا و قدر میں ہیں لیکن پھر بھی اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو امر و نہی کا مکلف بنایا۔ اسی اشکال کے پیش نظر صحابہ کرام نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھایا رسول اللہ آپ اس کے متعلق کیا فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہمارے اعمال کی تقادیر سے فارغ ہو چکا ہے یا کہ بعد میں وہ لکھے گا؟ آپ نے فرمایا وہ تقادیر سے فارغ ہو چکا ہے تو صحابہ کرام نے عرض کیا: ”ففيم العمل اذن“ پھر ہم عمل کیوں کریں ”قال اعملوا فكل ميسر لما خلق له“ آپ نے فرمایا عمل کرو جس کے لئے انسان پیدا کیا گیا ہے اپنے عمل سے اس کے لئے آسانی پیدا کرے۔

حدیث شریف میں پہلے تقدیر سے فراغت کا ذکر کیا گیا ہے جس میں خوف دلایا گیا ہے پھر عمل کرنے کا حکم دیا گیا ہے کہ اپنی زندگی میں عمل کر کے تقدیر کے مطابق آسانی پیدا کرے ”الا انك تحب ان تعلم ههنا فرق ما بين الميسر والمسخر“ خبردار بیشک تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ ميسر اور مسخر اور ہے یعنی عمل اس لئے کرو کہ تمہیں رب تعالیٰ نے مختار بنایا ہے اور عمل کا حکم دیا ہے تمہارے عمل پر جنت کو لازم نہیں کیا گیا۔

یہی حال رزق کا ہے اگرچہ رزق بھی تقدیر میں مقسوم اور معین ہے لیکن پھر بھی انسان کو کسب حلال کا حکم دیا گیا ہے اور دعا میں مقصد یہ نہیں ہوتا کہ اللہ تعالیٰ کو علم حاصل نہیں کہ اسے بتایا جائے وہ یقیناً عالم الغیب ہے بلکہ دعا میں مقصد اظہار عبودیت اور عجز و انکساری کا اظہار اور کامل طور پر اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنا مقصود ہوتا ہے۔ اور دعا میں عجز و انکساری کے اظہار کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی تقدیر و قضاء پر راضی ہونا مقصود ہے یہ بہت بڑا مقام ہے کیونکہ ”الرضاء بالقضاء“ عظیم عبادت ہے پھر دعا کرنا بھی عبادت ہے۔ (کبیر)

ہاں البتہ اللہ تعالیٰ کے ذکر میں مشغول رہنا اور اس خیال سے دعا نہ کرنا کہ وہ خود ہی مہربانی فرمادے گا میں تو عجز و انکساری سے اسکی عبادت کر رہی رہا ہوں یہ مستحسن امر ہے قابل اعتراض نہیں۔ (مرقاۃ ج ۵ ص ۳۲)

دعا کے عبادت ہونے اور دعا کے افضل ہونے کو احادیث مبارکہ کی روشنی میں دیکھا جائے تو دعا کا اہم ہونا واضح ہو جائے گا۔

دعا کے متعلق احادیث مبارکہ:

”عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ ﷺ لكل نبی دعوة مستجابة فتعجل کل نبی دعوته وانی اختبأت دعوتی شفاعة لامتی الی یوم القیامة فہی نائلة ان شاء اللہ من مات من امتی لا یشرک باللہ شیئا“

(روہ مسلم والبخاری الاصر منہ، مشکوٰۃ کتاب الدعوات)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہر نبی کو ایک قبول ہونے والی دعا عطا کی گئی ہر نبی نے اس دعا میں جلدی کر لی اور بیشک میں نے اپنی دعا کو چھپا کر رکھ لیا ہے یعنی قیامت تک اسے اپنی امت کو شفاعت کے لئے مؤخر کر دیا ہے۔ وہ (میری شفاعت) میری امت کے ہر شخص کو پہنچے گی بشرطیکہ اس نے اللہ تعالیٰ سے کوئی شریک نہ ٹھہرایا ہو۔

وضاحت حدیث:

”(لكل نبی دعوة مستجابة) ای فی حق مخالفی امتہ جمیعہم بالاستئصال“

یعنی ہر نبی کو ایک قبول ہونے والی وہ دعا عطا کی گئی جس سے وہ اپنی امت میں سے اپنے مخالفین

کو تباہ و برباد کر دے۔ مطلب یہ ہے کہ ہر نبی کو ایک خصوصی دعا کرنے کا حق دیا گیا اور ساتھ ساتھ بتا دیا گیا کہ یہ دعا تمہاری ضرورت قبول کی جائے گی۔ باقی دعائیں اگرچہ انبیاء کرام کی شرف قبولیت حاصل کر لیتی ہیں لیکن ان کی قبولیت کا وعدہ نہیں کیا گیا۔

”فتمجل کل نبی دعوتہ“ (ہر نبی نے اپنی اپنی دعا میں جلدی کر لی) یعنی نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کی ہلاکت کی دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے آپ کی قوم کو غرق کر دیا۔ اور ہود علیہ السلام نے اپنی قوم کی ہلاکت کی دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کی زوردار گرد آواز سے ان کو ہلاک کر دیا۔

”وانی اختبات دعوتی“ اور میں نے اپنی دعا کو چھپا کر رکھ لیا ہے یعنی اسے ذخیرہ بنا لیا ہے قیامت کے لئے اسے جمع کر لیا ہے ”وہو الاختفاء بالصبر علی اذی قومہ لانی بعثت رحمة للعالمین“ یعنی آپ کے ارشاد کا یہ مطلب ہے کہ میں نے اپنی قوم کی اذیت پر صبر کر کے اپنی دعا کو مخفی کر لیا ہے کیونکہ مجھے رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجا گیا۔

”شفاعة لامتی الی یوم القیامة ای مؤخرۃ الی ذلک الیوم“

”میرے پیارے حبیب علیہ السلام نے اپنی رحمۃ کاملہ کی وجہ سے اپنی دعا کو اپنی امت کی شفاعت کیلئے قیامت تک مؤخر کر دیا ہے۔“ جن لوگوں نے آپ کی دعوت پر ایمان لایا اور پھر شرک نہیں کیا تو ان تمام کو مصطفیٰ کریم ﷺ کی شفاعت سے فائدہ حاصل ہوگا۔ (از مرقاة ج ۵ ص ۲۳)

☆ ”عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ ﷺ اذا دعا احدکم فلا یقل اللہم اغفر لی ان شئت ارحمنی ان شئت ارزقنی ان شئت ولیعزم مسئلتہ انہ یفعل ما یشاء ولا مکرہ لہ“

(رواہ البخاری، مشکوٰۃ کتاب الدعوات)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تم میں سے کوئی ایک دعا کرے یہ نہ کہے اے اللہ اگر تو چاہتا ہے تو میری مغفرت فرما اگر تو چاہتا ہے تو مجھے رزق عطا فرما اگر تو چاہتا ہے تو مجھ پر رحم فرما بلکہ وہ پختہ عزم سے سوال کرے اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے وہی کرتا اور اللہ پر کوئی جبر نہیں کر سکتا۔

وضاحت حدیث: ”ان شئت“ کہنے سے ممانعت کی وجہ کیا ہے؟ ”لانہ شک فی القبول واللہ تعالیٰ کریم لا یبخل عندہ فلیستیقن بالقبول“ وجہ اس کی یہ ہے کہ اگر دعا میں یہ کہا جاتا

اگر تو چاہتا ہے تو میرا یہ کام کر تو اس دعا کرنے والے نے اللہ تعالیٰ کی قبولیت میں شک کیا ہے اور اللہ تعالیٰ کریم ہے وہ بخیل (کنجوس) نہیں لہذا رب تعالیٰ سے جب دعا کرے تو اس کی قبولیت کا یقین کرے۔

”وليعزم مسئلته، ای لیطلب جازما من غير شك“ یعنی اللہ تعالیٰ سے جو چیز طلب کرے اس میں شک نہ کرے بلکہ یقین رکھے اور پختہ ارادہ سے اس سے سوال کرے۔

☆ ”عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ ﷺ اذا دعا احدکم فلا يقل اللهم اغفر لی ان شئت ولكن ليعزم وليعظم الرغبة فان الله لا يتعاظمه شئ اعطاه“

(رواہ مسلم مشکوٰۃ کتاب الدعوات)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تم میں سے کوئی ایک شخص دعا کرے تو یہ نہ کہے اے اللہ اگر تو چاہتا ہے تو میری مغفرت فرما لیکن پختہ ارادہ سے دعا کرے اور عظیم رغبت سے دعا کرے بیشک اللہ تعالیٰ جو عطا فرماتا ہے اس کے سامنے وہ چیز کوئی عظیم نہیں ہوتی۔
وضاحت حدیث:

پہلے الفاظ کی وضاحت تو مندرجہ بالا حدیث میں گزر چکی ہے البتہ آگے الفاظ کی وضاحت کی جاتی ہے:
”وليعظم (بالتشديد على) الرغبة (ای الميل فيه بالالاحاح والوسائل“

یعنی انسان رب تعالیٰ سے عظیم رغبت سے دعا کرے عاجزی سے گڑگڑا کر دعا کرے اور دعا کی قبولیت کے تمام وسائل (جن کو پہلے ذکر کر دیا گیا ہے) کو اپنے کام میں لائے۔ ”فان الله لا يتعاظمه شئ اعطاه“ بیشک اللہ تعالیٰ کا کوئی چیز عطا کرنا اس کے سامنے عظیم نہیں۔

”لا يعظم عليه اعطاه شئ بل جميع الموجودات في امره يسير وهو

على كل شئ قدير“

اللہ تعالیٰ کسی کو کچھ عطاء کرے تو اس پر وہ چیز عطا کرنا بھاری نہیں ہوتا بلکہ وہ تمام مخلوق کو جو چیز عطا کرتا ہے اس پر وہ آسان ہوتا ہے کیونکہ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ ایک اور حدیث شریف میں ہے:

”لواجتمع الاولون والاخرون على صعيد واحد فسال كل مسالته

واعطيه اياها ما نقص ذلك من ملكي شئ“

اگر پہلے اور پچھلے تمام لوگ ایک میدان میں جمع ہو جائیں رب تعالیٰ سے اپنے سوال کریں

تو رب تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں ہر ایک کو اس کے سوال کے مطابق عطا کر دوں تو میری بادشاہی میں ذرا بھر کسی چیز کی کمی نہیں ہوتی۔

☆ ”وعن ابی الدرداء قال قال رسول اللہ ﷺ دعوة المرء المسلم لآخيه بظهر الغيب مستجابة عند رأسه ملك موكل كلما دعا لآخيه بخير قال الملك لموكل به آمين ولك بمثل“ (رواہ مسلم، مشکوٰۃ کتاب الدعوات)

حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مسلمان شخص اپنے مومن بھائی کے لئے اس کی غیر موجودگی میں دعا کرے تو اس دعا کو قبول کیا جاتا ہے اس دعا کرنے والے کے سر پر ایک فرشتہ موکل ہوتا ہے جب وہ اپنے بھائی کے لئے خیر کی دعا کرتا ہے تو وہ موکل فرشتہ آمین کہتا ہے اور تمہارے لئے بھی اسی کی مثل۔

وضاحت: کافی حد تک حدیث پاک کا مطلب ترجمہ سے ہی سمجھ آ رہا ہے کہ کوئی مسلمان مرد یا عورت اپنے مسلمان بھائی یا بہن کے لئے اس کی غیر موجودگی میں دعا کرے تو اس دعا کو شرف قبولیت زیادہ حاصل ہوتا ہے کیونکہ اس دعا میں خلوص پایا جاتا ہے وہ دکھلاوے اور چرچے سے پاک ہوتی ہے کسی کے سامنے دعا کرنے میں احتمال پایا جاتا ہے کہ ہو سکتا ہے یہ دکھلاوے سے کام لے رہا ہو۔ اگر کسی کے سامنے دعا بھی خلوص سے کی جائے تو یقیناً اسے بھی قبولیت حاصل ہوگی۔ اصل قبولیت کی وجہ کو مد نظر رکھا جائے تو راقم کی وضاحت سمجھ آ جائے گی۔

ایک فرشتہ اس کی دعا پر آمین کہنے کے لئے مقرر کر دیا جاتا ہے جب وہ اپنے مومن بھائی کے لئے اس کی غیر موجودگی میں دعا کرتا ہے تو فرشتہ آمین کہتا ہے یعنی جس کے لئے دعا کی جاتی ہے اس کیلئے بھی آمین کہتا ہے اور دعا کرنے والے کے لئے اسی کی مثل وہ فرشتہ دعا کرتا ہے اور آمین کہتا ہے۔

☆ ”وعن جابر قال قال رسول اللہ ﷺ لا تدعوا علی انفسکم ولا تدعوا علی اولادکم ولا تدعوا علی اموالکم لاتوا فقوا من اللہ ساعة یسئل فیہا عطاء فیستجیب لکم“ (رواہ مسلم، مشکوٰۃ کتاب الدعوات)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اپنی جانوں کے خلاف دعا نہ کرو اور اپنی اولاد کے خلاف دعا نہ کرو اور اپنے مالوں کے خلاف دعا نہ کرو اور اپنی دعا کو اس گھڑی کے موافق نہ کرو جس میں اللہ تعالیٰ سے سوال کیا جائے تو وہ عطا کرتا ہے۔

وضاحت حدیث: یعنی دن رات میں ایک گھڑی وہ بھی آتی ہے جس میں رب تعالیٰ سے جو طلب کیا جائے وہ عطا کرتا ہے اس گھڑی کو معین نہیں فرمایا گیا اس لئے تم اپنی ہلاکت یا اپنی اولاد کی ہلاکت اور اپنے مالوں (یعنی غلاموں اور باندیوں اور جانوروں) کی ہلاکت کی دعا نہ کرو ہو سکتا ہے وہ گھڑی مقبولیت کی ہو جس میں تم دعا کر رہے ہو کہ میں ہلاک ہو جاؤں برباد ہو جاؤں۔ یا تم دعا میں اولاد کے متعلق یہ کہہ رہے ہو کہ تم ہلاک ہو جاؤ تمہارے پاس کچھ نہ رہے تم اندھے ہو جاؤ تمہارے ہاتھ پاؤں ٹوٹ جائیں۔ یا تم دعا کر رہے ہو کہ یہ مال ہلاک ہو جائے وغیرہ تو اس مقبولیت کی گھڑی میں تمہاری دعا مقبول ہو کر تمہاری اور تمہاری اولاد کے لئے اور تمہارے مالوں کے لئے بربادی کا سبب نہ بن جائے۔

☆ "عن النعمان بن بشیر قال قال رسول الله ﷺ الدعاء هو العبادة ثم قرأ وقال رَبُّكُمْ ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ"

(رواه احمد والترمذی وابوداؤد والنسائی وابن ماجہ، مشکوٰۃ کتاب الدعوات)

نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دعا عبادت ہی ہے پھر آپ نے پڑھا "وَقَالَ رَبُّكُمْ ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ" اور آپ کے رب نے کہا مجھ سے دعا کرو میں تمہاری دعا کو قبول کروں گا۔

وضاحت حدیث: "الدعاء هو العبادة" میں مبتدا اور خبر دونوں معرفہ ہیں درمیان میں ضمیر ہے اس میں حصر پائی گئی ہے یعنی دعا عبادت ہی ہے راقم کا یہ ترجمہ قصر الصفة علی الموصوف کے ضابطہ کے مطابق ہے جس کو دینی طلباء کرام بخوبی سمجھتے ہیں۔ دعا عبادت حقیقیہ ہے یعنی دعا میں یہ اہلیت پائی گئی ہے کہ اسے عبادت کہا جائے اس کی وجہ یہ ہے:

"لذلّٰله علی الاقبال علی اللّٰه والاعراض عما سواہ بحیث لا یرجو ولا

یخاف الا ایّاه قائما بوجوب العبودیۃ معترفا بحق الربوبیۃ عالما بنعمۃ

الا یجاد طالبا لمدد الامداد علی وفق المراد وتوفیق الاسعاد"

کہ دعا میں انسان کی کامل توجہ اللہ تعالیٰ کی طرف ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کے ماسوا سے وہ اعراض کر رہا ہوتا کہ اس لحاظ پر کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بغیر کسی سے امید نہیں کر رہا ہوتا کسی کا خوف اسے نہیں ہوتا، وہ وجوب عبودیت کو قائم کرنے والا ہوتا ہے حق ربوبیت کا معترف ہوتا ہے، وہ ایجاد کی نعمت کو

جاننے والا ہوتا ہے، وہ اپنی مراد کے مطابق رب تعالیٰ سے ہی کامل امداد طلب کر رہا ہوتا ہے اور اسی سے نیک بختی کی توفیق طلب کر رہا ہوتا ہے۔ پھر نبی کریم ﷺ نے اپنے ارشاد پر اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے دلیل پیش فرمائی: ”وَقَالَ رَبُّكُمْ ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ“ کیونکہ رب تعالیٰ نے دعا کرنے کا حکم دیا ہے ”والمأمور به عبادة“ جس چیز کا رب تعالیٰ کی طرف سے حکم دیا جائے وہ عبادت ہوتا ہے۔

قاضی عیاض رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ آیت کریمہ سے مقصد بیان یہ تھا کہ آیت کریمہ کے الفاظ مبارکہ اس پر دلالت کر رہے ہیں۔ کہ جزاء مرتب ہے شرط پر اور مسبب مرتب ہے سبب پر۔ جس سے یہ واضح ہوا ”ویسکون اتم العبادات“ کہ دعا عبادات کی تکمیل کا ذریعہ ہے جس پر دوسری حدیث ”الدعاء مخ العبادة“ (دعا عبادت کا مغز ہے) دلالت کر رہی ہے۔

چونکہ یہ پہلے بیان کیا گیا ہے کہ دعا میں عبودیت کا حق ادا کرنا ہے اور عبودیت کے متعلق علامہ راغب اصفہانی رحمہ اللہ بیان فرماتے ہیں ”العبودية اظهار التذلل“ عبودیت عجز کا اظہار ہے اور کوئی عبادت اس سے زیادہ افضل نہیں کیونکہ سب سے زیادہ عجز کا اظہار اس ذات کے سامنے ہوگا ”من له غاية الافضال وهو الله تعالى“ جس کو بہت بڑی فضیلت حاصل ہوگی سب سے زیادہ افضل اور سب سے زیادہ فضل فرمانے والا صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے۔

علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے ارشاد ”الدعاء هو العبادة“ میں عبادت کا لغوی معنی لینا بھی ممکن ہے کیونکہ عبادت کا لغوی معنی یہ ہے ”هو غاية التذلل والافتقار والاستكانة“ کہ جس میں بہت زیادہ عجز اور محتاجی اور مسکینی پائی جائے وہ عبادت ہے اور یہ بھی واضح ہے ”وما شرعت العبادة الا للخضوع للبارئى و اظهار الافتقار“ کہ عبادت کو مشروع ہی اس لئے کیا گیا ہے کہ باری تعالیٰ کے حضور اظہار عجز کرے اور اپنی احتیاجی کا اظہار اسی سے کرے۔ آیت کریمہ کے بعد والے الفاظ اس پر دلالت کر رہے ہیں:

﴿إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِي سَيَدْخُلُونَ جَهَنَّمَ دَاخِرِينَ﴾

”بیشک وہ لوگ جو میری عبادت سے تکبر کرتے ہیں وہ جہنم میں ذلیل ہو کر داخل ہوں گے۔“

رب تعالیٰ نے بندوں کے عجز کے اظہار نہ کرنے اور اپنے احتیاجی کو اس کے حضور نہ پیش کرنے

کو تکبر سے تعبیر فرمایا کہ وہ لوگ متکبر ہیں ”ووضع عبادتی موضع دعائی“ اور ”عن عبادتی“ کو ”عن دعائی“ کی جگہ رکھ کر یہ ثابت فرمایا کہ میری عبادت یعنی مجھ سے دعا کرنے میں تکبر کرنے والے جہنم میں ذلیل ہو کر داخل ہوں گے۔

جگہ جگہ پر دعا سے روکنے والے فرضوں کے بعد دعا نہیں، نماز سے فارغ ہونے پر دعا نہیں، جنازہ کے بعد دعا نہیں، میت کے ایصال ثواب کے لئے دعا نہیں، چوتھے دن، چالیسویں دن دعا نہیں، کوئی فوت ہو جائے تو اس کے اقرباء کے پاس جا کر دعا کرنا ثابت نہیں۔ ایسے لوگ متکبر ہیں عبادت سے منہ موڑنے والے ہیں، ذلیل ہیں جہنم کا ایندھن ہیں خود تو گمراہ ہیں لیکن دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں ایسے ذلیلوں سے بچ کر رہیں صرف اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اللہ ﷺ کے حکم پر عمل کرتے ہوئے زیادہ سے زیادہ دعا کریں کیونکہ جتنی زیادہ دعا کریں گے اتنی ہی زیادہ عبادت پائی جائے گی۔

تنبیہ: علامہ میرک رحمہ اللہ نے ”الدعاء هو العبادة“ میں خبر کے معرف باللام ہونے اور مبتدا اور خبر کے درمیان ضمیر فصل لانے سے حصر کا معنی ثابت کرتے ہوئے یہ بیان فرمایا کہ ان الفاظ گرامی کا مطلب یہ ہے ”ان العبادة ليست غير الدعاء“ کہ بیشک عبادت سوائے دعا کے نہیں۔ اس میں مبالغہ پایا گیا ہے اور معنی یہ ہے ”ان الدعاء معظم العبادة“ بیشک دعا عظیم عبادت ہے۔ جس طرح نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ”الحج عرفة“ (حج عرفہ ہے) اس کا مطلب یہ ہے کہ حج کے ارکان میں سے عرفہ عظیم رکن ہے اسی طرح مطلب اس حدیث کا یہ ہوگا کہ عبادات میں سے عظیم عبادت دعا ہے۔ یہ معنی قصر الموصوف علی الصفة کے ضابطہ کے مطابق ہے لیکن راقم نے جو ترجمہ قصر الصفة علی الموصوف کا کیا ہے اسے علامہ ابن حجر رحمہ اللہ سے تائید حاصل ہے کیونکہ انہوں نے کہا ”وصوابه ان الدعاء ليس غير العبادة“ درست معنی یہ ہے کہ بیشک دعا عبادت کا غیر نہیں۔ اگرچہ علامہ ابن حجر رحمہ اللہ کے قول پر ملا علی قاری رحمہ اللہ نے بحث بھی کی ہے لیکن راقم کا ذہن جس بزرگ کا قول قبول کرے اسے نقل کر دیتا ہے یہ کبھی نہیں دیکھا کہ کس نے کیا کہا ہے اور کس نے کیا کہا ہے۔

اور یہ بھی خیال رہے کہ اس حدیث کو ترمذی نے ”حدیث حسن صحیح“ (یہ حدیث حسن صحیح ہے) اور حاکم نے بھی اس حدیث کو ذکر کر کے صحیح الاسناد کہا ہے اور اس حدیث کو طبرانی نے بھی

(ازمرقاۃ)

کتاب الدعاء میں ذکر کیا ہے۔

☆ "عن انس قال قال رسول الله ﷺ الدعاء مخ العبادة"

(رواه الترمذی ، مشکوٰۃ کتاب الدعوات)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دعا عبادت کا مغز ہے۔

"والمعنى ان العبادة لا تقوم الا بالدعاء كما ان الانسان لا يقوم الا بالمخ" (مرقاۃ)

حدیث کا مطلب یہ ہے کہ عبادت بغیر دعا کے قائم نہیں ہو سکتی جس طرح انسان بغیر دماغ کے قائم نہیں ہو سکتا۔ "مخ الشئ خالصه وما يقوم به" کسی چیز کا جس سے قیام ہو اور جو اس کے لئے خالص ہو اسے "مخ" کہا جاتا۔ جس طرح انسان کا قیام دماغ سے ہے تو اس مغز کو "مخ" کہا جائے گا گویا انسان میں خالص چیز وہی ہے اسی طرح آنکھ کی پتلی آنکھ کے لئے "مخ" ہے اور ہڈیوں کی چربی ہڈیوں کے لئے "مخ" ہے۔

☆ "وعن ابی ہریرۃ قال قال رسول الله ﷺ ليس شئ اكرم على الله من الدعاء"

(رواه الترمذی وابن ماجہ وقال الترمذی هذا حديث حسن غريب ، مشکوٰۃ کتاب الدعوات)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کے ہاں دعا سے

افضل کوئی چیز نہیں۔

وضاحت: اس حدیث پر بظاہر یہ وہم ہوتا ہے کہ رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے ﴿إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاهُمْ﴾ بیشک تم میں زیادہ مکرم اللہ تعالیٰ کے ہاں وہ ہے جس میں تقویٰ زیادہ پایا جائے ان میں تعارض ہے۔ حدیث پاک سے ثابت ہے کہ دعا اکرم و افضل ہے اور قرآن پاک سے ثابت ہے کہ تقویٰ اکرم و افضل ہے ان میں تطبیق کیسے پائی جائے گی تو اس کا جواب یہ ہے کہ ان میں کوئی تعارض نہیں کیونکہ دعا عبادت ہے اور عبادت سے تقویٰ حاصل ہوتا ہے لہذا معلوم ہوا کہ دعا اکرم ہے کیونکہ عبادت ہے اور اسی عبادت سے حاصل ہونے والا تقویٰ بھی یقیناً مکرم ہوگا۔

☆ "وعن سلمان الفارسی قال قال رسول الله ﷺ لا يرد القضاء الا الدعاء ولا يزيد في العمر الا البر"

(رواه الترمذی ، مشکوٰۃ کتاب الدعوات)

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قضاء رد نہیں ہوتی

سوائے دعا کے اور عمر میں زیادتی نہیں ہوتی سوائے نیکی کے۔

وضاحت حدیث: قضاء سے مراد امر مقدر یعنی جو چیز تقدیر میں ہے تقدیر رد ہونے کا ایک مطلب یہ ہے کہ انسان کسی مکروہ (ناپسندیدہ، مصیبت) چیز کے واقع ہونے کا خوف رکھتا ہو تو اس شے سے بچنے کی کوشش میں اللہ تعالیٰ نے اسے دعا کی توفیق عطا فرمادی اس دعا کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے اس کو بچالیا۔ مجازی طور پر اسے تقدیر کے ٹلنے سے تعبیر کر دیا رسول اللہ ﷺ نے دم کرنے کو تقدیر کا حصہ قرار دیا پھر مریض کو دواء لینے کا حکم دیا اور دعا کرنے کا حکم دیا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ شام کے علاقہ میں گئے تو آپ کو پتہ چلا کہ وہاں طاعون کی مرض پھیلی ہوئی ہے آپ وہاں سے لوٹ پڑے۔ تو حضرت ابو عبیدہ نے کہا ”اتفر من القضاء یا امیر المؤمنین“ اے امیر المؤمنین کیا تم تقدیر سے بھاگ رہے ہو؟ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا اے ابو عبیدہ ”لو غیرک قالھا“ کاش تمہارا غیر یہ کہتا۔ یعنی کوئی جاہل یہ بات کرتا تو تعجب نہ ہوتا لیکن تم تو صاحب علم شخصیت ہو تم نے یہ کیا کہا ہے؟ اس پر تعجب ہے ہاں یہ بات سن لو ”نعم نفر من قضاء اللہ الی قضاء اللہ“ ہم اللہ تعالیٰ کی تقدیر سے اللہ کی تقدیر کی طرف بھاگے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ہمارا یہاں آنا بھی تقدیر کے مطابق ہے اور ہمارا یہاں سے جانا بھی تقدیر کے مطابق ہے۔ ”ولا یزید فی العمر الا البر“ عمر میں زیادتی نہیں ہوتی سوائے نیکی کے ”البر“ بکسر الباء وهو الاحسان والطاعة ”البر“ کا معنی احسان اور طاعت ہے۔

عمر کی زیادتی سے کیا مراد ہے؟ بعض حضرات نے کہا حقیقی طور پر عمر کی زیادتی ہوتی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد اس پر دلالت کر رہا ہے ”وما یعمر من معمر ولا ینقص من عمرہ الا فی کتاب“ کسی کی عمر میں زیادتی نہیں کی جاتی اور کسی کی عمر کو کم نہیں کیا جاتا مگر یہ کہ وہ کتاب (لوح محفوظ) میں ہے۔

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ”یمحو اللہ ما یشاء ویثبت وعنده ام الكتاب“ اللہ تعالیٰ مٹاتا ہے جو چاہے اور ثابت رکھتا ہے جو چاہے ام الكتاب (لوح محفوظ) اسی کے پاس ہے۔ اور کشاف میں ذکر کیا گیا ہے ”انہ لا یطول عمر انسان ولا یقصر الی فی کتاب“ بیشک کسی انسان کی

عمر لمی نہیں ہوتی اور نہ ہی چھوٹی ہوتی ہے مگر یہ کہ وہ کتاب میں (لوح محفوظ میں) پائی جاتی ہے۔

صورت اس کی یہ ہے کہ لوح محفوظ میں لکھا جاتا ہے کہ اگر فلاں نے حج نہ کیا یا جہاد میں شریک نہ ہوا تو عمر اس کی (مثال کے طور پر) چالیس سال ہوگی اور اگر اس نے حج کر لیا یا جہاد میں شریک ہو گیا تو اس کی عمر ساٹھ سال ہوگی۔ گویا کہ جب اس نے نیکی کے کام پر عمل کیا تو عمر بڑھ گئی اور نیکی کا کام نہ کیا تو عمر کم ہو گئی۔ عمر کی زیادتی کا اور مطلب یہ ہے ”انہ اذا بر لا یضیع عمرہ فکأنہ زاد“ کہ بیشک جب وہ نیکی کرے گا تو اس کی عمر ضائع نہیں ہوگی (اور گناہ کرنے کی وجہ سے گویا کہ عمر ضائع ہو جائے گی)۔

عمر کی زیادتی کا اور مطلب یہ ہے کہ نیکی کے اعمال عمر کی زیادتی کا سبب ہیں یہ بھی تقدیر میں موجود ہے جیسا کہ دعا کا رد البلاء ہونا بھی تقدیر میں موجود ہے:

”فالدعاء للوالدین وبقیة الارحام یشد فی العمر اما بمعنی انہ یشد
لہ فی عمرہ فیسیر لہ فی الزمن القلیل من الاعمال الصالحة مالا
یتسیر لغيرہ من العمل الکثیر“

یعنی والدین کی دعا اور قریبی رشتہ داروں کی دعا عمر میں زیادتی کرتی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اس شخص کی عمر میں برکت پائی جاتی ہے تھوڑے سے وقت میں وہ اتنے زیادہ نیک عمل کر لیتا ہے جتنے عمل دوسرا کوئی شخص نہیں کر سکتا۔ (ازمرقاۃ)

☆ ”وعن ابن عمر قال قال رسول اللہ ﷺ ان الدعاء ینفع ممانزل ومما لم ینزل
فعلیکم عباد اللہ بالدعاء“ (رواہ الترمذی ورواہ احمد عن معاذ بن جبل وقال الترمذی هذا حدیث غریب

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک دعا اس چیز میں بھی نفع دیتی ہے جو واقع ہو چکی ہے اور جو واقع نہیں ہوئی اسمیں بھی نفع دینی والی ہے اے اللہ کے بندوں تم پر لازم ہے کہ دعا کرو۔

وضاحت حدیث: یعنی جو مصیبت وغیرہ واقع ہو جائے اسے صبر سے برداشت کرے اور دعا کرتا رہے تو اللہ تعالیٰ اس میں آسانی پیدا فرمائے گا اور جو مصیبت واقع نہیں ہوئی جب دعا کرے گا تو اللہ تعالیٰ اسے پھیر دے گا وہ مصیبت واقع ہونے سے مندرفع ہو جائے (ٹل جائے گی)۔ جب دعا کا یہ

مقام ہے تو اے اللہ کے بندو تم پر لازم ہے کہ دعا کرو ” لانه من لوازم العبودية التي هي القيام بحق الربوبية “ اس لئے کہ دعا میں غبودیت یعنی عجز و انکساری پائی جاتی ہے انسان کے لئے لازم ہے کہ وہ رب تعالیٰ کی ربوبیت کا اپنی غبودیت کے ذریعے حق ادا کرے۔

☆ ” وعن ابن مسعود قال قال رسول الله ﷺ سلوا الله من فضله فان الله يحب ان يسئل و افضل العبادۃ انتظار الفرج “ (رواه الترمذی وقال هذا حديث غریب)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ سے اس کے فضل کا سوال کرو بیشک اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے کہ اس سے سوال کیا جائے اور افضل عبادت یہ ہے کہ کشادگی کی انتظار کی جائے۔

وضاحت حدیث: جب اللہ تعالیٰ وسیع فضل کا مالک ہے اور وہ کامل صفات کا مالک ہے یعنی ” انہ کریم منعم و هاب معط غنی مغن باسط “ وہ ذات کریم ہے انعام عطا فرمانے والا ہے اور بخشش عطا فرمانے والا ہے اور عطیات عطاء کرنے والا ہے اور غنی ہے اور غنی کرنے والا ہے اور کشادگی عطاء کرنے والا ہے ” يحب ان يسأل “ اس لئے وہ پسند فرماتا ہے کہ اس سے اس کے فضل کو طلب کیا جائے ” وفيه ايماء الى ان احدا لم يقدر على عدله “ اسی سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ ہر انسان اللہ تعالیٰ سے اس کے فضل کو ہی طلب کرے کسی انسان کی یہ مجال نہیں کہ وہ اس کے عدل کا سامنا کر سکے۔

” و افضل العبادۃ انتظار الفرج “ یعنی افضل عبادت یہ ہے کہ انسان مصیبت اور حزن کے جانے کی انتظار کرے کیونکہ انسان جب اپنی مصیبتوں کی شکایت اللہ تعالیٰ کے غیر کی طرف نہیں کرے گا تو یہ افضل عبادت ہوگی۔

” و كونه افضل العبادۃ لان الصبر في البلاء انقياد للقضاء و ذلك

فضل الله يؤتيه من يشاء “

کیونکہ مصیبت پر صبر کرنا، تقدیر پر راضی ہونا بہت بڑی افضل عبادت ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے جسے چاہے عطا کرتا ہے۔

☆ "عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ ﷺ من لم یسأل اللہ یغضب علیہ"

(رواہ الترمذی، مشکوٰۃ کتاب الدعوات)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص اللہ تعالیٰ سے سوال نہیں کرتا اللہ تعالیٰ اس پر غضب فرماتا ہے۔

وضاحت حدیث: "لان ترک السؤال تکبر واستغناء وهذا لا يجوز للعبد"

اس لئے کہ رب تعالیٰ سے سوال نہ کرنا علامت ہے۔ (ازمراقۃ) اس بات کی کہ وہ شخص متکبر ہے اور مستغنی ہے بندے کیلئے یہ جائز نہیں کہ وہ اپنے آپ کو رب تعالیٰ سے مستغنی سمجھے اور اس کے سامنے تکبر کا اظہار کرے۔ حدیث شریف میں "غضب" کا جو ذکر ہے اس سے مراد سزا دینا ہے۔ علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"وذلك لان الله يحب ان يسأل من فضله فمن لم يسأل الله يغضبه
والمبغوض مغضوب عليه لا محالة"

کہ دونوں احادیث کا مطلب یہ ہے کہ بیشک اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے کہ اس سے اس کے فضل کو طلب کیا جائے جو شخص اللہ تعالیٰ سے سوال نہیں کرتا اللہ تعالیٰ اس پر ناراض ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ جس سے ناراض ہوگا یقیناً اس پر اللہ تعالیٰ کا غضب بھی ہوگا۔ اللہ تعالیٰ سے مانگنے اور بندوں سے مانگنے کو کسی شاعر نے کیا خوب بیان فرمایا:

اللہ یغضب ان ترک سؤالہ وبنی آدم حین یسئل یغضب

اللہ سے سوال کرنا چھوڑ دو تو وہ اس پر ناراض ہوتا اور بندوں سے سوال کر دو تو وہ اس پر ناراض ہوتے ہیں

دعا خواہ لسان مقال (زبان) سے کرے یا لسان حال (دل کی توجہ) سے کرے ہر حال میں بہتر ہے بلکہ بلند پایہ شخصیات کی دعا لسان حال سے ہی زیادہ ثابت ہے "یعنی ان السؤال بلسان الحال ادعی الی وصول الکمال من بیان المقال" زبان حال سے سوال کرنا بنسبت زبان مقال سے سوال کرنے کے زیادہ کمال تک پہنچانے والا ہے۔ حدیث صحیح میں ہے "من شغلہ ذکری عن مسئلتی اعطیتہ الفضل ما اعطى السائلین" اللہ تعالیٰ سوال کرنے والوں کی بنسبت اسے زیادہ عطا کرتا ہے جو اس کے ذکر میں مشغول ہے (یعنی دل کی توجہ سے اس سے سوال کرے)۔

اسی لئے ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا ”حسبی من سؤالی علمہ بحالی“ میرے سوال کی بنسبت اس کا علم میرے حال کو کافی ہے کیا خوب کسی شاعر نے کہا ہے:

إذا اثنی عليك المرء يوما
كفاه من تعرضه الشاء

جب کوئی شخص تمہاری کسی دن تعریف کرے تو اس کا تعریف کے درپے ہونا ہی اس کی کفایت کا تقاضا کرتا ہے۔

☆ ”وعن ابن عمر قال قال رسول الله ﷺ من فتح له منكم باب الدعاء فتحت له ابواب الرحمة وما سئل الله شياً يعني احب اليه من ان يسأل العافية“

(رواه الترمذی، مشکوٰۃ کتاب الدعوات)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص کے لئے دعا کا دروازہ کھول دیا جائے اس کے لئے رحمت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے جب بھی کسی چیز کا سوال کرو تو اسے یہ پسند ہے کہ اس سے عافیت کا سوال کیا جائے۔

وضاحت حدیث: حدیث پاک سے بہت واضح طور پر سمجھ آیا کہ دعا کرنا ذریعہ رحمت ہے۔ اور آخری الفاظ راوی کی وضاحت ہے کہ سب چیزوں سے زیادہ رب تعالیٰ کو پسند یہ ہے کہ اس سے عافیت کا سوال کیا جائے۔ تاہم یہ خیال رہے کہ عافیت سے مراد اخروی اور دینی عافیت ہے اس سے مراد دنیاوی اور جسمانی عافیت نہیں۔ ایک شخص میرے سردار شیخ ابوالعباس مرسی کے پاس آیا آپ کو تکلیف تھی درد لاحق تھا اس شخص نے آپ کے لئے دعا کی ”عافاک یا سیدی“ اے میرے سردار اللہ تعالیٰ آپ کو عافیت عطا فرمائے۔ آپ سن کر خاموش رہے آپ نے کوئی جواب نہ دیا اس شخص نے پھر وہی دعا کی تو شیخ نے فرمایا کہ درد کے آرام کی میں نے تو دعا نہیں کی تم نے میرے درد کے آرام کی دعا کی ہے ”والذی انسا فیہ وهو العافیة“ قسم ہے ذات باری تعالیٰ کی میں جس حال میں ہوں وہی عافیت ہے۔ وجہ اصل میں یہ ہے کہ بیماری اور تکالیف مدارج کی بلندی کا ذریعہ ہیں:

”وقد سأل رسول الله ﷺ العافية وقال ما زالت اكلة خيبر تعاودني“

فالآن قطعت ابهری

نبی کریم ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے عافیت کا سوال کیا تو آپ پر خیر میں زہر آلود بکری کے گوشت

کے زہر کا اثر لوٹ آیا آپ کی انتڑیاں اسے کٹنے لگیں۔ اسی زہر کے اثر سے آپ کو منصب شہادت حاصل ہو گیا اخروی عافیت اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی تھی۔ ”و ابوبکر سأل العافیه ومات مسموما“ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عافیت کا سوال کیا تو آپ پر غارتور میں سانپ کے ڈسنے کی زہر کا اثر لوٹ آیا آپ کو منصب شہادت حاصل ہو گیا جو اخروی لحاظ پر عظیم عافیت تھی۔ ”وعمر سأل العافیه ومات مطعونا“ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عافیت کا سوال کیا اور آپ نیزے کے زخم سے شہید ہو گئے آپ کے حق میں اخروی لحاظ پر یہی عافیت عظیمہ تھی۔ ”وعثمان سأل العافیه ومات مذبوحا“ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے عافیت کا سوال کیا تو آپ کو ذبح کر کے شہید کر دیا گیا اس طرح آپ نے بھی اخروی نعمت عظیمہ کو حاصل کر لیا۔ ”وعلی سأل العافیه ومات مذبوحا“ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عافیت کا سوال کیا تو آپ کو بھی شہادت نصیب ہوئی گویا کہ آپ کے لئے یہی عافیت تھی جو آپ کو عطا کر دی گئی۔

اس مندرجہ بالا بحث سے یہ فائدہ حاصل ہوا:

”فاذا سألت الله العافیه فسنله العافیه من حيث يعلم انها لك عافیه“

جب تو اللہ تعالیٰ سے عافیت کا سوال کر تو یہ عرض کر اے اللہ میرے حق میں جس عافیت کو تو بہتر جانتا ہے وہی عافیت مجھے عطاء فرما اس کا یہ فائدہ ہوگا کہ اگر انسان کی مرض کو دور کر کے اسے زندہ رکھنا اس کے لئے مفید ہو تو اللہ تعالیٰ سے اسے جسمانی راحت حاصل ہوگی اور اگر اس کے حق میں اس کے لئے موت بہتر ہوئی تو اسے موت عطا کر دی جائے گی۔ چونکہ ”العافیه دفع العفاء وهو الهلاك“ عافیت ہلاک کو دور کرنے کا نام ہے اس لئے اتنی روزی عطاء کرنا جو کفایت کر جائے وہ بھی عافیت ہے۔ اور بدن کو قوت عطاء کرنا جس سے انسان عبادت ادا کر سکے یہ بھی عافیت ہے اور دین کے کاموں میں علم و عمل کے لحاظ پر مشغول رکھنا بھی عافیت ہے اور جو کام انسان کے لئے بہتر نہ ہو اسے چھوڑ دینا بھی عافیت ہے اور جو کام غیر ضروری ہوں ان کو چھوڑ دینا بھی عافیت ہے اس لئے عافیت کی دعا کرتے ہوئے معین نہ کرے بلکہ یہ کہے کہ اللہ تعالیٰ میرے حق میں جو جو عافیت بہتر ہے وہ عطاء فرما۔

☆ ”وعن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ ﷺ من سره ان يستجيب الله له عند

(رواه الترمذی وقال هذا حدیث غریب ، مشکوٰۃ کتاب الدّعوات)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص کو یہ پسند ہو کہ اللہ تعالیٰ اس کی مشکلات میں اس کی دعا کو قبول کر لے تو وہ آسانی میں زیادہ دعا کرے۔

وضاحت حدیث: یعنی مومن کی یہ شان ہے ”یلتجی الی اللہ تعالیٰ قبل مس الاضطرار“ کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حضور رجوع کرتا ہے اور اسی سے پناہ پکڑتا ہے مصیبت کے پہنچنے سے پہلے، بخلاف کافر کے اسے جب مصیبت پہنچتی ہے۔ تو وہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے اور جب اسے خوشحالی ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ سے روگردانی کرتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

﴿وَإِذَا مَسَّ الْإِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَا رَبَّهُ مُنِيبًا إِلَيْهِ ثُمَّ إِذَا خَوَّلَهُ نِعْمَةً مِنْهُ نَسِيَ مَا كَانَ يَدْعُو إِلَيْهِ مِنْ قَبْلُ﴾
”اور جب آدمی کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے اپنے رب کو پکارتا ہے اسی طرف جھکا ہوا پھر جب اللہ نے اسے اپنے پاس سے کوئی نعمت دی تو بھول جاتا ہے جس لئے پہلے پکارتا تھا۔ آیت کریمہ میں آدمی سے مراد مطلقاً کافر یا خاص ابو جہل یا عتبہ بن ربیعہ مراد ہے۔“
(خزان العرفان)

☆ ”وعن مالک بن یسار قال قال رسول اللہ ﷺ اذا سألتم اللہ فاسألوه ببطون اکفکم ولا تسألوه بظهورها وفی رواۃ ابن عباس قال سلوا اللہ ببطون اکفکم ولا تسألوه بظهورها فان فرغتم فامسحوا بها وجوهکم“
(رواه ابو داؤد)

حضرت مالک بن یسار رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تم اللہ تعالیٰ سے سوال کرو تو اپنی ہتھیلیوں کے اندرونی حصہ سے سوال کرو ان کی پیٹھ سے سوال نہ کرو۔ ایک روایت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے اس میں یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے اپنی ہتھیلیوں کے اندرونی حصہ سے سوال کرو اور ان کی پیٹھ سے سوال نہ کرو۔ پھر جب تم فارغ ہو جاؤ تو اپنے ہاتھ اپنے مونہوں پر پھیر لو۔

وضاحت حدیث: عام حالات میں دعا سیدھے ہاتھوں سے کی جائے البتہ ”قیل فی دفع البلاء یجعل ظهر الکف فوق بطنها تفاؤلاً“ مصیبت کو مندفع کرنے کے لئے بعض حضرات نے اٹے ہاتھوں سے دعا کرنا مناسب سمجھا ہے کہ اس میں نیک شگون پائی جاتی ہے۔ کہ انسان جب اٹے ہاتھوں سے دعا کرتا ہے پھر منہ پر پھیرنے کے لئے ہاتھ سیدھے کرتا ہے تو گویا کہ وہ زبان حال

سے یہ کہہ رہا ہوتا ہے کہ اللہ جس طرح میں نے ہاتھوں کو الٹا کر کے پھر سیدھا کر کے منہ پر پھیر دیا ہے اس طرح تو میرے لئے حالات کو سیدھا کر دے۔ ایک روایت میں ہے ”انہ علیہ الصلوۃ والسلام اشار فی الاستسقاء بظہر کفہ“ کہ بیشک نبی کریم ﷺ بارش کی طلب کی دعاء میں ہاتھوں کی پیٹھ سے اشارہ فرمایا۔ بعض حضرات نے تو اس کا ظاہر معنی ہی لیا ہے کہ بارش کے لئے اٹھنے سے دعا کی جائے۔

لیکن علامی طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”ومعناه انه رفع يديه رفعا بليغا حتى ظهر بياض ابطيه وصارت كفاه
محاذين لرأسه ملتصقا ان يغمره برحمته من رأسه الى قدميه“

اور معنی اس کا یہ ہے کہ بیشک آپ نے بارش کی دعا کے لئے بہت بلند ہاتھ اٹھائے یہاں تک کہ آپ کی بغلوں کی سفیدی ظاہر ہو گئی۔ اور آپ کی ہتھیلیاں آپ کے سر کے برابر تھیں وجہ اس کی یہ تھی کہ آپ گویا کہ رب تعالیٰ سے یہ مطالبہ کر رہے تھے کہ اے اللہ جس طرح میں نے اپنے ہاتھوں کو سر تک اٹھایا اسی طرح تو اپنی رحمت سے ہمیں سر سے قدموں تک ڈھانپ دے۔

راقم کا موقف اس میں یہ ہے کہ بارش کی دعا میں ہاتھ بلند کر کے سر تک اٹھائے اور ہاتھ سیدھے رکھے یا اٹھائے ہاتھوں سے دعا کرے دونوں صورتیں جائز ہیں جو شارحین نے بیان فرمائی ہیں:

﴿فَإِذَا فَرَّغْتُمْ فَاُمْسَحُوا بِهَا وُجُوهَكُمْ﴾

”جب تم دعا سے فارغ ہو جاؤ تو اپنے ہاتھ منہ پر پھیرو“

چہرے پر ہاتھ پھیرنے کی وجہ یہ ہے ”فانہا تنزل علیہا آثار الرحمة فتصل برکتها الیہا“ بیشک دعا کی وجہ سے رحمت کے آثار ہاتھوں تک پہنچتے ہیں اس لئے ہاتھوں کو منہ پر پھیرنے کا حکم ہے کہ ہاتھوں سے برکت چہرے پر پہنچ جائے۔

فائدہ: قال ابن حجر استفيد من هذا الحديث والذي قبله انه یسن رفع الیدین الی السماء فی کل دعاء وصحت به الاحادیث الكثيرة عنه علیہ الصلوۃ والسلام من غیر حصر قال النووی ومن ادعی حصرها فقد غلط غلطا فاحشا

حضرت ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں اس حدیث اور اس سے پہلی حدیث سے یہ فائدہ حاصل ہوا

کہ ہر دعائیں آسمانوں کی طرف ہاتھوں کو اٹھانا سنت ہے نبی کریم ﷺ کی کثیر احادیث اس مسئلہ کو ثابت کر رہی ہیں جو شمار میں ہی نہیں۔ اگر کوئی چند احادیث میں اس مسئلہ کو منحصر کرے تو اسکی فاحش غلطی ہوگی۔

اعتراض: "عن انس قال كان النبي ﷺ لا يرفع يديه في شئ من دعائه الا في الاستسقاء فانه يرفع حتى يرى بياض ابطيه" (بخاری ومسلم، مشکوٰۃ باب الاستسقاء)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ کسی دعائیں اپنے ہاتھ نہیں اٹھاتے تھے سوائے بارش طلب کرنے کی دعا کے بیشک آپ اس میں ہاتھ اٹھاتے یہاں تک کہ آپ کی بغلوں کی سفیدی نظر آتی۔ اس حدیث پاک سے ثابت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے سوائے استسقاء کے کسی دعائیں ہاتھ نہیں اٹھائے تو کس طرح کہنا ثابت ہے کہ ہر دعائیں ہاتھ اٹھائے جائیں۔

پہلا جواب: کہ جن احادیث میں ہاتھ اٹھانے کا ذکر ہے وہ مثبت ہیں اور جن میں ہاتھ نہ اٹھانے کا ذکر ہے وہ منفی ہیں۔ قانون یہ ہے کہ مثبت مقدم ہوتی ہے ثانی روایت سے لہذا دعائیں ہاتھ اٹھانے والی احادیث رائج ہیں۔

دوسرا جواب: "ان المراد انه كان لا يبالغ في رفع يديه في شئ من الدعاء الا الاستسقاء" جس حدیث میں نفی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے دعائیں ہاتھ اٹھانے میں اتنا مبالغہ نہیں کیا جتنا استسقاء میں کیا ہے کہ سر تک ہاتھ اٹھائے ہیں۔ (مرقاۃ ج ۵ ص ۳۳۲)

"وقال القاضي لا يرفعهما كل الرفع حتى يجاوز رأسه ويرى بياض ابطيه لو لم يكن عليه ثوب الا في الاستسقاء لانه ثبت استحباب رفع اليدين في الادعية كلها اى غالبا"

(مرقاۃ ج ۳ ص ۳۳۲)

قاضی عیاض رحمہ اللہ نے فرمایا کہ آپ دعائیں اتنے زیادہ ہاتھ نہیں اٹھاتے کہ آپ کے سر سے ہاتھ تجاوز کر جاتے اور آپ کی بغلوں کی سفید نظر آتی جب کہ آپ پر کپڑا نہ ہوتا سوائے استسقاء کے کیونکہ تمام دعاؤں میں آپ کا غالباً ہاتھ اٹھانا ثابت ہے۔

"وفيه ان الجزري عد في الحصن من جملة آداب الدعاء مسح وجهه بيديه بعد فراغه"

(مرقاۃ ج ۵ ص ۳۲)

علامہ جزری نے اپنی کتاب حصن میں آداب دعا ذکر فرمائے ان میں یہ بھی ذکر فرمایا کہ دعا سے

فارغ ہونے کے بعد اپنے ہاتھ منہ پر پھیر لے۔

☆ ”وعن سلمان قال قال رسول الله ﷺ ان ربكم حي كريم يستحي من عبده اذا رفع يديه اليه ان يردهما صفرا“ (رواه الترمذی وابو داؤد والبيهقي في الدعوات الكبير)

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک تمہارا رب حیاء فرمانے والا ہے (جو اس کی شان کے لائق ہے) اور کریم ہے اپنے بندے سے حیاء فرماتا ہے جب وہ اپنے ہاتھ اس کی طرف اٹھاتا ہے کہ ان کو خالی لوٹا دے۔

وضاحت حدیث: حی (فعل کا وزن ہے) حیاء فرمانے والا، رب تعالیٰ کے حیاء کرنے کا مقصد یہ ہے کہ جو کام بندے کے لئے نفع مند ہو وہ کرتا ہے اور جو کام نقصان دہ ہو اسے چھوڑ دیتا ہے۔

”کريم“ وهو الذي يعطى من غير سؤال فكيف بعده

اللہ تعالیٰ کے کریم ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ بغیر سوال کے عطا کرتا ہے سوال کے بعد کس طرح عطا نہیں کرے گا۔ ”صفرا“ (بکسر الصادو سکون الفاء) خالی ہونا، فارغ ہونا۔

حدیث شریف کا مطلب واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ کی شان کے جو لائق ہے وہ حیاء فرماتا ہے اور وہ کریم ہے اس لئے بندہ جب اس کے حضور اپنے ہاتھ اٹھاتا ہے تو وہ اپنے بندے کے ہاتھوں کو خالی لوٹانے سے حیاء فرماتا ہے یعنی وہ اپنے بندے کی دعا قبول فرماتا ہے۔

☆ ”وعن عمر قال كان رسول الله ﷺ اذا رفع يديه في الدعاء لم يحطهما حتى يمسح بهما وجهه“ (رواه الترمذی، مشکوة كتاب الدعوات)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا رسول اللہ ﷺ دعا میں جب اپنے ہاتھ اٹھاتے تو ان کو واپس نہیں لوٹاتے تھے یہاں تک کہ ان کو اپنے منہ پر پھیر لیتے۔

وضاحت حدیث: ”قيل حكمة الرفع الى السماء انها قبلة الدعاء ومهبط الرزق والوحي والرحمة والبركة“

ہاتھوں کو آسمانوں کی طرف اٹھانے میں حکمت یہ ہے کہ وہ دعا کا قبلہ ہے اور رزق وہاں سے اترتا ہے اور وحی کے آنے کا مقام ہے کیونکہ قرآن پاک ایک مرتبہ ہی لوح محفوظ سے آسمان دنیا پر نازل ہوا ہے پھر وہاں سے ضرورت کے مطابق بذریعہ وحی نازل ہوتا رہا:

” قال الغزالی ولا يرفع بصره الى السماء لخبر فيه “

علامہ غزالی رحمہ اللہ نے فرمایا دعائیں نظر آسمانوں کی طرف نہ اٹھائے۔

” وقد عد الجزري في الحصن من آداب الدعاء ان لا يرفع بصره الى السماء “

جزری رحمہ اللہ نے بھی آداب دعائیں یہی ذکر کیا ہے کہ دعائیں اپنی نظر کو آسمانوں کی طرف نہ اٹھائے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ اللہ تعالیٰ آسمانوں میں ہے حالانکہ وہ تو مکان سے پاک ہے۔ ” ہاتھ نیچے واپس لوٹانے سے پہلے اپنے چہرے پر پھیرے “ وجہ اس کی وہی ہے جو پہلے ذکر کر دی گئی کہ اس کے ہاتھ رحمت و برکت سے بھر جاتے ہیں پھر وہ چہرے پر پھیر دیئے جائیں تاکہ چہرہ بھی رحمت و برکت کے انوار سے منور ہو جائے۔

(ازمرقاۃ)

☆ ” وعن عائشة قالت كان رسول الله ﷺ يستحب الجوامع من الدعاء ويدع

ماسوی ذلك “ (رواه ابو داؤد ، مشکوۃ کتاب الدعوات)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ دعائیں سے جوامع کو پسند فرماتے تھے اور اس کے ماسوا کو چھوڑ دیتے تھے۔

وضاحت حدیث: ” الجوامع “ کے مختلف مطالب بیان کئے گئے ہیں جو تمام ہی مراد ہیں۔ اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ آپ ایسی دعا فرماتے جو نیک اغراض کی جامع ہوتی۔ اور اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ ایسی دعا فرماتے جو اللہ تعالیٰ کی ثناء کی جامع ہوتی۔ اور یہ مطلب ہے کہ آپ ایسی دعا فرماتے جو آداب مسئلہ کی جامع ہوتی۔ علامہ مظہر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ” جوامع “ کا یہاں بھی وہی معنی ہے جو آپ کے خصوصی صفت جوامع الکلم کا معنی ہے وہ یہ ہے:

” ما لفظه قليل ومعناه كثير شامل لامور الدنيا والآخرة “

جس کے لفظ قلیل ہوں اور معانی کثیر ہوں جو امور دنیا اور آخرت پر مشتمل ہو۔ نبی کریم ﷺ مختصر دعائیں کرتے جو کثیر معانی پر مشتمل ہوتیں وہ یہ ہیں:

﴿ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴾

﴿ اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْأَلُكَ الْعَفْوَ وَالْعَافِیَةَ فِی الدِّیْنِ وَالدُّنْیَا وَالْآخِرَةِ ﴾

﴿ اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْأَلُكَ الْهُدٰی وَالتَّقٰی وَالعِفَافَ وَالْغِنٰی ﴾

اور جو دعا جامع نہیں ہوتی تھی وہ دعا آپ نہیں فرماتے تھے اور آپ صرف اپنی ذات کے لئے دعا نہیں فرماتے تھے بلکہ اپنی دعا میں اور لوگوں کو بھی شامل کرتے تھے۔

☆ ”وعن عمر بن الخطاب قال استأذنت النبي ﷺ في العمرة فاذن لي وقال اشركنا يا اخي في دعائك ولا تنسنا فقال كلمة ما يسرني ان لي بها الدنيا“
(رواه ابو داؤد والترمذی وانتهت روايته عند قوله ولا تنسنا مشكوة كتاب الدعوات)

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نے عمرہ میں نبی کریم ﷺ سے اجازت طلب کی تو آپ نے مجھے اجازت دے دی اور آپ نے فرمایا اے میرے پیارے بھائی ہمیں اپنی دعا میں شریک رکھنا اور ہمیں بھلانا نہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے وہ کلمہ ارشاد فرمایا جو میرے لئے تمام دنیا سے زیادہ خوش کرنے والا تھا۔

وضاحت حدیث: یہ اس عمرہ کی بات ہے جو آپ نے زمانہ جاہلیت میں نذر مانی تھی کہ میں عمرہ ادا کروں گا۔ اگرچہ وہ نذر پوری کرنی آپ پر واجب نہ تھی لیکن عبادت خواہ مستحب ہو عبادت ہی ہوتی ہے اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ نے آپ کو اجازت فرمادی۔

”وقال اشركنا“ میں ”نا“ ضمیر جمع متکلم کی ہے جو مفعول ہے اشرك امر کا صیغہ ہے۔ جمع متکلم کی ضمیر کے ذکر کرنے کی دو مطلب ہو سکتے ہیں ”يحتمل نون العظمة وان يريد نحن واتباعنا“ کہ نون عظمت پر دلالت کر رہا ہو یا آپ کی مراد یہ ہو کہ مجھے اور میرے متبعین تمام کو اپنی دعا میں شریک رکھنا یعنی ہمارے لئے بھی دعا کرنا۔ ”يا اخي“ تصغیر کا صیغہ ہے جو لطف و مہربانی پر دلالت کر رہا ہے۔ اگرچہ تصغیر بھی تحقیر کے لئے بھی آتی ہے لیکن وہ یہاں معتبر نہیں۔ نبی کریم ﷺ کا یہ فرمانا کہ ہمیں اپنا دعا میں شریک رکھنا اس سے چند فوائد حاصل ہوئے:

(۱) ”فيه اظهار الخضوع والمسكنة في مقام العبودية بالتماس الدعاء ممن عرف له الهداية“
نبی کریم ﷺ نے مقام عبودیت میں اپنے عجز اور اپنی مسکینی کا اظہار فرمایا کہ آپ اس شخص سے دعا کرنا کا التماس کر رہے ہیں کہ جس کے متعلق آپ کو معلوم ہے کہ وہ ہدایت کے اعلیٰ منصب پر قائم ہیں۔

(۲) ”وحيث للامة على المرغبة في دعاء الصالحين واهل العباداة“

اور آپ نے اپنی امت کو اس پر برا بیختہ کیا کہ وہ نیک اور عبادت گزار لوگوں سے دعا کرانے میں رغبت رکھیں۔

(۳) ”وتنبیہ لهم علی ان لا یخصوا انفسهم بالدعاء ولا یشار کوا فیہ اقاربهم واحیاء هم لا سیما فی مظان الاجابة“

اور اس پر متنبہ فرمایا کہ دعا کرتے وقت صرف اپنے لئے دعا نہ کرو اور ایسی دعا نہ کرو جس میں اپنے رشتہ داروں اور اپنے احباب کو شریک نہ کرو خاص کر کے اس دعا میں جس کی قبولیت کی قوی امید ہو۔ یعنی دعا کرتے وقت اپنے ساتھ اپنے رشتہ داروں اور اپنے احباب اور تمام مسلمانوں کو شریک کرے۔

(۴) ”وتفخیم لسان عمر“ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شان بیان کی گئی ہے کہ آپ کی دعا کی قبولیت کی قوی امید پائی گئی ہے۔ ”ولا تنسنا“ (اور ہمیں بھلائیں نہیں) یہ الفاظ تاکید پر دلالت کر رہے ہیں کہ عمرہ کرتے ہوئے تمام احوال میں ہمیں یاد رکھنا ہمیں نہ بھلانا۔

”فقال کلمة ما یسرنی ان لی بها الدنیا“ ان الفاظ مبارکہ میں ”قال“ کا فاعل ”عمر“ ہیں اور ”کلمة“ مفعول ہے فعل محذوف کا یعنی ”تکلم النبی ﷺ کلمة“ ”ما“ نافیہ ہے اور ”بها“ میں باء بدلیت کے لئے ہے۔ اب عبارت کا مطلب یہ ہوگا:

”قال عمر تکلم النبی ﷺ کلمة لا یعجنی ولا یفرحنی کون جمیع الدنیا لی بدلها“

کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ نبی کریم ﷺ نے ایسا کلمہ ارشاد فرمایا کہ تمام دنیا اگر اس کے بدلہ میں مجھے مل جائے تو تمام دنیا کا مال و دولت مجھے اتنا خوش نہیں کر سکتا جتنا اس ایک کلمہ نے مجھے خوش کیا (خیال ہے راقم نے ان الفاظ کا ترجمہ اوپر مرادی ذکر کیا ہے لفظوں کے مطابق تفصیلی ترجمہ یہی ہے جو ذکر کر دیا گیا۔

☆ ”وعن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ ﷺ ثلاثة لا ترد دعوتهم الصائم حین یفطر والامام العادل ودعوة المظلوم یرفعها اللہ فوق الغمام وتفتح لها ابواب السماء ویقول الرب وعزتی لا نصرنک ولو بعد حین“ (رواہ الترمذی، مشکوٰۃ کتاب الدعوات)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تین شخصوں کی دعا کو رد نہیں

کیا جاتا روزہ دار جب افطار کے وقت دعا کرے اور عادل امام جب دعا کرے اور مظلوم کی دعا کو اللہ تعالیٰ بادلوں سے اوپر اٹھا لیتا ہے اور اس کے لئے آسمانوں کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور رب تعالیٰ کہتا ہے مجھے میری عزت کی قسم میں تمہاری ضرور بر ضرور امداد کروں گا اگرچہ کچھ وقت کے بعد۔

وضاحت حدیث: تین اشخاص کا جو ذکر کیا گیا ہے ان میں دعا کی قبولیت کو منحصر نہیں کیا بلکہ بعد میں آنے والی احادیث میں اور اشخاص کا بھی ذکر ہے یہ قیادتفاقی ہے ”لا ترد دعوتہم“ (ان کی دعا کو رد نہیں کیا جاتا) اس سے یہ واضح ہوا کہ دعا کی جلدی قبولیت دعا کرنے والے کی نیکی سے ہوتی ہے یا دعا میں خلوص اور عجز و انکساری پائے جائیں۔ چونکہ روزہ دار بھی صرف اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے روزہ رکھتا ہے۔ اس کی عبادت میں خلوص پایا جاتا ہے اس لئے اس عبادت کی تکمیل کے وقت اس کی دعا کو قبول کیا جاتا ہے۔

”والامام العادل اذ عدل ساعة منه خير من عبادة ستين ساعة كما في حديث“

عادل حاکم کی دعا کو اس لئے قبول کیا جاتا ہے کہ اس کا ایک گھڑی عدل کرنا ساٹھ سال کی عبادت سے بہتر ہے اسی طرح حدیث پاک میں مذکور ہے۔ مظلوم کی دعا کو اس لئے قبول کیا جاتا ہے کہ ظلم کی آگ اس کی انتڑیوں کو جلا دیتی ہے وہ نہایت عاجزی اور انکساری سے رب تعالیٰ کے حضور دعا کرتا ہے اس لئے اس کی دعا کی قبولیت کا بڑا وثوق دلایا جاتا ہے رب تعالیٰ فرماتا ہے:

”وعزتي لا نصرنك ولو بعد حين“ مجھے اپنے عزت کی قسم میں تمہاری ضرور امداد کروں گا اگرچہ کچھ وقت کے بعد۔ گویا کہ رب تعالیٰ کی طرف سے کہا جاتا ہے کہ تمہارا حق ضائع نہیں کیا جائے گا تمہاری دعا کو رد نہیں کیا جائے گا اگرچہ کچھ وقت بھی گزر گیا کیونکہ میں حلیم ہوں میں اپنے بندوں کو جلدی سزا نہیں دیتا ہو سکتا ہے کہ وہ ظلم سے باز آ جائے تا تب ہو جائے اسی سے پتہ چلا ”انہ تعالیٰ یمہل الظالم ولا یمہلہ“ بیشک اللہ تعالیٰ ظالم کو مہلت تو دیتا ہے لیکن ظالم کو چھوڑتا نہیں اسی پر رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی دلالت کر رہا ہے۔

﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ اللَّهَ غَافِلًا عَمَّا يَعْمَلُ الظَّالِمُونَ﴾
 ”اور ہر گز گمان نہ کرو کہ اللہ غافل ہے اس سے جو ظالم عمل کرتے ہیں۔“

یعنی رب تعالیٰ ظالموں کے ظلم سے غافل نہیں بلکہ ان کو انجام تک پہنچاتا ہے رب تعالیٰ کے دربار میں دیر ہے اندھیر نہیں۔ (ازمرقاۃ)

☆ "وعن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ ﷺ ثلاث دعوات مستجابات لا شک فیہن دعوة الوالد ودعوة المسافر ودعوة المظلوم"

(رواہ الترمذی و ابوداؤد وابن ماجہ ، مشکوٰۃ کتاب الدعوات)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تین دعاؤں کو قبول کیا جاتا ہے جن کی قبولیت میں کوئی شک نہیں والد کی دعا اور مسافر کی دعا اور مظلوم کی دعا۔

وضاحت حدیث: ان تین دعاؤں کی قبولیت کی وجہ بھی یہ ہے "لا لتجاء هؤلاء الثلاثة الى الله تعالى بصدق الطلب ورقة القلب وانكسار الخاطر" کہ یہ لوگ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سچی طلب اور رقتِ قلب (دل کی نرمی) اور شکستہ دل سے التجاء کرتے ہیں لہذا ان کی دعا میں ان کے عجز اور خلوص کی وجہ سے قبول کی جاتی ہیں۔ والد اپنی اولاد کے حق میں دعا کرے یا اولاد کے خلاف دعا کرے اللہ تعالیٰ اسے قبول فرماتا ہے والد کا ذکر حدیث پاک میں کیا گیا ہے والدہ کا ذکر نہیں کیا گیا اسکی وجہ یہ ہے کہ اکثر مقامات میں قرآن پاک اور حدیث پاک میں مذکر کے صیغے استعمال ہیں۔ ان میں بالتبع مؤنث کا ذکر بھی پایا جاتا ہے دوسری وجہ یہ ہے "ان حقها اکثر فدعاؤها اولی بالاجابة" کہ بیشک ماں کا حق زیادہ ہے اس لئے اس کی دعا میں شرف قبولیت بھی زیادہ ہے اس مسئلہ کو واضح ہونے کی وجہ سے ذکر نہیں کیا گیا۔ تاہم راقم کے نزدیک پہلی وجہ زیادہ قوی ہے۔ مسافر کی دعا کی قبولیت کی وجہ یہ ہے کہ مسافر رقتِ قلب سے دعا کرتا ہے خواہ کسی کے حق میں دعا کرے کہ اس پر کسی نے مہربانی کی ہو یا وہ کسی کے خلاف دعا کرے کہ اس پر کسی نے ظلم کیا ہے یا اسے کسی نے ستایا ہے۔

(ازمرقاۃ)

☆ "وعن ابن عباس عن النبی ﷺ قال خمس دعوات يستجاب لهن دعوة المظلوم حتى ينتصر ودعوة الحاج حتى يصدر ودعوة المجاهد حتى يقعد ودعوة المريض حتى يبرأ ودعوة الاخ لاخته بظهر الغيب ثم قال واسرع هذه الدعوات اجابة دعوة الاخ بظهر الغيب"

(رواہ البیہقی فی الدعوات الکبیر ، مشکوٰۃ کتاب الدعوات)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ نے فرمایا پانچ دعائیں قبول کی جاتی ہیں مظلوم کی دعا یہاں تک کہ وہ اپنی امداد خود کر لے۔ حاجی کی دعا یہاں تک کہ وہ لوٹ آئے اور مجاہد کی دعا یہاں تک کہ وہ (جہاد سے ہٹ کر) بیٹھ جائے۔ اور مریض کی دعا یہاں تک کہ وہ صحت یاب ہو جائے اور بھائی کی اپنے (مومن) بھائی کے لئے دعا اس کی غیر موجودگی میں کی جائے۔

وضاحت حدیث: مظلوم کی دعا جلدی قبول ہوتی ہے بشرطیکہ مظلوم ظالم سے انتقام نہ لے اگر اس نے زبان سے یا ہاتھ سے انتقام لے لیا تو اس نے اپنا حق حاصل کر لیا اب دعا کی قبولیت کا وہ مقام نہ رہا جو مظلومیت کے حال میں تھا۔ یہ بھی خیال رہے کہ اگر مظلوم نے اپنے سے زیادہ زیادتی کر لی تو اب یہ ظالم ہو گیا اور ظالم مظلوم ہو گیا اس لئے جتنی اس سے زیادتی کی گئی اس سے بڑھ کر انتقام لینا جائز نہیں۔ حاجی کی دعائیں دوران حج جلدی قبول ہوتی ہیں جب وہ اپنے گھر اور اپنے اہل و عیال میں لوٹ کر آ جائے تو وہ مقام مقبولیت اسے حاصل نہیں رہتا جو اسے حج کے دوران حاصل تھا۔

مجاہد جب تک جہاد میں شریک ہوتا ہے اس وقت تک اسکی دعائیں جو قبولیت ہوتی ہے وہ جہاد سے فارغ ہونے کے بعد نہیں ہوتی۔ مریض کی دعا اسکی مرض میں جو شرف قبولیت حاصل کرتی ہے وہ مرض سے صحت یاب ہونے کے بعد نہیں۔ جب کوئی مومن شخص اپنے مومن بھائی کی غیر موجودگی میں اسکے حق میں دعا کرے تو وہ زیادہ جلدی قبول ہوتی ہے۔ کیونکہ اس میں خلوص نیت پائی جاتی ہے ریاء سے خالی ہوتی ہے اسی لئے مروی ہے ”ان الله في عون العبد ما دام العبد في عون اخيه المسلم“ بیشک اللہ تعالیٰ بندے کا معاون ہوتا ہے جب تک وہ اپنے مسلمان بھائی کی امداد کرتا ہے۔ (ازمرقاۃ)

☆ ”وعن انس قال ان رسول الله ﷺ يرفع يديه في الدعاء حتى يرى بياض ابطيه“
☆ ”وعن سهل بن سعد عن النبي ﷺ قال كان يحمل اصبعيه خداه منكبیه ويدعو“
☆ ”وعن السائب بن يزيد عن ابيه ان النبي ﷺ كان اذا دعا رفع يديه مسح وجهه بیدیه“

(روای البیہقی الاحادیث الثلاثة فی الدعوات الکبیر، مشکوٰۃ)

مندرجہ بالا تین حدیثیں بیہقی نے دعوات کبیر میں ذکر فرمائی ہیں۔ پہلی حدیث حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ دعائیں اپنے ہاتھ اٹھاتے تھے یہاں تک کہ آپ کی بغلوں کی سفیدی نظر آتی۔ عام طور پر دعا کرتے وقت سینے کے برابر رہنے چاہئیں لیکن جواز ثابت کرنے کے لئے آپ نے کبھی کبھی ہاتھ زیادہ بلند بھی کئے ہیں۔ یا یہ بھی ممکن ہے کہ اس حدیث میں استثناء کے وقت دعا

کرنے کا ذکر ہو۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس حدیث میں مصیبت کے وقت دعا کرتے ہوئے زیادہ بلند کرنے کا ذکر ہو۔

دوسری حدیث میں حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ دعا کرتے وقت اپنی انگلیوں کو کندھوں کے برابر کرتے۔ اس حدیث پاک میں یا تو یہی ذکر ہے کہ آپ دعا میں جب ہاتھ اٹھاتے تو ہتھیلیاں سینہ کے برابر ہوتیں اور انگلیاں کندوں کے برابر ہوتیں۔ اور یا یہ مطلب ہے ”وہی حالة المبالغة والالاحاح فی الدعاء والمسئلة“ کہ آپ دعا جب زیادہ گڑگڑا کر کرتے اور اہم سوال کرتے اور بار بار عاجزی سے دعا کرتے تو ہاتھ زیادہ بلند کر کے اٹھاتے۔ تیسری حدیث سائب بن یزید اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ بیشک نبی کریم ﷺ اپنے ہاتھوں کو اٹھاتے تو پھر اپنے دونوں ہاتھ اپنے چہرے پر پھیر لیتے۔

☆ ”عن عكرمة عن ابن عباس قال المسئلة ان ترفع يديك حذو منكبيك او نحوهما والاستغفار ان تشير باصبع واحد والابتهاال ان تمد يديك جميعا وفي رواية قال والابتهاال هكذا ورفع يديه وجعل ظهورها مما يلي وجهه“

(رواه ابو داؤد ، مشكوة كتاب الدعوات)

حضرت عکرمہ حضرت ابن عباس (رضی اللہ عنہم) سے روایت کرتے ہیں سوال یہ ہے (دعا کے آداب میں سے یہ ہے) کہ تم اپنے ہاتھ کندھے تک یا اس کے قریب اٹھاؤ۔ اور استغفار کے وقت ایک انگلی سے اشارہ کرو اور زیادہ عجز کے وقت اپنے ہاتھوں کو اٹھاؤ اور ان کی پیٹھ اپنے چہرہ کی طرف کرو۔

وضاحت حدیث: حدیث شریف میں ”المسئلة“ سے مراد سوال اور دعا ہے یعنی دعا کرتے وقت ہاتھوں کی انگلیاں کندھے کے برابر ہیں اور ہتھیلیاں سینہ کے برابر ہیں۔ اور استغفار کے وقت ایک انگلی سے اشارہ کرے یعنی ”ادب الاستغفار الاشارة بالسبابة سبها للنفس الامارة والشیطان والتعود منهما“ استغفار کے آداب میں سے ایک یہ ہے کہ اپنی سبابہ (شہادت کی انگلی) سے اشارہ کرنا مقصد اس میں شیطان اور نفس امارہ کو گالیاں دینا ہوگا اور ان دونوں سے پناہ پکڑنا ہوگا۔ اور یہ بھی خیال رہے کہ استغفار کرتے وقت ایک انگلی سے اشارہ کرے دو انگلیوں سے اشارہ نہ کرے۔

”لما روی انه علیه الصلوة والسلام رای رجلا یشیر بهما فقال له احد احد“

کیونکہ مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک شخص کو دیکھا جو دو انگلیوں سے اشارہ کر رہا ہے تو آپ نے فرمایا ایک انگلی سے اشارہ کرو ایک انگلی سے اشارہ کرو۔

”والابتھال ای التصرع والمبالغة فی الدعاء فی دفع المکروه عن النفس“

ابتھال کا معنی یہ ہے کہ عاجزی کرے اور اپنے نفس سے مصیبت کے دور کرنے میں مبالغہ سے دعا کرے۔ یعنی مصیبت کے دور کرنے میں دعا کرتے وقت بہتر یہ ہے کہ ہاتھ بہت زیادہ بلند کرے اور ایک روایت میں یہ ہے ”وجعل ظہورہما ممایلی وجہہ“ اس عبارت کے دو مطلب ہیں کہ ہاتھ بہت زیادہ بلند کرے سر کے برابر کر دے تاکہ اسکے ہاتھوں کی پیٹھ اسکے چہرہ کے برابر ہو جائے اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ الٹے ہاتھوں سے دعا کرے دونوں وجوہ شارحین کے اقوال سے ملتی ہیں۔

☆ ”عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ ﷺ ان اللہ عزوجل لیرفع الدرۃ للعبد الصالح فی الجنة فیقول یا رب انی لی ہذہ فیقول باستغفار ولدک“

(رواہ احمد، مشکوٰۃ کتاب الاستغفار والتوبۃ)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ جنت میں ایک نیک بندے کے درجات کو بلند فرمائے گا تو وہ کہے گا اے میرے رب مجھے یہ درجات کہاں سے مل گئے؟ تو رب تعالیٰ فرمائے گا تیری اولاد کی استغفار کی وجہ سے۔ اس حدیث سے واضح ہوا کہ اولاد کی استغفار اور والدین کے حق میں دعا سے والدین کے مدارج بلند ہوتے ہیں۔

☆ ”وعن عبد اللہ بن عباس قال قال رسول اللہ ﷺ المیت فی القبر الا کالغریق المتغوث ینتظر دعوة تلحقہ من اب او ام او اخ او صدیق فاذا لحقہ کان احب الیہ من الدنیا وما فیہا وان اللہ تعالیٰ لیدخل علی اهل القبور من دعاء اهل الارض امثال الجبال وان ہدیۃ الاحیاء الی الاموات الاستغفار لہم“

(رواہ البہیقی فی شعب الایمان مشکوٰۃ باب الاستغفار والتوبۃ)

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قبر میں کوئی میت نہیں مگر یہ کہ غرق ہونے والے فریاد طلب کرنے والے کی طرح ہوتا ہے۔ وہ دعا کی انتظار میں ہوتا ہے کہ اسے دعا ملے اس کے باپ یا ماں یا بھائی یا دوست کی طرف سے جب اسے وہ دعا لاحق ہوتی ہے تو دنیا اور دنیا کی تمام چیزوں سے اسے وہ زیادہ محبوب ہوتی ہے بیشک اللہ تعالیٰ قبروں والوں کے پاس

زمین والوں کی دعا سے پہاڑوں کی طرح ثواب داخل کرتا ہے۔ اور بیشک زندہ لوگوں کی طرف سے مردوں کے لئے ہدیہ یہ ہے کہ ان کے لئے بخشش طلب کریں۔

وضاحت حدیث: کالغریق، غرق ہونے کے قریب یعنی ڈوب رہا ہو ”المتغوث“ فریاد طلب کرنے والا امداد طلب کرنے والا، پناہ پکڑنے والا، بلند آواز سے قرب و جوار کے لوگوں کو پکارنے والا کہ کوئی اسے آ کر بچائے۔

حدیث پاک کا مفہوم واضح ہے کہ قبر میں میت ڈوبنے والے کی طرح فریاد کر رہا ہوتا ہے امداد کرنے کی درخواست کر رہا ہوتا ہے ”کالغریق يتعلق بكل حشیش“ جیسا کہ ڈوبنے والا ہر تنکے کا سہارا لیتا ہے۔ جس طرح ڈوبنے والا اس انتظار میں ہوتا ہے کہ کوئی شخص کنارے پر ہو یا میری آواز سن رہا ہو تو وہ میری امداد کرے اسی طرح قبر والا شخص اس انتظار میں ہوتا ہے کہ اس کا باپ یا ماں یا بھائی یا اولاد اور دوست احباب اس کے لئے مغفرت کی دعا کریں۔ قبر والے شخص کو دنیا اور دنیا کی تمام چیزوں سے زیادہ پسندیدہ پیچھے رہنے والوں کی دعا ہے۔

پیچھے رہنے والوں کی دعا کی وجہ سے اس کے اعمال میں ترقی ہوتی رہتی ہے یہی وجہ ہے کہ جب پیچھے رہنے والے اس کے لئے زیادہ سے زیادہ دعا کریں گے تو اسے پہاڑوں جتنا ثواب جب حاصل ہوگا تو وہ تعجب سے رب تعالیٰ سے سوال کرے گا کہ یہ ثواب مجھے کہاں سے حاصل ہو گیا میرے اعمال تو اس قابل نہیں تو اسے بتایا جائے گا کہ یہ وہ ہدیہ ہے جو زندہ لوگوں کی طرف سے مردہ حضرات کی بخشش طلب کی گئی۔

فَلْيُسْتَجِیْبُوْا لِیْ : ”تو چاہیے کہ وہ میرا حکم مانیں“

اس کا ایک معنی مجاہد وغیرہ نے یہ بیان کیا ہے:

”فلیجیبوا الی فیما دعوتهم الیه من الایمان ای الطاعة والعمل“

کہ میں ان کو ایمان کی دعوت دیتا ہوں اسے قبول کریں اس کی فرمانبرداری کریں اور اس پر عمل کریں ”اجاب واستجاب بمعنی“ اجاب اور استجاب ایک ہی معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔ اعلیٰ حضرت و پیر محمد کرم شاہ رحمہما اللہ نے اسی کے مطابق ترجمہ کیا ہے۔ لیکن ابورجاء خراسانی رحمہ

اللہ نے یہ ترجمہ کیا ہے ”فليدعوا لي“ وہ مجھ سے ہی دعا کریں۔ اور ابن عطیہ نے یہ ترجمہ کیا ہے ”فليطلبوا ان اجيبهم“ وہ مجھ سے طلب کریں کہ میں ان کی دعا کو قبول کروں ان دونوں قولوں کے مطابق ترجمہ یہ ہوگا تو چاہئے کہ وہ مجھ سے قبولیت طلب کریں (طلباء کرام یہ ترجمہ بھی یاد کر لیں) راقم کا یہی ترجمہ ہے) اس صورت میں سین اور تاء طلب کیلئے ہیں پہلی صورت سین زائد ہے اور لام امر کلام ہے۔

(فرطی)

وَلْيُؤْمِنُوا بِيْ : ”اور مجھ پر ایمان لائیں“ ﴿فَلْيَسْتَجِيبُوا لِيْ وَلْيُؤْمِنُوا بِيْ﴾ ان دونوں جملوں کا ماقبل سے ربط یہ ہے کہ گویا کہ اللہ تعالیٰ یہ ارشاد فرماتا ہے:

”انا اجيب دعاءك مع اني غني عنك مطلقا فكن انت ايضا مجيبا

لدعائي مع انك محتاج الي من كل الوجوه فما اعظم هذا الكرم“

کہ میں تمہاری دعا کو قبول کرتا ہوں باوجود اس کے کہ میں تم سے مطلقاً غنی ہوں تم بھی میرے حکم کو مانو اور دعا کرو باوجود اس کے کہ تم ہر طرح میرے محتاج ہو رب تعالیٰ کا یہ کہنا بہت عظیم کرم ہے۔ اور اس میں عجیب نکتہ یہ پایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا ”اجب دعائی حتی اجیب دعاءک“ (تم میرا حکم مانو تو میں تمہاری دعا کو قبول کروں گا):

”وهذا تنبيه على ان اجابة الله عبده فضل منه ابتداء وانه غير معلل بطاعة العبد“

یہاں یہ واضح کر دیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کا دعا کو قبول کرنا اس سے ابتدائی طور پر فضل ہے اس قبولیت کی دار و مدار بندے کی طاعت پر موقوف نہیں بلکہ رب تعالیٰ اپنے فضل سے بعض اوقات بندے کی طاعت میں مشغولیت سے پہلے ہی دعا قبول فرما لیتا ہے۔

تنبیہ: اجابة کی نسبت بندے کی طرف بھی ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف بھی ہے لیکن ”الاجابة من العبد لله الطاعة واجابة الله لعبده اعطاؤه اياه مطلوبه“ جب نسبت بندے کی طرف ہوگی تو معنی ہوگا ”طاعت“ یعنی بندہ اللہ تعالیٰ کے حکم کو مانتا ہے اور جب نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی جائے تو معنی ہوگا ”قبول کرنا“ یعنی اللہ تعالیٰ اپنے بندے کی دعا کو قبول کر کے اس کا مطلوب اسے ادا کرے گا۔

اعتراض: اگر ﴿فَلْيَسْتَجِيبُوا لِيْ﴾ میں ”استجابة“ کو بمعنی ”اجابة“ لیا جائے تو ”اجابة“ کا معنی کیا جائے گا؟ اگر معنی یہ ہو کہ دل اور زبان سے میرا حکم ہونا ”فذاک هو الایمان“ تو

یہ عین ایمان ہے۔ تو اس صورت میں ﴿فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَلْيُؤْمِنُوا بِي﴾ میں تکرار محض ہوگا۔ اگر ”اجابة“ کا معنی ”طاعت“ لیا جائے تو معاملہ الٹ ہو جائے گا کیونکہ ایمان پہلے ہے اور طاعت بعد میں یہاں طاعت پہلے ہو جائے گی اور ایمان بعد میں۔

جواب: استجابة کا معنی ہے اطاعت و فرمانبرداری اور ایمان دل کی صفت ہے۔ اگرچہ یہ بات درست ہے کہ اصل ایمان پہلے ہے اور طاعت بعد میں لیکن مراد تو کمال ایمان اور نور ایمان ہے:

”فهذا يدل على ان العبد لا يصل الى نور الايمان وقوته الا بتقدم الطاعات والعبادات“

تو یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ بندہ نور ایمان اور قوت ایمان تک اس وقت تک نہیں پہنچ سکتا جب تک طاعات اور عبادت کو مقدم نہ کیا جائے گویا کہ حکم یوں ہو گیا کہ میرے بندوں کو چاہئے کہ وہ میری فرمانبرداری کریں میرا حکم مانیں اور کامل ایمان مجھ پر ہی رکھیں اور میرے احکام مان کر نور ایمان حاصل کریں۔ (از کبیر)

لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ : ”تا کہ وہ ہدایت پا جائیں“ رشد مقابل ہے غی کے ہدایت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جیسا اسی آیت میں استعمال ہے اسی طرح ”فان آنستم منهم رشدا“ میں بھی تقریباً اسی معنی میں استعمال ہے۔ یہ خیال رہے کہ ”رشد“ (بفتح الراء والشین) خاص ہے نسبت ”رشد“ (بضم الراء وسكون الشین) کے اس لئے کہ ”رشد“ (بضم الراء) استعمال ہوتا ہے امور دنیوی اور اخروی دونوں میں اور رشد (بفتح الراء) کا استعمال صرف امور اخروی میں ہے راشد اور رشید دونوں ہی ہدایت پر چلنے کے معنی میں استعمال ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿أُولَئِكَ هُمُ الرَّاشِدُونَ﴾ اور ”وما امر فرعون برشید“ سے واضح ہو رہا ہے۔

(از مفردات راغب)

”ومعنى الآية انهم اذا استجابوا لى و آمنوا بى اهتدوا لمصالح دينهم ودنياهم“

آیت کریمہ کا معنی یہ ہے کہ بیشک میرے بندے جب میرے احکام مانیں گے یا مجھ سے ہی دعا کی قبولیت کی درخواست کریں گے اور مجھ پر ایمان لائیں تو ان کو دینی اور دنیاوی مصلحتوں کی ہدایت حاصل ہو جائے گی اس لئے کہ رشد کا معنی ہی ہدایت ہے۔

☆☆☆☆☆

﴿ أَحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفْتُ إِلَى نِسَائِكُمْ هُنَّ لِبَاسٌ لَكُمْ وَأَنْتُمْ لِبَاسٌ لَهُنَّ عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُونَ أَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ فَالْآنَ بَاشِرُوهُنَّ وَابْتَغُوا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَكُمْ وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ثُمَّ أَتُمُوا الصِّيَامَ إِلَى اللَّيْلِ وَلَا تُبَاشِرُوهُنَّ وَأَنْتُمْ عَاكِفُونَ فِي الْمَسَاجِدِ تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ فَلَا تَقْرَبُوهَا كَذَلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ آيَتِهِ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ ﴾

(۱) ”روزوں کی راتوں میں اپنی عورتوں کے پاس جانا تمہارے لئے حلال ہوا وہ تمہاری لباس ہیں اور تم ان کے لباس اللہ نے جانا کہ تم اپنی جانوں کو خیانت میں ڈالتے تھے تو اس نے تمہاری توبہ قبول کی اور تمہیں معاف فرمایا تو اب ان سے صحبت کرو اور طلب کرو جو اللہ نے تمہارے نصیب میں لکھا ہوا رکھاؤ اور پیو یہاں تک کہ تمہارے لئے ظاہر ہو جائے سفیدی کا ڈورا سیاہی کے ڈورے سے پوچھکر پھر رات آنے تک روزے پورے کرو اور عورتوں کو ہاتھ نہ لگاؤ جب تم مسجدوں میں اعتکاف سے ہو یہ اللہ کی حدیں ہیں ان کے پاس نہ جاؤ اللہ یوں ہی بیان کرتا ہے لوگوں سے اپنی آیتیں کہ کہیں انہیں پرہیزگاری ملے۔“

(۲) ”حلال کیا گیا ہے تمہارے لئے روزوں کی راتوں میں تمہارا اپنی عورتوں کے پاس جانا وہ لباس ہیں تمہارا اور تم لباس ہو ان کا اللہ کو معلوم ہے بیشک تم خیانت میں ڈالتے ہو اپنے نفسوں کو تو اس نے تمہاری توبہ قبول فرمائی اور تمہیں معاف کیا تو اب ان سے صحبت کرو اور طلب کرو جو

لکھا ہے اللہ نے تمہارے لئے اور کھاؤ او پو یہاں تک کہ ظاہر ہو جائے تمہارے لئے دھاگہ سفید دھاگے سیاہ سے یعنی فجر سے پھر پورا کرو تم روزوں کو رات تک اور ہاتھ نہ لگاؤ ان (عورتوں) کو ایسے حال میں کہ جب تم اعتکاف میں ہو مساجد میں یہ اللہ کی حدیں ہیں تو نہ قریب جاؤ ان کے اسی طرح بیان کرتا ہے اللہ اپنی نشانیاں لوگوں کے لئے تاکہ وہ پرہیزگار ہو جائیں۔“

شان نزول : چند واقعات کے درپیش آنے کے بعد اس آیہ کریمہ کا نزول ہوا وہ تمام واقعات مجموعی طور پر اس آیت کے نزول کا سبب ہیں اور ”أَجَلٌ لَّكُمْ“ کے الفاظ بھی اس پر دلالت کر رہے ہیں کہ جو کام پہلے حرام تھا اسے حلال کر دیا گیا:

☆ ”روی ابو داؤد عن ابن ابی لیلی قال وحدثنا اصحابنا قال وکان الرجل اذا فطر فنام قبل ان یأکل لم یأکل حتی یصبح قال فجاء عمر فاراد امراته فقالت انی قد نمت فظن انها تعتل فاتاها ، فجاء رجل من الانصار فاراد طعاما فقالوا حتی نسخن لک شیاً فنام فلما اصبحوا انزلت هذه الآیة“

ایک وجہ شان نزول کی ابو داؤد نے ابولیلی سے روایت جو ذکر کی ہے اس میں ہے کہ جب کوئی شخص افطار کرتا تو کھانے سے پہلے اگر سو جاتا تو پھر وہ صبح تک کھا نہیں سکتا تھا (یہی حکم جماع کا بھی تھا) حضرت عمر رضی اللہ عنہ گھر تشریف لائے تو اپنی زوجہ سے جماع کا ارادہ فرمایا تو آپ کی زوجہ نے کہا بیشک میں تو سو گئی تھی آپ نے خیال کیا کہ یہ ویسے ہی حیلہ و بہانہ کر رہی ہے آپ اس کے پاس آگئے یعنی آپ نے اس سے جماع کر لیا۔ اسی طرح ایک اور وجہ یہ ہے کہ ایک شخص انصاری نے طعام کا ارادہ کیا تو گھر والوں نے کہا ہم تمہارے لئے کوئی چیز (کھانے کی) گرم کرتے ہیں تو اتنی دیر میں وہ سو گئے جب صبح ہوئی تو یہ آیہ کریمہ نازل ہوئی۔

☆ ”وروی البخاری عن البراء قال کان اصحاب محمد ﷺ اذا کان الرجل صائما فحضر الافطار فنام قبل ان یفطر لم یأکل لیلته ولا یومه حتی یمسی وان قیس بن صرمة الانصاری کان صائما ، وفی روایة کان یعمل فی النخیل بالنهار وکان صائما فلما حضر الافطار اتی امراته فقال لها عندک طعام ؟ قالت لا ولكن انطلق فاطلب لک“

وكان يومه يعمل فغلبته عيناه فجاءته امرأته فلما رآته قالت خيبة لك فلما انتصف النهار غشى عليه فذكر ذلك للنبي ﷺ فنزلت هذه الآية (احل لكم ليلة الصيام الرفث الى نسائكم) ففرحوا فرحا شديدا ونزلت وكلوا واشربوا حتى يتبين لكم الخيط الابيض من الخيط الاسود من الفجر“

بخاری نے حضرت براء رضی اللہ عنہ سے روایت ذکر کی کہ نبی کریم ﷺ کا جو صحابی بھی روزہ رکھتا تو جب روزہ کے افطار کا وقت ہوتا تو اگر وہ افطار سے پہلے سو جاتا تو رات اور دن کو وہ کچھ نہ کھا سکتا بلکہ پھر شام ہونے پر افطار کرتا حضرت قیس بن صرمة انصاری روزہ دار تھے اور ایک روایت میں یہ ہے کہ وہ دن کو کھجوروں کے باغ میں کام کرتے اور روزہ دار تھے جب افطار کا وقت ہوا تو آپ اپنی زوجہ کے پاس آئے ان سے پوچھا کیا تمہارے پاس کوئی کھانے کی چیز ہے؟ انہوں نے کہا پاس تو کچھ نہیں البتہ (گھر) چل کر دیکھتی ہوں کہ تمہارے لئے کوئی چیز مل جائے چونکہ وہ دن کو کام کرتے تھے اس لئے ان کی آنکھوں پر نیند کا غلبہ ہو گیا تو آپ کے پاس جب آپ کی عورت آئی (اور کھانے کی کوئی چیز لائی) تو اس نے کہا تم تو محروم ہو چکے ہو (تو انہوں نے کچھ نہ کھایا) جب نصف دن گزرا تو ان پر بیہوشی طاری ہو گئی تو یہ نبی کریم ﷺ کے سامنے ذکر کیا گیا اس وقت یہ آیت کریمہ نازل ہوئی یعنی ﴿أَحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَى نِسَائِكُمْ﴾ تک الفاظ مبارکہ نازل ہوئے تو صحابہ کرام بہت زیادہ خوش ہوئے اس کے بعد ﴿وَكُلُوا وَاشْرَبُوا﴾ (الی) ﴿مِنَ الْفَجْرِ﴾ الفاظ مبارکہ نازل ہوئے۔

☆ ”وفی البخاری ایضا عن البراء قال لما نزل صوم رمضان كانوا لا يقربون النساء رمضان كله وكان رجلا يخونون انفسهم فانزل الله تعالى ﴿عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُونَ أَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ﴾

بخاری شریف میں حضرت براء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جب رمضان کے روزوں کا حکم نازل ہوا تو صحابہ کرام اپنی عورتوں کے قریب تمام رمضان میں نہیں جاتے تھے تاہم بعض حضرات نے اپنے نفسوں کو خیانت میں ڈال لیا تو یہ الفاظ مبارکہ نازل فرمائے ﴿عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُونَ أَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ﴾ (خیانت کا ذکر انشاء اللہ بعد میں آئے گا)

☆ ”وذكر الطبري ان عمر رضي الله تعالى عنه رجع من عند النبي ﷺ وقد سمر

عندہ لیلة فوجد امرأته قد نامت فارادھا فقالت له قد نمت فقال لها مانمت فوقع بها وصنع كعب بن مالک مثله فعدا عمر علی النبی ﷺ فقال اعتذر الی اللہ والیک فان نفسی زینت لی فواقعت اهلی فهل تجدل لی من رخصة فقال لی لم تكن حقیقا بذلك یا عمر فلما بلغ بیتہ ارسل الیه فانبا بعذرہ فی آیة من القرآن

طبری نے ذکر کیا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک رات نبی کریم ﷺ سے گفتگو فرماتے رہے جب گھر لوٹے تو آپ کی عورت سو کر اٹھی آپ نے اس کی طرف ارادہ فرمایا تو اس نے کہا کہ میں تو سو چکی تھی تو آپ نے اسے کہا تم نہیں سوئی تھی تو آپ نے جماع کر لیا۔ یہی صورت حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ سے بھی درپیش آ چکی تھی صبح حضرت عمر رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے عرض کیا میں اپنا عذر اللہ تعالیٰ کے حضور اور آپ کے حضور پیش کر رہا ہوں بیشک میں نے اپنی زوجہ سے جماع کر لیا۔ تو آپ نے فرمایا اے عمر تمہیں حق نہیں تھا۔ جب آپ اپنے گھر پہنچے تو آپ کو خبر دی گئی کہ قرآن پاک کی آیت نازل ہو گئی جس میں تمہارے عذر کو قبول کر لیا گیا۔

أَحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَى نِسَائِكُمْ :

”حلال کیا گیا ہے تمہارے لئے روزوں کی راتوں میں تمہارا اپنی عورتوں کے پاس جانا“ ”الرفث“ سے مراد کنایہ جماع ہے چونکہ اللہ تعالیٰ کریم ہے اس لئے وہ ارشاد کنایہ فرمایا ہے اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے بھی کنایہ ترجمہ کیا ہے ”عورتوں کے پاس جانا۔

زجاج نے کہا ہے کہ ”الرفث“ کا معنی عام ہے تمام ان مقاصد کو شامل ہے ”ما یزید الرجل من امرأته“ جو مرد اپنی عورت سے ارادہ کرتا ہے۔ ”وقال ابن عرفة، الرفث ههنا الجماع“ ابن عرفة نے کہا ہے کہ ”الرفث“ کا معنی یہاں جماع ہے ”وقیل الرفث اصله قول الفحش“ بعض حضرات نے بیان کیا ”الرفث“ کا اصل میں معنی بری باتیں کرنا ہے ”رفث“ اور ”ارفث“ لفظ اس کے لئے استعمال ہوتے جو قبیح کلام کرے کسی شاعر نے ذکر کیا ہے:

رب اسراب حبیج کظم عن اللغا ورفث التکلم

کتنے ہی ریگستان پر چلنے والے حاجی (اپنی آپ کو) روک کر رکھتے ہیں لغو کاموں اور قبیح کلام

کرنے سے۔ (از قرطبی) لیکن خیال رہے کہ اس آیت کریمہ میں مراد جماع ہی ہے فحش کلامی یا عورتوں سے عشقیہ کلام کرنا مراد نہیں۔

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں: یہاں بظاہر اعتراض کہ ”الرفث“ کو ”الی“ سے متعدی کیا گیا ہے اور کہا گیا ہے ﴿الرَّفَثُ إِلَى نِسَائِكُمْ﴾ حالانکہ ”الرفث“ کو ”الی“ سے متعدی نہیں کیا جاتا یہ نہیں کہا جاتا ”رفثت الی النساء“ تو یہاں متعدی الی سے کرنا کیسے صحیح ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں قاعدہ تفسیمین جاری ہے کہ ”الرفث“ کو ”الافضاء“ کے معنی میں لیا گیا جو ”الی“ سے متعدی ہوتا ہے جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَقَدْ أَقْضَىٰ بَعْضُكُم إِلَىٰ بَعْضٍ﴾ ”اور تحقیق بعض تمہارا بعض کی طرف پہنچا ہے“

یہاں بھی مراد عورتوں کی طرف جانا ہے لیکن پھر مراد ملا بست یعنی مجامعت ہے۔ (از قرطبی)

عجیب نکتہ: الرفث کا اصل معنی قبیح کلام ہے پھر اس کا مجازی معنی عورتوں کی موجودگی

میں ان سے عشقیہ کلام کرنا پھر مجازی معنی جماع کرنا اور جماع کے دوائی (جماع کے دعوت دینے والے) بوس و کنار، چھونا وغیرہ۔ اب بظاہر اس پر اعتراض یہ ہوتا ہے کہ ایسا لفظ جس کا حقیقی معنی فحش کلامی ہے اس سے کنایہ جماع معنی کیوں لیا گیا جب کہ جماع کے لئے کنایہ الفاظ مبارکہ قرآن پاک میں اور بھی استعمال ہیں جیسا کہ

”وَقَدْ أَقْضَىٰ بَعْضُكُم إِلَىٰ بَعْضٍ فَلَمَّا تَغَشَّاهَا / اولا مستم النساء / دخلتهم بهن / فاتوا

حرثکم / من قبل ان تمسوهن ، فما استمتعتم به منهن ، ولا تقر بهن“

”جوابہ السبب فیہ استہجان ما وجد منهم قبل الاباحۃ کما سماہ

اختیاناً لانفسہم“

اس کا جواب یہ ہے کہ چونکہ صحابہ کرام سے حکم کے مباح ہونے سے پہلے بھول واقع ہوتی رہی جس کو رب تعالیٰ نے خیانت سے تعبیر فرمایا تو اسی طرح جماع کے حلال ہونے کے لئے وہ لفظ ذکر فرمایا کہ جو قباحت پر دلالت کرتا ہے ضمناً اس طرف توجہ دلائی گئی اگرچہ تم سے خیانت واقع ہوئی جو حقیقت میں قباحت تھی لیکن اب اسے حلال کر دیا گیا ہے۔

(از کبیر)

اعتراض: ﴿لَيْلَةُ الصِّيَامِ﴾ میں ”لیلۃ“ واحد ذکر ہے حالانکہ مراد جمع ہے (روزوں کی راتوں میں عورتوں کے پاس جانا حلال کر دیا گیا) تو ”لیالی“ کیوں نہیں ذکر کیا گیا۔

جواب: کئی مقام پر واحد کو جماعت کے لئے استعمال کرتے ہیں جیسا کہ العباس بن مرداس کے قول میں ہے ”فقلنا اسلموا انا اخوکم“ ہم نے کہا اسلام لے آؤ تو بیشک ہم تمہارے بھائی ہوں گے یہاں بھی ”اخوانکم“ کی جگہ ”اخوانکم“ ذکر ہے۔ (کبیر)

هٰنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ: ”وہ لباس ہیں تمہارا اور تم لباس ہو ان کا“ عورتوں کو مردوں کا لباس اور مردوں کو عورتوں کا لباس قرار دینے میں چند وجوہ ہیں۔

ان میں سے ایک وجہ یہ ہے کہ لباس بمعنی تسکین کے ہے ”هن سکن لکم وانتم سکن لهن“ کہ وہ تمہارے لئے باعث تسکین ہیں اور تم ان کے لئے باعث تسکین ہو۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے جب نافع بن ارزق نے آیۃ کریمہ میں لباس کا معنی پوچھا تو آپ نے یہی معنی بیان فرمایا اور اس پر ذبیانی کا ایک شعر بطور دلیل پیش کیا:

اذا ما الضجیع ثنی عطفہ ثنت علیہ فکانت لباسا

جب پاس لیٹنے والا اپنی کروٹ پھیرتا ہے تو میں اس کی طرف کروٹ پھیر دیتا ہوں جو ایک دوسرے کے لئے تسلی کا سبب بنتا ہے۔

اور وجہ تشبیہ یہ ہے کہ جب مرد اور عورت ایک دوسرے سے گلے ملتے ہیں تو ایک دوسرے پر اس طرح لپٹ جاتے ہیں جس طرح لباس لپٹا ہوتا ہے ربیع نے کہا ”هن فراش لکم وانتم لحاف لهن“ عورتیں تمہارا فراش (بچھونا) ہیں اور تم ان کا لحاف ہو۔

اور وجہ تشبیہ یہ ہے کہ ہر ایک زوجین میں سے دوسرے کے لئے پردہ بن جاتا ہے اور اس کو فجور سے روکتا ہے حدیث شریف میں آیا ہوا ہے ”ومن تزوج فقد احوز ثلثی دینہ“ جس شخص نے شادی کر لی تحقیق اس نے اپنے دین کے دو تہائی حصہ کو بچا لیا۔

اور وجہ تشبیہ یہ ہے کہ مرد عورت ایک دوسرے کا لباس اس لئے ہیں کہ انسان جس طرح لباس اپنے لئے مختص کرتا ہے اسی طرح زوج اپنی زوجہ کو اور زوجہ اپنے زوج کو اپنے لئے مختص کرتے ہیں۔

اور وجہ تشبیہ یہ ہے کہ جس طرح لباس پورے بدن پر چھا جاتا ہے اسی طرح مرد کا بدن عورت کے تمام بدن سے مل جاتا ہے اور عورت کا بدن مرد کے تمام بدن سے مل جاتا ہے۔

اور وجہ تشبیہ یہ ہے کہ جس طرح لباس انسان کو گرمی اور سردی اور کیڑوں مکوڑوں سے بچاتا ہے اسی طرح انسان کی زوجہ اس کے گھر کو مفاسد سے بچانی ہے گھر کی محافظ ہوتی ہے اسکے مال کی محافظ ہوتی ہے اسلئے انسان کو اجنبی عورتوں کے میل جول سے بچالیتی ہے۔ گھر کے مال کو بربادی سے بچاتی ہے گویا کہ مال اور جان اور آبرو کی محافظ ہوتی ہے۔ اسی طرح یقیناً مرد عورت کو مفاسد سے بچاتا ہے یعنی اجنبی مردوں سے بچاتا ہے اور عورت کو ذریعہ معاشی کیلئے در بدر دھکے کھانے سے بچاتا ہے یقیناً مرد کھلانے کا وہی حق دار ہے جو اپنے اہل و عیال کے خرچ کیلئے ذمہ دار ہو۔ وہ شخص نکھد گھٹیا بلکہ انسانیت سے دور ہے جو یہ تمنا کرے کہ میرے خرچ اور اپنے خرچ اور اولاد کے خرچ کو عورت اپنی محنت و مزدوری سے چلائے۔

(از روح المعانی و کبیر)

آئیے ضیاء القرآن سے مفکر اسلام مفسر قرآن پیر محمد کرم شاہ رحمہ اللہ کا اس آیہ کریمہ کی تفسیر سے ایک اقتباس دیکھئے کیا خوب آپ نے بیان فرمایا، کیا ایک اچھی بیوی اپنے خاوند کے لئے اور ایک اچھا خاوند اپنے بیوی کے لئے پردہ، زینت اور راحت نہیں؟ یقیناً ہے جس ملت کے ہر گھر میں زوجیت کا یہ بلند تصور اور اعلیٰ معیار ہو اس کے لئے یہ دنیا جنت نہیں تو اور کیا ہے اسلام پر یہ اعتراض کرنے والے کہ اس نے عورت کے حقوق کو پامال کر دیا ہے اگر آیت کے اسی حصہ پر نظر ڈالیں تو انہیں اپنی غلطی کا احساس ہو جائے گا ہاں اسلام نے ملت ابراہیمی کی بیٹیوں کے چہروں سے شرم و حیا کا نقاب نوچنے کا حکم نہیں دیا۔ اس نے عورت کو محفل رقص و سرور کی زینت بننے کی اجازت نہیں دی اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام ایک مستقل دین ہے اس کا اپنا نظام، اپنا قانون اور اپنا ضابطہ حیات ہے اور اس کے استقلال کی یہی علامت ہے کہ وہ ہر حالت میں اسی ضابطے کا پابند رہے کسی کو پسند آئے یہی بات یا نہ، کوئی خوش ہو یا ناخوش، اسلام کو ہر دل عزیز بنانے اور اسے تہذیب مغرب سے ہم آہنگ کرنے کے لئے اس کے سادہ لوح بھی خواہوں نے اس کے فطری خدو خال میں جس وقت قطع و برید (کانٹ چھانٹ) گوارا کر لی اس دن اسلام بحیثیت ایک مستقل ضابطہ حیات کے ہم سے چھن جائے گا اللہ تعالیٰ اس روز بد (برے

یہ الفاظ مبارکہ یعنی ﴿هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ﴾ ماقبل کے مضمون کا بیان ہیں کہ مرد عورتوں کے محتاج ہیں اور ان میں صبر کم پایا جاتا ہے اور عورتوں میں بھی صبر کم پایا جاتا اور ان کا اجتناب مشکل ہوتا ہے بلکہ مردوں کی نسبت عورتوں میں صبر کی کمی زیادہ پائی جاتی ہے حدیث شریف میں آتا ہے:

”لا خیر فی النساء ولا صبر عنهن یغلبن کریمما ویغلبهن لیثم واحب

ان اکون کریمما مغلوبا ولا احب ان اکون لیثما غالبا“

نبی کریم ﷺ نے فرمایا عورتوں میں خیر نہیں اور نہ ان میں صبر ہے وہ کریم شخص پر غالب آ جاتی ہیں اور ذلیل شخص ان پر غالب آ جاتا ہے۔ میں پسند کرتا ہوں کہ میں کریم اور مغلوب ہو جاؤں اور یہ نہیں پسند کرتا کہ میں غالب اور ذلیل ہو جاؤں۔

(از روح المعانی)

عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُونَ أَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ:

”اللہ کو معلوم ہے بیشک تم خیانت میں ڈالتے ہو اپنے نفسوں کو تو اس نے تمہاری توبہ قبول فرمائی اور تمہیں معاف کیا۔“

﴿عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُونَ﴾ ای تفعلون خفیه فعل الخائن

فتظلمون ﴿أَنْفُسَكُمْ﴾ بتعريضها للعقاب ونقص حظها من الثواب

بأشر عمر رضی اللہ عنہ بعد العشاء فندم واعتذر الی النبی ﷺ فقام

رجال واعترفوا بمثله ثم ندموا علیه ﴿فَتَابَ عَلَيْكُمْ﴾ ای قبل توبتکم

﴿وَعَفَا عَنْكُمْ﴾ ای جاوز عنکم تحریمہ بلا کراهة (تبصیر الرحمن)

اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے کہ تم پوشیدہ طور پر خائن کی طرح فعل کر کے اپنی نفسوں پر ظلم کر رہے ہو اور اپنے آپ کو عذاب کے لئے پیش کر رہے ہو اور اپنے ثواب کا حصہ کم کر رہے ہو چونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عشاء کے بعد مباشرت کر لی پھر اس پر نادم ہو گئے تو نبی کریم ﷺ کے سامنے عذر پیش کیا تو کئی صحابہ کرام کھڑے ہو گئے اسی قسم کا معاملہ درپیش آنے کا اعتراف کیا پھر سب نادم ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ کو قبول فرمایا اور ان کو معاف کر دیا یعنی تم سے حرمت کو اٹھالیا گیا یہاں تک کہ اس میں کراہیت کو بھی باقی نہیں رکھا۔

تنبیہ : راقم تو اس مسئلہ میں اس بات کا قائل ہے کہ صحابہ کرام سے خطا ہوئی یعنی بلا ارادہ غلطی ہوئی جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی زوجہ نے بتایا کہ میں سوچکی تھی لیکن آپ نے سمجھا کہ یہ بہانہ بنا رہی ہے تو آپ نے اس کی بات کی پرواہ نہ کرتے ہوئے جماع کر لیا بعد میں جب یقین ہو گیا کہ زوجہ نے تو سچ کہا تھا غلطی تو مجھ سے ہی سرزد ہوئی تو آپ نادم ہو گئے توبہ کی اللہ تعالیٰ نے آپ کی توبہ کو قبول فرمایا۔

راقم کے خیال کو علامہ قرطبی رحمہ اللہ کی تفسیر سے بہت زیادہ تقویت ملتی ہے آپ رقم طراز ہیں:

﴿عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُونَ أَنْفُسَكُمْ﴾ يستأمر بعضكم في موافقة

المحظور من الجماع والاكل بعد النوم في ليالي الصوم

یہاں خیانت کا یہ مطلب ہے کہ تم ایک دوسرے سے پوچھتے ہو کہ روزوں کی راتوں کو سونے کے بعد جماع اور کھانے پینے کی ممانعت کب اٹھے گی تمہارا ایک دوسرے سے مخفی طور پر پوچھنا خیانت کی طرح ہے۔ ﴿فَتَابَ عَلَيْكُمْ﴾ میں دو احتمال ہیں ایک ان میں سے یہ ہے ”قبول التوبة من خيانتهم لانفسهم“ کہ اس نے تمہاری توبہ کو قبول کیا جو تم نے اپنے نفسوں کو خیانت میں ڈالا اگرچہ بلا ارادہ خطا تھی لیکن صحابہ کرام کا مقام بلند تھا زیادہ تحقیق کی ضرورت تھی اور دوسرا احتمال یہ ہے ”التخفيف عنهم بالرخصة والاباحة“ توبہ قبول کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رخصت عطا فرمائی اور مباشرت اور کھانے پینے کو مباح قرار دیا۔ یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ (علم ان لن تحصوه فتاب عليكم) میں ﴿فَتَابَ عَلَيْكُمْ﴾ کا معنی ”خفف عنكم“ ہے کہ اس نے تم سے تخفیف فرمائی۔ اسی طرح رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿لَقَدْ تَابَ اللَّهُ عَلَى النَّبِيِّ﴾ وان لم يكن من النبي ما يوجب التوبة منه“ نبی کریم ﷺ سے تو کوئی ایسا کام سرزد نہیں ہوا جو توبہ کرنے کا ذریعہ بنتا البتہ آپ کا ذکر صحابہ کرام مہاجرین و انصار کے ساتھ ان کی دل جوئی کے لئے ذکر فرما دیا لہذا نبی کریم ﷺ کی طرف توبہ کی نسبت کا مطلب ہی وسعت امر ہے:

﴿وَعَفَا عَنْكُمْ﴾ يحتمل العفو من الذنب ويحتمل التوسعة والتسهيل

قول النبي ﷺ اول الوقت رضوان الله وآخره عفو الله يعني تسهيلة

وتوسعته

معاف کرنے کے بھی دو ہی مطلب ہیں ایک یہ کہ گناہوں کو معاف کرنا اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ وسعت اور آسانی کا عطا کرنا جیسا کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے اول وقت میں رب تعالیٰ کی رضا مندی پائی جاتی ہے اور آخر میں عفو اس مقام میں عفو کا معنی آسانی اور وسعت عطا کرنا ہی ہے۔

(از فرطی)

تاہم اس مسئلہ کو حضرت مفتی احمد یار خان رحمہ اللہ نے اعتراض و جواب کی صورت میں مستحسن انداز پر پیش کیا۔

اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ حضرت عمر و دیگر صحابہ خیانت کرتے تھے اور خائن خلافت کے قابل نہیں۔ لہذا ان کی خلافت باطل ہے نیز تمہارا یہ عقیدہ بھی باطل ہے کہ کوئی صحابی فاسق نہیں اس آیت سے ان کی خیانت ثابت ہوئی جو کہ اولیٰ درجہ کافس ہے۔

جواب: ہم صحابہ کرام کو معصوم نہیں مانتے عادل مانتے ہیں یعنی وہ گناہ پر قائم نہیں رہتے بلکہ اگر غلطی ہو جائے تو توبہ کر کے رب سے معافی حاصل کر لیتے ہیں یہاں بھی یہی ہوا۔ نیز یہاں خیانت سے مراد انسانی امانت میں خیانت مراد نہیں بلکہ فقط بے اختیاری گناہ مراد ہے کیونکہ انہوں نے کسی کا مال نہیں مارا تھا اپنی حلال بیبیوں سے جماع کیا تھا اسی لئے فرمایا گیا ﴿أَنفُسُكُمْ﴾ اپنے نفسوں کی خیانت کی کسی کا مال یا کسی کا باپ نہ مارا نیز جب رب انہیں معافی کا پروانہ دے چکا تو تمہیں انکے عیب نکالنے کا کیا حق ہے رب تو معاف کرے اور تم شور مچاؤ بلکہ اس آیت سے ان کی عظمت ثابت ہوتی ہے کیونکہ رب نے ان کے نفسوں کو اپنی ملک قرار دیا اور فرمایا اے عمر تمہارا نفس تو جنت کے عوض خرید چکا اب تو نام تمہارا رہ گیا چیز ہماری ہو گئی تم نے مجھ سے بغیر پوچھے اپنے اختیار سے جماع بھی قبول کر لیا، سبحان اللہ کوئی ایسا خوش نصیب بھی تو ہو جس کو رب اپنی ملک بتائے اسکی تفسیر وہ آیت ہے ﴿إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ﴾ (نجمی)

فائدہ: حضرت ابن عربی رحمہ اللہ فرماتے ہیں علماء زہد و تقویٰ نے بیان فرمایا:

”وَكَذَا فَلَئِكَ الْعَنَابَةُ وَشَرَفَ الْمَنْزِلَةُ خَانَ نَفْسِهِ عَمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ

فَجَعَلَهَا اللَّهُ تَعَالَىٰ شَرِيعَةً وَخَفَفَ مِنْ أَجَلِهِ عَنِ الْأَمَةِ فَرَضَىٰ اللَّهُ عَنْهُ

وَارِضَاهُ“

رب تعالیٰ کی طرف سے کتنی ہی مہربانی اور کتنی ہی بلندی مرتبت پائی گئی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ

نے اپنے نفس کو خیانت میں ڈالا تو اللہ تعالیٰ نے اسکو شریعت کا حصہ بنا دیا آپکی وجہ سے تمام امت پر مہربانی پائی گئی۔ آپ نے اللہ تعالیٰ کے حضور عذر پیش کر کے اسے راضی کر لیا اور رب آپ سے راضی ہو گیا۔

(فرطی)

فَالْتَنَ بِأَشْرُوهُنَّ : ”تو اب ان سے صحبت کرو“

جب حرمت منسوخ ہو گئی تو اب تم اپنی عورتوں سے مباشرت کر سکتے ہو خیال رہے کہ یہ امر وجوب کے لئے نہیں بلکہ اباحت کے لئے ہے ﴿الآن﴾ اصل میں ”آن“ بمعنی ”حان“ ہے فعل ہے پھر اس کو زمانہ حاضر کے لئے اسم بنالیا گیا اور معرف باللام بنالیا گیا اور فتحہ باقی رکھا گیا:

”والمباشرة الزاق بالبشرة كنى بها عن الجماع الذى يلتزمها“

مباشرت کا معنی ہے چمڑے کا چمڑے سے ملنا، کنایہ اس کا معنی جماع لیا گیا ہے جس کو چمڑے کا ملنا لازم ہے اسی طرح اس مباشرت کے حکم میں جماع کے دوائی یعنی بوسہ لینا اور معانقہ وغیرہ داخل ہیں اس سے ایک اور مسئلہ ثابت ہو گیا کہ حدیث کا قرآن پاک سے منسوخ ہونا ثابت ہو گیا کہ رمضان کی راتوں کو سونے کے بعد کھانے پینے اور جماع کرنے کی حرمت حدیث پاک سے ثابت تھی لیکن قرآن پاک سے اسے منسوخ کر دیا گیا۔

البتہ بعض حضرات نے کہا کہ ان چیزوں کی حرمت پہلی شریعتوں سے ثابت تھی اور قرآن پاک کی اس آیت سے پہلی شریعتوں کے احکام کو منسوخ کر دیا گیا لیکن یہ قول درست نہیں کیونکہ پہلی شریعتوں کے احکام ہم پر لازم ہی نہیں۔

(از روح البیان)

وَابْتَغُوا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَكُمْ : ”اور طلب کرو جو لکھا ہے اللہ نے تمہارے لئے“ یعنی اللہ تعالیٰ نے جو اولاد تمہاری تقدیر میں لکھ دی ہے اور لوح محفوظ میں ثابت ہے وہ طلب کرو۔ اسی سے یہ مسئلہ سمجھ آ گیا کہ مباشرت میں مقصد اولاد اور نسل کی طلب ہو کیونکہ شہوت کے پیدا کرنے اور نکاح کی مشروعیت میں حکمت ہی یہی ہے صرف خواہشات کو پورا کرنا مقصود نہ ہو حدیث شریف میں ہے:

”عن معقل بن يسار قال قال رسول الله ﷺ تزوجوا الودود الولود“

فانى مكاثربكم الامم“ (ابو داؤد، نسائی)

حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا محبت کرنے والی اور بچے جننے والی عورتوں سے نکاح کرو بیشک میں دوسری امتوں پر تمہاری کثرت پر فخر محسوس کروں گا۔ اور مسئلہ یہ سمجھ آ یا کہ جماع صرف قبل یعنی مولد میں ہو سکتا ہے دبر میں نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ مقام اولاد نہیں۔ اور مسئلہ یہ سمجھ آ یا "ان العزل مکروہ" کہ عزل مکروہ ہے۔ (از روح البیان و مظہری)

عزل، برتھ کنٹرول، خاندانی منصوبہ بندی:

عزل کے مسئلہ کو علامہ سید محمود اندر ضوی شارح بخاری نے رضوان ماہ نومبر 1991ء میں یوں ذکر کیا:

(۱) حدیث وفقہ کی تقریباً تمام کتب میں مستقل طور پر باب العزل کا عنوان قائم ہے اور شارحین نے عزل کے متعلق شرح و بسط کے ساتھ گفتگو کی ہے شارحین حدیث اور فقہاء کرام نے عزل کے معنی یہ کئے ہیں کہ اپنی بیوی سے جماع کے وقت ایسا طریقہ اختیار کیا جائے کہ مادہ باہر گرے۔ مقصد اس عمل کا یہ ہے بچے پیدا نہ ہوں۔

جہاں تک میرے علم و عقل کا تعلق ہے میں سمجھتا ہوں کہ عزل اور برتھ کنٹرول یا دوسرے لفظوں میں خاندانی منصوبہ بندی کا مطلب و مقصد ایک ہی ہے۔ فی زمانہ (اس دور میں) برتھ کنٹرول کے مختلف طریقے ہیں ادویہ کا استعمال وغیرہ وغیرہ زمانہ رسالت میں مانع حمل ادویہ اور دیگر اشیاء ایجاد نہیں ہوئی تھیں اس لئے صرف عزل کے ذریعے بچہ کی پیدائش کو روکا جاتا تھا۔

(۲) صحابہ کرام کے عزل کی وجوہ:

ایک وجہ اس کی یہ ہے کہ وہ لونڈی سے عزل کرتے تھے تاکہ اس کی اولاد نہ ہو کیونکہ جس لونڈی کی اولاد ہو جائے وہ شرعاً ام ولد ہو جاتی ہے اس کی بیع (اسے بیچنا) ممنوع و ناجائز قرار پاتی ہے چنانچہ بخاری و مسلم و ابوداؤد و مسند احمد و ابن ماجہ کی متعدد احادیث میں اس وجہ کا واضح طور پر ذکر ہے۔

دوسری وجہ اپنی بیوی سے عزل کرنا، صحابہ کرام اپنی بیویوں سے اس لئے عزل کرتے تھے تاکہ اولاد زیادہ نہ ہو۔ چنانچہ مسلم و مسند احمد کی حدیث میں ہے کہ حضرت اسامہ فرماتے ہیں کہ بحضور نبوی ایک شخص حاضر ہوا عرض کی:

”انی اعزل من امرأتی فقال له ﷺ لم تفعل ذلك فقال اشفق علی ولدها او علی اولادها“
(مسلم)

میں اپنی بیوی سے عزل کرتا ہوں نبی کریم ﷺ نے فرمایا عزل کیوں کرتے ہو اس نے جواباً عرض کی کہ اس کے بچہ یا اولاد پر شفقت کی بناء پر۔ علامہ شوکانی نے اس حدیث کی شرح میں لکھا ہے کہ اس میں عزل کی وجوہات میں سے ایک وجہ کا ذکر ہے اور وہ یہ کہ کثرت اولاد سے بچا جائے۔
(نبیل الاوطار ج ۶ ص ۱۹۸)

اس حدیث سے واضح ہوا کہ صحابہ کرام اپنی ازواج سے عزل (برتھ کنٹرول) کرتے تھے اور اس لئے کرتے تھے تاکہ اولاد کی کثرت نہ ہو۔ ثابت ہوا کہ کثرت اولاد کی مشکلات سے بچنے کے لئے اپنی بیوی سے عزل جائز ہے۔ (یعنی عقیدہ کی صحت و سلامتی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو قادر و قدیر اور خالق و رازق سمجھتے ہوئے) محض سبب کے طور پر عزل کے عمل کو اپنانا جائز ہے شرط صرف یہ ہے کہ اس عمل کو مؤثر حقیقی نہ سمجھے اور یہ عقیدہ رکھے کہ خواہ کوئی بھی طریقہ اختیار کیا جائے جسے پیدا کرنا اللہ تعالیٰ کو مقصود ہو بہر حال اور بہر صورت پیدا ہوگا۔

چنانچہ یورپ میں جن عورتوں نے مانع حمل گولیاں استعمال کیں اخبارات شاہد ہیں کہ ان کے ایک نہیں دو بچے بھی پیدا ہوئے ہیں یہی وجہ ہے کہ حضور اقدس ﷺ سے جب کسی صحابی نے عزل کے متعلق سوال کیا۔ تو آپ نے بڑے حکیمانہ انداز میں انہیں بتایا کہ عزل محض ایک سبب ہے اسے مؤثر حقیقی نہ سمجھا جائے اور اللہ تعالیٰ کے خالق و رازق ہونے کے عقیدہ کو ذہنوں سے اوجھل نہ ہونے دیا جائے۔ چنانچہ بخاری و مسلم و ابوداؤد و مسند احمد و مؤطا امام محمد کی احادیث میں اس امر کی تصریح ہے۔

حضرت جابر سے روایت ہے کہ ایک شخص نے بحضور نبوی عرض کی میں اس بات کو اچھا نہیں سمجھتا کہ میری لونڈی حاملہ ہو نبی علیہ السلام نے فرمایا ”اعزل عنها ان شئت فانه سیأتیها ما قدر لها“
اگر تو چاہتا ہے تو عزل کر مگر اس کے باوجود جو مقدر ہے وہ ضرور پیدا ہوگا۔
(موطا امام محمد)

اسی طرح امام احمد اور بزار نے باسناد حسن حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کی کہ ایک شخص نے عزل کے متعلق نبی علیہ السلام سے سوال کیا تو آپ نے فرمایا وہ پانی جس سے بچے کی

پیدائش اللہ کو منظور ہے ” اہرقنہ علی صخرة لا خرج اللہ منها ولدا ویخلقن اللہ نفسا ہو خالقہا “ (موطا امام محمد) اسے تو پتھر پر بھی ڈال دے تو اس صورت میں بھی اللہ تعالیٰ بچہ پیدا فرما دے گا یا نفس کو پیدا فرما دے گا جس کا وہ خالق ہے۔

عزل جائز ہے لیکن مکروہ تنزیہی: موطا امام محمد کی شرح التعلیق الممجد میں حضرت مولنا عبدالحی لکھنوی علیہ الرحمۃ زیر عنوان باب العزل لکھتے ہیں کہ صحابی رسول حضرت ابن عباس و جابر بن عبد اللہ و سعد بن ابی وقاص و زید بن ثابت و حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہم اپنی بیوی اور لونڈی سے عزل جائز قرار دیتے ہیں البتہ حضرت عمر و حضرت علی و حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے کراہت کا قول کیا ہے۔ (یعنی یہ حضرات عزل کو جائز تو قرار دیتے ہیں مگر اس عمل کو اچھا نہیں سمجھتے یعنی مکروہ تنزیہی قرار دیتے ہیں اور مکروہ تنزیہی فعل جائز ہے حرام یا مکروہ تحریمی یا گناہ ہرگز نہیں)

”ونقل ابن عبد البر وابن ہبيرة الاجماع علی انه ما لا یعزل عن

(التعلیق الممجد)

الزوجة الحرة الا باذنها“

علامہ ابن عبد البر اور علامہ ابن ہبرہ نے لکھا ہے کہ اپنی بیوی کی اجازت سے عزل کے جواز پر اجماع ہے۔

اسقاط حمل کی وجوہ: ”قال حافظ ابن حجر ینتزع من حکم العزل معالجة المرأة اسقاط

(التعلیق الممجد)

النطفة قبل نفخ الروح“

حافظ ابن حجر شارح بخاری میں فرماتے ہیں عزل کے جواز سے بغرض علاج اسقاط حمل کا جواز بھی واضح ہو جاتا ہے مگر شرط یہ ہے کہ بچہ میں روح نہ پڑی ہو۔

”قال ابن الہمام ینباح الاسقاط النطفة قبل نفخ الروح“ (التعلیق الممجد)

علامہ ابن ہمام رحمہ اللہ فتح القدیر میں لکھتے ہیں کہ اسقاط حمل مباح ہے جب تک اعضاء نہ بنے ہوں اور روح نہ پڑی ہو (یعنی اگر حاملہ بیوی کو حمل کی وجہ سے جان کا خطرہ پیدا ہو جائے یا سخت بیماری کا تو جب تک بچہ میں جان نہ پڑی ہو اسقاط حمل جائز ہے)۔

بلا عذر اسقاط حمل ناجائز:

” لا اقول انه يباح الاسقاط مطلقا ان يلحقها اثم منها اذا اسقطت من

(التعليق الممجد)

غير عذر“

فقہ حنفی کی مشہور کتاب خانہ (قاضی خان) میں ہے کہ اپنی بیوی کا اسقاط حمل اس صورت میں ناجائز اور گناہ ہے جب کہ عذر شرعی نہ ہو (یعنی حاملہ کی جان یا سخت و شدید بیماری کا خطرہ نہ ہو)۔

” قال في البحر ينبغي الاعتماد عليه لان له اصلا صحيحا يقاس عليه“

(التعليق الممجد)

اور صاحب البحر الرائق نے فرمایا: ضرورت اسقاط حمل جائز ہے کیونکہ اس کے لئے دلیل صحیح موجود ہے جس پر اسقاط حمل کو قیاس کیا جائے۔ صحابی رسول حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے ابن فہید یمنی نے اپنی لونڈی سے عزل کے متعلق سوال کیا تو آپ نے فرمایا:

” هو حرثك ان شئت عطشته وان شئت سقيته“ (موطا امام محمد ص ۱۹۵)

وہ تیری کھیتی ہے اب یہ تیری مرضی ہے خواہ اس کو پیسا سا رکھ یا سیراب کر دے۔ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ

نے فرمایا:

” لا نرى بالعزل بأسا عن الامة امام الحرة لله فلا ينبغي ان يعزل عنها

(موطا امام محمد ص ۱۹۵)

الاباذن“

ہمارا موقف بھی یہی ہے کہ لونڈی سے عزل میں حرج نہیں البتہ اگر بیوی حرہ (آزاد) ہو تو اس کی اجازت سے عزل کرنا جائز ہے (یہ بھی خیال رہے آج کل تمام عورتیں آزاد ہیں بین الاقوامی قوانین کی وجہ سے کوئی لونڈی نہیں)۔ مولانا عبدالحی لکھنوی موطا امام محمد کی ان روایات کی شرح میں لکھتے ہیں کہ حضرت امام مالک اور امام احمد کا بھی یہی مذہب ہے۔

سید المفسرین حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے قرآن مجید کی آیت ﴿نِسَاءُكُمْ

خَرَثَ لَكُمْ﴾ سے عزل کے جواز کا استدلال فرمایا ہے آیت میں ﴿أَنْتُمْ شِئْتُمْ﴾ بمعنی ”کیف

شئتم“ ہے اور آیت کے اس جملہ سے عزل کا جواز ثابت ہوتا ہے مکمل عبارت مندرجہ ذیل ہے:

”ان جواز العزل مستنبط من الكتاب فانه تعالى قال في باب وطى النساء نساء كم حرث لكم فاتوا حرثكم اني شتمت فسمى بضع المرأة حرثا ومن المعلوم ان الحرث يستخير فيه الانسان بين ان يسقيه وان لا يسقيه فكذلك بضع النساء وبل قبل ان نزول اني شتمت اي كيف شتمت كان لبيان جواز العزل“ (طبرانی وحاکم)

بیشک عزل کا جواز قرآن پاک سے مستنبط ہے بیشک اللہ تعالیٰ نے عورتوں کے ساتھ وطی کا ذکر فرماتے ہوئے فرمایا تمہاری بیویاں تمہاری کھیتیاں ہیں اپنی کھیتی میں آؤ جس طرح تم چاہو، عورت کی فرج کو کھیتی کہا اور یہ بات یقیناً معلوم ہے کہ کھیتی میں انسان کو اختیار حاصل ہے چاہے تو اسے سیراب کرے یا نہ کرے یہی حکم عورت کی بضع کا بھی ہے یعنی مادہ کو اندر گرائے یا باہر اور بلکہ دوسری دلیل یہ بھی پیش کی گئی ہے کہ آیہ کریمہ میں ﴿ اَنِّیْ شَتَمْتُ ﴾ بمعنی ”کیف شتمت“ کے ہے یعنی جیسے تم چاہو۔ اس سے بھی عزل کا اختیار حاصل ہونا سمجھ آتا ہے۔ اور حضرت ابن مسعود و حضرت ابن عباس و حضرت ابن عمر و حضرت امیر المؤمنین فاروق اعظم رضی اللہ عنہم سے ابن ابی شیبہ و عبدالرزاق و بیہقی نے مرفوع احادیث روایت کی ہیں جن میں لونڈی سے اس کی اجازت کے بغیر اور اپنی حرہ بیوی سے اس کی اجازت سے عزل کا جائز ہونا واضح ہے۔

اسی طرح ابن ماجہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مرفوع حدیث اور علامہ ابن حجر نے تلخیص الجیر میں اور امام طحاوی علیہ الرحمۃ نے شرح معانی الآثار میں متعدد احادیث و آثار نقل کئے ہیں جن سے عزل کا جواز ثابت ہوتا ہے۔ اور حضرت عمر نے جو یہ فرمایا ہے کہ لوگ اپنی لونڈیوں سے عزل کرتے ہیں جو لونڈی میرے پاس آئے گی اور اس کا آقا یہ اعتراف کرے گا کہ میں نے اس سے جماع کیا ہے تو یہ اولاد آقا ہی کی قرار دوں گا۔ اب یہ تمہاری مرضی ہے کہ تم عزل کرو یا نہ کرو تو حضرت عمر نے اپنے اس فرمان میں لونڈی سے حرمت کا قصد نہیں فرمایا کیونکہ وہ بھی لونڈی سے عزل کو جائز قرار دیتے ہیں۔

حدیث جدامہ میں نبی کریم ﷺ نے عزل کو وادخفی یعنی کم درجہ کا زندہ درگور کرنا قرار دیا تھا۔ اگرچہ حدیث کے اس جملہ سے شارحین نے کراہۃ تنزیہی مراد لی ہے تاہم صاحب فتح القدیر نے صحابہ

کرام کے درمیان عزل کے متعلق ایک علمی مذاکرے کا ذکر کیا ہے جس میں حضرت عمرؓ۔ و حضرت زبیرؓ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی موجود تھے انہوں نے آپس میں عزل کا ذکر کیا اور سب نے کہا کہ اس میں کوئی جرم نہیں۔ حاضرین میں سے کسی نے کہا کہ لوگوں کا خیال ہے کہ عزل مؤدہ صغریٰ ہے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ مؤدہ صغریٰ نہیں جب تک اس پر سات ادوار نہ گزر جائیں یعنی (۱) سلالہ (۲) نطفہ (۳) علقہ (۴) مضغہ (۵) عظام (۶) لحم (۷) خلق آخر (یعنی روح پڑ جانے پر زندہ درگور کرنے کا حکم ثابت ہو گا پہلے نہیں) اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ آپ نے سچ کہا اللہ تعالیٰ آپ کی عمر دوا کرے۔

نوٹ: یہ تمام مضمون موطا امام محمد اور اس کی شرح تعلیق مجدد کا خلاصہ ہے جسے ہم نے آسان زبان میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

(موطا امام محمد ص ۱۹۴، ۱۹۵)

مولانا عبدالحی لکھنوی علیہ الرحمۃ نے احادیث پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ بعض صحابہ کرام نے عزل کو مکروہ اس لئے قرار دیا کہ عزل کی کراہت کا قول کرنے سے ایک تو حق زوجہ کو تقویت ملتی ہے اور دوم یہ کہ عزل کا عمل قضاء و قدر کے معاند (مخالف) ہے۔ حق زوجہ کی تقویت کی دلیل حدیث احمد وابن ماجہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

”قال نہی رسول اللہ ﷺ ان یعزل عن الحرة الا باذنها“

(نبیل الاوطار ج ۲ ص ۱۹۶)

نبی کریم ﷺ نے آزاد بیوی سے اس کی اجازت کے بغیر عزل سے منع فرمایا ہے۔ اور قضاء و قدر کے معاند کی دلیل حدیث جابر و انس ہے ”فافہم“ (سمجھئے) (التعلیق الممجد)

واضح ہوا حدیث جدامہ سے عزل کی ممانعت کا قول کیا جاتا ہے جس میں عزل کے متعلق سوال کے جواب میں نبی علیہ السلام نے فرمایا ”ذلک الواد الخفی“ (یہ ہلکا زندہ درگور کرنا ہے) (احمد مسلم) اور حدیث ابوسعید میں ہے یہود نے عزل کو ”المؤدہ الصغریٰ“ قرار دیا اس پر نبی علیہ السلام نے فرمایا ”کذبت یہود“ یہود جھوٹ بولتے ہیں۔ یہ دونوں حدیثیں آپس میں معارض ہیں ایک سے عزل کا

جواز اور دوسری سے ممانعت ثابت ہوتی ہے۔

اسی طرح بخاری شریف کی حدیث میں ہے حضور ﷺ سے عزل کے متعلق سوال ہوا تو آپ نے فرمایا ”ما علیکم ان لا تفعلوا“ حدیث کے اس جملہ سے بھی ممانعت کا قول کیا گیا ہے۔ شارح مسلم حضرت امام نووی علیہ الرحمۃ اور علامہ ابن قیم نے ان احادیث میں تطبیق دی ہے فرماتے ہیں:

”ثم هذه الاحادیث مع غيرها یجمع بینہما بان ما ورد فی النفی

محمول علی کراهة التنزیہ وما ورد فی الاذن فی ذلک محمول

علی انه لیس بحرام“ (حاشیہ مسلم ج ۱ ص ۴۶۴)

جن احادیث میں عزل کی ممانعت ہے وہ کراہیت تنزیہی پر محمول ہیں اور جن میں عزل کی اجازت ہے وہ اس پر محمول ہیں کہ یہ فعل حرام نہیں۔ غرضیکہ شارحین کرام نے ممانعت کی احادیث میں نہی کو نہی تنزیہی قرار دیا ہے اور جو فعل مکروہ تنزیہی ہو وہ جائز ہوتا ہے۔

علامہ ابن ہمام علیہ الرحمۃ نے اس مسئلہ پر تفصیلی گفتگو فرماتے ہوئے لکھا ہے کہ صحیح یہ ہے کہ عزل جائز ہے اور عامۃ العلماء کا یہی مذہب ہے دس صحابہ کرام حضرت علی، سعد بن ابی وقاص، زید بن ثابت، ابو یوب، جبر، ابن عباس، حسن بن علی، خباب بن ارت، ابوسعید خدری اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم سے عزل کا جائز ہونا مروی ہے۔

(فتح القدیر ج ۳ ص ۲۷۲)

”عن جابر قال کنا نعزل والقرآن ینزل زاد اسحق قال سفیان لو کان

شیئا ینہی عنہ لنہانا عنہ القرآن“

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم عزل کیا کرتے تھے اور قرآن کا نزول جاری تھا سفیان نے کہا اگر عزل کا عمل ممنوع ہوتا تو قرآن مجید میں اس کی ممانعت آ جاتی۔ (مسلم)

”عن جابر قال کنا نعزل علی عہد رسول اللہ ﷺ فبلغ ذلک نبی

اللہ ﷺ فلم ینہانا“

حضرت جابر فرماتے ہیں کہ ہم عہد نبوی میں عزل کرتے تھے نبی کریم ﷺ کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپ نے منع نہیں فرمایا۔ (مسلم ج ۱ ص ۴۶۵)

فقہاء کرام، ائمہ دین اور شارحین حدیث نے بخاری و مسلم کی ان ہی احادیث کی بناء پر عزل کو جائز و مباح قرار دیا ہے اس لئے اس عمل کو مطلقاً حرام و ناجائز قرار دینا سخت زیادتی ہے۔

البتہ ایک احتیاط کی سخت ضرورت ہے: اور یہ حکومت کا کام ہے کہ وہ عزل اور برتھ کنٹرول کی ادویہ و آلات وغیرہ صرف شادی شدہ افراد کے لئے مختص کر دے اور ایسا انتظام کیا جائے کہ یہ ادویہ و آلات وغیرہ غیر شادی شدہ مرد و عورت نہ حاصل کر سکیں تاکہ کوئی ان سے ناجائز فائدہ نہ اٹھا سکے۔

اور یہ بھی ضروری ہے کہ خاندانی منصوبہ بندی کی تشہیر کے ساتھ ساتھ ان احادیث کو بھی بیان کیا جائے جن میں نبی کریم ﷺ نے یہ فرمایا ہے جسے پیدا کرنا اللہ تعالیٰ کو مقصود ہے وہ بہر حال و بہر صورت پیدا ہوگا تاکہ لوگ عقیدہ کی درستگی کے ساتھ اس عمل کو اپنانا چاہیں تو اپنائیں مگر اسے محض ایک سبب سمجھیں اور مؤثر حقیقی صرف اور صرف خداوند قدوس کو جانیں۔ (النتھی)

وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ : ”اور کھاؤ اور پیو یہاں تک کہ ظاہر ہو جائے تمہارے لئے دھاگہ سفید دھاگے سیاہ سے یعنی فجر سے“۔ آیت کریمہ میں سفید دھاگہ سے مراد صبح صادق ہے اور سیاہ دھاگہ سے مراد صبح کاذب اور ”مِنَ الْفَجْرِ“ اس کا بیان ہے یہاں سے کھانے پینے کی انتہاء اور روزہ کی ابتداء بیان کی گئی۔ یعنی صبح کاذب میں تم کھاپی سکتے ہو اور صبح صادق میں کھانے پینے سے رک جاؤ سفید اور سیاہ دھاگہ سے فجر کی دونوں قسمیں ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے نافع ازرق نے رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ﴾ کے متعلق سوال کیا کہ اس کا کیا مطلب ہے؟ تو آپ نے فرمایا: ”بیاض النهار من سواد الليل وهو الصبح“ اس سے مراد صبح ہے یعنی رات کی تاریکی سے جودن کی سفیدی ظاہر ہوتی ہے۔ مطلب واضح ہے کہ آپ نے فرمایا سیاہ دھاگہ سے مراد رات کی تاریکی ہے جو صبح کاذب میں بھی رہتی ہے اور سفید دھاگہ سے مراد صبح صادق کی سفیدی ہے۔ سوال کرنے والے شخص نے کہا کیا یہ محاورہ عرب حضرات کے کسی کلام میں بھی استعمال ہے؟

آپ نے فرمایا ہاں کیا تم نے امیہ کا قول نہیں سنا:

الخيط الابيض ضوء الصبح منفلق والخيط الاسود لون الليل مكموم
سفید دھاگہ صبح کی روشنی یعنی پوپھٹنا ہے اور سیاہ دھاگہ رات کی تاریکی کا چھپا (چھایا ہوا ہونا)

☆ "واخرج البخاری ومسلم والنسائی وابن جریر وابن المنذر وابن ابی حاتم
والبيهقي في سننه عن سهل بن سعد قال انزلت ﴿وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ
الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ﴾ ولم ينزل ﴿مِنَ الْفَجْرِ﴾ فكان رجال اذا ارادوا الصوم ربط
احدهم في رجله الخيط الابيض والخيط الاسود فلا يزال يا كل ويشرب حتى يتبين له
رؤيتهما فانزل الله بعد ﴿مِنَ الْفَجْرِ﴾ فعلموا انما يعنى الليل والنهار

بخاری، مسلم اور نسائی وغیرہ نے بیان کیا ہے کہ حضرت سہل بن سعد کہتے ہیں جب آیہ کریمہ
کے یہ الفاظ مبارکہ نازل ہوئے ﴿وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ
الْأَسْوَدِ﴾ اس وقت ﴿مِنَ الْفَجْرِ﴾ کے الفاظ نازل نہیں ہوتے تھے تو لوگ جب روزہ رکھنے کا
ارادہ کرتے تو اپنے ایک پاؤں (یعنی ٹانگ) سے سفید دھاگہ باندھ لیتے اور دوسرے سے سیاہ دھاگہ
باندھ لیتے دونوں دھاگوں کو دیکھتے رہتے جب تک واضح طور پر دونوں میں فرق نظر آتا اس وقت تک
کھاتے پیتے رہتے تو اللہ تعالیٰ نے ﴿مِنَ الْفَجْرِ﴾ کے الفاظ نازل فرمائے تو سمجھ گئے کہ سیاہ دھاگہ
سے مراد رات اور سفید دھاگہ سے مراد صبح ہے۔

☆ "واخرج سفيان بن عيينه وسعيد بن منصور وابن ابی شيبة واحمد والبخاری
ومسلم وابو داود والترمذی وابن جریر وابن المنذر والبيهقي عن عدي بن حاتم قال لما
انزلت هذه الآية ﴿وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ﴾
عمدت الى عقالين احدهما اسود والاخر ابيض فجعلتهما تحت وسادتي فجعلت انظر
اليهما فلا يتبين لي الابيض من الاسود فلما اصبحت غدوت على رسول الله ﷺ فاخبرته
بالذي صنعت فقال ان وسادك اذا لعريض انما ذاك بياض النهار من سواد الليل

بخاری مسند احمد، مصنف ابن ابی شیبہ، مسلم، ابو داود اور ترمذی وغیرہ میں ہے کہ عدی بن حاتم
کہتے ہیں کہ جب آیہ کریمہ میں یہ الفاظ نازل ہوئے ﴿وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ
الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ﴾ تو میں نے اونٹ باندھنے والی دو رسیاں ایک سیاہ اور سفید اپنے

تکیہ (سرہانے) کے نیچے رکھ لیں ان کو دیکھنے لگ گیا سفید اور سیاہ میں فرق نظر نہیں آ رہا تھا۔ صبح میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا میں نے آپ کو خبر دی کہ میں نے ایسے کیا تھا تو آپ نے فرمایا کہ پھر تو تمہارا تکیہ بہت چوڑا (وسیع) ہوگا، حالانکہ اس سے مراد تو دن کی سفیدی اور رات کی سیاہی ہے مطلب یہ تھا کہ کیا تمہارا تکیہ اتنا وسیع ہو سکتا ہے کہ اس میں دن کی سفیدی اور رات کی تاریکی سما سکیں۔

☆ ”واخرج عبد بن حميد والبخاري وابن جرير عن عدي بن حاتم قال قلت يا رسول الله ما الخيط الابيض من الخيط الاسود اهما الخيطان فقال انك لعريض القفا ان ابصرت الخيطين ثم قال لا بل هو سواد الليل وبياض النهار“

بخاری وغیرہ نے بیان کیا ہے کہ عدی بن حاتم کہتے ہیں میں نے کہا یا رسول اللہ سفید دھاگے اور سیاہ دھاگے سے مراد کیا دو دھاگے ہی ہیں؟ آپ نے فرمایا اگر تم حقیقتہً دو دھاگے ہی سمجھ رہے ہو تو تم چوڑی گدی والے ہو (یعنی بے وقوف ہو) آپ نے فرمایا اس سے مراد دھاگے نہیں بلکہ رات کی سیاہی اور دن کی سفیدی مراد ہے۔ (درمنثور)

خیال رہے ”عريض القفا“ کا کنایہ معنی بے وقوف لیا جاتا ہے ”قفا“ سر کے پچھلے حصہ کو کہا جاتا ہے۔

فائدہ: زیر بحث الفاظ مبارکہ ﴿كُلُوا وَاشْرَبُوا.....﴾ سے ایک مسئلہ یہ سمجھ آیا کہ طلوع فجر تک کھانا جائز ہے۔ اور اسی سے یہ سمجھ آیا کہ سحری کے وقت کھانا تناول کرنا مستحب ہے البتہ رخصت ہے اگر کوئی نہ کھائے تو مؤاخذہ نہیں لیکن اس پر عمل کرنا مستحب ہے۔ (ازصابونی)

سحری کے کھانے کے متعلق احادیث مبارکہ:

”عن انس قال قال رسول الله ﷺ تسحروا فان في السحور بركة“

(بخاری و مسلم، مشکوٰۃ کتاب الصوم)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سحری کا کھانا تناول کرو بیشک سحری کے کھانے میں برکت ہے۔

وضاحت حدیث: (تسحروا) امر ندب کما اجمعوا علیہ ”سحری کے کھانے کا حکم وجوبی نہیں بلکہ استحبابی ہے یعنی سحری کے وقت کچھ نہ کچھ کھا لینا مستحب ہے دوسری حدیث شریف

میں ہے ”تسحروا ولو بجرعة ماء“ سحری کرو اگرچہ پانی کے ایک گھونٹ سے بھی کیوں نہ ہو۔ ابن حبان نے اس حدیث ”تسحروا ولو بجرعة ماء“ کو صحیح قرار دیا ”وقیل انه ضعیف لکنه یعمل به فی فضائل الاعمال“ البتہ بعض حضرات نے اس کو ضعیف کہا ہے لیکن ضعیف ہونے کے باوجود بھی اس پر عمل ہوگا کیونکہ فضائل اعمال میں ضعیف حدیث معتبر ہے۔

یہاں سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ ہر حدیث کو ضعیف کہہ کر عبادات سے روکنا اور فضائل کو کم کرنا سوائے حماقت و جہالت کے اور کچھ نہیں۔ اور ساتھ یہ بھی خیال کریں کہ اگر ایک حدیث کو بعض حضرات صحیح قرار دیں اور بعض ضعیف تو دیکھا جائے اگر اس کا تعلق نیک اعمال اور فضائل انبیاء و اولیاء سے ہے تو اس پر عمل کیا جائے یہی تقویٰ ہے ہاں اگر اس کا تعلق کچھ اعمال کی ممانعت سے ہے اور اس کے مقابل کوئی اور مثبت روایت نہیں تو پھر البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ تقویٰ یہ ہے کہ اس سے اجتناب کر لیا جائے لیکن حرمت ثابت کرنا پھر بھی ناجائز ہوگا۔

قاموس میں ذکر ہے ”السحر هو قبیل الصبح“ صبح سے تھوڑا پہلے وقت سحری کا وقت ہے اور کشاف میں ہے ”هو السدس الاخير من الليل“ رات کا آخری چھٹا حصہ ہے ”وقیل وقتہ یدخل بنصف اللیل“ اور یہ بیان کیا گیا ہے کہ سحری کا وقت آدھی رات سے داخل ہو جاتا ہے ”السحور“ سین پر فتح ہے سحری کے وقت کھانے، پینے کی اشیاء پر یہ لفظ بولا جاتا ہے ”فان فی السحور برکة“ بیشک سحری کے کھانے میں برکت ہے اس میں برکت کی ایک وجہ یہ ہے ”لان فیہ اجرا عظیما باقامة السنة“ کہ سحری کھانا سنت ہے سنت پر عمل کرنا عظیم اجر و ثواب کا ذریعہ ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ سحری کے وقت کھانے سے دن میں روزہ رکھنے کی طاقت حاصل ہوگی روزہ کو زیادہ بوجھ نہیں سمجھا جائے گا بلکہ خوش دلی سے عبادت سمجھ کر ادا کیا جائے گا جس سے اجر و ثواب حاصل ہوگا۔

علمی بحث کثیر فوائد پر مشتمل:

نہایہ میں ذکر کیا گیا ہے کہ حدیث شریف میں ”سحور“ کا جو ذکر ہے اس میں زیادہ طور پر مشہور سین کا فتح ہے: ”وقیل الصواب بالضم لانہ المصدر والاجر فی الفعل لافی الطعام“ بعض حضرات نے کہا کہ درست اس میں سین کا ضمہ ہے کیونکہ اس صورت میں مصدر ہے اور اجر مصدری معنی یعنی تناول کرنے میں ہے نہ کہ سحری کے وقت کھانے والی اشیاء (چیزوں) میں۔

ملا علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ درست فتح ہے کیونکہ فعل پر ثواب اسی وقت حاصل ہوتا ہے جب وہ سنت کے مطابق ہو ”فاذا اثیب علی اثرہ فبا لاولی علی نفسہ“ جب ثواب ایک چیز کے اثر پر یعنی تناول کرنے پر ہوگا تو اس چیز پر ثواب تو یقیناً بہتر طریقہ سے حاصل ہوتا ہے۔

واضح ہوا کہ کھانے کی چیزیں حاصل کرنا اور ان کو تیار کرنا بھی باعث برکت ہے سحری کے وقت کھایا جانے والا کھانا بھی مبارک ہے اور اس کا تناول کرنا بھی باعث برکت ہے ”کما ورد فی الحدیث مداد العلماء افضل من دماء الشهداء“ جس طرح حدیث شریف میں ہے علماء کی سیاہی شہداء کے خون سے افضل ہے۔

واضح ہوا کہ علماء کا علمی اور فقہی مسائل لکھنا بھی افضل ہے اور لکھنے کے لئے استعمال ہونے والی سیاہی بھی افضل ہے۔ ابن ہمام رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ برکت سے مراد تقویٰ ہے کہ سحری کے کھانے میں روزہ رکھنے کی تیاری اور نیت پائی گئی جو تقویٰ کا سبب ہے اسی کو برکت سے تعبیر کر دیا گیا۔ اور سحری کے کھانے میں اس لئے بھی برکت ہے کہ نبی کریم ﷺ کی سنت پر عمل پایا جاتا ہے۔

(ماخوذ از مرقاۃ ح ۴ ص ۲۵۱)

☆ ”وعن عمرو بن العاص قال قال رسول اللہ ﷺ فصل ما بین صیامنا وصیام اهل الكتاب اكلة السحر“ (رواہ مسلم . مشکوٰۃ کتاب الصوم)

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہمارے اور اہل کتاب کے روزوں میں فرق سحری کے کھانے سے ہے۔

وضاحت حدیث: ”اکلة“ ہمزہ کے فتح سے مصدری معنی کا بھی احتمال ہے جیسا کہ راقم

نے ترجمہ کیا ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ ”ایک مرتبہ کھانا“ معنی لیا جائے اور ہمزہ کے ضمہ سے لقمہ معنی بھی لیا جاسکتا ہے تاہم راقم کے نزدیک وہی معنی درست ہے جو تحریر کر دیا۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب پر سونے کے بعد کھانا پینا حرام کر دیا تھا یا مطلقاً افطار کے بعد پھر دوبارہ ان پر کھانا پینا منع کر دیا تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے ہم پر ابتداء اسلام میں حرام کر دیا تھا لیکن بعد میں اس حرمت کو اٹھالیا گیا ”ومخالفتنا ایہم تقع موقع الشکر لتلك النعمة“ اس لئے ہم پر اللہ تعالیٰ نے یہ انعام فرمایا ہے تو اس انعام کے لحاظ سے ہمارا ان سے مختلف ہونا تقاضا کرتا ہے کہ ہم اس کا شکر کریں۔ (مرقاۃ ج ۴ ص ۲۵۱)

☆ ”وعن العرباض بن ساریۃ قال دعانی رسول اللہ ﷺ الى السحور فی رمضان فقال ہلم الى الغداء المبارک“

(رواہ ابو داؤد والنسائی، مشکوٰۃ کتاب الصوم) (ورواہ ابن خزیمہ وابن حبان فی صحیحہما)

حضرت عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں مجھے رسول اللہ ﷺ نے رمضان میں سحری کے کھانے کی طرف بلایا اور فرمایا آؤ صبح کے مبارک کھانے کی طرف۔

وضاحت حدیث: ”ہلم“ بنی پر فتح ہے اس کا معنی ہے ”تعال“ آؤ۔ کبھی اس کا معنی

ہوتا ہے لاؤ حاضر کرو جیسا کہ ”ہلم شہداء کم“ میں معنی لیا گیا ہے ”احضروہم“ گواہ حاضر کرو۔ یہ لفظ واحد، تشبیہ، جمع اور مذکر و مؤنث سب کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ ”الغداء“ (غین کے فتح سے) صبح کے کھانے کو کہا جاتا ہے سحری کے کھانے کو صبح کا کھانا کہنے میں یہ حکمت تھی کہ یہ کھانا چونکہ صبح کے کھانے کی طرح دن میں کفایت کرتا ہے۔

☆ ”عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ ﷺ نعم سحور المؤمن التمر“

(رواہ ابو داؤد، مشکوٰۃ کتاب الصوم)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مؤمن کا سحری کا بہترین کھانا کھجور ہے۔

وضاحت حدیث: علامہ ابن طبری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے سحری کے

وقت کھجور کھانے کی تعریف بیان فرمائی، حالانکہ سحری کے وقت کوئی چیز بھی کھائی جائے تو اس میں برکت

ہوتی ہے ”وتخصیصہ بالتمر بركة علی بركة“ اور کھجور کے ساتھ خاص کرنے میں برکت پر برکت ہے۔ پھر خاص کر کے اگر کھجور کے ساتھ افطار بھی کرے تو اس میں اور ہی زیادہ برکت ہوگی ”لیكون المبلوہ به والمنتھی الیه البركة“ کیونکہ روزہ کی ابتداء بھی بابرکت چیز سے ہوگی اور انتہاء بھی بابرکت چیز ہے۔
(مرقاۃ ج ۴ ص ۲۵۹)

مسئلہ : جب صبح صادق تک کھانے، پینے اور جماع کرنے کی اجازت دی گئی ہے تو اگر یقین ہو جائے کہ صبح صادق ہو چکی ہے تو روزہ رکھنے والے کے لئے اس وقت کھانا پینا حرام ہوگا۔ یہی حکم ظن غالب کا ہے یعنی جب غالب گمان ہو کہ صبح صادق ہو چکی ہوگی اس وقت کھانا، پینا اور جماع کرنا منع ہے اس وقت کھانے اور پینے سے روزہ نہیں ہوگا۔ اور اگر غالب گمان ہو کہ صبح نہیں ہوئی تو اس وقت کھانا اور پینا مباح ہے لیکن اگر غالب گمان تھا کہ صبح نہیں ہوئی کھا، پی لیا بعد میں صبح ہونے کا یقین ہو گیا کہ صبح ہو جانے پر میں نے کھانا کھالیا تھا تو اس روزہ کی قضاء لازم ہے۔ (ازکیر) یہی مطلب ہے اس حدیث کا:

”عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ ﷺ اذا سمع النداء احذکم والاناء فی یدہ فلا یضعہ حتی یقض حاجتہ منہ“

(رواہ ابو داؤد، مشکوٰۃ کاب الصوم)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب کوئی ایک تم سے نداء (اذان) سنے ایسے حال میں کہ برتن اس کے ہاتھ میں ہو تو برتن نہ رکھے یہاں تک کہ اس سے اپنی حاجت پوری کر لے۔

وضاحت حدیث : بظاہر مطلب یہ ہے کہ روزہ رکھنے والا شخص جب اذان سنے تو اس کے ہاتھ میں کھانے، پینے والا برتن ہو تو کھا، پی لے اسی وقت رکھ نہ دے لیکن یہ حکم مطلق نہیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے ”وہذا اذا علم او ظن عدم الطلوع“ یہ حکم اس وقت ہے جب یہ یقین ہو جائے یا غالب گمان ہو کہ صبح طلوع نہیں ہوئی۔ اس سے زیادہ واضح عبدالمالک رحمہ اللہ کا قول ہے وہ فرماتے ہیں:

”هذا اذا لم يعلم طلوع الصبح اما اذا علم انه قد طلع او شک فیہ فلا“

یہ حکم اس وقت ہے کہ جب صبح صادق کے طلوع ہونے کا یقین نہ ہو۔ لیکن جب یقین ہو جائے کہ صبح طلوع ہو چکی ہے یا شک واقع ہو رہا ہو صبح کے طلوع ہونے میں تو کھانا، پینا چھوڑ دینا لازم ہے۔

نبی کریم ﷺ کا دوسرا ارشاد گرامی اسی وضاحت کی تائید کر رہا ہے آپ فرماتے ہیں:

”ان بلا لا يؤذن بليل فكلوا واشربوا حتى يؤذن ابن ام مكتوم“

یشک بلال رات کو اذان کہتے ہیں اس وقت کھاؤ اور پیو یہاں تک کہ ابن ام مکتوم اذان کہیں۔
یعنی حضرت بلال رضی اللہ عنہ سحری کے وقت تہجد کی نماز کے لئے اذان کہتے تھے اس وقت روزہ رکھنے کی
غرض سے کھانا، پینا جائز تھا لیکن حضرت عبداللہ بن ام مکتوم صبح صادق کے وقت اذان کہتے تھے اس
وقت پہلے کلمہ کے ساتھ ہی کھانے اور پینے سے رک جانا لازم تھا۔

راقم کا موقف تو یہ ہے کہ آج کل گھڑیوں کا دور ہے صبح صادق کا وقت معین ہوتا ہے لیکن پھر بھی
احتیاط اسی میں ہے کہ معین وقت سے تین چار منٹ پہلے کھانے سے رک جائیں۔ راقم خود پانچ منٹ
پہلے ضرور کھانا، پینا چھوڑ دیتا ہے۔ یعنی اصل مسئلہ اذان کی ہونے یا نہ ہونے سے متعلق نہیں بلکہ ”ان
المعتبر اول طلوع الصبح عند جمهور العلماء“ جمہور علماء کے نزدیک صبح صادق کا طلوع

ہونا ہی معتبر ہے کہ اس وقت کھانا پینا چھوڑ دے۔ (ماخوذ از مرقاۃ ج ۳ ص ۲۵۲، ۲۵۵)

دینی طلباء کرام کی توجہ کے لئے:

﴿مِنَ الْفَجْرِ﴾ میں ”من“ بیان ہے اسلئے راقم نے اس کا معنی ”یعنی“ کیا ہے:

”ومن الفجر بيان للخيط الابيض كانه قيل الخيط الابيض الذي هو

الفجر“

یعنی آیہ کریمہ میں ﴿مِنَ الْفَجْرِ﴾ بیان ہے ”الخيط الابيض“ کا گویا کہ کہا گیا ہے کہ
کھاؤ اور پیو یہاں تک کہ ظاہر ہو جائے تمہارے لئے سفید دھاگہ، سفید دھاگہ وہ فجر ہے اس کو مختصر طور
پر یعنی فجر ہے سے راقم نے بیان کر دیا۔

”من“ بیان لانے کی ضرورت اسی لئے درپیش آئی کہ ذکر تشبیہ کا تھا لیکن بعض صحابہ کرام نے
حقیقی سمجھ کر دھاگے ہی مراد لے لئے تھے تو اسے واضح کر دیا گیا اب بظاہر وہم یہ ہے کہ ﴿مِنَ الْفَجْرِ﴾
تو صرف ﴿الْخِيطُ الْاَبْيَضُ﴾ کا بیان ہو سکتا ہے ﴿الْخِيطُ الْاَسْوَدُ﴾ کا نہیں ہو سکتا۔ تو چاہئے
تھا کہ ﴿الْخِيطُ الْاَسْوَدُ﴾ کا بیان ”مِنَ اللَّيْلِ“ سے آتا ایسا کیوں نہیں کیا گیا؟ اس کا جواب یہ

ہے کہ جب ایک لفظ کا بیان آ گیا تو اتنا واضح ہو گیا کہ سفید دھاگہ سے مراد حقیقی دھاگہ نہیں بلکہ تشبیہ کے طور پر مراد فجر ہے اسی سے خود واضح ہو گیا کہ سیاہ دھاگہ سے مراد رات ہے۔ (از شیخ زادہ)

ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى اللَّيْلِ : ”پھر تم پورا کرو روزوں کو رات تک“ ”بیان آخر وقت—
واخراج الليل عنه ونفى صوم الوصال“ (بیضادی) یعنی یہاں سے تین مسئلے ذکر کئے گئے ہیں
ایک یہ کہ روزہ کا آخری وقت رات کا آ جانا ہے۔ دوسرا یہ ثابت کیا گیا کہ رات خود روزے میں داخل
نہیں۔ یہ شان نزول سے واضح ہو چکا ہے۔ اور تیسرا مسئلہ یہ ثابت ہوا کہ صوم وصال منع ہے۔ تینوں
مسائل کو واضح طور پر انشاء اللہ بیان کیا جا رہا ہے۔

رات سے مراد کیا ہے: اس مسئلہ کو سمجھنے کے لئے ایک حدیث پاک اور اس کی شرح کی طرف توجہ فرمائیں:
☆ ”وعن عمر قال قال رسول الله ﷺ اذا قبل الليل من ههنا وادبر النهار من ههنا
وغربت الشمس فقد افطر الصائم“ (بخاری، مسلم مشکوٰۃ کتاب الصوم)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب یہاں سے رات آ جائے اور
یہاں سے دن پیٹھ پھیر جائے اور سورج غروب ہو جائے تو روزہ دار روزہ افطار کر لے۔

وضاحت حدیث: (اذا قبل الليل) ای ظلامہ (من ههنا) ای جانب
الشرق ”جب یہاں سے رات آ جائے کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے مشرقی جانب اشارہ کر کے فرمایا
کہ مشرقی جانب جب اندھیرا ہو جائے۔

(وادبر النهار) ای ضیاء (من ههنا) ای جانب الغرب“

پھر مغربی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ ادھر سے دن کی روشنی پیٹھ پھیر جائے (وغربت
الشمس) بفتح الراء ای غابت الشمس کلھا“ پھر اس کی اور وضاحت فرمائی کہ سورج مکمل
طور پر غروب ہو جائے۔ یعنی ایسا نہ ہو کہ سورج ابھی تک مکمل غروب ہی نہ ہو تو روزہ افطار کر کے تمام دن
کی محنت کو ضائع کر بیٹھو۔

رات کے دو وصف ذکر کر کے یہ واضح کیا:

”ان غرو بها عن العيون لا يكفى لانها قد تعيب ولا تكون غربت
حليقة فلا بد من البال الليل“

کہ صرف آنکھوں سے سورج کا چھپ جانا کافی نہیں کیونکہ کبھی حقیقتاً غروب نہیں ہوتا اس لئے ضروری ہے کہ رات متوجہ ہو اور دن پیٹھ پھیرے۔

(مرفاۃ ج ۲ ص ۲۵۲)

”والمیراد بالغروب زمان غیوبة جرم الشمس بحيث تظهر الظلمة فی جهة الشرق قال ﷺ اذا قبل اللیل من ههنا فقد افطر الصائم ای اذا وجدت الظلمة حسا فی جهة المشرق فقد ظهر وقت الفطر“

(نامی ج ۲ ص ۸۹)

روزہ صبح صادق سے لے کر غروب آفتاب تک ہے غروب سے مراد سورج کی ٹکیہ کا چھپ جانا ہے اس لحاظ پر کہ مشرقی جانب تاریکی ہو جائے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا جب رات ادھر سے چھا جائے تو روزہ دار روزہ افطار کر لے یعنی جب مشرقی جانب تاریکی محسوس ہونے لگے تو فطر کا وقت ظاہر ہوگا۔ رات روزہ کے حکم سے خارج ہے:

چونکہ آیت کریمہ میں ”الی اللیل“ غایۃ امتداد ہے غایۃ امتداد اپنے مغیا سے خارج ہوتی اس لئے روزہ رات کو نہیں رکھا جاتا بخلاف اس کے کہ وضو کے حکم میں کلائیوں کے دھونے کی غایۃ ”الی المرافق“ ذکر کی گئی اور پاؤں کے دھونے کی غایۃ ”الی الکعبین“ ذکر کی گئی لیکن ان دونوں مقاموں میں ”غایۃ اسقاط“ ہے جہاں غایۃ اسقاط ہو وہاں غایۃ اپنے مغیا میں داخل ہوتی ہے اس لئے وضو میں کہنیوں اور ٹخنوں کا دھونا فرض ہے۔ (اس بحث کا تعلق دینی طلباء کرام سے ہے)۔

روزہ جلدی افطار کرے:

”عن سهل قال قال رسول الله ﷺ لا يزال الناس بخير ما عجلوا الفطر“

(بخاری، مسلم، مشکوٰۃ کتاب الصوم)

حضرت سہل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ لوگ ہمیشہ بھلائی پر قائم رہیں گے جب تک وہ جلدی افطار کرتے رہیں گے۔ روزہ کے جلدی افطار کرنے کو کیوں پسند کیا گیا؟

”فان فی التعجیل مخالفة اهل الكتاب فانهم يؤخروه الی اشتباک النجوم“

جلدی افطار کرنے کو اس لئے مختار قرار دیا گیا کہ اس میں اہل کتاب کی مخالفت پائی گئی کیونکہ وہ

ستاروں کے خلط ملط ہونے تک افطار میں تاخیر کرتے تھے ”ثم صار عادة لاهل البدعة في ملتنا“ پھر ہماری ملت میں اہل بدعت نے اپنی عادت یہ بنالی کہ وہ روزہ دیر سے افطار کرتے ہیں۔

بعض حضرات نے یہ کہا تھا کہ اگر روزہ اس لئے دیر سے افطار کرے کہ وہ اپنے نفس پر تنگی کر رہا ہے روزہ افطار کرنے میں تاخیر کے واجب ہونے کا عقیدہ نہیں رکھتا تو اس میں کوئی حرج نہیں، کوئی ضرر نہیں لیکن ملا علی قاری رحمہ اللہ اسے رد کرتے ہیں ”اقول بل يضره حيث يفوته السنة“ فرماتے ہیں کہ میں کہتا ہوں اس میں سنت کی ترک کی وجہ سے ضرر (نقصان) لازم آتا ہے مزید آپ بیان فرماتے ہیں:

”ان في التعجيل اظهار العجز المناسب للعبودية ومبادرة الى قبول الرخصة“

کہ روزہ جلدی افطار کرنے میں اظہار و عجز پایا جائے گا کیونکہ اس میں اپنی عبودیت کا اقرار پایا جاتا ہے اور رخصت کی قبولیت کی طرف جلدی پائی جاتی ہے ”ويؤيده ما صح ان الصحابة كانوا اعجل الناس افطارا وابطاهم سحورا“ اور اس کو صحابہ کرام کے عمل سے تائید ملتی ہے کہ وہ جلدی افطار کرتے تھے اور سحری میں تاخیر کرتے تھے۔ (ازمقة ج ۳ ص ۲۵۲)۔ بعض حضرات کا قول یہ ہے کہ رات کا چھ حصہ گزر جائے تا کہ دن کا گزرنا یقینی ہو جائے تو پھر روزہ افطار کیا جائے۔ اس کے متعلق علامہ بدالدرین ابو محمد محمود بن احمد عینی رحمہ اللہ لکھتے ہیں ”ولا يجب امساك جزء من الليل لتحقيق مضي النهار“ رات کے کچھ حصہ میں افطار سے رکنا کوئی واجب نہیں کہ دن کا گزرنا یقینی طور پر ثابت ہو جائے۔

(عمدة القاری ج ۱ ص ۶۵)

☆ ”عن ابي هريرة قال قال رسول الله ﷺ قال الله تعالى احب عبادي الى اعجلهم فطرا“ (رواه الترمذی . مشکوة كتاب الصوم)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرے بندوں میں سے وہ مجھے پسند ہیں جو جلدی افطار کرتے ہیں۔

وضاحت حدیث:

”وقال الطيبي ولعل السبب في هذه المحبة المتابعة للسنة“

والمباعدة عن البدعة والمخالفة لاهل الكتاب

علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جلدی افطار کرنے والوں کو اللہ اس لئے پسند کرتا ہے کہ وہ سنت کی تابعداری کرتے ہیں اور بدعت سے دور رہتے ہیں اور اہل کتاب کی مخالفت کرتے ہیں۔ اور اس امت کی افضلیت ثابت ہوئی کہ وہ حدیث پاک کی متابعت کرنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے محبوب بن جاتے ہیں اور اس آیت کریمہ کا مصداق بن جاتے ہیں:

﴿قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ﴾

”اے محبوب تم فرما دو کہ لوگو! اگر تم اللہ کو دوست رکھتے ہو تو میرے فرمانبردار ہو جاؤ اللہ تمہیں دوست رکھے گا۔“

(مرفاۃ ج ۲ ص ۲۵۵)

☆ ”عن ابی عطیة قال دخلت انا ومسروق علی عائشة فقلنا یا ام المؤمنین رجلا من اصحاب محمد ﷺ احدهما یعجل الافطار ویعجل الصلوة والآخر یؤخر الافطار ویؤخر الصلوة قالت ایہما یعجل الافطار ویعجل الصلوة فقلنا عبد اللہ بن مسعود قالت ہکذا صنع رسول اللہ ﷺ والآخر ابو موسی“ (رواہ مسلم، مشکوٰۃ کتاب الصوم)

حضرت ابو عطیہ کہتے ہیں میں اور مسروق (دونوں تابعی ہیں) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس حاضر ہوئے اور ہم نے کہا اے ام المؤمنین (مومنوں کی ماں) نبی کریم ﷺ کے دو صحابیوں میں سے ایک جلدی افطار کرتے ہیں اور جلدی (مغرب کی) نماز ادا کرتے ہیں اور دوسرے دیر سے افطار کرتے ہیں اور دیر سے نماز ادا کرتے ہیں آپ نے فرمایا ان دونوں میں سے کون جلدی افطار کرتے ہیں اور جلدی نماز ادا کرتے ہیں تو ہم نے کہا وہ عبد اللہ بن مسعود ہیں آپ نے فرمایا اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے کیا ہے (یعنی وہ بھی جلدی کرتے تھے) اور دوسرے صحابی (جو دیر کرتے تھے وہ) ابو موسیٰ اشعری ہیں۔

وضاحت حدیث: ”قال الطیبی الاول عمل بالعزیمۃ والسنة والثانی بالرخصة“

علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا عمل عزیمت (عمل میں فوقیت)

پر تھا اور حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کا عمل رخصت پر تھا۔ ملا علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”والاحسن ان یحمل عمل ابن مسعود علی السنة وعمل ابی موسیٰ علی

بیان الجواز کما سبق من عمل عمرو عثمان رضی اللہ عنہم اجمعین

بہتر یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا عمل سنت کے مطابق تھا اور حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کا عمل بیان جواز پر تھا۔ جیسا کہ حضرت عثمان اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کا بھی دیر سے افطار کرنا بیان جواز کے لئے تھا۔ اگرچہ بعض حضرات نے یہ کہا تھا کہ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی تاخیر کی وجہ عذر ہو کہ آپ تک یہ بات نہ پہنچی ہو کہ نبی کریم ﷺ جلدی افطار کرتے تھے۔ لیکن اس قول کو علامہ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے رد کیا ہے کہ یہ درست نہیں۔ (مرقاۃ ج ۴ ص ۲۵۹) ☆
”عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ ﷺ لا یزال الدین ظاہرا ما عجل الناس الفطر لان اليهود والنصارى یؤخرون“ (رواہ ابو داؤد وابن ماجہ، مشکوٰۃ کتاب الصوم)
حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دین ہمیشہ ظاہر رہے گا جب تک لوگ جلدی افطار کرتے رہے کیونکہ یہود و نصاریٰ روزہ دیر سے افطار کرتے تھے۔

وضاحت حدیث: (ظاہرا) ای غالباً و عالیاً او واضحاً و لائحاً

دین ہمیشہ ظاہر رہے گا ظاہر کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دین ہمیشہ غالب رہے گا اور دین ہمیشہ بلند رہے گا۔ اور یہ معنی بھی مراد لیا جاسکتا ہے کہ دین ہمیشہ ظاہر، واضح اور روشن رہے گا جب تک لوگ جلدی افطار کرتے رہے کیونکہ یہود و نصاریٰ دیر سے افطار کرتے ہیں۔ اسی سے یہ واضح ہوا:

”ان قواما الدین الحنیفی علی مخالفة الاعداء من اهل الكتاب وان موافقتهم تلفا للدين“

کہ بیشک دین حنیف کا قیام دشمن اہل کتاب کی مخالفت پر ہے اور یہود و نصاریٰ کی موافقت پر دین کو ضائع کرنا لازم آئے گا۔

راقم کا موقف:

راقم خود تو اگرچہ روزہ افطار کرنے میں تعجیل کا قائل ہے لیکن محققین اہل سنت و جماعت جو تاخیر کے قائل ہیں ان پر زبان طعن دراز کرنے کو بھی حماقت سمجھتا ہے۔ جب صحابہ کرام میں سے حضرت ابوموسیٰ اشعری، حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم بھی تاخیر پر عمل کرتے تھے بلکہ ایک روایت میں

حضرت عثمان اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کا نماز کے بعد بھی روزہ افطار کرنا ثابت ہے۔

(طحاوی ج اول باب مواقت الصلوة ص ۱۰۷)

تو تحقیق کے اختلاف کو تحقیق پر مبنی ہی قرار دیا جائے۔

جب میں شیخ الاسلام خواجہ قمر الدین سیالوی، استاذ استاذی المکرم حضرت مولانا حافظ عطاء محمد بند یالوی اور مفکر اسلام اور مفسر قرآن حضرت پیر محمد کرم شاہ رحمہم اللہ جیسی ہستیوں کو تاخیر کا قائل دیکھتا ہوں تو سمجھتا ہوں کہ یہ اختلاف رحمت ہے اور صحابہ کرام کے مختلف اعمال کے مطابق ہی یہ اختلاف بھی ہے۔

پیر صاحب فرماتے ہیں ”پہلے روزہ کی ابتداء کا وقت بتایا اب اس کے اختتام کا وقت بتایا جا رہا ہے صبح صادق سے لے کر رات کے آنے تک روزہ رکھو۔ حضور ﷺ نے اپنے ارشاد سے وضاحت فرما دی ”اذا ادبر النهار من ههنا وا قبل الليل من ههنا“ جب ادھر (مغرب) سے دن پیٹھ پھیر دے اور ادھر (مشرق) سے رات آ جائے وہ وقت ہے افطار کا۔ بعض لوگ روزے کے افطار میں اتنی جلدی کرنے لگے ہیں کہ سورج بھی صحیح طور پر غروب نہیں ہوتا کہ وہ افطار کا نقارہ بجا دیتے ہیں۔

(ضیاء القرآن)

راقم ایک سال سلا نوالی ضلع سرگودھا میں بھی استاذی المکرم حضرت ابو الحسنات محمد اشرف سیالوی مدظلہ العالی سے پڑھتا رہا وہاں رمضان میں رہنے والے طلباء نے بتایا کہ ایک دن روزہ جلدی افطار کرانے والوں نے افطار کر دیا جب کہ ابھی سورج مکمل غروب نہیں ہوا تھا۔ راقم نے بھی تین سال پہلے رمضان میں پولی کلینک اسلام آباد سے واپس آتے ہوئے صدر روڈ پر یہی کیفیت دیکھی کہ ایک مسجد سے اذان کی آواز آرہی ہے جب کہ سورج کا ایک کنارہ غروب ہونے سے رہتا ہے خدا را اتنا ظلم عظیم بھی نہ کیا جائے۔

خیال رہے کہ راقم کا خاندان کئی پشتوں سے علمی چلا آ رہا ہے راقم کے پردادا قاضی غلام نبی رحمہ اللہ کے دو بیٹے تھے قاضی فیض احمد اور قاضی رسول احمد رحمہما اللہ ان کا زمانہ تو راقم نے نہ پایا البتہ قاضی فیض احمد صاحب کے دو بیٹے قاضی عبدالعزیز رحمہ اللہ (راقم کے والد) اور قاضی غلام ربانی رحمہ اللہ اور قاضی رسول احمد رحمہ اللہ کے دو بیٹے قاضی عبدالواحد اور قاضی عبدالحق رحمہما اللہ کا زمانہ پایا۔ تمام ہی

فقہی مسائل میں بہت زیادہ سمجھ رکھتے تھے۔ ان چار بھائیوں میں تین سوائے قاضی عبد الخالق رحمہ اللہ کے سب ہی تاخیر کے قائل تھے۔ بلکہ قاضی عبد الواحد رحمہ اللہ نے یہی حدیث جو ابھی ضیاء القرآن کے حوالہ سے پیش کی بیان کرنے کے بعد فرمایا کہ بزرگ (قاضی رسول احمد صاحب) بھی اسی کے قائل تھے، تاہم راقم گاؤں میں تین سال امام رہا ایک مرتبہ چچا صاحب، قاضی عبد الخالق رحمہ اللہ نے میرے تاخیر سے روزہ افطار کرانے پر ناراضگی کا اظہار فرمایا جب میں نے عرض کیا کہ چچا عبد الواحد صاحب نے تو مجھے مسئلہ اس طرح بتایا اور ساتھ یہ بھی بتایا کہ والد رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل تھے تو آپ نے اپنی عادت شریفہ کے مطابق بڑے پیار و محبت سے فرمایا بچے جی تحقیق کا اختلاف رحمت ہے۔ اسی وقت سے راقم کا موقف بدل گیا پھر کچھ خود بھی کتابوں کو دیکھنے کی صلاحیت حاصل ہو گئی۔ تاہم بزرگوں کے خلاف لب کشائی کا قائل نہیں۔

صوم وصال کی ممانعت:

”وعن ابی ہریرۃ قال نہی رسول اللہ ﷺ عن الوصال فی الصوم
فقال له رجل انک توصل یا رسول اللہ قال وایکم انی ابیت یطعمنی
ربی ویسقینی“ (بخاری، مسلم، مشکوٰۃ کتاب الصوم)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ نے صوم وصال سے منع فرمایا تو ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ بیشک آپ خود تو صوم وصال رکھتے ہیں آپ نے فرمایا تم میں سے میری مثل کون ہو سکتا ہے۔ بیشک میں رات (اپنے رب کے ہاں) گزارتا ہوں میرا رب مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے۔

وضاحت حدیث: صوم وصال کیا ہیں؟ ”تتابع الصوم من غیر افطار باللیل“
صوم وصال یہ ہیں کہ روزہ رکھا جائے اور افطار کے وقت روزہ افطار نہ کیا بلکہ بغیر افطار کرنے کے دن کے روزہ کے ساتھ رات کا روزہ بھی پایا جائے صوم وصال کے منع کرنے میں حکمت یہ تھی کہ اس طرح روزہ رکھنے سے ضعف پیدا ہوگا ملال ہوگا عبادت کی ادائیگی میں کوتاہی واقع ہوگی اور یہ بھی خیال رہے کہ مختار مذہب یہ ہے کہ صوم وصال سے نہی تحریم پر مبنی ہے۔

ایک صحابی نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ آپ خود تو صوم وصال رکھتے ہیں۔ صحابی کا یہ کہنا تعجب کی وجہ سے تھا کہ اس میں حکمت کیا ہے کہ آپ خود تو صوم وصال رکھتے ہیں اور ہمیں منع کرتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ کا جواب کیا ہی حکیمانہ تھا ”ایکم مثلی“ تم میں سے میری مثل کون ہو سکتا ہے۔ یعنی میں صوم وصال رکھوں تو میری طاقت میں کوئی کمی نہیں ہو سکتی مجھے ایسا ضعف لاحق نہیں ہو سکتا جو عبادت سے روکنے کا ذریعہ بنے پھر اسی کی وضاحت ان الفاظ سے فرمادی ”ان ابیت بطعمنی ربی و بسقینی“ بیشک میں رات گزارتا ہوں میرا رب مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے۔

بعض حضرات نے کھلانے اور پلانے سے مراد جنت کے کھانے اور مشروبات لئے ہیں لیکن مولنا عبدالحلیم رحمہ اللہ نے قمر الاقمار حاشیہ نور الانوار میں اسے رد کیا ہے اور ملا علی قاری رحمہ اللہ بھی بیان فرماتے ہیں ”وان الوصال مع تناول الطعام والشراب من المحال“ بیشک کھانے اور پینے کے ساتھ ساتھ صوم وصال کا پایا جانا محال ہے صوم وصال تو وہی ہو سکتے ہیں کہ افطار کے وقت نہ کھایا جائے اور نہ پیا جائے۔ پھر اس کھلانے اور پلانے سے کیا مراد ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کے انوار کی تجلیات کا مشاہدہ کرتا ہوں تو مجھے کھانے اور پینے کی حاجت ہی نہیں رہتی۔

ایک اور طویل حدیث حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جس میں یہ الفاظ آتے ہیں:

”فاخذ یو اصل رسول اللہ ﷺ وذلك فی آخر الشهر فاخذ رجال من اصحابه واصلون فقال النبی ﷺ ما بال رجال واصلون انکم لستم مثلی اما والله لو تماد بی الشهر لو اصلت وصالا یدع المتعمقون بتعمقهم“

کہ نبی کریم ﷺ نے رمضان کے آخر میں صوم وصال شروع کئے تو صحابہ کرام نے بھی صوم وصال شروع کئے تو حضور ﷺ نے فرمایا لوگوں کا کیا حال ہے کہ وہ صوم وصال رکھتے ہیں بیشک تم میری مثل نہیں ہو سکتے۔ خبردار قسم ہے اللہ تعالیٰ کی میں ایک مہینہ بھی صوم وصال رکھنا چاہوں تو رکھ سکتا ہوں بڑی گہرائی میں ڈوب کر عبادت کرنے والے گہرائی میں ڈوبنا چھوڑ دیں (یعنی انہیں اس کی طاقت ہی

حاصل نہیں ہوگی)۔

یہ بھی خیال رہے کہ صحابہ کرام کے صوم وصال کی وجہ سے ضعف کو دیکھ کر نبی کریم ﷺ نے منع فرمایا: ”ان النبی ﷺ واصل باصحابہ یومین حین ابوا ان ینتھوا“ بیشک نبی کریم ﷺ نے اپنے صحابہ کرام کے صوم وصال پر خاموشی رکھی یعنی ان کو ابتدائی طور پر اجازت دے رکھی لیکن وہ دوسرے دن ہی نڈھال ہو گئے دوسرے دن روزہ کو مکمل کرنے کی طاقت نہیں رہی۔

(از عمدة القاری ج ۱ ص ۷۲)

اعتراض: اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ روزہ رات میں افطار کیا جائے تو جس جگہ کئی کئی ماہ کا دن ہوتا ہے وہاں روزہ کی کیا صورت ہوگی؟

جواب: اس کے چند جواب ہیں ایک یہ کہ ایسی جگہ آبادی ہی نہیں کیونکہ وہاں سردی سخت ہے دوسرا جواب اگر وہاں آبادی بھی ہو تو وہاں کے باشندے ماہ رمضان پائیں گے ہی نہیں لہذا ان پر روزہ واجب ہی نہیں۔ جیسے کہ بہت سے علماء کرام نے فتویٰ دیا ہے کہ جس زمانہ میں بلغاریا لندن میں عشاء کا وقت آتا ہی نہ ہو یعنی شفق غائب ہی نہ ہوتا ہو ان پر نماز عشاء واجب ہی نہیں کیونکہ انہوں نے وقت ہی نہیں پایا۔ یا جیسے کہ جس شخص کے ہاتھ و پاؤں نہ ہوں اس پر وضو کے فرض فقط دو ہیں منہ دھونا اور سر کا مسح کیونکہ اس کے پاس باقی فرضوں کا مکمل ہی نہیں۔ (شامی کتاب الصلوٰۃ)

راقم کہتا ہے یہ اس وقت ہے جب کٹے ہوئے ہاتھوں سے منہ دھو سکے اور سر کا مسح کر سکے اگر ایسا نہ کر سکے تو اس سے وضو مکمل ساقط ہو جائے گا کیونکہ وضو میں غیر سے امداد طلب کرنی امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک واجب نہیں)۔ رب فرماتا ہے:

﴿فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ﴾ ”جو رمضان پائے وہ روزہ رکھے“۔

انہوں نے رمضان پایا ہی نہیں لہذا روزہ واجب نہیں۔

تیسرا جواب ایسے لوگوں پر روزہ کا فدیہ واجب ہے اور ان پر یہ آیت صادق ہے ﴿وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ﴾ یہ جواب اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان رحمہ اللہ نے دیا ہے اور یہ ہی قوی ہے۔

اعتراض: جب ماہ رمضان روزہ کا سبب ہے اور وہ انہیں نہ ملا تو ان پر فدیہ کیونکر واجب ہوا فدیہ تو روزہ کا عوض ہے۔

جواب: حدیث شریف میں ہے کہ دجال کے ظہور کا پہلا دن ایک سال کا ہوگا دوسرا ایک ماہ کا صحابہ کرام نے پوچھا کہ اس دن میں نمازوں کا کیا حکم ہے؟ آپ نے فرمایا حساب لگا کر پڑھنا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز کے لئے اس دن حکمی وقت معتبر ہے اور چونکہ وہ دن ایک سال کا ہے لہذا روزے بھی ضرور رکھیں جائیں گے کیونکہ روزہ بھی نماز کی طرح فرض ہے۔ (نبی)

راقم کے نزدیک نمازیں اوقات کا حساب کر کے پڑھی جائیں روزہ کی ابتداء اور انتہاء کا وقت محسوس ہو خواہ بہت قلیل ہی کیوں نہ ہو تو روزہ رکھے ورنہ فدیہ دے۔

وَلَا تُبَاشِرُوهُنَّ وَأَنْتُمْ عَاكِفُونَ فِي الْمَسَاجِدِ : ”اور ہاتھ نہ لگاؤ ان (عورتوں) کو ایسے حال میں کہ جب تم اعتکاف میں ہو مساجد میں“۔ آئیے سب سے پہلے راقم کی تسکین الجنان فی محاسن کنز الایمان کا ایک ورق دیکھئے۔

فَالآنَ بَاشِرُوهُنَّ :

- ☆ ”پھر ملو اپنی عورتوں سے“ (محمود الحسن صاحب)
- ☆ ”اب تم اپنی بیویوں کے ساتھ شب باشی کرو“۔ (مودودی صاحب)
- ☆ ”سوا ب تم ان سے ملو ملاؤ“ (عبدالماجد صاحب)
- ☆ ”اب (تم کو اختیار ہے کہ) ان سے مباشرت کرو“۔ (فتح محمد صاحب)
- ☆ ”پس اب ملا کرو ان سے“ (شارہ رفیع الدین صاحب)
- ☆ ”تو اب ان سے صحبت کرو“۔ (مولانا احمد رضا خان رحمہ اللہ)

وَلَا تُبَاشِرُوهُنَّ :

- ☆ ”اور نہ ملو عورتوں سے“ (محمود الحسن صاحب)
- ☆ ”تو بیویوں سے مباشرت نہ کرو“ (مودودی صاحب)
- ☆ ”بیویوں سے صحبت نہ کرو“ (عبدالماجد صاحب)

(فتح محمد صاحب)

☆ ”ان سے مباشرت نہ کرو“

(شاہ رفیع الدین صاحب)

☆ ”اور مت ملو ان سے“

(مولانا احمد رضا خان رحمہ اللہ)

☆ ”اور عورتوں کو ہاتھ نہ لگاؤ“

یہاں اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان رحمہ اللہ کے ترجمہ اور دوسروں میں فرق سمجھنے کیلئے ایک تو یہ خیال کیا جائے کہ ”عورتوں سے ملو“ یا ان سے صحبت کرو یا ان سے شب باشی کرو، ایک ہی معنی میں استعمال ہوئے ہیں یعنی جماع کرنا اور ”نہ ملو عورتوں سے یا ان سے مباشرت نہ کرو“ یہ اسی پہلے معنی کی نفی ہے یعنی جماع نہ کرو۔ لیکن اعلیٰ حضرت کے ترجمہ ”صحبت کرو“ پر نفی نہیں کہ ترجمہ یہ ہوتا ”ان سے صحبت نہ کرو“ لیکن آپ نے ترجمہ کیا ہے ”اور عورتوں کو ہاتھ نہ لگاؤ“ وجہ فرق کیا ہے اس مسئلہ کو سمجھنے سے پہلے یہ سمجھا جائے کہ ﴿بَاشِرُوْهُنَّ﴾ میں امر کا تعلق رمضان کی راتوں سے ہے اور ﴿وَلَا تَبَاشِرُوْهُنَّ﴾ کی نفی کا تعلق اعتکاف سے ہے ﴿بَاشِرُوْهُنَّ﴾ کا ترجمہ سمجھنے سے پہلے اصل وجہ نزول کو ذہن میں رکھیں:

”عن ابن عباس كانوا على عهد رسول الله ﷺ اذا صلوا العشاء حرم عليهم

الطعام والشراب والنساء وفي البخاري عن البراء كون المنع مقيدا بالنوم

قال الحافظ يحتمل ان يكون التقيد بالحقيقة انما هو بالنوم وذكر صلوة

لكون ما بعدها مظنة النوم غالبا“ (حاشیہ جلالین بحوالہ کمالین)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کہ نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں عشاء کی نماز ادا کرنے کے بعد کھانا، پینا جماع کرنا منع تھا بخاری شریف میں حضرت براء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ یہ حکم سونے کے بعد تھا۔ ان دونوں حدیثوں میں محاکمہ اس طرح کیا گیا ہے کہ حکم حقیقۃً نیند سے ہی مقید تھا لیکن چونکہ بعد از نماز عشاء عام طور پر سویا جاتا ہے لہذا ایک جگہ نماز عشاء کا ذکر ہے اور دوسری جگہ نیند کا۔

لیکن یہ حکم کئی صحابہ کرام کی معذوریات پر منسوخ کر دیا گیا اور جماع کو یا کھانے پینے کی کورات میں جائز کر دیا گیا۔ لیکن رمضان کے دن میں شہوت سے ہاتھ لگانا اور بوس و کنار منع نہیں جب کہ انسان کو اپنے آپ پر اعتماد ہو کہ انزال نہیں ہوگا یا وہ بے صبری سے کام لے کر غلطی نہ کر دے یعنی جماع نہ کر دے۔

لیکن اعتکاف کی حالت میں جس طرح صحبت کرنا منع ہے اسی طرح اس کے دواعی (ہاتھ لگانا

شہوت سے اور بوس و کنار) بھی منع ہیں اب اس مسئلہ کی حقیقت جاننے کے بعد تراجم کی طرف توجہ کریں یہ مسئلہ صرف اعلیٰ حضرت کے ترجمہ سے واضح ہوگا کہ رمضان شریف میں جماع کی قید کواٹھایا گیا ہے لیکن اعتکاف کی حالت میں جماع سے اور اس کے اسباب سے بھی ممانعت ہے ہدایت کتاب الصوم میں دیکھیں:

”ولا بأس بالقلبة اذا امن على نفسه اى الجماع والانزال ويكره اذا لم يامن“

روزے کی حالت میں جماع یا انزال کی فکر نہ ہو تو بوسہ لینے میں کوئی حرج نہیں لیکن اگر یہ خطرہ ہو تو مکروہ ہے ہاں یہ بھی خیال رہے کہ انزال ہو جائے تو روزہ ٹوٹ جائے گا البتہ کفارہ نہیں ہوگا اور اگر جماع کر لیا تو روزہ ٹوٹ گیا قضاء بھی لازم ہوگی اور کفارہ بھی۔

لیکن اعتکاف میں کیا حکم ہے؟ دیکھئے ہدایت باب الاعتکاف:

”وبحرم على المعتكف الوطى لقوله تعالى ولا تبشروهن وانتم عاكفون فى المساجد وكذا اللمس والقلبة لانه دواعيه فيحرم عليه اذ هو محظوره كما فى الاحرام بخلاف الصوم لان الكف ركنه لا محظوره فلم يتعد الى دواعيه“

حالت اعتکاف میں وطی حرام ہے اور اسی طرح بوسہ لینا اور چھونا بھی منع ہے جس طرح احرام میں منع ہیں لیکن یہ حکم روزے کا نہیں کیونکہ وہاں صرف جماع سے رکنارکن صوم ہے بوسہ لینے اور مس کرنے سے رکناروزے کا رکن نہیں۔ یہ فرق واضح کرنے کے لئے اعلیٰ حضرت کا ترجمہ موزوں ترین ہے ارباب نظر خدا را انصاف کریں اسی فقہی فرق پر کون سا ترجمہ دال ہے اور کون سے کوسوں دور ہیں۔ اسی پر شیخ زادہ کی عبارت بھی شاہد ہے:

”واما اذا لمسه بشهوة او قبلها او باشر فيما دون الفرج فهو حرام على المعتكف“

شہوت کے ساتھ عورت کو چھونا اور بوسہ لینا تفخیذ و تبطین سب ہی اعتکاف والے پر حرام ہیں۔

(تسکین الجنان ص ۱۰۰۵۹)

اعتکاف کے مسائل و فضائل: اعتکاف کا لفظ عکف بمعکف (بکسر الکاف و ضمها) سے لیا ہوا ہے۔ لغوی معنی یہ ہے ”کسی چیز پر رک جانا، اور سانس کو روکنا اور اصطلاح شرع میں مسجد میں رکنا اور عورتوں کا اپنے گھر میں نماز کی جگہ رکنا۔ اعتکاف کی تین قسمیں ہیں: واجب، مستحب، سنت۔

اعتکاف واجب: اس وقت ہوتا ہے جب کہ انسان نذر مانے کہ میں اتنے دنوں کا اعتکاف کروں گا۔ اتنے دن اور اتنی ہی راتیں اعتکاف واجب ہو جائے گا۔ اور ہر دن روزہ رکھنا بھی ضروری ہوگا۔

اعتکاف مستحب: بہتر تو یہ ہے کہ بغیر کسی نذر کے کم از کم ایک دن ایک رات کا اعتکاف ہو روزہ بھی رکھے زیادہ جتنے دن چاہے اعتکاف کرے اور روزہ بھی رکھے۔ تاہم مسجد میں جتنی دیر رہے اتنی دیر کی نیت اعتکاف کی کر لے تو یہ بھی اعتکاف مستحب ہوگا:

”وقال محمد من اصحابنا في اعتكاف النفل فينبغي اذا دخل المسجد ان يقول نويت الاعتكاف ما دمت في المسجد“

اور امام محمد رحمہ اللہ نے نفلی اعتکاف کے متعلق ارشاد فرمایا کہ لائق یہ ہے کہ جب کوئی شخص مسجد میں داخل ہو تو یہ کہے ”میں اعتکاف کی نیت کرتا ہوں جب تک مسجد میں رہوں“ بلکہ زیادہ بہتر یہی ہے کہ مسجد میں نماز کی انتظار میں بیٹھنے والا شخص، یاد دنیاوی اور اخروی کام کے لئے مسجد میں ہے تو اعتکاف کی نیت کر لے ”فاذا خرج ثم دخل يحدد النية“ جب مسجد سے نکلے پھر مسجد میں داخل ہو تو اعتکاف کی نیت دوبارہ از سر نو کر لے۔

اعتکاف سنت: رمضان شریف کے آخری دس دن اعتکاف سنت مؤکدہ کفایہ ہے یعنی جو شخص اعتکاف کریگا ثواب تو اسے ہی حاصل ہوگا دوسرے کو ثواب تو حاصل نہیں تاہم کسی ایک کے اعتکاف سے دوسروں پر سنت مؤکدہ کے ترک کی وجہ سے جو ملامت لازم ہوتی تھی وہ نہیں ہوگی۔ (ماخوذ از مرقاۃ ج ۲ ص ۳۲۵)

یہ بھی خیال رہے کہ شہر میں کوئی ایک مرد یا عورت اعتکاف کر لے تو تمام شہر والوں پر ترک سنت کا بوجھ لازم نہیں رہے گا فقہاء کرام کی صحیح تحقیق یہی ہے ہر مسجد میں یا ہر محلہ میں اگر کوئی معتکف نہ ہو تو دوسروں پر بوجھ ہوگا یہ قول معتبر نہیں۔ نبی کریم ﷺ کے وصال کے بعد صحابہ کرام کو جنگوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کی تیاری وغیرہ کی وجہ سے مرد حضرات اعتکاف نہ کر سکے صرف ازواج مطہرات کے اعتکاف پر

اکتفا کر لیا گیا۔

مسئلہ : اعتکاف ایسی مسجد میں کیا جائے جس میں پانچ نمازیں جماعت سے ادا کی جاتی ہوں کیونکہ جماعت سے نماز ادا کرنا واجب ہے لیکن اعتکاف سنت ہے ایسا درست نہیں کہ سنت پر عمل کرنے کی وجہ سے واجب کی ترک لازم آجائے۔

مسئلہ : عورت کا مسجد میں اعتکاف مکروہ ہے عورت اپنے گھر میں جو مقام نماز ادا کرنے کے لئے اس نے مختص کیا ہوا ہے اسی میں اعتکاف کرے۔

”عن عائشة ان النبی ﷺ کان یعتکف العشر الاواخر من رمضان حتی توفاه الله ثم اعتکف ازواجه من بعده“ (بخاری ومسلم، مشکوٰۃ باب الاعتکاف)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں بیشک نبی کریم ﷺ رمضان کے آخری دس دنوں کا اعتکاف کرتے تھے یہاں تک کہ آپ کا اللہ تعالیٰ نے وصال فرمایا پھر آپ کے بعد آپ کی ازواج (بیویوں) نے اعتکاف کیا:

”ثم اعتکف ازواجه ای فی بیوتہن لعدم رضائہ علیہ الصلوٰۃ والسلام لفعلہن ولذا قال الفقہاء یستحب للنساء ان یعتکفن فی مکانہن (من بعده) ای من بعد موتہ احياء لسنۃ و ابقاء لطریقۃ“

نبی کریم ﷺ کی ازواج نے اپنے گھروں میں اعتکاف کیا کیونکہ نبی کریم ﷺ نے اپنی ظاہری حیات میں ان کے مسجد میں اعتکاف کو ناپسند فرمایا تھا۔ نبی کریم ﷺ کی ازواج مطہرات نے آپ کے بعد اعتکاف کیا تا کہ آپ کی سنت زندہ رہے اور آپ کا طریقہ باقی رہے۔ نبی کریم ﷺ نے ازواج مطہرات کے مسجد میں اعتکاف کو ناپسند فرمایا اس پر حدیث پاک کو دیکھیں:

”عن عائشة قالت کان النبی ﷺ اذا اراد ان یعتکف صلی الصبح ثم دخل المکان الذی یرید ان یعتکف فیہ فاراد ان یعتکف العشر الاواخر من رمضان فامر فضرب لہ خباء فامرت عائشة بخباء فاضرب لہا وامرت حفصة بخباء فضرب لہا فلما رأت زینب خباء ہما امرت بخباء فضرب لہا فلما رأی ذلک رسول الله ﷺ قال البر تردن فلم یعتکف فی رمضان واعتکف عشرًا من شوال“ (ابن ماجہ باب الاعتکاف)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں نبی کریم ﷺ جب اعتکاف کرنے کا ارادہ فرماتے صبح نماز ادا کرتے پھر اس جگہ داخل ہوتے جہاں اعتکاف کا ارادہ کرتے آپ نے رمضان کے آخری دس دنوں کے اعتکاف کا ارادہ فرمایا تو آپ نے حکم فرمایا آپ کے لئے خیمہ لگا دیا گیا (یعنی اعتکاف کے لئے چادریں تان دی گئیں) پھر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حکم دیا ان کے لئے خیمہ لگا دیا گیا۔ پھر حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے حکم دیا ان کے لئے خیمہ لگا دیا گیا۔ پھر حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے ان دونوں کے خیموں کو دیکھا تو انہوں نے حکم دیا ان کے لئے خیمہ لگا دیا گیا۔ جب رسول اللہ ﷺ نے اسے دیکھا تو آپ نے فرمایا کیا نیکی صرف یہی ہے جو تم ارادہ رکھتی ہو۔ آپ نے اس رمضان میں اعتکاف نہ کیا بلکہ شوال میں دس دن اعتکاف کیا۔

وضاحت حدیث: اس حدیث پاک سے یہ واضح ہوا کہ نبی کریم ﷺ نے عورتوں کا مسجد میں اعتکاف بیٹھنا ناپسند فرمایا۔ اور واضح ہو گیا کہ اگرچہ ضروری تو صرف اعتکاف کی حالت میں مسجد میں رہنا ہے چادریں تاننا فرض یا واجب تو نہیں لیکن مسنون ہے کہ اس سے یکسوئی حاصل ہوتی ہے عام آدمی پاس بیٹھ کر باتیں نہیں کرتے۔

نبی کریم ﷺ اپنے اعتکاف کے مقام پر صبح ہی تشریف لے جاتے حالانکہ مغرب سے پہلے اعتکاف کی جگہ پر پہنچ جانا ضروری ہے تو اس کی وجہ یا آپ کی تخصیص تھی کہ آپ وقت سے زیادہ اعتکاف فرمالیتے تھے کیونکہ کمی درست نہیں لیکن زیادتی میں کوئی حرج نہیں۔

لیکن راقم کے نزدیک یہ کوئی ثابت نہیں کہ آپ اعتکاف کی جگہ صبح تشریف لے جاتے تھے پھر وہیں آخری رمضان تک قیام فرماتے ممکن ہے صبح اعتکاف کی جگہ کا جائزہ لیتے ہوں اور پھر مغرب سے پہلے آ کر بیٹھ جاتے ہوں (واللہ اعلم بالصواب)۔

مسئلہ: اعتکاف بیٹھنے والا مرد ہو یا عورت ان کیلئے ضروری ہے کہ وہ مسلمان ہوں عاقل ہوں

(پاگل نہ ہوں) اور جنابت سے پاک ہوں اور عورت کیلئے حیض و نفاس سے پاک ہونا بھی ضروری ہے۔

تنبیہ: رمضان شریف کے آخری دس دن اعتکاف سنہ مؤکدہ علی الکفایۃ ہے لیکن اگر کوئی شخص

رمضان کے آخری دس دنوں میں ایک دن یا تین دن یا پانچ دن کا اعتکاف بیٹھنا چاہتا ہے تو درست ہے

اس کا اعتکاف مستحب ہوگا۔ بظاہر یہاں اعتراض یہ ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے مدینہ طیبہ میں اعتکاف

ہر رمضان کے آخری دس دن کیا ہے ایک مرتبہ (جس کا ذکر کیا جا چکا ہے) چھوڑا لیکن وہ بھی شوال میں قضا کیا ہے اس سے تو پتہ چلتا ہے کہ اعتکاف واجب ہونا چاہئے:

”والجواب كما في العناية انه عليه الصلوة والسلام لم ينكر على من تركه ولو كان واجبا لأنكر، وحاصله ان المواظبة انما تفيد الوجوب اذا افترت بالانكار على التارك“

تو اس کا جواب یہ ہے کہ کوئی کام نبی کریم ﷺ نے ہمیشہ کیا ہو اور اس کے تارک پر وعید فرمائی ہو اور ترک کرنے کی اجازت نہ دی تو وہ کام واجب ہوتا ہے یہاں تارک پر انکار نہیں فرمایا لہذا اسے مؤکدہ ہے واجب نہیں۔ (شامی)

☆ عن ابی ہریرۃ قال کان یعرض علی النبی ﷺ القرآن کل عام مرة فعرض علیہ مرتین فی العام الذی قبض وکان یعتکف کل عام عشر فاعتکف عشرين فی العام الذی قبض“ (رواہ البخاری، مشکوٰۃ کتاب الاعتکاف)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ سے ہر سال ایک مرتبہ قرآن پاک کا دور کیا جاتا تھا۔ جس سال آپ کا وصال ہو گیا اس سال آپ سے دو مرتبہ دور کیا گیا۔ آپ ہر سال دس دن اعتکاف بیٹھتے تھے لیکن جس سال آپ کا وصال ہو گیا اس سال آپ بیس دن اعتکاف بیٹھے۔

وضاحت حدیث: نبی کریم ﷺ سے ہر رمضان میں جبریل دور کرتے تھے۔ جس رمضان کے بعد پھر رمضان نہیں آتا تھا اس میں دو مرتبہ دور کیا اسی طرح نبی کریم ﷺ ہر رمضان کے آخری دس دن اعتکاف بیٹھتے تھے لیکن آپ نے اپنی زندگی کے آخری رمضان میں بیس دن کا اعتکاف کیا۔

اس حدیث سے یہ بھی واضح ہو رہا ہے کہ نبی کریم ﷺ کو اپنے وصال کا علم تھا کہ اس رمضان کے بعد آپ پر آپ کی ظاہری حیات میں اور رمضان نہیں آئے گا۔ اور آپ نے اپنی امت کو یہ درس دیا کہ ہر انسان اپنی زندگی کے آخری ایام میں زیادہ سے زیادہ نیک اعمال کرے اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے حضور جانے اور اس سے ملاقات کے قابل بنائے۔ اور یہ بھی ثابت ہوا کہ حفاظ کا قرآن پاک کا دور کرنا سنت جبریل اور سنت نبی کریم ﷺ ہے یعنی حفاظ کو دور کرنے سے سنت پر عمل کا ثواب بھی حاصل ہوتا ہے۔

(مرقاۃ)

مسئلہ : مرد کا مسجد سے اور عورت کا گھر کی نماز کی جگہ (جہاں وہ اعتکاف میں ہو) سے بغیر

ضرورت انسانیہ اور بغیر ضرورت شرعیہ کے نکلنا منع ہے انسانی حاجات یہ ہیں پیشاب، پاخانہ کے لئے نکلنا اور اگر احتلام ہو جائے تو تیمم کر کے مسجد سے نکل جائے اور مسجد سے باہر غسل کرے۔ اور حاجات شرعیہ یہ ہیں۔ اگر اذان کہنی ہو اور اذان کا مینارہ مسجد کے باہر ہو تو اعتکاف والے کا اذان کہنا جائز ہوگا۔ اس طرح جس مسجد میں اعتکاف بیٹھا ہوا ہے اس میں جمعہ ادا نہیں ہوتا تو اتنا وقت لے کر جامع مسجد میں چلا جائے کہ وہاں سنتیں ادا کر سکے اور خطبہ سن سکے اور جمعہ کے فرض ادا کر سکے۔ فرضوں کے بعد والی سنتیں اپنی اعتکاف والی مسجد میں ادا کرے تو بہتر ہے۔ لیکن اگر فاصلہ زیادہ ہو واپس آ کر سنتیں ادا نہ کر سکے یا جامع مسجد سے نکلنا دشوار ہو تو وہاں ہی سنتیں ادا کر لے۔

☆ ”وعن عائشة قالت كان رسول الله ﷺ اذا اعتكف ادنى الى رأسه وهو فى المسجد فارجله وكان لا يدخل البيت الا لحاجة الانسان“

(بخاری، مسلم، مشکوٰۃ باب الاعتکاف)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب اعتکاف بیٹھتے تھے تو اپنا سر میرے قریب کرتے آپ خود مسجد میں ہی رہتے تو میں آپ کی کنگھی کرتی آپ گھر میں سوائے حاجت انسانیہ کے داخل نہیں ہوتے تھے۔

وضاحت حدیث: ادنیٰ کا معنی قریب کرنا دنو سے لیا ہوا ہے مطلب یہ ہوا ”اخرج

رأسه من المسجد الى حجرتي“ کہ نبی کریم ﷺ مسجد میں ہی تشریف فرما ہوتے اور سر مبارک کھڑکی سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرہ میں کر دیتے کیونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا یہی حجرہ تھا جواب نبی کریم ﷺ کا روضہ مطہرہ ہے تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نبی کریم ﷺ کی کنگھی کر دیتیں۔

اور مسئلہ یہ ثابت ہوا کہ اعتکاف والا شخص اگر اپنے بعض اعضاء کو مسجد سے نکالے اور خود مسجد میں رہے تو اس کا اعتکاف ٹوٹتا نہیں۔ اور مسئلہ یہ سمجھ آیا کہ بڑا برتن (ٹپ) وغیرہ رکھ کر اس میں بیٹھ کر غسل کرے جب مسجد ملوث نہ ہو تو جائز ہے۔ حاجت انسانیہ سے مراد پیشاب پاخانہ ہے یعنی حضور ﷺ قضاء حاجت کے لئے مسجد سے نکل کر گھر تشریف لائے۔

مسئلہ : اعتکاف والا شخص اگر قضا حاجت کے لئے گھر آئے تو گھر میں کسی بیمار سے چلتے چلتے

پوچھ لے کہ تمہارا کیا حال ہے تو یہ جائز ہے۔

”وعن عائشة قالت كان رسول الله ﷺ يعود المريض وهو معتكف فيمر كما هو فلا يعرج يسأل عنه“ (رواه ابو داود وابن ماجه ، مشكوة باب الاعتكاف)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ مریض کی عیادت کرتے تھے جب آپ اعتکاف میں ہوتے تھے لیکن چلتے چلتے آپ رک کر اس سے سوال نہیں کرتے تھے۔

وضاحت حدیث : اس حدیث پاک سے واضح ہوا کہ مریض مسجد سے باہر ہو تو اعتکاف والا شخص اپنی حاجت انسانیہ کے لئے مسجد سے نکلے تو چلتے چلتے مریض کی عیادت کر لے تو جائز ہے:

”فيمر كما هو“ ای يمر مرورا فلا يميل الى الجوانب ولا يقف

وقولها (فلا يعرج) ای لا يمكث بيان للجمل لان التعريج الاقامة“

یعنی چلتے چلتے عیادت کی جائے دائیں بائیں نہ پھرے اپنے راستے پر چلتے ہوئے بغیر رکنے کے عیادت کرے اگر راستہ سے ہٹ کر دائیں بائیں جا کر مریض کی عیادت کرے یا مسجد سے باہر رک کر عیادت کرے تو یہ ناجائز ہے۔

(ازمراقہ)

☆ ”عن عائشة قالت السنة على المعتكف ان لا يعود مريضا ولا يشهد جنازة ولا يمس المرأة ولا يباشرها ولا يخرج لحاجة الا لما لا بد منه ولا اعتكاف الا بصوم ولا اعتكاف الا في المسجد جامع“ (رواه ابو داود ، مشكوة باب الاعتكاف)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں اعتکاف والے شخص کے لئے سنت یہ ہے کہ وہ مریض کی عیادت نہ کرے اور نماز جنازہ میں حاضر نہ ہو اور کسی عورت کو مس نہ کرے اور عورت سے مباشرت نہ کرے کسی کام کے لئے مسجد سے باہر نہ نکلے سوائے ضرورت کے۔ اور اعتکاف بغیر روزہ کے صحیح نہیں اور اعتکاف سوائے اس مسجد کے نہیں جس میں جماعت ہوتی ہے۔

وضاحت حدیث : حدیث پاک میں ”سنة“ کا لفظ جو ذکر ہے اس سے مراد دین اور شرع اور وہ راہ جس پر چلا جائے۔ یعنی اعتکاف والے کے لئے شرعی طریقہ یہ ہے کہ مسجد سے باہر کسی کی جا کر عیادت نہ کرے ہاں البتہ حاجت انسانیہ کے لئے نکلے تو چلتے چلتے مریض کی عیادت کر لے۔

اور مسجد سے باہر جنازہ ادا کرنے کے لئے نہ نکلے۔ اور اعتکاف میں روزہ رکھنا ضروری ہے ایک دن ایک رات کا بھی اعتکاف ہو تو روزہ رکھنا لازم ہوگا ہاں البتہ کچھ دیر کے لئے اعتکاف کی نیت کرے دن رات سے کم ہو تو اس میں روزہ رکھنا ضروری نہیں۔

اعتکاف کے لئے ضروری ہے کہ مسجد میں ہو اور اس میں جماعت ہوتی ہو۔ اگر مسجد میں جماعت نہ ہوتی ہو تو ایسی مسجد میں اعتکاف نہ بیٹھے۔ حدیث شریف میں ”الا فی مسجد جامع“ کا مطلب یہ کہ وہ مسجد جس میں جماعت ہوتی ہو اس سے مراد جامع مسجد (جس میں جمعہ ہوتا ہو) نہیں۔

(از مرقاۃ)

معتکف کو معتکف کہنے کی وجہ:

”عن ابن عباس ان رسول اللہ ﷺ قال فی المعتکف هو یعتکف

الذنوب و یجری له من الحسنات کعامل الحسنات کلھا“

(رواہ ابن ماجہ . مشکوٰۃ باب الاعتکاف)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا معتکف وہ ہے جو گناہوں سے بچ جائے۔ اور اس کو (مسجد میں بیٹھنے کی وجہ سے) نیکیوں کا ثواب ملتا رہتا ہے جیسا کہ نیکیوں پر عمل کرنے والے کو ثواب ملتا ہے۔

وضاحت: حدیث پاک کا مطلب واضح ہے کہ اعتکاف والا شخص دنیا سے کنارہ کش ہو کر مسجد میں بیٹھ جاتا ہے اور اپنے آپ کو گناہوں سے بچا لیتا ہے پھر اس کا ہر لمحہ نیکی میں گزر رہا ہوتا ہے خواہ وہ اٹھے یا بیٹھے جاگے یا سوئے۔ یعنی اس کا جاگنا بھی عبادت اور اس کا سونا بھی عبادت ہے۔

مسئلہ: اعتکاف والے شخص کیلئے مسجد میں کھانا اور پینا جائز ہے بلکہ وہ مسجد سے باہر نکل کر کھا اور پی نہیں سکتا یہ اس کیلئے جائز ہی نہیں اور اعتکاف کے دنوں میں وہ لازماً مسجد میں ہی سوئے گا اعتکاف والا شخص اگر کسی چیز کو خریدنے یا بیچنے کا محتاج ہو یعنی بہت ضرورت درپیش آئے تو اس چیز کو مسجد میں نہ لایا البتہ زبانی طور پر وہ سودا کر سکتا ہے ہاں بغیر عذر کے تجارت کی غرض سے خرید و فروخت منع ہوگی۔ (درمختار شاہی)

مسئلہ: اعتکاف کی حالت میں قرآن پاک پڑھے، درود شریف پڑھے ہر قسم کا وہ ذکر کرے جو

قرآن وحدیث میں ہودعائیں کرے لیکن اس عقیدہ سے بالکل خاموش ہو کر نہ بیٹھے کہ خاموش رہنا بھی عبادت ہے پہلی قوموں پر خاموشی کا روزہ بھی عبادت سمجھا جاتا تھا لیکن نبی کریم ﷺ کی شریعت میں اسے منسوخ کر دیا گیا:

”عن ابی ہریرۃ قال ان النبی ﷺ نہی عن صوم الوصال وعن صوم الصمت“

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک نبی کریم ﷺ نے صوم وصال سے اور خاموشی کے روزے سے منع فرمایا۔ ہاں البتہ لغو کلام سے بچنے کے لئے خاموش رہنا بہتر ہے بلکہ کہیں فرض اور واجب ہوتا ہے کہ خاموش رہا جائے۔ حدیث شریف میں ہے ”من صمت نجا“ جو خاموش رہا اس نے نجات حاصل کر لی۔ اور حدیث شریف میں ہے:

”رحم اللہ امرأ تکلم فغنم او سکت فسلم“

اللہ تعالیٰ اس شخص پر رحم کرے جو کلام کرے تو غنیمت حاصل کر لے (یعنی کلام سے نفع حاصل کرے، کلام خیر ہو) یا خاموش رہے تو سلامتی میں رہے۔ خیال رہے غیبت سے بچنا اور جھوٹ سے بچنا فرض ہے اور برے اشعار پڑھنے سے بچنا اور سامان تجارت کو لوگوں کو سامنے خالص اور کھرا بیان کرنے کے لئے اللہ کے ذکر سے بچنا واجب ہے۔

خیال رہے کہ برا کلام نہ ہو تو وہ مباح ہے لیکن اعتکاف والے کے لئے مباح کلام کرنا بھی مکروہ ہے ہاں البتہ قرآن پاک اور حدیث پاک کا درس دے اور طلباء کو پڑھائے اور انبیاء کرام کے واقعات بیان کرے اور نیک لوگوں کی حکایات بیان کرے اور دینی مسائل پر مشتمل کتاب لکھے فتویٰ لکھے یہ سب کام جائز اور مستحسن ہیں۔ (ازدر مختار، شامی)

مسئلہ: اگر ایک شخص نذر مانے کہ میں اتنے دن اعتکاف بیٹھوں گا تو اتنی راتیں بھی تو وہ اس پر لازم ہو جائیں گے اور روزہ رکھنا بھی لازم ہو جائے گا اور اگر راتوں کی نذر مانے کہ میں اتنی راتیں اعتکاف بیٹھوں گا تو اتنے دن بھی خود بخود لازم ہو جائیں گے۔ ہاں اگر نذر میں یہ کہے میں صرف دن دن کا اعتکاف بیٹھوں گا رات کو اعتکاف نہیں کروں گا تو صرف دن کا اعتکاف لازم ہوگا۔ (در مختار، شامی)

مسئلہ : اگر کسی عذر، یعنی شدید بیماری وغیرہ کی وجہ سے اعتکاف توڑ دیا تو جتنے دن اس کی نیت کے مطابق اعتکاف کے رہتے تھے اتنے دن اعتکاف کی قضاء کرنی لازم ہوگی اور روزہ رکھنا بھی لازم ہوگا۔ یہ بھی خیال رہے کہ یہ اعتکاف کے دن مستقل طور پر روزہ رکھنا لازم ہوگا کوئی شخص یہ خیال کرے کہ وہ پھر آنے والے رمضان میں اعتکاف قضاء کر لے گا یہ درست نہیں ہوگا کیونکہ رمضان میں تو روزہ رکھنا ہی ہے وہ مستقل روزہ اعتکاف کی قضا کی وجہ سے نہیں رکھا جاتا۔

مسئلہ : اگر ایک مسجد شہید ہونے کا خطرہ لاحق ہو جائے یا وہاں کے بد معاش لوگ اسے نکال دیں کہ وہ کسی کو اعتکاف نہیں بیٹھنے دیتے تو دوسری مسجد میں منتقل ہونا جائز ہے۔

مسئلہ : اعتکاف کی حالت میں مسجد میں رہنا ضروری ہے خواہ کمرے میں ہو یا صحن میں یا مسجد کی چھت میں ہو لیکن مسجد سے نکلنا منع ہے وضو والی جگہ مسجد سے باہر ہوتی ہے اس لئے وضو کرنے کی اجازت ہے لیکن برتن صاف کرنے کے لئے وضو کی جگہ بیٹھنا منع ہے۔ بغیر مجبوری یعنی جنابت کے غسل کے بغیر جمعہ وغیرہ کا غسل کرنا منع ہے کیونکہ بلا وجہ مسجد سے باہر نکلنا لازم آئے گا۔

تنبیہ : مسجد کا محراب آج کل کے رواج کے مطابق مسجد کا حصہ ہی سمجھا جاتا ہے اس لئے مسجد کے محراب کو مسجد کے غیر کا حکم دینا درست نہیں۔ ہاں مسجد بناتے وقت محراب کو یا کسی حصہ کو مسجد سے باہر شمار کر لیا گیا تو اس جگہ اعتکاف والے شخص کا بیٹھنا وغیرہ منع ہوگا۔ مسجد کا ہی حصہ شمار کیا جائے درمیان میں دیوار وغیرہ دے کر اعتکاف والوں کے لئے علیحدہ جگہ منتخب کر لی تو جائز ہے۔ ایسی سیڑھی جو مسجد سے باہر ہو اسے استعمال کر کے مسجد کی چھت پر معتکف کو جانا منع ہوگا۔ محراب کے متعلق راقم نے اپنا خیال ظاہر کیا ہے، کوئی اتفاق کرے یا نہ کرے۔

تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ فَلَا تَقْرَبُوهَا : ”یہ اللہ کی حدیں ہیں تو نہ قریب جاؤ ان کے“ ﴿حد﴾ کا معنی ہے کسی چیز کی انتہاء کسی چیز کے منقطع ہونے کا مقام، جو شخص رزق سے محروم ہوا ہے بھی محدود کہا جاتا ہے کہ اس سے رزق کو منقطع کر لیا گیا۔ اور دربان کو حداد کہا جاتا ہے کہ وہ لوگوں کو اندر داخل ہونے سے روکتا ہے اور کہتا ہے تمہارے آنے کی حد دروازہ ہی ہے اور حد الدار کا مطلب ہوتا ہے یہاں غیر کا

داخل ہونا منع ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی حدود سے مراد وہ چیزیں اور وہ احکام ہیں جن کی مخالفت منع ہے۔

(از کبیر)

اعتراض: "تِلْكَ" کا اشارہ ہے پہلے احکام مذکورہ کی طرف وہ تمام تو حرام نہیں بلکہ بعض ان میں سے مباح ہیں تو سب کے متعلق یہ کہنا کس طرح درست ہے ﴿فَلَا تَقْرُبُوهَا﴾ ان کے قریب نہ جاؤ۔

جواب: اگرچہ پہلے کئی احکام کا ذکر ہے لیکن قریب ﴿وَلَا تَبَاشِرُوهُنَّ وَأَنْتُمْ عَاكِفُونَ فِي الْمَسَاجِدِ﴾ ہے کہ تم عورتوں کو ہاتھ نہ لگاؤ جب کہ تم مساجد میں معتکف ہو۔

اسی طرح ذکر ہے ﴿ثُمَّ أَتِمُّوا الصِّيَامَ إِلَى اللَّيْلِ﴾ "پھر تم پورا کرو روزوں کو رات تک" اس سے پتہ چلا کہ رات آنے سے پہلے روزہ افطار کرنا حرام ہے اس لئے یہ کام جو حرام ہیں وہی "تِلْكَ" کا اشاریہ ہیں ان کے قریب جانے سے منع کیا گیا ہے۔ (خازن)

اعتراض: اعتراض اس آیت کریمہ میں ذکر ہے

﴿تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ فَلَا تَقْرُبُوهَا﴾ "یہ اللہ کی حدیں ہیں ان کے قریب نہ جاؤ۔ دوسرے مقام پر فرمایا:

﴿تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ فَلَا تَعْتَدُوهَا﴾ "یہ اللہ کی حدیں ہیں ان سے تجاوز نہ کرو۔ ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿وَمَنْ يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَتَعَدَّ حُدُودَهُ﴾

"اس میں بھی حدود سے تجاوز کرنے پر وعید فرمائی تو یہ وجہ فرق کیا ہے؟

جواب: جو شخص اللہ تعالیٰ کی طاعت میں ہو اور اللہ تعالیٰ کے فرائض کی ادائیگی میں ہو وہ مقام حق میں ہے اسے منع کیا گیا کہ حدود سے تجاوز کر کے باطل مقام میں داخل نہ ہونا پھر اور زیادہ تاکید کی گئی کہ حق اور باطل کے درمیان حدود کے قریب بھی نہ جانا کہ کہیں بے خبری اور بے احتیاطی کی وجہ سے باطل راہ میں داخل نہ ہو جانا۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

"الحلال بین والحرام بین وبينهما أمور مشبهات لا يعلمها كثير من

الناس فمن اتقى المشبهات استبرأ لعرضه ودينه ومن وقع في

المشتبهات وقع فی الحرام کرا عی حول الحمی یوشک ان
یواقعه الا وان لكل ملک حمی الا وان حمی الله فی ارضه محارمه

(متفق علیہ)

حلال چیزیں واضح ہیں اور حرام بھی واضح ہیں اور ان کے درمیان کچھ امور مشتبہ ہیں کثیر لاک ان کو نہیں جانتے۔ جو شخص مشتبہ چیزوں سے بچ گیا اس نے اپنی عزت اور اپنے دین کو بچا لیا اور جو شخص مشتبہ چیزوں میں واقع ہو گیا وہ حرام میں واقع ہو گیا جیسا کہ جانوروں کو چرانے والا جب حد بندی کے ارد گرد جانوروں کو چرائے تو قریب ہے کہ اس کے جانور (اس حد بندی کے اندر) واقع ہو جائیں بیشک ہر بادشاہ کی حد بندی ہے خبردار اللہ تعالیٰ کی زمین میں اس کی حد بندی اس کے محارم ہیں۔

مطلب واضح ہے کہ جس طرح جانوروں کو چرانے والا کسی کی زمین کی حد کے ساتھ جانوروں کو چرائے تو ممکن ہے کہ وہ جانور دوسرے کے فصل میں واقع ہو کر فصل برباد کر دیں اسی طرح جن امور کے متعلق شک ہو کہ ہو سکتا ہے یہ حرام ہوں تو ان سے دور رہے کیونکہ اگر ان میں واقع ہو گا تو ہو سکتا ہے کہ عین حرام کاموں میں واقع ہو جائے۔ اور جن کاموں کا حرام ہونا یقینی ہو تو ان کے قریب بھی نہ آئے تاکہ ان سے مکمل بچ سکے۔

(ماخوذ از خازن ومظہری)

كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيَاتِهِ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ :

”اسی طرح بیان کرتا ہے اللہ تعالیٰ اپنی نشانیاں لوگوں کے لئے تاکہ وہ پرہیزگار ہو جائیں۔“

﴿كَذٰلِكَ﴾ میں کان محل نصب میں ہے اور مصدر محذوف کی صفت ہے حاصل کلام یہ ہے:

”کذلک ای بیانا مثل هذا البیان الوافی والواضح“

اور آیات سے مراد دلائل دین اور نصوص احکام اور مقصد بیان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اپنے بندوں پر جو رحمت اور اس کی طرف سے ان کو ہدایت حاصل ہے اس کی عظمت کو واضح کرنا ہے۔ یعنی جس طرح اللہ تعالیٰ نے یہاں احکام واضح طور پر بیان فرمائے ہیں اسی طرح تمام دلائل دین اور احکام پر نصوص کو واضح طور پر بیان فرماتا ہے تاکہ لوگ ہدایت پا جائیں اور اس کی رحمت سے فائدہ حاصل کریں تاکہ اس کے اوامر و نواہی کی مخالفت سے بچ جائیں۔

تقویٰ کا پہلا درجہ شرک سے بچنا ہے پھر گناہوں سے بچنا، پھر شہوات سے بچنا ہے پھر بے فائدہ چیزوں سے بچنا ہے حدیث شریف میں ہے:

”لا يبلغ العبد درجة المتقين حتى يدع مالا باس به حذرا مما باس به“

بندہ اس وقت تک متقین کے درجہ کو نہیں پاسکتا جب تک ان چیزوں کو نہ چھوڑ دے جن میں کوئی حرج نہیں ان سے بچنے کی غرض سے جن میں حرج پائی جاتی ہے۔ شیخ سعدی رحمہ اللہ نے کیا خوب فرمایا:

ترا آنکہ چشم و دہان داد و گوش اگر عاقلی در خلا فاش مکوش
تجھے جس ذات نے آنکھیں اور منہ اور کان دیئے اگر تو عقل مند ہے تو اس کے خلاف کام کرنے کی کوشش نہ کر:

چوں پاک آفریدت بہش باش و پاک کہ ننگست ناپاک رفتن بخاک
جب رب تعالیٰ نے تجھے پاک پیدا کیا ہے تو ہوش میں رہ اور پاک ہی رہ۔ کہ مقام شرم ہے ناپاک ہو کر خاک میں جانا:

مرو زیر بارہ گناہ ای پسر کہ حمال عاجز بود در سفر
اے لڑکے گناہوں کا بوجھ اٹھا کر نہ جا کہ بوجھ اٹھانے والا سفر میں عاجز ہو جاتا ہے
مکن عمر ضائع بافسوس و حیف کہ فرصت عزیز است و وقت سیف
اپنی عمر بے مقصد ضائع نہ کر دے کہ فرصت عزیز ہے اور وقت تلوار (کی طرح چمکنے والا جانے والا ہے)

(از روح البیان)

وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوا بِهَا إِلَى الْحُكَّامِ
لِتَأْكُلُوا فَرِيقًا مِّنْ أَمْوَالِ النَّاسِ بِالْإِثْمِ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ

- (۱) ”اور آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق نہ کھاؤ اور نہ حاکموں کے پاس ان کا مقدمہ اس لئے پہنچاؤ کہ لوگوں کا کچھ مال ناجائز طور پر کھا لو جان بوجھ کر“
- (۲) ”اور نہ کھاؤ تم ایک دوسرے کا مال آپس میں ناحق طریقہ سے اور نہ پیش کرو ان کو حاکموں کی طرف کہ تم کھاؤ مال لوگوں کے مالوں میں سے ناجائز طور پر حالانکہ تم جانتے ہو۔“

شان نزول:

- (۱) عبدان حضری نے امرؤ القیس کنڈی پر زمین کا دعویٰ کیا لیکن عبدان حضری کے پاس گواہ نہیں تھے جو یہ گواہی دیں کہ یہ زمین جو امرؤ القیس کے پاس ہے وہ عبدان حضری کی ہے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے امرؤ القیس کو حکم فرمایا کہ وہ قسم اٹھائے اس نے قسم اٹھانے کا ارادہ کر لیا تو نبی کریم ﷺ نے یہ آیت کریمہ تلاوت کی:

﴿إِنَّ الَّذِينَ يَشْتَرُونَ بِعَهْدِ اللَّهِ وَأَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيلًا أُولَٰئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللَّهُ وَلَا يَنْظُرُ إِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ﴾

بیشک وہ لوگ جو اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کے بدلے گھٹیا دام (یعنی حقیر دنیا کا مال) لیتے ہیں آخرت میں ان کا کچھ حصہ نہیں اور اللہ نہ ان سے بات کرے نہ ان کی طرف نظر فرمائے قیامت کے دن اور نہ انہیں پاک کرے اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔

امرو القیس نے جب نبی کریم ﷺ کی زبان مبارک سے اس آیت کریمہ کو سنا تو قسم اٹھانے سے رک گیا اور زمین فی الواقع حقدار عبدان حضری کو دے دی۔ ایک اس واقعہ کے درپیش آنے کے بعد یہ آیت کریمہ (زیر بحث) نازل ہوئی۔

- (۲) ”روى انه اختصم اليه خصمان فقال عليه السلام انما انا بشر مثلكم وانتم تختصمون“

الی ولعل بعضکم الحن بحجته من بعض فاقض له علی نحو ما اسمع منه فمن قضیت له بشنی من حق اخیه فانما اقضی له قطعة من نار فبکیا فقال کل واحد منهما حقی لصاحبی

نبی کریم ﷺ کی خدمت میں دو شخصوں کا جھگڑا پیش ہوا تو آپ نے فرمایا بیشک میں تمہاری طرح بشر ہوں اور تم جھگڑا میرے پاس لے کر آتے ہو، ہو سکتا ہے تم میں سے بعض دوسرے بعض سے اپنے دلائل اچھی طرح پیش کر دے تو میں اس کے حق میں فیصلہ کر دوں اگر میں نے کسی شخص کے حق میں فیصلہ کر دیا اور اسے اس کے دوسرے بھائی کا حق دے دیا تو میں نے اسے آگ کا ٹکڑا دے دیا۔ یہ سن کر دونوں صحابی رونے لگے ہر ایک یہی کہہ رہا تھا کہ یہ میرے بھائی کا حق ہے۔ میرا اس میں کوئی حق نہیں۔ (یہ واقعہ بھی درپیش آنے کے بعد اس آیت کریمہ کا نزول ہوا)۔ (از تفسیر ابی السعود)

سبحان اللہ تعلیمات مصطفویہ کا کیا خوب اثر ہوا کہ جھگڑا کرنے والے خود ہی اپنے اپنے حق سے دستبردار ہو کر آپس میں شیر و شکر ہو گئے اور نبی کریم ﷺ نے ایک قانون کی طرف اشارہ کر دیا کہ قاضی فیصلہ اپنے علم کے مطابق نہیں کر سکتا بلکہ مدعی کے گواہ یا مدعی علیہ کی قسم کے مطابق فیصلہ کرتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص جھوٹے گواہوں کے ذریعے یا جھوٹی قسم کے ذریعے ناحق فیصلہ کرا لے اور اپنے دوسرے بھائی کے حق پر ناجائز قابض ہو جائے تو اس کا یہ عمل جہنم میں جانے کا ذریعہ ہے اس لئے اس نے اپنے حق میں جہنم کی آگ کے ٹکڑے کا فیصلہ کرا لیا۔

نبی کریم ﷺ کو اگرچہ حق اور ملکی حیثیت بھی حاصل تھی لیکن تعلیم امت کیلئے آپ کا فیصلہ بشری حیثیت میں ہوا کرتا تھا۔

وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ : بظاہر مطلب ﴿وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ﴾ کا یہ ہے کہ تم اپنے مال باطل طریقے سے نہ کھاؤ۔ لیکن مراد یہ ہے کہ تم آپس میں ایک دوسرے کا مال باطل طریقہ سے نہ کھاؤ کیونکہ ایک دوسرے کے مال کی حفاظت تم پر لازم ہے اپنے ہی بھائیوں کا مال ناجائز طور پر کھانا گویا کہ اپنا مال ہی باطل طریقے سے کھانا ہے جس سے منع فرمایا گیا بہت حسین اشارہ کیا گیا کہ اپنے بھائیوں کے مال کو اپنا مال سمجھو نہ اپنے مال میں ناجائز تصرف کرو اور نہ ہی اپنے بھائیوں کے مال میں ناجائز تصرف کرو۔ (از تبصر الرحمن)

﴿وَلَا تَأْكُلُوا﴾ کا معنی تو ہے ”اور نہ کھاؤ“ لیکن مراد عام ہے کہ ”اخذ اور استیلاء“ کو

بھی شامل ہے۔ یعنی مطلب یہ ہے کہ تم آپس میں ایک دوسرے کا مال باطل طور پر کسی طرح بھی نہ حاصل کرو کسی کے مال پر ناجائز غلبہ حاصل نہ کرو۔ البتہ کھانے کی ممانعت اس لئے کی ہے کہ عام طور پر مال کھانے میں سرف کیا جاتا ہے اور غیر کا مال زیادہ طور پر کھا کر برباد کیا جاتا ہے۔ (از روح المعانی)

﴿بِالْبَاطِلِ﴾ باطل کا لغوی معنی ہے زائل ہونا، چلا جانا (بطل الشئ بطولا فهو باطل)

باطل کی جمع بواطل آتی ہے اور البطولة، پھر البطولة کی جمع اباطیل آتی ہے عرب حضرات کہتے ہیں ”بطل“ لاجیر ”مزدور نے لہو و لعب میں مشغول ہو کر چھٹی کر کے اپنی مزدوری زائل کر دی۔ (از کبیر)

باطل سے مراد کیا ہے؟ باطل طریقہ سے مال نہ کھانے سے مراد کیا ہے؟ ضابطہ تو اس میں روح المعانی کے یہ الفاظ ہیں ”کل ما لم يأذن بأخذه الشرع“ ہر وہ چیز جس کی شریعت نے اجازت نہ دی ہو یعنی غیر شرع طور پر مال کا استعمال باطل کہلاتا ہے جو ناجائز ہے۔ مختلف تفاسیر کو دیکھنے سے جزئیات کئی واضح ہو جاتی ہیں:

”والا کل بالباطل علی وجهین احدهما ان یأکله علی وجه الظلم

بنحو الغصب والسرقة واليمين الكاذبة والثانی ان یأکله علی جهة

الهرؤ واللعب کالذی یؤخذ فی القمار والملاهی وغیر ذلک“

باطل طریقے سے مال حاصل کرنے کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ ظلم سے کسی کا مال حاصل کرے

جیسا کہ کسی کا مال غصب کر لے یا چوری کر لے، یا جھوٹی قسم اٹھا کر کسی کا مال ناحق طور پر لے لیا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ مال مزاح اور لہو و لعب سے حاصل کر لے یعنی جو بازی سے مال حاصل

کرے یا کھیل کو وغیرہ سے شرط لگا کر مال حاصل کرے۔

قاضی محمد ثناء اللہ مظہری فرماتے ہیں باطل طریقہ سے مال حاصل کرنے کی کئی مثالیں ہیں

جھوٹے دعویٰ سے مال حاصل کرے۔ جھوٹی گواہی سے مال حاصل کرے حق کا انکار کرنے کے بعد

جھوٹی قسم اٹھا کر مال حاصل کرے، کسی کا مال غصب کرے کسی کا مال اچک لے، چوری سے مال حاصل

کرے۔ خیانت کے ذریعے مال حاصل کرے جو بازی سے مال حاصل کرے گانا گائے کرا جرت سے مال

حاصل کرے فاحشہ عورت بدکاری کے ذریعے مال حاصل کرے، کاہن اور نجومی لوگ اپنے اس فن سے جو مال حاصل کرتے ہیں اور زجانور کو مادہ کے گابھن کرنے کے لئے مادہ پر چڑھانے کی اجرت۔ اور ہر قسم کی فاسد بیع سے مال حاصل کرنا اور رشوت کے ذریعے مال حاصل کرنا سب حرام اور باطل ہیں یہ مثالیں ذکر کرنے کے بعد آپ نے بھی یہ فرمایا ”وغير ذلك من الوجوه التي لا يبيحه الشرع“ اس کے علاوہ وہ تمام وجوہ جن کی شریعت نے اجازت نہیں دی ان سے مال حاصل کرنا باطل اور حرام ہے۔ (مظہری)

تنبیہ : ”ومن الاكل بالباطل ان يقضى القاضي لك وانت تعلم انك مبطل فالحرام لا يصير حلالا بقضاء القاضي لانه انما يقضى بالظاهر“

اگر قاضی نے گواہوں کی گواہی کو سن کر یا مدعی علیہ کی قسم کا لا اعتبار کر کے فیصلہ کر دیا جس کے حق میں فیصلہ کیا گیا وہ جانتا ہے کہ میں نے ناحق فیصلہ کر لیا ہے تو اس صورت میں قاضی تو گنہگار نہیں ہوگا البتہ وہ شخص باطل اور حرام طریقہ سے مال حاصل کر رہا ہے کیونکہ قاضی نے ظاہر طور پر فیصلہ کیا ہے اس سے حرام حلال نہیں ہوا اور نہ ہی حلال چیز قاضی کے فیصلہ سے حرام ہوتی ہے۔

مقام توجہ : تفسیر صاوی نے باطل طریقہ سے مال کھانے کی چند مثالیں دی ہیں جو مظہری کے حوالہ سے نقل کی جا چکی ہیں البتہ انہوں نے ایک اور مثال ”مکس“ (ٹیکس) بھی دی ہے۔ یعنی ظالمانہ ٹیکس مقرر کرنا بھی باطل اور حرام ہے ہاں اگر لوگوں کے نفع کے لئے کوئی حاکم ایماندازی سے کوئی کام کرنا چاہے نہ رکھدوانی ہے، ڈیم بنانا ہے وغیرہ تو لوگوں پر ٹیکس مقرر کیا جاسکتا ہے لیکن مقام افسوس یہ ہے کہ سارا نظام برباد اس وجہ سے کہ ٹیکس مقرر غرباء پر ہوتا ہے یا زمیندار پر ہوتا یا تاجر پر ہوتا ہے۔ یا تنخواہ دار پر ہوتا ہے یہی لوگ ملک کو چلانے والے ہیں یہی ملک کی ریڑھ کی ہڈی ہیں لیکن وہ پیسہ کھانے والے الگے تلگے، غاصب لیٹرے ہوتے ہیں۔

کسی منصوبہ پر اربوں روپے یا کروڑوں روپے خرچ کرنے کا اعلان ہوتا ہے کبھی آپ نے سوچا کہ وہ پیسہ صرف دس فیصد خرچ ہوتا ہے نوے فیصد مختلف ہاتھوں میں چلا جاتا ہے۔ ملک کو قرضے میں جکڑ دیا گیا ہے قرض پر قرض لئے جا رہے ہیں اب حالت یہ ہے کہ صرف سود ادا کرنے کے لئے بھی قرض لینے کی ضرورت پڑتی ہے وہ قرض ہم بے مقصد کاموں پر صرف کر دیتے ہیں ایک ایک محفل پر کروڑوں روپے خرچ ہو جاتے ہیں کہ صدر صاحب آرہے ہیں، وزیراعظم صاحب آرہے ہیں۔

اسمبلیوں کے ممبران کی تعداد بڑھا بڑھا کر ان کی مراعات بڑھا بڑھا کر ملک کو کنگال کیا جا رہا ہے وزراء کی مراعات بڑھائی جا رہی ہیں صدر اپنی ہی قلم سے اپنی مراعات بڑھا دیتا ہے کیا یہ سب کچھ ظلم ہے یا نہیں؟

باطل طریقے سے مال کھانے پر مختلف ارشادات:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ إِلَّا أَنْ تَكُونَ تِجَارَةً﴾
 ”اے ایمان والو نہ کھاؤ آپس میں ایک دوسرے کے مال باطل طریقے سے سوائے اس کے کہ تجارت سے (نفع حاصل) ہو“

﴿الَّذِينَ يَأْكُلُونَ أَمْوَالِ الْيَتَامَىٰ ظُلْمًا إِنَّمَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ نَارًا وَسَيَصْلُونَ سَعِيرًا﴾
 ”وہ لوگ جو یتیموں کا مال کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹوں میں آگ کھاتے ہیں اور عنقریب جہنم کی بھڑکتی آگ میں جلیں گے۔“

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا إِن كُنتُمْ مُؤْمِنِينَ﴾
 ”اے ایمان والو اللہ سے ڈرو اور باقی سود چھوڑ دو اگر تم مومن ہو۔“

ان آیات میں حرام، ناحق، باطل طریقے سے مال کھانے پر وعید فرمائی اور ساتھ ہی ایمان والوں کو حلال اور پاکیزہ مال کھانے کا حکم دیا۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ﴾
 ”اے ایمان والو کھاؤ پاکیزہ، حلال مال جو ہم نے تمہیں عطا کیا ہے“

اور یہی حکم رب تعالیٰ نے اپنے برگزیدہ بندوں یعنی رسولوں کو دیا ارشاد باری تعالیٰ ہے:
 ﴿يَا أَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوا مِنَ الطَّيِّبَاتِ﴾ ”اے رسولو کھاؤ پاکیزہ، حلال مال“

حلال و حرام کی پہچان میں ایک شاندار ضابطہ:

شیخ ابو حامد محمد غزالی رحمہ اللہ نے خوبصورت ضابطہ بیان فرمایا علامہ رازی رحمہ اللہ نے تفسیر کبیر میں بھی ذکر فرمایا۔ زمین میں پائی جانی والی اشیاء جن کو کھایا جاتا ہے وہ تین قسم کی ہیں: معدنیات،

نباتات اور حیوانات۔

معدنیات کا حکم: معدنیات وہ چیزیں ہیں جو زمین کے اجزاء ہیں یا زمین سے نکلتی ہیں وہ تمام حلال ہیں جب تک کھانے والے کو نقصان نہ پہنچائیں۔ اگر کھانے والے کو نقصان پہنچائیں تو نقصان پہنچانے کی وجہ سے ان کا استعمال ناجائز ہوگا۔ کیونکہ بعض معدنیات میں زہریلے اثرات پائے جاتے ہیں۔ اس ضابطہ کے مطابق ”والسخبز لو کان مضرا الحرام اكله“ اگر کوئی ماہر طبیب بتائے کہ تمہارے لئے روٹی کھانا زہر قاتل ہے تو اس شخص کے لئے روٹی کھانا بھی حرام ہو جائے گا۔

مٹی بھی اجزاء ارض سے ہونے کی وجہ سے معدنیات سے تعلق رکھتی ہے مٹی کا کھانا بھی مضر صحت کی وجہ سے حرام ہے حالانکہ پاک مٹی پر کھانے کی کوئی چیز گر جائے تو اسے اٹھا کر صاف کر کے کھانے کا حکم ہے۔

نباتات کا حکم: نباتات تمام ہی حلال ہیں ہاں البتہ وہ نباتات جو عقل کو زائل کر دیں یا زندگی کو زائل کر دیں یا صحت کو زائل کریں وہ حرام ہوں گی۔ عقل کو زائل کرنے والی چیزیں جو حرام ہیں وہ یہ ہیں بھنگ، شراب اور تمام نشہ دینے والی چیزیں۔ زندگی کو زائل کرنے والی اشیاء یعنی نباتات میں سے کوئی چیز جس میں زہریلے اثرات ہوئے جس سے زندگی ختم ہونے کا خطرہ ہو وہ حرام ہے۔ صحت کو زائل کرنے والی چیزیں حرام ہیں جیسا کہ دوا بغیر وقت کے اور بغیر طبیب کے مشورہ کے استعمال کرنا جو صحت کو زائل کر دے۔

تنبیہ: ”والمسکرات فان الذی لا یسکر منها ایضا حرام مع قلته لعینہ ولصفته وہی الشدة المطربة“

نشہ آور چیزیں تمام حرام ہیں ان کو تھوڑا استعمال کرے یا زیادہ استعمال کرے کیونکہ ان میں ذاتی طور پر نشہ پایا گیا ہے لہذا یہ کہنا باطل ہے کہ نشہ آور چیز اتنی مقدار میں جائز ہے جس سے نشہ نہ آئے۔ ہاں البتہ کسی دوا وغیرہ کے تابع ہو تو اس کا حکم ﴿فَمَنْ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ﴾ کے تحت ذکر کیا جا چکا ہے۔

فائدہ: زہر کا زہریلا اثر ختم ہو گیا یا اس کے کم ہونے کی وجہ سے یا کسی اور دوا وغیرہ میں ملا کر اس سے کوئی کشتہ تیار کر لیا گیا جس سے اس کے اثرات زائل ہو گئے تو اس کا استعمال جائز ہے۔

حیوانات کا حکم: بعض جانوروں کا گوشت کھانا حلال ہے اور بعض کا حرام۔ کئی جانوروں کے حلال ہونے اور حرام ہونے کو قرآن پاک یا احادیث مبارکہ میں واضح کر دیا گیا ہے تاہم ہر درندہ خواہ حیوانات سے ہو یا پرندوں سے ہو حرام ہے۔ ہر جانور جو بچے سے پکڑ کر چونچ سے کھائے حرام ہے ہمیشہ بلوں میں بسیرا کرنے والے جانور حرام ہیں۔ لیکن یہ بھی خیال ہے کہ حلال جانوروں کو شرعی ضابطہ کے مطابق ذبح کیا جائے یا شکار کیا جائے تو وہ حلال ہوتے ہیں ورنہ وہ حلال ہونے کے باوجود حرام ہو جائیں گے ہاں البتہ مچھلی اور مکڑی بغیر ذبح کے حلال ہیں۔ پانی والے جانور سوائے مچھلی کے باقی تمام حرام ہیں سوائے ان جانوروں کے جن کی مثال خشکی میں حلال ہو جیسا کہ بھینس، مینڈھا وغیرہ، یہ دریائی بھی حلال ہیں۔

حرام طریقہ سے حاصل کیا ہوا مال حرام ہے:

اس میں کل چھ قسمیں ہیں پھر ہر ایک میں دو صورتیں ہیں ایک حلال اور ایک حرام۔

- (۱) معدنیات کو حاصل کرنا اور شکار کرنا اور لکڑیاں حاصل کرنا اگر کسی مالک کی زمین ہے تو اس سے اجازت طلب کر کے یا حکومت کی ملکیت ہے تو حکومت سے اجازت طلب کر کے یہ کام کئے گئے تو حلال ہیں۔ یا جنگل میں سے شکار کرنے کی ہر شخص کو اجازت ہے اسی طرح لکڑیاں حاصل کرنے کی اجازت ہے تو یہ کام جائز ہیں اگر زبردستی یا چوری سے یہ کام کئے ہیں تو ناجائز ہیں۔
- (۲) مال غنیمت اور مال فنی اور کافروں کی املاک پر مسلمانوں کا قبضہ ہوا حاکم نے شرعی قوانین کے مطابق انہیں تقسیم کیا تو جس کے حصہ میں جو آیا حلال ہے اور اگر خود ہی ناجائز طور پر قبضہ کر لیا تو اس سے نفع حاصل کرنا منع ہے۔
- (۳) کسی شخص سے مال اس کی رضا مندی سے حاصل کیا تو حلال ہے اور جبری طور پر لے لیا چوری کر لیا یا کسی قسم کے فراڈ سے مال لے لیا تو حرام ہے۔
- (۴) اگر کسی سے مال خریدا یا کرایہ پر لیا تو اس میں شرعی حدود و قیود کا لحاظ پایا گیا تو جائز ہے اور اگر شریعت کے خلاف کوئی شرائط وغیرہ پائی گئیں تو ناجائز ہوگا۔
- (۵) اگر کسی نے مال ہبہ کیا یا وصیت کی تو اس میں بھی شرعی امور کا لحاظ رکھا گیا ہے تو درست ہے اور

شرعی امور کا لحاظ نہیں کیا گیا تو ناجائز ہے۔

(۶) وراثت کے طور پر مال ملا اور اپنا حق شرعی ہی لیا تو حلال ہے اور اگر شرعی حق سے تجاوز کر کے کسی

(ماخوذ از احیاء العلوم ج ۲ ص ۵۳، ۵۴)

کا حق غصب کیا تو حرام ہے۔

فضیلت حلال اور مذمت حرام بیان میں:

چند آیات کا پہلے ذکر کر دیا گیا ہے، اب چند احادیث و آثار کی طرف توجہ کی جائے۔

☆ ”روی ابن مسعود رضی اللہ عنہ عن النبی ﷺ انه قال طلب الحلال فريضة على كل مسلم“

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہر مسلمان پر حلال چیزوں کا طلب کرنا فرض ہے۔ دوسری حدیث میں فرمایا ”طلب العلم فريضة على كل مسلم“ ہر مسلمان پر علم کا طلب کرنا فرض ہے۔ لیکن اس علم سے مراد کون سا علم ہے؟ ”طلب علم الحلال والحرام“ حلال اور حرام کا علم طلب کرنا فرض ہے۔ گویا کہ دونوں حدیثوں کا مطلب ایک ہی ہے علم سے مراد دینی علم ہے جس سے حلال اور حرام میں تمیز حاصل ہوتی ہے۔ ایسا علم مراد نہیں جس سے رشوت اور لوٹ کھسوٹ اور ملک کی چلتی حکومت کو توڑ کر خود قابض ہو جانے اور ساری عسکر یہ کولوگوں کی نفرت کا نشانہ بنانے کا علم حاصل ہو۔

☆ ”وقال ﷺ من سعى على عياله من حله فهو كالمجاهد في سبيل الله ومن طلب الدنيا حلالا في عفاف كان في درجة الشهداء“

نبی کریم ﷺ نے فرمایا جو حلال مال کی طلب میں اہل و عیال کے لئے کوشش کرتا ہے وہ اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے کی طرح ہے اور جو پاک دامن رہتے ہوئے دنیا کا حلال مال طلب کرے وہ درجہ شہداء میں ہے۔

☆ ”وقال ﷺ من اكل الحلال اربعين يوما نور الله قلبه واجرى ينابيع الحكمة من قلبه على لسانه“

نبی کریم ﷺ نے فرمایا جس شخص نے چالیس دن رزق حلال کھایا اللہ تعالیٰ اس کے دل کو منور کر

دے گا اور اس کے دل سے اس کی زبان پر حکمت کے چشمے جاری کر دیتا ہے۔

☆ ”روی ان سعیدا سأل رسول الله ﷺ ان يسأل الله تعالى ان يجعله مجاب الدعوة فقال له اطب طعمتك تستجب دعوتك“

حضرت سعید رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں عرض کیا یا رسول اللہ آپ اللہ تعالیٰ سے میرے لئے سوال کریں کہ مجھے مستجاب الدعوات بنا دے (یعنی میری دعاؤں کو وہ قبول کرے) تو آپ نے فرمایا تم اپنا مال حلال اور پاکیزہ رکھو تو تمہاری دعاؤں کو قبول کیا جائے گا۔

☆ ”ولما ذكر الحريص على الدنيا قال رب اشعت اغبر مشردا في الاسفار مطعمه حرام وملبسه حرام وغذى بالحرام يرفع يديه فيقول يا رب يا رب فاني يستجاب لذلك“

جب نبی کریم ﷺ کے سامنے دنیا کے حریص کا ذکر کیا گیا تو آپ نے فرمایا کتنے پراگندہ حال اور غبار آلود اور سفر میں بغیر کسی مونس کے ہوتے ہیں طعام ان کا حرام ہوتا ہے اور لباس ان کا حرام ہوتا ہے اور غذا ان کی حرام ہوتی ہے وہ اپنے ہاتھوں کو اٹھاتا ہے عرض کرتا ہے اے میرے رب اے میرے رب تو اس کی دعا کیسے قبول کی جائے گی۔

مطلب یہ تھا کہ ایک شخص مسافر بھی ہوا کیلا ہو پریشان حال ہو پراگندہ حالت ہو، کپڑے غبار آلود ہوں یا سے شخص کی دعا زیادہ قبول ہوتی ہے لیکن شرط یہ ہے کہ اس کا رزق حلال ہو اگر رزق حرام ہو تو اس کی دعا کی قبولیت کی امید نہیں کی جاسکتی۔

☆ ”وقال ﷺ كل لحم بنت من حرام فالنار أولى به“

نبی کریم ﷺ نے فرمایا جس کے گوشت کی نشوونما حرام مال سے ہوئی آگ اسکے زیادہ قریب ہوگی۔

☆ ”وقال ﷺ من لم يبال من اين اكتسب المال لم يبال الله من اين ادخله بالنار“

نبی کریم ﷺ نے فرمایا جو شخص یہ پرواہ نہیں کرتا کہ اس کا مال کہاں سے آ رہا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی کوئی پرواہ نہیں کرتا کہ اسے کس جانب سے آگ میں داخل کرے۔ یعنی اس کے لئے جہنم کے دروازے ہر طرف سے کھلے ہوں گے جس طرف سے رب چاہے گا اسے آگ میں داخل کر دے گا۔

(از احیاء العلوم ج ۲ ص ۵۲)

بعض حضرات نے کسی ابدال کی خدمت میں طعام پیش کیا تو انہوں نے کھانے سے انکار کر دیا انہوں نے ابدال سے نہ کھانے کے متعلق سوال کیا تو اس نے کہا (ہم وہ کھانا نہیں کھاتے جس میں اشتباہ ہو کہ حرام ہے یا حلال):

”نحن لا ناكل الا فلذلك نستقيم قلوبنا ويدوم حالنا ونكاشف بالملكوت ونشاهد الآخرة ولو اكلنا ما ياكلون ثلاثة ايام لما رجعنا الى شئ من علم اليقين ولذهب الخوف والمشاهدة من قلوبنا“

ہم صرف حلال مال کھاتے ہیں (یعنی جس کے حلال ہونے کا یقین ہو) اسی وجہ سے ہمارے دل درست رہتے ہیں اور ہمارا حال ہمیشہ ایک طرح کا ہوتا ہے اور ملکوت کا ہمیں کشف حاصل ہوتا ہے اور آخرت کا ہم مشاہدہ کرتے ہیں اور اگر ہم تین دن وہ چیزیں کھائیں جو عام لوگ کھاتے ہیں (یعنی حلال و حرام کی تحقیق کے بغیر) تو ہم کبھی علم یقین کا درجہ نہیں پاسکتے اور ہمارے دل سے رب تعالیٰ کا خوف جاتا رہے گا اور ہمارے دلوں کا مشاہدہ زائل ہو جائے گا۔ (احیاء العلوم ج ۲ ص ۵۳)

وَتَذَلُّوا بِهَا إِلَى الْحُكَّامِ : ”اور نہ پیش کرو ان کو حاکموں کی طرف“

”ادلاء“ کا معنی ہے ڈول ڈالنا کہ پانی حاصل کرے پھر کسی کی طرف بات پیش کرنا اور فعل پیش کرنا بھی اس کا معنی لیا جاتا ہے اسی طرح کہا جاتا ہے ”ادلی بحجته“ اس نے اپنی دلیل پیش کی ﴿وَتَذَلُّوا بِهَا﴾ کا عطف منہی عنہ پر ہے اور معطوف علیہ سے پہلے جو ”لا“ ہے وہ معطوف سے پہلے بھی مراد ہوگا۔ اب تقدیر عبارت یہ ہوگی:

﴿وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَلَا تَذَلُّوا بِهَا إِلَى الْحُكَّامِ﴾

”اور تم آپس میں ایک دوسرے کے مال ناحق نہ کھاؤ اور نہ پیش کرو ان کو حکام کی طرف“

”بہا“ ضمیر کا مرجع کیا ہے؟ اسی میں دو احتمال ہیں (بہا) ای بحکومتها او بالاموال رشوة“ ایک احتمال یہ ہے کہ حکام سے حکومت جو سمجھ آ رہا ہے وہ مرجع ہو تو اب معنی یہ ہوگا کہ اپنے مقدمات حاکموں کے پاس اس لئے نہ لے جاؤ کہ (ان سے غلط فیصلے کرا کے) لوگوں کا مال گناہ سے کھا لو۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ ضمیر کا مرجع ”اموال“ ہو اب معنی یہ ہوگا کہ حاکموں کے پاس اپنے مال بطور رشوت نہ پیش کرو کہ ان کے ذریعے لوگوں کا مال گناہ سے کھاؤ۔ (جلالین)

خیال رہے اعلیٰ حضرت کا ترجمہ پہلے احتمال کے مطابق ہے اور راقم کا ترجمہ مطلق ہے تاکہ عموم المجاز کے مطابق دونوں احتمالات کو شامل ہو جائے۔ یعنی مطلب جب یہ ہو کہ ان کو حاکموں کی طرف باطل طریقہ سے نہ پیش کر دخواہ وہ باطل مقدمات ہوں یا رشوت کے طور پر دیا ہو باطل مال ہو۔

سبحان اللہ راقم نے اپنا موقف پیش کرنے کے بعد تفسیر کبیر کو دیکھا تو اپنے قول کے مطابق پا کر رب تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ اس نے مجھے صحیح سمجھنے کی توفیق عطا کی۔ آپ پہلے تو یہ بیان کرتے ہیں:

”هو ان يدفع الى الحكام رشوة وهذا اقرب الى الظاهر“

حاکموں کو رشوت کے طور پر مال دینے سے منع کیا گیا ہے اور یہ قول مراد لینا زیادہ بہتر ہے۔ اس کے بعد آپ فرماتے ہیں:

”ولا يعد ايضا حمل اللفظ على الكل لانها باسرها اكل بالباطل“

یہ کوئی بعید بات نہیں کہ مفسرین کے تمام اقوال ہی مراد ہوں حکام کے پاس باطل طریقہ سے کسی چیز کو پیش کر کے لوگوں کا مال ناحق کھانا منع ہے۔

فائدہ: رشوت پیش کرنے کی ممانعت کو ڈول ڈالنے سے تشبیہ اس لئے دی گئی کی رشوة اور رشاء کا مادہ ایک ہی ہے رشاء کا معنی ہے رسہ۔ جس طرح بھرا ہوا ڈول دور سے یعنی کنوئیں کی نیچے جانب سے رسے کے واسطے سے قریب لایا جاتا ہے کہ اسے کنوئیں کی اوپر جانب کی طرف لایا جاتا ہے۔ ایسے ہی رشوت کے ذریعے دور والے مقصد کو قریب کیا جاتا ہے۔

دوسری وجہ تشبیہ کی یہ ہے کہ جس طرح ڈول ڈال کر پانی حاصل کر لیا جاتا ہے یہ نہیں دیکھا جاتا کہ کنوئیں والا پانی لینے سے ناراض تو نہیں یہ نہیں دیکھا جاتا کہ کنواں پاک ہے یا ناپاک اسی طرح رشوت لینے والا حاکم یہ نہیں دیکھتا کہ میں فیصلہ حق کے مطابق کر رہا ہوں یا ناحق فیصلہ کر رہا ہوں۔ اس نے تو رشوت دینے والے کے حق میں فیصلہ کرنا ہی ہے۔

(ماخوذ از کبیر)

لِتَأْكُلُوا فَرِيقًا مِّنْ أَمْوَالِ النَّاسِ بِالْإِثْمِ : ”کہ کھاؤ تم مال لوگوں کے مالوں میں سے ناجائز طور پر“ ”فریقاً“ کا اکثر مفسرین نے ”طائفہ“ سے ترجمہ کیا ہے (کچھ مال) اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا بھی یہی ترجمہ ہے لیکن تفسیر تبصیر الرحمن میں علامہ علی بن احمد بن ابراہیم بن اسماعیل رحمہم اللہ بیان

فرماتے ہیں (فریقا) ای طائفہ عظیمہ ”حاکموں کے پاس باطل طریقہ سے مقدمات نہ لے جاؤ یا ان کو رشوت دے کر اپنے حق میں باطل فیصلہ اس لئے نہ کراؤ کہ لوگوں کا بہت بڑا مال ناجائز طریقہ سے کھا لو۔

روح المعانی میں علامہ ابوالفضل شہاب الدین السید محمود آلوسی بغدادی فرماتے ہیں (فریقا) قطعہ او جملہ ”(کچھ مال یا کل مال) تمام تفاسیر کے مجموعہ سے نتیجہ یہ نکلا کہ لوگوں کا کل مال یا زیادہ مال یا کچھ مال غلط مقدمات کے ذریعے یا رشوت کا مال دے کر کھانا حرام ہے اسی لئے راقم نے ترجمہ میں ”کچھ“ کا لفظ نہیں شامل کیا ”بالاثم“ (گناہ کے ذریعے، ناجائز طریقہ سے) یعنی جھوٹے گواہ پیش کر کے، جھوٹی قسمیں اٹھا کر، جان بوجھ کر ناجائز مقدمات پیش کر کے، رشوت کا مال دے کر اپنے حق میں مقدمات کا فیصلہ کرنا گناہ کا سبب ہے ایسے ناجائز طریقہ سے مال حاصل کرنے سے اجتناب کا حکم دیا **وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ**: ”حالانکہ تم جانتے ہو“ ”جملہ حالۃ من فاعل تا کلوا“ یہ جملہ اسمیہ ”تا کلوا“ کے فاعل سے حال واقع ہو رہا ہے۔

(صادی)

ایسے حال میں کہ تم جانتے ہو کہ تم باطل طریقہ پر ہو:

”ولا شک ان الاقدام علی القبیح مع العلم بقبح اقبح وصاحبہ

بالتوبیخ احق“

اسمیں کوئی شک نہیں کہ بیشک برے کام کا علم رکھنے والے کا اقدام اس برائی کی طرف زیادہ برا ہے اور صاحب علم کا برائی کا ارتکاب تو بخ (زجر، ڈانٹ) کا زیادہ حق رکھتا ہے۔

☆ ”روی عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ انه قال اختصم رجلان الی النبی ﷺ عالم بالخصومة وجاہل بہا فقضى رسول اللہ ﷺ للعالم فقال من قضی علیہ یا رسول اللہ والذی لا الہ الا هو انی محق فقال ان شئت اعاودہ فعاودہ فقضى للعالم فقال المقضى علیہ مثل ما قال اولائم عاودہ ثالثا، ثم قال علیہ الصلوۃ والسلام ”من اقتطع حق امری مسلم بخصومته فانما اقتطع قطعۃ من النار“ فقال العالم المقضى له ”یا رسول اللہ ان الحق حقہ“ فقال علیہ الصلوۃ والسلام، من اقتطع بخصومته وجد له حق غیر فلیتبوا مقعده من النار“

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک دو شخصوں نے نبی کریم ﷺ کے پاس اپنا جھگڑا لایا۔ ایک شخص مقدمہ لڑنے کا طریقہ جانتا اور دوسرا نہیں جانتا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے فیصلہ اس شخص کے حق میں کر دیا جو مقدمہ کا علم رکھتا تھا جس کے خلاف فیصلہ ہوا اس نے عرض کیا قسم ہے اس ذات کی جس کے بغیر کوئی معبود نہیں میں حق پر ہوں تو حضور ﷺ نے اسے پھر مقدمہ لوٹانے کی اجازت دی اس شخص نے مقدمہ لوٹا یا لیکن پھر فیصلہ اسی کے حق میں ہو گیا جو مقدمہ کا طریقہ جانتا تھا۔ جس کے خلاف فیصلہ ہوا اس نے پھر کہا قسم ہے اس ذات کی جس کے بغیر کوئی معبود نہیں بیشک میں حق پر ہوں۔ (آپ نے اسے پھر مقدمہ لوٹانے کی اجازت دے دی) اس نے پھر مقدمہ لوٹا یا تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا جو شخص جھگڑا کر کے (اپنا مقدمہ چرب زبانی سے پیش کر کے جھوٹے گواہ پیش کر کے، جھوٹی قسم کے ذریعے) اپنے مسلمان بھائی کا حق لے لیا تو اس نے اپنے لئے آگ کا ٹکڑا کاٹ کر رکھ لیا۔ (یہ سن کر) وہ شخص جو مقدمہ کرنے کا علم رکھتا تھا جس کے حق میں فیصلہ ہو چکا تھا (اس کے دل میں خوف طاری ہو گیا) کہنے لگا یا رسول اللہ بیشک یہ اسی کا حق ہے پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے دوسرے کا حق جھگڑا کر کے حاصل کر لیا اس نے اپنا ٹھکانا جہنم بنا لیا۔

امام اعظم رحمہ اللہ کے تقویٰ کی شاندار مثال:

امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے کسی مجوسی سے قرض لینا تھا آپ قرض کا مطالبہ کرنے کے لئے اس کے دروازے پر تشریف لے گئے جب آپ اس کے دروازے پر پہنچے آپ کا جوتا نجاست (گوبر وغیرہ) پر واقع ہو گیا تو آپ نے اپنے جوتے کو جھاڑا، جوتے سے نجاست گر کر مجوسی کی دیوار پر پڑ گئی تو امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ حیران ہو گئے اور دل ہی دل میں یہ کہہ رہے ہیں:

”ان ترکھا کان ذلک شینا یقبح جدار ذلک المجوسی وان حککتھا احضر التراب“
اگر یہ نجاست دیوار پر ہی رہنے دیتا ہوں تو دیوار اس مجوسی کی قبیح (بدزیب) نظر آئے گی اور اگر میں اسے کھرچتا ہوں تو اس کی مٹی بھی ساتھ کھرچی جائے گی (مٹی کے کھرچے جانے سے دیوار کا نقصان ہوگا) آپ نے دروازہ کھٹکھٹایا اندر سے ایک غلامہ باہر آئی آپ نے اسے کہا اپنے مولیٰ سے جا کر کہو کہ ابو حنیفہ دروازہ پر ہے وہ مجوسی باہر نکلا اس نے گمان کیا کہ آپ قرض کا مطالبہ کریں گے تو اس

نے پہلے ہی عذر پیش کرنا شروع کر دیا تو امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اب تو میں ایک عذر پیش کرنے کا زیادہ حقدار ہوں۔ پھر آپ نے دیوار پر نجاست لگنے کا واقع بیان کیا اور پوچھا ”وانہ کیف السبیل الی التطہیر“ اب اس کو پاک کرنے کا کیا طریقہ ہے (یعنی تمہاری اجازت ہو تو مٹی کھرچ دوں) ”فقال المجوسی فانا ابدأ بتطہیر نفسی فاسلم فی الحال“ مجوسی نے حضرت امام اعظم رحمہ اللہ کے تقویٰ کو دیکھ کر کہا میں پہلے اپنے نفس کو پاکیزہ کر لوں تو اسی وقت اس نے اسلام قبول کر لیا۔

اس واقعہ سے مطلب یہ حاصل ہوا کہ جب لوگوں کا ناحق مال کھانا ظلم ہے تو یقیناً ظلم میں واقع ہونا باعث نقصان اور باعث ذلت ہے اور ”فمن احترز عن الظلم نال سعادة الدارين“ جو شخص ظلم سے بچ گیا اس نے دونوں جہانوں کی سعادت کو حاصل کر لیا یہی وجہ ہے:

”ان ابا حنيفة لما احترز عن ظلم ذلك المجوسی فی ذلك القدر القليل فلاجل بركة ذلك اسلم المجوسی ونجا من شقاوة الابد“

کہ بیشک امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے جب مجوسی پر معمولی ظلم کرنے سے اجتناب کیا اور اس کے معذرت طلب کی تو وہ اس کی برکت کی وجہ سے اسلام لے آیا اور ہمیشہ کی بدبختی سے نجات حاصل کر گیا۔

(از روح البیان)

تنبیہ: دنیا میں تین قسم کی چیزیں پائی جاتی ہیں حلال، حرام، شبہ۔

”فالحرام یوجب العقاب“ حرام اشیاء کی وجہ سے رب تعالیٰ کی طرف سے عذاب ہوگا یعنی شدید مؤاخذہ ہوگا ”والشبهة توجب العتاب“ اور شبہات کی وجہ سے عتاب ثابت ہوگا یعنی ڈانٹ ڈپٹ، زجر و توبیخ ہوگی۔ (شبہات وہ چیزیں ہوں گی جن میں واضح طور پر حلت و حرمت کی کوئی دلیل تو نہیں ہوگی البتہ ان میں شک پایا جائے کہ ہو سکتا ہے کہ یہ ناجائز ہو ورنہ جس میں شک نہیں اور شریعت میں ان کو منع بھی نہیں کیا گیا وہ اشیاء مباح ہیں۔

”والحلال یوجب الحساب“ اور حلال اشیاء کا بھی حساب ہوگا یعنی ضرورت سے زائد

بے جا استعمال سے گریز کیا جائے۔ حکیم سنائی نے کیا خوب کہا:

این جہاں بر مثال مردا است گر گساں اندروں ہزار ہزار
یہ جہاں (دنیا) مردار کی طرح ہے اس میں ہزاروں گدھیں پائی جاتی ہیں

ایں مرآن رابمی زند فحلب وآن مرایں رابمی زند متقار
کوئی ادھر سے اسے پنچے مار رہی ہے اور کوئی ادھر سے اسے چونچ مار رہی ہے
آخر الامر بگذر ندبمہ وزبمہ باز ماند ایں مردار
آخر کار سب گزر جائیں گے اور یہ مردار سب سے باقی رہ جائے گا۔

یعنی دینا دار گدھوں کی طرح دنیا کے مال و دولت پر چھٹیں گے جو مردار کی طرح ہے۔ کوئی ادھر
سے مال بٹورنے کی طرف ہاتھ پاؤں مارے گا کوئی ادھر سے تگ و دو کرے گا۔ حلال و حرام کی پرواہ
نہیں کریں گے صرف مال حاصل کرنا ان کا و طیرہ ہوگا۔ لیکن یہ دنیا یہیں رہ جائے گی لوگ دنیا سے چلے
جائیں گے اس لئے ”فعلى العاقل ان يجتنب عن حقوق العباد والمظالم“ عقل
مند آدمی پر لازم ہے کہ وہ حقوق العباد کا خیال کرے لوگوں کے حقوق نہ دبائے اور لوگوں پر ظلم
کرنے سے اجتناب کرے۔

حکایت : نوشیرواں نے وصیت کی کہ جب میں مر جاؤں تو میرے تابوت کو میری مملکت کے مختلف
اطراف میں پھیرا جائے اور اعلان کیا جائے کسی شخص کا کوئی حق بادشاہ پر ہو تو وہ آجائے اور اس کا وہ حق
ادا کیا جائے۔ بادشاہ کی وصیت کے مطابق ایسا ہی کیا گیا لیکن کسی شخص نے آ کر ایک درہم کا سوال بھی
نہ کیا یہی وجہ ہے کہ نوشیرواں کے عدل و انصاف کی وجہ سے اس کا نام آج تک زندہ ہے۔

حکایت : ایک نصرانی (عیسائی) اپنی زوجہ کو گدھے پر سوار کر کے کہیں جا رہا تھا اس کا گزر مسلمانوں کی
ایک بستی سے ہوا تو ایک نشہ میں مست شخص نے اس کے گدھے کی دم کو نیچے سے کاٹ دیا گدھا درد کے
مارے اضطراب میں آ گیا گدھے کی چھلانگ سے عورت گر گئی اس کا ہاتھ ٹوٹ گیا اور اس کا حمل گر گیا۔

وہ عیسائی اس بستی کے قاضی کے پاس گیا قاضی نے اس نشئی کو بلایا اور کہا ابھی گدھا تم اپنے پاس
رکھ لو جب گدھے کی دم آگ آئے (صحیح ہو جائے) تو پھر اس کو گدھا واپس کر دینا۔ اور اسکی عورت کو بھی
اپنے پاس رکھ لے جب یہ پھر حاملہ ہو جائے اور اس کا ہاتھ درست ہو جائے تو اسکی عورت واپس کر دینا۔
نصرانی نے کہا ”اھکذا حکم شریعتکم“ کیا تمہاری شریعت کا یہی حکم ہے؟ پھر اس نے
سر آسمانوں کی طرف اٹھایا اور کہا:

”الہی انت حلیم ولا صبر لی علی هذا فاحکم یا ناظر الملهوفین

ویاناصر المظلومین فمسخ اللہ ذلک القاضی فصار حجرا من ساعته“

اے اللہ تو حلیم ہے مجھے اس پر صبر حاصل نہیں اے اللہ تو ہی فیصلہ فرما۔ اے مظلوموں پر نظر رحمت فرمانے والے اور اے مظلوموں کی امداد کرنے والے تو بہتر فیصلہ فرما دے تو اللہ تعالیٰ نے اس قاضی کو پتھر بنا دیا۔ اس واقعہ سے دو فائدے حاصل ہوئے ”الاول ان هذا القاضی بظلمہ وقع فیما وقع من البلاء العظیم“ پہلا فائدہ یہ حاصل ہوا کہ قاضی ظلم کی وجہ سے بہت بڑی مصیبت میں گرفتار ہوا۔ (ظالموں کا انجام یہی ہوتا ہے لیکن افسوس کہ ظالموں کو بروقت عقل نہیں آتی ساتھ ساتھ یہ بھی پتہ چلا کہ شریعت کے احکام سے عدولی کر کے اپنی مرضی کے فیصلے کرنے والے ملک و ملت کے لئے باعث ننگ و عار (شرم و حیا کا سبب) ہیں ایسے قاضی ملک کو برباد کرتے ہیں۔

اور دوسرا فائدہ یہ حاصل ہوا ”یجب الاحتراز عن الظلم وان کان الظالم“ ظلم سے اجتناب ضروری ہے کسی کافر پر بھی ظلم نہ کیا جائے، مظلوم کی آہ سے عرش الہی کا بنتا ہے مظلوم کی دعا قبول ہوتی ظالم اپنے انجام کو پہنچتا ہے اگرچہ اس میں دیر ہی کیوں نہ ہو۔

آیہ کریمہ میں لطیف اشارہ:

مال انسان کی مصلحت کے لئے پیدا کیا گیا ہے کہ انسان اس سے اپنے بدن کو درست کر سکے۔ اور نفس کو اس لئے پیدا کیا گیا کہ وہ حق عبودیت ادا کر سکے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ﴾

”اور نہیں پیدا کیا میں نے جنوں اور انسانوں کو مگر یہ کہ میری عبادت کریں“

﴿لِيَعْلَمُوا أَنَّ الْاَمْوَالَ وَالْاَنْفُسَ لِلّٰهِ فَلَا يَتَصَرَّفُونَ فِيْهِمَا اِلَّا بِاَمْرِ اللّٰهِ﴾

”ہر انسان کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ بیشک اس کا مال اور اس کی جان اللہ تعالیٰ کے لئے ہے اس

لئے وہ مال اور جان میں اللہ کے امر کے خلاف کوئی تصرف نہ کریں۔“ (ازروح البیان)

☆☆☆☆☆

يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْاَهْلَةِ قُلْ هِيَ مَوَاقِيتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ
وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ ظُهُورِهَا وَلَكِنَّ الْبِرَّ مَنْ
اتَّقَى وَاتَّقُوا الْبُيُوتَ مِنْ اَبْوَابِهَا وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ

(۱) ”تم سے نئے چاند کو پوچھتے ہیں تم فرما دو وہ وقت کی علامتیں ہیں لوگوں اور حج کے لئے اور یہ کچھ بھلائی نہیں کہ گھروں میں پچھیت توڑ کر آؤ ہاں بھلائی تو پرہیزگاری ہے اور گھروں میں دروازوں سے آؤ اور اللہ سے ڈرتے رہو اس امید پر کہ فلاح پاؤ۔“

(۲) ”سوال کرتے ہیں آپ سے چاند کی حالتوں کا، فرما دیجئے وہ وقت کی علامتیں ہیں لوگوں اور حج کے لئے اور یہ نہیں ہے نیکی کہ تم آؤ گھروں کو ان کی پچھلی جانب سے اور لیکن نیکی تو اسے حاصل ہے جس شخص نے تقویٰ اختیار کیا، اور گھروں میں آؤ ان کے دروازوں سے اور ڈرو اللہ سے تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ۔“

شان نزول:

(۱) حضرت معاذ بن جبل اور ثعلبہ بن غنم نے سوال کیا کہ کیا وجہ ہے چاند شروع میں دھاگے کی طرح باریک ہوتا ہے پھر زیادہ ہوتا ہے یعنی آہستہ آہستہ بڑھتا رہتا ہے یہاں تک کہ مکمل ہو جاتا ہے پھر آہستہ آہستہ کم ہونا شروع ہوتا ہے یہاں تک کہ اپنی پہلی حالت کی طرف لوٹ آتا ہے اس میں حکمت کیا ہے۔

(تفسیر ابی السعود)

”وقال الربيع بلغنا انهم قالوا يا رسول الله لم خلقت الالهة فانزل الله ،

يسئلونك عن الالهة الخ“

(۲) ربیع فرماتے ہیں کہ ہمیں یہ خبر ملی ہے کہ صحابہ کرام نے پوچھا یا رسول اللہ چاند کو کیوں پیدا کیا گیا تو اس کے جواب میں یہ آیت کریمہ نازل کی گئی۔

(صابونی)

ہلال کو ہلال کہنے کی وجہ:

ہلال کا معنی ہے آواز بلند کرنا، پیدائش کے بعد بچے کے رونے کو بھی استہلال کہا جاتا ہے:

الشهر هلالاً وكذلك ليلتين من آخر الشهر“ (كبير)

”وهو اول حال القمر حين يراه الناس اول ليلة من الشهر“

”لم تبدو دقيقة ثم تزيد حتى تمتلئ نوراً ثم تعود كما بدت ولا تكون على حالة واحدة كالشمس“

”وان كانت في الظاهر سؤالا عن التعدد الا انها في الحقيقة متضمنة للسؤال عن اختلاف التشكلات النورية لان التعدد يتبع اختلافها اذ لو كان الهلال على شكل واحد لا يحصل التعدد كما لا يخفى“

مسودة بقرة

تنبیہ : صحابہ کرام کے سوال میں دو احتمال ہیں:

”والسؤال یحتمل ان یکون عن الغایة والحکمة وان یکون عن

السبب والعلّة“

ایک احتمال یہ ہے کہ ان کے سوال کا مقصد یہ تھا کہ یہ بتایا جائے کہ چاند کی حالتوں کے بدلنے میں حکمت کیا ہے اور اس کا مقصد کیا ہے؟ دوسرا احتمال یہ ہے کہ سوال ہو سبب اور علت کے متعلق کہ چاند کے گھٹنے اور بڑھنے کی وجہ اور سبب کیا ہے ”ولا نص فی الآیة والخبر علی احدهما“ قرآن پاک اور حدیث پاک میں کسی احتمال پر کوئی نص موجود نہیں۔ ظاہر یہی ہے کہ سوال حکمت کے متعلق ہی تھا اسی احتمال کو ابوالسعود رحمہ اللہ نے بھی ترجیح دی ہے اور جواب ”قل ہی مواقیت للناس والحج“ بھی اس پر دلالت کرتا ہے کیونکہ علامہ آلوسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ رب تعالیٰ کا ارشاد ﴿قُلْ هِيَ مَوَاقِیتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ﴾ اسی احتمال کے مطابق بظاہر نظر آتا ہے کہ حکمت بیان کی گئی ہے کہ چاند کی حالتوں کے بدلنے میں مقصد یہ ہے ”وہی ان یکون معالم للناس یوقتون بها“ کہ یہ لوگوں کے لئے وقت علامتیں ہیں کہ وہ اپنے دنیاوی امور کے لئے وقت مقرر کر سکیں اور اپنی کھیتی باڑی اور تجارت اور عبادات مقررہ کے اوقات کی علامتیں مقرر کر سکیں مثلاً روزوں کی تاریخوں اور افطار کی تاریخوں کا تعین کر سکیں اور خصوصاً حج کے وقت کی علامتیں ہیں اگر چاند ایک ہی حالت میں رہتا تو یہ فوائد حاصل نہ ہوتے۔

اگر دوسرا احتمال مراد ہو تو جواب پھر بھی حکمت کے بیان کا دیا گیا ہے اور اس پر متنبہ کیا گیا ہے کہ سوال حکمت کے متعلق ہونا چاہیے نہ کہ اسباب کے متعلق کیونکہ چاند کی تبدیلی کے اسباب کا تعلق ان کی زندگی سے متعلق نہیں نہ ہی دنیاوی زندگی اور نہ ہی اخروی زندگی سے اس کا تعلق ہے۔ اور نبی کریم ﷺ کو بھی اس لئے مبعوث کیا گیا ہے کہ آپ لوگوں کے سامنے وہ مسائل ذکر فرمائیں جو ان کے لئے دنیا اور آخرت میں نفع مند ہوں آپ کو علم ہیئت کے مسائل بیان کرنے کے لئے مبعوث نہیں کیا گیا۔ چاند کی حالتوں کی تبدیلی کی حکمت بیان کرنے کی یہی وجہ ہے:

”لا لان الصحابة رضی اللہ عنہم لیسوا ممن یطلع علی دقائق علم

الهيئة الموقوفة على الارصاد والادلة الفلسفية كما وهم

اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس لئے علم ہیئت کا مسئلہ نہیں بیان کیا گیا کہ فلسفہ والوں کے دلائل پر جو علم ہیئت موقوف ہے صحابہ کرام اسے سمجھ نہیں سکتے تھے یہ گمان جن لوگوں نے کیا ان کا گمان باطل ہے کیونکہ صحابہ کرام:

”اولئك المشاؤون في ركاب النبوة والمرتاضون في رواق الفتوة
والفائزون باشراف الانوار والمطلعون بارصاد قلوبهم على دقائق
الاسرار“

تو وہ ہستیاں جن کو نبی کریم ﷺ کے ہر کاب ہو کر چلنے کے مواقع میسر ہوئے صحابہ کرام تو وہ ہیں جن کو مصطفیٰ کریم ﷺ کے کرم کے باغ سے پھول اور کلیاں حاصل کرنے کا مقام ملا وہ تو حضور ﷺ کی نورانیت سے منور ہو کر کامل طور پر کامیاب ہوئے وہ تو اسرار کے باریک نکات پر مطلع ہوئے جس کی وجہ سے ہر مشکل مسئلہ ان کے دلوں میں جا گزیں ہوگا۔

اس شان کے لائق حضرات کے متعلق یہ تو تصور بھی نہیں کیا جاسکتا کہ وہ علم ہیئت کے مسائل کو سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتے تھے۔ البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کو چاند کی حالتوں کے بدلنے کے متعلق غرض و غایت کو بتا دیا گیا کہ اسی پر لوگوں کے اوقات مقرر کرنے کی دار و مدار ہے اور علم ہیئت کا مسئلہ نہ بیان کر کے اس طرف اشارہ کیا گیا:

”ان سبب الاختلاف ما بين في علم الهيئة من بعد القمر عن الشمس
وقربه اليها وهو باطل عند اهل الشريعة فانه مبني على امور لم يثبت
جزما شئ منها“

کہ علم ہیئت میں چاند کے زیادہ روشن ہونے یا کم روشن ہونے کا دار و مدار جو سورج کے قریب ہونے اور دور ہونے پر رکھی گئی ہے اس کا اعتبار شریعت میں نہیں کیونکہ وہ جن امور اور دلائل پر موقوف ہے وہ کوئی یقینی نہیں بلکہ محض خیالی ہیں۔ اور یہ بھی خیال رہے کہ فلاسفہ کا خود بہت مسائل میں اختلاف ہے کسی نے کہا سورج اور زمین مرکز ہیں اور ستارے ان کے ارد گرد گھومتے ہیں کسی نے کہا زمین چلتی ہے کسی نے کہا آسمان چلتا ہے کسی نے کہا تمام سیارے چلتے ہیں یعنی سورج بھی چلتا ہے۔ اس شدید

اختلاف کو مد نظر رکھتے ہوئے یہی کہا جاسکتا ہے کہ جس علم کی تھیوریاں، قوانین بدلتے رہیں وہ علم معتبر نہیں۔ معتبر قرآن و حدیث کے علوم ہیں جن کے قوانین ”الیوم اکملت لکم دینکم“ کے نزول کے بعد بدلنے کا تصور ختم ہو گیا تا قیامت وہی قوانین رہیں گے۔

ہاں البتہ فلاسفہ کے وہ قوانین اور مسائل جو شریعت سے نہ ٹکرائیں ان سے فوائد حاصل کئے جاسکتے ہیں۔ (ماخوذ از روح المعانی)

الْمَوَاقِیْتُ : جمع ہے ”مِیقات“ کی جو آلہ کا صیغہ ہے معنی یہ ہوا ”ما یعرف بہ الوقت“ جس کے ذریعے وقت کو پہچانا جائے ”وہی ان یکون معالم للناس یوقتون بہا امورہم“ یہ لوگوں کے لئے علامتیں ہیں جن کے ذریعے وہ اپنے امور کے وقت مقرر کرتے ہیں۔ (از روح المعانی)

روح المعانی کی اس وضاحت کے بعد اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کے ترجمہ کو دیکھا جائے تو کیا خوب نظر آئے گا ”وہ وقت کی علامتیں ہیں“ راقم نے بھی اسی خوب ترجمہ کو نقل کیا ہے۔

وقت و مدت و زمان میں فرق : علامہ راغب اصفہانی کے کلام سے ان میں یہ فرق نظر آتا ہے۔
مدت : مطلقاً حرکت فلک کے امتداد کا نام ہے جو مبدأ سے منتہاء تک ہے یعنی آسمان (یا زمین کی حرکت جو ابتدا سے انتہاء تک ہوتی ہے اسی سے ظاہر ہونے والے وقت کو مدت کہا جاتا ہے۔

زمان : اس وقت اور مدت کو کہا جائے گا جس کی تقسیم سالوں اور مہینوں اور دنوں اور ساعات کی طرف کی جائے۔

وقت : معین اور مقدر زمانہ کو کہا جاتا ہے یہ کام اتنے وقت میں کر دوں گا یعنی آٹھ دنوں میں مثلاً (از روح المعانی)

وَالْحَجَّ : کا عطف ”لِلنَّاسِ“ پر ہے اب معنی یہ ہوا کہ وہ وقت کی علامتیں ہیں لوگوں کے لئے اور حج کے لئے ”اگرچہ“ ”لِلنَّاسِ“ میں لوگوں کی تمام عبادات کے اوقات کا ذکر ہو چکا ہے لیکن ”وَالْحَجَّ“ کو علیحدہ ذکر کرنے کا مقصد یہ ہے۔

”ان الحج مقصور علی الاشهر التی عینہا اللہ تعالیٰ لفرضہ وانہ لا یجوز نقل الحج من تلک الاشهر الی اشهر کما کانت العرب تفعل ذلک فی النسبی“

کہ حج ان مہینوں میں ہوگا جو اللہ تعالیٰ نے حج کے لئے معین کئے ہیں یہ جائز نہیں کہ اپنی مرضی سے حج کے مہینے کو اپنی جگہ سے ہٹا کر ہمیشہ حج موسم بہار میں کیا جائے عرب حج کے مہینے کو اپنی جگہ سے ہٹا دیتے تھے۔ مکمل تفصیل ﴿ إِنَّمَا النَّسِيءُ زِيَادَةٌ فِي الْكُفْرِ ﴾ میں انشاء اللہ آئے گی۔
گزشتہ سے پیوستہ:

صحابہ کرام کے علم ہیئت کے حصول پر شاندار دلیل کی طرف توجہ فرمائیں:

”واخرج الطستى عن ابن عباس ان نافع بن الارزق قاله له اخبرنى عن

قوله موافقت للناس قال عدة نساہم ومحل دينہم وشروط الناس قال

وهل تعرف قال ذلك نعم اما سمعت قول الشاعر وهو يقول:

والشمس تجرى على وقت مسخرة اذا قصت سفرا استقبلت سفرا

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نافع بن ازرق نے پوچھا کہ ﴿ قُلْ هِيَ مَوَاقِيتُ

لِلنَّاسِ ﴾ کا کیا مطلب ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ چاند کی حالتوں کے بدلنے کا یہ مطلب ہے کہ وہ اپنی

عورتوں کی عدت کے دن پہچان لیں اور اپنے قرض وغیرہ کی ادائیگی کی تاریخوں کا تعین کر لیں اور لوگوں

سے جو عہد و پیمان وغیرہ باندھ رکھے ہوں ان کی تاریخوں کا تعین کر لیں۔ نافع بن ازرق نے پوچھا کیا

چاند کی حالتوں کی تبدیلی کی باریکیوں کو عرب حضرات جانتے ہیں۔ آپ نے فرمایا ہاں تم نے ایک شاعر

کے شعر کو نہیں دیکھا جس نے یہ کہا ہے۔ سورج حکم کا پابند ہو کر ایک وقت پر چلتا ہے جب اس کا ایک سفر

ختم ہوتا ہے تو دوسرا سفر اس کا شروع ہوتا ہے۔

☆ ”واخرج الحاکم وصححه والبيهقي في سننه عن ابن عمر قال قال رسول

الله ﷺ جعل الله الاهلة موافقت للناس فصوموا لرؤيته وافطروا لرؤيته فان غم عليكم

فعدوا ثلاثين يوما“

حاکم نے حدیث بیان کی جسے صحیح کہا اور بیہقی نے اپنی سنن میں حدیث ذکر کی کہ حضرت ابن عمر

رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے چاند کو مختلف حالتوں میں تبدیل کر کے

لوگوں کے لئے وقت کی علامتیں بنایا اس لئے تم چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور چاند دیکھ کر روزہ افطار کرو اگر

بادل چھ جائیں تو تیس دن مکمل کرو۔

☆ ”واخرج احمد والطبرانی وابن عدی والدارقطنی بسند ضعيف عن طلق بن
علي قال قال رسول الله ﷺ جعل الله الاهلة مواقيت للناس فاذا رايتم الهلال
فصوموا واذا رأيتموه فافطروا فان غم عليكم فاكموا العدة ثلاثين“

طلق بن علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے چاند کی حالتوں میں
تبدیلی کر کے لوگوں کے لئے وقت کی علامتیں بنایا ہے جب تم چاند دیکھو تو روزہ رکھو اور جب تم چاند
دیکھو تو افطار کرو اگر چاند بادل میں آجائے تو تیس دن مکمل کرو۔ (درمنثور)

رویت ہلال سے متعلق چند مسائل:

رویت ہلال کمیٹی کا اعلان چاند کے ثبوت کے لئے معتبر ہے کیونکہ ایک مرکزی رویت ہلال کمیٹی
ہے اور چند ذیلی کمیٹیاں ہیں جن میں علماء کرام کو نمائندگی حاصل ہے وہ شرعی طور پر شہادتوں پر وثوق کر
کے اعلان کرتے ہیں اس لئے ان کا اعلان معتبر ہوتا ہے، کیونکہ البحر الرائق وغیرہ میں ہے کہ اگر چاند
دیکھ کر حاکم نقارہ بجوادے، ڈھنڈورا پیٹ دے تو پوپ کا فائر کر دے، آگ جلا دے جس سے لوگوں کو
معلوم ہو جائے کہ یہ چاند کا اعلان کیا جا رہا ہے تو اس سے روزہ رکھنا اور عید کرنا جائز ہے۔ تو یقیناً ریڈیو کی
خبر سے بھی چاند کا ثبوت یقینی طور پر صحیح ہوگا۔ اگر کوئی شخص اس مسئلہ میں تفصیل طلب کرنا چاہے تو فتاویٰ
نوریہ کی جلد ۲ کا مطالعہ کرے۔

مسئلہ: اگر ایک شخص جدہ سے عید کا چاند دیکھ کر آئے لیکن پاکستان میں چاند نظر نہیں آیا عید نہیں
بلکہ روزہ ہے تو وہ شخص بھی روزہ رکھے گا اگرچہ اس کے روزے تیس مکمل ہی کیوں نہ ہو چکے ہوں اس لئے
فقہاء کرام نے بیان کیا ہے:

”ان المنفرد برؤية هلال رمضان اذا صام واكمل ثلاثين يوما لم يفطر

الامع الامام“ (تبیین الحقائق، البحر الرائق)

اگر کسی شخص نے رمضان کا چاند اکیلے دیکھا لیکن اس کے قول پر اعتبار نہ کرتے ہوئے حاکم نے
رمضان کا روزہ رکھنے کا حکم دیا تو وہ خود اکیلا ہی روزہ رکھے۔ اب اس شخص کے تیس روزے مکمل ہو گئے

اور باقی لوگوں کے انیس روزے ہوئے ہیں لیکن چاند بادلوں کی وجہ سے نظر نہیں آیا تو باقی لوگ تیس روزے مکمل کریں گے۔ تو یہ شخص جس کے تیس روزے مکمل ہو چکے تھے افطار (عید) نہیں کر سکتا بلکہ حاکم اور دوسرے لوگوں کے ساتھ ہی افطار کرے گا لہذا اسے اکتیسواں روزہ بھی رکھنا پڑے گا۔

رہا مسئلہ اختلافِ مطالع کا تو اس کا عدم اعتبار ظاہر الروایۃ سے ثابت ہے اگر سعودیہ سے چند لوگ اکٹھے پاکستان آئیں اور وہ شہادت دیں کہ ہم عید کا چاند دیکھ کر آئے ہیں تو پھر بھی ان کی شہادت سے پاکستان میں عید نہیں کی جاسکتی بلکہ پاکستان میں چاند دیکھنا اور چاند کی شہادتوں کا موصول ہونا ہی معتبر ہوگا۔

(ماخوذ از فتاویٰ نوریہ ج ۲ ص ۱۳۳)

چاند کے نام حالتوں کے لحاظ پر: چاند کی پہلی دو راتوں میں اور آخری دو راتوں میں چاند کو ہلال کہا جاتا ہے اور چودھویں رات کو جب چاند مکمل ہو جاتا ہے تو اسے بدر کہا جاتا ہے اور باقی راتوں میں قمر، بلکہ قمر کا اطلاق عام ہے شروع سے آخر تک خواہ ہلال ہو یا بدر ہو یا ان کے سوا ہو ہر حال میں قمر کہا جاسکتا ہے۔

سال، مہینہ، دن اور ساعت کی بحث:

سال: سورج کی حرکت جب فلک کے نقطہ معین سے شروع ہو تو یہ سال کی ابتداء ہے یہ بھی خیال رہے کہ سورج کی حرکت فلک کی حرکت کے مخالف ہوگی۔ جب سورج کی حرکت اسی نقطہ معین پر ختم ہو جائے تو سال کی انتہا ہے۔

سال میں چار موسم: سورج کے دوران کے لحاظ پر سال میں چار موسم ہوتے ہیں۔

سورج جب برج حمل میں ہو تو وہاں سے جب شمالی جانب ہوتا ہے تو ہوا میں گرمی آ جاتی ہے پھر یہ گرمی آہستہ آہستہ بڑھتی رہتی ہے کیونکہ سورج برج سرطان کی طرف بڑھ رہا ہوتا ہے جب تک سرطان اور اسد میں رہتا ہے۔ اس وقت تک بہت شدید گرمی ہوتی ہے اور یہ گرمی لگاتار باقی رہتی ہے۔

پھر سورج واپس میزان میں پہنچتا ہے تو اب ہوا معتدل ہو جاتی ہے اس میں معمولی خنکی آ جاتی ہے وہ شدت حرارت ختم ہو جاتی ہے۔ پھر حرارت میں آہستہ آہستہ کمی آنی شروع ہو جاتی ہے اور

برودت (ٹھنڈک) میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ سورج جدی میں پہنچ جاتا ہے جب تک یہاں رہتا ہے اس وقت تک سخت سردی رہتی ہے۔ پھر وہاں سے سورج شمالی جانب چڑھنا شروع کرتا ہے تو آہستہ آہستہ ہوا میں اعتدال آنا شروع ہوتا ہے سردی میں کمی واقع ہوتی ہے اب سورج پھر حمل میں پہنچ جاتا ہے اس وقت ہوا مکمل طور پر معتدل ہوتی ہے۔

واضح ہوا کہ سورج سال کی ابتدا میں جہاں سے شروع ہوا تھا سال کی انتہا میں وہاں ہی پہنچا اس دوران سے چار موسم ربیع (موسم بہار) صیف (موسم گرما) خریف (موسم خزان) شتاء (موسم سرما) معرض وجود میں آتے ہیں۔

مہینہ: چاند کی خاص فلک سے حرکت شروع ہونے سے مہینہ کی ابتداء ہوتی ہے پھر اسی نقطہ پر پہنچنے پر مہینہ کی انتہاء ہوتی ہے۔ چاند کی روشنی کے کم ہونے اور زیادہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ یہ ضابطہ بیان کیا گیا ہے ”نور القمر مستفاد من نور الشمس“ سورج کی ضیاء (روشنی) سے چاند روشنی حاصل کرتا ہے۔

چاند سورج کے سامنے جب ہوتا ہے تو چاند مکمل روشن ہوتا ہے اور جب چاند کا کچھ حصہ سورج کے سامنے ہوتا ہے تو اتنی مقدار میں روشن ہوتا ہے اور باقی دھاگہ کی شکل میں گول دائرہ ہوتا ہے۔ اسی طرح آہستہ آہستہ چاند کی روشنی بڑھتی جاتی ہے پھر چاند کا سورج سے سامنا جب کم ہوتا ہے تو کی آنی شروع ہو جاتی ہے اور آہستہ آہستہ کم ہوتے ہوتے پہلی حالت میں آ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب سورج اور چاند کے درمیان زمین حائل ہو جاتی ہے تو چاند کو گرہن لگ جاتا ہے۔

بعض اہل علم کا قول: سورج بھی جسم ہے اور چاند بھی جسم ہے تمام اجسام جسمیت میں برابر ہیں جو اشیاء ماہیت میں برابر ہوں ان کے لئے یہ کہنا ممکن نہیں کہ اس چیز کو فلاں چیز لازم ہے اور اس کو کوئی اور چیز لازم ہے بلکہ تمام کے لوازمات ایک جیسے ہوں گے۔ اس لئے یہ کہنا درست نہیں کہ چاند سورج سے روشنی حاصل کرتا ہے بلکہ یہ کہا جائے۔

”ان حصول النور فی جرم الشمس انما کان بسبب ایجاد القادر

المختار وكذا الذی فی جرم القمر“

کہ سورج کی روشنی اللہ تعالیٰ کی ایجاد سے حاصل ہے جو قادر مختار ہے اور چاند کی روشنی بھی اسی قادر مختار سے حاصل ہے۔
(ماخوذ از کبیر)

محشی کا محاکمہ: اگر کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی قدرت کا انکار کرے اور صرف یہ عقیدہ رکھے کہ چاند ذاتی طور پر سورج سے فائدہ حاصل کرتا ہے اللہ تعالیٰ کی قدرت کو کوئی دخل نہیں تو یہ ناجائز ہے بلکہ کفر ہے۔ اور اگر کسی کا یہ عقیدہ ہو کہ اصل ہر چیز کا خالق اللہ تعالیٰ ہے وہی سورج اور چاند کو روشنی عطا کرنے والا ہے البتہ اس نے خود ہی یہ سب پیدا فرمادیا ہے کہ سورج سے چاند کو روشنی حاصل ہو تو یہ کہنا جائز ہے۔
نظام شمسی اور قمری:

سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فاعل مختار ہے جو چاہے وہ کرتا ہے اس سے یہ نہیں پوچھا جاسکتا کہ یہ تو نے کیوں کیا ہے اور یہ کیوں نہیں کیا ہے لہذا سورج کی روشنی کی وبیشی نہ رکھ کر اور گھٹنا و بڑھنا نہ رکھ کر اور چاند کی روشنی کو کم اور زیادہ رکھ کر اور اس کے گھٹنے اور بڑھنے کی حالت پیدا کر کے اپنی قدرت کاملہ کا ذکر فرمادیا کہ میرے کام کسی غرض کے محتاج نہیں۔

تاہم حضرت قبلہ مفتی احمد یار خان رحمہ اللہ نے نظامی شمسی اور قمری کو بہت خوب انداز میں پیش کیا جو قارئین کے پیش خدمت ہے:

- (۱) قمری مہینے شمسی مہینوں سے افضل ہیں کہ رب نے تاریخیں معلوم کرنے ہی کیلئے چاند کو گھٹایا یا بڑھایا۔
- (۲) نیز شمسی مہینوں کی جنتری زمین پر ہے اور قمری مہینوں کی جنتی آسمانوں پر ہے۔
- (۳) اور وجہ فرق یہ ہے کہ شمسی مہینوں کی جنتری بندوں نے بنائی ہے اور قمری مہینوں کی جنتری فقط رب تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہے۔

- (۴) اور ذرا غور کیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ شمسی تاریخوں پر سورج کو دیکھ کر کوئی دلیل حاصل نہیں کی جاسکتی لیکن قمری تاریخوں پر جاہل انسان بھی چاند کو دیکھ کر کافی حد تک سمجھ جاتا ہے کہ آج کیا تاریخ ہونی چاہئے۔

- (۵) اور وجہ فرق یہ ہے کہ شمسی مہینوں میں موسم کے تبدیل ہونے کو دخل ہے لیکن قمری مہینوں میں

موسم کی تبدیلی کو کوئی دخل نہیں۔

(۶) اور شمسی مہینوں میں چار سال کے بعد فرق کرنا پڑتا ہے یعنی فروری کا مہینہ 28 دنوں کے بجائے 29 دنوں کا کرنا پڑتا ہے کیونکہ ہر سال سورج کا دور مکمل ہونے سے اتنا پیچھے رہ جاتا ہے کہ جتنا دن کا چوتھائی حصہ ہوتا ہے لہذا چار سال کے بعد مکمل دن کے برابر پیچھے رہ جاتا ہے تو ایک دن کا اضافہ کرنا پڑتا ہے۔

(۷) اور ہندی مہینوں میں بھی یہی صورت حال رہتی ہے کہ کچھ سالوں کے بعد سال 12 مہینوں کے بجائے 13 مہینوں کا کرنا پڑتا لیکن اب اس کمی کو پورا کرنے کے لئے کئی مہینے اکتیس دنوں کے اور کئی بتیس دنوں کے بنانے پڑتے ہیں۔ لیکن قمری مہینے اس کے محتاج نہیں کہ ان میں پلچر لگایا جائے وہ اس خرابی سے بچ کر صاف و شفاف ہیں۔

(۸) اسلامی کام قمری مہینہ سے ہوں گے لہذا روزے، زکوٰۃ، حج، عدت وغیرہ سب میں قمری مہینے معتبر ہوں گے نہ کہ شمسی، یہی وجہ ہے کہ تمام اسلامی تہوار قمری مہینہ کے تاریخوں کے مطابق ہوتے ہیں۔

(۹) چاند میں جمال ہے اور سورج میں جلال ہے نبی کریم ﷺ کو بھی جمال حاصل ہے اور آپ کی رحمت اور رب تعالیٰ کی رحمت سے امت کو بھی جمال حاصل ہے لہذا ان کو تاریخیں بھی جمالی حاصل ہیں یعنی قمری تاریخوں کے مطابق ان کا حساب رکھا گیا ہے۔

(۱۰) سورج میں کمی و بیشی نہیں اس لئے شمسی تاریخوں سے حساب لگانے والوں کو اس سے مقام عبرت حاصل نہیں ہوتی۔ لیکن چاند کی کمی اور زیادتی سے عقل مند انسان اپنے کمال و زوال کا اندازہ لگا لیتے ہیں۔ چاند شروع میں باریک ہوتا ہے پھر آہستہ آہستہ بڑھتا ہے پھر چودھویں رات کو اپنی کامل تابانی پر ہوتا ہے۔ اور مکمل دائرہ کی شکل اختیار کر لیتا ہے پھر آہستہ آہستہ اس میں کمی آنی شروع ہو جاتی ہے آخر میں ایک دن آنکھوں سے اوجھل ہو کر گویا کہ درجہ معدومیت میں پہنچ جاتا ہے۔

یہی حال انسان کا ہے معدومیت سے وجود میں آتا ہے چھوٹا بچہ ہوتا ہے پھر آہستہ آہستہ جوان ہو جاتا ہے کامل عروج پر پہنچ کر آہستہ آہستہ زوال کی طرف آتا ہے یعنی بڑھاپا حاصل ہوتا ہے پھر وفات طاری ہو جاتی ہے۔

لہذا انسان اپنی زندگی کو غنیمت سمجھے زوال اور فنا سے پہلے جو ہو سکے نیکی کے عمل کر لے اور یہ ہر وقت خیال کرتا رہے کہ کمال کے بعد زوال ہے یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام نے جب آیہ کریمہ ﴿الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ﴾ کو سنا تو سمجھ لیا کہ حضور ﷺ کے وصال کا وقت قریب آچکا ہے کیونکہ کمال حاصل ہو چکا ہے اب زوال کی باری ہے۔

(۱۱) ستارہ پرستوں کو تنبیہ کی گئی ہے کہ ذرا غور کرو سورج ہو یا چاند یا دوسرے ستارے تمام کے تمام اللہ تعالیٰ کے حکم کے پابند ہیں ایک محور پر گھوم رہے ہیں ایک نقطہ سے چل کر پھر اسی نقطہ پر پہنچ جاتے ہیں یہ خود جب قدرت باری تعالیٰ کے محتاج ہیں اسکے چلانے سے چل رہے ہیں تو یقیناً یہ معبود نہیں بن سکتے۔

(از نعمی بمصرف)

دن رات : معدل النهار یا نصف النہار کے دائرہ افق سے سورج کا جدا ہونا پھر اسی نقطہ کی طرف لوٹ آنا اسے دن رات سے تعبیر کیا جائے گا۔ فلاسفہ کا ایک قول یہ ہے کہ سورج کا زمین سے اوپر ہونا دن کہلاتا ہے اور زمین کے نیچے ہونا رات کہلاتا ہے کیونکہ آسمان زمین کے اوپر بھی ہیں اور نیچے بھی زمین درمیان میں معلق ہے۔

تنبیہ : فلاسفہ کے نزدیک دن طلوع آفتاب سے شروع ہوتا ہے اور غروب آفتاب پر ختم ہوتا ہے لیکن شریعت میں دن صبح صادق سے شروع ہوتا ہے اور غروب آفتاب پر ختم ہوتا ہے۔

ساعت : کی دو قسمیں ہیں مستویہ اور معوجہ۔ مستویہ ساعت چوبیس ساعتوں میں سے ایک ہے جو دن رات میں پائی جاتی ہیں یعنی دن اور رات کے مجموعی چوبیس گھنٹوں کو ساعات مستویہ کہا جاتا ہے۔ اور دن کی بارہ ساعتوں میں سے ایک یا رات کی بارہ ساعتوں میں ایک کو ساعات معوجہ کہا جاتا ہے۔ اس طرح دن کے بارہ گھنٹوں کو یا رات کے بارہ گھنٹوں کو ساعات معوجہ کہا جاتا ہے۔

خیال رہے کہ دن اور رات کے بارہ بارہ گھنٹے یا تو اس وقت مراد ہو سکتے ہیں جب دن اور رات برابر ہوں۔ لیکن زیادہ گمان یہ ہے کہ جس طرح گھڑیوں میں رات کے بارہ بجے کے بعد ایک دو کا حساب ہوتا ہے اس وقت گویا کہ دن کا آغاز سمجھا جاتا ہے اور دن کے بارہ بجے کے بعد تیرہ چودہ کا حساب ہوتا ہے اسے رات کا آغاز سمجھا جاتا ہے۔ اس حساب سے ہر دن بارہ گھنٹے کا اور ہر رات بارہ گھنٹے کی شمار ہوگی۔ (ماخوذ از کبیر)

وَلَيْسَ الْبِرُّ بِأَنْ تَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ ظُهُورِهَا وَلَكِنَّ الْبِرَّ مَنْ
اتَّقَى وَاتُّوا الْبُيُوتَ مِنْ أَبْوَابِهَا وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ

”اور یہ نہیں ہے نیکی کہ تم آؤ گھروں کو ان کی پچھلی جانب سے، اور لیکن نیکی تو اسے حاصل ہے جس شخص نے تقویٰ اختیار کیا۔ اور گھروں میں آؤ ان کے دروازوں سے اور ڈرو اللہ سے تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ۔“

شان نزول:

آیہ کریمہ کے اس حصہ کے شان نزول میں تین وجہ بیان کی گئی ہیں جو مجموعی طور پر مل کر شان نزول ہیں یعنی تین واقعات کے بعد یہ آیہ کریمہ نازل ہوئی۔

(۱) حضرت حسن اور اصم رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ زمانہ جاہلیت میں اگر کوئی شخص کسی کام کا ارادہ کرتا تو وہ کام اس کا اگر نہ ہوتا تو وہ اپنے گھر دروازے کی جانب سے داخل نہ ہوتا بلکہ پچھلی جانب سے داخل ہوتا اور ایک سال تک اسی پر عمل کرتا، اس طریقہ کو وہ لوگ نیک تقاؤلی یعنی نیک شگونی سمجھتے تھے کہ اس سے کام ہو جائے گا۔ تو رب تعالیٰ نے اس آیہ کریمہ کو نازل فرما کر ان کو اس سے منع کیا کہ گھروں کے دروازوں سے نیک شگونی کے ارادہ سے داخل نہ ہونے کو تم نیکی کا کام سمجھ رہے ہو حالانکہ یہ نیکی کا کام نہیں۔ نیکی تو اس شخص کو حاصل ہوگی جو اللہ تعالیٰ سے ڈرے گا اور کسی کا ڈر اور خوف اسے حاصل نہیں ہوگا بلکہ اللہ تعالیٰ پر توکل رکھے گا اسی وحدہ لا شریک سے ڈر رکھے اسی وجہ سے رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴾، ای لتفوزوا بالخير في الدين والدنيا“

اور اللہ سے ڈرو تاکہ تم دین اور دنیا میں کامیاب ہو جاؤ۔ اور رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ وَمَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لَهُ مَخْرَجًا ☆ وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ﴾

(الطلاق آیت ۳، ۲)

”اور جو اللہ سے ڈرے اور اللہ اسکے لئے نجات کی راہ نکال دے گا اور اسے وہاں سے روزی

دے گا جہاں اس کا گمان نہ ہو“ اور رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَمَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لَهُ مِنْ أَمْرِهِ يُسْرًا﴾

”اور جو اللہ سے ڈرے اللہ اس کے کام میں آسانی فرمادے گا“

اسی سے واضح ہوا ”من رجع خائباً فهو ما افلح وما انجح“ جو شخص اللہ سے نہیں ڈرے گا وہ رسوا ہوگا اور اسے کامیابی حاصل نہیں ہوگی۔ آیہ کریمہ کے اس مذکور شان نزول سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ فال نکالنا منع ہے اسی لئے نبی کریم ﷺ نے فرمایا ”لا عدوی ولا طيرة“ کوئی بیماری متعدی آگے تجاوز کرنے والی نہیں اور نہ ہی کوئی فال کارگر ہے۔

صحابہ کرام نے عرض کیا یا رسول اللہ ایک اونٹ خارش کی مرض میں مبتلا ہو تو دوسرے بھی خارش میں مبتلا ہو جاتے ہیں تو اس سے پتہ چلتا ہے کہ بیماری آگے تجاوز کرتی ہے تو آپ نے فرمایا کہ سب سے پہلے کو کیسے خارش لاحق ہوئی؟ مطلب یہ تھا کہ عقیدہ یہ رکھا جائے کہ اللہ تعالیٰ جسے چاہے محفوظ رکھے اور جسے چاہے بیماری میں مبتلا کرے ذاتی طور پر کوئی بیماری متعدی (تجاوز کرنے والی) نہیں۔

اسی طرح کسی چیز کو نیک شگون سمجھنا یا کسی چیز کو بدگمانی سمجھنا بھی غلط ہے اسی لئے نبی کریم ﷺ نے فرمایا ”من رده عن سفره تطير فقد اشرك“ جس شخص کو فال نے سفر سے روکا وہ مشرک ہو گیا۔ یعنی یہ سمجھا کہ فلاں وجہ سے میرا کام نہیں ہوگا لہذا مجھے سفر نہیں کرنا چاہئے جب فال کے ذریعے سفر سے رک گیا تو گویا کہ رب تعالیٰ پر کامل ایمان نہ رہا اور کامل توکل اس پر نہ رہا گویا کہ شرک خفی پایا گیا یہاں شرک کا معنی حقیقی نہیں۔

”ويحب الفال الحسن“ اچھی فال محبوب ہے جیسا کہ کسی کام کے لئے چلے تو کوئی نیک آدمی مل جائے یا اچھے نام والا کوئی شخص مل جائے جیسے سعد، طاہر، صالح، محمد حسین، عبد اللہ وغیرہ نام کا کوئی شخص مل گیا تو یہ خیال کیا کہ میرے کام میں برکت ہوگی تو یہ جائز بلکہ مستحسن ہے۔

(۲) شان نزول کی دوسری وجہ جو زیادہ مشہور ہے وہ یہ ہے کہ جب کوئی شخص حج یا عمرہ احرام کا باندھ لیتا تو پھر اگر اسے کوئی کام پڑ جاتا تو وہ گھر دروازے سے داخل نہیں ہوتا تھا بلکہ گھر کی پچھلی دیوار کو نقب لگاتا (سوراخ کرتا) اس سے داخل ہوتا۔ اسی طرح خیموں میں رہنے والے بھی داخل ہونے کی سمت

سے داخل نہیں ہوتے تھے بلکہ خیمہ کی پچھلی جانب سے داخل ہوتے تو رب تعالیٰ نے اس آیہ کریمہ کو نازل فرمایا کہ گھروں کے دروازوں سے داخل نہ ہونا نیکی کا کام نہیں نیکی کا کام تو تقویٰ حاصل کرنا ہے۔ (۳) ابن ابی حاتم اور حاکم نے حدیث بیان کی اور اس حدیث کو صحیح قرار دیا کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں قریش کو جس کہا جاتا تھا وہ احرام کی حالت میں گھروں کے دروازوں میں داخل ہوتے تھے (یعنی احرام کے بعد اگر گھر کسی کام کے لئے لوٹا پڑتا تو گھروں میں دروازوں سے داخل ہوتے) اور انصار اور باقی عرب گھروں میں احرام کی حالت میں دروازوں سے داخل نہیں ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ ایک باغ سے احرام باندھ کر نکلے پھر اسی باغ کے دروازے سے احرام کی حالت میں داخل ہوئے تو آپ کو دیکھ کر قطبہ بن عامر انصاری بھی دروازے سے اسی باغ میں داخل ہو گئے تو بعض حضرات نے کہا قطبہ بن عامر انصاری فاسق و فاجر ہو گیا کیونکہ وہ دروازے سے داخل ہو گیا حالانکہ وہ انصاری ہے۔ نبی کریم ﷺ نے اس سے پوچھا ”ما حملک علی ما صنعت“ تمہیں اس فعل پر کس چیز نے برا بیختہ کیا (ابھارا) ہے۔ تو اس شخص نے کہا ”رأيتک فعلتہ ففعلتہ کما فعلت“ میں نے آپ کو جو کام کرتے ہوئے دیکھا ہے وہی میں نے بھی کیا ہے تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا ”انی رجل احمس“ میں تو احمس شخص ہوں (تم انصاری ہو) تو وہ شخص عرض کرنے لگے ”فان دینی دینک“ بیشک میرا دین وہی ہے جو آپ کا دین ہے۔

اور ایک روایت میں ان کے جواب کے یہ الفاظ ذکر کئے گئے ہیں:

”انی رضیت بسنتک و ہدیک ، وقد رأيتک دخلت فدخلت“

بیشک میں آپ کی سنت اور آپ کی ہدایت پر راضی ہوں جب میں نے آپ کو دروازے سے نکلتے ہوئے اور داخل ہوتے ہوئے دیکھا تو میں نے بھی وہی کام کیا۔ ان کے اس محبت بھرے جواب پر یہ آیہ کریمہ نازل ہوئی۔ گویا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے محبت بھرے کلمات کو پسند فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا ہاں گھروں میں دروازوں سے داخل نہ ہونا نیکی نہیں بلکہ نیکی تو تقویٰ سے یعنی اتباع رسول اللہ ﷺ سے حاصل ہوتی ہے۔

حمس کا مطلب کیا ہے؟

یہ لفظ جمع ہے ”فعل بضم تین“ کا وزن ہے اس کا واحد حمس ہے یہ لفظ ”حماسة“ سے مشتق ہے جس کا معنی شدت ہے۔ حمس ان قبائل کو کہا جاتا تھا قریش، کنانہ، خزاعہ، ثقیف، خثیم، بنو عامر بن صعصعہ، بنو نصر بن معاویہ، ان قبائل کو حمس اس لئے کہا جاتا تھا کہ یہ لوگ اپنے دین میں سختی سے کار بند رہتے تھے یہ لوگ احرام باندھ کر گھروں میں نہیں لوٹتے تھے اور جن خیموں سے احرام باندھ کر نکلتے ان کا پھر سایہ حاصل نہیں کرتے تھے اور گھی اور پنیر نہیں کھاتے تھے، ہاں البتہ اگر کوئی مجبوری ان کو درپیش آ جاتی تو گھروں میں ان کے دروازوں سے ہی داخل ہوتے تھے لیکن دوسرے تمام عرب حضرات اور خصوصاً انصار گھروں کی پچھلی دیوار کو نقب لگا کر داخل ہوتے تھے دروازوں سے داخل نہیں ہوتے تھے۔

(از کبیر و درمنشور)

سوال : جب اسی آیہ کے پہلے حصہ میں ہے:

﴿يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْآهِلَةِ قُلْ هِيَ مَوَاقِيتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ﴾

”کہ وہ آپ سے چاند کی حالتوں کے متعلق سوال کرتے ہیں آپ فرما دو وہ علامتیں ہیں وقت کی لوگوں کے لئے اور حج کے لئے“۔ تو اس شان نزول کی پہلی وجہ (قال) والے واقعہ کی کوئی مناسبت نہیں تو اسے شان نزول کی وجہ کیسے قرار دیا جائے؟

جواب : اللہ تعالیٰ نے ﴿وَلَيْسَ الْبِرُّ بِأَنْ تَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ ظُهُورِهَا﴾ کو ﴿يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْآهِلَةِ﴾ کے ساتھ ذکر فرمایا:

”انما اتفق وقوع القصتين في وقت واحد فنزلت الآية فيهما في وقت واحد“

تو اتفاق یہ ہوا کہ دونوں واقعے یعنی قال کے متعلق سوال اور احرام کے متعلق واقعہ ایک ساتھ درپیش آئے تو آیہ کریمہ کا نزول ہوا۔ (از کبیر)

شان نزول کی مختلف وجوہ کو علامہ رازی رحمہ اللہ کے اسی قول کی روشنی میں دیکھا جائے اور یہی استاذی المکرم مولانا محمد اشرف سیالوی مدظلہ العالی بیان فرماتے تھے۔

دینی طلباء کرام کی توجہ کے لئے: ﴿لَيْسَ الْبِرُّ﴾ میں لفظ ”البر“ پر رفع (پیش) لازم ہے کیونکہ ﴿بَانَ تَأْتُوا الْبُيُوتَ﴾ میں باء داخل ہے باء خبر پر داخل ہوتی ہے نہ کہ اسم لیس پر اس لئے ”البر“ کا اسم لیس ہونا معین ہو گیا۔
(صاوی)

اور توجہ: اللہ تعالیٰ نے دو جملے خبریئے ذکر فرمائے ہیں اور دو امر ذکر فرمائے ہیں لف وشر مرتب کلام ہے یعنی پہلے امر کو پہلے جملہ خبریہ پر مرتب فرمایا ہے اور دوسرے امر کو دوسرے جملہ خبریہ پر مرتب فرمایا ہے:
﴿لَيْسَ الْبِرُّ بَانَ تَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ ظُهُورِهَا﴾

جملہ خبریہ ہے اس پر امر ﴿وَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ أَبْوَابِهَا﴾ کو مرتب فرمایا ہے اور ﴿وَلَكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اتَّقَى﴾ جملہ خبریہ ہے اور اس پر امر ﴿وَاتَّقُوا اللَّهَ﴾ کو مرتب فرمایا۔
(صاوی)
ذرا اور توجہ: ﴿وَلَكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اتَّقَى﴾ میں یا تو خبر مخذوف ہے اصل عبارت ﴿وَلَكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اتَّقَى﴾ لیکن نیکی تو معتبر تقویٰ کرنے والے شخص کی نیکی ہے۔ یا حذف مضاف ہے (وَلَكِنَّ) ذا (الْبِرِّ) البار (مَنْ اتَّقَى) لیکن نیکی کرنے والا نیک شخص تو وہ ہے جس نے تقویٰ اختیار کیا یعنی محارم اور باطل شہوات سے اپنے آپ کو بچا کر رکھا۔
(روح المعانی)

﴿وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ﴾: ای لکی تفوزوا بالمطلوب من الهدی والبر“ اور اللہ سے ڈرو تا کہ تم کامیاب ہو جاؤ۔ یعنی تم ہدایت حاصل کرنے اور نیکی حاصل کرنے کے مطلوب کو پا لینے میں کامیاب ہو جاؤ۔
(روح المعانی)

شریعت کے خلاف کوئی کام نیکی کا نہیں ہو سکتا:

”عن ابن عباس قال بينما رسول الله ﷺ يخطب اذا هو برجل قائم في الشمس فسأل عنه فقالوا هو ابو اسراييل نذر ان يقوم ولا يقعد ولا يستظل ولا يتكلم ويصوم فقال النبي ﷺ مروه فليتكلم ويستظل وليقعد وليتم صومه“

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ ایک مرتبہ خطبہ دے رہے تھے تو ایک شخص کو دھوپ پر کھڑے دیکھا آپ نے اس کے متعلق سوال کیا تو صحابہ کرام نے بتایا یہ ابو اسراييل

ہے (یہ انصاری صحابی ہیں جن کی کنت ابو اسرائیل ہے ان کے نام میں اختلاف پایا جاتا ہے) جس نے نذر مانی ہوئی ہے کہ وہ کھڑا رہے گا اور بیٹھے گا نہیں اور سایہ حاصل نہیں کرے گا اور کلام نہیں کرے گا اور روزہ رکھے گا تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا اسے حکم دو کہ وہ سایہ حاصل کرے اور بیٹھ جائے اور اپنے روزہ کو مکمل کرے۔

کیا خوب قانون مقرر فرمایا:

”فابطل النبی ﷺ ما کان غیر قربۃ مما لا اصل له فی شریعتہ وصحہ

ما کان قربۃ مما له نظیر فی الفرائض والسنن“

نبی کریم ﷺ نے اس شخص کو کھڑے رہنے اور سایہ نہ حاصل کرنے اور کلام نہ کرنے کی نذر سے منع فرمایا کہ اس کی کوئی اصل شریعت میں نہیں لیکن آپ نے روزہ مکمل کرنے کی ہدایت فرمائی کیونکہ اس کی نظیر (مثال) فرضی روزوں اور مسنون روزوں سے ملتی ہے۔ (قرطبی)

واضح ہوا کہ بروہ کام جو شریعت کے مخالف ہو وہ ناجائز ہوگا لیکن جو کام شریعت کے مطابق ہوگا وہ جائز ہوگا یہ دلیل ناقص ترین ہے کہ جو کام نبی کریم ﷺ نے نہیں کیا وہ جائز نہیں، یہ دلیل دینے والوں کا چلنا پھرنا، تصنیفی کام اور نئی وضع کی مساجد اور نئی طرز پر مدارس کا قیام سب حرام ہو جائے گا۔

بیان کردہ آیات میں لطیف اشارات:

انسان میں تین قسم کی قوتیں پائی جاتی ہیں درندگی کی قوت، حیوانی قوت اور ملکی (فرشتوں والی) قوت۔ قصاص کا حکم نافذ کر کے اس طرف بھی اشارہ فرمادیا کہ جس طرح قتل کا بدلہ قتل ہے یہ عدل ہے اسی طرح جب تم کسی کے دل کو ستاؤ گے یا کسی کی روح کو تکلیف دو گے تو تم پر قصاص لازم آئے گا کہ تم یا تو اپنے قلب و روح کو اس پر پیش کرو کہ وہ اپنا بدلہ لے لے یا وہ تمہیں معاف کر دے یا تم اس کے قلب و روح کو خوش کر کے گویا کہ خون بہا دے کر اس سے اپنے آپ کو معاف کرا لو۔

پھر رب تعالیٰ نے وصیت کرنے کا حکم فرمایا اس میں یہ بھی اشارہ پایا گیا ہے کہ تم اللہ والوں کو

صرف اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ کرنے اور اللہ تعالیٰ کے ازلی اسرار کو یاد رکھنے کی وصیت کر کے اپنی قوت ملکی کو محفوظ رکھوا کر تم نے اس وصیت میں کمی کی تو تمہاری قوت ملکی میں بھی کمی ہوگی۔

پھر اللہ تعالیٰ نے روزے رکھنے کا حکم دیا اس میں یہ اشارہ بھی ملتا ہے کہ اے انسان تو اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے جس طرح روزہ رکھتا ہے اسی طرح اپنے قول و فعل اور حرکت کو صرف اللہ تعالیٰ کی رضا کے مطابق رکھتا کہ تیری قوت حیوانی میں کمی آئے کیونکہ حیوانوں کا کام صرف کھانا پینا ہے تو روزہ رکھنے سے ان کی اس قوت حیوانی میں کسی حد تک کمی واقع ہوگی۔ اور حیوان اپنے قول و فعل اور حرکات میں مکلف نہیں تو انسان بھی اپنے آپ کو اس قوت حیوانی کی وجہ سے غیر مکلف نہ سمجھے بلکہ اپنے اقوال و افعال اور اپنی حرکات کو رب تعالیٰ کی مرضی کے مطابق کر کے اپنے آپ کو مکلف سمجھے اس طرح اس کی قوت حیوانی میں کمی واقع ہوگی۔

پھر اللہ تعالیٰ نے انسان کو تسلی دیتے ہوئے ﴿يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ﴾ اس طرف اشارہ فرمادیا کہ اللہ تعالیٰ تمہارے لئے آسانی کا ارادہ فرماتا ہے کہ تم اپنے آپ کو اصل الی اللہ (اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے) کے درجہ پر پہنچاؤ اور اپنے آپ کو رب تعالیٰ کی صفات سے متصف کرو تا کہ تمہیں رب تعالیٰ اپنی قدرت اور صفات کا مظہر بنادے۔

رب تعالیٰ تم پر مشکل کا ارادہ نہیں فرماتا کہ تم اپنے آپ کو رب تعالیٰ کے قریب نہ کرو، بلکہ وہ تو اپنے قریب کرنے کیلئے آسانی کی راہ پیدا فرماتا ہے انسان چونکہ متلون مزاج ہے یعنی اس کا مزاج بدلتا رہتا ہے کبھی اس پر صفات روحانیہ غالب ہوتی ہیں یعنی ملکی قوت جب غالب ہوتی ہے تو یہ انسانی خواہشات سے روزہ رکھتا ہے یعنی گناہوں کو قریب بھی نہیں آنے دیتا اور کبھی انسان پر صفات حیوانیہ غالب ہوتی ہیں یہ وہ وقت غفلت کا ہوتا ہے انسان اپنی خواہشات کی تکمیل کا خواہش مند ہوتا ہے۔ اگر جائز طریقہ سے اپنی خواہشات کی تکمیل کرے یعنی اپنی زوجہ کی جانب رجوع کرے تو اسکی طرف اشارہ ﴿هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ﴾ ”وہ عورتیں تمہارا لباس ہیں اور تم ان کا لباس ہو“ سے کر دیا۔ اور اگر خواہشات کی تکمیل ناجائز طریقہ سے کی تو اسکی طرف اشارہ ﴿عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ كُنْتُمْ

تَحْتَانُونَ أَنْفُسُكُمْ ﴿۱﴾ ”اللہ کو معلوم ہے کہ بیشک تم اپنے نفسوں کو خیانت میں ڈالتے ہو“ سے اشارہ کر دیا۔

پھر اگر انسان اپنے گناہوں سے تائب ہو جائے اللہ تعالیٰ کے حضور رجوع کرے تو رب تعالیٰ توبہ قبول کرتا ہے اور معاف فرماتا ہے اس مسئلہ کی طرف ﴿فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ﴾ ”وہ تمہاری توبہ قبول کرتا اور معاف کرتا ہے“ سے اشارہ فرما دیا۔

چونکہ انسان اگر تمام وقت عبادات میں گزارے تو دنیاوی زندگی اور ذریعہ معاش معطل ہو کر رہ جاتا ہے اسلئے بندے کا عبادت کرنا بھی رب تعالیٰ کو محبوب ہے اور اپنے اہل و عیال کیلئے رزق حلال کے حصول کیلئے کسب کرنا بھی رب تعالیٰ کو پسند ہے بلکہ اسے بھی عبادت قرار دیا۔ اس کی طرف اشارہ: ﴿كُلُوا وَاشْرَبُوا حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ﴾

”کھاؤ اور پیو یہاں تک کہ فجر کا سفید دھاگہ ظاہر ہو جائے سیاہ دھاگہ سے (کر دیا)“ کہ کسی وقت کھانے اور پینے کی ممانعت کر کے اشارہ کر دیا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف مشغول ہونے کے وقت کا بھی لحاظ کرو اور کسی وقت کھانے اور پینے کی اجازت عطا فرما کر اس طرف اشارہ کر دیا کہ اپنے بعض اوقات دنیاوی مشاغل میں بھی گزار لو۔ نبی کریم ﷺ کے ارشاد سے بھی یہی ثابت ہو رہا ہے آپ کا ارشاد گرامی ہے:

”لِى مَعَ اللّٰهِ وَقْتُ لَا يَسْعٰى فِىْهِ مَلِكٌ مُّقْرَبٌ وَلَا نَبِىٌّ مُّرْسَلٌ، وَلِى مَعَ

حفصة وزینب“

میر اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایک وقت ہوتا ہے جس میں کوئی مقرب فرشتہ اور کوئی نبی مرسل دم نہیں مار سکتا اور میرا کوئی وقت (اپنی ازواج) حفصہ اور زینب (وغیرہما) سے گزرتا ہے۔ (از روح المعانی)

﴿يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْآهْلِ... الْخ﴾ اس آیت کریمہ سے اس طرف بھی اشارہ کر دیا کہ سیدھی راہ کامل وہ ہے کہ یقینی دلائل کو ظنی دلائل پر ترجیح دی جائے، اگر ظنی دلائل کو یقینی دلائل پر ترجیح دے گا تو معاملہ الٹ ہو جائے گا جو کام واجب ہوگا اس کو انسان واجب نہیں سمجھے گا اور جو واجب نہیں ہوگا اسے واجب سمجھے گا۔ اس کے بعد یہ سمجھنا ضروری ہے کہ رب تعالیٰ عالم، صانع، مختار اور حکیم ہے اور یہ بھی بہت واضح ہے کہ:

”ان الحكيم لا يفعل الا الصواب البرئى عن العتب والسفه“

حکیم ذات کا کوئی کام بھی غلط نہیں ہوتا بلکہ درست ہی درست ہوتا ہے اس کا ہر کام بے فائدہ ہونے سے خالی ہوتا ہے یعنی ہر کام حکمت کے مطابق ہوتا ہے۔ اس قانون سے ہی یہ پتہ چل گیا کہ اللہ تعالیٰ نے چاند کو مختلف حالتوں میں رکھ کر اپنی حکمت کاملہ کا اظہار فرمادیا۔ لہذا رب تعالیٰ کے ہر امر و نہی کو حکمت پر مبنی سمجھ کر اسے تسلیم کرنا گویا کہ گھروں کو دروازوں کی جانب سے آنا ہے اور اس کے حکم کے خلاف چلنا گویا کہ گھروں کے پچھلی جانب سے آنا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق چلنے کا نام ہی صراط مستقیم ہے اور اس کی مرضی کے خلاف چلنے کا نام باطل راہ ہے۔ (از کبیر)

ایک انوکھی تفسیر: آیہ کریمہ وضاحت احادیث مبارکہ اور معتبر تفاسیر سے بیان کر دی گئی اور جو لطیف اشارات پائے گئے ہیں وہ بھی بیان کر دیئے گئے تاہم تمام تفاسیر سے ہٹ کر عقلی ڈھکوسلے کے مطابق تفسیر کو دیکھئے۔

”و اما قوله ﴿لَيْسَ الْبِرُّ بِأَنْ تَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ ظُهُورِهَا وَلَكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اتَّقَىٰ وَآتَىٰ الْبُيُوتَ مِنْ أَبْوَابِهَا﴾ قال نزلت في أمير المؤمنين عليه السلام لقول رسول الله ﷺ انا مدينة العلم وعلي عليه السلام بابها ولا تدخلوا المدينة الا من بابها“ (تفسیر قمی لاهل التشیع)

یہ آیہ امیر المؤمنین علیہ السلام کے متعلق نازل ہوئی ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں علم کا شہر ہوں اور علی علیہ السلام اس کا دروازہ ہیں اور شہر میں سوائے دروازہ کے داخل نہ ہو۔
راقم نے اس تفسیر کو انوکھا کیوں قرار دیا؟

اس لئے کہ اس آیہ کریمہ کا شان نزول کسی حدیث کی کتاب میں نہیں کیونکہ احادیث سے شان نزول کی وہی تین وجوہ ثابت ہیں جن کو ذکر کر دیا گیا خصوصاً درمنثور میں بھی نہ ذکر ہونا واضح کرتا ہے کہ اس انوکھی تفسیر کے مطابق شان نزول پر کوئی ضعیف حدیث بھی نہیں کیونکہ درمنثور میں صحیح اور حسن اور ضعیف تمام احادیث ہی تقریباً مذکور ہیں۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ رئیس المحققین عمدۃ الازکیاء رازی دوراں استاذی المکرم حضرت علامہ مولانا محمد اشرف سیالوی مدظلہ العالی فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ میں علم کا شہر ہوں

اور علی اس کا ایک دروازہ ہیں۔ یعنی تمام صحابہ کرام اس شہر کے دروازے ہیں ان میں سے ایک دروازہ حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی ہیں ورنہ وہ شہر کیسا ہوگا جس کا ایک ہی دروازہ ہوگا۔ استاذی المکرم کی اس وضاحت کو اور مرقاة شرح مشکوٰۃ کو دیکھیں تو مطابقت نظر آئے گی۔ حضرت علامہ ملا علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں ترمذی شریف میں تو حدیث یہ ہے:

”عن علی قال قال رسول اللہ ﷺ انا دار الحکمة وعلی بابها“

”حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا میں حکمت کا دار ہوں اور علی اس کا دروازہ ہیں۔“

”وفی رواية انا مدينة العلم وعلی بابها“

”ایک روایت میں ہے میں علم کا شہر ہوں اور علی اس کا دروازہ ہیں“

”وفی رواية المصباح انا دار العلم وعلی بابها“

”اور مصباح کی روایت میں ہے میں علم کا دار ہوں اور علی اس کا دروازہ ہیں“

”وفی رواية زیادة فمن اراد العلم فلیاتہ من بابہ“

”اور ایک روایت میں یہ زیادتی بھی ہے کہ جو شخص علم کا ارادہ رکھتا ہے وہ اس کے دروازے سے آئے“

حدیث پاک کا مطلب کیا ہے؟

”والمعنی علی باب من ابوابها ولكن التخصیص یفید نوعاً من

التعظیم وهو كذلك لانه بالنسبة الى بعض الصحابة اعظمهم

واعلمهم“

حدیث پاک کا مطلب یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ علم کے شہر کے دروازوں میں سے ایک دروازہ ہیں لیکن آپ کا ذکر خصوصی طور پر کرنا آپ کی عظمت پر دلالت کرتا ہے اس بات کا کوئی انکار نہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نسبت بعض صحابہ کرام کے (نہ کہ نسبت تمام صحابہ کرام کے) افضل بھی ہیں یعنی آپ کو عظمت حاصل ہے اور نسبت بعض صحابہ کرام کے آپ زیادہ علم بھی رکھتے ہیں۔

”ومما يدل علی ان جمیع الاصحاب بمنزلة الابواب قوله ﷺ“

اصحابی کالنجوم بایہم اقتدیتم اہتدیتم

اس پر دلیل یہ ہے کہ تمام صحابہ کرام ہی علم کے شہر کے دروازے ہیں خود نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ میرے صحابہ تمام ہی ستاروں کی طرح ہیں ان میں سے جس کی اقتداء کرو گے ہدایت پا جاؤ گے۔ البتہ ستاروں سے تشبیہ دے کر یہ ثابت کر دیا کہ جس طرح بعض ستارے زیادہ نورانیت رکھتے ہیں اور بعض کم، اسی طرح صحابہ کرام بھی انوار ہدایت میں مختلف مراتب رکھیں گے۔

اس پر اور دلیل یہ ہے کہ تابعین نے علوم شرعیہ کی مختلف اقسام یعنی قراءت اور تفسیر اور حدیث فقہ تمام صحابہ کرام سے حاصل کئے ہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے حاصل نہیں کئے ”فعلم عدم انحصار البابۃ فی حقہ“ اسی سے معلوم ہو گیا کہ علم کے شہر کا دروازہ ہونا صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ پر بند نہیں۔ ہاں اگر جزوی فضیلت ثابت کی جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں:

”اللہم الا ان یختص بباب القضاء فانہ ورد فی شانہ انہ اقضاکم“

ہاں اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو علم قضاء (عدالتی فیصلے کرنے) کے شہر کا دروازہ مان لیا جائے تو یہ درست ہے اسلئے کہ ان کی شان میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا وہ تم تمام سے اچھے قاضی ہیں۔ اس طرح جزوی فضیلت اور صحابہ کرام کو بھی حاصل ہے کیونکہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کے متعلق ارشاد مصطفوی ہے ”انہ اقروکم“ وہ تم تمام سے زیادہ اچھے قاری ہیں اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے متعلق ارشاد فرمایا ”انہ افروضکم“ بیشک وہ تم تمام سے زیادہ علم فرائض رکھتے ہیں یعنی وراثت کے مسائل وہ تمام صحابہ کرام سے زیادہ جانتے ہیں اور حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کے متعلق فرمایا ”انہ اعلمکم بالحلل والحرام“ بیشک وہ تم تمام سے حلال و حرام کا زیادہ علم رکھتے ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے کچھ لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان کے متعلق پوچھا تو آپ نے بتایا:

”کان قد ملی جوفہ حکما وعلما وباسا ونجدة مع قرابۃ من

(اخرجه احمد)

رسول اللہ ﷺ

کہ وہ علم و حکمت اور بہادری و رفعت سے بھرے ہوئے تھے باوجود اس کے کہ رسول اللہ ﷺ

کے ساتھ آپ کو قربت بھی حاصل تھی۔

”وعن سعید بن مسیب قال عمر کان يتعوذ من معضلة ليس لها

(اخرجه احمد)

ابو حسن“

حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان پیچیدہ مسائل سے پناہ مانگتے جن کا فیصلہ کرنے کے لئے حضرت ابوالحسن (حضرت علی) رضی اللہ عنہ نہ ہوتے۔

علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث (میں علم کا شہر ہوں علی اس کا دروازہ ہیں) سے اہل تشیع کا یہ دلیل پیش کرنا کہ علم اور حکمت صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ سے حاصل کرنا خاص ہے کسی اور کی طرف آپ کے واسطہ کے بغیر تجاوز نہیں ہو سکتا کیونکہ دار (گھر) میں داخل صرف دروازے سے ہی ہو سکتا ہے رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿واتوا البيوت من ابوابها﴾ ”گھروں میں ان کے دروازوں سے آؤ“

”ولا حجة لهم فيه اذ ليس دار الجنة باوسع من دار الحكمة ولها

ثمانية ابواب“

اس میں اہل تشیع کی دلیل ثابت نہیں ہو سکتی کیونکہ جنت کا دار علم کے دار سے زیادہ وسیع نہیں حالانکہ جنت کے بھی آٹھ دروازے ہیں۔

(مرقاۃ ج ۱۱ ص ۳۳۶)

یعنی مقام جنت علم و حکمت کے شہر سے چھوٹا ہے جبکہ آٹھ دروازے جنت کے بھی ہیں تو علم کا شہر کیسا شہر ہوگا جس کا ایک ہی دروازہ ہو ہاں یقیناً اس کے دروازے بہت ہیں وہ سب صحابہ کرام ہی اس کے دروازے ہیں البتہ یوں کہا جاسکتا ہے کہ کوئی دروازہ بڑا ہوگا اور کوئی چھوٹا۔

حدیث پاک پر محدثین کے اقوال:

”رواه الترمذی وقال هذا حديث غريب وقال روى بعضهم هذا

الحديث عن شريك ولم يذكروا فيه الصنايحى (بضم صاء وكسر

موحدة ومهملة) ولا نعرف هذا الحديث عن احد من الثقات غير

شريك“

یہ حدیث (انا دار الحکمة وعلی بابها) ترمذی نے ذکر کی ہے اور فرمایا یہ حدیث غریب ہے اور یہ کہا کہ یہ حدیث شریک سے بعض نے روایت کی ہے اور سند میں ضابطی کا بھی ذکر نہیں اور بعض کا نام بھی نہیں اور یہ حدیث سوائے شریک کے اور ثقہ راویوں سے ثابت نہیں۔

اور حدیث ” انا مدینة العلم وعلی بابها “ حاکم نے اپنی مستدرک کے باب المناقب میں ذکر کی ہے ” وقال صحیح “ اور انہوں نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ” وتعقبه الذهبي فقال بل هو موضوع “ اور ذہبی نے اس کا تعاقب کیا ہے اور کہا ہے بلکہ وہ موضوع ہے ” وقال ابو زرعة کم خلق افتضحوا فيه “ اور ابو زرعة نے کہا ہے کہ اس میں کتنے لوگ رسوا ہوئے ہیں۔ (یعنی اس کی سند کو صحیح نہیں ثابت کر سکے)۔

” وقال يحيى بن معين لا اصل له كذا قال ابو حاتم ويحيى بن سعيد “

اور یحیی بن معین نے کہا ہے کہ اس حدیث کی کوئی اصل نہیں اس طرح ابو حاتم اور یحیی بن سعید نے بھی کہا ہے۔ ” وقال الدار قطنی ثابت “ اور دار قطنی نے کہا ہے یہ حدیث ثابت ہے ” ورواه الترمذی فی المناقب من جامعه وقال انه منكر “ اور ترمذی نے یہ حدیث اپنی جامع کے باب المناقب میں ذکر کی ہے کہ یہ حدیث منکر ہے یعنی ثقہ راویوں کی حدیث معرف کے مقابل ہے جسے منکر کہا جاتا ہے۔

” وكذا قال البخاری انه ليس له وجه صحيح “ اور بخاری نے بھی اسی طرح بیان کیا ہے کہ اس حدیث کی کوئی وجہ صحیح نہیں۔ ” واورده ابن الجوزی فی الموضوعات “ اور ابن جوزی نے اسے موضوعات میں ذکر کیا ہے۔

” وقال ابن دقيق العبد هذا الحديث لم يثبتوه وقيل انه باطل “

ابن دقیق العبد نے کہا یہ حدیث ثابت نہیں اور بعض نے کہا یہ باطل ہے۔

صحیح قول بطور محاکمہ : لیکن حافظ ابو سعید علانی رحمہ اللہ نے فرمایا درست قول یہ ہے :

” انه حسن باعتبار طريقه لا صحيح ولا ضعيف فضلا عن ان يكون

موضوعاً ذکرہ الزرکشی

کہ یہ حدیث باعتبار طرق سند کے حسن ہے صحیح بھی نہیں اور ضعیف بھی نہیں۔ جب حسن ہے تو موضوع کہنا کیسے صحیح یعنی موضوع کا قول لغو ہے علامہ زرکشی رحمہ اللہ نے حضرت علائی کے قول کو یوں ہی نقل فرمایا۔ علامہ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ صاحب فتح الباری شرح بخاری سے اس حدیث کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا:

”انہ حسن لا صحیح کما قال الحاکم ولا موضوع کما قال ابن الجوزی“

یہ حدیث حسن ہے صحیح نہیں جیسا کہ حاکم نے کہا ہے اور موضوع بھی نہیں جیسا کہ ابن جوزی نے کہا ہے۔ علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اس حدیث کے متعلق علامہ علائی رحمہ اللہ نے اور علامہ عسقلانی رحمہ اللہ نے بہت تفصیل سے بحث فرمائی ہے۔

(مرقاۃ ج ۱ ص ۳۴۶)

ہاں البتہ یہ کہا جائے کہ آیہ کریمہ میں اس طرف اشارہ ملتا ہے کہ جس طرح احرام باندھنے کے بعد گھروں میں آنے کی ضرورت ہو تو گھروں کے دروازوں کی طرف سے آؤ اسی طرح علم حاصل کرنا چاہو علم کے شہر میں آنا چاہو تو اس کے شہر کے دروازوں سے آؤ وہ دروازے تمام صحابہ کرام ہیں تعلیمات صحابہ کرام کی راہنمائی میں ہی علم ہدایت حاصل ہو سکتا ہے۔

☆☆☆☆☆

﴿وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا إِنَّ

اللَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ﴾

(۱) ”اور اللہ کی راہ میں لڑوان سے جو تم سے لڑتے ہیں اور حد سے نہ بڑھو اللہ پسند نہیں رکھتا حد سے بڑھنے والوں کو“۔

(۲) ”اور لڑائی کرو اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے جو لڑائی کرتے ہیں تم سے اور نہ تجاوز کرو بیشک اللہ نہیں پسند کرتا تجاوز کرنے والوں کو“۔

ما قبل سے تعلق:

پہلی آیہ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے تقویٰ کا حکم دیا یعنی دین میں استقامت اور اللہ تعالیٰ کی معرفت راہ تقویٰ سے حاصل ہوتی ہے صرف اپنی عقلی رائے کا دخل نہ ہو عقل سے بھی کسی چیز کو سوچنا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کے حکم کے تابع ہو۔

تقویٰ کا حکم دینے کا مطلب یہ ہے ”ہو ترک المحظورات وفعل الواجبات“ کہ ممنوع چیزوں کو چھوڑ دیا جائے اور واجب چیزوں پر عمل کیا جائے اس بحث سے واضح ہو گیا ”ان الاستقامة علم والتقوى عمل“ بیشک استقامت علم ہے اور تقویٰ عمل ہے ان دو چیزوں کی ہی مومن کو تکلیف دی گئی ہے کہ علم و عمل دونوں کو ہی حاصل کرو۔ تقویٰ کے حکم کے بعد:

”امر فی هذه الآية باشد اقسام التقوى واشقها على النفس وهو قتل اعداء الله“

اس آیہ میں تقویٰ کی سخت قسم کا حکم دیا جو انسان کو بظاہر بہت بھاری اور مشقت آمیز نظر آتی ہے تقویٰ کی شدید قسم اللہ تعالیٰ کی راہ میں اللہ تعالیٰ کے دشمنوں یعنی کافروں سے جہاد کرنا ہے۔ (ازکبیر)

شان نزول:

اس آیہ کریمہ کے شان نزول میں دو احتمال پائے گئے ہیں ایک احتمال کے لحاظ سے یہ آیہ کریمہ

منسوخ ہے اور دوسرے لحاظ سے منسوخ نہیں۔ مکہ مکرمہ میں جہاد کرنے کی ممانعت تھی نبی کریم ﷺ مدینہ طیبہ میں آئے تو آپ سے جہاد کی ممانعت کی پابندی اٹھائی لیکن اسے پھر بھی اس شرط سے مشروط کر دیا کہ جو تم سے لڑائی کرے اس سے لڑائی نہ کرے اس سے لڑائی نہ کرو اس لئے کہ جو لڑائی نہ کرے اگر اس سے لڑائی کرو گے تو تمہاری طرف سے تجاوز پایا جائے گا۔ اس آیت کریمہ کے نزول کے بعد:

”کان رسول اللہ ﷺ یقاتل من قاتل و یکف عن قتال من ترکہ“

رسول اللہ ﷺ ان لوگوں سے لڑائی کرتے جو آپ سے لڑائی کرتے اور جو آپ سے لڑائی نہیں کرتے تھے رسول اللہ ﷺ بھی ان سے لڑائی نہیں کرتے تھے:

”و بقی علی هذه الحالة الی ان نزل قوله تعالیٰ ﴿اَقْتُلُوا الْمُشْرِکِیْنَ﴾

نبی کریم ﷺ نے اسی پر کچھ دیر عمل کیا پھر اللہ تعالیٰ نے جہاد کا حکم عام کر دیا اور آیت کریمہ ﴿اَقْتُلُوا الْمُشْرِکِیْنَ﴾ نازل فرما کر مطلقاً کفار و مشرکین کو قتل کرنے کا حکم دیا جس سے پہلے لڑائی نہ کرنے کی شرط منسوخ کر دی گئی۔

شان نزول کی دوسری وجہ یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ چھٹے سن ہجری میں اپنے صحابہ کرام کو ساتھ لے کر عمرہ کرنے کی غرض سے مکہ مکرمہ کی طرف چلے۔ مقام حدیبیہ میں آپ نے قیام کیا اس جگہ اترنے کی وجہ یہ تھی کہ اس جگہ میں درخت بہت تھے اور پانی بھی تھا۔ لیکن کفار مکہ کو آپ کے تشریف لانے اور حدیبیہ میں اترنے کے متعلق معلوم ہو گیا تو انہوں نے آپ کو مکہ مکرمہ میں داخل ہونے سے منع کر دیا، ایک مہینہ تک آپ نے وہاں قیام کیا اور کفار سے بات چیت کے بعد ان سے چند شرائط پر صلح ہو گئی جن میں ایک شرط یہ تھی کہ تم اب واپس چلے جاؤ اور آئندہ سال آؤ عمرہ کر لو یعنی طواف کرو اور ہدی کے جانور ذبح کرو تین دن تک ٹھہرو اس میں نیکی کے کام جو چاہو کرو اور تین دن کے بعد پھر واپس لوٹ جانا۔

صلح کے بعد نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام مدینہ طیبہ میں لوٹ گئے آئندہ سال عمرہ کی تیاری کی تو صحابہ کرام کے دل میں خیال آیا کہ ہو سکتا ہے قریش وعدہ کی وفانہ کریں ہمارے ساتھ لڑائی شروع کر دیں تو ہم شہر حرام اور حرم شریف میں ان سے لڑائی نہیں کر سکیں گے تو ہم کیا کریں گے۔ اللہ تعالیٰ نے اس

آیت کریمہ کو نازل کر کے ان کے اس خدشہ کو دور کر دیا کہ اگر وہ تمہارے ساتھ پہلے لڑائی کریں تو جو بات تم بھی ان سے لڑائی کر سکو گے تمہارے لئے یہ لڑائی جائز ہوگی۔

شان نزول کی اگر یہ وجہ ہو تو آیت کریمہ منسوخ نہیں ہوگی کیونکہ حرم شریف میں اگر کوئی لڑائی کرے تو اس کے جواب میں لڑائی جائز ہے لیکن لڑائی کی ابتداء کرنا جائز نہیں یہ حکم باقی ہے۔ بعض حضرات نے پہلے شان نزول کے مطابق بھی آیت کریمہ کو منسوخ نہیں مانا کہ تجاوز کرنے کا مطلب کفار کی عورتوں اور بچوں اور بوڑھوں کو قتل نہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے جس کی تفصیل انشاء اللہ احادیث مبارکہ کے بیان میں آئے گی۔

راقم کا موقف: تفاسیر کے مختلف اقوال دیکھنے کے بعد راقم نے یہ رائے قائم کی ہے کہ نبی کریم ﷺ جب مکہ مکرمہ میں تھے جہاد کرنا بالکل منع تھا لیکن مدینہ طیبہ میں آنے کے بعد اس آیت کریمہ کے نزول سے ممانعت کے حکم میں کچھ نرمی کر دی گئی آہستہ آہستہ حکم کو مزید نرم کیا گیا لہذا اس آیت کریمہ کے منسوخ ہونے کی کوئی خاص وجہ نہیں۔

جب مسلمانوں کی تعداد قلیل تھی تو لڑائی سے مکمل منع کیا گیا تا کہ لڑائی میں زیادہ تکلیف نہ اٹھانی پڑے۔ جب مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہو گئی تو پھر بھی ابتدائی طور پر حکم یہ دیا کہ جو تمہارے ساتھ لڑائی کرے اس سے لڑائی کرو اور جو لڑائی نہ کرے اس سے لڑائی نہ کرو پھر حکم اور عام کر دیا گیا کہ کافروں سے جہاد کرو خواہ وہ تمہارے ساتھ لڑائی کریں یا نہ کریں۔

پھر صلح حدیبیہ کے بعد دوسرے سال عمرہ کی تیاری میں جب صحابہ کرام کے دل میں خدشہ پیدا ہوا کہ وہ حرم شریف میں ہمارے ساتھ اگر لڑائی کے درپے ہوئے تو ہم کیا کریں گے تو اسی آیت کریمہ سے پھر ان کو متنبہ کیا کہ حرم میں پہلے تم پر لڑائی کو منع کیا گیا ہے اگر کافر تمہارے ساتھ لڑائی کریں تو تم اپنا دفاع حرم میں بھی کر سکتے ہو۔

(ماخوذ از کبیر بنصرہ)

﴿وَأَقْتُلُوهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوهُمْ وَأَخْرِجُوهُمْ مِّنْ حَيْثُ
أَخْرَجُوكُمُ وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ وَلَا تَقَاتِلُوهُمْ عِنْدَ
الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتَّى يُقَاتِلُوكُمْ فِيهِ فَإِنْ قَاتَلُوكُمْ
فَأَقْتُلُوهُمْ كَذَلِكَ جَزَاءُ الْكَافِرِينَ﴾

(۱) ”اور کافروں کو جہاں پاؤ مارو اور انہیں نکال دو جہاں سے انہوں نے تمہیں نکالا تھا اور ان کا
فساد تو قتل سے بھی سخت ہے اور مسجد حرام کے پاس ان سے نہ لڑو جب تک وہ تم سے وہاں نہ
لڑیں اور اگر تم سے لڑیں تو انہیں قتل کرو کافروں کی یہی سزا ہے۔“

(۲) ”اور قتل کرو ان (کافروں) کو جہاں تم ان کو پاؤ، اور نکالو ان کو جہاں سے انہوں نے نکالا
تمہیں اور فتنہ سخت ہے قتل سے اور تم نہ لڑو ان سے مسجد حرم کے پاس یہاں تک کہ وہ لڑائی
کریں تمہارے ساتھ اس میں تو اگر وہ لڑائی کریں تمہارے ساتھ تو ان کو قتل کرو اسی طرح بدلہ
ہے کافروں کا۔“

مختصر وضاحت:

ثقف یثقف کا لغوی معنی ہے کسی چیز میں مہارت حاصل کرنا خواہ علم کے لحاظ پر ہو یا عمل کے
لحاظ پر ہو۔

”فہو یتضمن معنی الغلبة فالمعنی حیث تمکنتم علی قتلہم“

پھر یہ غالب آنے کے معنی کو متضمن ہے اب معنی یہ ہے جہاں بھی تم ان کو قتل کرنے پر قادر ہو
وہاں ہی ان کو قتل کر دو (مظہری) اسی معنی کے مناسب زیادہ مفسرین نے ﴿حَيْثُ ثَقِفْتُمُوهُمْ﴾ کا
ترجمہ کیا ہے ”حیث وجدتموہم“ اور قتل کرو ان کو جہاں تم ان کو پاؤ۔

﴿وَأَخْرِجُوهُمْ مِّنْ حَيْثُ أَخْرَجُوكُمْ﴾

”اور نکال دو ان کو جہاں سے انہوں نے تمہیں نکالا“

یعنی کفار نے تمہیں مکہ سے نکالا تھا اب تم ان کفار کو مکہ سے نکال دو فتح مکہ کے بعد جن لوگوں نے اسلام قبول نہیں کیا تھا ان کو مکہ مکرمہ سے نکال دیا گیا۔ مکمل تفصیل تو چھیسیویں پارہ میں ہے یہاں صرف اتنا سمجھ آئے کہ حدیبیہ میں اگر صلح کا معاہدہ دس سال کے لئے ہوا تھا لیکن کفار نے خود ہی عمرہ کی قضا کے بعد اس معاہدہ کے خلاف کام کرنا شروع کر دیا تھا جس کی وجہ سے انہوں نے خود ہی معاہدہ پہلے توڑ دیا تھا۔ اس لئے فتح مکہ اور کفار کو مکہ سے نکالنا مسلمانوں کی طرف سے نہ کوئی زیادتی تھی اور نہ ہی وعدہ کی خلاف ورزی تھی۔

وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ : ”اور فتنہ سخت ہے قتل سے۔“

یعنی تم جو خوف کر رہے ہو کہ ہم احرام میں ہوں گے اور حرم کی سرزمین ہوگی تو ہمارے ساتھ اگر کافر لڑائی کریں گے تو ہم کیا کریں گے؟ تو اس پر اللہ تعالیٰ تمہیں بتا رہا ہے کہ کفار کا شرک کرنا اور تمہیں مسجد حرام سے روکنا اور طرح طرح کا فساد برپا کرنا فتنہ ہے اور اللہ تعالیٰ کے ہاں فتنہ عظیم جرم ہے اور عظیم گناہ ہے نسبت لڑائی کرنے اور ان کو قتل کرنے کے، اگرچہ تمہاری طرف سے قتل کی ابتدا تو رب تعالیٰ کو پسند نہیں لیکن اگر وہ تمہارے قتل کے درپے ہوتے ہیں۔ تو تم بھی ان کو قتل کر دینا تمہارے لئے حرم میں دفاعی جنگ کو حلال کر دیا گیا ہے۔

﴿وَلَا تُقَاتِلُوهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتَّى يُقَاتِلُوكُمْ فِيهِ فَإِنْ قَاتَلُوكُمْ فَاقْتُلُوهُمْ﴾

”اور تم نہ لڑو ان سے مسجد حرام کے پاس یہاں تک کہ وہ لڑائی کریں تم سے اس میں تو اگر وہ لڑائی کریں تمہارے ساتھ تو تم قتل کرو ان کو“۔ یہاں ذکر مسجد حرام کا ہے مراد تمام حرم ہے یعنی ذکر جزاء کا ہے اور مراد کل ہے جسے مجاز مرسل کہا جاتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ حرم میں تم ان سے لڑائی نہ کرنا جب تک وہ تمہارے ساتھ لڑائی نہ کریں ہاں اگر وہ حرم شریف کا احترام نہ کریں اور تمہارے ساتھ لڑائی کریں تو تم بھی ان کو قتل کر دینا۔

مطلب واضح ہوا کہ حرم شریف کے احترام کا حکم تا قیامت موجود رہے گا مسلمانوں کے لئے جائز نہیں کہ وہ حرم شریف میں لڑائی کریں ہاں اگر کافر مسلمانوں کو حرم شریف میں اس لئے قتل کرنا شروع کر دیں کہ یہ حرم شریف کے احترام کی وجہ سے ہمارے ساتھ لڑائی نہیں کریں گے تو تم اس وقت بہت

شریف اور سیدھے سادے بن کر نہ رہنا بلکہ ان کو بطور دفاع حرم شریف میں ہی قتل کر دینا یہ تمہارے لئے جائز ہے۔ اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے دن فرمایا:

”ان هذا البلد حرمة الله يوم خلق السماوات والارض فهو حرام بحرمة الله الى يوم القيامة وانه لن يحل القتال فيه لاحد قبلى ولم يحل لى الا ساعة من نهار فهو حرام بحرمة الله الى يوم القيامة لا يعصد شوكة ولا ينفر صيده“
(رواه البخارى ومسلم)

بیشک اللہ تعالیٰ نے اس شہر (حرم مکہ) کو زمین و آسمان کی پیدائش کے دن سے ہی محترم بنا دیا ہے اس لئے اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے احترام عطا کرنے کی وجہ سے قیامت تک احترام حاصل رہے گا مجھ سے پہلے کسی کے لئے اس میں جنگ کرنا جائز نہ ہوا اور میرے لئے بھی سوائے دن کی ایک گھڑی کے اس میں جنگ حلال نہ ہوئی تا قیامت اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے احترام عطا کرنے کی وجہ احترام حاصل ہے اس کے کانٹے نہ کاٹے جائیں اور اس کے شکار کو نہ بھگایا جائے۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”لا يحل لاحدكم ان يحمل بمكة السلاح“ (رواہ مسلم) تم میں سے کسی کے لئے حلال نہیں کہ وہ مکہ میں ہتھیار اٹھائے۔

وَكَذَلِكَ جَزَاءُ الْكَافِرِينَ: ”اور اسی طرح بدلہ ہے کافروں کا“

یعنی دنیا میں ان کی سزا اور ان کا بدلہ یہ ہے کہ جہاں سے انہوں نے تمہیں نکالا وہاں سے تم ان کافروں کو نکال دو اور اگر وہ تمہارے ساتھ حرم میں اور شہر حرام (یعنی ذیقعد جس میں عمرہ کو قضا کیا جا رہا تھا) میں اور تمہارے احرام کی حالت میں لڑائی کریں تو تم بھی ان کو قتل کر دو اور آخرت میں ان کو دردناک عذاب دیا جائے گا۔

(از جلالین و صاوی و مظہری)

☆☆☆☆☆

﴿فَانِ انتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾

(۱) ”پھر اگر وہ باز رہیں تو بیشک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔“

(۲) ”پھر اگر وہ رک جائیں تو بیشک اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔“

یعنی اگر وہ کافر کفر و شرک سے اور لڑائی کرنے سے اور فتنہ و فساد سے رک جائیں اور اسلام لے آئیں اور توبہ کر لیں تو اللہ تعالیٰ ان کے پہلے جرموں کو بخش دے گا جب وہ ایمان لے آئے تو اللہ تعالیٰ کے مقرب بندے بن جائیں گے تو اللہ تعالیٰ ان پر رحم فرمائے گا۔
(از جلالین و مظہری)

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

”انتہوا“ اصل میں ”انتہیوا“ ہے یا متحرک ماقبل فتح ہونے کی وجہ سے یا کوالف سے تبدیل کر دیا الف التقاء ساکنین کی وجہ سے گر گیا تو ”انتہوا“ رہ گیا۔
(از صادری)

﴿وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰی لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّیَكُوْنَ الدِّیْنُ لِلّٰهِ فَاِنَّ اَنْتَهُوْا فَلَا عُدُوَانَ اِلَّا عَلَی الظَّالِمِیْنَ﴾

(۱) ”اور ان سے لڑو یہاں تک کہ کوئی فتنہ نہ رہے اور ایک اللہ کی پوجا ہو پھر اگر وہ باز آئیں تو زیادتی نہیں مگر ظالموں پر۔“

(۲) ”اور لڑائی کرو ان سے یہاں تک کہ نہ رہے فتنہ اور ہو جائے دین خالص (اللہ) کے لئے پھر اگر وہ رک جائیں تو زیادتی نہیں مگر ظالموں پر۔“

یعنی مشرکوں سے جنگ کرو یہاں تک کہ شرک اور فتنہ و فساد ختم ہو جائے اور مکہ مکرمہ میں دین خالص اللہ تعالیٰ کیلئے ہو جائے عبادت اور طاعت صرف رب تعالیٰ کو ہوا سکے غیر کی عبادت نہ کی جائے۔

☆ ”عن ابن عمر قال قال رسول الله ﷺ امرت ان اقاتل الناس حتى يشهدوا ان لا اله الا الله وان محمدا رسول الله و يقيموا الصلوة و يؤتوا الزكاة فاذا فعلوا ذلك عصموا مني دماءهم و اموالهم الا بحق الاسلام و حسابهم على الله تعالى“ (بخاری و مسلم)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں (کافروں) سے لڑائی کروں یہاں تک کہ وہ شہادت دیں کہ اللہ کے بغیر کوئی معبود نہیں اور بیشک محمد اللہ کے رسول ہیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں۔ تو جب یہ کام وہ کر لیں تو انہوں نے اپنے خونوں اور مالوں کو مجھ سے بچا لیا سوائے حقوق اسلامیہ کے (کی وجہ سے جو ان پر بطور قصاص قتل لازم آئے یا کسی کے مال کے بدلے مال لازم آئے) اور ان کا حساب اللہ تعالیٰ پر ہے۔

اگر وہ لوگ شرک اور لڑائی اور فتنہ و فساد سے رک جائیں تو ان پر کوئی زیادتی نہیں یعنی ان کو قتل نہ کیا جائے اور نہ ہی ان کو قید کیا جائے ہاں البتہ ان میں سے جو شرک پر قائم رہیں تو ان کو قتل کر دیا جائے۔

(از مظہری)

﴿الشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمَتُ قِصَاصٌ
فَمَنْ اعْتَدَى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدَى
عَلَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ﴾

(۱) ”ماہ حرام کے بدلے ماہ حرام اور ادب کے بدلے ادب ہے جو تم پر زیادتی کرے اس پر زیادتی

کرو اتنی ہی جتنی اس نے کی اور اللہ سے ڈرتے رہو اور جان رکھو کہ اللہ ڈروالوں کیساتھ ہے۔“

(۲) ”عزت والا مہینہ بدلے عزت والے مہینہ کے اور حرمت کے بدلے حرمت تو جو تم پر زیادتی

کرے تم اس سے انتقام لو اتنا جتنی اس نے زیادتی کی ہے تم پر اور ڈرو اللہ سے اور جان لو

بیشک اللہ ساتھ ہے تقویٰ رکھنے والوں کے۔“

مختصر وضاحت : حضرت صدر الافاضل مولانا نعیم الدین مراد آبادی رحمہ اللہ نے

﴿الشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ﴾ کی تفسیر میں یوں بیان فرمایا ”جب گزشتہ سال ذی القعدہ 6ء

میں مشرکین عرب نے ماہ حرام کی حرمت و ادب کا لحاظ نہ رکھا اور تمہیں ادائے عمرہ سے روکا تو بے حرمتی

ان سے واقع ہوئی اور اس کے بدلے بتوفیق الہی 7ء کے ذی القعدہ میں تمہیں موقع ملا کہ تم عمرہ

قضاء کو ادا کر لو۔

(خزانة العرفان)

تا ہم جلالین میں یوں ذکر ہے:

﴿الشَّهْرُ الْحَرَامُ﴾ المحرم مقابل ﴿بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ﴾ فکما
قاتلوکم فیہ فاقتلوہم فی مثلہ رد لا ستعظام المسلمین ذلک

حرمت والا مہینہ حرمت والے مہینہ کے مقابل ہے اگر وہ حرمت والے مہینہ کا لحاظ نہ کریں
تمہارے ساتھ لڑائی کریں تو تم بھی اسی طرح ان سے لڑائی کرو اور ان کو قتل کر دو۔ یہ آیت کریمہ مسلمانوں
کے اس خدشہ کو دور کرنے کے لئے نازل ہوئی جو ان کو لاحق تھا کہ حرمت والے مہینہ اور حرم میں ان سے
ہم کیسے لڑائی کریں گے؟

﴿وَالْحُرُمَاتُ قِصَاصٌ﴾ ای متی حصل انتهاک من احد لحرمة
آخر سقطت حرمتہ فیقتص له منه

عزت کے بدلے عزت کا مطلب یہ ہے کہ جب ایک شخص دوسرے کی حرمت و عزت کا لحاظ
رکھے تو یہ بھی اس کا لحاظ رکھے اور اگر ایک شخص دوسرے کی عزت کا لحاظ نہ رکھے تو یہ بھی اس کی عزت کا
پاس چھوڑ دے۔ (صاوی)

﴿فَمَنْ اَعْتَدَى عَلَیْكُمْ﴾ جو شخص تم پر تجاوز کرے زیادتی کرے یعنی حد سے تجاوز کر جائے
﴿فَاعْتَدُوا عَلَیْهِ بِمِثْلِ مَا اَعْتَدَى عَلَیْكُمْ﴾ ای انتقموا منه "تو تم اس سے انتقام لو انتقام لینے
اور ان سے قتال (لڑائی) کرنے کو ﴿فَاعْتَدُوا عَلَیْهِ﴾ سے تعبیر کر دیا اس کی وجہ مشاکلت ہے ان کی
زیادتی کے بدلے کو زیادتی کہہ دیا چونکہ بظاہر شکل ایک جیسی ہوگی۔

﴿بِمِثْلِ مَا اَعْتَدَى عَلَیْكُمْ﴾ سے وہی مسئلہ بطور تاکید ذکر فرمایا جو ﴿الْحُرُمَاتُ
قِصَاصٌ﴾ میں ذکر فرمایا کہ جب وہ تم پر زیادتی کریں تو تم بھی ان کی زیادتی کی طرح ان سے انتقام
لے لو۔

﴿وَاتَّقُوا اللَّهَ﴾ اور ڈرو اللہ سے یعنی اللہ تعالیٰ سے تقویٰ حاصل کرو تقویٰ حاصل ہونا
درحقیقت اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے اپنے بندوں پر اس لئے اپنے آپ کو اس رحمت کا مستحق بناؤ اس سے
اپنے آپ کو محروم نہ کرو۔

﴿وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ﴾ اور جان لو بیشک اللہ تعالیٰ تقویٰ کرنے والوں کے ساتھ ہے یعنی خصوصی معیت ان کو حاصل ہے جس کی وجہ سے خصوصی امداد ان کو حاصل ہے ورنہ اللہ تعالیٰ اپنے علم و تصرف کے لحاظ سے ہر انسان کے ساتھ ہے خواہ وہ مومن ہو یا کافر۔ (از جلالین و صاوی)

آیات جہاد کے متعلق تفصیلی بحث:

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ﴾ ”اور لڑائی کرو اللہ کی راہ میں“

اس سے واضح ہوا کہ وہی جہاد باعث اجر و ثواب ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی رضا پائی جائے اور اللہ تعالیٰ کے دین کی بلندی کے لئے جہاد کرے ”وقال ابن الہمام وهو دعوتهم الى الدين الحق“ جہاد کا مقصد ہی دین حق کی طرف دعوت دینا ہے۔ (مرقاۃ ج ۷ ص ۲۶۴)

☆ ”وعن ابي موسى قال جاء رجل الى النبي ﷺ فقال الرجل يقاتل للمغنم والرجل يقاتل للذكر والرجل يقاتل ليري مكانه فمن في سبيل الله قال من قاتل لتكون كلمة الله هي العليا فهو في سبيل الله“ (بخاری و مسلم، مشکوٰۃ کتاب الجہاد)

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ایک شخص نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور پوچھا کہ ایک شخص مال غنیمت حاصل کرنے کے لئے جہاد کرتا ہے اور ایک شخص جہاد کرتا ہے کہ اس کا چرچا ہو اور ایک شخص جہاد کرتا ہے کہ اس کی شجاعت و بہادری کو لوگ دیکھیں ان میں سے کسی شخص کا جہاد اللہ کی راہ میں ہے؟ نبی کریم ﷺ نے فرمایا، جس نے جہاد اللہ تعالیٰ کے کلمہ کی بلندی کیلئے کیا، وہی جہاد اللہ کی راہ میں جہاد ہے۔

وضاحت حدیث: ”الرجل“ اس حدیث میں جتنی مرتبہ استعمال ہوا ہے وہ شخص کے معنی میں ہے سوائے پہلی مرتبہ کے ”جاء رجل“ میں ایک مرد آیا، اس کا معنی ہے اگرچہ راقم نے با محاورہ معنی شخص سے ہی کیا ہے ”فقال الرجل يقاتل للمغنم“ اس مقام میں ”قال“ کا فاعل ”هو“ ضمیر مقدر ہے۔ اور ”الرجل“ سوالیہ جملہ کا مبتداء ہے عبارت اس طرح ہوگی:

” (فقال) ذلك الرجل (الرجل) ای جنس الرجل بمعنى الشخص

يقاتل للمغنم“

یعنی وہ شخص جو آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اس نے کہا (پوچھا) کہ ایک شخص مال غنیمت کے لئے جہاد کرتا ہے: (والرجل) الآخر (يقاتل للذكر) ایک اور شخص جہاد کرتا ہے کہ اس کا چرچا ہو اس مقام میں ”ذکر“ کا معنی ہے آواز، شہرت، دکھلاوا، لوگوں کو سنانا یعنی اس کے جہاد کرنے میں مقصد لوگوں کو اپنی بہادری دکھانی اور اپنا چرچا کرنا مقصود ہوتا ہے کہ لوگ میری بہادری کی تعریف کریں:

” (والرجل) الآخر (يقاتل لیری) بصيغة المجھول ای لیعلم او

یبصر (مکانہ) بالرفع ای مرتبہ فی الشجاعة“

ایک اور شخص جہاد کرتا ہے کہ اس کا شجاعت و بہادری میں مرتبہ لوگوں کو دکھایا جائے اور ان کو معلوم ہو جائے کہ میں کتنا بہادر ہوں ان میں سے کسی شخص کا جہاد اللہ کی راہ میں شمار ہوگا؟ نبی کریم ﷺ نے نہایت حکیمانہ جواب دیا:

” من قاتل لکون کلمة الله (ای کلمة التوحید وہی لا اله الا الله)

فهو فی سبیل الله“

جو شخص اللہ تعالیٰ کے کلمہ (یعنی کلمہ توحید) کی بلندی کے لئے جہاد کرتا ہے اسی کا جہاد اللہ کی راہ میں شمار ہوگا۔ کیا خوب جواب ہے کہ جہاد کرنے میں مقصد اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنی ہو اور اللہ تعالیٰ کے دین کی بلندی مقصود ہو تو وہی جہاد اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد ہوگا۔ نیت صرف مال غنیمت کی نہ ہو کیونکہ مال غنیمت خود ہی حاصل ہو جانا ہے اور اسی طرح نیت صرف اپنا چرچا اور اپنی بہادری کا مرتبہ نہ دکھانا ہو بلکہ صرف دین کی بلندی مقصود ہو تو یہ چیزیں خود بخود حاصل ہو جائیں گی۔ یہ بھی خیال رہے کہ جنت کے حصول کے لئے جہاد اللہ کی راہ میں ہی شمار ہوگا کیونکہ اس میں مقصد ہی اللہ کے دین کی بلندی ہوگی جس پر جنت کا حاصل ہونا مرتب ہوگا اس لئے نبی کریم ﷺ نے جہاد میں شرکت کے لئے فرمایا ” قوموا الی جنة“ جنت کی طرف جانے کے لئے کھڑے ہو جاؤ ” فالمراد بهما واحدو المال متحد“ اس لئے جنت حاصل ہونے کے ارادہ سے اور دین کی بلندی کے لئے جہاد کرنے سے ایک ہی چیز مراد ہے اور مقصد ایک ہی ہے یہ دونوں چیزیں متحد ہیں علیحدہ علیحدہ نہیں۔ (ازمراقاة ج ۷ ص ۲۸۴)

☆ "وعن ابن عباس قال قال رسول الله ﷺ عینان لا تمسهما النار عین بکت من خشية الله وعین باتت تحرس فی سبیل الله"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دو آنکھوں کو آگ مس نہیں کرے گی ایک وہ آنکھ جو اللہ تعالیٰ کے ڈر کی وجہ سے روئی اور دوسری وہ آنکھ جس نے اللہ کی راہ میں رات نگہبانی کرتے ہوئے گزاری۔
(ترمذی، مشکوٰۃ باب الجہاد)

پہلی آنکھ نفس سے جہاد کرنے والوں کی مراد ہے جو گناہوں سے توبہ کرتے ہیں عبادت میں رو کر رات گزار دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا خوف کسی کو بھی حاصل ہو اور روئے خواہ عالم ہو یا جاہل ہے اس کی رونے والی آنکھ سے بھی مراد اس شخص کی ذات ہے کہ وہ شخص جہنم کی آگ سے محفوظ رہے گا لیکن عالم کو یہ مرتبہ زیادہ حاصل ہوتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کی شان میں بیان فرمایا:
﴿انما يخشى الله من عباده العلماء﴾

"اللہ تعالیٰ سے کامل ڈرنے والے اس کے بندوں سے صرف علماء ہی ہیں۔"

اور دوسری آنکھ، یعنی دوسرا شخص وہ مراد ہے جو جہاد میں دشمن کے سامنے کھڑا ہو اور رات نگہبانی کرتے ہوئے گزار دے یعنی صرف اللہ تعالیٰ کی رضا مقصود ہو اسے بھی جہنم کی آگ مس نہیں کرے گی۔
علامہ غزالی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"الخوف سوط الله تعالى يسوق به عباده الى المواظبة على العلم والعمل لينا لواء بهما رتبة القرب الى الله تعالى"

خوف اللہ تعالیٰ کا کوڑا ہے جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو علم و عمل پر قائم رکھتا ہے تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کر سکیں۔ جس کو علم و عمل حاصل ہوگا اس کو ہی حقیقی خوف ہوگا۔ اسی خوف سے رونے والی آنکھ جہنم کو آگ سے محفوظ رہے گی۔ مندرجہ بالا حدیث سے بھی واضح ہوا کہ جہاد ہی اللہ کی راہ میں شمار ہوگا جس میں اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنی مقصود ہوگی۔

☆ "وعن ابی ہریرۃ ان رجلا قال یا رسول الله رجل يريد الجهاد فی سبیل الله وهو يتغنى عرضا من عرض الدنيا فقال النبی ﷺ لا اجر له"

(رواہ ابو داؤد، مشکوٰۃ کتاب الجہاد)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ (اس شخص کا کیا حکم ہے) جو شخص اللہ کی راہ میں جہاد کرتا ہے لیکن وہ دنیا کے سامان میں سے کسی چیز کو حاصل کرنا چاہتا ہو تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا اسے کوئی اجر حاصل نہیں۔

وضاحت حدیث:

”عرض (بفتح الراء) ما كان من مال قل او كثر، وبالسكون المتاع“

یعنی ”عرض“ کی راء پر جب زبر ہو تو معنی ہوگا مال خواہ قلیل ہو یا کثیر۔ اور جب راء ساکن ہو تو اس کا معنی سامان ہوتا ہے۔ درہم اور دینار کے بغیر ہر قسم کے مال کو ”عرض“ کہا جاتا ہے۔ مطلب واضح ہے کہ سائل نے یہ پوچھا کہ اگر کوئی شخص مال حاصل کرنے کی غرض سے جہاد کرے تو اس کا کیا حکم ہے؟ تو آپ نے فرمایا اسے کوئی اجر حاصل نہیں۔

یہ حکم اس وقت ہے جب وہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے جہاد نہ کرے بلکہ صرف جہاد نہ کرے بلکہ صرف مال و دولت حاصل کرنے کے لئے جہاد کرے۔

”واما اذا غزا لله وقصد حصول الغنیمۃ فلا شک ان له الاجر“

لیکن جب کوئی شخص جہاد تو صرف اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے کرتا ہے البتہ مال غنیمت حاصل ہونے کی بھی نیت کر لے تو اسے یقیناً اجر حاصل ہونا ہے۔ ہاں البتہ خالص اللہ تعالیٰ کی رضا کی نیت کرے تو اسے ثواب زیادہ حاصل ہوگا۔

☆ ”وعن معاذ قال قال رسول الله ﷺ الغز وغزو ان فاما من ابتغى وجه الله واطاع الامام وانفق الكريمة وياسر الشريك واجتنب الفساد فان نومه ونهه اجر كله واما من غزا فخر او رياء وسمعة وعصى الامام وافسد في الارض فانه لم يرجع بالكفاف“
(رواه مالك وابوداود والنسائي، مشکوٰۃ مات الجہاد)

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جہاد کی دو قسمیں ہیں ایک یہ ہے کہ جہاد میں اللہ تعالیٰ کی رضا کی طلب پائی جائے اور امام کی اطاعت کرے اور اپنا پسندیدہ مال خرچ کرے اور اپنے ساتھ شریک (دوست) کے لئے آسانی پیدا کرے اور فساد سے اجتناب کرے بیشک

اس کا سونا اور جاگنا سب ہی باعث ثواب ہیں (دوسری قسم جہاد کی یہ ہے) جس شخص نے جہاد کیا فخر کے طور پر دکھلاوا کے لئے اور چرچا کے لئے اور امام کی نافرمانی کی اور زمین میں فساد برپا کیا تو اسے کوئی ثواب حاصل نہیں۔

”فانه لم يرجع بالكفاف، قال القاضي ای لم يرجع بالثواب ماخوذ من مكفاف الشئ“
(مرقاۃ ج ۷ ص ۳۰۲)

(ترجمہ ذکر کرو یا گیا)۔

☆ ”عن عبد الله بن عمرو انه قال يا رسول الله اخبرني عن الجهاد فقال يا عبد الله بن عمرو ان قاتلت صابرا محتسبا بعثك الله صابرا محتسبا وان قاتلت مرائيا مكاثرا بعثك الله مرائيا مكاثرا يا عبد الله بن عمرو على اي حال قاتلت او قتلت بعثك الله على تلك الحال“
(رواه ابو داود، مشکوة باب الجهاد)

حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص سے مروی ہے کہ انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ مجھے جہاد کے متعلق خبر دیں آپ نے فرمایا اے عبد اللہ بن عمرو اگر تم نے جہاد کیا صبر سے اور ثواب کی امید سے اللہ تعالیٰ سے خلوص رکھتے ہوئے تو اللہ تعالیٰ تمہیں صابر و مخلص اٹھائے گا اور اگر تم نے جہاد کیا دکھلاوے اور کثرت پر فخر کرتے ہوئے تو اللہ تعالیٰ تمہیں ریاء کار اور کثرت پر فخر کے حال میں ہی اٹھائے گا۔ اے عبد اللہ بن عمرو جس حال میں تم جہاد کرو گے اس حال میں تمہیں اللہ تعالیٰ اٹھائے گا۔

وضاحت حدیث:

جہاد کے متعلق سوال کا یہ مطلب تھا کہ آپ بتائیں کہ کونسا وہ جہاد ہے جو افضل ہے اور باعث ثواب ہے اور مقبول ہے اسی سے غیر مقبول خود بخود سمجھ آ جائے گا۔ ”صابرا محتسبا“ صابر کا معنی صبر کرنے والا ”محتسبا خالصا لله تعالیٰ“ اور محتسب کا معنی اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے خلوص رکھنے والا یعنی جہاد کرنے والا جب صبر و خلوص سے جہاد کرے گا تو اللہ تعالیٰ اسے صبر و خلوص کی حالت میں ہی اٹھائے گا۔

خیال رہے کہ اگرچہ دونوں مقاموں میں ”صابرا محتسبا“ نکرہ ذکر ہے لیکن پہلے مقام پر

توینِ تقلیل کے لئے ہے دوسرے مقام پر توینِ تکثیر و تعظیم کے لئے ہے۔ اب مطلب یہ ہوا کہ جہاد کرنے والے نے معمولی صبر و خلوص سے بھی جہاد کیا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ”انہ لہ اجر و ثوابا لا یقدر قدرہ“ اسے اتنا اجر و ثواب حاصل ہوگا کہ اس کا اندازہ نہیں کر سکے گا۔ اور اللہ تعالیٰ اسے کامل صابر کے درجے میں اٹھائے گا اور بے حساب اجر اسے عطا فرمائے گا۔ اور اسے کامل اخلاص کے درجہ میں اٹھائے گا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس سے راضی ہوگا اور وہ اللہ تعالیٰ سے راضی ہوگا۔

”ورضوان من اللہ اکبر“ اللہ تعالیٰ کی معمولی رضامندی بہت بڑی چیز ہے۔ تمام انعام و اکرام اسی میں موجود ہوں گے۔ روایت میں آتا ہے ”کما تعیشون تموتون و کما تموتون تحشرون“ جس طرح تم زندگی گزارو گے اس طرح تمہاری موت آئے گی اور جس طرح تم پر موت آئے گی اس طرح تمہیں اٹھایا جائے گا۔

”وان قاتلت مرانیہ مکاثرا بعثک اللہ مرانیہ مکاثرا“

مرایا، کا معنی واضح ہے دکھلاوا کرنا، یعنی جو شخص جہاد دکھلاوے کی غرض سے کرے گا وہ اجر و ثواب سے محروم ہوگا کیونکہ اسے اٹھایا ہی اس حال میں جائے گا کہ سب کو معلوم ہوگا کہ یہ ریاء کاری کرنے والا شخص ہے۔ خیال رہے جو عمل بھی ریاء کاری سے ہوگا اس میں اجر و ثواب حاصل نہیں ہوگا۔

﴿التکاثر﴾ کے معنی میں وسعت ہے ”التکاثر التباری فی الکثرة والتباہی بها“ کثرت میں مقابلہ کرنا اور کثرت میں فخر کرنا ﴿التکاثر﴾ کہلاتا ہے کبھی کوئی شخص جہاد کرتا ہے اس غرض سے کہ مال غنیمت حاصل ہوگا اور مال میں زیادتی ہوگی۔ اور کبھی کوئی شخص جہاد کرتا ہے اس پر فخر کرتے ہوئے کہ میرے پاس لشکر زیادہ ہے مددگار زیادہ ہیں مجھے شجاعت زیادہ حاصل ہے اس غرض سے کیا ہوا جہاد اللہ تعالیٰ کے کلمہ اور دین کی بلندی کے لئے نہیں ہوگا اور نہ ہی اس میں کوئی اجر و ثواب حاصل ہوگا۔

(ازمرقاۃ ج ۷ ص ۳۰۳، ۳۰۴)

اس کے بعد نبی کریم ﷺ نے مطلقاً ایک ضابطہ بیان کر دیا کہ جو شخص جس نیت سے جہاد کرے گا اسی کے مطابق اللہ تعالیٰ اسے اٹھائے گا (واضح ہوا کہ جہاد وہی اللہ تعالیٰ کے حضور معتبر ہے جو اس کی رضاء کے لئے ہو)

جہاد تدریجاً فرض ہوا: اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو جہاد کا حکم تدریجی طور پر بالترتیب دیا ہے:
پہلا حکم: ”وقد كان ﷺ مأموراً أولاً بالتبليغ والاعراض (فاصدع بما تؤمر

واعرض عن المشركين“

نبی کریم ﷺ کو پہلے صرف تبلیغ کرنے کا حکم تھا رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿يا ايها الرسل بلغ ما انزل اليك من ربك﴾

”اے رسول تبلیغ فرما دو اس کی جو تمہاری طرف نازل ہوا تمہارے رب کی طرف سے“

اور ارشاد فرمایا:

﴿فاصدع بما تؤمر واعرز عن المشركين“

”تو علانیہ کہہ دو جس بات کا تمہیں حکم ہے اور مشرکوں سے منہ پھیر لو“

یعنی ابتدائی طور پر مشرکوں کی طرف سے ایذا اور ملامت کرنے کا جواب نہ دینے کا حکم تھا کہ تم درگزر کرو اور ان کو معاف کر دو علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے ”الاتقان“ میں بیان فرمایا ہے کہ ایک سو چوبیس آیات قرآن پاک میں وہ ہیں جن میں درگزر کرنے کا حکم دیا گیا ہے کہ کافروں کی زیادتیاں برداشت کی جائیں لیکن ﴿فاقتلوهم حيث ثقتموهم﴾ سے وہ تمام منسوخ کر دی گئیں۔

دوسرا حکم: ”ثم بالمجادلة بالاحسن ﴿ادع الى سبيل ربك بالحكمة والموعظة

الحسنة وجادلهم بالتي هي احسن﴾ (النحل ۱۲۵)

پھر اچھے طریقہ سے جھگڑا کرنے کا حکم دیا یعنی دلائل سے ان کا رد کریں اتنی حد تک کفار سے درپے ہونے کی اجازت دی ارشاد باری تعالیٰ کا ترجمہ: ”اپنے رب کی راہ کی طرف بلاؤ پکی تدبیر اور اچھی نصیحت سے اور ان سے اس طریقہ پر بحث کرو جو سب سے بہتر ہو۔ اچھے طریقہ سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف اس کی آیات و دلائل سے بلاؤ اسی کو مجادلہ حسنہ (اچھا جھگڑا) کہا ہے۔

تیسرا حکم: ”ثم اذن لهم بالقتال اذن للذين يقاتلون بانهم ظلموا وان الله على

نصرهم لقدير“ (الحج ۳۹)

اجازت عطا ہوئی انہیں جن سے کافر لڑتے ہیں اس بنا پر کہ ان پر ظلم کیا جائے اور بیشک اللہ ان

کی مدد کرنے پر ضرور قادر ہے۔

یعنی اس آیت سے مظلومین مسلمانوں کو کفار سے لڑنے کی اجازت دے دی گئی یہ نہیں فرمایا کہ ضرور لڑائی کرو بلکہ ان کی مشیت پر حکم کو موقوف کر دیا گیا چاہیں تو لڑائی کریں اور چاہیں تو درگزر سے کام لیں۔ چوتھا حکم: ”ثم امروا بالقتال ان قاتلوهم ﴿فان قاتلوكم فاقتلوهم﴾“

پھر ان کو لڑائی کرنے کا حکم دیا لیکن مشروط طور پر کہ اگر وہ تمہارے ساتھ لڑائی کریں تو تم بھی ان سے لڑائی کرو لیکن اس میں بھی ان کی زیادتی کے مطابق ان سے انتقام لینے کا حکم دیا، تجاوز نہ کرنے کا حکم دیا اور پہلے مسلمانوں کو لڑائی کرنے سے بھی منع کر دیا گیا۔

پانچواں حکم: ”ثم امروا به بشرط انسلاخ الاشهر الحرم (فاذا انسلخ

الاشهر الحرم فاقتلوا المشركين)

کافروں کی طرف سے لڑائی شروع کرنے پر بھی حرمت والے مہینوں (رجب، شوال، ذیقعد، ذی الحج) میں مسلمانوں کو پہلو تہی کرنے کا حکم دیا گیا البتہ حرمت والے مہینوں کے گزر جانے پر ان سے لڑائی کرنے کا حکم دیا گیا۔

چھٹا حکم: ”ثم امروا به مطلقا ﴿وقاتلوا في سبيل الله﴾“

پھر مطلقاً حکم دے دیا گیا کہ اللہ کی راہ میں لڑائی کرو اور حکم دیا ﴿فاقتلوهم﴾ حیث ثقتموہم ﴿ان کو قتل کرو جہاں ان کو پاؤ۔ لیکن اس حکم میں بھی حرم شریف میں قتل کرنے کی ممانعت جوں کی توں رہی اور اب بھی حکم یہی ہے۔

”واستقر الامر على هذا في جميع الا زمان والاماكن سوى الحرم“

علامہ سرخسی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا کہ اب حکم یہی ہے کہ ہر زمانہ میں اور ہر جگہ میں جہاد کرنا جائز ہے لیکن حرم شریف میں اب بھی منع ہے تا قیامت منع رہے گا جیسا کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی پہلے ذکر کر دیا گیا ہے۔

تنبیہ: ”وفي الخانية ان الا فضل ان لا يتدأ به في الاشهر الحرم“

قاضی خان رحمہ اللہ نے بیان فرمایا کہ افضل یہ ہے کہ مسلمان حرمت والے مہینوں میں جنگ کی ابتداء نہ کریں کفار کی طرف سے حرمت والے مہینوں میں جنگ چھیڑ دی جائے تو اس کے جواب میں جنگ ضرور کی جائے کفار کا منہ توڑ جواب دیا جائے۔ اگر مسلمان ہی حرمت والے مہینوں میں جنگ کی ابتداء کریں تو پھر بھی جائز ہے صرف بہتر یہ ہے کہ ہو سکے تو مسلمان ابتداء نہ کریں۔

ساتواں حکم: ”والمراد بقوله سوى الحرم اذا لم يدخلوا فيه للقتال فلو دخلوه للقتال حل قتالهم فيه لقوله تعالى ﴿حتى يقاتلوكم فيه﴾“

حرم شریف میں بھی لڑائی کرنا اس وقت تک منع ہے جب تک کفار حرم میں لڑائی نہ شروع کریں اگر کفار یہ خیال کریں کہ مسلمانوں کو تو منع کیا گیا ہے حرم شریف میں لڑائی کرنے سے اس لئے ان کو حرم میں قتل کر دیا جائے تو اس صورت میں جب وہ حرم میں لڑائی شروع کریں تو مسلمانوں کو بھی حکم دیا گیا کہ تم بھی ان کو حرم میں قتل کر دو شریف بن کر قتل نہ ہوتے رہو۔ (ماخوذ از شامی بزیادة ج ۳ ص ۳۳۹ باب الجہاد)

مقام توجہ: اگرچہ بظاہر یہاں یہ وہم ہوتا ہے کہ کافر تو کافر ہیں وہ حرم شریف کی عزت کا لحاظ نہ کریں تو عقل کے مطابق ہے لیکن مومنوں کو ان کے جواب میں حرم شریف میں لڑائی کرنے کا حکم دینا اور بے حرمتی کرنے کی اجازت کا کیا مقصد ہے؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ بظاہر یہ سمجھ آتا ہے کہ حرم شریف کی بے حرمتی ہے لیکن حقیقت میں حرم شریف کی عزت ہے کیونکہ اگر مومنوں کو لڑائی کرنے کی اجازت نہ دی جاتی تو کفار حرم میں خصوصاً حج کے موقع پر آئے دن مسلمانوں کو شہید ہی کرتے رہتے بار بار حرم شریف کی بے حرمتی ہوتی رہتی لیکن جب مسلمانوں کو اجازت دے دی کہ تم بھی ان کو قتل کر دو تو اب کفار کے ارادے خاک میں مل گئے وہ آرام سے (نک کر) بیٹھ گئے۔ (ماخوذ از شیخ زادہ)

جہاد فرض کفایہ:

”وہو فرض کفایۃ ابتداء وہ“ جہاد کی ابتداء فرض کفایہ ہے۔ یعنی جب بعض حضرات کے جہاد کرنے سے مقصد حاصل ہو جائے تو فرض کفایہ ہے اگر بعض لوگ جہاد قائم کر لیں تو دوسرے حضرات

سے ساقط ہو جائے گا کوئی گنہگار نہیں ہوگا:

”والا اثموا بترکہ ای اثم الكل من المکلفین“

اگر کوئی بھی جہاد قائم نہ کرے تو تمام گنہگار ہو جائیں گے۔

”وایاک ان تتوهم ان فرضیته تسقط عن اهل الهند بقیام اهل الروم

بل یفرض علی الاقرب فالاقرب من العدو“

تم یہ وہم نہ کرنا کہ ہندوستان کے لوگ جہاد قائم کر دیں تو روم والوں سے جہاد ساقط ہو جائے گا ایسا نہیں بلکہ جو مسلمان کافروں کے قریب ہوں گے ان پر جہاد کرنا فرض کفایہ ہے۔ لہذا واضح ہو کہ ایران پر جہاد علیحدہ فرض کفایہ ہے اور پاکستان پر علیحدہ اور ترکی پر علیحدہ تمام ممالک کا یہی ضابطہ ہے۔

ماں، باپ کی خدمت اور جہاد:

جب تک جہاد فرض کفایہ کے درجہ میں ہوگا اس وقت تک ماں باپ کی اجازت کے بغیر جہاد کا

حکم یہ ہے:

”لا یفرض علی صبی وبالغ له ابوان او احدهما لان طاعتہما فرض عین“

بچہ خواہ نابالغ ہو یا بالغ ہو جب اس کے باپ اور ماں موجود ہیں یا دونوں میں سے کوئی ایک موجود ہے تو اس پر جہاد فرض ہی نہیں بلکہ یہ اپنے ماں باپ کی خدمت کرے کیونکہ ان کی اطاعت اس پر فرض عین ہے۔

(در مختار)

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

”لان طاعتہما فرض عین“ کے تحت شامی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ تجنیس میں ذکر ہے

”والجہاد لم یتعین فکان مراعاة فرض العین اولی“ ماں باپ کی خدمت فرض عین ہے اور

جہاد اس پر معین نہیں، یعنی جہاد اس پر فرض عین نہیں لہذا فرض عین کی رعایت کرنا اولیٰ (بہتر) ہے۔

علامہ ابن ہمام رحمہ اللہ نے فرمایا ماں باپ جب خدمت گزاری کے محتاج ہوں تو ان کو چھوڑ کر

جہاد میں جانا ”انہ یحرم“ بیشک حرام ہے فتح القدیری کی اس وضاحت (کہ حرام ہے) پر صاحب

البحر الرائق نے اعتراض کیا ہے اور کہا ہے کہ حرام کہنا صحیح نہیں بلکہ ”کراهة الخروج بلا اذنهما“ ماں باپ کی اجازت کے بغیر جہاد پر جانا مکروہ ہے۔ شامی فرماتے ہیں کہ صاحب البحر الرائق کا قول غلط ہے ان کو غلطی تجنیس کے قول ”اولی“ سے لگی ہے شامی اپنا موقف یوں بیان فرماتے ہیں۔

”فان الاولى هنا بمعنى الاقوى والارجح ای ان الاقوى مراعاة فرض

العین لقوته ورجحانه علی فرض الكفاية فحيث ثبت انه فرض كان

خلافه حراما“

تجنیس میں جو لفظ ”اولی“ ذکر ہے اس کا مطلب ”زیادہ قوی ہونا اور رائج ہونا“ ہے مطلب یہ ہے کہ ماں باپ کی خدمت فرض عین ہے جس کی رعایت بنسبت فرض کفایہ کے زیادہ قوی اور زیادہ رائج ہے اس لئے یہی ثابت ہے کہ ماں باپ کی خدمت فرض عین ہے اسے ترک کرنا حرام ہے۔

(شامی ج ۳ ص ۲۴۱)

☆ بخاری شریف میں ہے ایک شخص نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور جہاد کی اجازت طلب کی آپ نے فرمایا ”احی والداک قال نعم قال ففیہما فجاہد“ کیا تمہارے والدین زندہ ہیں؟ تو اس نے عرض کیا ہاں (یا رسول اللہ والدین زندہ ہیں) تو آپ نے فرمایا ان دونوں میں جہاد کرو (یعنی ان کی فرمانبرداری اور ان کی خدمت میں کوشش کرو یہی تمہارا جہاد ہے)۔

☆ ”عن ابن عباس بن مرداس انه قال یا رسول اللہ انی ارید الجہاد قال الک ام قال نعم قال الزم امک فان الجنة تحت رجل امک“

ابن عباس بن مرداس فرماتے ہیں کہ انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ بیشک میں جہاد کا ارادہ رکھتا ہوں تو آپ نے فرمایا کیا تمہاری ماں ہے؟ تو انہوں نے عرض کیا ہاں (ماں تو ہے) آپ نے فرمایا ماں کو لازم پکڑو (یعنی ماں کی خدمت کو لازم پکڑو) بیشک جنت تمہاری ماں کے پاؤں کے نیچے ہے۔

شامی فرماتے ہیں کہ دوسری حدیث یہ ہے ”الجنة تحت اقدام الامهات“ جنت ماؤں کے قدموں کے نیچے ہے:

”اعلم تقبیل رجلها او هو کنایة عن التواضع لها واطلقت الجنة علی

سبب دخولها

حدیث پاک کا ایک معنی یہ ہو سکتا ہے ماں کے قدموں کو چومنا جنت میں جانے کا ذریعہ ہے اور دوسرا معنی یہ ہو سکتا ہے کہ ماں سے عاجزانہ طور پر پیش آنا جنت میں داخل ہونے کا سبب ہے اسی سے پتہ چل گیا کہ ماں سے سخت کلامی، بیہودگی انسان کو جنت سے دور رکھے گی کاش کہ نوجوانوں کو یہ مسئلہ سمجھ آ جائے۔

(از در مختار و شامی بزیادۃ ج ۳ ص ۲۴۱)

فائدہ : ”وفیه لا یحل سفر فیہ خطر الا باذنہما وما لا خطر فیہ یحل بلا اذن ومنہ السفر فی طلب العلم“

اسی بحث سے یہ مسئلہ بھی ثابت ہو گیا کہ تجارت، نوکری، حج اور عمرہ وغیرہ کے لئے سفر ماں باپ کی اجازت کے بغیر جائز ہے جب کہ اس میں خطرہ نہ ہو اگر اس کے ضائع ہو جانے یعنی دشمنوں کے قتل کر دینے کا خطرہ ہو تو ماں باپ کو حق پہنچتا ہے کہ اولاد کو روک دیں اس خطرہ والی صورت میں ماں باپ کی اجازت کے بغیر جانا جائز نہیں ہوگا۔

خیال رہے کہ جب تک حج میں جانا کفار وغیرہ کے حملہ اور قتل و غارت سے خالی نہ ہو اس وقت تک حج فرض نہیں ہوتا۔ یہی حکم علم کی طلب میں سفر کا بھی ہے کہ اگر خطرہ نہ ہو اور ماں باپ خدمت گزاری کے محتاج نہیں تو علم حاصل کرنے کے لئے سفر کرے اور اگر ایسے علاقہ میں جانے کا ارادہ ہو جہاں کفار، فساق اور بد معاش لوگوں کا خطرہ ہو کہ وہ جان سے مار ڈالیں گے اعضاء کاٹ دیں گے تو وہاں ماں باپ کی اجازت کے بغیر نہ جائے بلکہ راقم کے نزدیک وہاں سرے سے جانا ہی منع ہے۔

(ماخوذ از در مختار، و شامی ج ۳ ص ۲۴۱)

عورت اور غلام اور معذور لوگوں کا جہاد میں حکم:

جب تک جہاد فرض کفایہ کے درجہ میں ہو اس وقت عورت جہاد کے لئے نہ جائے کیونکہ خاوند کا حق خدمت فوت ہوگا ہاں اگر خاوند اجازت دے اور ضرورت محسوس کرے تو کسی حد تک جواز ہوگا۔ (کچھ مزید تفصیل انشاء اللہ آگے آئے گی) غلام مولیٰ کی اجازت کے بغیر جہاد میں شریک نہیں ہو سکتا کیونکہ اس کے جہاد میں جانے سے مولیٰ کی خدمتگزاری کا حق ضائع ہوتا ہے۔ معذور لوگ نابینا، لنگڑا اور ہاتھ پاؤں وغیرہ کٹے ہوئے ہوں ایسے لوگوں پر جہاد فرض نہیں۔ (در مختار، شامی)

مسئلہ: ”ومدیون بغیر اذن غریمہ“ مقروض شخص قرض خواہ کی اجازت کے بغیر جہاد میں شریک نہیں ہو سکتا فقہاء کرام کی مختلف عبارات سے جامع مسئلہ یہ ہے کہ اگر ایک شخص قرض ادا کرنا اب لازم ہو تو وہ بغیر قرض خواہ کی اجازت کے جہاد میں نہیں جا سکتا اجازت سے اس وقت جا سکتا ہے جب صحیح لوٹنے کی غالب امید ہو یا قرض خواہ اس کی شہادت پر قرض معاف کرنے کا وعدہ کرے یا اتنا ترکہ ہو کہ قرض ادا کیا جاسکے گا۔ اگر قرض ادا کرنے میں وقت موجود ہے اور اسکے زندہ سلامت لوٹنے کی بھی امید ہے یا ترکہ سے قرض ادا کرنے کی صلاحیت ہے تو قرض خواہ کی اجازت کے بغیر جانا جائز ہے **فائدہ:** ”وعالم لیس فی البلدة افقه فلیس له الغز وخوف ضیاعهم“

اگر ایک شخص عالم فقہی مسائل پر عبور رکھتا ہو اس شہر میں اس سے بڑھ کر کوئی فقہ کا عالم نہیں تو جب تک جہاد فرض کفایہ کے درجہ میں ہے وہ جہاد میں شریک نہ ہو کیونکہ اس کے شہید ہونے سے شہر کے تمام لوگ فقہی مسائل سے محروم ہو کر ضائع ہو جائیں گے۔ (در مختار)

جہاد فرض عین کب ہے؟

”وفرَض عین ان هجم العدو فیخرج الكل ولا بلا اذن ویائم الزوج ونحوه بالمنع“

جب کفار اچانک حملہ کر دیں اور ان کا ہجوم ہو کثیر تعداد میں ہوں تو اس وقت جہاد فرض عین ہو جاتا ہے یعنی ہر شخص پر جہاد فرض ہو جاتا ہے بغیر اجازت کے جہاد کے لئے نکل پڑیں۔ جب جہاد فرض

عین ہو تو خاوند اپنی زوجہ کو منع کرے یا مالک اپنے غلام کو منع کرے یا والدین اپنی اولاد کو منع کریں تو وہ گنہگار ہوں گے۔

ہاں البتہ یہ خیال رہے کہ جہاد فرض عین تدریجاً (درجہ بدرجہ) ہوگا یعنی پہلے ان لوگوں پر فرض عین ہوگا جو قریب ہوں گے اگر قریب والے عاجز ہو جائیں کفار کا دفاع نہ کر سکیں یا ست ہو جائیں کفار کا مقابلہ نہ کریں تو جوان کے قریب ہوں گے ان پر جہاد فرض عین ہوگا اسی طرح اگر یہ عاجز آجائیں یا اپنی کاہلی (سستی) کی وجہ سے جہاد میں شریک نہ ہوں تو پھر جوان کے قریب ہوں ان پر جہاد فرض ہو جائے گا۔

”حتی یفترض علی هذا التدریج علی کل المسلمین شرقاً وغرباً“

یہاں تک کہ اسی طرح درجہ بدرجہ تمام مسلمانوں پر جہاد فرض عین ہو جائے گا یعنی مشرق و مغرب (شمال و جنوب) میں بسنے والے تمام مسلمانوں پر جہاد فرض عین ہو جائے گا۔

فائدہ : ”و یجب ان لا یأثم من عزم علی الخروج وقعوده لعدم خروج الناس وتکاسلهم او قعود السلطان او منعه“

جب جہاد فرض عین ہو جائے تو ایک شخص جہاد میں جانے کا پختہ ارادہ رکھتا ہے لیکن اور کوئی جہاد کے لئے نہیں نکلتا اس لئے کہ لوگ ست ہو گئے ہیں یا مسلمانوں کا بادشاہ ہی ڈر کر بیٹھ جائے یا مسلمانوں کو جہاد سے منع کرے تو ایسی صورت میں وہ شخص گنہگار ہوگا جو جہاد کا مصمم ارادہ (پکا ارادہ) رکھتا ہے۔

تنبیہ : ”وفی البزازیة مسلمة سبیت بالمشرق وجب علی اهل المغرب تخلصها من الاسر“

فتاویٰ بزازیہ میں مذکور ہے کہ اگر مسلمان عورت مسرق میں کفار کی قید میں آجائے تو مغرب والوں پر لازم ہے کہ اسے قید سے آزاد کروائیں۔

محمد بن قاسم نے مغرب میں ایک مظلوم عورت کی آواز مشرق سے سنی تو عرب کی سرزمین سے سندھ میں آ گیا۔ کہاں محمد بن قاسم کی یاد میں مجالس کا قیام، تعریف و تقاریر اور اخبارات میں مضامین اور کہاں مسلمانوں کے خلاف نصاریٰ کا ساتھ دینا یہ دوغلہ پالیسی ایک نام نہاد مسلمان تو کر سکتا ہے حقیقی

مسلمان کا یہ شیوہ نہیں کہ وہ یہودیوں اور نصاریوں کا ساتھی بن جائے اور مسلمانوں کو اور مسلمانوں کی عورتوں اور بچوں کو ذبح کرادے۔

مسئلہ : جس طرح جہاد کے فرض عین ہونے پر عورت بغیر خاوند کی اجازت کے اور غلام بغیر مالک کی اجازت کے اور مقروض بغیر قرض خواہ کی اجازت کے جہاد میں شریک ہوں:

”و كذلك الغلمان الذين لم يبلغوا اذا اطاقوا القتال فلا بأس بان يخرجوا ويقاتلوا في النفي العام وان كره ذلك الآباء والامهات“

اسی طرح وہ بچے جو بالغ تو نہیں ہوئے لیکن جہاد کرنے کی طاقت رکھتے ہوں ان کے جہاد میں شریک ہونے میں کوئی حرج نہیں بلکہ وہ عام لڑائی میں چلے جائیں اگرچہ ان کے ماں باپ اسے ناپسند ہی کیوں نہ سمجھیں۔

(در مختار، شامی ج ۳ ص ۲۲۲)

جہاد کے لئے چندہ جمع کرنا:

”و كره الجعل ای اخذ المال من الناس لاجل الغزاة مع الفی ای مع وجود شنی فی البیت المال والفی هنا یعم الغنیمۃ والا لا لدفع الضرر الا علی بالادنی“

غازیوں کے لئے لوگوں سے مال طلب کرنا اس وقت مکروہ ہے جب مسلمانوں کے بیت المال میں مال موجود ہو خواہ مال نے ہو یا مال غنیمت ہو اور اگر بیت المال میں مال نہیں تو پھر لوگوں سے مال طلب کیا جاسکتا ہے اگرچہ لوگوں سے مال مانگنا بھی بظاہر عیب اور نقصان ہے لیکن کافروں کا مسلمانوں پر غالب آنا اور ہی باعث ضرر ہے اس لئے چندہ حاصل کرنا معمولی ضرر ہے لہذا معمولی ضرر سے کفار کا زیادہ ضرر دور کرنا ضروری ہے۔

(در مختار)

تنبیہ : جو شخص جہاد کرنے پر قادر ہو اور اس کے پاس مال بھی ہو تو اس پر جہاد فرض ہوگا اور لوگوں سے مال حاصل کرنا منع ہوگا۔ اور جو شخص خود جہاد کرنے پر تو قادر نہیں لیکن اس کے پاس مال ہے تو وہ دوسرے شخص کی مالی معاونت کر کے جہاد پر بھیجے جس کے پاس مال نہیں اور جب بادشاہ مالی معاونت کرے تو لوگوں سے مالی تعاون حاصل نہ کیا جائے۔

اور جب ایک شخص جہاد کرنے کی طاقت رکھتا ہو خود جہاد کے لئے نہ جائے حالانکہ جہاد فرض عین ہو چکا ہے خود گھر بیٹھ جائے اور اپنی طرف سے دوسرے شخص کو مال دے کر جہاد پر بھیج دے ”فلا يجوز لانه استجار على الجهاد“ تو یہ جائز نہیں کیونکہ کرایہ کا جہاد جائز نہیں ہاں یہ نہ کہے کہ تم مال لے کر میری طرف سے جہاد کرو صرف جہاد کے لئے مالی معاونت کرے تو جائز ہے۔ اور یہ بھی خیال رہے کہ غازی کو اتنا مال گھر چھوڑنا بھی ضروری ہے جو اس کی واپسی تک اس کے اہل و عیال کو کفایت کرے۔

(از شامی ج ۳ ص ۲۲۲)

مسئلہ: اگر ہم کفار کا محاصرہ کریں تو دیکھا جائے اگر ان کو دعوت اسلام پہلے نہیں دی گئی تو واجب ہے کہ ان کو دعوت اسلام دی جائے اور اگر ان کو دعوت اسلام پہلے دی جا چکی ہے تو پھر بھی مستحب ہے کہ ان کو دعوت اسلام دی جائے اگر وہ اسلام لے آئیں تو بہتر اگر وہ اسلام نہیں لائے لیکن جزیہ دینے کو قبول کرتے ہوں تو ان پر جزیہ مقرر کر دیا جائے تو پھر ہم پر لازم ہو جائے گا کہ ہم ان سے وہی انصاف کریں جو مسلمانوں سے کرتے ہیں اور ان کو وہی انصاف دلائیں جو انصاف مسلمانوں کو دلاتے ہیں ان کے مال اور جانوں کی حفاظت ہم پر لازم ہوگی یعنی ان کو ناحق قتل نہیں کیا جائے گا اور ان کا مال غصب نہیں کیا جائے گا۔ اگر وہ جزیہ ادا کرنا بھی نہ قبول کریں تو ان کو قتل کر دیا جائے۔ (از درمختار شامی)

خصوصی مقام توجہ:

”ويجب على الامام ان يبعث سرية الى دار الحرب كل سنة مرة او

مرتين وعلى الرعية اعانته الا اذا اخذ الخراج فان لم يبعث كان كل

الاثم عليه وهذا اذا غلب على ظنه انه يكافئهم والا فلا يباح قتالهم

بخلاف الامر بالمعروف“ (شامی ج ۳ ص ۲۳۹)

مسلمانوں کے حاکم پر واجب ہوتا ہے کہ وہ ہر سال ایک مرتبہ یا دو مرتبہ دار حرب میں اپنا لشکر بھیجے جو کافروں سے جنگ کریں اور رعیت پر بھی لازم ہے کہ وہ امام کے حکم کی فرمانبرداری کریں۔ ہاں اگر امام رعیت سے ٹیکس بھی لے کر جہاد کے لئے یہ ٹیکس دو اور جہاد میں بھی چلو تو رعیت حاکم کے حکم کو نہ مانے اگر مسلمانوں کا حاکم ہر سال ایک یا دو مرتبہ کفار کی طرف اپنا لشکر نہیں بھیجتا تو حاکم اور رعیت تمام

گنہگار ہوں گے۔

ہاں یہ خیال بھی رکھا جائے کہ ہر سال لشکر بھیجنا اس وقت واجب ہوگا جب مسلمانوں کے حاکم کو معلوم ہو کہ ہم غالب رہیں گے لیکن اگر معلوم ہو کہ ہم کفار کو تو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے بلکہ اپنے آپ کو تباہ کر دیں گے تو ایسی صورت میں جنگ چھیڑنا منع ہوگا البتہ کفار کو زبان سے اسلام کی حقانیت، دین اسلام کی افادیت اور اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور محمد مصطفیٰ ﷺ کی رسالت اور اقامت قیامت اور عبادت وغیرہ کی تبلیغ کرتے رہیں۔

مسلمانوں کا کفار سے صلح کرنا:

”ويجوز الصلح على ترك الجهاد معهم بمال منهم او منا لو خيرا

لقوله تعالى وان جنحوا للسلم فاجنح لها“

مسلمانوں کا حاکم جب جنگ نہ کرنے میں اپنی اور مسلمانوں کی بہتری سمجھے تو جہاد کو چھوڑ کر کفار سے صلح کر لے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اگر وہ صلح کی طرف میلان کریں تو تم بھی صلح پر آمادہ ہو جاؤ۔

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

”وفي المصباح والسلم بالكسر والفتح الصلح يذكرو ويؤنث“

مصباح میں یہ ذکر کیا گیا ہے کہ سلم کے سین پر فتح اور کسرہ دونوں جائز ہیں معنی اس کا صلح کرنا یہ لفظ مذکر اور مؤنث دونوں طرح استعمال ہوتا ہے ”فاجنح لها“ میں ”ها“ ضمیر مؤنث لائی گئی جو ”سلم“ کی طرف لوٹ رہی ہے کیونکہ اس میں تانیث کا اعتبار کیا گیا ہے۔

پھر سے مسئلہ کی طرف توجہ: کفار سے مال لے کر صلح کرنے کا مطلب یہ ہے کہ جنگ کے حالات پیدا ہو گئے تو ایک دوسرے نے اپنے قاصد بھیجے مسلمانوں کو جب جنگی برتری حاصل ہوئی تو یہ ان سے مال لے کر صلح کر لیں کہ مسلمانوں کا فائدہ اس میں ہے کہ زیادہ تباہی سے بچ جائیں تو یہ بھی جائز ہے۔ اور اگر مسلمانوں کو برتری حاصل نہیں جنگ میں زیادہ بربادی ہو تو مسلمانوں کے لئے یہ بھی جائز ہے کہ مال دے کر صلح کر لیں:

”ان نصلح بمال نعطيهم لهم ان خاف الامام الهلاك على نفسه
والمسلمين باى طريق كان“

لیکن یہ خیال رہے کہ کفار سے صلح اس وقت جائز ہے جب مسلمانوں کا اس میں فائدہ ہو ان کو
اس میں مصلحت نظر آئے کفار کی چالبازیوں اور دھوکا بازیوں اور غدار یوں سے مسلمان غافل نہ ہوں۔
مسلمان وقتی مصلحت کے لئے صلح کر لیں لیکن اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے غافل نہ رہیں۔
﴿وَأَعِدُّوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ﴾ تم ان کافروں کے لئے تیاری رکھو جتنی تم طاقت رکھتے ہو۔

کفار اگر وعدہ کا پاس نہ کریں تو مسلمان بھی وعدہ توڑ دیں:

نبی کریم ﷺ نے کفار سے دس سال کے لئے صلح کی اور معاہدہ کیا لیکن جب کفار مکہ نے وعدہ کو
توڑ دیا تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو بھی حکم دے دیا کہ اب آپ پر بھی وعدہ کی پابندی لازم نہیں رہی ایسا نہ ہو
کہ مسلمان وعدہ کی پابندی کا خیال کرتے رہیں اور کفار وعدہ کو توڑ کر ان کی سرکوبی کرتے رہیں ہاں جب
وہ وعدہ توڑ دیں تو مسلمانوں کو چاہئے کہ ان کو قتل کر دیں۔
(ماخوذ از شامی ج ۳ ص ۲۴۷)

اسلامی جہاد اور کفار کی جنگ میں فرق:

اسلامی جہاد میں کفار کی سرکوبی کا حکم بھی اسلام نہ قبول کرنے پر اور جزیہ نہ قبول کرنے پر ہے
مقصد کفار کو ذلیل کرنا نہیں بلکہ اسلام کی سر بلندی مقصود ہے۔ اسلامی جہاد میں ظلم کرنے سے منع کیا گیا
ہے رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿وَلَا تَعْتَدُوا إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ﴾ اور تجاوز نہ کرو بیشک
اللہ تعالیٰ تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

☆ ”عن عبد الله بن عمر رضي الله عنهما قال نهى رسول الله ﷺ عن قتل النساء
والصبيان“ (بخاری و مسلم، ترمذی ابن ماجہ ابوداؤد، مشکوٰۃ کتاب الجہاد)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے عورتوں اور بچوں کو قتل کرنے
سے منع فرمایا۔

عورتوں کے قتل کا حکم:

عورتوں کو قتل کرنے سے اس وقت نبی کریم ﷺ نے منع فرمایا جب آپ نے ایک عورت کو مقتول پایا لیکن یہ حکم اس وقت ہے جب عورتیں جنگ میں کسی طرح بھی نہ شریک ہوں لیکن ”ان قاتلن قتلن“ اگر وہ جنگ میں قتال کر رہی ہوں تو ان کو قتل کر دیا جائے۔

عورت کی جنگ میں اگر مالی امداد ہو تو پھر بھی عورت کو قتل کر دیا جائے۔ اور اگر وہ زبان سے یعنی تقریر سے مردوں کو جنگ پر ابھار رہی ہے تو پھر بھی اسے قتل کر دیا جائے اور اگر وہ اشعار اور گانوں سے مردوں کو جنگ پر ابھار رہی ہو تو پھر بھی اسے قتل کر دیا جائے۔

”قال سحنون فی حالة المقاتلة وبعدها“ سحنون رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ان صورتوں میں عورت کو جنگ میں بھی قتل کیا جائے جنگ کے بعد بھی۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ جنگ میں قتال کرنے والوں کو قتل کرنے کا حکم اللہ تعالیٰ نے عام فرمایا ہے

﴿وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ﴾

”اور لڑائی کرو (قتل کرو) اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے جو تمہارے ساتھ قتال کرتے ہیں“

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَأَقْتُلُوهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوهُمْ﴾ ”اور ان (کافروں) کو قتل کرو جہاں ان کو پاؤ۔“

اسی طرح عورت جب کفار کی ملکہ ہو یا صدر یا وزیرہ عظمیٰ (وزیر اعظم) ہو تو اسے قتل کر دیا جائے کیونکہ جنگ تو اسی نے برپا کر رکھی ہے۔

بچوں کو قتل نہ کیا جائے:

نبی کریم ﷺ نے کافروں کے بچوں کو بھی قتل کرتے سے منع فرمایا ہے لیکن بچے بھی اگر جنگ میں قتل کر رہے ہوں تو ان کو قتل کر دیا جائے کیونکہ وہ جنگ میں شریک ہیں اسی طرح اگر نابالغ بچہ ان کا بادشاہ یا صدر یا وزیر اعظم ہو تو اسے بھی قتل کر دیا جائے۔

راہوں کو نہ قتل کیا جائے:

یہود و نصاریٰ میں راہب وہ ہوتے ہیں جو دنیا سے کنارہ کش ہوتے ہیں دنیا والوں سے ان کا تعلق نہیں ہوتا اسی طرح ہندوؤں میں جوگی ان کو جنگ میں قتل نہ کیا جائے اور نہ ہی ان کو غلام بنایا جائے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے یزید بن سفیان رضی اللہ عنہ کو فرمایا:

”وَسْتَجِدُوا قَوْمًا زَعَمُوا أَنَّهُمْ حَبَسُوا أَنْفُسَهُمْ لِلَّهِ فَذَرَهُمْ وَمَا زَعَمُوا أَنَّهُمْ حَبَسُوا أَنْفُسَهُمْ لَهُ“
کہ تم ایسے لوگوں کو پاؤ جو دنیا سے کنارہ کش ہو کر اپنے گمان کے مطابق وہ اللہ کی عبادت میں مشغول ہوں تو ان کو چھوڑ دو اور ان کے لئے ضرورت کے مطابق رزق چھوڑ دیا جائے۔ ہاں اگر یہ راہب لوگ بھی قتال میں شریک ہوں یا انہوں نے اپنے عبادت خانوں میں اور کافروں کو بھی ساتھ رکھا ہوا ہے جن کو یہ قتال کی ترغیب دے رہے ہیں یا وہ دوسرے کافران کی وجہ سے اپنا بچاؤ چاہتے ہیں تو ان راہبوں کو بھی قتل کر دیا جائے۔

معذور لوگوں کو قتل نہ کیا جائے:

معذور لوگوں کو اس وقت تک قتل نہ کیا جائے جب تک ان کی طرف سے مسلمانوں کو تکلیف نہ ہو اگر معذور لوگ بھی جنگ میں کافروں کو جنگی تدابیر بتا رہے ہوں اور جنگ میں کسی طرح معاونت کر رہے ہوں تو ان کو بھی قتل کر دیا جائے۔

بوڑھوں کو قتل نہ کیا جائے:

جنگ میں بوڑھے کافروں کو قتل نہ کیا جائے: ”ان کان شیخ کبیرا ہو مالا یطیق القتال“ لیکن اس وقت جب کہ وہ اتنے بوڑھے ہوں کہ وہ جنگ کرنے کی طاقت ہی نہیں رکھتے۔ ”ولا ینتفع بہ فی رأی ولا مدافعة فانہ لا یقتل“ اور نہ ہی ان کی رائے پر جنگ میں کوئی عمل ہو رہا ہو اور نہ ہی ان میں دماغ کی صلاحیت ہو تو ایسی صورت میں بوڑھوں کو قتل نہیں کیا جائے گا۔ اگر بوڑھے کافر جنگ میں اپنی رائے دے رہے ہوں یا دفاع کر رہے ہوں یا قتال کر رہے ہوں یا بوڑھا

شخص ان کا حاکم ہو تو ایسی صورت میں بوڑھے کو بھی قتل کر دیا جائے گا۔

معتوہ (نیم پاگل) کو قتل نہ کیا جائے:

جو شخص کسی وقت پاگلوں والی باتیں کرتا ہے کسی وقت عقل مندوں والی باتیں کرتا ہے اس کو جنگ میں قتل نہ کیا جائے ہاں اگر وہ قتال میں شریک ہے یا ان کا سربراہ مملکت ہے تو اسے بھی قتل کر دیا جائے۔

خادم کو قتل نہ کیا جائے:

”عن رباح بن الربیع قال کنا مع رسول اللہ ﷺ فی غزوة فرأی الناس مجتمعین علی شئی فبعث رجلا فقال انظر علی ما اجتمع هؤلاء فجاء فقال علی امرأة قتیل فقال ما کانت هذه لتقاتل وعلی المقدمة خالد بن الولید فبعث رجلا فقال قل لخالد لا تقتل امرأة ولا عسیفا“
(رواہ ابو داؤد، مشکوٰۃ باب القتال فی الجہاد)

رباح بن ربیع رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ایک غزوہ میں تھے تو آپ نے لوگوں کو دیکھا کہ وہ کسی چیز پر جمع ہیں آپ نے ایک شخص کو بھیجا کہ دیکھو وہ لوگ کیوں جمع ہیں؟ وہ شخص آئے تو کہا کہ وہ ایک مقتول عورت پر مجتمع ہیں تو آپ نے فرمایا اس عورت کو قتل نہیں کیا جاتا تھا۔ آگے والے لشکر کے قائد حضرت خالد بن ولید تھے تو نبی کریم ﷺ ایک شخص کو بھیجا کہ ان کو کہو کسی عورت اور خادم کو قتل نہ کرو۔

”ولا عسیفا ای اجبیرا وتابعا للخدمة ولعل علامته ان یکون بلا سلاح“

(مرقاۃ ج ۷ ص ۳۶۲)

عسیف کا معنی خادم اور تابعدار ہے جو خدمت کے لئے مقرر کیا جائے اس وقت ان کی علامت یہ ہوتی تھی کہ ان کے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہوتا تھا۔ مطلب اس میں بھی یہی ہے کہ نوکر صرف خدمت کے لئے میدان جنگ میں ہو وہ خود لڑائی نہیں کر رہا اور کوئی مشورہ نہیں دے رہا تو اسے قتل نہ کیا جائے اور اگر جنگ کرنے میں کسی قسم کا بھی تعاون کر رہا ہے تو اسے قتل کر دیا جائے۔

کفار کے اعضاء نہ کاٹے جائیں:

”عن بريدة قال كان رسول الله ﷺ اذا امر اميرا على جيش او سرية اوصاه في خاصته بتقوى الله ومن معه من المسلمين خيرا ثم قال اغزوا بالله في سبيل الله قاتلوا من كفر بالله اغزوا ولا تغلوا ولا تعتدوا ولا تمثلوا ولا تقتلوا وليدا“ (مسلم)

حضرت بريدہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ جب کسی لشکر پر امیر مقرر فرماتے تھے تو اسے خصوصی طور پر نصیحت فرماتے کہ اللہ تعالیٰ سے تقویٰ رکھنا یعنی رب تعالیٰ سے ڈرتے رہنا۔ اور اپنے مسلمان ساتھیوں سے بہتر سلوک رکھنا پھر آپ فرماتے اللہ تعالیٰ کی امداد سے اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرو جو شخص اللہ تعالیٰ سے کفر کرنے والا ہوا سے قتل کر دو۔ جہاد کرو اور مال غنیمت میں خیانت نہ کرو، اور تجاوز نہ کرنا اور کفار کو مثلہ نہ بنانا (یعنی ان کے اعضاء نہ کاٹو اور ان کی شکلیں نہ بگاڑو) اور بچوں کو قتل نہ کرو۔

(از خازن)

غدر سے منع فرمایا: کفار سے وعدہ کر کے کہ ہم تم سے جنگ نہیں کریں گے پھر اچانک ان پر حملہ کر کے ان کو قتل کرنا حرام ہے اسے غدر کہا جاتا ہے۔

☆ ”عن ابن عمر قال قال رسول الله ﷺ اذا جمع الله الاولين والآخرين يوم القيامة يرفع لكل غادر لواء فقیل هذه غدرة فلان بن فلان“ (مسلم ج ۲ ص ۹۱ باب تحريم الغدر)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب اللہ تعالیٰ اولین و آخرین کو قیامت کے دن جمع کرے گا تو ہر غدر کرنے والے کا جھنڈا بلند کیا جائے گا تو بتایا جائے گا یہ شخص فلاں ابن فلاں کا غدر ہے۔

حدیث پاک کا مطلب واضح ہے کہ جنگ میں وعدہ کر کے اس کے خلاف دھوکا بازی حرام ہے لیکن پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ کفار اگر وعدہ کو توڑ دیں تو مسلمانوں پر بھی وعدہ کی پابندی ختم ہو جاتی ہے۔

جنگی چال بازی جائز ہے:

”عن ابی هريرة قال قال رسول الله ﷺ الحرب خدعة“

”حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جنگ چال بازی ہے۔“

وضاحت:

”خدعة (بفتح الخاء وسكون الدال ، بضم الخاء واسكان الدال ،

بضم الخاء وفتح الدال

”خدعة“ کا معنی ہے دھوکا دینا یعنی کفار کو جنگ میں دھوکا دینا جائز ہے:

”كيف امکن الخدع الا ان يكون فيه نقض العهد او امان فلا يحل“

جس طرح بھی ممکن ہو کفار کو جنگ میں دھوکا دیا جائے البتہ وعدہ کر کے توڑنا اور کسی کو امن دے کر قتل کرنا حلال نہیں۔ جنگ میں دھوکا دینے سے مراد جنگی چال بازی ہی ہے کہ فوجیں ایک طرف کھڑی کی جائیں وہ سمجھیں فوجیں ادھر ہیں لیکن حملہ دوسری جانب سے کر دیا جائے اس طرح کی ہر قسم کی چال بازی جائز ہوگی۔

کفار کی جنگ: ابھی تک بیان کردہ مضمون سے قارئین کرام نے واضح طور پر سمجھ لیا ہوگا کہ مسلمانوں کو کفار سے جنگ کرنے میں ظلم کرنے سے منع کیا گیا ہے بلکہ احسان کرنے کا حکم دیا گیا ہے کیونکہ بچوں اور عورتوں وغیرہ کو قتل نہ کرنا احسان نہیں تو اور کیا ہے لیکن کفار کی جنگ میں سراسر ظلم ہی ظلم ہے۔

پہلے پارہ میں شیطانی وسوسہ کے اثرات غزالی دوران علامہ سید احمد سعید کاظمی رحمہ اللہ کی تفسیر سے نقل کئے تھے ان میں سے ایک اقتباس کا اعادہ کیا جا رہا ہے اسی سے سمجھیں کہ کفار کی جنگ ظالمانہ ہے۔

شیطانی وسوسہ سے متاثر ہونے والا دوسرا گروہ وہ ہے جس میں جسمانی استعداد تو باقی رہی مگر شیطان کے بھٹکانے سے بھٹک گیا اور روحانی استعداد کو ضائع کر دیا اس لئے روحانی تقاضوں کو بروئے کار لانے سے وہ محروم ہو گیا معرفت الہیہ تو درکنار اللہ تعالیٰ کی ہستی سے بھی منکر ہو گیا اس نے صرف جسم اور مادہ کو اپنا مقصد سمجھ لیا اور اپنی بقیہ استعداد کا رخ مادیات کی طرف موڑ دیا وہ عقلی پیچیدگیوں میں گم ہو کر رہ گئے بعض نے جدید انکشافات اور مادی ایجادات میں بڑی کامیابی حاصل کر لی بیشمار مفید چیزیں ایجاد کیں فضاء میں اڑنے والے طیارے اور خلا نور و سیارے کے ذریعے زمین و آسمان تک رابطے قائم کر لئے، حیرت انگیز آلات ایجاد کر لئے اب ان کی ترقی کا آخری مرحلہ ہے کہ انہوں نے بنی نوع

انسان کی ہلاکت کے لئے ہزاروں میل تک مار کرنے والے میزائل تیار کر لئے ایٹم بم، نیپام بم بنائے، آواز سے زیادہ تیز رفتار ہوائی جہاز تیار کئے جن کے ذریعے چند سیکنڈ میں روئے زمین کو ہلاکت خیز منظر میں تبدیل کیا جاسکتا ہے اور ایٹم بموں کے ذریعے کرہ ارض (زمینی کرہ) کو آنکھ جھپکنے کی مقدار میں اڑا کر تباہ و برباد کر دینا آسان ہے۔

خلافت الہیہ کی وہ استعداد جو بنی نوع انسان کی جسمانی، روحانی، دنیوی اور اخروی فوائد کے لئے تھی اسے انسانوں کے ہلاک کر دینے والے آلات کے لئے وقف کر دیا گیا۔ اب معاملہ یہاں تک پہنچ چکا ہے کہ ان ہتھیاروں کو ایجاد کرنے والے خود اپنے آپ کو ان کی زد میں محسوس کر رہے ہیں انہیں ہر وقت یہ خطرہ لاحق ہے کہ ہمارے ایجاد کئے ہوئے آلات نہ معلوم کس وقت ہم پر پھٹ پڑیں اور کرہ ارض کے ساتھ ہم بھی لقمہ اجل بن کر رہ جائیں۔

اس اقتباس کو ذرہ ہوش و حواس سے پڑھیں پھر خود انداز لگائیں کہ کفار کے ایجاد کردہ آلات اور جنگ میں ظلم ہی ظلم ہے یا نہیں کیا انہوں نے کبھی سوچا کہ بچوں، عورتوں، بوڑھوں، عبادت گزاروں، معذوروں اور خدام کو نہیں قتل کرنا، کیا انہوں نے کبھی یہ خیال کیا کہ کسی کے اعضاء نہیں کاٹنے، انہوں نے تو صرف تباہی و بربادی کے آلات ایجاد کئے انہوں نے تو تمام مسلمانوں کو تباہ کرنے کے منصوبے تیار کئے۔

دہشت گرد کون؟

ذرا غور کیجئے دہشت گرد کون ہے؟ دہشت گرد یقیناً وہ ہے جو صرف ایٹم بم بنانے والا نہیں بلکہ دو مرتبہ ایٹم بم چلا چکا ہے۔ دہشت گرد وہ ہے جو فلسطینی مسلمانوں پر نصف صدی سے زائد عرصہ مظالم ڈھا چکا ہے ابھی تک ظلم کئے جا رہے ہیں عراق اور افغانستان کو برباد کر چکا ہے ابھی تک پھر بھی عراق اس کی آنکھ میں کھٹک رہا ہے پاکستان اور ایران پر بھی اس کی ناپاک نظریں لگی ہوئی ہیں وہی بڑا دہشت گرد اور بڑا ظالم ہے مسلمان اپنا دفاع کرنے والا، مسلمان اپنے مسلمان بھائیوں کو کفار کے چنگل سے آزاد کرانے میں تعاون کرنے والا کبھی دہشت گرد نہیں ہو سکتا۔

افسوس کہ مسلمانوں کے حکمران دہشت گردوں کے ساتھی بن کر مسلمانوں کو دہشت گرد کہنے لگ

گئے۔ جن کی تربیت کی ان کو دہشت گرد کہنا انصافی ہے جن کو اپنے ساتھ ملا کر کئی سال روس سے جنگ کرائی ان کو عیسائیوں اور یہودیوں کے ہاتھوں برباد کر دینا اور یہود و نصاریٰ کا ساتھی بن جانا ظلم عظیم ہے۔ مسلمان تجھے انصاف کرنا چاہئے لیکن افسوس تو ظالم بن گیا اے مسلمان تو مسلمان کا بھائی ہے افسوس کہ تو نصاریٰ اور یہود و ہنود کا بھائی بن بیٹھا۔

مسلمان کفار سے انتقام لیں:

﴿فَمَنْ اعْتَدَىٰ عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدَىٰ عَلَيْكُمْ﴾

”جو شخص زیادتی کرے تم پر، تم اس سے انتقام لو اس کی مثل جو اس نے زیادتی کی ہے تم پر“

تفسیر صاوی کے حوالہ سے پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ ﴿فَاعْتَدُوا عَلَيْهِ﴾ کا مطلب یہ ہے تم ان سے انتقام لو لیکن کافروں کی زیادتی کے انتقام کو مشکلات کی وجہ سے زیادتی سے تعبیر کر دیا جس کا بظاہر مطلب یہ ہے کہ جو تم پر زیادتی کرے تم اس پر زیادتی کرو جیسا کہ اس نے تم پر زیادتی کی۔

تو اسی سے واضح ہو گیا کہ کافر اگر میزائل تم پر گرائیں تو تم بھی میزائلوں سے ان سے انتقام لو وہ توپوں کے گولے برسائیں تو تم بھی ایسی ہی جوابی کروائی کرو، وہ طیاروں سے لڑائی کریں تو تم بھی طیاروں سے لڑائی کرو وہ ایٹم بم گرائیں تو تم بھی ایٹم بم گراؤ۔

کافروں کے ظالمانہ رویہ کا بڑھ کر جواب دو کافروں کے ظلم کا جواب ظلم نہیں۔ یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب سب مسلمان متحد ہو کر یہود و نصاریٰ کو سبق سکھائیں ایک اسلامی ملک کو تباہ کرانے میں مسلمان بھی یہود و نصاریٰ کے ہمنوا بن جائیں تو کس طرح ان کفار کا مقابلہ کیا جائے۔ اے مسلمانو جاگ جاؤ، ذرا ہوشیار ہو جاؤ، خواب غفلت میں نہ رہو، کفار کے دام فریب میں نہ آؤ، اسلامی احکام پر عمل کرو پھر کامیابی تمہارے قدم چومے گی۔

”وترى الامة الاسلامية لما كانت تعظم الاعمال الدينية وترعاها حق

رعايتها غلبت اعداءها فلما تفرقت اهوائها وخضعت شوكتها

تخطفها الاعداء من كل جانب ، فان الناس اذا استعبدوا والشهواتهم

وذلوا لا هوائهم تفرقت كلمتهم وذهبت ريحهم وذاق باس بعضهم

امت اسلامیہ کے ماضی کی طرف جھانک کر دیکھو، تاریخ کا مطالعہ کرو تو تمہیں پتہ چلے گا کہ جب تک دینی اعمال کی عظمت کا مسلمان پاس کرتے رہے تو دشمن پر غالب رہے جب ان کی خواہشات بکھر گئیں ان کا دبدبہ جاتا رہا تو ہر طرف سے دشمن ان کو گدھوں کی طرح نوچ رہے ہیں بیشک لوگ جب اپنی خواہشات کی وجہ سے غلام بن گئے اور اپنی خواہشات کی وجہ سے ذلیل ہو گئے تو ان کی اجتماعیت ختم ہو گئی جتنے منہ اتنی باتیں ہونے لگیں، ان کے رعب اور دبدبہ کی ہوا اڑ گئی، ان کی بہادری کا چرچا جاتا رہا اور لوگوں کے رعب میں آگئے جو ان کو اپنا ترنوالہ بنا رہے ہیں۔

جہاد قیامت تک جاری رہے گا:

نبی کریم ﷺ نے فرمایا ”الجهاد ماض الى يوم القيامة“ جہاد قیامت تک جاری رہے گا اسی سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ جہاد منسوخ نہیں ہوا کیونکہ نبی کریم ﷺ کا مندرجہ بالا ارشاد گرامی جب قیامت تک کے متعلق ایک حکم کو ثابت کر رہا ہے تو منسوخ کس نے کرنا تھا۔

☆ ”وعن جابر بن سمرة قال قال رسول الله ﷺ لن يرح هذا الدين قائما يقاتل عليه عصابة من المسلمين حتى تقوم الساعة“ (رواه مسلم، مشكوة كتاب الجهاد)

حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ دین ہمیشہ قائم رہے گا مسلمانوں کی ایک جماعت جہاد کرتی رہے گی یہاں تک کہ قیامت قائم ہو جائے گی۔

وضاحت حدیث: ”یقاتل علیہ“ میں ”علی“ مذکور ہے جو دلالت کر رہا ہے کہ یہ جملہ ”یظاہر“ کے معنی کو متضمن ہے معنی ہو گیا:

”یظاہرون بالمقاتلة على اعداء الدين يعني ان هذا الدين لم يزل

قائما بسبب مقاتلة هذه الطائفة“

کہ جب تک مسلمانوں کی کوئی نہ کوئی جماعت جہاد کرتی رہی تو دین قائم رہے گا۔ اور یہ بھی نبی کریم ﷺ کے ارشاد سے واضح ہے کہ مسلمانوں کی کوئی نہ کوئی جماعت قیامت تک جہاد کرتی رہے گی اور قیامت تک دین قائم رہے گا۔

” لا یخلو وجه الارض من الجهاد ان لم یکن فی ناحیة یكون فی
ناحیة اخرى “

یعنی زمین جہاد سے خالی نہیں رہے گی اگر زمین کے ایک علاقے میں جہاد نہیں ہوگا تو دوسرے علاقے میں جاری رہے گا۔
(مرقاۃ ج ۷ ص ۲۷۵)

جہاد اصغر اور جہاد اکبر:

جہاد کا لغوی معنی ہے مشقت اٹھانا، لغت کی کتاب مغرب میں ذکر کیا گیا ہے ”جہدہ حملہ فوق طاقتہ“ جب کوئی شخص طاقت سے زائد بوجھ اٹھائے تو کہا جاتا ہے ”جہدہ“ پھر غالب طور پر اس کا استعمال کفار کے ساتھ جنگ کرنے پر ہونے لگا۔ اب شرعی طور پر اس معنی میں استعمال ہونے لگا:

” بذل المجہود فی قتل الکفار مباشرة او معاونة بالمال “

کفار سے قتال میں اپنی جان پیش کرنا یا مالی معاونت سے کوشش کرنا۔ اور کہا جاتا ہے ”جاہدت العدو اذا قابلتہ فی تحمل الجہد“ کہ میں نے دشمن سے جہاد کیا یعنی خوب کوشش کی اور مشقت برداشت کی۔

” وهو دعوتهم الى الدين الحق وقاتلهم ان لم یقبلوا “

جہاد دین حق کی طرف دعوت دینا ہے اور اگر کفار دین حق کی دعوت کو نہ قبول کریں تو ان سے قتال (لڑائی) کرنا ہے:

” وفضل الجہاد عظیم وکیف وحاصلہ بذل اعز المحبوبات وادخال

اعظم المشقات علیہ وهو نفس الانسان ابتغاء مرضاة الله وتقربا

بذلک الیہ تعالیٰ “

اور جہاد میں بہت بڑی فضیلت پائی گئی ہے اس فضیلت کی اصل وجہ واضح ہے کہ اس پر عظیم محبوب چیز یعنی اپنی جان کو اللہ تعالیٰ کی رضا مندی حاصل کرنے کے لئے اور اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرنے کے لئے پیش کیا جاتا ہے اور بہت بڑی مشقت کو برداشت کیا جاتا ہے لیکن اس سے بھی زیادہ فضیلت کس میں ہے؟

”واشوق منه قصر النفس على الطاعات في النشاط ودفع الكسل على الدوام ومجانبة اهويتها“

اور جہاد سے بھی زیادہ اس میں مشقت پائی جاتی ہے کہ ہمیشہ اپنے نفس کو چستی سے عبادات و طاعت میں لگایا جائے اور اپنی خواہشات نفسانیہ سے مکمل طور پر اجتناب کیا جائے اس کے مشقت آمیز ہونے کی وجہ سے ہی تو نبی کریم ﷺ نے جہاد سے واپس لوٹتے ہوئے ارشاد فرمایا ”رجعنا من الجہاد الا صغر الى الجہاد الا کبر“ ہم چھوٹے جہاد سے بڑے جہاد کی طرف لوٹے ہیں۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی ایک روایت سے اس پر دلیل پائی گئی کہ نماز اپنے وقت میں ادا کرنا افضل ہے اسی وجہ سے نبی کریم ﷺ نے نماز کو وقت پر ادا کرنے سے افضل قرار دیا پھر جہاد کو:

”عن ابن مسعود قلت يا رسول الله اى الاعمال افضل؟ قال الصلوة على ميقاتها قلت ثم اى؟ قال بر الوالدین قلت ثم اى؟ قال الجہاد فى سبيل الله ولو استزدته لزادنى رواه البخارى“

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ کون سا عمل افضل ہے؟ تو آپ نے فرمایا نماز اپنے وقت میں ادا کرنا۔ میں نے کہا کہ پھر کون سے عمل افضل ہے؟ تو آپ نے فرمایا والدین کی فرمانبرداری، میں نے عرض کیا پھر کون سے عمل افضل ہے؟ تو آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد اور اگر میں آپ سے اور زیادہ سوال کرتا تو آپ اس کا جواب مجھے ارشاد فرماتے (لیکن میں نے اتنا ہی سوال کیا)۔

اعتراض: ایک اور روایت میں ایمان کے بعد جہاد کو افضل قرار دیا گیا تو پھر کس طرح کہا جائے گا کہ نماز افضل ہے۔

☆ ”عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ قال سئل رسول اللہ ﷺ اى العمل افضل؟ قال الايمان بالله ورسوله، قيل ثم ماذا؟ قال الجہاد فى سبيل الله، قيل ثم ماذا؟ قال حج مبرور“ (بخاری و مسلم)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ سے سوال کیا گیا کہ کون سا عمل افضل ہے؟ تو آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول (ﷺ) پر ایمان لانا پھر پوچھا گیا کہ پھر کون سا عمل

افضل ہے؟ تو آپ نے فرمایا حج مقبول۔

جواب: اگرچہ بظاہر احادیث میں تعارض ہے لیکن صحیح ترتیب یہ ہے کہ ایمان سب سے افضل ہے کیونکہ تمام عبادات کی دار و مدار ایمان پر ہے ایمان نہیں تو کوئی عبادت کار گرنہیں۔ اس کے بعد نماز اور وہ عبادات جو فرض عین ہیں وہ افضل ہیں:

”الصلوة علی ميفاتها افضل من الجهاد لان هذه فرض عين وتكرر والجهاد ليس كذلك“

کہ جہاد فرض ہی اس لئے ہوا ہے کہ کافر ایمان لائیں اور اللہ تعالیٰ کے دین کو بلندی حاصل ہو اور لوگ نماز ادا کریں لہذا واضح ہوا کہ جہاد مقصود لغیرہ ہے اور حسن لغیرہ ہے یعنی جہاد ایمان اور نماز کے لئے ہی مقصود ہے اور ان کی وجہ سے ہی حسین ہے لیکن نماز ذاتی طور پر مقصود ہے اور اس میں حسن ذاتی پایا گیا ہے۔ نبی کریم ﷺ سے ایک طویل حدیث حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جس میں یہ الفاظ گرامی مذکور ہیں:

”والذى نفس محمد بيده ما شجرت وجه ولا اغبرت قدم فى عمل يتغنى به درجات الآخرة بعد الصلوة المفروضة كجهاد فى سبيل الله صححه الترمذی“

قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں محمد کی جان ہے کوئی چہرہ زخمی نہیں اور کوئی قدم غبار آلود نہیں جس کے ذریعے آخرت کے درجات حاصل کئے گئے ہوں فرض نماز کے بعد جیسے اللہ کی راہ میں جہاد کرنا ہے۔ یعنی نماز فرض کے بعد جہاد ہی وہ عبادت ہے جس کے ذریعے آخرت کے درجات حاصل ہوتے ہیں اور اس میں مشقت اٹھائی جاتی ہے اور اللہ کی راہ میں انسان اپنے آپ کو زخمی کرتا ہے اور اپنے قدموں کو غبار آلود کرتا ہے۔

ہاں البتہ جب جہاد فرض عین ہو جائے تو اس وقت جہاں تک ممکن ہو نماز بھی ادا کرے اور جہاد بھی کرے اگر سخت مشکل درپیش آجائے کہ نماز ادا کرنی ممکن نہیں ہو رہی تو نماز مؤخر بھی ہو سکتی ہے اس صورت میں یقیناً ایمان کے بعد افضلیت کے لحاظ پر پہلا درجہ جہاد کا ہوگا۔ اس پر دلیل یہ ہے کہ خندق

کے دن نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام کی چار نمازیں قضاء ہو گئی تھیں۔

(ماخوذ از مرقاة ح ۷ ص ۲۶۲، و شامی ح ۳ ص ۲۳۷)

کون سے جہاد افضل ہے؟

”عن عبد الله بن حبشي ان النبي ﷺ سئل اي الاعمال افضل؟ قال طول القيام قيل اي الصدقة افضل؟ قال جهد المقل قيل فاي الهجرة افضل؟ قال من هجر ما حرم الله عليه قيل فاي الجهاد افضل؟ قال من جاهد المشركين بماله ونفسه، قيل فاي القتل اشرف؟ قال من اهرىق دمه وعقر جواده رواه ابو داود وفي رواية النسائي ان النبي ﷺ سئل اي الاعمال افضل؟ قال ايمان لا شك فيه وجهاد دلا غلول فيه وحجة مبرورة“

(مشکوٰۃ کتاب الجہاد)

حضرت عبد اللہ بن حبشی (بضم مہملۃ وسکون موحدۃ) رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک نبی کریم ﷺ سے پوچھا گیا کون سا عمل افضل ہے؟ آپ نے فرمایا لمبا قیام پھر پوچھا گیا کون سا صدقہ افضل ہے؟ آپ نے فرمایا جو تھوڑے مال والا شخص مشقت سے صدقہ کرے پھر سوال کیا گیا کون سی ہجرت افضل ہے؟ آپ نے فرمایا جن چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے حرام فرمایا ان کو چھوڑ دینا پھر پوچھا گیا کون سا جہاد افضل ہے؟ آپ نے فرمایا مشرکین سے اپنے جانوں اور مال سے جہاد کرنا پھر سوال کیا گیا کون سا قتل ہونا افضل ہے؟ آپ نے فرمایا کہ اس شخص کا مقتول (شہید) ہونا افضل ہے جس کا خون بہایا گیا ہو اور اس کے گھوڑی کی کچیں کاٹ دی گئی ہوں۔

(ابوداؤد)

نسائی کی روایت میں ہے کہ نبی کریم ﷺ سے سوال کیا گیا کون سا عمل افضل ہے؟ تو آپ نے فرمایا ایمان جس میں شک نہ ہو اور جہاد جس کے مال غنیمت میں خیانت نہ پائی جائے اور حج مقبول۔

وضاحت حدیث: لمبا قیام افضل ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس میں قراءت بھی لمبی ہوگی اور مشقت بھی زیادہ ہوگی جس عبادت میں مشقت زیادہ ہو وہ یقیناً افضل ہوتی ہے:

”واما ماورد من اطالة السجود افضل فلكونها تدل على كمال

المسكنة الموجبة للقرب الى الله تعالى“

بعض روایات میں لمبا سجدہ افضل ہونے کا ذکر ہے اس کی وجہ بھی یہ ہے کہ وہ کامل مسکینی پر دلالت کرتا ہے انسان جب رب تعالیٰ کے حضور کامل مسکینی سے سجدہ ریز ہوتا ہے تو اسے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہوتا ہے۔

”جهد المقل“ بضم الجیم وضم المیم وکسر القاف وتشدید اللام
ای طاقة الفقیر ومجهوده“

یعنی قلیل مال والا فقیر شخص جو مشقت سے اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کرے وہ افضل ہے البتہ شرط یہ ہے کہ اپنے اہل و عیال کو محتاج نہ کرے یا اس کے اہل و عیال نہ ہوں۔

”ولهذا ورد سبق درهم مائة الف درهم رجل له درهمان اخذ
احدهما فتصدق به ورجل له مال كثير فاخذ من عرضه مائة الف
فتصدق بها رواه النسائي عن ابي ذر“

اسی وجہ سے وارد ہے کہ ایک درہم ایک لاکھ درہم سے سبقت لے جاتا ہے کیونکہ جب ایک شخص کے پاس دو درہم ہوں ایک اپنے پاس رکھ لے اور ایک اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کر دے اس کا ایک درہم اس شخص کے لاکھ درہم سے سبقت لے جائے گا جس کے پاس کثیر مال ہے تو اس نے اس سے ایک لاکھ درہم صدقہ کر دیا۔

ہجرت کے سوال پر (کہ کونسی ہجرت افضل ہے)؟ آپ نے جواب دیا جن چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے حرام کیا ان کو چھوڑ دینا کیونکہ لغوی معنی ہی ”ہجر یہجر“ کا چھوڑنا ہے عام مشہور ہجرت کو بھی اسی لئے ہجرت کہا جاتا ہے کہ اس میں انسان اپنے وطن کو چھوڑ کر دوسرے وطن میں چلا جاتا ہے۔ افضل جہاد ہے وہ جس میں مشقت زیادہ پائی جائے اسی لئے نبی کریم ﷺ نے جان اور مال سے جہاد کرنے کو افضل قرار دیا ”ولتوقف هذا الجهاد على مجاهدة النفس“ کیونکہ اس جہاد میں نفس پر مشقت ہوتی ہے:

”ورد افضل الجهاد ان يجاهد الرجل نفسه وهو رواه ابن البخاری
عن ابي ذر“

اور یہ روایت بھی مذکور ہے کہ انسان کا اپنے نفس اور اپنی خواہشات سے جہاد کرنا افضل ہے وجہ

اس کی بھی یہی ہے کہ اس میں مشقت پائی جاتی ہے اسی لئے اس کو جہاد اکبر کہا گیا ہے۔

اعتراض: نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے ”افضل الجہاد کلمۃ حق عند سلطان جابر“
افضل جہاد کلمۃ حق ظالم بادشاہ کے سامنے کہنا ہے (تو ان تمام میں تطبیق کیسے؟)۔

جواب اول: ”هذا لا ینافیہ لانہ اشق علی النفس“ یہ حدیث پہلی احادیث کے مخالف نہیں
کیونکہ افضلیت کی وجہ جب نفس پر مشقت ہے تو یہ بھی افضل جہاد ہے کیونکہ جابر اور ظالم بادشاہ کے سامنے
کلمۃ حق کہنا اپنے آپ کو شدید مصائب میں مبتلا کرنا ہے تو اس سے بڑھ کر اور نفس پر مشقت کیا ہوگی۔

دوسرا جواب: ”او الا فضلیۃ اضافیۃ“ یا افضلیت اضافی پائی گئی ہے کہ بعض جہادوں سے
افضل جہاد یہ ہے کہ ظالم اور جابر بادشاہ کے سامنے کلمۃ حق کہا جائے۔ ”اشرف القتل“ کے سوال کے
جواب کا مطلب یہ ہے کہ انسان ثابت قدمی سے جہاد کرے پیٹھ پھیر کر بھاگے نہیں اس کا خون بہا دیا
جائے گا اس کے گھوڑے کی ٹانگیں کاٹ دی جائیں تو یہی شہادت افضل درجہ رکھتی ہے۔

(از مرقۃ ج ۷ ص ۲۹۵)

مجاہدین کی ازواج کی حرمت:

”عن بریدۃ قال قال رسول اللہ ﷺ حرمة نساء المجاہدین علی
القاعدین کحرمة امہاتہم وما من رجل من القاعدین یخلف رجلاً من
المجاہدین فی اہلہ فیخونہ فیہم الا وقف لہ یوم القیامۃ فیأخذ من
عملہ ما شاء فما ظنکم“ (رواہ مسلم، مشکوٰۃ کتاب الجہاد)

حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجاہدین کی عورتوں کی عزت
پیچھے رہ جانے والوں پر ایسے ہے جیسے ان کی ماؤں کی عزت ان پر ہے مجاہدین میں سے کسی شخص نے
پیچھے رہ جانے والوں میں سے کسی کو اپنی اہل میں اپنا جائنشین بنایا (کہ وہ ان کی دیکھ بھال رکھے اور ان کا
کام میں ہاتھ بٹائے) تو اس نے خیانت کر لی تو قیامت کے دن اسے کھڑا کیا جائے گا وہ اس کے اعمال
میں سے جو چاہے گالے لے گا تمہارا کیا گمان۔

وضاحت حدیث: جو لوگ جہاد میں نہ شریک ہو سکیں ان پر لازم ہے کہ مجاہدین کی بیویوں

کی عزت اسی طرح کریں جس طرح وہ اپنی ماؤں کی عزت کرتے ہیں اگر ان سے کسی نے دست درازی کر کے خیانت کی تو قیامت کے دن ضرور اس کے اعمال میں سے مجاہد کو لینے کا حق دے دیا جائے گا کہ تو اس کے نیک اعمال سے جو چاہے لے لے ﴿فَمَا ظَنُّكُمْ﴾ تمہارا کیا گمان ہے؟ یعنی وہ شخص جو اپنے نیک اعمال سے مکمل محروم ہو گیا اور مجاہد کو اس کی نیکیاں لینے کا حق دے دیا گیا تو اس کے متعلق تمہارا کیا گمان ہے کہ وہ خیانت کرنے والا کتابد بخت ہوگا اور مجاہد اور اس کی زوجہ کا مقام کتنا بلند ہوگا۔

مجاہد کی فضیلت:

☆ "عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ ﷺ مثل المجاہد فی سبیل کمثل الصائم القائم القانت بآیات اللہ لا یفتر من صیام ولا صلوة حتی یرجع المجاہد فی سبیل اللہ"

(بخاری و مسلم، مشکوٰۃ کتاب الجہاد)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والا جہاد سے لوٹنے تک اس درجہ میں ہوتا ہے جس درجہ میں روزے دار، قیام کرنے والا اور اللہ تعالیٰ کی آیات پڑھنے والا ہوتا ہے جو کہ روزے رکھنے میں اور نماز ادا کرنے میں سستی سے کام نہیں لیتا۔

وضاحت حدیث: اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والوں کو وہ اجر و ثواب حاصل ہوتا ہے جو نفلی روزے رکھنے والوں اور رات کو نوافل ادا کرنے والوں کو ہوتا ہے حالانکہ مجاہدین نفلی روزے نہیں رکھ رہے ہوتے اونہ ہی نوافل ادا کر رہے ہوتے ہیں "القانت بآیات اللہ ای القاری بہا" یہاں قانت کا معنی قاری ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی آیات کی تلاوت کرنے والا۔ مراد عبادت ہی ہے صاحب نہایہ نے بیان فرمایا ہے کہ احادیث میں "قانت" چند معانی میں استعمال ہوا ہے وہ یہ ہیں:

طاعت، خشوع، نماز، دعا، عبادت، قیام، لمبا قیام اور سکوت۔

"شبه المجاہد الذی لا یضیع لمحۃ من لمحاته من اجر و ثواب

سواء کان قائما او نائما یقاتل العدو ام لا بالصائم القائم الذی لا یفتر

عما ہو فیہ فہو من التشبیہ الذی المشبہ بہ مفروض غیر محقق"

مجاہد کو اس روزہ دار اور رات کو قیام کرنے والے اور اللہ تعالیٰ کی آیات کی تلاوت کرنے والوں

سے تشبیہ دی گئی جن کو عبادت سے ملال نہیں ہوتا تھکتے نہیں اور ست نہیں ہوتے گویا کہ ان کا ہر لمحہ عبادت میں گزر رہا ہے اسی طرح مجاہد کا ہر لمحہ یعنی حرکت و سکون عبادت شمار ہوتا ہے اگرچہ وہ روزہ دار نہیں ہوتا قیام کرنے والا نہیں ہوتا۔

☆ "عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ ﷺ انتدب اللہ لمن خرج فی سبیلہ لایخرجه الا ایمان بی وتصدیق برسلی ان ارجعه بما نال من اجر او غنیمۃ وادخلہ الجنة" (بخاری و مسلم، مشکوٰۃ کتاب الجہاد)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ ضامن ہے اس شخص کا جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں نکلتا ہے اور صرف اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہوئے اور اللہ تعالیٰ کے رسول (ﷺ) کی تصدیق کرتے ہوئے نکلتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو اجر و ثواب یا غنیمت سے لوٹاتا ہے اور اسے جنت میں داخل کرتا ہے۔

وضاحت حدیث: جو شخص اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہوئے اور اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ کی تصدیق کرتے ہوئے جہاد میں شریک ہو اللہ تعالیٰ نے اس سے وعدہ کر رکھا ہے کہ اسے اجر و ثواب عطا کرے گا اور یا مال غنیمت عطا کرے گا اور یا اسے درجہ شہادت عطا کرے گا کہ وہ جنت میں داخل ہوگا۔

☆ "عن سہل بن سعد قال قال رسول اللہ ﷺ رباط یوم فی سبیل اللہ خیر من الدنیا وما علیہا" (بخاری و مسلم، مشکوٰۃ کتاب الجہاد)

سہل بن سعد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کی راہ میں ایک دن (دشمن کے مقابل) ٹھہرنا دنیا اور دنیا کی تمام چیزوں سے بہتر ہے۔

وضاحت: "رباط بکسر اولہ ہو الاقامة فی مکان یتوقع هجوم العدو فیہ لقصد دفعہ للہ تعالیٰ"

"رباط" کا معنی یہ ہے کہ ایسی جگہ ٹھہرنا جہاں دشمن (کفار) کے هجوم کا خطرہ ہو کہ جب دشمن آئیں گے تو میں اللہ تعالیٰ کی رضامندی کیلئے ان کو مندرفع کروں گا۔

☆ "وعن انس قال قال رسول اللہ ﷺ لغدۃ فی سبیل اللہ اور وحة خیر من الدنیا وما فیہا" (بخاری و مسلم، مشکوٰۃ کتاب الجہاد)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کی راہ میں ایک صبح یا ایک شام دنیا اور دنیا میں پائی جانی والی چیزوں سے بہتر ہے۔

وضاحت: یعنی جہاد میں ایک صبح اور ایک شام گزارنا دنیا کی تمام نعمتوں سے بہتر ہیں۔ اسی طرح جہاد میں ایک صبح اور ایک شام گزارنے سے جو ثواب حاصل ہوتا ہے وہ دنیا کی نعمتوں کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے بھی افضل ہے۔

☆ "عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ ﷺ افشوا السلام واطعموا الطعام واضربوا الہام تورثوا الجنان، رواہ الترمذی وقال هذا حدیث غریب" (مشکوۃ کتاب الجہاد)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سلام کو عام کرو اور طعام کھلاؤ اور کھوپڑیوں کو اڑا دو کہ تمہیں جنت عطا کر دی جائے۔

وضاحت: "تورثوا" باب افعال سے مجہول کا صیغہ ہے "جنان" بکسر الجیم جمع ہے جنت کی یعنی جنات نعیم سلام کو عام کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اپنے مسلمان بھائیوں کو سلام کرو اور ان کے سلام کا جواب دو۔ طعام کھلانے کا مطلب یہ ہے کہ فقیروں، غریبوں، یتیموں کو طعام کھلاؤ کیونکہ یہ باعث برکت ہے اور ذریعہ جنت ہے۔ کھوپڑیاں اڑانے سے مراد کفار سے جہاد کرنا اور میدان جہاد میں ان کے سراڑا دینے کا حکم دیا گیا ہے۔

مسئلہ: "ورمہم بنبل ونحوہ وان تترسوا ببعضنا ونقصہم ای الکفار وما اصیب منہم ای من المسلمین لادیۃ فیہ ولا کفارۃ"

کفار اگر اپنے بچاؤ کے لئے مسلمانوں کو آگے کر کے اپنی ڈھال بنادیں تو ہم ان مسلمانوں کا خیال کرتے ہوئے کفار کو نہیں بچائیں گے بلکہ ان پر اپنے ہتھیار چلا دیں گے اس کی زد میں آ کر مسلمان قتل ہو جائے تو ہم پر کوئی کفارہ اور دیت لازم نہیں آئے گا کیونکہ ہم نے کافروں کو قتل کرنے کا ارادہ کیا نہ کہ مسلمانوں کو۔ اسی طرح کوئی گناہ بھی ہم پر لازم نہیں آئے گا۔ (درمختار)

ہاں یہ بھی خیال رہے کہ اگر مسلمانوں کو زبردستی آگے کر لیا گیا تو وہ مسلمان گنہگار نہیں ہوں گے بلکہ کفار کے جبر کی وجہ سے ان کو درجہ شہادت بھی حاصل ہو گا لیکن اگر مسلمان کافروں کی فوج میں ہوں

کافروں کا ساتھ دے رہے ہوں اور کافر مسلمانوں پر حملہ آور بھی ہیں تو پھر بھی ان مسلمانوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے کفار کو قتل کیا جائے گا۔ اس صورت میں کفار کا بچاؤ کرنے والے مسلمان گنہگار ہوں گے اور مسلمانوں کی تلوار کی زد میں آنے سے درجہ شہادت سے بھی محروم ہو گئے کیونکہ انہوں نے دنیاوی لالچ یعنی تنخواہ کی وجہ سے کافروں کا ساتھ اپنی خوشی سے دیا جبر سے نہیں۔ ہاں فتح کے بعد مسلمان اس علاقے کے کفار کو تہ تیغ نہیں کر سکتے جس میں مسلمانوں اور ذمی لوگ اس کی زد میں آ رہے ہوں پہلے وہاں سے ان کو نکال لیا جائے پھر کفار کے سراڑ دیئے جائیں۔

مسئلہ : جب جنگ میں کافروں کے غالب آنے کا خطرہ ہو اور یہ بھی خطرہ ہو کہ اگر ہمارے پاس قرآن پاک ہو تو وہ اس کی بے حرمتی کریں گے تو ایسی صورت میں قرآن پاک میدان جنگ میں لے جانا منع ہے۔

مسئلہ : مسلمانوں پر حرام ہے کہ وہ اپنا اسلحہ جنگی آلات و ہتھیار کفار پر بیچیں کیونکہ اس سے کفار کو طاقت حاصل ہوگی اور مسلمانوں کی بربادی کا ذریعہ بنے گا۔ لیکن اس مسئلہ کا تعلق غالباً اس وقت سے تھا جب مسلمان واقعی مسلمان تھے کفار پر غالب تھے اپنے اسلحہ میں خود کفیل تھے، اب تو مسلمان زبوں حالی کا شکار کفار سے دب کر جی حضوری بن کر وقت گزار رہے ہیں اب انہوں نے کیا اسلحہ بیچنا ہے بلکہ کفار سے اسلحہ خریدنے کے لئے منت سماجت کرنی ہے ایک علاقے کے کافر نے جو دوسرے کافر کو اسلحہ دینا ہے وہ مسلمانوں کو نہیں دینا بلکہ ناکارہ دینا ہے۔

کاش کہ گزرا ہوا دور واپس آ جائے ایک مرتبہ پھر کفار مسلمانوں کو دیکھ کر کانپنے لگ جائیں وہ ہم سے اسلحہ مانگیں نہ کہ ہم ان سے دست سوال دراز کریں۔



﴿وَأَنْفِقُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ
وَاحْسِنُوا إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ﴾

(۱) ”اور اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ پڑو اور بھلائی والے ہو جاؤ بیشک بھلائی والے اللہ کے محبوب ہیں۔“

(۲) ”اور خرچ کرو اللہ کی راہ میں اور نہ ڈالو اپنے آپ کو ہلاکت میں اور احسان کرو بیشک اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے احسان کرنے والوں سے۔“

ما قبل سے رابطہ:

(۱) اللہ تعالیٰ نے جب کافروں سے جنگ کرنے کا حکم دیا تو جنگ میں آلات قتال (اسلحہ) کی محتاجی ہوتی ہے یقیناً اس میں مال خرچ کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اس لئے اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے کا حکم دیا پھر خصوصاً کئی لوگ مال دار ہوتے ہیں لیکن بیماری، ضعف اور کسی نہ کسی عذر کی وجہ سے جہاد میں شریک نہیں ہو سکتے اور کئی لوگ جہاد کرنے کی طاقت رکھتے ہیں لیکن ان کے پاس ہتھیار خریدنے کی طاقت نہیں ہوتی۔ اس لئے رب تعالیٰ نے مال خرچ کرنے کا حکم دیا کہ مالی طاقت رکھنے والے جب جانی طور پر خود جہاد میں شریک نہیں ہو سکتے تو دوسروں کی مالی معاونت کر کے بھی جہاد میں شرکت کا ثواب حاصل کیا جاسکتا ہے۔

(۲) جب آیہ کریمہ ﴿الشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمَاتِ قِصَاصٌ﴾ نازل ہوئی تو ایک شخص نے عرض کیا قسم ہے اللہ تعالیٰ کی یا رسول اللہ ہمارے پاس خرچ نہیں اور کوئی ایک بھی ہمیں کھلاتا نہیں۔ (مالی معاونت نہیں کرتا)

”فامر رسول اللہ ﷺ ان ینفقوا فی سبیل اللہ وان یتصدقوا وان لا یکفوا

ایدیہم عن الصدقة ولو بشق تمرۃ تحمل فی سبیل اللہ فیہلکوا“

تو رسول اللہ ﷺ نے حکم فرمایا کہ اللہ کی راہ میں مال خرچ کرو اور صدقہ کرو اور اپنے ہاتھوں کو

صدقہ کرنے سے نہ روکو (اپنی طاقت کے مطابق خلوص سے صدقہ کرو) اگرچہ کھجور کا کچھ حصہ بھی دے دو جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں جانے کے لئے معاون بن سکے ورنہ ہلاک ہو جاؤ گے تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کریمہ کو نازل فرمایا۔

شان نزول:

دو وجہ یہی جو ماقبل سے رابطہ کے لئے کبیر میں ذکر کی گئی ہیں یہ شان نزول ہی ہیں پہلی وجہ کی وضاحت عام مفسرین کرام نے بطور شان نزول ذکر فرمائی۔ ابو عمران روایت کرتے ہیں کہ ہم قسطنطنیہ میں تھے تو رومیوں کا ایک بہت بڑا لشکر ہمارے مقابلہ کے لئے آگیا تو مسلمانوں میں سے ایک شخص ان کے لشکر میں گھس کر لڑائی کرنے لگا تو دوسرے مسلمان حضرات کہنے لگے ”القی بیدیہ الی التہلکۃ“ اس شخص نے اپنے آپ کو اپنے ہی ہاتھوں ہلاکت میں ڈال دیا (مطلب یہ تھا کہ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنے سے تو اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے) تو مسلمانوں کے لشکر میں حضرت ابو ایوب انصاری بھی تھے وہ کھڑے ہوئے انہوں نے فرمایا تم رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ﴾ کی یہ وجہ بیان کرتے ہو حالانکہ یہ وجہ نہیں بلکہ یہ آیت ہم انصار کے حق میں نازل ہوئی اس کی اصل وجہ نزول یہ ہے:

”ان لما اعز الله تعالى دينه وكثر ناصروه قال بعضنا لبعض سرا دون رسول الله ﷺ ان اموالنا قد ضاعت وان الله تعالى قد اعز الاسلام وكثر ناصروه فلو اقمنا في اموالنا فاصلحنا ما ضاع منها فانزل الله تعالى على نبيه ما يرد علينا“

جب اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کو عزت دے دی یعنی غلبہ عطا فرما دیا اور دین اسلام کے بہت مددگار ہو گئے تو ہم میں سے رسول اللہ ﷺ کی غیر موجودگی میں بعض حضرات بعض سے آہستہ آہستہ کہنے لگے کہ اب اللہ تعالیٰ نے اسلام کو غلبہ عطا کر دیا ہے عزت عطا فرمادی ہے اور اس کے کثیر مددگار ہو چکے ہیں ہم پہلے ہی بہت مال خرچ کر چکے ہیں اب ہمیں اپنے مالوں کی حفاظت کرنی چاہئے اور اپنی ضروریات و اصلاح کے لئے مال بچا کر رکھنا چاہئے تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کریم ﷺ پر ہمارے اس

قول کے رد میں یہ آیت کریمہ نازل فرمائی کہ اللہ کی راہ میں مال خرچ کرو اگر مال خرچ نہیں کرو گے کفار سے جنگ کی تیاری نہیں کرو گے تو اپنے ہاتھوں سے ہی اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال دو گے۔

(روح المعانی)

(۲) شان نزول کی دوسری وجہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب عمرہ کی قضاء کے لئے مکہ مکرمہ میں جانے لگے تو صحابہ کرام کے دلوں میں خیال پیدا ہوا کہ ہو سکتا ہے کفار ہمیں پھر روک دیں اور ہمارے ساتھ جنگ چھیڑ دیں اور ہمیں بھی ان سے لڑنا پڑے تو ہمیں بھی تیاری رکھنی چاہئے اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کی تسلی کے لئے آیت کریمہ کو نازل فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کرو:

”فكانت عمرة وجهادا واجتمع فيه المعينان فلما كان الامر كذلك

لا جرم قال الله تعالى ﴿وَأَنْفِقُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ﴾ ولم يقل وانتفقوا في

الجهاد والعمرة“

قرآن پاک کا یہ خصوصی کمال ہے کہ مختصر الفاظ کثیر مطالب کو حاوی ہوتے ہیں اگرچہ مسلمانوں کو جہاد اور عمرہ کے لئے مال خرچ کرنے کا حکم دیا لیکن لمبا جملہ ”وأنفقوا في الجهاد والعمرة“ (اور خرچ کرو جہاد میں اور عمرہ میں) ذکر نہیں کیا بلکہ مختصر جملہ ذکر کیا جو طویل مقصد کو شامل ہے ارشاد فرمایا:

﴿وَأَنْفِقُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ﴾ ”اور اللہ کی راہ میں مال خرچ کرو“

فائدہ جلیلہ: شان نزول کی پہلی وجہ حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے ان کی روایت کو ذکر کرنے کے ساتھ مفسرین کرام نے یہ بھی ذکر فرمایا:

”قال البغوي فما زال ابو ايوب رضي الله عنه يجاهد في سبيل الله حتى

كان آخر غزوة غزاها بقسطنطينية فاستشهد ودفن في اصل سور

قسطنطينية وهم يستسقون به“

بغوی رحمہ اللہ نے ذکر فرمایا کہ حضرت ابو ایوب انصاری ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد میں شریک ہوتے رہے یہاں تک کہ آپ نے سب سے آخری جہاد قسطنطنیہ میں شرکت کی جس میں آپ شہید ہو گئے اور قسطنطنیہ کے قلعہ کی دیواروں کے ساتھ ہی آپ کو دفن کر دیا گیا لوگ قحط سالی میں آپ کے توسل سے رب تعالیٰ سے بارش طلب کرتے ہیں۔

(مظہری)

روح البیان نے بھی یہ واقعہ ذکر کیا ساتھ وضاحت کی کہ یہ قسطنطنیہ کی وہ جنگ مراد ہے جو حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ہوئی (یعنی پہلی جنگ جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ کی زیر قیادت ہوئی وہ مراد نہیں):

”فتوفی هناک ودفن فی اصل سور قسطنطنیة وهم یتشفون به“

وہ وہاں ہی شہید ہوئے اور قسطنطنیہ کی دیواروں کے ساتھ ہی آپ کو دفن کر دیا گیا اور لوگ آپ کے وسیلہ جلیلہ سے اللہ تعالیٰ سے شفا حاصل کرتے ہیں۔

سبحان اللہ کیا خوب مسئلہ حل ہوا کہ اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کے وسیلہ سے اپنی خصوصی رحمت کا نزول فرماتا ہے جس کی وجہ سے لوگوں کو بارش بھی حاصل ہوتی ہے اور بیماریوں سے شفا بھی یعنی حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کا مزار پر انوار مرجع خلائق ہے اور رب تعالیٰ کی رحمت کے نزول کا ذریعہ ہے۔

وَأَنْفِقُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ: ”اور خرچ کرو اللہ کی راہ میں“۔ انفاق، کا معنی ہے کہ مال خیر کے کاموں میں صرف کیا جائے اگر کوئی مال ضائع کر دے تو اس ضائع کرنے والے کو عربی میں ”مضيع المال“ کہا جائے گا ”منفق“ نہیں کہا جائے گا۔ پھر ”انفاق“ کو ﴿فِي سَبِيلِ اللَّهِ﴾ سے مقید کر دیا کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کرو اللہ تعالیٰ کی راہ سے مراد دین اسلام ہے سبیل کا معنی ”راستہ“ اور ”سَبِيلِ اللَّهِ“ کا معنی اللہ کا راستہ یعنی دین اسلام۔

اب آیہ کا مفہوم وسیع تر ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ نے دین میں جہاں بھی مال خرچ کرنے کا حکم دیا ہے وہ اس میں داخل ہیں:

”سواء كان انفاقا في حج او عمرة او كان جهادا بالنفس او تجهيزا

للغير او كان انفاقا في صلة الرحم او في الصدقات او على العیال او

في الزکوات والكفارات او عمارة السبیل وغيره ذلک“

خواہ وہ مال حج میں خرچ کرنا ہو یا عمرہ میں خواہ اپنے نفس سے جہاد کرنے میں مال خرچ کرنے کی ضرورت یا غیر کی تجہیز و تکفین میں مال خرچ کرنا ہو، یا صلہ رحمی کے طور پر مال خرچ کرنا یا بطور صدقات

مال خرچ کرنا اسی طرح رفاہ عامہ کے لئے کنواں کھوانے اور تیار کرنے میں مال خرچ کرنا ہو وغیرہ تمام نیکی کے کاموں میں مال خرچ اس آیت کریمہ میں داخل ہے کیونکہ یہ سب کام دین اسلام نے ہی تو بتائے ہیں کہ یہ نیکی کے کام ہیں۔ ہاں البتہ جہاد کا ذکر ساتھ ہی پہلے آچکا ہے اس لئے یہ آیت کریمہ جہاد میں مال خرچ کرنے کو زیادہ واضح کر رہی ہے۔

(کبیر)

کیا خوب حکمت:

سبحان اللہ رب تعالیٰ کا کلام کتنی ہی حکمت سے لبریز ہے اور کیا خوب انداز بیان ہے جب مال خرچ کرنے کو واجب کیا گیا تو اس وجوب کی علت اور وجہ ﴿وَأَنْفِقُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ﴾ ”اللہ کی راہ میں مال خرچ کرو“ سے یوں بیان کر دی:

”وَذَلِكَ لَانَ الْمَالِ مَالِ اللَّهِ فَيَجِبُ انْفَاقُهُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ“

کہ جب مال ہی تمہیں رب تعالیٰ نے عطا کیا ہے اور درحقیقت مال ہی اس کا ہے تو تم پر واجب ہے کہ اسی کی راہ میں خرچ کرو یعنی مال اس طرح خرچ کرو جس طرح رب تعالیٰ نے بیان فرمایا:

”وَلَا يَزَالُ الْمُؤْمِنُ إِذَا سَمِعَ ذَكَرَ اللَّهِ اهْتَزَّ وَنَشِطَ فَيَسْهَلُ عَلَيْهِ انْفَاقُ الْمَالِ“

اور رب تعالیٰ نے ﴿فِي سَبِيلِ اللَّهِ﴾ کہا ہے اس میں حکمت یہ ہے کہ مومن جب اللہ تعالیٰ کا نام سنتا ہے تو خوشی سے جھوم اٹھتا ہے اور خوشی سے پھولے نہیں سماتا تو اس پر اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنا آسان ہو جاتا ہے۔

(کبیر)

وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ : ”اور نہ ڈالو اپنے آپ کو ہلاکت میں“ اس میں ایک قول یہ ہے کہ باء زائدہ ہے اور ”ایدی“ سے مراد نفس (ذاتیں) ہیں یعنی ذکر جزاء کا اور مراد کل ہے۔ ”وَالْمَعْنَى لَا تُلْقُوا أَنْفُسَكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ“ اور معنی یہ ہے کہ اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو (راقم کا ترجمہ اسی کے مطابق ہے)

اور ایک قول یہ ہے کہ باء اپنے اصل ہے پر زائدہ نہیں اور کلام میں عبارت محذوف ہے تقدیر عبارت کی یہ ہے ”وَلَا تُلْقُوا أَنْفُسَكُمْ بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ“ اور اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ پڑو یہ ترجمہ اعلیٰ حضرت کا ہے جو با محاورہ ہے اصل میں ان الفاظ کا ترجمہ یہ ہے (اور نہ ڈالو اپنے آپ کو

(خازن)

اپنے ہی ہاتھوں سے ہلاکت میں)۔

تاہم مفتی احمد یار خان رحمہ اللہ نے ظاہری الفاظ کے مطابق ترجمہ کیا ہے ”اور نہ ڈالو اپنے ہاتھوں کو ہلاکت میں“ ضیاء القرآن کا ترجمہ بھی اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کے مطابق ہی ہے۔

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

﴿وَلَا تُلْقُوا﴾ اصل میں مضارع کا صیغہ ”تلقیوں“ ہے لاء نہی کے ذریعے نون اعراب گر گیا۔ ”لا تلقیو“ ہو گیا۔ ضمہ یاء پر ثقیل تھا نقل کر کے ماقبل کو دے دیا۔ یاء کو التقاء ساکنین کی وجہ سے حذف کر دیا ”ولا تلقوا“ ہو گیا۔

”اللقاء، طرح الشئ، والقی بیدہ لا يستعمل الا فی الشر“

القاء کا معنی ڈالنا اور پھینکنا ہے ”القی بیدہ“ صرف شر میں استعمال ہوتا ہے خیر کے معنی میں استعمال نہیں ہوا۔ ”الی“ سے فعل کو متعدی کیا گیا کیونکہ اس میں معنی انتہاء کا پایا گیا ہے یعنی ایسا کام نہ کرو جس کی انتہاء ہلاکت ہو۔

”إِلَى التَّهْلُكَةِ“ ای الہلاک یعنی ہر وہ چیز جس کا انجام ہلاکت ہوا ہے ”تہلکۃ“ کہا جاتا ہے۔ بعض حضرات نے یہ بیان کیا ہے کہ جس ہلاکت سے بچنا ممکن ہوا ہے ”تہلکۃ“ کہتے ہیں اور جس سے بچنا ممکن نہ ہوا ہے ”ہلاک“ کہا جاتا ہے۔

(مظہری)

”تہلکۃ“ کا بہت وسیع مفہوم ہے:

یعنی اپنے آپ کو اسباب ہلاکت میں نہ ڈالو وہ اسباب ہلاکت کیا ہیں؟

”امساک الاموال والانفس عن الجهاد لان به يقوى العدو وتكسر

المصاب في الدين والذل لاهله كما هو مشاهد“

جہاد کے لئے مال خرچ نہ کرنا اور اپنی جانوں کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں قربان نہ کرنا کیونکہ اس سے دشمن کو قوت حاصل ہوتی ہے اور دین میں زیادہ مصیبتیں حاصل ہوتی ہیں اور مسلمانوں کو ذلت حاصل

ہوتی ہے جسے ہم آئے دن دیکھ رہے ہیں۔ بخلاف اس کے جو لوگ اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنا مال اور جان پیش کرتے ہیں ان کو اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت میں دائمی عزت عطا فرماتا ہے یہی لوگ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے مستحق ہوتے ہیں:

﴿أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ﴾
 ”ان لوگوں پر اللہ تعالیٰ کی مہربانیاں اور رحمت ہے“

(صاوی)

”الأترون ان الامة الاسلامية لما نكصت على اعقابها ونامت على
 وسادة الراحة الوئير وتقهقرت الى الوراء ونامت عن جمع المال
 وانفاقه في الجهاد وسبقته الامم اخذت تبید وتهلك“

کیا تم دیکھتے نہیں جب ملت اسلامیہ نے پیچھے کی جانب جانا شروع کر لیا اور آرام دہ بستر پر
 سونے کی عادت بنالی اور الٹی چال چلنے لگے اور جہاد میں مال جمع کرنے اور خرچ کرنے سے آنکھیں
 بند کر لیں تو دوسری قومیں ان پر سبقت لے گئیں اور انہوں نے مسلمانوں کو تباہ و برباد کرنا شروع کر دیا۔

(جواہر طنطاوی)

کفار نے مسلمانوں کی ہلاکت کے لئے طیارے تیار کر لئے، میزائل بنائے ہر قسم کی تباہی
 پھیلانے والے آلات حرب تیار کر لئے اور مسلمانوں نے قرض لے لے کر محافل سرود و رقص قائم کیں
 بسنت پر کروڑوں روپے اڑا دیئے جب جنگ کی باری آئی تو نوے ہزار مسلمانوں کو قید کر کے اپنے
 ملک کو دلخت کر کے ایسی ذلت حاصل کی جس کی مثال نہیں ملتی۔ حق تو یہ تھا کہ اس پر شرم آتی لیکن
 کرتوت وہی رہے۔ چال وہی رہی۔

قاضی بیضاوی رحمہ اللہ نے یہی مضمون بیان کرنے کے ساتھ زیادہ یہ بھی بیان کیا:

﴿وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ﴾ بالاسراف وتضيع وجه المعاش“

تم اپنے مالوں میں اسراف کر کے (بیجا خرچ کر کے) اور اپنے ذرائع معاش ضائع کر کے اپنے

(بیضاوی)

آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔

”وقال بعضهم نزلت الآية في البخل وترك الانفاق في سبيل الله“

بعض حضرات نے بیان کیا ہے کہ آیہ کریمہ بخل اور اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے کو چھوڑنے کے متعلق نازل ہوئی یعنی مقصد یہ ہے کہ تم کنجوسی کر کے اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کرنے کو چھوڑ کر اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔
(مظہری)

خرچ میں اعتدال سے کام لینا:

قاضی بیضاوی رحمہ اللہ نے ایک معنی جو تحریر فرمایا کہ اسراف کر کے اور ذرائع معاش کو ضائع کر کے اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو اسی کی وضاحت میں شیخ زادہ رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں۔

☆ "عن سعيد بن المسيب ومقاتل بن حيان رضى الله عنهما قالا لما امر الله تعالى بالانفاق قال رجال امرنا بالانفاق في سبيل الله ولو انفقنا اموالنا بقينا فقراء فانزل الله تعالى ولا تلقوا بأيديكم الى التهلكة"

حضرت سعید بن مسیب اور مقاتل بن حیان رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں جب اللہ تعالیٰ نے مال خرچ کرنے کا حکم دیا تو کچھ لوگ کہنے لگے کہ ہمیں اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے کا حکم دیا گیا ہے لیکن ہم نے اپنے مال اگر خرچ کر دیئے تو ہم خود فقیر ہو جائیں گے تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا ﴿وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ﴾ یعنی تمہیں یہ حکم نہیں دیا گیا کہ تم اللہ کی راہ میں سارا مال ہی خرچ کر دو خود بھوکے اور ننگے ہو جاؤ اور اپنے اہل و عیال کو بھوک کی وجہ سے ضائع کر دو بلکہ مال خرچ کرنے میں اعتدال سے کام لو کچھ مال اپنے لئے اور اپنی زوجہ اور اولاد اور اپنے ضعیف والدین کے لئے بھی رکھ لو اور کچھ اللہ تعالیٰ کی راہ میں بھی خرچ کر دو سارا مال خرچ کر کے اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو یہ مسئلہ اللہ تعالیٰ کے ارشادات گرامیہ سے واضح طور پر ثابت ہے:

﴿وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُومًا مَّحْسُورًا﴾
(بنی اسرائیل ۲۹ پ ۱۵)

”اور اپنا ہاتھ اپنی گردن سے بندھا ہوا نہ رکھ اور نہ پورا کھول دے کہ تو بیٹھ رہے ملامت کیا ہوا تھکا ہوا“
﴿وَالَّذِينَ إِذَا أَنْفَقُوا لَمْ يُسْرِفُوا وَلَمْ يَقْتُرُوا وَكَانَ بَيْنَ ذَلِكَ قَوَامًا﴾

”اور وہ کہ جب خرچ کرتے ہیں نہ حد سے بڑھیں اور نہ تنگی کریں اور ان دونوں کے درمیان اعتدال پر رہیں“

(ار شیخ زادہ)

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے چند اوصاف ذکر فرمائے ان میں یہ بھی ذکر کیا کہ وہ خرچ میں اعتدال رکھتے ہیں نہ حد سے زیادہ مال خرچ کرتے ہیں اور نہ ہی کنجوسی سے کام لیتے ہیں لیکن راقم کا موقف یہ ہے کہ یہ عام نیک لوگوں کا وصف ہے البتہ وہ حضرات جو تقویٰ میں بہت بلند مقام رکھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ پر کامل توکل رکھتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں سارا مال بھی خرچ کر دیں تو یہ ان کی شان ہے جیسا کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے سارا مال نبی کریم ﷺ کی خدمت میں غزوہ (جہاد) کی تیاری کے لئے پیش کر دیا۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے ان کی اس فعل پر تعریف فرمائی:

گناہوں میں مبتلا ہو کر ہلاکت میں نہ پڑو:

”اخرج عبد بن حمید وابن المنذر وابن مردويه والطبرانی والبيهقي
في الشعب عن النعمان بن بشير قال كان الرجل يذنب الذنب فيقول
لا يغفر الله لي فانزل الله ولا تلقوا بأيديكم الى التهلكة“

حضرت نعمانی بن بشیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں جب کوئی شخص گناہ کرتا تو کہتا اللہ تعالیٰ میری مغفرت نہیں کرے گا (اس طرح وہ مزید گناہوں میں مبتلا ہوتا) تو اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ مبارکہ کو نازل کیا ﴿وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ﴾ اب اس کا مطلب یہ ہوگا کہ گناہوں میں مبتلا ہو کر اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔

☆ ”واخرج وكيع وسفيان بن عيينة والفریابی وعبد بن حمید وابن جریر وابن المنذر وابن ابی حاتم والحاكم وصححه والبيهقي عن البراء بن عازب انه قيل له ﴿وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ﴾ هو الرجل يلقي العدو فيقاتل حتى يقتل قال لا ولكن وهو الرجل يذنب الذنب فيلقى بيديه فيقول لا يغفر الله لي ابدًا“

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ﴾ کا کیا یہ مطلب ہے۔ کہ ایک شخص دشمن سے مقابلہ کرے اور لڑائی کرتے ہوئے مقتول ہو جائے (کیا اس سے منع کیا گیا ہے کہ تم اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو) تو انہوں نے فرمایا نہیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص گناہوں میں مبتلا ہو کر یہ نہ کہے کہ وہ مجھے اللہ تعالیٰ کبھی بھی نہیں بخشے گا تو وہ اور گناہوں میں مبتلا ہو کر اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالے۔

رب تعالیٰ کی رحمت سے ناامید ہو کر اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو:

ابھی جو دو حدیثیں بیان کی ہیں ان کا ایک وہی مطلب ہے جو ذکر کر دیا گیا ہے جس کو اس

حدیث سے تائید حاصل ہے:

”واخرج ابن جریر وابن المنذر وابن ابی حاتم عن ابن عباس قال
التهلكة عذاب الله“

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ﴿وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ﴾
میں ”التهلكة“ کا معنی اللہ تعالیٰ کا عذاب ہے اور دوسرا مطلب یہ ہے جو اب عنوان قائم کیا ہے کہ کوئی
شخص گناہ کر کے یہ نہ کہے کہ اللہ تعالیٰ کبھی بھی مجھے نہیں بخشے گا یہ رب تعالیٰ کی رحمت سے ناامیدی ہے جو
انسان کو ہلاکت میں ڈال دیتی ہے اس لئے توبہ کرے اور رب تعالیٰ کی رحمت کی امید رکھے کہ وہ مجھے
بخشنے گا اس مسئلہ کو اس حدیث سے تائید حاصل ہے۔

”واخرج وكيع وعبد بن حميد وابن جرير عن عبيدة السلماني في

قوله ﴿وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ﴾ قال القنوط“

عبیدہ سلیمانی رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ
إِلَى التَّهْلُكَةِ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ناامید ہو کر اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔
(ماخوذ از درمنشور)

مال کم سمجھ کر، خرچ نہ کر کے ہلاکت میں نہ پڑو:

”قال ابن عباس انفق في سبيل الله وان لم يكن ذلك الاسهم او

مشقص ولا يقولن احدكم لا اجد شيئا“

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اللہ کی راہ میں مال خرچ کرو اگرچہ سوائے ایک
تیر یا تیر کی نوک کے تمہارے پاس اور کچھ نہ ہو تم میں سے کوئی ایک یہ نہ کہے کہ میں کچھ نہیں پاتا۔ اب
مطلب یہ ہو گیا کہ مال کو تھوڑا سمجھ کر اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنا چھوڑ کر اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو
”ونحوه عن السدي انفق ولا عقلا ولا تلقى بيدك الى التهلكة“

حضرت سدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کرو خواہ تمہارے پاس اونٹ کی ایک رسی ہو تو وہی اللہ تعالیٰ کی راہ میں دے دو لیکن یہ کہہ کر کہ ”میرے پاس دینے کے لئے کوئی چیز نہیں“ اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔
(قرطبی)

اپنی اولاد کی فکر میں مال خرچ نہ کر کے ہلاکت میں نہ پڑو:

حضرت حذیفہ بن یمان اور حضرت ابن عباس اور حضرت عکرمہ اور عطا اور مجاہد اور جمہور حضرات نے یہ معنی بھی تحریر فرمایا ہے:

” لا تلقوا بایدیکم بان تترکوا النفقة فی سبیل اللہ وتخافوا العيلة

فیقول الرجل لیس عندی ، والی هذا ذهب البخاری

اپنی اولاد کی فکر میں اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کرنا چھوڑ کر اور یہ کہہ کر کہ میرے پاس دینے کے لئے کچھ نہیں اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو بخاری رحمہ اللہ نے بھی یہ معنی لیا ہے۔

ثواب سے محروم ہو کر ہلاکت میں نہ پڑو:

” لا تمسکوا اموالکم فی رثا منکم غیرکم فتہلکوا بحرمان منفعة

اموالکم ومعنی آخر ولا تمسکوا فیذهب علیکم الخلف فی الدنیا

والثواب فی الآخرة

اپنے مال روک کر اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ نہ کر کے اپنے آپ کو دنیاوی منافع اور اخروی ثواب سے محروم کر کے اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو کیونکہ وہ تمہارا مال تمہارے پیچھے رہ جائیگا لے ورتاء سمیٹ لیں گے بلکہ دنیا میں بھی تمہیں اس مال سے محروم کرنے کیلئے مختلف ہتھکنڈے استعمال کریں گے۔
حرام مال خرچ کر کے اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو:

” لا تنفقوا من حرام فیرد علیکم فتہلکوا “ حرام مال خرچ نہ کرو کیونکہ اگر تمہیں بھی

حرام مال ہی عطا کر دیا گیا تو تم ہلاکت میں پڑ جاؤ گے اور اگر تم نے حرام مال ثواب کی غرض سے خرچ یا تو اس کے بدلے تمہیں جو جزاء حاصل ہوتی ہے وہ جزاء خیر تو ہونی نہیں اس لئے تم اپنے آپ کو ہلاکت

میں نہ ڈالو۔

جنگ میں بلا خطر کو دپڑنا اس آیت کا مصداق نہیں:

ایک مسلمان کفار کے ایک بڑے لشکر پر حملہ کرتا ہے اس امید پر کہ میں ان پر غالب آ جاؤں گا ”اذا طلبت الشهادة وخلصت النية فليحمل“ اور اس کی نیت بھی خالص ہے اور شہادت کی طلب کے لئے وہ کفار پر حملہ کرتا ہے تو یہ جائز ہے۔ اگرچہ بعض حضرات نے کہا ”فان لم تكن فيه قوة فذلك من التهلكة“ کہ اگر کسی شخص میں اتنی طاقت نہیں کہ وہ کفار کے ساتھ مقابلہ نہیں کر سکتا تو پھر جنگ میں اکیلے شخص کا شریک ہونا اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا ہے۔ (از قرطبی)

لیکن راقم کے نزدیک یہ ہلاکت میں واقع ہونا لازم نہیں آتا۔ اسی پر علامہ قرطبی اور علامہ رازی رحمہ اللہ کے دلائل ملاحظہ ہوں ایک دلیل تو علامہ رازی نے وہی بیان فرمائی جو شان نزول میں حضرت ابوالیوب انصاری رضی اللہ عنہ کا ارشاد ذکر کیا گیا۔

☆ ”الثانی روی الشافعی رضی اللہ عنہ ان رسول اللہ ﷺ ذکر الجنة فقال له رجل من الانصار ارأيت يا رسول الله ان قتلت صابرا محتسبا قال عليه الصلوة والسلام لك الجنة فانغمس في جماعة العدو فقتلوه بين يدي رسول الله ﷺ“

دوسری دلیل اس پر روایت امام شافعی رحمہ اللہ ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے جنت کا ذکر فرمایا تو ایک انصاری شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ اگر میں صبر و خلوص سے رب تعالیٰ کی راہ میں شہید ہو جاؤں تو آپ کی رائے کیا ہے؟ آپ نے فرمایا تمہارے لئے جنت ہے تو وہ شخص دشمن کی جماعت میں گھس گئے دشمن لوگوں نے ان کو رسول اللہ ﷺ کے سامنے شہید کر دیا۔ (واضح ہوا کہ بلا خطر جنگ میں کو دپڑنا اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا لازم نہیں آتا):

”وان رجلا من الانصار القى درعا كانت عليه حين ذكر النبي ﷺ

الجنة ثم انغمس في العدو فقتلوه“

ایک اور انصاری شخص نے رسول اللہ ﷺ سے جنت کا ذکر سنا تو انہوں نے اپنی زرہ کو اتار پھینک دیا اور دشمن کی جماعت میں گھس گئے ان لوگوں نے ان کو شہید کر دیا۔

☆ "والثالث روى ان رجلا من الانصار تخلف عن بنى معاوية فرأى الطير عكوفاً على من قتل من اصحابه فقال لبعض من معه سأقدم اى العدو فيقتلوننى ولا تخلف عن مشهد قتل فيه اصحابى ففعل ذلك فذكروا ذلك للنبي ﷺ فقال فيه قولاً حسناً"

اور تیسری دلیل یہ ہے کہ روایت میں ہے کہ ایک انصاری شخص بنی معاویہ سے پیچھے رہ گئے ان کے کچھ دوست شہید ہو گئے انہوں نے جب شہداء احباب کے پاس پرندوں کو دیکھا تو اپنے کسی ساتھ کو کہا کہ میں دشمن سے مقابلہ کے لئے آگے بڑھ رہا ہوں دشمن اپنی کثرت کی وجہ سے مجھے شہید کر دیں گے لیکن میں اپنے احباب کے ساتھ میدان جنگ میں رہوں گا ان سے پیچھے نہیں رہوں گا۔ جب نبی کریم ﷺ کو اس کی خبر ملی تو آپ نے اس شخص کی تعریف کی حضور ﷺ کا اس کی تعریف کرنا ہی دلالت کر رہا ہے کہ جنگ میں مسلمانوں کا بلا خطر کوڈ پڑنا ہلاکت میں ڈالنا نہیں بلکہ قابل تحسین ہے۔

☆ "والرابع روى ان قوما حاصروا حصناً فقاتل رجل حتى قتل فقیل القى بيده الى التهلكة فبلغ عمر بن الخطاب رضى الله عنه ذلك فقال كذبوا اليس يقول الله تعالى ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَن يَشْرِى نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ وَاللَّهُ رَؤُفٌ بِالْعِبَادِ﴾"

(البقرة ۲۰۶ پ ۲)

اور چوتھی دلیل یہ ہے کہ ایک قوم نے ایک قلعہ کا محاصرہ کر لیا تو ایک شخص بلا خطر لڑائی میں مشغول ہو گیا یہاں تک کہ شہید ہو گیا تو اس کے متعلق بعض حضرات کہنے لگے کہ اس نے اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال لیا ہے جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یہ خبر ملی تو آپ نے کہا وہ جھوٹ کہتے ہیں کیا اللہ تعالیٰ نے نہیں فرمایا (ترجمہ) اور کوئی آدمی اپنی جان بیچتا ہے اللہ کی مرضی چاہنے میں اور اللہ بندوں پر مہربان ہے۔

(از کبیر)

☆ "وفى صحيح مسلم عن انس بن مالك ان رسول الله ﷺ افرده يوم احد فى سبعة من الانصار ورجلين من القریش فلما رهقوه قال من يردهم عنا وله الجنة او هو رفيقى فى الجنة فتقدم رجل من الانصار فقاتل حتى قتل ثم رهقوه ايضا فقال من يردهم عنا وله الجنة او هو رفيقى فى الجنة فتقدم اجل من الانصار فقاتل حتى قتل فلم يذل كذلك حتى قتل السبعة"

مسلم شریف میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے بیشک رسول اللہ ﷺ احد

کے دن سات انصار اور دو مہاجرین کے ساتھ (باقی صحابہ کرام سے کٹ کر) علیحدہ رہ گئے جب کفار نے آپ کو گھیرے میں لے لیا تو آپ نے فرمایا کون وہ شخص ہے جو ہماری طرف دفاع کرے ان کو واپس دھکیل دے وہ جنت میں میرا رفیق ہوگا۔ تو ایک انصاری صحابی آگے بڑھے ان سے لڑائی کی یہاں تک کہ وہ شہید ہو گئے۔ پھر ان کفار نے جب گھیرا ڈالا تو پھر نبی کریم ﷺ نے وہی ارشاد فرمایا پھر ایک انصاری صحابی آگے بڑھے جنہوں نے قتال کیا یہاں تک کہ شہید ہو گئے اسی طرح ایک ایک کر کے سات انصاری صحابی شہید ہو گئے۔

حضرت امام محمد رحمہ اللہ کی خوبصورت تفصیل:

(۱) اگر ایک مسلمان ایک ہزار کافر پر حملہ کرتا ہے اور اسے اپنی نجات کی امید ہے یا اس کا یہ خیال ہے کہ میرے حملہ سے مسلمانوں کو فائدہ ہوگا اور دشمن کا نقصان ہوگا تو یہ صورت جائز ہے۔
(۲) اور اگر اس لئے حملہ کرے کہ میرے ایک کے حملہ کرنے سے دوسرے مسلمان بھی حملہ کریں گے اور بہادری کا مظاہرہ کریں گے کہ جب ہمارا ایک بھائی اکیلے میدان جنگ میں کود پڑا ہے تو ہم کیوں پیچھے رہیں تو یہ صورت بھی جائز ہے کیونکہ مسلمانوں کا اس میں بھی نفع پایا گیا ہے۔
(۳) اور اگر دشمن کو ڈرانے کے لئے حملہ کرے کہ وہ سمجھیں کہ ایک شخص ہزار کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اگر حملہ آور ہو چکا ہے تو دوسرے بھی جب حملہ آور ہوئے تو ہماری تباہی ہو جائیگی اس طرح ان کے دلوں پر رعب طاری کرنے کے لئے حملہ کرنا بھی جائز ہے۔

(۴) جب مسلمانوں کا کامل نفع ہو اور دین کو عزت و عظمت حاصل ہو اور کفار کو ذلت حاصل ہو تو اس صورت میں اس شخص کا اپنی جان قربان کا قابل مدح ہے ایسے حضرات کی شان میں ہی فرمایا:

﴿إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَيَقْتُلُونَ وَيُقْتَلُونَ﴾

(التوبة ۱۱۱ پ ۱۱)

” بیشک اللہ نے مسلمانوں سے ان کے مال اور جان خرید لئے ہیں اس بدلے پر ان کے لئے جنت ہے اللہ کی راہ میں لڑائیں تو ماریں اور شہید ہو جائیں۔“
(۵) اگر ایک شخص ہزار پر حملہ کرتا ہے جس سے مسلمانوں کو کوئی فائدہ نہیں ہوتا تو یہ شہید ہو جاتا ہے

اگرچہ شہادت بذاتہ باعث اجر و ثواب ہے لیکن اس لئے مکروہ ہے کہ کم از کم ایسی صورت کو اختیار کرنا جس سے مسلمانوں کو نفع حاصل ہوتا کافروں کو ذلت حاصل ہوتی پھر یہ شہید ہوتا تو زیادہ بہتر تھا۔

(از قرطبی)

فائدہ : اسی سے یہ فائدہ بھی حاصل ہو گیا جو فقہاء کرام نے تحریر فرمایا ہے کہ جب مسلمانوں کا حاکم یہ دی کھے کہ ابھی ہمیں شکست نظر آتی ہے تو وقتی طور پر جنگ کو ٹال دے اور تیاری کر کے جنگ کریں لیکن ہمیشہ خرگوش کی نیند نہ سو جائیں اور غفلت میں وقت نہ گزاریں اور ہمیشہ ہی کافروں سے شر کر وقت نہ گزاریں یعنی نہ ہی اپنے آپ کو ہلاکت و تباہی میں ڈالیں اور نہ ہی ہمیشہ کے لئے خوف و ہراس میں رہیں۔

وَأَحْسِنُوا إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ :

”اور احسان کرو بیشک اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے احسان کرنے والوں سے“ احسان کے دو معنی ہیں:

”احدهما فعل فعلا حسنا فی نفسه سواء تعدی نفعه الی غیرہ اولاً“

احسان کا پہلا معنی یہ ہے کہ اچھا فعل کرنا خواہ اس کا نفع غیر کو پہنچے یا نہ پہنچے اس معنی کا لحاظ پر جس شخص نے نماز ادا کی اور روزہ رکھا اور کوئی نیکی کا کام کیا اس کے متعلق کہا جاسکتا ہے ”احسن الرجل“ فلاں شخص نے احسان کیا یعنی اچھا عمل کیا۔ (شیخ زادہ) اسی معنی کے لحاظ سے بعض صحابہ کرام سے مروی ہے کہ رب تعالیٰ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے ”احسنوا فی اعمالکم بامثال الطاعات“ کہ اپنے عمل اچھے کرو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کو تسلیم کرو اور ان پر عمل کرو۔ (قرطبی)

یہ معنی ماخوذ ہے ”الاحسان هو فعل الحسن“ سے یعنی اچھا کام۔ اسی معنی کے لحاظ پر یہ بھی کہا جاسکتا ہے ”فالضرب والقتل اذا حسنا کان فاعلهما فحسنا“ ضرب اور قتل جب اچھے ہوں تو ان پر عمل کرنے والے کے متعلق بھی یہ کہا جائے گا کہ وہ احسان کر رہا ہے:

”واخرج ابن جریر عن رجل من الصحابة فی قوله واحسنوا قال ادوا

الفرائض“

ایک صحابی سے مروی ہے کہ ”احسنوا“ کا مطلب یہ ہے کہ فرائض ادا کرو۔

”واخرج عبد بن حمید وابن جریر عن عکرمۃ فی قوله ﴿وَأَحْسِنُوا﴾“

إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ﴿٥٩﴾ قَالَ احْسِنُوا الظَّنَّ بِاللَّهِ

حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ﴿وَأَحْسِنُوا إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ پر اچھا گمان کرو کہ تم نیک عمل کرو اور اللہ تعالیٰ پر اچھا گمان کرو کہ وہ تمہیں جزاء عطا فرمائے گا۔ (درمنثور)

اسی معنی کے لحاظ پر ایک حدیث پاک کے یہ الفاظ گرامی بھی مد نظر رہیں:

”قال (یعنی جبرائیل) اخبرنی عن الاحسان قال (علیہ السلام) ان تعبد الله كانك تراه فان لم تكن تراه فانه يراك (یعنی بالحضور والخشوع)

جبریل علیہ السلام نے نبی کریم ﷺ سے سوال کیا احسان کیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ احسان یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو (یہ تصور کرتے ہوئے) گویا کہ تم اللہ کو دیکھ رہے ہو اگر تم نہیں دیکھ رہے تو وہ تمہیں دیکھ رہا ہے یعنی حضور قلب اور خشوع سے عبادت کرو۔ عجز و انکساری سے عبادت کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔ ابھی تک احسان کا جو معنی بیان کیا ہے اسے الاحسان فی العبادات کہا جاتا ہے (مظہری)

احسان کا دوسرا معنی یہ ہے:

”ایصال الخیر الی المحتاج“ محتاج تک بھلائی کو پہنچانا۔ اس معنی کے لحاظ پر نماز پڑھنے یا روزے رکھنے کو احسان نہیں کہا جائے گا بلکہ صدقہ کرنا یا اور کسی طرح محتاج نفع پہنچانے کو احسان کہا جائے گا۔ (شیخ زادہ)

یہ معنی ماخوذ ہے ”احسان“ سے:

”ففاعل الحسن لا یوصف بكونه محسنا الا اذا كان فعله حسنا واحسانا معا“

اچھا کام کرنے والا اس وقت تک محسن نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کا کام اچھا نہ ہو اور دوسرے کو نفع نہ پہنچائے یعنی حسن اور احسان دونوں بیک وقت جس میں پائے جائیں گے وہ محسن کہلائے گا۔ (کبیر)

اسی معنی کا اعتبار کرتے ہوئے کہا جاتا "الاحسان فی المعاملات" (معاملات میں احسان) (منظری) اب مطلب یہ ہوگا "واحسنوا فی الانفاق علی من تلزمکم مؤنت ونفقته" کہ جن لوگوں کا خرچ تمہارے ذمہ ہے تمہاری زوجہ اور اولاد اور ضعیف والدین یا محتاج رشتہ داران پر خرچ کر کے احسان کرو اور اس خرچ میں اعتدال رکھو نہ حد سے زائد خرچ کرو اور نہ ہی حد سے کم (کبیر)

احسان معاملات پر احادیث مبارکہ :

"قال رسول الله ﷺ تحب للناس ما تحب لنفسك وتكره لهم ما تكره لنفسك" (رواہ احمد عن معاذ)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم لوگوں کے لئے وہی پسند کرو جو اپنے لئے پسند کرتے ہو اور لوگوں کے لئے وہی ناپسند کرو جو اپنے لئے ناپسند کرتے ہو۔

☆ "قال رسول الله ﷺ المسلم من سلم المسلمون من لسانه ويده ، رواه اصحاب السنن عن ابى هريرة"

رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں مسلمان تو حقیقت میں وہی ہے جس کی زبان اور جس کے ہاتھوں سے مسلمان محفوظ رہیں۔

☆ "ورواه احمد عن عمرو بن عنبسة في جواب ابى السلام افضل قال ان من احبكم الى احسنكم اخلاقا"

عمرو بن عنبسہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا گیا کون سا اسلام (اسلام کا کون سا عمل) افضل ہے؟ آپ نے فرمایا تم میں سے جس کے اچھے اخلاق ہوئے وہی مجھے محبوب ہوگا۔
"رواه البخاری عن عبد الله بن عمرو وفي الصحيحين بلفظ من خياركم احسنكم اخلاقكم"

بخاری و مسلم نے روایت ذکر کی جو بخاری میں حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص تم میں سے اچھے اخلاق رکھتا ہو وہی تم میں سے بہتر ہے۔
☆ "قال رسول الله ﷺ ان الله كتب الاحسان على كل شئ فاذا قتلتم فاحسنوا"

القتلة واذا ذبحتم فاحسنوا الذبحة وليحد احدكم شفرته و ليرح ذبيحته

(رواہ مسلم)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ نے ہر چیز پر احسان کرنے کا حکم فرمایا اس لئے جب تم کسی کو قتل کرو تو اچھے طریقہ سے قتل کرو (یعنی ان کے اعضا نہ کاٹو، شکل نہ بگاڑو اور جب (قصاص وغیرہ کے طور پر) قتل کرو تو پھر بھی تیز دھار آلہ سے قتل کرو کند آلہ سے تکلیف نہ پہنچاؤ) اور جب جانور کو ذبح کرو تو اس پر ذبح میں احسان کرو یعنی تم اپنی چھری کو تیز کر لو اور اپنے ذبیحہ (ذبح ہونے والے جانور) کو راحت پہنچاؤ۔

(مظہری)

تنبیہ: جتنے معانی احسان کے بیان کئے گئے ہیں وہ تمام ہی ﴿إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ﴾ میں اسی ترتیب سے مراد لئے جائیں یعنی عبادات و معاملات میں احسان کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے۔

مخالفین جہاد کے اعتراضات:

- (۱) مخالفین اسلام تعصب و عناد سے جہاد کے متعلق یہ اعتراض کر کے اسلام پر دھبہ لگاتے ہیں پہلی کتب میں اخوت اور محبت اور عفو کا سبق دیا گیا ہے انجیل میں ہے ”جو تیرے گال پر ایک طمانچہ مارے تو اس کی طرف دوسرا گال کر دے اور جو تیرا برا چاہے تو اس کی بھلائی چاہ۔ لیکن قرآن و اسلام سے اس سے خالی ہے بلکہ اس کا حکم پہلے انبیاء کرام کی تعلیمات کے خلاف ہے۔
 - (۲) تمام انبیاء کرام کی تعلیمات کے خلاف قرآن نے بزر و شمشیر اسلام پھیلانے کا حکم دیا جو اسلام نہ لائے اس کو بے رحمی سے قتل کر دیا جائے اور قیدیوں کو غلام بنالیا جائے۔
 - (۳) جہاد کے مسئلہ نے مسلمانوں کو غیر مذہب والوں پر ظلم و ستم کی اجازت دے دی حالانکہ کفار کے ممالک میں مسلمان بھی آزادی سے حفاظت میں رہتے ہیں۔
- یہ اعتراضات یورپ کے مخالفین اسلام اور ان کے مرید مشنری یعنی نام نہاد روشن دماغ جہاد اور اسلام اور قرآن پاک اور نبی کریم ﷺ پر کرتے ہیں۔

جواب: یہ کہنا ہی لغو اور باطل ہے کہ پہلے انبیاء کرام نے جہاد نہیں کیا یا کفار اور بدطنیت لوگوں کی بربادی کے لئے دعا نہیں کی موسیٰ علیہ السلام کا بنی عمالہ سے جہاد کرنا اور حضرت حزقیل علیہ السلام اور حضرت سمویل علیہ السلام کا جہاد کرنا بہت واضح طور پر ثابت ہے نوح علیہ السلام اور کئی انبیاء کرام کا اپنی کافروں کی بربادی کے لئے دعا کرنا بھی بہت ہی روز روشن کی طرح ثابت ہے۔

کیا کسی قاتل، چور اور ڈاکو کو سزا دینا یہود و نصاریٰ اور ان کے ہمنواؤں کے نزدیک جرم ہے؟ کیا انہوں نے کبھی سزائیں نہیں دیں؟ جب وہ بھی سزائیں دیتے ہیں تو صرف اسلام پر اعتراض کیوں؟ ذرا ماقبل اوراق پر نظر دوڑائیں تو آپ کو راقم کی بیان کردہ بحث سے واضح ہو جائے گا کہ اسلامی جہاد اور کافروں کی جنگوں میں کتنا عظیم فرق ہے۔ اسلام نے جنگ میں بھی بچوں، بوڑھوں اور عورتوں پر رحم کرنے کا حکم دیا۔ مقتولین سے بھی اچھا سلوک کرنے کا حکم دیا اور کفار نے مسلمانوں کو تباہ و برباد کرنے کا ہمیشہ ہی منصوبہ بنایا اور اسی پر عمل کیا۔ کوئی مسلمان حاکم ڈر کے مارے جرات نہیں کر سکتا کہ وہ یہ کہے کہ دہشت گرد تو تم ہو مسلمانوں کو دہشت گرد کیوں کہتے ہو؟ ستم بالائے ستم یہ ہے کہ مسلمان بھی ان کے ساتھ مل کر مسلمانوں کو ہی دہشت گرد کہہ رہے ہیں۔

اسلام چند صورتوں میں جہاد کا حکم دیتا ہے:

اول یہ کہ مخالفین اسلام مسلمانوں کے ملک اور مساجد پر قبضہ کرنے کے ارادہ سے حملہ آور ہوں اور مسلمان پر چڑھائی کریں جیسا کہ احزاب کی جنگ میں کفار سے جہاد کرنا اور اپنا دفاع کرنا فرض کیا گیا۔

دوم یہ کہ کسی جگہ مسلمان اور کافر قدیم وقت سے ملے جلے رہتے ہیں اور پھر کفار مسلمانوں کو مذہبی رسوم و عبادات پر عمل کرنے کی اجازت نہ دیں تو ایسی صورت میں وہاں رہ کر کفار سے مقابلہ کر سکیں تو مقابلہ کر کے اپنی مذہبی آزادی حاصل کر کے رہیں لیکن کفار سے جب ان کے ملک میں رہتے ہو مقابلہ ممکن نہ ہو تو وہ وہاں رہ کر اپنے اسلام شعار کو نہ چھپائیں بلکہ وہ وہاں سے ہجرت کر لیں جیسے صحابہ کرام نے مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ میں ہجرت کر لی جب مذہبی آزادی کوئی چھیننے کی کوشش کرے تو وہاں سے ہجرت کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔

سوم مسلمان اپنی شان و شوکت اور سامان حرب و قتال بہم پہنچا کر اپنے آس پاس کے بادشاہوں اور قریب و بعید ملکوں کو دین حق کی منادی کریں اور بت پرستی اور دیگر بری عادات ترک کرنے اور فطرت اسلامیہ کے مطابق ان کو عمل کرنے کے متعلق کہیں۔

اسی عظیم مقصد کے لئے اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام کو مبعوث فرمایا اور اسی مقصد عظیم کے لئے نبی کریم ﷺ تشریف لائے اسی پر آپ علم کے وارث علماء کرام تا قیامت عمل کرتے رہیں گے۔ اگر کفار امر حق اختیار کر لیں اور فساد سے باز آئیں تو ان سے کچھ نہ کہا جائے ورنہ اللہ کا نام لے کر مسلمان اس طرح حملہ کریں جیسے صحابہ کرام جہاد کرتے رہیں۔

یہود و نصاریٰ اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھیں:

اور جو نا انصاف یہود و نصاریٰ اب بھی اعتراض سے باز نہ آئیں اور ملحدانہ طور سے کہیں کہ قرآن نے ریلجس لبرٹی اور کامنٹیشن کا ستیاناس کر دیا اور مذہبی آزادی کو باقی نہ رکھا اور آسمانی حقوق کے لئے کیوں تلوار اٹھائی اور کیوں کافروں پر قہر و غضب کیا تو وہ پہلے بائبل اور اپنی دینی پیشواؤں پر بھی اعتراض کریں جنہوں نے مذہبی جنگیں قائم کیں اور جنہوں نے کفار سے عہد باندھنے کی سخت ممانعت کر دی۔

توراة سفر خروج باب نمبر ۲۲ اور درس نمبر ۱۸ میں ہے، تو جادو گرنی کو جینے مت دے جو کوئی چار پائے سے مباشرت کرے مارا جائے جو کوئی خدا کے سوا اور معبود کی عبادت کرے مارا جائے عذاب دے کر۔ پھر باب نمبر ۱ میں ذکر قوم عمالیق سے جنگ کی اور نسل در نسل ان سے جنگ کرنے کا حکم دیا۔

پھر باب نمبر ۳۳ میں خدا کا کفار سے دشمنی رکھنا اور تمام کفار کی ہلاکت کا وعدہ کرنا اور ان سے معاہدہ کرنے کی سخت ممانعت مذکور ہے۔ پھر باب نمبر ۳۴ میں بسبب گوسالہ پرستی کے بھائی کو بھائی اور دوست کو دوست کے ہاتھ سے قتل کرنے کا حکم اور نیز ہزاروں کا قتل بھی مذکور ہے۔ پھر کتاب استثناء کے باب نمبر ۲ میں ”حسیوں کے بادشاہ موری سے جنگ کرنے کا حکم“ مذکور ہے۔ پھر باب نمبر ۳ میں عوج کو اس کی تمام قوم سمیت قتل کرنے کا ذکر ہے جس میں ان کی عورتیں اور معصوم بچے بھی بحکم خدا قتل کئے گئے اس طرح کے سینکڑوں مقامات میں یہود کی مذہبی کتاب میں قتال کا ذکر ہے۔

اب عیسائیوں کے بزرگوں کی طرف آئے۔ فلسطین اعظم نے عیسوی چوٹی صدی میں مذہبی قتل عام کیا پھر ایرین چرچ نے مقلدین اتنایس کو کس بے رحمی سے افریقہ میں قتل کیا۔ اور ”روس چرچ کر“ نے جرمن و برطانیہ و فرانس میں اور اٹلی کے شمال میں الیس کے پہاڑوں میں دریا خون خاص مذہب کے لئے ہی بہائی۔ اسٹریا میں تیس برس تک مذہبی جنگ رہی۔ ملک فرانس میں چارلس نہم عیسائی نے تین لاکھ پرائسٹنٹ کو بے رحمی سے قتل کیا۔

پھر یہ دیکھئے کہ کون میری اور لوئیس چہار دہم نے کیسا قتل عام مذہب کے لئے کیا اور ہنری ششم شاہ انگلستان نے کاتھولیک لوگوں کو قتل کر کے مذہب پرائسٹنٹ پھیلایا۔ پھر انگلستان میں ایک سو تیس برس تک پرائسٹنٹوں نے اپنا مذہب جاری کرنے کے لئے کیسے کیسے ظلم و ستم کئے پھر جان کالوں نے شاہ سروئیس کو ترغیب دی کہ جو ہمارے مذہب کو نہ مانے قتل کیا جائے۔ پھر ایسین میں مسلمانوں پر پادریوں نے کیا کچھ جور و ستم نہ کئے؟

پھر ہندوؤں میں ویدوں اور بد مذہب والوں میں سا لہا سال تک کیسے کیسے قتل عام ہوئے اگر مذہبی آزادی خدا کا حکم ہے تو ان نام نہاد روشن دماغوں نے یہ قتل عام کیوں کئے ان کے لئے سب کچھ جائز تھا اور صرف مسلمانوں کے لئے ناجائز ہے کیا ان کی طرف سے عدل تھا اور مسلمانوں کی طرف سے ظلم ہے۔ کیا اب بھی یہود و نصاریٰ بنی نوع انسان کو اپنا غلام بنانے کے لئے طرح طرح کے جابجا مظالم نہیں ڈھارہے۔

کیا مسلمانوں کو اور اسلام کو بزعم خویش مٹانے کے لئے وہ فلسطین، عراق، افغانستان، کشمیر اور چینیا میں ظلم نہیں کر رہے انسانی ہمدردی کا جھوٹا ڈھنڈورا پیٹنے والے مسلمانوں کو دہشت گردی کا الزام لگا کر دہشت گردی کر رہے ہیں بے جان مسلمان حکمران، ڈرپوک، خوف زادہ ان درندوں کا نام سن کر کانپ رہے ہیں اور ان کے ہمنوا بن کر جہاد کو دہشت گردی کہہ رہے ہیں۔ ٹف تمہاری عقل پر۔

(ماخوذ از حقانی مصروف)

☆☆☆☆☆

